

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شمارہ ۱۳۶
دسمبر ۱۹۸۷ء

بانی
محمد طفیل

مدیر
جاوید طفیل

ادارۃ فروغِ اردو لاہور

قیمت ۱۳۰ روپے

مکتبہ اربعہ اہل بیت علیہم السلام
لاہور
۱۹۸۷ء

ترتیب

محمد طفیل نمبر کی تقریبِ رونمائی کی ایک جھلک

۹	صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب	(۱) خطبہ صدارت
۱۷	ڈاکٹر وحید قریشی	(۲) کم گوشر میل شخص
۱۹	ڈاکٹر جمیل جالبی	(۳) نقوش کے مرشد
۲۲	پروفیسر مختار الدین احمد	(۴) محمد طفیل کی یاد میں
۲۵	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	(۵) اچھا آدمی سچا ادیب
۲۹	اشفاق احمد	(۶) نقوش کا طفیل نمبر
۳۱	رشید حسن خاں	(۷) بریادِ مرحوم
۳۳	جاوید طفیل	(۸) خطبہ استقبالیہ

نوادرات و مقالات

۳۹	ڈاکٹر معین الرحمن	(۱) ”جاگیر غالب“ میں غالب کی قلمی تحریریں
۴۶	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	(۲) سراج اور نگ آبادی پر نئی روشنی
۷۴	اکبر حیدر کاشمیری	(۳) میر کی دیئے عشق کا ایک نادر و ناماب مخطوطہ
۹۳	پروفیسر مختار الدین احمد	(۴) سرسید کے ایک رفیق ملیشی نجم الدین
۱۱۶	محمد حنیف نقوی	(۵) دیوانِ ناسخ - ایک نادر قلمی نسخہ
۱۴۹	عبد العزیز خالد	(۶) کجدار و مرزے
۲۷۳	مجتبیٰ حسین	(۷) انیس - نطقِ عظیم
۲۹۵	ڈاکٹر سہیل بخاری	(۸) زبان کی مکانی حقیقت
۳۰۷	بشیر ساجد	(۹) جلال الدین اکبر اور ان کی غزل گوئی
۳۲۹	ڈاکٹر سلیم اختر	(۱۰) تنقیدی اشیر باد
۳۳۴	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	(۱۱) میر امن دلی والے

گوشہ قدرت اللہ شہاب

۳۶۷	قدرت اللہ شہاب	(۱) ماں جی
۳۷۵	”	(۲) چمکور صاحب
۳۸۷	فتناز مفتی	(۳) اللہ کا .. قدرت اللہ شہاب
۴۰۴	احمد بشیر	(۴) بیرو مرشد

(۵) قدرت اللہ شہاب

افسانے

(۱) فقیرا فقیری دُور ہے

(۲) خدو خال

(۳) گولڈن گیٹ کی بلیاں

(۴) ہسٹری شیٹرز

(۵) بے یقینی کا عذاب

(۶) پہاڑوں کی کہانیاں

(۷) جزیرے

(۸) زندگی کی بندگی

(۹) بکری، شیر اور گھاٹ

(۱۰) صراطِ مستقیم

(۱۱) بادِ وفا / بے وفا

(۱۲) اپنا اپنا قرض

(۱۳) فاختہ

میرزا ادیب، ایک تفصیلی مطالعہ

(۱) لاؤ پتھر

(۲) گریٹ مین

(۳) دو بہنیں (ایک تمثیل ریڈیو تکنیک میں)

(۴) لہو اور قالین

(۵) ابنِ بطوطہ

(۶) ایک خوب صورت انسان

(۷) جناب آسا

انتظاریہ

(۱) فتح مبین

پروین عاطف

اعجاز حسین بٹالوی

آغا بابر

احمد سعید

احمد شریف

غلام نقیص نقوی

جوگندر پال

رام لعل

سائرہ ہاشمی

محمد نقشا یاد

عرفان علی شاد

وحید رضا بھٹی

خورشید عالم

انیت احمد

میرزا ادیب

"

"

"

"

محمد طفیل

ڈاکٹر انور سدید

شیخ منظور الہی

۴۲۶

۴۳۷

۴۵۱

۴۸۲

۴۸۹

۴۹۴

۴۹۹

۵۰۸

۵۱۳

۵۲۳

۵۲۹

۵۴۷

۵۵۰

۵۵۵

۵۶۱

۵۷۲

۵۷۹

۶۰۱

۶۱۰

۶۲۸

۶۳۷

۶۴۳

(۲) روشنی کی لکیر

ڈاکٹر آغا سہیل

۶۵۵

(۳) بیس سو بیس

ارشدمیر

۶۵۸

حمد و نعت، نظمیں، غزلیں

(۱) حمد باری تعالیٰ

حافظ لدھیانوی

۶۶۷

(۲) حمد باری تعالیٰ

حافظ لدھیانوی

۶۶۹

(۳) حمد باری تعالیٰ

حافظ لدھیانوی

۶۷۰

(۴) حمد

فضا ابن فیضی

۶۷۱

(۵) مناجات

حفیظ تائب

۶۷۲

(۶) نعت

حفیظ تائب

۶۷۵

(۷) نعت

حمایت علی شاعر

۶۷۶

(۸) اُمّی حرف آشنا

فضا ابن فیضی

۶۷۷

(۹) نعت

تحمین فراقی

۶۷۹

(۱۰) اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دم رکھنا

قتیل شغائی

۶۸۰

(۱۱) رہبری کے نشاں سارے کے سارے بر محل رکھنا

قتیل شغائی

۶۸۰

(۱۲) نہ جانے ہم فقیروں کو یہ کس نے بد دعا دی ہے

جگن ناتھ آزاد

۶۸۱

(۱۳) دیدہ بے نیاز دوست! یوں میری زندگی نہ دیکھ

جگن ناتھ آزاد

۶۸۱

(۱۴) زندگی میں ہر قدم پر مات کھاتا رہ گیا

جگن ناتھ آزاد

۶۸۲

(۱۵) اے دل ناداں، نہ کر تو نکتہ آرائی بہت

جگن ناتھ آزاد

۶۸۲

(۱۶) بے آب آئینے تھے، شجر بے لباس تھے

منظر امام

۶۸۳

(۱۷) جلی کتاب کا اک اقتباس لگتا ہے

منظر امام

۶۸۳

(۱۸) ہاتھ اٹھتے ہی کٹا چلیے یہاں سے چلیے

منظر امام

۶۸۴

(۱۹) آسمانوں سے فرشتے جو اتار رہے جائیں

امید فاضلی

۶۸۵

(۲۰) ناز کرنا کہ یہ ناز جدا ہے سب سے

امید فاضلی

۶۸۵

(۲۱) اقبال و مفکر اسلام و فلسفی

امید فاضلی

۶۸۷

(۲۲) زندگی میں میں آلام بہت

رفعت سلطان

۶۸۹

(۲۳) دیکھ کر مجھ کو پریشان بہت

رفعت سلطان

۶۸۹

(۲۴) بامعنی

صدیق کلیم

۶۹۰

۶۹۰	صدیق کلیم	(۲۵) درد کی روشنی
۶۹۲	شہزاد احمد	(۲۶) مرے ہمراہ منزل بھی رواں ہے
۶۹۳	شہزاد احمد	(۲۷) اجاڑ ہونے لگیں بستیاں چلا جائے
۶۹۴	شہزاد احمد	(۲۸) شہر کا شہر اگر آئے بھی سمجھانے کو
۶۹۵	راسخ عرفانی	(۲۹) وہ گرد باد تھا کوئی غبارِ جادہ تھا
۶۹۵	راسخ عرفانی	(۳۰) زندگی کے پہاڑ سر کرنا
۶۹۶	جلیل ملک	(۳۱) سلطنت
۶۹۸	جلیل ملک	(۳۲) ضمیر کی موت
۷۰۰	جلیل ملک	(۳۳) تو میری ساری تمنائوں کا حاصل ٹھہرے
۷۰۰	جلیل ملک	(۳۴) تیری آنکھوں میں گھلاوٹ ہے شرابوں جیسی
۷۰۱	جلیل ملک	(۳۵) خود اپنے بوجھ سے بت گر کے پاش پاش ہوئے
۷۰۱	جلیل ملک	(۳۶) یہ تپتے سے دن، یہ سلگتی سی خاموش راتیں
۷۰۲	علی احمد حبیلی	(۳۷) اجاب کے خلوص سے جب واسطہ پڑا
۷۰۲	علی احمد حبیلی	(۳۸) مٹ گیا غم، غلش وہی ہے ابھی
۷۰۳	احمد ظفر	(۳۹) قربت میں بار بار مجھے پتھر سمجھ لیا
۷۰۴	احمد ظفر	(۴۰) قاتل نے مجھے سمجھا مقتل نے مجھے جانا
۷۰۴	احمد ظفر	(۴۱) چھپ کے اُس یارِ طحار نے دیکھا مجھ کو
۷۰۵	احمد ظفر	(۴۲) مجھے نہ دل کا دیا
۷۰۶	احمد ظفر	(۴۳) سر شاخِ طوبی
۷۰۸	احمد ظفر	(۴۴) اپنے آپ سے ایک مکالمہ
۷۰۹	احمد ظفر	(۴۵) رقمطرازِ بہار
۷۱۱	فضا ابن فیضی	(۴۶) بجزِ لا حاصل کیا اور بام و در پہ رکھا ہے
۷۱۱	فضا ابن فیضی	(۴۷) اُسے پڑھنا ہے شکل جو کچھ آئینے پہ لکھا ہے
۷۱۲	فضا ابن فیضی	(۴۸) کسی بٹکتے آئینے کا ٹکڑا بھیج دینا
۷۱۳	فضا ابن فیضی	(۴۹) زخموں کو گلاب لکھ رہا ہوں
۷۱۴	محسن احسان	(۵۰) فولادیں ڈھل رہی ہے دنیا
۷۱۴	محسن احسان	(۵۱) کرن، شبِ نیم کوئی کر خوشبوؤں پر پاؤں دھرتی ہے
۷۱۵	محسن احسان	(۵۲) چلا ہے اوڑھ کے زر کا پیر بن مہتاب

- (۸۱) افق پر شمس ڈھلتا جا رہا تھا سلمان سعید ۷۳۰
 (۸۲) جب سے اُس کو پایا ہے سلمان سعید ۷۳۰
 (۸۳) اپنے شہر کا ایک منظر سلمان سعید ۷۳۱
 (۸۴) ایک نظم سلمان سعید ۷۳۱
 (۸۵) نہاں نظر سے ہے اور دوبہ و پکارتا ہے تحسین فراقی ۷۳۲
 (۸۶) زیادہ کیا بھلا اب حسن کی تفصیل میں ہوگا ڈاکٹر طارق عزیز ۷۳۳
 (۸۷) دن کٹ گیا سفر کا، پھر شام لوٹ آئی ڈاکٹر طارق عزیز ۷۳۳
 (۸۸) نظم ڈاکٹر طارق عزیز ۷۳۴
 (۸۹) زمانہ میرے قدموں میں پڑا تھا منور ہاشمی ۷۳۶
 (۹۰) سوچتا ہوں حاصلِ احساس کیا کیا رہ گیا منور ہاشمی ۷۳۶

یاد رفتگان

- (۱) زندگی کی ایک شام (خواجہ احمد عباس کے نام) وحید انور ۷۳۷
 (۲) ابنِ حسن برنی شیخ منظور الہی ۷۴۶
 (۳) ابو الفضل صدیقی مرحوم ڈاکٹر انور سدید ۷۵۶
 (۴) صادقین، خورشید مثال شخص رشید نثار ۷۶۷
 (۵) فکر تو نسوی کا مزاج ڈاکٹر انور سدید ۷۷۴

گوشہ محمد طفیل

- (۱) عظمتِ شیخ (ایک خاکہ) محمد طفیل ۷۸۵
 (۲) محمد طفیل، میرا دوست رشید اختر ندوی ۷۹۰
 (۳) میرا بچہ طفیل (ایسا کہاں لاؤں کہ تجھ سا کہیں) جگن ناتھ آزاد ۷۹۲
 (۴) م۔ ط۔ شخصیت و کردار (خطوط کے آئینہ میں) ڈاکٹر نثار احمد ۸۱۲
 (۵) نذرِ جناب محمد طفیل احمد ظفر ۸۲۱
 (۶) قلعہ تاریخ و فات سید قدرت نقوی ۸۲۲

تبصرے

غزل نما، ہمسفر بگلوں کا، کا کل غم، دخل در معقولات، اردو گیت ۸۳۶ — ۸۲۳



جاوید اقبال پریٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

یارانِ با صفا! ادب کا ایک خدمت گزا۔ آپ کو سلام کہتا ہے۔
۱۹۴۰ء سے لے کر آج تک ادب میں جو تغیر رونما ہوا میں اُسے ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا رہا۔
بہت سے نامور لکھنے والے سدھار گئے، کچھ نامور لکھنے والے زندہ ہیں مگر سدھارے ہوئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ
کم لکھتے ہیں یا اُن کے لکھنے کا معیار پہلے جیسا نہیں۔ کچھ نئے لکھنے والے سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب اچھے
لکھتے ہیں کیونکہ وہ اچھا لکھنے والوں کو مانتے ہی نہیں!

ادب میں میرا رول عاقبت پسندوں جیسا ہے۔ میں ادب میں کسی ایسے گروہ سے تعلق نہیں رکھتا جو دوسرے
کو برا بھلا کہتا ہو، کیونکہ فی زمانہ رواج یہ ہے کہ دوسرے کو برا ہی کہو بھلا نہ کہو۔ یاروں نے محاورہ ہی غلط کر ڈالا۔
یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی میری اپنی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ ادیب ایک دوسرے کی طرف مُنہ کر کے پوچھتے ہیں یہ
شخص ادھر ہے یا ادھر۔ اصل میں میں نہ ادھر ہوتا ہوں نہ ادھر، میں تو اُس طرف ہوتا ہوں جدھر ادب کی پری
کھڑی ہو۔

میرا مسلک نئے ادب کی ترویج تھا اور ہے۔ وہ کون سا بڑا ادیب اور شاعر ہے جس کی رفاقت مجھے نصیب
نہ ہوئی ہو، کوئی ایک نام بھی نہیں لیا جاسکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادب کی متعدد قدآور تحریروں نقوش میں چھپیں!
ادب میں جاندار تحریروں کا زمانہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک کا ہے۔ پھر ذہنوں میں ٹھپل پیدا ہوئی۔ بڑے بڑے
لکھنے والوں کے قلم ہند ہو گئے، مسلمان ہو گئے۔ انسانی قدیریں شرمندہ ہونے لگیں، ادیب سنبھلا تو ادب بھی سنبھل گیا۔ بڑی
تحریروں وجود میں آنے لگیں۔ یہ دور ۱۹۴۰ء تک چلا ہو گا!

میں یہ نہیں کہتا کہ ۱۹۴۰ء کے بعد اچھی تحریروں وجود میں نہیں آئیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ تناسب کم ہو گیا، جو کم
ہوتا چلا گیا۔ بے شک گھپ اندھیر۔ میں ایک دیے کی روشنی بھی بہت ہوتی ہے مگر میں تو سوچتا ہوں پہلے الی
جگ مگ کب ہوگی!

محمد طفیل



اس شمارے میں

- نوادرات و مقالات کے عنوان سے چند اہم تحریریں شامل ہیں جن کی اہمیت مستقل ہے۔
- ”گوشہ قدرت اللہ شہاب“ میں افسانوں کا انتخاب نقوش میں اُن کے طبع شدہ افسانوں میں سے کیا گیا ہے۔
- میرزا ادیب ایک تفصیلی مطالعہ میں چند مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں جن کے متعلق میرزا ادیب صاحب کا خیال ہے کہ یہ اُن کی قابل ذکر تحریریں ہیں۔



محمد طفیل نمبر

تقریبِ روزنامی

کی ایک جھلک

ترتیب تصاویر

تقریب رومانی محمد طفیل نمبر

صفحہ نمبر ۱ :

صدر پاکستان جناب جنرل محمد ضیاء الحق خطبہ صدارت فرما رہے ہیں ۔

صفحہ نمبر ۲ :

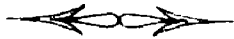
جاوید طفیل ، صدر پاکستان جناب جنرل محمد ضیاء الحق ، گورنر پنجاب جناب مخدوم سجاد حسین قریشی ، قاری امجد علی حبیب علوی تلاوت قرآن پاک فرما رہے ہیں ۔

صفحہ نمبر ۳ :

- (۱) حاضرین (۲) جناب سراج منیر (ٹیچ سیکرٹری) (۳) جاوید طفیل
(۴) صدر پاکستان جناب محمد ضیاء الحق محمد طفیل نمبر کو ملاحظہ فرما رہے ہیں ۔
(۵) صدر پاکستان محمد طفیل ادبی ایوارڈ کو ملاحظہ فرماتے ہوئے ۔ (۶) جناب رشید حسن خان (نئی دہلی ، بھارت)

صفحہ نمبر ۴ :

- (۷) جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۸) جناب اسحاق احمد خان
(۹) جناب ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۰) جناب مختار الدین احمد (علی گڑھ ، بھارت)
(۱۱) ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۸۶ء کا محمد طفیل ادبی ایوارڈ صدر پاکستان سے حاصل کر رہے ہیں جو انکی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں پیش کیا گیا ۔
(۱۲) جناب ڈاکٹر وحید مستیشی









1



2



3



4





7



8



9



10



خطبہ صدارت

صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على خاتم النبيين^ط

محترم مخدوم سجاد حسین قریشی صاحب گورنری پنجاب ،

محترم مریم طفیل صاحبہ ،

محمد طفیل مرحوم کے فرزند ارجمند اور مدیر ”نقوش“ بناب جاوید طفیل صاحب ،

ادیب حضرات ،

دانشوران کرام

اور

معزز خواتین و حضرات !

السلام علیکم !

آج کی یہ تقریب ایسے شخص کی یاد میں منعقد ہو رہی ہے جس نے ہمارے مذہبی و قومی ادب اور ثقافت پر گہرے اور دیر پا نقش چھوڑے ہیں۔ ”نقوش“ محمد طفیل مرحوم کا نقش جاوداں ہے۔ محمد طفیل نے ”نقوش“ کو زندہ کیا ہے اور ”نقوش“ نے محمد طفیل کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔

میں کوشش کروں گا کہ آپ کی توقعات پر پورا اتر سکوں لیکن جیسا کہ میں نے ایسے کئی مواقع پر اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے کہ محفل خواہ ادبی ہو، خواہ ثقافتی ہو، خواہ سائنسی ہو مجھے جیسے گنہگار اور کم علم سے توقع کی جاتی ہے کہ سارے کا سارا علم یہ شخص بتائے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ ضرور اس کا احساس فرمائیں گے ، بہر حال میں اپنی کوشش ضرور کروں گا کہ جو آپ کی توقعات ہیں ان پر پورا نہیں اتر سکتا تو کم از کم ان کے نصیحت تک ضرور پہنچ سکوں۔ ”نقوش“ کے ارتقا پر دیگر ادیبوں اور مقالہ نگاروں کے علاوہ جناب جاوید طفیل نے بھی بھرپور اور خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی اور خود محمد طفیل مرحوم کے الفاظ میں ”اس لاڈلے کی پرورش اور اس کی بلوغت کی کہانی“ سنائی۔ اس کے بعد جاوید صاحب نے ”نقوش“ کے بارے میں اس کے مربیوں اور عشاق کے جذبات اور تاثرات بیان

نوٹ : ہوٹل ملٹن (لاہور) میں نقوش محمد طفیل ممبر کے سلسلے میں منعقدہ تقریب مورخہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں صدارتی خطاب ۔

کہ جن میں مجھے بھی انہوں نے احتراماً شامل کیا ہے بلکہ آغاز ہی میں سے کیا ہے۔ یہ ان کی مہربانی ہے ورنہ میں اس مقام کا اہل نہیں ہوں۔ ہاں اس سے اگر میری عقیدت، محبت اور تعلق خاطر کی سہ سہی منظور ہے تو مجھے اس پر بڑا فخر ہے۔ مجھ سے پہلے بلند پایہ ادیبوں اور دانشوروں نے 'نقوش' کی علمی اور ادبی اہمیت اور مفید طویل مرحوم کی خدمات پر ہم پر انداز میں روشنی ڈالی ہے اس پر اضافہ میرے بس کی بات نہیں البتہ اظہار عقیدت کے طور پر خلوص دل سے چند الفاظ آپ کے گوش گزار نہ در کروں گا۔

طفیل صاحب میری دانست کے مطابق کوئی چمکیلی یا چمکاڑا شخصیت کے مالک نہ تھے جو لاکھوں کے مجمع میں اپنی وضاحت قطع، قد کاٹھ، عمدہ لباس یا شوخ گفتگو کی وجہ سے پہچانے بائیں۔ ان کا جوہر ان کی محنت ہے۔ وہ چیونٹی کی طرح کام میں جُت جاتے اور چپکے چپکے بڑے سے بڑا پہاڑ کھودنا شروع کر دیتے۔ ان کی محنت اور حوصلے کا یہ اس وقت چلتا جب وہ پہاڑ کو اپنے سر پر اٹھا کر 'نقوش' کے خصوصی ممبر کی شکل میں ہمارے سامنے رکھ دیتے تب نہیں اندازہ ہوتا کہ یہ کھیت سا شخص کتنا سخت جہان ہے۔ یہ خاموش طبع مدیر کتنے ستوریدہ سرکار نامے انجام دیتا ہے اور یہ مدغم مدغم شخص اندر سے کتنا چمکیلا اور وکس ہے!

وہ 'نقوش' کی اور 'نقوش' ان کی پہچان تھا بعد ازاں کہ آپ نے مجھ سے پہلے بہت سے مقررین سے سنا ہے اور آپ یو پیسے تو 'نقوش' ہی ان سے ممبر سے تعارف کی بھی وجہ بنا۔ میں شہوت سے ہی 'نقوش' کا حیدار، قاری اور ذخیرہ امد و زما ہوں۔ 'نقوش' کے بعض عشاق میرے ذخیرے، دفینے اور خزینے میں وقتاً فوقتاً نقب بھی لگاتے رہے ہیں لیکن میں کبھی 'نقوش' سے تہی دامن نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ لائبریری یا الماری میں سجے ہوئے بڑے اچھے لگتے ہیں بلکہ ان کے مطالعہ سے انسان ادب کے لیے اپنی پیاس بجھاتا ہی نہیں بڑھاتا بھی ہے۔ کم از کم میں نے ہمیشہ یہ ہی محسوس کیا ہے کہ میں نے جتنا پڑھا ہے اس سے اور پڑھ لوں اور جتنا محفوظ کیا ہے اس سے اور زیادہ محفوظ کروں اور اب ماشاء اللہ میرے دل و دماغ کے علاوہ میری لائبریری میں 'نقوش' کے تقریباً تمام یادگار نمبر محفوظ ہیں۔

مقصود اظہار تعلق نہیں حرص مطالعہ ہے۔ آپ نے جاوید طفیل کی زبانی سنا کہ جب طفیل مرحوم نے 'نقوش' کو گود لیا تو اس کی عمر اڑھائی برس تھی۔ بچہ کم عمر ہونے کے علاوہ ذرا بیمار بھی تھا۔ یہاں طفیل صاحب کو فخر اچھ عقیبت پیش کرتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اس کم سن اور کمزور بچے کی خوب پرورش کی، اسے پالا پوسا، پروان چڑھایا اور جوان بنایا۔ لیکن اس بات کا بہت کم لوگوں نے نوٹس لیا ہے کہ انہوں نے اس کی صورت کے علاوہ اس کی سیرت پر بھی خاصی توجہ دی اور وہی 'نقوش' جو کبھی نام نہاد ترقی پسند خیالات کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا ان کی ادارت میں رفتہ رفتہ اسلامی رنگ میں ڈھلتا گیا اور میری نظر میں بطور مدیران کا نقطہ عروج اور 'نقوش' کا عالم شباب اس وقت آیا جب تیرہ جلدوں پر مبنی رسول نمبر شائع ہوا۔

ان کارناموں کی وجہ سے جناب محمد طفیل خود بھی اپنی ذات میں ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے بشمار خوبیاں اور صلاحیتیں ودیعت کی تھیں اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو صحیح سمت میں تعمیری کاموں کے لیے صرف کیا۔ ان کے مرتبہ ”نقوش“ کے خصوصی نمبروں کی تعداد، ضخامت اور معیار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اُن تھک، محنت کرنے والے اور وقت کا شعور رکھنے والے انسان تھے۔ وقت کے اسی احساس اور زمانے کے اسی ادراک نے انھیں اعلیٰ پایہ کا مدیر بننے میں مدد دی۔ وہ علمی اور تحقیقی پہلوؤں پر گہرہ نگاہ رکھتے تھے اور محض خیال آرائی اور ٹھوس تحقیقی سرگرمیوں کے فرق سے بخوبی آگاہ تھے۔

طفیل مرحوم کے حوالے سے جو ایک اہم بات مجھے یاد آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کے سفر میں عام طور پر لوگ بنے بنائے راستوں پر چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتے ہیں کیونکہ اس میں محنت بھی کرنا پڑتی ہے، دقتیں بھی پیش آتی ہیں اور انجام بھی غیر یقینی ہوتا ہے لیکن جن اصحاب نے دنیا میں اپنا نام چھوڑا ہے انہوں نے اپنا راستہ خود تراشا ہے۔ محمد طفیل کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ادب کے سفر میں جنگل کاٹ کر اپنا راستہ تراشا ہے۔ محمد طفیل کو رنگ و نور کا یہ راستہ تراشنے میں جن مراحل سے گزرنا پڑا ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو آداب کو کھ کھنی سے واقف ہیں۔ محمد طفیل نے ادب کی صرف خدمت ہی نہیں کی بلکہ ادب سے عشق کیا ہے اور ایک سچے عاشق کی طرح اپنا ایک ایک لمحہ اس کے سپرد کیا ہے۔ انہوں نے نقوش کو اپنا خون جگر دے کر پروان چڑھایا حتیٰ کہ یہ ایک سایہ دار تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ اس پورے عمل کے دوران محمد طفیل نے اپنے آپ کو فراموش کیے رکھا۔ ان کی سوچیں ان کے جذبے اور ان کی تخلیقی توانائیاں سب ”نقوش“ کی آبراری کے لیے وقف رہیں۔

مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر بھی تامل نہیں کہ ”نقوش“ ایک لیجنڈ (LEGEND) بن چکا ہے۔ ادب کی دنیا میں اسے ایک روایت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ادب کا شاید ہی کوئی اہم موضوع ہو جس پر ”نقوش“ کا خاص نمبر شائع نہ ہوا ہو اور پھر کمال یہ ہے کہ اس کا ہر نمبر اردو ادب میں مستقل حیثیت کا حامل ہے۔ ادب کی تاریخ پر تحقیق کرنے والا کوئی شخص اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ شاید یہ میرے ہی خیالات ہیں لیکن جب میں نے جناب رشید خاں صاحب کے مقالے میں اس کے متعلق سنا تو میری بڑی ڈھارس بندھی کیونکہ کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ تحقیق کے میدان میں اگر رشید خاں صاحب سے آپ نے تعاون حاصل کر لیا تو سمجھ لیجئے کہ واقعی آپ نے صحیح کہا ہے۔

یوں تو محمد طفیل نے ان گنت ادبی کارنامے سرانجام دے دیے ہیں اور کئی علمی معرکوں میں کامرانیوں نے ان کے قدم چومے لیکن ان کی ارفع تر سعادت بلاشبہ رسولی نمبر کی اشاعت اور ارفع ترین خدمت قرآن نمبر کی ترتیب و تدوین ہے جو ابھی منظر عام پر نہیں آیا۔ اہل نظر اس کے منظر تھے کہ خدا نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ تاہم

وہ اپنے حصے کا کام کر چکے تھے اور یہ نیکی ان کی اولاد کی طرف منتقل ہونا تھی کسی فرزند کے لیے اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے عظیم باپ کے اس قدر عظیم اور مقدس منصوبے کو پائیہ تکمیل تک پہنچائے۔
رسولؐ نمبر اور قرآن نمبر اس خاندان کی دو نسلوں کے لیے توشہ آخرت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "نفوش"
کے رسولؐ نمبر کی تیرہ ضخیم جلدیں گواہی دے رہی ہیں کہ آج بھی چودہ صدیوں کے فاصلے پر ہمارے درمیان ایسے عشاق موجود ہیں جو صرف اپنی ذاتی لگن سے، اپنے لہو سے دیے جلا سکتے ہیں اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسا محبت بھرا تحفہ پیش کر سکتے ہیں۔

رسولؐ نمبر کی پہلی جلد میں دیباچے کے طور پر "طلوع" کے عنوان سے محمد طفیل نے لکھا تھا کہ "مجھ سے جو کام مولانا لینا ہے وہ لے رہا ہے کیونکہ میں تو اپنی ذات میں ماسائبوں کی پوٹ ہوں اور کچھ بھی نہیں۔ میری گنہگار ی اپنی جگہ توفیق ایزدی اپنی جگہ، مگر سوال یہ ہے کہ میرے اس سہم شوق کا حال کچھ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی معلوم ہے۔ میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ میں حاضر! اور پھر وہ واقعی حاضر دربار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو گئے۔

یہ بڑے کرم کے میں فیصلہ

یہ بڑے نصیب کی بات ہے

وہ قرآن نمبر کے متعلق بڑے سنجیدہ اور سرگرم عمل تھے۔ وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اس کا خاکہ سنایا کرتے تھے، اس کی فہرست مصامین دکھایا کرتے تھے اور بڑے فخر اور اعتماد سے کہتے تھے کہ قرآن نمبر بھی ان شاء اللہ نفوش کی اعلیٰ روایات کا حامل ہوگا۔

قرآن شعر نہیں لیکن اس کی نثر میں شامی جیسا اعجاز، بلاغت اور ایمانیت ہے۔ ہر جگہ کے بڑے نقادوں، شاعروں اور ادیبوں نے اسے ادب عالیہ قرار دیا ہے۔ قرآن کی علامات، استعارات، تلازمات، لسانی جاذبیت اور تاثیر نے ہر زبان کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام ذہن و عقل کو مسح کر کے دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔ "نفوش" کے قرآن نمبر کی طباعت کے آغاز کی نوید سے ہمیں ایک گونہ اطمینان ہوا ہے کہ مرحوم محمد طفیل نے جو شمع روشن کی تھی اس کی لودھم نہیں ہوئی اور اس مشعل کو اب ان کے بیٹے جاوید طفیل نے تھام لیا ہے۔ ہماری دعا، کہ اللہ تعالیٰ انھیں کامیابی عطا فرمائے۔

طفیل صاحب کے جاری کردہ کام کو آگے بڑھانے کے علاوہ جاوید طفیل نے ایک اور کارنامہ سرانجام دیا ہے انھوں نے، جیسا کہ ابھی آپ نے دیکھا۔ ۸۵ صفحات پر مبنی "طفیل نمبر" شائع کر کے اپنی مدیرانہ اور ناشرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں انہیں اس کارنامے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ میں اس خصوصی نمبر پر تفصیلاً کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ پریچہ ابھی وصول ہوا ہے۔ اس کے مختلف حصوں پر کچھ سرسری سی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ

کیا جاسکتا ہے کہ یہ خاصا جامع پرچہ ہے جس میں طفیل صاحب کی شخصیت پر بھی مضامین ہیں اور ان کے کام کا بھی بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں طفیل صاحب بطور مدیر، ادیب اور خاکہ نگار، بہت سی تحریروں کا موضوع ہیں۔ پھر خود ان کی اپنی تحریروں کا انتخاب اس مجلے میں شامل ہے۔ یقیناً یہ ایک قابلِ ستائش کوشش ہے اور ادبی حلقوں میں اس کی ضرور پذیرائی کی جائے گی۔ لیکن ایک خیر خواہ اور ہمہ کے طور پر میں جاوید صاحب کو انہیں آئندہ کی دشوار گزار گھاٹیوں سے آگاہ کرنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی برسی ہمیشہ دلگداز ہوتی ہے۔ پہلایا دگاری نمبر ترتیب دینا نسبتاً آسان ہوتا ہے کیونکہ کچھ تو مرحوم کا بکھرا ہوا کام ہوتا ہے جسے آسانی سے سمیٹا جاسکتا ہے اور کچھ مرحوم کے دوست، کم از کم ایک سال تک بٹے بامروت ہونے ہیں کہ لپٹا ماند کان کے لیے کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، اجاب ٹوٹ جاتے ہیں، ادبی پرچے دم توڑ دیتے ہیں۔ اللہ کرے "نفوس" کا یہ حال نہ ہو۔ لیکن دوسرے ادبی پرچوں کی مثالیں بڑی حوصلہ شکن ہیں اور میں سمجھ رہا تھا کہ شاید میں ہی اس کا ذکر کروں گا لیکن جمیل جالبی صاحب نے پھر میری حوصلہ افزائی فرمائی، لیکن میں کسی اور پہلو سے آپ کی توجہ ان کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ میں صرف چند ایک حوالہ جات دینے پر اکتفا کروں گا، اور آپ کی دعا سے میں نے یہ سب پرچے پڑھے ہیں۔

"ساقی" نے طویل عرصے تک تشنگانِ ادب کی پیاس بجھائی اور شعر و ادب کے خم لٹھ حالے لیکن شبِ ہمدردی دہلوی اٹھ گئے تو پوری محفل پر خاست ہو گئی۔

"شیرازہ" مولانا چراغ حسن حسرت کا چشم و چراغ تھا لیکن حسرت صاحب فوت ہوئے تو یہ چراغ بھی گل ہو گیا اور ہم آج تک حسرت سے ہی اسے یاد کرتے ہیں۔

"مخزن" کا خزانہ سر عبدالقادر کے سبکدوش ہونے کے ساتھ ہی لٹ گیا۔

"ادبی دنیا" مولانا صلاح الدین احمد کی آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی اُجڑ گئی۔

"ہمایوں" اور "عالمگیر" جو نام اور کام کے لحاظ سے سلطنتِ مغلیہ کا سا طعراق رکھتے تھے اپنے بانیوں کے انتقال کے ساتھ ہی سلطنتِ مغلیہ کے سے انجام کو پہنچے۔

نیا زفتحپوری اور حکیم یوسف حسن کی وفات کے بعد اگر "نگار" اور "نیزنگ خیال" زندہ ہی رہے تو نیم دروں، نیم بروں والی کیفیت رہی۔

اب امتحان کا یہ دور "نفوس" پر آیا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا بلکہ ملک کا کوئی بھی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ "نفوس" سابقہ ادبی پرچوں کے انجام کو پہنچے۔ اسے بچانے، پروان چڑھانے اور بارغ و بہار رکھنے کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے کیونکہ "نفوس" دورِ حاضر کی ایک ادبی روایت ہے، ہماری ادبی شناخت ہے، ہماری تخلیقی صلاحیتوں کا عنوان ہے، اس عنوان کو ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک حکومت کا

کھلتی ہے وہ نقوش "کو بالخصوص اور دیگر ادبی پرچوں کو بالعموم سہارا دینے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ پچاس ہزار روپے کا سالانہ "نقوش ایوارڈ" ان شاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ وفاقی حکومت سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ادبی پرچوں کے لیے نیوز پرنٹ یا دوسرا کاغذ رعایتی قیمت پر مہیا کرنے کا جائزہ لے۔ اس کے علاوہ ہم اکادمی ادبیات پاکستان سے توقع کریں گے کہ وہ ادبی جرائد کے مدیران یا ان کی اکین سے مشورہ کر کے حکومت کو ایسی سفارشات پیش کرے جس سے ادبی پرچوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ جن قوموں میں ادبی تنوع خشک ہو جاتے ہیں وہ بہت جلد نابھج جاتی ہیں اور جو قومیں نابھج جاتی ہیں وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم جاتی ہیں یہ نہ شعروادب کی دنیا میں کوئی تخلیقی تجربہ کیا سکتی ہیں نہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں۔ لہذا میں ایک طرف ادب، شاعروں، دانشوروں اور دوسری طرف ادبی پرچوں کے مدیروں اور ناستروں سے اور تیسری طرف تمام وفاقی اور مقامی محکموں سے اپیل کروں گا کہ شعروادب کے دوش کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ملک کو صحت مند ادب سے مالا مال کرنے میں مدد دیں۔

میں ادب اور اس کے سرچشموں کے بارے میں طویل تقریر نہیں کرنا چاہتا کیونکہ آپ میں سے اکثر و بیشتر نااہل و سہلے ادیب ہیں یا ادب پسند ہیں۔ میں صرف اتنی یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ادب کے دھارے ملی روایات کے سر سے تھوڑے ہیں۔ ادیب ہماری تہذیبی ولایت کے سیفر ہیں اور اس حیثیت سے وہ اپنے تمدن کی اسیریں مابالقی اور ابتدائی قدروں کے امین ہیں۔ ادب محض کسی قوم کا آئینہ نہیں ہوتا بلکہ پیشین بین ہوتا ہے۔ لہذا ادیبوں کو اس امانت کا تحفظ بھی کرنا ہے اور آئندہ کے لیے پیش بینی بھی۔

آج میں بار بار فکد و حمل اور جذلوں کی وحدت کی ضرورت کا شدید احساس ہے اور یہ حال بار بار سر اٹھاتا ہے کہ دلوں کے درمیان وحدت کیسے پیدا ہو۔ اس کا جواب یہی ہے کہ جس طرح پہلے پیدا ہونی تھی۔ رسول یا کاک کی محبت نے دور اول میں بھی دلوں کو جوڑا تھا اور آج بھی یہی قوت ان شاء اللہ دلوں کو جوڑ سکے گی اور ہمارے ادیب اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

پاکستان کو کس قسم کا ادب چاہیے اس کا فیصلہ میں نے یا حکومت نے نہیں کرنا، ادیبوں نے اور قارئین نے کرنا ہے۔ لیکن جہاں تک میرے خیالات کا تعلق ہے میں کئی مواقع پر اور خاص کر اسلام آباد میں منعقدہ قلم کاروں کے سالانہ اجتماعات کے سامنے اس موضوع پر مفصل اظہار کر چکا ہوں جس کا خلاصہ اس طرح سے ہے کہ: سرزمین پاکستان کے بعض حصوں میں سیم اور تھور بہت سے وہ ہماری زمین کی پیداواری صلاحیتوں کو ختم کر رہی ہے ہم پوری توجہ اور زور سے اس لعنت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم ملک کی نظریاتی سرزمین میں بھی کسی قسم کی سیم اور تھور کو برداشت نہیں کریں گے۔ سیم اور تھور کے جزیروں پر ہماری نظر ہے ہم ان شاء اللہ ملک کی نظریاتی سرحدیں کھوکھل کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں آزادی اظہار کا پورا قائل ہوں لیکن آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ماورپہر آزادی کا تصور نہ تو کسی ملک یا عہد میں رہا ہے اور نہ آج کہیں ہے۔ آزادانہ بننے والا

دیر یا بھی کناروں کے درمیان پہننے پر مجبور ہے۔ کناروں سے اچھل جائے تو تباہی، کناروں کے اندر رہنا تو سہا ہوا اور خوشحالی۔ لہذا ملک کی نظریاتی حدود کے اندر رہیے، ملک کو صحت مند لٹریچر دیجئے، نئی نسل کو اعلیٰ مطالعاتی مواد مہیا کیجئے۔ اس سے ملک کی بنیادیں مضبوط ہوں گی، اس سے پاکستانیت فروغ پائے گی اور اس سے پاکستان کے مستقبل میں نئی نسل کا اعتماد مضبوط ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ محمد طفیل مرحوم نے 'نقوش' کے رسول ممبر کی تکمیل اور قرآن ممبر کی ابتدا کر کے جس روایت کی بنیاد رکھی ہے وہ پاکستانی ادب کو ایک نیا رخ دے گی، ان شاء اللہ! اور اردو ادب ہمارے اسلامی اور ملی تشخص کو نوری طرح نمایاں کرے گا۔ ہمارا ادب اور ہماری ثقافت اسلام سے ابھرتی ہے اور اسلام سے ہی رہنمائی حاصل کرتی ہے، کیونکہ اسلام سے ہی ہماری لقا ہے اور اسلام ہی ہماری صحیح شناخت ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں اپنا یہ مقالہ ختم کروں میں دو چیزوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، ایک تو پھر رشید حسن صاحب کے حوالے سے۔ میں نے جاوید صاحب سے پوچھا کہ تبھی! یہ جو اتنے نقوش نمبر چھاپے ہیں ان کے نسخے بھی آپ کے پاس موجود ہیں یا نہیں، میرے پاس تو نہیں تو انہوں نے فرمایا کہ فائلوں میں موجود دیں۔ پہلی تو میں ان کی خدمت میں یہ گزارش کروں گا کہ ان تمام نمبروں کو باقاعدہ طور پر دوبارہ چھپوائیں اور چھپا کر محفوظ رکھیں۔ یہ کوشش کروں گا کہ ان کے تمام نمبروں کی کم از کم ایک ایک جلد ہر اچھے کتب خانے میں موجود ہو۔ ان کتب خانوں کے لیے یہ میرا تحفہ ہوگا۔

دوسری چیز جس کا مجھے خود احساس نہیں تھا وہ بھی رشید حسن صاحب نے بتائی اور آپ یقین کیجئے کہ سرحد کے اس پار سے جو آوازیں آتی ہیں وہ نقارِ ظلم کی آوازیں ہیں۔ گھر کے اندر تو گنبد کی آواز ہیں سنائی نہیں دیتی لیکن اس طرف سے جو آواز آتی ہے اسے خصوصی طور پر آپ کو سننا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ تحقیق کے میدان میں نقوش کے بعض بعض مقالے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم نے یہاں مرحوم طفیل صاحب سمیت ایک بورڈ بنایا تھا جس کے لیے میں نے پچاس ہزار روپے کی رقم رکھی تھی اور کہا تھا کہ نقوش میں جو سب سے اچھا مضمون چھپے اسے پچاس ہزار روپے دے دیجئے۔ اس موقع پر میں نے ان سے کہا تھا کہ تبھی دیکھیے اسے اپنے پاس ہی نہ رکھ لیجئے، اس کے لیے ایک بورڈ تشکیل کیجئے، کوئی روایت ایسی قائم کریں کہ ہمارے اور آپ کے جانے کے بعد یہ چیز جاری رہے۔ تو انہوں نے بھی اپنا ایک بورڈ بنایا ہوا ہے جس سے کہ ہر سال یہ پچاس ہزار روپے کا انعام دیتے تھے۔ آج جاوید صاحب نے ایک نئی روایت قائم کی ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس روایت کو قائم رکھے اور میں انہیں بھی اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اس کی پہلی اینٹ رکھی اور پہلی خشت با اینٹ جو ہے وہ بھی وحید قریشی صاحب کے ہاتھ میں آئی۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو جاری رکھے لیکن آج کے جو مقالہ نگار ہیں میں ان کی خدمت میں گزارش کروں گا جس میں جناب رشید حسن خاں صاحب، جناب

مولوی اشفاق احمد صاحب، جناب پروفیسر فرمان فتحپوری صاحب، ڈاکٹر مختار الدین صاحب، جناب جمیل جالبی صاحب اور محترم جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، ان کی خدمت میں میری گزارش ہے کہ ایک رضا کارانہ بورڈ بنائیے اور از خود یا اپنے احباب کے ذریعے "نقوش" کی تمام جلدوں کا مطالعہ کیجئے اور اس میں سے وہ مضامین چھانیے جو کہ صحیح معنوں میں تحقیق کے اعلیٰ معیار پر پورے اُترتے ہوں۔ اس کا پھر ایک خصوصی نمبر شائع کیجئے اور اس کا نام طفیل نمبر رکھیے۔ "نقوش تحقیقی طفیل نمبر" اور اس کی تمام کی تمام قیمت میں ادا کروں گا تاکہ یہ تحقیق کا کام جو ہے وہ بھی جاری رہے اور طفیل صاحب کا نام فقط نقوش ہی کی خاطر نہیں بلکہ نقوش کے ساتھ جو تحقیق کا عمل ہے اس کے ذریعے بھی زندہ رہے۔

میں نے شروع میں جو بگم طفیل صاحبہ کا نام لیا تھا وہ صرف اس وجہ سے لیا تھا کہ کسی محقق، ادیب یا مورخ کا مقولہ ہے کہ ہر بڑے آدمی کے نیچے کسی نہ کسی خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے بگم طفیل کے طفیل کے متعلق کیا تاثرات ہیں جب تک وہ نقوش سامنے نہیں آئیں گے یہ طفیل نمبر ادھورا رہے گا، کیونکہ (مولوی) اشفاق صاحب نے کہا تھا کہ اگر طفیل خود اپنی سوانح عمری لکھ جاتے اور اپنے لیے ایک طفیل نمبر مرتب کر جاتے تو وہ چیز واقعی بلند ہوتی، اب یہ کام تو انہوں نے کیا نہیں۔ اب اس چیز کو لیتے ہوئے میں بگم طفیل کی خدمت میں عرض کروں گا کہ وہ اپنے فرزند ارجمند کی مدد سے اپنے تاثرات ایک ایسے شخص کے متعلق ریتا کر ڈکرائیں جس کے لیے ہم آج پچھلے دو گھنٹوں سے باتیں کر رہے ہیں اور وہ پچاس ہزار صفحات کا مالک ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ایک خصوصی نمبر ایک تحقیقی نمبر ہوگا اور ہر لحاظ سے اچھوتا ہوگا۔

ان الفاظ کے ساتھ میں جاوید طفیل صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور انہیں یہ تقریب منعقد کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اس تقریب کا مزاج تہنیتی بھی ہے اور تعزیتی بھی۔ تہنیتی اس لحاظ سے کہ نقوش کے طفیل نمبر کی یہ تقریب رونمائی ہے اور تعزیتی اس لیے کہ آج طفیل صاحب کی برسی ہے۔ طفیل صاحب جو یادگار نمبر نکالنے کے لیے مشہور تھے آج خود ایک یادگار نمبر کا موضوع ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جو رحمت میں جگہ دے۔ آمین

پاکستان پائسنڈہ باد

کم گو اور شرمیل شخص

ڈاکٹر وحید قریشی

جناب صدر و خواتین و حضرات !

طفیل صاحب کا انتقال میرے لیے ایک ذاتی سانحہ بھی ہے۔ میرے اُن کے تعلقات کا آغاز اُس وقت ہوا جب میں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا تھا اُن کی زندگی کے چار روپ یا چار رنگ میں نے دیکھے ہیں اُس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ مختراً پہلا دور جو کئی برسوں میں محیط ہے اُس میں میں نے طفیل صاحب کو ایک خاموش، کم گو اور شرمیل شخص کے طور پر دیکھا جو دیر آشنا تھا اس لیے اُن ابتدائی چند برسوں میں محض آشنائی کا یا واقفیت کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ بعد میں جب اُنھوں نے تیزی کے ساتھ ادب کا سفر شروع کیا تو اُن کے بارے میں کئی افواہیں بھی پھیلانی گئیں افواہیں تو زندگی بھر اُن کا تعاقب کرتی رہیں کیونکہ ہمارے ہاں دوسرے کی ترقی دیکھتے ہوئے جل جانے کا رواج کچھ زیادہ ہی ہے۔ لیکن طفیل میں ایک خاص کمال تھا جو انھیں تیسرے مرحلے میں لے آیا وہ یہ تھا کہ وہ اپنی لگن میں کام کرتے جاتے تھے اور بہت کم لوگوں کو اپنا حریف جانتے تھے۔ یہ دور محض کم گوئی کا بھی نہیں ہے اور کم آمیزی کا بھی نہیں۔ چنانچہ ادب کی سیاسی بساط پر اُنھوں نے بھی کئی مہرے بڑھائے، ادب کی شطرنج بھی کھیلی اور اُس کی تلخیوں کا سامنا بھی کیا۔ اس کے بعد چوتھا دور آخری بیس برس کا ہے جب اُن کے مزاج میں بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی یہ غالباً سلسلہ یا سلسلہ کی بات ہے جب اُن پر دل کا دورہ پڑا۔ اُس زمانے میں وہ گڑھی شاہو میں رہتے تھے اور وہاں سے سمن آباد کے لاہور ہسپتال میں اُنھیں کچھ دن گزارنا پڑے تھے۔ اس کے بعد سے اُن کی زندگی میں ایک بنیادی تبدیلی آئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب میرا ان کا قریبی ساتھ ہوا۔ یہی وہ دور ہے جب دیگر اصناف کے مقابلے میں تحقیق میں اُن کی دلچسپی بڑھی اور نقوش کی بنیادی روایت ادب کے علاوہ تنقید اور تحقیق بھی بن گئی۔ وہ اس سلسلے میں بڑے سخت تھے، مضامین کی چھان بھٹک میں دوستوں کا لحاظ بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک مدیر کی حیثیت سے اُنھوں نے اس پرچے میں جان ڈالی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی زندگی کا آخری دور اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ادب کی آنے والی نسلیں اُنھیں ہمیشہ ادب کے ایک عمن کی حیثیت سے جانتی رہیں گی۔

اس دور میں جو مذہب کے ساتھ اُن کا لگاؤ تھا وہ ان کے مزاج کا ایک ایسا رنگ ہے جو شروع کے ادوار میں نہیں تھا۔ اسی بنا پر انھیں اس موضوع پر کام کے لیے بے پناہ محنت کرنا پڑی اور ڈاکٹر نے ان کی صحت کے پیش نظر انہیں زیادہ کام کرنے سے منع بھی کر رکھا تھا تاہم یہ چوری چھپے کام کر لیتے تھے۔ انتقال سے کچھ پہلے انہیں ایک

جبری بن باس پر باہر بھی جانا پڑا۔ ملک سے گئے تو وہ صحت کی بحالی کے لیے گئے تھے مگر اس پر بھی انھوں نے کام بند نہ کیا اور سفر میں بھی اپنے منصوبے پر کام کرتے رہے۔ ان کے مزاج کے دو تین پہلو بہت نمایاں تھے۔ ایک تو ان کے مزاج میں ایک خاص طرح کی طنز شامل ہوتی تھی جس کا واروہ بالکل چپکے سے کرتے تھے، خاموشی سے بیٹھے بیٹھے اچانک کوئی ایسا ہلکہ نکلتا جو اپنی کاٹ کر جاتا تھا اور اس کے بعد سُکنے والا دیر تک اپنے زخم سے تازہ رہتا تھا۔

زندگی کے آخری دنوں میں ان کے مزاج میں ایک تبدیلی یہ بھی آگئی تھی کہ جتنی دشمنیاں انھوں نے زندگی میں پالی تھیں ان سب کی تلافی کرنے کی کوشش کی اور ان سب لوگوں سے اپنے تعلقات دوبارہ استوار کیے جن سے جوانی میں لڑائیاں لڑی تھیں۔ ایک چیز وہ کبھی برداشت نہیں کرتے تھے اور آخر وقت تک انھوں نے برداشت نہ کی وہ یہ کہ جو لوگ نقوش کے سلسلے میں مخصوص قسم کی افواہیں پھیلانے کے درپے تھے انھیں انھوں نے کبھی بھی معاف نہیں کیا کیونکہ یہ سلسلہ ان کے مشن کا تھا ان کے مسلک کا تھا اور مسلک میں سمجھوتے کی بات نہیں ہوتی۔ زندگی کے آخری برسوں میں انھوں نے بے تحاشا کام کیا، کام سے ان کی لگن کی بنا پر ہی نقوش کا ہر شمارہ ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

بٹل بٹن لاہور میں نقوش طیف نیر کی منقہ تقریب میں مورخہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء کو پڑھا گیا۔ (ادارہ)

نقوش کے مرشد

جیل جالبی

معزز خواتین و حضرات !

ہر نسل کا نوجوان خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر سے وہ اپنے راستے اور اپنی منزلیں مقرر کرنا ہے۔ میری نسل کا نوجوان جب خواب دیکھتا تھا تو اس میں بڑا مصنف، بڑا شاعر، بڑا صحافی، بڑا موحد یا علم حاصل کر کے بڑا آدمی بننے کی خواہش مضمر ہوتی تھی اور وہ نوجوان خود کو اپنے خواب کی تعبیر کے لیے وقت کر دیتا تھا۔ یہ وہ خواب تھے جن سے معاشرے میں بڑے آدمی پیدا ہوتے تھے اور معاشرہ ہر دم سرسبز و شاداب رہتا تھا۔ آج کا نوجوان بھی بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتا ہے لیکن ان خوابوں میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی آرزو شامل ہوتی ہے۔ کسائش سے معمور زندگی، اور دولت کی ریل پیل۔ یہی آج بڑے آدمی کی پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں آسائش سے معمور بڑے گھروں اور کاروں کی نوکثرت ہے لیکن بڑے آدمیوں کا کال پڑ گیا ہے۔ محمد طفیل مرحوم نے بھی اپنی نسل کے خوابوں کے عین مطابق، بڑا مدیر اور بڑا ناشر بننے کا خواب دیکھا اور ساری عمر اسی خواب کی تعبیر میں لگا دی اور پھر یہ ہوا کہ محمد طفیل کو ساری دنیا زمانے نے اپنے دور کا سب سے بڑا مدیر تسلیم کر لیا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے اور اسی کارنامے سے ان کا نام نہ صرف آج روشن ہے بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی روشن رہے گا۔

محمد طفیل کو یہی اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ نوجوان تھے۔ سیدھے سادے۔ خاموش طبع۔ کم آئین لیکن فلسفہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے غم گسار۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی نظم ”پن چکی“ کی طرح دن رات کام میں لگے رہنے والے۔ دُھن کے پورے کام کے پتے۔ نقوش کے مرشد بھی اور نقوش کے مرید بھی۔ یہی کام تھا۔ یہی مقصد حیات تھا۔ کثرت ذکر سے دونوں ایک ہو کر ایک دوسرے میں گم ہو گئے محمد طفیل کا ذکر کیجیے تو وہ محمد نقوش کا ذکر ہوگا، محمد نقوش کا ذکر کیجیے تو وہ محمد طفیل کا ذکر ہوگا۔ تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگم تو دیگر کی۔ اسی لیے دونوں اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جس طرح میاں بشیر احمد اور ہمایوں، مولانا صلاح الدین احمد اور ادبی دنیا، نیاز فچوری اور نگار، شاہد احمد ہلوی اور ساقی، حکیم یوسف جلی ریزنگ نیال۔ یہ ادبی جہاد کا عظیم دور تھا اور محمد طفیل اور نقوش اسی روایت کی آخری کڑی تھے۔

”نقوش“ نے کسی فکری یا ادبی تحریک کو جنم نہیں دیا لیکن اردو ادب کے بہترین شہ پاروں کو گھر گھر سے ہٹل ملٹن لاہور میں نقوش محمد طفیل نمبر کی تقریب منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

پہنچا کر فروغِ ادب کی عظیم خدمت انجام دی۔ اس میں معاصر ادب بھی شامل ہے اور کلاسیکی ادب بھی۔ نقوش کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ محمد طفیل اسے معیاری مواد سے مزین کر کے حسنِ ترتیب اور ذوقِ جمال کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جو پڑھتا دانتا اور پھر سنبھال کر محفوظ کر لیتا۔ اسی لیے نقوش وہ واحد رسالہ تھا جو پڑھا بھی جاتا تھا اور سینت کر سنبھال کر رکھا بھی جاتا تھا۔ نقوش کی شہرت کا راز یہ بھی تھا کہ محمد طفیل نے ایسے معیاری اور بلند پایہ خاص نمبر شائع کیے کہ جو مواد کے اعتبار سے منفرد اور حسنِ ترتیب کے اعتبار سے بے مثل تھے اور جن کی مجموعی تعداد ۴۳ ہے۔ محمد طفیل معیاری ادب کا اتنا بڑا گلاس لبالب بھر کر پیش کرتے کہ قارئین ادب کے ذوق کی پوری طرح آسودگی ہو جاتی۔ غزل نمبر، شخصیات نمبر، منو نمبر، مکاتیب نمبر، شوکت تھاغوی نمبر، آپ بیتی نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر اور آخر میں رسول نمبر وہ خاص شمارے ہیں جو اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں اور جن کا ڈسکا سارے برعظیم میں بیچ رہا ہے۔

محمد طفیل مرحوم نے نقوش میں بلند پایہ تحقیقی مقالات شائع کر کے جدید اور قدیم کی حد فاصل کو پاٹ دیا۔ اس سے ایک طرف جدید تحقیقات کی روشنی نے علمِ وادب کے حلقوں کو منور کیا اور دوسری طرف خود نقوش نئی تحقیق کا حوالہ بن گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ حوالے پھیلتے اور بڑھتے جائیں گے اور انہیں سوالوں کے تعلق سے نقوش کی اہمیت بھی قائم و دائم رہے گی۔ نقوش اور دوسرے علمی ادبی رسالوں میں یہی بنیادی فرق ہے اور اسی لیے نقوش نے اور پرانے دونوں حلقوں میں یکساں مقبول تھا اور مقبول رہے گا۔

محمد طفیل کی شخصیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ کم گو تھے۔ یہ خصوصیت اس نسل کے دور کے ادیبوں کی ایک عام مشترک خصوصیت تھی۔ اس دور کے ادیب کم بولتے اور زیادہ لکھتے تھے۔ آج کے دور کے ادیب کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور پر زیادہ بولتے اور کم لکھتے ہیں۔ زیادہ بولنے میں فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ رنگ چوکھا آتا ہے اور کم بولنے اور زیادہ لکھنے میں نقصان یہ ہے کہ فائدے کا پتا بہت دیر میں چلتا ہے۔ محمد طفیل کے نفع نقصان کا پتا بھی اسی لیے دیر سے چلا اور اسی لیے وہ مرنے کے بعد آج بھی زندہ ہیں۔

محمد طفیل کے نام، کام اور شخصیت کے ساتھ مثنوی مولانا روم کی وہ حکایت مجنوں یاد آتی ہے جن میں ایک صحرا نورد نے مجنوں کو تنہا بیٹھے اور اپنی انگلیوں کے قلم سے ”ریت پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا“ صحرا نورد نے مجنوں سے پوچھا کہ یہ خط کس کے نام لکھ رہے ہو۔ ابھی تیز ہوا کا ایک جھونکا آئے گا اور سب کچھ مٹا کر رکھ دے گا۔ مجنوں نے جواب دیا،

گفت شرح حسنِ یسلی می دہم
خاطر خود را سلی می دہم
تا چشمِ جبر سے از جام او
عشقِ نازی می کھم با نام او

یہی پتے عاشق کی پہچان ہے اور محمد طفیل، خدا انہیں کروٹ کروٹ چھین دے، ایک ایسے ہی عاشق تھے جو ساری عمر اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ادب سے عشق بازی کرتے رہے۔ ان کے کام کی خوشبو آج بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور ہمارے مشامِ جاں کو معطر کیے ہوئے ہے۔ شاید جرات نے یہ شعر ایسے ہی عاشقوں کے لیے کہا تھا:

جو مرض تھا پڑا جاں بہ لبِ خیر اور کچھ نہیں اس کی اب
مگر اتنا کہتے ہیں لوگ سب کہ بڑا یہ نیک خصال تھا

معزز خواتین و حضرات!

بس آج کی شام مجھے آپ سے یہی کہنا تھا۔

شکریہ!

محمد طفیل کی یاد میں

ڈاکٹر مختار الدین احمد (بھارت)

مجھے بہ دیکھ کر بہت حوصلہ ہو رہی ہے کہ آج محمد طفیل مرحوم کی پہلی برسی پر اردو دنیا نے ایسا ایک مرض پورا کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ایسا مرض جس کی تکمیل ضروری تھی۔ یعنی بلند پایے بہ ایک باوقار تقریب کا انعقاد جس میں محمد طفیل مرحوم کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے اور جس میں صدر مملکت، رسالہ نقوش کے محمد طفیل عنبر کی رسم اجرا دافرا رہے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے رسالہ نقوش کے شخصیات میں پر اظہار جہاں کرنے ہوئے طفیل مرحوم کو لکھا تھا۔ ”آپ کا ہر مبرا خاص ہوتا ہے مگر تنقید کا ہر سب پر بازی لے گیا۔ اب صرف ایک ہی شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب غیب ہے۔ اس کا کہنے والا ایک نہیں سو سنا کسی ہونے، شب میں کسی روز وہ پورا ایک ہی شخصیت بن چکے“ عجیب و غریب شخصیت سے مولوی صاحب کی مراد محمد طفیل سے بھی۔

اس مبارک کام کی ابتدا تو آج سے چار سال پہلے اردو کے مشہور اُستاد اور مصنف طفیل صاحب کے دوست اور یہ و فہمہ سند معین الرحمن صاحب نے محمد نقوش مرتبہ اور شائع کر کے کر دی تھی۔ آج کے جلسے کا انعقاد اس کام کی تکمیل کی طرف دوسرا قدم ہے۔ جب محمد طفیل کے بارے میں نقوش کا ضخیم مہر طبع کر کے صدر مملکت کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، اور اس طرح بابائے اردو کی ایک بسارت کی تکمیل ہو رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ نقوش کا موجودہ شمارہ طفیل مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کے ادبی اور عملی کارناموں کو رکھنے کے لیے ہر طرح مفید ثابت ہو گا۔

آج مجھے اس محرومی کا احساس ہو رہا ہے کہ مرحوم سے زیادہ ملنے اور ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کی سہولت سے محروم رہا۔ ان سے گفتگو کی عمر تو وہی ہے جو رسالہ نقوش سے ان کی وابستگی کی ہے، لیکن ملاقاتیں ان سے صرف چند ہوئیں۔ ابتدا میں وہ کم کم کھلے، اندازہ ہوا کہ وہ طبعاً کم آمیز اور کم گو ہیں۔ ساتھ ہی ایک مغربی مفکر کا مغولہ یاد آیا کہ زیادہ باتیں کرنے والے مشیر لوگ کارکردگی کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں جب کہ خاموش طبیعت کے لوگ یادگار کارنامے انجام دے جاتے ہیں۔ طفیل صاحب خاموشی سے ایک گھنٹے میں بیٹھے اپنے کام میں لگے رہے اور ملندی کی منزلوں تک پہنچ کر انھوں نے دم لیا۔ انھوں نے خصوصی شماروں کی اشاعت میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا اور ضخیم، مضبوط معیاری شمارے شائع کر کے ایسی مثال قائم کر دی کہ اس کی پیروی کی آرزو تو کی جا سکتی ہے۔ بروی نہیں کی جا سکتی۔

محمد طفیل ایک جامع الصفات انسان تھے، انھوں نے اپنی زندگی میں متعدد کارنامے انجام دیے، سوال یہ ہے کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کس ہے؟

وہ ممتاز ناشر تھے، بے مثال آرگنائزر تھے، کامیاب ایڈیٹر تھے، زبردست انشا پرداز تھے اور منفرد قسم کے خاکہ نگار۔ ان کی تنگنہ و شاداب تحریروں نے ہمہ تن ہمارے دلوں پر ایک گہرا نقوش چھوڑا ہے۔ خاکہ نگاری ان کا حاسن میدان تھا، جس شخصیت پر انھوں نے قلم اٹھایا اُسے زندہ جاوید بنا دیا۔ ممنوع اور اصول کی مطابقت و ہم آہنگی کے کہتے ہیں۔ دیکھنے کے لیے ان کے لکھے ہوئے خاکوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

لیکن کہا جاسکتا ہے کہ ان صفات سے کسی نہ کسی درجے میں کچھ اور لوگ بھی ان کے عہد میں منصف میں اور آئندہ بھی منصف ہوتے رہیں گے۔ کامیاب ناشر بھی پیدا ہوں گے اور ایڈیٹر بھی۔ اسا پرواز بھی اور خاکہ نگار بھی۔ میری مایہ نازائے میں جو چیز انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور جسے ان کا اصل کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے وہ نقوش کی ادارت اور اس کی خصوصی اشاعتوں کی معرکہ آرا ترتیب و تدوین ہے۔ اس معاملے میں محمد طفیل بلاشبہ منفرد ہیں۔

مسویں صدی کی ابتداء میں رسالوں کے خصوصی نمبر شائع کرنے کا رواج نہ تھا۔ برنگ سال، عالمگیر، سناہکار، ادبی دنیا، ہماہوں کے سالانہ نمبر شائع ہوا کرتے تھے بعض رسالے عبدغفر نکال بیٹے تھے۔ بناؤ نسخہ پوری نے خصوصی نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ بخار کا ایک شمارہ انھوں نے غالب کے لیے مخصوص کیا۔ پھر مصحفی نمبر شائع ہوا، جنہیں نذر و منزلت کی نگاہ میں اب بھی تلاش کرتی ہیں۔ برنگ خیال کا انبال نمبر نکلا اور جوہر دہلی کا عبدالحق نمبر ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر۔ بر غالب۔ برہیل خصوصی شمارہ نکلا، جس میں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے ممتاز ماہرین غالبیات نے حصہ لیا تھا۔ بعض دوسرے رسالوں کے بھی خاص نمبر شائع ہوئے لیکن مختصراً یہاں پر۔

محمد طفیل نے ۱۹۵۱ء میں نقوش کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی اور وہیں سے نقوش کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ انھوں نے کوئی سو سو شمارے اس کے شائع کیے جن کے اوراق کی مجموعی تعداد بیس ہزار صفحات سے زائد ہوتی ہے۔ اہل قلم کے ایسے تعاون کی مثال تسک سے ملے گی خصوصی شماروں کی ابتداء انھوں نے انسان نمبر سے کی جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا، پھر تو خاص نمبروں کی گویا پلینا شروع ہو گئی۔ نمبر بر نمبر شائع ہونے لگے۔ رنزل نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، مکاسب نمبر، خطوط نمبر، طنز و مزاح نمبر، بطرس نمبر، ادب عالیہ نمبر، لاہور نمبر، شوکت بخاری نمبر، آپ بیتی نمبر، جگ نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر، انیس نمبر، ادبی معرکہ نمبر اور عصری ادب نمبر نقوش کے یہ نمبر اتنے وسیع ثابت ہوئے کہ انھوں نے حوالے کی کتاب جیسی اہمیت حاصل کر لی۔

محمد طفیل کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک مثالی ایڈیٹر تھے جو اپنے سچے ایسے منتقد شمارے چھوڑ گئے جو ادب کا حصہ بن گئے۔ نقوش کے بعض شماروں کے متعلق ہم بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ذکر کے بغیر ادب کی تاریخ مکمل نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ شمارے ہیں جن کا اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ذکر آئے گا۔

میں نے ایک بار جب لاہور میں ان کے یہاں مقیم تھا ان کے حالات دریافت کیے اور ان کی کامیابی کا راز جاننا چاہا۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کے چند فقرے مجھے یاد آتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

”اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے مجھے کچھ شرم آتی ہے بلکہ بسا اوقات وحشت ہوتی ہے۔ جہاں تک میری زندگی کی کامیابی کا

تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا میاب ہے اور مجھے اس کی خوشی ہے۔ میں نے اب تک کوئی کام ایسا انجام نہیں دیا ہے، جسے اپنا کارنامہ کہوں۔ جو کام میں نے کئے ہیں، ان میں کچھ کام مجھے پسند آئے، کچھ نہ آئے، لیکن کوشش برابر جاری رکھی اور خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہی۔“

اس خوب تر کی تلاش نے انھیں رسولؐ نمبر کی ترتیب کی طرف متوجہ کیا اور اس تلاش میں انھیں قرآن نمبر اور خدا نمبر مرتب کرنے کا

خیال پیدا ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انھیں بڑی محبت تھی۔ رسولؐ نمبر کے مہلات میں طلوع کے عزمون سے جو شذرات انھوں نے لکھے ہیں انھیں ٹھہرے تو امداد ہر گاہ کہ وہ محبت رسولؐ میں کھتے اور کیسے ڈوبے ہوئے تھے۔ رسولؐ نمبر کے دوران ترتیب ان کی تو حبت رسولؐ پاک پر جو کتاب نازل ہوئی تھی اس طرف ہوئی چنانچہ انھوں نے قرآن نمبر مرتب کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے مضامین جمع کرنے لگے۔ اپنی آخری ملاقات (مئی ۱۹۸۶ء) میں وہ کہنے لگے۔ قرآن نمبر کے جمع شدہ مضامین دیکھ کر مجھے اس ہستی کا خیال آیا کہ جس نے اپنے بد سے اور آخری رسولؐ پر قرآن نازل کیا تھا۔ اب میرا خیال ہوا کہ کیوں قرآن نمبر کی پہلی جلد کو خدا نمبر کے نام سے شائع کروں۔ اس طرح ان کا دماغ نیت نئے ارادوں اور نصورات کے جائے بننا رہا اور نئے خا کے بننا رہا۔

ادب سے اسلامیات کی طرف محمد طفیل کے ذہنی سفر کے متعلق فیاں آرائیاں بھی ہوئیں۔ مجھے تو ان کا وہ ادارہ یاد آ جا جس میں انھوں نے باری تعالیٰ کا یہ ارشاد اصل کیا ہے۔

(جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اسے اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے)

اور بے اختیار دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ اے خدا مرحوم کی نذر کو شرف قبولیت عطا فرما۔ انھیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازا اور اپنے وعدے کے مطابق آخرت میں لگائی ہوئی کھیتی کو ترقی دے اور ساتھ ہی ساتھ اس دنیا میں بھی ان کی لگائی ہوئی کھیتی کو شاداب رکھ۔

ان کی لگائی ہوئی کھیتی کی سر بلندی اور شادابی مجھے اس کے بہرہ صفت بیٹے عزیز بی جاوید طفیل کے ہاتھ اور روپ میں فروزاں اور فراواں دکھائی دیتی ہے جس خوش دغوبی اور خوش مامنی اور جس درجہ مستعدی مسنق مزاجی اور وضع داری کا پچھلے ایک برس میں جاوید طفیل نے ثبوت فراہم کیا ہے میں اس میں محمد طفیل مرحوم کے ارادوں اور عزم کی بشارت پاتا ہوں۔ باپ کے ادبی ورثے اور مفید سلسلے کو اس طرح پانا، سنبھالنا اور نباہ لینا، اس حوالے سے بھی شاید طفیل مرحوم اپنی خوش نصیبی میں بیکتا دکھائی دیں، یہ ہم سوں کے لیے سرور و سکون کا باعث بھی ہے اور قابل رشک بھی۔

بٹن ہٹل لاہور میں منعقدہ نقوش طفیل نمبر کی تقریب رونمائی پورنہ ۹ جولائی ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

اچھا آدمی سچا ادیب

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

جناب صدر، خواتین و حضرات !

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ تمجہ ہم ایک ایسے اچھے آدمی اور سچے ادیب کی یاد تازہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ادب اور اہل ادب کے لیے وقف تھا۔ پھر بھی زندگی، خواہ کسی کی ہو، کتنی ہی خوبصورت اور بامقصد کیوں نہ ہو، مختصر و بے ثبات ہے، اتنی بے ثبات کہ اگر اس کے اثبات کے بارے میں سوال کیجئے تو سوال کرنے والے کی سادہ لوحی پر فطرت کے بے جان عناصر کو بھی ہنسی آ جاتی ہے۔ میر کے لفظوں میں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات

گلی نے یہ سن کر تبستم کیا

لیکن زندگی کے مقابلے میں زندگی کا حُسن کارا نہ عکس یا اظہار جسے فن کہہ لیجئے بے کران و لازوال ہے۔ آدمی مرجاتا، نام زندہ رہتا ہے۔ واقعات بھلا دیے جاتے ہیں۔ واقعات کی تہ سے ابھرنے والا فن زندہ رہتا ہے۔ پھر یہی فن ایک ایسی کہانی کو جنم دیتا ہے جسے ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

سُنتے اور کہتے رہتے ہیں۔ اور آج ہم ایک ایسی ہی کہانی سننے اور بیان کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

فن کی ایک شاخ کا نام ادب ہے اور ادب کا دوسرا نام فنِ لطیف ہے۔ فنِ لطیف کی اور بھی شاخیں ہیں مثلاً مصوری، نقاشی، مجسمہ سازی اور فنِ تعمیر۔ لیکن ادب ان سب سے لطیف تر ہے۔ اس میں کثافت کا عنصر برائے نام یعنی صرف حرف و صوت کی حد تک ہوتا ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ:

لطف بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

(غالب)

لہ "نقوش" کے "طفیل نمبر" کی تقریب منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء بمقام لاہور کی تقریر، جسے بعد میں قلمبند کیا گیا۔

تبھی تو اسپیں کی مسجدِ طہ سلموں کے لیے ایک تاریخی نشان کی حیثیت رکھتی ہے اور علامہ اقبال کی مسجدِ طہ ایک زندہ جاوید عالمی شہکار تھی۔ لیکن اس نوع کی صورت گری محض زورِ بازو سے ممکن نہیں ہوتی اس کے لیے غالب کے لفظوں میں دیدہ و دل گہ اختہ اور علامہ اقبال کے لفظوں میں ”خونِ جگر“ درکار ہوتا ہے۔
نقش میں سب نامِ خونِ جگر کے بغیر

خونِ جگر کی یہ سرخی، اس ادیب کی تحریروں اور اس کے اصفیہ میں صاف نظر آتی ہے جس کے طفیل میں آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ حسن اتفاق سے اس ادیب کا نام بھی طفیل ہے۔ طفیل نے اپنے خونِ جگر سے صرف ایک نقش نہیں بلکہ ”نقوش“ کو روشن رکھنے کا کام لیا ہے۔ طفیل کا نقوش، اس کے خونِ جگر کی لالی سے آج بھی شاداب و سرخروہ اور طفیل صاحب، نقوش کے حوالے سے زندہ جاوید ہیں اور ہم ”زندہ جاوید“ کا ماتم نہیں کرتے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ”نقوش“ کو تازہ ولولوں کے ساتھ زندہ رکھے اور اس میں نئے رنگ بھرنے کے لیے محمد طفیل کے بڑے صاحبزادے جاوید طفیل، ہمارے، میان موجود ہیں۔ میں ان کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ ان کے وصلوں کو سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے میراتِ پدر کی قدر و منزلت کو پہچانا اور اس کے تحفظ و توسیع کو ضروری جانا۔ مجھے ان کی ذہانت اور علمی سوجھ بوجھ سے، کامل یقین ہے کہ وہ ”آنچہ پدر نتواند لیر تمام کند“ کے قول پر پورے اتریں گے اور باپ کے خوابوں کی تعبیر بن جائیں گے۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ادب اور ادیب کی اس جانشینی اور ”نقوش“ کی پاسبانی کو بہت سے لوگ شغلِ بیکاراں قرار دیں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو علامہ اقبال کے پیغام کے برعکس زندگی کو ”پیمانہ“ امروز و فردا“ ہی سے ناپیں گے۔ ہر بات نمود و زبان کے حوالے سے کریں گے۔ اخوت، محبت، درد، مندی، غم گساری، شرافت و انسانیت اور دوسرے جذباتی رشتوں کو بالائے طاق رکھ کر عقلِ عیار ہی کو اپنا رہنما بنائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو یہ بھی نہیں جانتے کہ جو محسوس نہیں کر سکتا وہ دیکھ بھی نہیں سکتا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے یاد رکھیے کہ ادب اور ادیب کی دنیا، اس حیوانی سطح سے بہت بلند اور بہت مختلف ہوتی ہے جس میں جسم پروری ہی کو سب کچھ خیال جاتا ہے۔ ادیب صرف عقل و جسم کی سطح پر نہیں احساس اور جذبے کی سطح پر بھی جینے پر اصرار کرتا ہے اور اسی طرزِ احساس کو اصل زندگی جانتا ہے۔ اس کا یقین ہے کہ ادب اساسی طور پر علم و فکر کے پشتار سے نہیں جذبات کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ حکمت و دانش کی یورش سے نہں جذبوں کے ارتعاش سے وجود میں آتا ہے۔

غالب کے لفظوں میں

مجھے ارتعاشِ غم نے پیئے عرضِ حالِ غشی
ہو بس غزلِ سرائی پیشِ فسانہِ خوانی

یہی بار بار جی میں مے اُسے ہے کہ غالب
کریں خواں گھنٹگو پر دل و جاں کی میہانی

”خواں گھنٹگو“ پر دل و جان کی میہانی کا استعارہ دراصل ارتعاش جذبات کو حرف و صوت سے ہم آہنگ کرنے کا اشارہ ہے۔ جذبے اور حرف و صوت کا ہم آہنگ ہونا ایک لطیف انظاری اسلوب کو جنم دیتا ہے۔ یہ اسلوب ایک طرف خود اپنے وجود کے لازوال ہونے کی صامت دیتا ہے دوسری طرف حیوانی مطلق کو چیراٹی اور جبلی سطحوں سے بلند کر کے روحانیت اور انسانیت کے منصب پر فائز کرنا ہے۔ اسی منصب پر پہنچ کر انسان کی زندگی اصل کی نفس یا نقل کی نقل نہیں رہتی، بلکہ اصل کو اس کی جملہ صداقتوں اور کج ادائیگوں کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ سبھی نو ارتعاش جذبات سے عاری صاحبانِ علم و فکر کے لیے گلاب کا پھول صرف ایک قسم کا پھول ہے لیکن احساس اور جذبے کی سطح پر جینے والوں کے لیے، گلاب صرف ایک پھول نہیں اور بھی بہت کچھ ہے اگر ایسا ہونا تو اس طرح کی باتیں نہ کہی جاتیں کہ ”اے گل نتو خور ستم تو بوسے کسے داری“۔

یہی وہ جذباتی صداقتیں اور آرزو مندیاں ہیں حوالہ دل کے نزدیک منطقی خواہشوں اور صداقتوں سے زیادہ حیات افروز و کارگشا ہیں۔ یہ وہ سیاحیاں ہیں جو زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کی دستگیری کرتی ہیں۔ علم و فضل اور فکر و دانش کے قافلے کو آگے بڑھاتی ہیں، ذہن انسانی کی ایجادات و اختراعات کا وسیلہ بنتی ہیں۔ ایمان، عقیدہ، نظریہ، اخوت، محنت، انسانیت، تہذیب، تمدن، شائستگی، سچائی، دردمندی اور غم گساری کی جہلمہ حیات آفرین اقدار، انہی جذباتی صداقتوں کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں۔ یہی صداقتیں ہیں جو ایک محبت و وطن شہری کو ملک و ملت کے تحفظ کے لیے سینہ سپر رکھتی ہیں۔ ایک سپاہی کو جام تہادت نوش کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال انہی صداقتوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ جس وقت تک یہ صداقتیں کسی قوم میں زندہ رہتی ہیں اسی وقت تک وہ قوم بھی ممتاز و فعال رہتی ہے۔ ان صداقتوں کی وحدت و مرکزیت کا نام دل ہے۔ دل کا مرجانا عملاً آدمی کا مرجانا اور آدمی کے وجود کا ختم ہو جانا ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی لیے کہا ہے کہ

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عجارت ہے تیرے جینے سے

اور علامہ اقبال نے اسی بنیاد پر یقین فرمائی ہے کہ

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کس کا چارہ

اس لیے جاوید میاں! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ادب اور ادبی کا وئیس کا ربیکا راں نہیں ہے۔ یہ انسان اور انسانیت کے سر پر امن و آشتی کی چادر ہے۔ ثقافتی زندگی کا جگمگانا نشان اور شائستگی قلب و ذہن کی ہیچان ہے۔

اس پہچان اور نشان کو ٹھم نہ ہونے دینا۔ ادب جیسا روح پرور اور عالمگیر وسیلہ حیات، آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ یہ وسیلہ، انسان کو ہر قسم کی تنگ نظری و تعصب سے نجات دلاتا ہے۔ رنگ و نسل اور مذہب و قومیت کے دائروں سے نکال کر وسیع تر انسانی دائرے میں لے جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو علامہ اقبال جیسا شاعر جس کا یقین و پیغام یہ ہو کہ

پہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ دوست

اگر باہر رسیدی تمام بُو لبی ست

وہ کرشن جی، ٹلسی داس، گرو مانک، گوٹے، تسکپیڈر، برگسان اور قرۃ العین طاہرہ کی توصیف میں رب اللسان نہ ہوتا۔

ادب کی اسی معنوی وسعت و بلند قامتی سے قطع نظر، اس وقت دنیا میں جتنے اسالیب اظہار کا رفرما ہیں ان میں ادب واحد اسلوب اظہار ہے جو لطیف سے لطیف اور کثیف سے کثیف خیالات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ ہزاروں باتیں جو ہونا گفتمے ہیں اور جو محض فسادِ خلق کے خوف سے آدمی کسی اور طرح نہیں کہہ سکتا ادب کی معرفت کہی جاسکتی ہیں۔ ادب، کنایات و استعارات کی مدد سے سماج دشمن عناصر اور جاہر حاکموں پر ضرب لگاتا رہتا ہے۔ مضروب تملاتے رہتے ہیں۔ لیکن الفاظ کے تر بہ نہ معنے کے سبب سچے اہل ادب کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ خود ”نقوش“ کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ اس پر پابندیاں لگائی گئی ہیں، کاپیاں ضبط کی گئی ہیں اور پریس کو ضبط کرنے کی دھمکی دی گئی ہے، لیکن ”نقوش“ بطور خورشید جیسا رہا ہے، ادھر ڈوبتا ادھر نکلتا رہا ہے۔

جاوید میاں! قلم کو صرف لکڑی یا لوبہ کا ایک ٹکڑا سمجھنا غلطی ہوگی۔ یہ ایک ادیب کا سب سے قیمتی اور دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہے۔ اسے ہاتھ میں لیے رہنا، اسی ہتھیار سے ہر بدی، ہر ظلم، ہر بد صورتی، ہر زیادتی، ہر سماجی نا انصافی اور معاشرتی نا ہمواری کے خلاف آواز بلند کرتے رہنا۔ ہاتھ کو قلم ہی کیوں نہ بنانا پڑے جنوں کی حکایاتِ خوں چکان لکھتے رہنا۔ باپ کے بلند کیے ہوئے نشانِ اقتیاز کو جھکے نہ دینا۔ حالات کہتے ہی ناسازگار کیوں نہ ہو جائیں باپ کے روشن کیے ہوئے نقوش کو مدھم نہ ہونے دینا، اُنہیں روشن تر بناتے رہنا۔ ایسا کرنے سے باپ کی رُوح خوش ہوگی اور خود بھی اُمر ہو جاؤ گے۔ موت آئے گی لیکن مار نہ سکے گی، خالی ہاتھ جائے گی، پھر بھی کوئی ڈرائے دھمکائے تو خوف زدہ نہ ہوتا۔ نقوش کے مدیرِ اول احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر سنا کر آگے بڑھ جانا کہ :

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

نقوش کا طفیل نمبر

اشفاق احمد

زندگی کی اس طویل مدت میں طفیل صاحب کے ساتھ کوئی اڑتیس برس کا یا رانہ رہا لیکن اس کے اولین حصے میں، یعنی پہلی دہائی کے آخری سالوں میں (یا اس سے بھی قدرے بعد) پورے مین برس تک ان سے کچھ خفگی رہی، خفگی کیا اچھی خاصی ناراضگی رہی۔ اچھی خاصی ناراضگی ان معنوں میں کہ ان کے ساتھ سلسلہ کلام بند رہا۔ اس سرسری کچھ رقعہ بازی البتہ ہوئی لیکن ان کا مضمون بھی واحد تھا کہ مہربانی فرما کر مجھے خط نہ لکھا کریں اور اس خط و کتابت کو طول نہ دیں۔ میں نے تو اس پر سختی سے عمل کیا لیکن طفیل صاحب خطوط نویسی سے باز نہ آئے اور ہر بات کی باقاعدہ اطلاع دیتے رہے۔ اس دورانیے کا سب سے مشکل وقت وہ ہوتا تھا جب گرمیوں میں ان کی آم پارٹی کا دعوت نامہ آتا تھا اور مجھے اس میں شرکت کرنا پڑتی تھی۔ میں ان سے بات نہیں کرتا تھا صرف آم کھانا تھا وہ بھی مجھ سے بات نہیں کرتے تھے صرف کاٹ کاٹ کے آگے رکھے جاتے تھے۔ میں چونکہ ان متکبر لوگوں میں سے ہوں جو اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا کرتے اس لیے میں نے تجدید کلام میں پہل نہ کی۔ وہ چونکہ ماننے والے لوگوں میں سے تھے اس لیے ایک روز میرے گھر آکر سارا قصور اپنے ذمے ڈال کر مجھے مناکر چلے گئے۔ میں چونکہ ظالموں میں سے ہوں اس لیے آخر دم تک قصور وار انہی کو گردانتا رہا۔ اپنی طرف سے معافی مانگنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور وہ ہمیشہ کے لیے سلسلہ کلام بند کر کے چلے گئے۔ اب جو نقوش کا طفیل نمبر نکلا ہے تو خیال آتا ہے کہ ہمارے درمیان میں سے کتنا بڑا آدمی چپ چاپ آگے چلا گیا۔ یہ چپ چاپ آگے چلے جانا طفیل کے مزاج کا بنیادی خاصا تھا۔ وہ زندگی میں بھی جب سب لوگوں سے آگے نکلا ہے تو اسی طرح خاموشی سے اور نرم مزاجی سے آگے نکلا ہے۔ ڈھول بجا کر اور چھنج ڈال کر اور لڑائی کا کہ آگے نہیں نکلا، ساتھ ساتھ رہتے ہوئے ہی ہم سب سے زیادہ کامیاب ہو گیا اور ہم میں سے کسی پر بھی بوجھ نہ پڑا۔ دراصل ترقی اور کامیابی محمد طفیل کا وہ لباس کتنی جیسے وہ پہن کر ہی سو جاتا رہا۔ اس کی استری ٹوٹی رہی اور اس پر شکنوں اور سلوٹوں کے اتنے گہرے نشان پڑتے رہے کہ حلقہ یاران میں ہم سب اس کے مقابلے میں زیادہ کلفت یافتہ رہے۔ اگر آپ نے کبھی میجر کے بیٹ مین کو صاحب کی وردی سائیکل پر لاتے دیکھا ہو تو آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو سکتی ہے کہ بیٹ مین کا بایاں ہاتھ سائیکل کے ہینڈل پر ہوتا ہے دائیں ہاتھ میں ہینگر کا سوالیہ نشان پکڑا ہوتا ہے۔ ہینگر پر کلفت شدہ وردی ہوتی ہے۔ وردی سر سے بلند، بلکہ سارے ٹریفک سے بلند ہوتی ہے۔ پہنی میجر صاحب کو ہوتی ہے لیکن

سیسہ بیٹ میں کا اکڑا ہوا ہوتا ہے آدھا پیڈل مارتا ہے اور پورے پیڈل والوں کا رستہ کاٹ کے BEE LINE بنانا ہوا آگے نکل جانا ہے۔۔۔ اعر از سارا طفیل کا اپنا ہوتا تھا لیکن عزت میں عطا کئے بنانا تھا۔ کام وہ کرتا تھا نام سارا چاہتا تھا۔ میں نے اس حبیباً عجیب و غریب آدمی آج تک نہیں دیکھا، پڑھا ضرور ہے۔ لیکن پڑھے ہوئے میں اور ملے ہوئے میں بڑا فرق ہے۔

ہمت اور کوشش ایسی جگہ جدوجہد اور سعی کا اپنا ایک مقام لیکن یہ کامیابی کے ضروری عنصر نہیں ہیں۔ اس دنیا کے کروڑہا انسان السرزاک کے جی کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس وقت زندہ میں ایک چھوڑ دو دو تین تین السریلے سرنے میں لیکن کامیابی ان سے انہی تک کو سول دور ہے۔۔۔ جس طرح ایک اسلی درجے کی منتظم بوی کی سنبھال نے رکھی ہوئی چیر کوڈ سوڈا منسلک ہے اسی طرح یہ راز پانا بھی بہت مشکل ہے کہ کامیابی حاصل کر لے کا فارمولا کیا ہے، بس جسے اللہ دے۔۔۔ اس معاملے میں طفیل مرحوم بہت ہی خوش نصیب تھے اور اس عطا کو ابھی طرح سے سمجھتے تھے۔ کہتے تھے میں کوشش، محنت، جدوجہد، مشقت بائیں ہیں کرنا بس ہمت نہیں بارنا۔۔۔ میں نے پوچھا وہ کون، کن لگا ہمت چھوڑ دینے سے روت یر خیریاں بڑ جاتی ہیں، مجھے جہرے کی جھریاں قول میں لیکن روح کی جھریاں میری بڑا ست سے باہر کی چیز ہیں۔

جذبہ کس پہلے میں ایک بزرگ سے ملنے چو 'سیدن شاہ' کہا تو پتا چلا کہ اس وقت سادہ صاحب اپنے مقبرے میں ہوں گے۔ میں جو کتاؤ اسوں نے بتایا کہ شاہ صاحب نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں ہی بنالیا ہے اور اب اپنی قبر میں ان کے صحن و سام تلاوت کیا کرتے ہیں۔ اسی زندگی میں اپنی لحد کے اندر ان کو ابے مستقبل کا راستہ طے کرنا پڑے مضبوط لوگوں کا کام ہے۔ ان کو اپنے انجام کا علم نہ ہوتا سی ہے، انجام کے انجام کی آگہی وہ خود استوار کر لیتے ہیں۔۔۔ لقوت کا طفیل نمبر سم لے طفیل کی غیر موجودگی میں تیار کیا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ کچھ نہیں ہے تو نمبروں والے محمد طفیل کے پردوں میں ہوا کرتا تھا۔ اگر کہیں محمد طفیل کو اپنی زندگی میں طفیل نمبر کا لے کا خیال آ جانا اور وہ حقیقت کی لحد میں اتر کر تلاوت وجود کی بزیات ضرور بہم کرتے۔ پھر وہ صحیفہ اردو ادب میں حتیٰ سچ اور خود احتسابی کا پہلا جزو ہوتا جس پر آئندہ آپ سیکھوں، خود نوشت سوانحوں اور MEMORIES کی مضبوط بنیاد استوار ہوتی۔ لیکن جبر بہ بھی اچھا ہے کہ ہم نے نکالا ہے اور اُس شخص کے حوالے سے ہے جس نے نمبروں کو ایک سی فہم، ایک سی شخصیت، پورا وجدان اور TOTAL GEOTAL عطا کیا۔

شکریہ !

بیادِ مرحوم

رشید حسن خاں

طفیل صاحب اور رسالہ 'نقوش' ایک ہی وجود کی دو جہتیں ہیں۔ ایک کا نام لیا جائے تو دوسرے کی یاد خود بخود آجائے گی۔ ان دونوں کے سلسلے میں کہنے کے لیے ضروری باتیں تو بہت سی ہیں۔ مگر اس جلسہ یادگار میں تفصیل کی کجائش نہیں، یوں بہت اختصار کے ساتھ صرف ایک بات عرض کی جائے گی۔

'نقوش' کے پچھلے شماروں میں مختلف موضوعات سے متعلق اعلیٰ درجے کے مضامین شائع ہوئے ہیں اور تخلیقات جیسی ہیں۔ ان کو پڑھ کر ان میں سے ہر ایک موضوع سے تعلق رکھنے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مرحوم کو اس موضوع سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ ظاہر یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص کو اس قدر مہم جہت قرار دیا جائے مگر ہے یہ واقعہ۔ مجھے ادبی تحقیق اور تدوین سے تعلق نہ تھا۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ طفیل صاحب ان دونوں موضوعات کو شاید سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اصطلاحی معنوں میں طفیل صاحب نہ تحقیق کے آدمی تھے اور نہ تدوین کے مگر شروع سے آخر تک انھوں نے 'نقوش' میں جیسے معیاری تحقیقی مقالات شائع کئے، ان کو پڑھ کر قدرتی طور پر یہ بات دہن میں آتی ہے کہ مرحوم کو ان موضوعات کی اہمیت کا خاص طور پر ادراک تھا، جیسی تو انھوں نے اپنے زمانے کے لائق ترین اہل علم سے ان موضوعات پر تحریریں حاصل کیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہاں، یعنی پاکستان میں طبعی کار کیا ہے، میں ہندوستان کے متعلق بعض کوروں کہ ہمارے یہاں پی ایچ ڈی میں داخلے سے پہلے دو سال کا ایک خاص نصاب مکمل کرنا ہوتا ہے جسے ایم فل کہتے ہیں۔ اس میں اصولی تحقیق اور اصولی تدوین باضابطہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس نصاب میں کام آنے والی کتابیں کم اور بہت کم ہیں۔ اچھے طالب علم ادھر ادھر سے مختلف مقالات بھی جمع کرتے رہتے ہیں تب کام چل یاتا ہے۔ میں آپ سے عرض کروں کہ اس سلسلے میں 'نقوش' میں شائع شدہ کئی مقالے ایسے ہیں جن کو وہ خاص طور پر تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مقالہ جو "فن تحقیق" کے عنوان سے 'نقوش' کے شمارہ ۱۰۴ میں چھپا تھا یا مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد کا مقالہ "تحقیق و تصحیح متن کے مسائل" جو شمارہ ۹۷ میں شائع ہوا تھا (وغیرہ) اس رسالے کے شمارے بہتوں کے پاس ہیں، مگر سب کے پاس نہیں اور کم لوگ ایسے ہیں جن کے پاس سب شمارے محفوظ ہوں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ طالب علم ایسے مقالات کے لیے ان شماروں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، کبھی مل جاتے ہیں کبھی نہیں ملے۔ اس سلسلے میں ایک توجہ کے قابل بات یہ بھی ہے کہ ایسے لکھنے والوں کے مقالے بھی ان شماروں میں

محموظ میں جن کے مجموعہ مضامین اب تک نہیں چھپے ہیں اور مستقبل قریب میں چھپنے کی امید بھی نظر نہیں آتی۔ میں مثال کے طور پر قاضی عبدالودود مرحوم کا نام لوں گا۔ قاضی صاحب تو ہمارے زمانے میں تحقیق کی نسبت سے استاذ الاساتذہ کا منصب رکھتے تھے، اُن کے متعدد مقالے 'فقوش' میں چھپے ہیں۔ میں ایسے صرف ایک مقالے کی نشان دہی کروں گا۔ شمارہ ۶۹-۷۰ میں "متفرقات" کے عنوان سے اُن کا ایک نہایت درجہ معلوماتی مقالہ شائع ہوا تھا۔ یا جیسے مولانا امتیاز علی خاں سرشتی کا ایک مضمون جو تدوین کلام مالک کی ایک بحث کے سلسلے میں شمارہ ۱۰۱ میں شامل ہے یا جیسے نجم الاسلام صاحب کا ایک مفصل مقالہ بیاض مرزا جان طیش سے متعلق جو شمارہ ۱۰۸ میں چھپا تھا۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے مضامین جو کتابی صورت میں اب تک نہیں آ سکے ہیں، مگر جو ہمارے طلبہ کے لیے بے حد مفید ہیں اور از بس ضروری ہیں۔

وہ سب لوگ جو ادبی تحقیق سے متعلق ہیں اور وہ سب طالب علم جو تحقیق و تدوین کے مسائل کو نسائی طور پر پڑھتے ہیں، یہ سب لوگ محمد طفیل مرحوم کا احسان مانتے ہیں کہ اتنے اور ایسے اعلیٰ درجے کے مقالات اُنہوں نے اپنے رسالے میں محفوظ کر رکھے ہیں جو بعینہ ان کے کام آتے رہیں گے اور تحقیقی بحثوں میں جن کے حوالے دئے جاتے رہیں گے۔ حضرات! یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ ہر اڈیٹر اس قدر اہم تحریروں کو یکجا نہیں کر سکتا جب تک کہ اُس کو ان کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو اور وہ ان کا قد ر شناس اور ذائقہ شناس نہ ہو۔ ہمارے بڑے لکھنے والے جو عموماً اچھے اچھوٹے کو خاطر میں نہیں لاتے اور آسانی سے کسی کا کہنا نہیں مانتے، وہ اس شخص کا اس قدر لحاظ کرتے ہوں کہ اُس کی بات کو ٹال نہ سکیں یہ شرف کم اور بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

یہ جو دو تین حوالے ابھی میں نے دئے ہیں بعض مقالات کے، یہ محض بطور مثال ہیں۔ ایسے مقالات کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ 'فقوش' کی فالو میں بند ایسے سب مقالوں کو ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ اس سے بہت فائدہ پہنچے گا تحقیق اور تدوین کے اُن طلبہ کو، جنہیں ایسی تحریریں جمع کرنے کے سلسلے میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے جو ان مباحث سے دل چسپی رکھتے ہیں، مگر جن کی دسترس سے یہ سارا مواد باہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب سے اچھا مدیہ عقیدت ہوگا جو مرحوم کی روح کو پیش کیا جاسکے گا۔ یہ مجموعہ خیر جاری کی صورت میں اُن کی یاد دلانا رہے گا مگر سب سے زیادہ ہمارے اہم فعل کے طالب علم آپ کے شکر گزار ہوں گے اور مرحوم کو ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔

میں تحقیق کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے طفیل صاحب کی روح کے سامنے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں کہ میں نے برسوں تک اس رسالے کے تحقیقی مضامین سے استفادہ کیا ہے، ان میں ادبی تحقیق اور لسانی تحقیق، دونوں سے متعلق تحریریں شامل ہیں اور ہر بار اس رسالے کے باکمال اڈیٹر کو دعائیں دی ہیں جس نے ہم جیسے لوگوں کے لیے ایسے گراں قدر مقالات حاصل کئے اور شائع کئے۔

بٹن ہٹل لاہور میں نقوش "طفیل نمبر" کی تقریب منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں چڑھا گیا۔

خطبہ استقبالیہ

جاوید طفیل

محترم المقام صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب ،
گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی صاحب ،
اور معزز خوانین و حضرات !

سب سے پہلے مجھ پر واجب ہے کہ میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کا شکریہ ادا کروں
جو اپنی مصروفیات کے باوجود جناب محمد طفیل مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر تشریف لائے۔ آپ کی اس کرم فرمائی کے لیے
میں ذاتی طور پر ممنون ہوں۔

اس موقع پر جب کہ ہم محمد طفیل مرحوم کی اردو ادب کے لیے خدمات پر ان کو تراجیحیں پیش کرنے کے لیے
اکٹھے ہوئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خدمات کا ایک مختصر سا جائزہ بھی لیں۔
پاکستان بننے کے چند ماہ بعد مارچ ۱۹۴۸ء میں نقوش کا اجرا لاہور سے ہوا۔ نقوش کی کارگزاری کا جائزہ
لینے کے لیے ہم اس کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلے تین ادوار کا ذکر والد محترم کی تحریر کے مطابق کچھ یوں ہے :
”ادب کی برائیں اس سے پہلے بھی چڑھی ہیں اور بڑے دھوم دھڑکوں کے ساتھ چڑھی ہیں۔ ماضی
کی یادوں میں گم ہو جائیے گا تو شناسائیوں کی آوازیں آج بھی سنائی دیں گی۔
اور لاڈلوں کی طرح نقوش بھی اس دنیا میں آیا۔ پہلے اس کی پرورش کے فرائض میرے
بڑے بھائی احمد ندیم قاسمی اور چھوٹی بہن ماجرہ مسرور کے سپرد ہوئے۔ سیانے کہتے ہیں
بچپن کی تربیت ہی مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے۔

پھر نقوش میرے سب سے بڑے بھائی سید وقار عظیم کی آغوش میں پلتا رہا۔ کسر
کسی نے بھی اٹھا نہ رکھی۔ سب ہی نے لاڈ پیار سے رکھا۔ ابھی نقوش تین ماہ ہی کا ہوا تھا کہ
سخت بیمار ہو گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ شرارتی بچوں کو اس کی بھین بھاتی نہ تھی۔ انھوں نے ایسی
چال چلی کہ یہ بے چارہ چھ ماہ تک بے سدھ پڑا رہا۔

ہوٹل ملٹن لاہور میں نقوش محمد طفیل نمبر کی تقریب منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا۔

جب نقوش بچکنے اور ٹوٹاں ٹان کرنے لگا تو اس کی پرورش میرے سپرد ہوئی۔ بیماری سمیت اُس وقت اس کی عمر اڑھائی برس ہو گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ میری راتوں کی نیند اُچٹ گئی۔ میں سوچتا تھا اتنا خوب صورت اور ہونہار بچہ۔ اگر میری نگہانی میں ینپ نہ سکا تو کتنی جگ ہنسائی ہوگی۔ میں تو لاجوں مرتار ہا۔

میرے مالی حالات بھی زیادہ اچھے نہ تھے مگر میں یہ چاہتا تھا اسے ولایت تک بھجیوں جو صلے اتنے، وسائل محدود، اللہ کی بارگاہ میں دن رات دعا کیں مانگیں۔ پھر تو کرنا خدا کا یہ ہوا نقوش نے اپنے پرارے کامن موہ لیا۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لئے اتنی محنت کی اور اتنے خلوص سے کی کہ اس نے ایک سال میں دودھ تین تین امتحان دینے شروع کر دے اور اللہ کی مہربانی سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔ اس کے کیے ہوئے پرچے آج پاکستان اور ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں رکھ کر دیکھ لیں اس تسان سے کوئی بھی پاس نہ ہوا ہوگا۔

ماتر اللہ نقوش اب جوانی میں قدم رکھ رہا ہے۔ کوئی اس کا بانگیں تو دیکھئے۔ ڈرتا ہوں کہیں اسے میری ہی طرح نہ جاسے۔

واللہ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں اسے میری نظروں سے نہ دیکھیں میں تو دیوانہ ہوں، دیوانہ نہ ہوتا تو آج نقوش کو یہ مرتبہ نصیب نہ ہوتا۔ مکہ مجھے آتا۔ اس ضرور ہے آج میرے لاد کی بارات چڑھی ہے۔“

اگر میں اپنی زبان سے نقوش کے اس دور پر کچھ کہنے کی جسارت کروں تو ہو سکتا ہے اس کو خود نمائی یا خود ستائشی کے زمرے میں لایا جائے، اس لیے نقوش کے کاموں کو مختلف موقعوں پر جس طرح اس ملک کے بہت ہی قابل ذکر لوگوں نے سراہا اُن میں سے چند ایک کا ہی ذکر کروں گا۔

اس موضوع کا آغاز میں صدر پاکستان جناب حنزل محمد ضیاء الحق سے کرتا ہوں، اُن کا کہنا یہ ہے :

”میرے اپنے نقطہ نگاہ سے نقوش ایک وزنی پرچہ ہے جس سے قلی سے لے کر قاری تک سبھی متاثر ہوتے ہیں۔ قلی اور اُس کی برادری سے تعلق رکھنے والے عموماً نقوش کی عظمت کا اندازہ اس کے حجم سے کرتے ہیں جبکہ پڑھے لکھے لوگ اس کی معنوی عظمت کی داد دیتے ہیں میں نقوش کو ایک اعلیٰ پایہ کا عظیم ادبی پرچہ سمجھتا ہوں جس کی نظیر مجھے پاکستان یا اس کے باہر نہیں ملتی۔ اس پرچے کی اپنے قارئین پر گرفت اتنی مضبوط ہے کہ جو کوئی ایک بار اس کا اسیر ہوا اس نے کبھی اس کی گرفت سے نجات نہیں پائی۔ میں گزشتہ تیس سال سے خود

اس کا اسبر ہوں۔ نقوش کے زیادہ تر نمبر میرے پاس محفوظ ہیں، کچھ بعض حضرات لے کر غائب ہو گئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ چیز ضرور نظر آئی کہ وہ نقوش کے سیدائی ہیں اور جو کوئی نقوش کا کوئی نمبر مانگ کر یا چوری کر کے لے جائے، میرے خیال میں اس پر چوری کی حد واجب نہیں ہوتی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نقوش کے شخصیات نمبر پر کچھ یوں تبصرہ کیا

”نقوش شخصیات نمبر یہ پوٹ کی پوٹ، اکٹھے سات سو صفحات، خدا کی پناہ! اسے رسالہ کون مسخرہ کہتا ہے، یہ تو ابوالرہ سائل ہے۔ اس پر اظہار رائے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیتیں اور لکھنے والوں کی شخصیتیں اور ان پر مقالے، ایک طومار ہے۔ یہ نمبر دراصل خاموش شخصیات ہے جو مدتوں یادگار رہے گا، اور لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈا کریں گے۔ آپ کا ہر نمبر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں، مگر تازہ شخصیات نمبر سب پر بازی لے گیا ہے۔ اب صرف ایک ہی شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب و غریب ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا، کئی ہوں گے۔ عجب نہیں کسی روز پورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔“

پطرس بخاری نے نقوش کے بارے میں کہا۔
”طنیل صاحب کا ہر پرچہ ایک خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر خاص خاص موقعوں پر شائع ہوتے ہیں۔“
جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری نے جناب محمد طفیل کو یوں خراج عقیدت پیش کیا :
”میں داد دیتا ہوں جناب طفیل کو، کہ یہ لڑکا سا ہمارے سامنے آیا تھا، پتلا، ڈبلا، چھریا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی جالندھر کا ہے۔ کیونکہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں۔ مار بھی کھاتے ہیں مگر کام کرتے ہیں۔ سیالکوٹ سے تو ایک ہی آیا اور اس نے ایسی ضرب لگائی کہ ہم سب سہلے رہ گئے۔ باقی یو۔ پی سے بہت اسناد آتے وہ ہم سب کے استاد ہیں۔ یہ ہم مل سے ملتے ہیں۔ طفیل چاہے تو ہم سے عالم نزع میں بھی مضمون لکھوا لے۔“

ایک دوسرے موقع پر کہا :
”میں نے انگریزی بھی پڑھی ہے، ہندی بھی پڑھی ہے، فارسی بھی پڑھی ہے، عربی سے بھی واقف ہوں، اردو کو بھی کھنکالا ہے، اس لیے اعتماد سے کہتا ہوں کہ دنیا میں اور میرے تصور میں کوئی ایسا مدیر، صحافی اور نقاد نہیں آیا جس نے طفیل صاحب جتنی مشقت اختیار کی ہو۔“
ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مجلاتی صحافت میں ”نقوش کا مسام“ کے عنوان سے یہ تحریر کیا۔
”مجلات صحافت میں ”نقوش“ کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ہمیں اس کا مطالعہ عوام پسند

رسائل کی روشنی میں نہیں، خواص پسند رسائل کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ ایسے رسائل کے لیے دنیا میں مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں ان رسائل کے لیے ”کوالٹی میگزین“ کی اصطلاح رائج ہے اور اشتراکی دنیا میں ”کلچرل میگزین“ کی۔ بعض مغربی ممالک میں انھیں HIGH BROW مائی برو میگزین بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ کون سے رسالے عوام پسند ہیں کون سے خواص پسند۔ کون سے کم دبیش تقریکی مواد پیش کرتے ہیں اور کون سے خیال افروز تحریریں مہیا کرتے ہیں۔

میرے نزدیک ”نقوش“ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جو کام پہلے اکاؤنٹدار سالہ کبھی اور نامکمل اور غیر جامع انداز میں کرتا تھا۔ وہ اس نے بڑے پیمانے پر ایک منظم انداز میں اور جامعیت کے تمام تقاضوں کے ساتھ کر کے مجلاتی صحافت کو ایک انسائیکلو پیڈیا کی رنگ بخش دیا۔

نقوش کا ہر نمبر اپنے اپنے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے ان میں نعت کو عمدہ دکرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی تو ان کی جامعیت میں فرق آ جاتا۔ ضخامت اور مواد کے اعتبار سے یہ مستقل تصانیف اور تالیفات کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو کام نقوش نے کر دکھایا ہے وہ معجزے سے کم نہیں۔ کتاب ”انسائیکلو پیڈیا اور محلے کو ایک جگہ سمو کر اور اسے حسن بخش کر“ نقوش نے مجلاتی صحافت کو چار چاند لگا دے ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ کام کرنے کی نیت ہو، خلوص اور لگن ہو تو جو کام بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکتے وہ فرد واحد سرانجام دے سکتا ہے۔

ہمارے عہد کے بڑوں نے ”نقوش“ کے بارے میں کیا کہا، یہ آپ نے سنا۔ میرا احساس یہ ہے کہ نقوش کے قلمبرے دور میں اردو ادب کے ہر اہم موضوع پر بہت ہی نمایاں کام ہوا۔ اس دور میں نقوش نے جن موضوعات پر فکر انگیز کام کیا اور نقوش کے خاص نمبر بچا پے وہ یہ ہیں،

افسانہ، غزل، شخصیات، مفلو، مسکاتیب، طنز و مزاح، پطرس، ادب عالیہ، لاہور، تنویر تھانوی، آپ بیتی، جنگ ۶۵-۶۹، خطوط، غالب، اقبال، میر تقی میر، عصری ادب، ادبی معرکے اور میر انیس۔

ان میں سے بعض موضوعات پر بعض ایسی نادر تحریریں محفوظ ہوئیں جو اردو ادب کی جان قرار دی جاسکتی ہیں۔ کئی تحریریں نقوش کے ذریعے دنیا میں پہلی دفعہ منظر عام پر آئیں جن میں غالب، میر تقی میر اور میر انیس ایسے اکابرین کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ اردو ادب سے شغف رکھنے والے کسی بھی ریسرچ سکالر کے لیے نقوش کے

ان اہم نمبروں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

اب میں اس کام کا ذکر کروں گا جس کے بارے میں والد محترم خود فرمایا کرتے تھے کہ ”یہ کام میری زندگی کا حاصل ہے اور میرے کاموں کی معراج بھی۔ ملت اسلامیہ نے بھی اسے ناقابلِ فراموش کام قرار دیا۔“ میری مراد نقوش کے رسول نمبر سے ہے۔

سیرت رسول پر کام کا ذہنی آغاز ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ ۱۹۶۶ء میں اس کا سب سے پہلا اظہار غالباً مجھ سے کیا۔ اس کی کتابت کا آغاز ۱۹۷۲ء میں ہوا اور تقریباً دس ہزار صفحات پر مشتمل ۱۳ جلدیں جنوری ۱۹۸۵ء تک مکمل ہوئیں۔ ان کے اس کام کو لوگوں نے کس طرح دیکھا، اگر میں چند ایک کا ذکر کر دوں تو یہ بے محل نہ ہوگا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (دارالعلوم دیوبند) فرماتے ہیں :

”اسے نمبر کیوں کہیے یہ تو اردو زبان میں سیرت طیبہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔“

مولانا نعیم صدیقی نے کہا :

”علامہ شبلی اور مولانا سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگ میل قائم کیا تھا اب ویسا ہی دوسرا سنگ میل شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا ادارہ نقوش نے قائم کیا ہے۔“

مولانا عبدالمستین ہاشمی فرماتے ہیں :

”میرا ذاتی خیال ہے کہ سیرت پاک سے متعلق مواد کا ایسا گلہ ستہ اور مجموعہ اردو تو کیا دنیا کی کسی زبان میں نہ ملے گا۔“

خود والد مرحوم نے اس نمبر کے بارے میں فرمایا :

”اس نمبر کی اشاعت میرے لیے سعادت ہے کہ جس کی تڑپ ایک عرصہ سے میرے دل میں تھی۔ میں نے اس نمبر کے لئے بڑی محنت کی اور محنت سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں دعائیں مانگیں۔ جذبہ اول کا ثمر محدود ہو سکتا ہے اور جذبہ دوم کا ثمر لامحدود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں بھی کسی قابل ہوا ہوں۔“

کسی نے کہا اہل وطن کے لیے کوئی پیغام ! ان کا جواب تھا :

”مجھے اہل وطن سے یہ کہنا ہے کہ ابتداء سے لے کر اب تک میں نے اپنی زندگی ان کے نام لکھ دی ہے اب وہ میرے لیے دعا کریں کہ مجھے میرا مقصود ملے اور یہ کہ دربار رسالت کی آخری صف میں جو آدمی کھڑا ہو وہ محمد طفیل ہو۔“

اس طرح نقوش کے تیسرے دور میں جناب محمد طفیل نے اپنی ۳۵ سال اور ۶۶ دن کی ادارتی زندگی میں ۵۹۸۵۸ فکر انگیز صفحات نقوش کے ذریعے اہل علم تک پہنچائے، جن میں دس ہزار صفحات سب موضوعات سے اعلیٰ

موضوع سیرت رسولؐ پر بھی شامل ہیں -

۵ جولائی ۱۹۸۶ء کو والد محترم کی اچانک وفات پر مابین حیران و پریشان رموز قدرت کو سمجھنے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا کہ یہ بات مجھ پر عیاں ہوئی کہ نقوش ہی فوہما را سب سے قیمتی اثاثہ ہے - والد محترم کی ۳۵ سالہ ریاضت کا نتیجہ ہماری ساخت اور پہچان، اس طرح ناقابل یقین قیمت کی ادائیگی کے بعد نقوش کی ذمہ داری میری طرف منتقل ہوئی - اور نقوش کے چوتھے دور کا آغاز ہوا -

آج میں ایک ایسے شخص پر نمبر پیش کر رہا ہوں جس نے زندگی بھر قابل ذکر نمبر چھاپے اور ہر موضوع کا حتیٰ ادا کیا - سب کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ایسا نمبر صرف نقوش ہی چھاپ سکتا تھا - میری ذمہ داری دوہری ہے - مجھ پر دو قرض واجب ہیں ایک اردو ادب کی اس نمایاں شخصیت کا حتیٰ ادا کرنے کا اور دوسرا ایک کم علم بیٹے کا اپنے والد کو قابل ذکر انداز میں خراج عقیدت پیش کرنے کا - اس نمبر کی اشاعت کے ساتھ ہی بابا سائے اردو مولوی عبدالحق کی وہ پیش گوئی بھی پوری ہو گئی جو انھوں نے کوئی ایک تہائی صدی پہلے ۱۹۵۶ء میں کی تھی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت پر شاکر ہوں اسی لیے ہر دم اسی سمت میں مجھ سفر ہوں جو سمت والد محترم نے متعین کی تھی -

سب سے اہم یا افضل کام جس کا ان شاء اللہ آغاز ۱۹۸۸ء سے ہو گا وہ نقوش کا قرآن نمبر ہے جو کم و بیش دس ہزار صفحات پر مشتمل ہو گا - اس کی تکمیل آئندہ تین چار برسوں میں ہو گی - مجھے پوری امید ہے کہ نقوش کا قرآن نمبر رسولؐ نمبر کی طرح بہت سی قیمتی اور بے حد قابل ذکر دستاویز ثابت ہو گا -

آخر میں ایک بار پھر جناب صدر پاکستان! میں آپ کا، گورنر پنجاب اور سب نوابین و حضرات کا پریمیم قلب شکر گزار ہوں کہ آپ "نقوش" کی اس تقریب میں نشر لائف لائے اور ہمیں سرفراز اور سرخرو کیا -

”جاگیر غالب“ میں غالب کی قلمی تحریریں

دَاكُتْرَسِيّدْ مَعِينِ الرَّحْمَنِ

غالب کی پیش کش کے بارے میں بعض دستاویزات پنجاب آرکائیوز، لاہور میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر نے کچھ دستاویزات کی عکسی نقول اپنی کتاب ”حیاتِ غالب کا ایک باب“ میں شائع کی ہیں (مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۷ء) کتاب کے ”پس لفظ“ میں انھوں نے بتایا ہے کہ:

..... اس تحقیقی کام کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ ”جاگیر غالب“ کے نام سے ان دستاویزات (یا ان میں سے بعض دستاویزات) کو ہندوستان میں شائع کیا جا چکا ہے۔ میں نے پاکستان میں غالبیات کے ماہرین سے رابطہ قائم کیا مگر یہ کتاب کہیں سے نہ مل سکی۔ مشہور محقق جناب رشید حسن خاں صاحب کو اس کی فراہمی کے لیے ہندوستان خط لکھا تو ان کا جواب آیا کہ ”جاگیر غالب“ کے نام سے کوئی کتاب یہاں نہیں ملتی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ تھوڑی چند صاحب نے اس نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ یہ اب سے دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس میں شاید کچھ دستاویزات کے عکس تھے مگر کچھ ایسا جملہ اڑا کہ وہ کتاب منظر عام پر نہیں آ سکی۔ شاید کچھ قانونی موٹگافیاں تھیں۔ پھر نہیں معلوم کہ اس کا کیا ہوا اور وہ ذخیرہ کہاں ہے؟ یہ تھوڑی چند مروتوم ہو گئے۔ ان کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اب میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کتاب میں کیا کچھ تھا۔ لیکن ہے کہ ہماری جس کاغذات تک رسائی ہوئی ان میں سے بعض یہ تھوڑی راج کو بھی دستیاب نہ ہوئے ہوں۔“

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ”جاگیر غالب“ کتنی نادر کتاب ہے — پرتھوی چندر کی نویں برسی (نومبر، ۱۹۶۸ء) کے موقع پر ”جاگیر غالب“ کی شایان شان اشاعت یونیورسٹی بکس (۴۰-۱-۷۷، اردو بازار، لاہور) کے پیش نظر ہے۔ ”جاگیر غالب“ پچاس سے زیادہ دستاویزات کی عکسی نقول پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تیس (۲۳) عرصہ آئین غالب کی ہیں۔ مقدمہ پیش کش کے سلسلے کی یہ ساری عرضیاں انگریز حکام کے نام ہیں اور غالب نے انہیں کسی مددگار یا حوالہ نویس سے انگریزی میں لکھوا کر پیش کیا ہے۔

۱۷ و ۱۸ و ۱۹ صحیح نام: پرتھوی چندر

”جاگیر غالب“ میں شامل غالب کی ان تئیس (۲۳) عرضیوں میں سے سات، غالب کی اصل عرضداشتوں کی مصدقہ نقول ہیں اور سولہ اصل ہیں۔ ان سولہ میں سے دو پر غالب کی صرف مہر ہے اور بقیہ چودہ پر مہر ثبت کرتے یا دستخط کرتے ہوئے غالب نے ایک آدھ بات اردو/فارسی میں اپنے قلم سے بڑھادی ہے جو ان کے اضطرابِ دلی کو ظاہر کرتی ہے۔ ذیل میں غالب کی ان سولہ عرضیوں کے اختتامی حصوں سے غالب کی دستخطی تحریروں اور مہروں کے عکس پیش کیے جا رہے ہیں :

۱
جارج سونٹن سیکریٹری حکومت ہند شعبہ سیاسی فورٹ ولیم (کلکتہ) کے نام انگریزی حروف میں غالب کی دستخطی مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۳۱ء کے آخر میں غالب نے اپنی مہر ثبت کی ہے۔ مہر میں ان کا نام اور سنہ ”محمد اسد اللہ خاں“ کندہ ہوا ہے۔ ”جاگیر غالب“ میں غالب کی عرضیوں پر جہاں تہاں ہی مہر لگائی گئی ہے (مہر کے نیچے غالب نے اردو میں اپنا نام اور حوالہ وغیرہ اس طرح درج کیا ہے: ”عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سوگند و سونسا“


عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں

۲

عرضداشت دستخطی و مہری اسد اللہ خاں غالب مورخہ ۱۳۔ نومبر ۱۸۳۶ء بنام ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن سیکریٹری حکومت ہند فورٹ ولیم (کلکتہ)۔ اس انگریزی عرضداشت کے آخر میں بھی غالب کے نام کی ۱۲۳۸ھ کی مہر لگی ہوئی ہے اور اس کے نیچے ان کے قلم سے یہ عبارت اور تاریخ درج ہے، خستہ دل، دردمند، حق طلب، دادخواہ، امیدوار لطف و کرم اسد اللہ، نگاشتہ چار دہم نومبر ۱۸۳۶ عیسوی“

۱۸۳۶ء

عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں



145564
26-3-92

۳

عرضداشت دستخطی و مہری اسد اللہ خاں برادرزادہ مرحوم نصر اللہ بیگ خاں، مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۳۶ء (مع فہرست کاغذات متعلقہ) بنام: لارڈ جی۔ آک لینڈ، گورنر جنرل ہند بہ کونسل، فورٹ ولیم (کلکتہ) — ۱۲۳۸ھ کی مہر اور اس کے ساتھ بخط غالب یہ عبارت: ”عرضداشت اسد اللہ خاں معروضہ چار دہم نومبر ۱۸۳۶ عیسوی“

عرضداشت اسد اللہ خاں برادرزادہ مرحوم نصر اللہ بیگ خاں



۴

عرضداشت دستخطی و مہری اسد اللہ خاں، مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۳۶ء، بنام: ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن چیف سیکریٹری حکومت، امور سیاسی — ۱۲۳۸ھ والی مہر اور اس کے ساتھ بخط غالب کچھ یہ عبارت درج ہے، عرضداشت

نہ نہ، سید وارث۔ کتبہ کرم اللہ تعالیٰ عنہ مورخہ ۱۲۳۸ھ



امیدوار (عنایت، سزاوار) کرم اللہ تعالیٰ معروضہ بستم دسمبر ۱۸۳۶ عیسوی

۵

ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن، سیکریٹری حکومت ہند، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے نام غالب کی دستخطی و مہری عرضداشت، مورخہ یکم اپریل ۱۸۳۷ء کے زیرین حصے میں نمبر کے نیچے بخط غالب چند کلمات اور تاریخ کا اندراج اس طرح ہوا ہے: ”معروض از اسد اللہ در عالم درماندگی واضطراب یہ تمنائے حصول جواب مناسب با صواب فقط یکم اپریل ۱۸۳۷ء“

کلمہ کلمہ



نہ نہ

معروض از اسد اللہ در عالم درماندگی واضطراب
تنب حصول جواب مناسب با صواب

۶

سیکرٹری حکومت ہند فورٹ ولیم (کلکتہ) ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن کے نام غالب کی دستخطی و مہری عرضداشت مورخہ ۹۔ اگست ۱۸۳۷ء کے آخر میں ۱۲۳۸ھ والی مہر کے ساتھ غالب کے قلم سے یہ عبارت: "حق طلب، دادخواہ اسد اللہ، فقط نہم اگست ۱۸۳۷ء عیسوی"

۱۸۳۷ء ۱۲۳۸ھ

حق طلب دادخواہ اسد اللہ
فقط نہم اگست ۱۸۳۷ء عیسوی



۷

لارڈ جارج آگ لیسنڈ، گورنر جنرل ہند بہ کنسل، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے نام غالب کی دستخطی و مہری عرضداشت، مورخہ ۹۔ اگست ۱۸۳۷ء کے آخر میں ۱۲۳۸ھ والی مہر کے اوپر تعلیم غالب یہ عبارت: "عرضداشت فدوی اسد اللہ نکاشتہ نہم اگست ۱۸۳۷ء عیسوی"

بخدمت فدرائے کاشفہ نہم اگست ۱۸۳۷ء



۸

ڈبلیو۔ ایچ۔ میکناٹن سیکرٹری حکومت، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے نام غالب کی دستخطی و مہری عرضداشت مورخہ ۱۶۔ ستمبر ۱۸۳۷ء — ۱۲۳۸ھ والی مہر کے ساتھ قلم غالب: "حق طلب، دادخواہ اسد اللہ ۱۶ ستمبر ۱۸۳۷ء عیسوی"

۱۸۳۷ء ۱۲۳۸ھ
حق طلب دادخواہ اسد اللہ ۱۶ ستمبر ۱۸۳۷ء



۹ اور ۱۰

غالب کی ۵۔ جون ۱۸۴۲ء کی دو عرضداشتوں (بنام، لارڈ ایڈورڈ ایلن برو، گورنر جنرل ہند، الہ آباد اور ایف۔ ایچ۔ بینڈک، سیکریٹری حکومت ہند، الہ آباد) پر غالب کی ۱۲۳۸ھ والی مہریں ثبت ہیں۔



۱۱

غالب کی ۲۶۔ جنوری ۱۸۴۴ء کی دستخطی و مہری عرضداشت بنام: کیوری، سیکریٹری حکومت ہند، پر ۱۲۳۸ھ ہجری والی مہر کے ساتھ غالب کی قلمی تحریر: ”ہواہ خواہ آرزو مند لطف و کرم نیا زمندا اسدا اللہ نگاشتہ بست و ششم جنوری ۱۸۴۴ء“

ہوا خواہ آرزو مند لطف و کرم نیا زمندا اسدا
اللہ نگاشتہ بست و ششم جنوری ۱۸۴۴ء



۱۲

عرضداشت دستخطی و مہری اسدا اللہ خاں مورخہ ۲۶۔ جنوری ۱۸۴۴ء بنام ایڈورڈ لارڈ ایلن برو گورنر جنرل ہند، پر ۱۲۳۸ھ ہجری والی مہر کے نیچے بخط غالب یہ عبارت درج ہوئی ہے: ”عرضداشت فدوی اسدا اللہ برادرزادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیر سونک سونسا، معروضہ بست و ششم جنوری ۱۸۴۴ء عیسوی“



عرضداشت دستخطی و مہری اسدا اللہ خاں مورخہ ۲۶۔ جنوری ۱۸۴۴ء بنام ایڈورڈ لارڈ ایلن برو گورنر جنرل ہند، پر ۱۲۳۸ھ ہجری والی مہر کے نیچے بخط غالب یہ عبارت درج ہوئی ہے: ”عرضداشت فدوی اسدا اللہ برادرزادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیر سونک سونسا، معروضہ بست و ششم جنوری ۱۸۴۴ء عیسوی“

۱۳

عرضداشت دستخطی و مہری اسد اللہ خاں، مورخہ ۲۵ - اکتوبر ۱۸۴۲ء بنام: جے۔ کیوری، سیکریٹری حکومت ہند، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے اختتام پر ۱۲۳۸ ہجری والی مہر کے اوپر بخطِ غالب یہ عبارت درج ہے،
رقیمہ نیاز، اُمید وارِ لطف و کرم اسد اللہ

رقیمہ نیاز اسید وار لطف و کرم اسد

سہ ۱۸۴۲ء

۱۴

غالب کی دستخطی و مہری عرضداشت مورخہ ۲۳ - اکتوبر ۱۸۴۲ء بنام: لیفٹننٹ جنرل لارڈ سرہنری مارڈنگ، گورنر جنرل ہند، فورٹ ولیم (کلکتہ) کے آخر میں ۱۲۳۸ ہجری والی مہر کے اوپر غالب نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔
عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ خاں جاگیردار سونک سونسا

عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ خاں جاگیردار سونک سونسا

سہ ۱۸۴۲ء

۱۵

غالب کی ۸ - دسمبر ۱۸۵۶ء کی دستخطی عرضداشت (بنام: جی۔ ایف۔ ایڈمنسٹن، سیکریٹری حکومت ہند کونسل، فورٹ ولیم) کے آخر میں یہ عبارت ہے: رقیمہ اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا
مرقومہ ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

رقیمہ اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا

عرضداشت دستخطی اسد اللہ خاں، مورخہ ۸۔ دسمبر ۱۸۵۶ء، بنام: چارلس جان واٹی کاؤنٹ کیننگ گورنر جنرل ہند
برکونسل، فورٹ ولیم (کلکتہ) — کے اخیر میں غالب کی قلمی یہ عبارت ہے: ”عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ
نصرت اللہ بیگ خاں جاگیر دار سونک سونسا، معروضہ ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی“

مرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصرت اللہ بیگ خاں جاگیر دار سونک سونسا معروضہ ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

”جاگیر غالب“ میں یہ غالب کی آخری عرضی ہے۔ اس عرضی کے بارے میں سیکریٹری شعبہ امور خارجہ
فورٹ ولیم کی ایک دفتر میں یادداشت مورخہ ۱۔ دسمبر ۱۸۵۶ء — ”جاگیر غالب“ کی آخری دستاویز ہے۔
اس کے کوئی پانچ ماہ بعد انقلاب ۱۸۵۷ء کا سلسلہ شروع ہو گیا اور غالب نئے مسائل، مصائب اور امکانات
سے دوچار ہوئے جو ان کا ایک الگ باب ہے۔

سراج اوزنگ آبادی پر نئی روشنی

نثار احمد فاروقی

سراج اوزنگ آبادی آدو کے شعرائے مقدمین کی صف میں ایک اہم اور ممتاز مقام رکھتے ہیں، اردو شاعری کا آغاز دکن ہی سے ہوا اس کا میر نے بھی اعتراف کیا ہے، تہالی ہندوستان میں دورۂ ایہام گویاں کے بعد میرزا مظہر، عبدالحی تاباں، سجاد اکبر آبادی، میر، سودا، درد وغیرہ کے زمانے تک اردو شاعری کا لب و لہجہ اور اسلوب و آہنگ قائم ہو چکا تھا۔ سراج اوزنگ آبادی کو باعتبار درجہ بندی ہم دلی دکنی اور میرزا مظہر کی درمیانی کڑی کہہ سکتے ہیں۔

سراج کی ادبیت اور ادبی عظمت کا اعتراف بہت دیر میں کیا گیا ہے وہ بھی ہنوز ناقص ہے اس لئے کہ سراج کے بارے میں بہت سی ضروری معلومات بھی ہمیں حاصل نہیں ہیں

سراج کا بہت ہی محقر حال اور نودہ کلام شعراء کے اُن قدیم تذکروں میں ملتا ہے جو زیادہ تر حالات سراج کے مآخذ دکن میں لکھے گئے، تہالی ہند کے تذکرہ نگار بھی اُن سے زیادہ واقف نہیں ہیں چنانچہ بعض تذکروں میں اس کا صرف نام ہی لکھا گیا ہے۔ کلام میں اکثر تذکرہ نگاروں نے اُن کی غزل۔

نہر تیر عشق تُوں نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ نو تو رہا نہ وہ یک رہا جو رہی سو بے خبری رہی

سے اشارہ کا انتخاب کیا ہے گویا یہ غزل ہر دور میں مقبول رہی ہے۔

حالات سراج کے اہم اور اولین مآخذ ہیں

- ۱۔ قائم چاند پوری محرن نکات تالیف قبل ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱-۱۷۵۲ء
- ۲۔ میر تقی میر نکات الشعراء تالیف ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱-۱۷۵۲ء نفی ی پریس بدایوں
- ۳۔ افضل بیگ قاضی تحفۃ الشعراء تالیف ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱-۱۷۵۲ء آصفیہ
- ۴۔ حیات اللہ فتوت خلعت شکر جنگ برادر کلان خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت سفر ل رکاز ڈیرا اندھرا

۵	فتح علی گردیزی	تذکرہ ریختہ گویان	تالیف ۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۲-۱۷۵۳ء انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۲ء
۶	سبزواری	تذکرہ اولیائے دولت آباد	تالیف ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳-۱۷۷۴ء جامعہ عثمانیہ
۷	لیچھی زائن شفیق	چشتان شعراء	۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱-۱۷۶۲ء طبع انجمن ترقی اردو
۸	لیچھی زائن شفیق	گل رحمت	۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵-۱۷۶۶ء (مثنوی تین تذکرے)
۹	قدرت اللہ شوق	طبقات الشعراء	۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء کتب خانہ آصفیہ / طبع لاہور ۱۹۶۵ء
۱۰	میر حسن	تذکرہ شعرائے اردو	۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء طبع انجمن ترقی اردو
۱۱	اسد علی خاں تمنت	گل عجائب	۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء طبع انجمن ترقی اردو (آصفیہ)
۱۲	سید عبدالوہاب	تذکرہ بے نظیر	۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸-۱۷۵۹ء سبٹ ہاؤس الہ آباد ۱۹۴۰ء
۱۳	افتخار دولت آبادی	مرتبہ سید منظور علی	۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳-۱۷۸۴ء انجمن ترقی اردو
۱۴	علی ابراہیم خاں خلیل	نگار ابراہیم	۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳-۱۷۹۴ء طبع حیدر آباد
۱۵	شاہ تجلی علی	تذکرہ آصفیہ	۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶-۱۸۰۷ء طبع لاہور
۱۶	حکیم قدرت اللہ قاسم	مجموعہ نغز	۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶-۱۸۰۷ء طبع لاہور
۱۷	حکیم بیگ حاکم لائوی	تذکرہ مردم دیدہ	۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶-۱۸۰۷ء طبع لاہور

لیچھی زائن شفیق، افتخار دولت آبادی اور حاکم لاہوری سراج سے ملے ہیں، اور انہوں نے ہی بعض سوانحی اشارے کئے ہیں۔ شفیق نے "منتخب دیوانہا" کے دیباچے کا اقتباس نقل کر کے سراج کے بارے میں کچھ مستند معلومات فراہم کر دی ہیں۔ باقی تذکروں سے ہمیں کوئی قابل ذکر مدد نہیں ملتی۔

یہ وہ تذکرے ہیں جن کے مؤلفوں نے کم و بیش سراج کا زمانہ پایا تھا۔ ان کے بعد جن تذکروں میں سراج کے حالات یا انتخاب کلام ملتے ہیں وہ ثانوی درجہ کے مآخذ ہیں اور بیشتر نے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں ہی سے اخذ کیا ہے۔ دیباچہ انوار السراج میں انصاف حیدر آبادی، سید صالح علی خاں اور مرزا الیاس استعجلو کا تذکرہ بھی ان لوگوں میں کیا گیا ہے۔ جنہوں نے سراج کے حالات میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔

۱۔ "شفیق اورنگ آبادی سید اللہ تعالیٰ دریں ولادت کرہ ریختہ گویان سہی چشتان شعراء پر داختہ" دیباچہ دیوان سراج از ضیاء الدین پروانہ (شفیق کی سراج سے ذاتی ملاقات تھی۔ اس نے سب تذکرہ نگاروں سے زیادہ تفصیل سے سراج کے حالات لکھے ہیں دگل عننا مثنوی تین تذکرے مرتبہ احمد فاضل ۲۳، ۲۴)۔ ۲۔ گل عجائب ۶۰-۶۱ (دس شعرا انتخاب کیے ہیں۔ حالات میں نری غافل ہے)۔

۳۔ سید عبدالوہاب افتخار دولت آبادی میر غلام علی آزاد بگڑائی کے شاگرد ریختہ میں بکلی تخلص تھا (گل عجائب ۱۵)، اور میر عبد الولی عزت سے تلمذ لکھتے تھے۔ (گردیزی ۲۹-۳۰)

کیاں سراج کے مانعہ میں سب سے زیادہ اہم وہ مایعات ہیں جنہیں خود سراج نے یا ان کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے۔
 یہ سراج اور رنگ آبادی کی کلیات ہے جسے سب سے پہلے بقول ضیاء الدین برداز شاہ
انوار السراج (کلیات سراج) | عبدالرسول جتئی نے مرتب کیا تھا۔ جمع و ترتیب کا سال ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء بتایا جاتا ہے۔

اسے پرنسپل عبدالقادر سروری نے ۱۹۴۰ء میں کلیات سراج کے نام سے شائع کیا تھا۔
 اسی کا عکسی ایڈیشن، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی نے ۱۹۸۲ء میں چھاپا ہے۔
 کلیات سراج کے متعدد نقلی نسخے دستیاب ہیں جن نسخوں سے عبدالقادر سروری نے استفادہ کیا تھا ان کی تفصیل مقدمہ کلیات میں درج
 کر دی ہے۔ ان میں سے بعض اہم نسخے یہ ہیں۔

۱ نسخہ مکتوبہ ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء
 یہ قدیم ترین نسخہ ہے جو سراج کی زندگی میں لکھا گیا۔
 ۲ مصنفہ کے نسخوں میں ایک ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء - ۱۷۷۶ء کا لکھا ہوا ہے جس کے آخر میں یہ عبارت ہے
 ”نسخہ دیوان سراج سلمہ اللہ تعالیٰ ماتم رجب“
 اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نقل کسی ایسے نسخے سے ہوئی ہے جو سراج کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

منتخب دیوانہا (۱۱۶۹ھ) ۱۷۵۵-۱۷۵۶ء | قیماً دستیاب ہوتا تھا تو وہ خرید لیتے تھے درمڑھے کے لئے
 مانگ لیا کرتے تھے، باب دواؤں کا حامدا و نیرہ جمع ہو گیا تو انہیں جیل ہوا کہ اتنے دواؤں کا محفوظ رکھنا دشوار ہے اور انہیں ایک جگہ سے
 دوسری جگہ منتقل کرنے میں ہی پریشانی ہوگی اس لئے انہوں نے تمام دواؤں سے اپنے پسندیدہ شعروں کا انتخاب کیا، اور اس طرح تقریباً ۴۴ شعرا
 کا انتخاب کلام تین جروں کے ساتھ ہی فراہم کر دیا۔ اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا۔
 ”منتخب دیوانہا“ تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء - ۱۷۵۶ء برآمد ہونے ہیں
 اس کا مکمل محفوظ جس میں دیا جا چکا ہے شامل ہے عبدالقادر سروری کو ترتیب کلیات کے وقت نہیں مل سکا تھا حالانکہ وہ کتب خانہ سارا
 جگت میں موجود تھا مگر فہرست منظومات مرتب کرنے والوں کی سہلی انگاری کی وجہ سے اس کا اکتشاف نہ ہو سکا تھا۔
 دیا جا چکا منتخب دیوانہا کا ایک اقتباس لکھی رائے سفیق اور رنگ آبادی نے جہستان شعراء میں درج کیا تھا۔ لیکن مکمل
 محفوظ دریافت ہونے پر اس کی بقیہ عبارت عبدالقادر سروری نے شائع کر دی تھی لکھ

طہتیں سرودی سراج اور برداز رسالہ آدو اپریل ۱۹۵۱ء

۱۲۴۶ھ / ۱۷۶۰ء کے مکتوبہ نسخہ کلیات دہم کو کہ مصنفہ ایسی جیساں ترتیب ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء بتایا گیا ہے۔

اسی محفوظ نمبر ۱۲۲ پر ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے کتابت درج نہیں کی گئی بلکہ ادب دہلی جون ۱۹۶۰ء عبدالقادر سرودی شاہ سراج کا منتخب دیوانہا ج ۱، شمارہ ۲

اضواء السراج کلیات سراج (انوار السراج) کے دیباچہ نوشتہ ضیاء الدین بردانہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سراج اورنگ آبادی کے ملفوظات بھی اضواء السراج کے نام سے جمع کئے گئے تھے، یہ ابھی تک دستیاب نہیں ہیں لیکن یقین ہے کہ کسی گوشے میں ردپوش ہوں گے اور جب بھی یہ مخطوط دریافت ہو جائے گا اس سے ہم سراج کی زندگی اور زائے کے بارے میں بہت سی نئی باتیں جان سکیں گے۔

مکتوبات سراج عبدالقادر سروری نے دیباچہ کلیات میں سراج کے فارسی خطوط اور فارسی کلام کا ذکر کیا ہے یہ نسخہ سالار جنگ (رقم ۱۱۲۶- الف) میں موجود ہیں۔ سروری اس کو منتخب دیوانہ کا نام لکھتے ہیں اور ان کا بیان ہے کہ یہ شاہ ضیاء الدین بردانہ کا مرتبہ ہے فارسی خطوط اور فارسی کلام سوائے اس نسخے کے کہیں اور دستیاب نہیں ہوا جو خطوط بردانہ کے موسومہ ہیں ان سے اس کا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً بردانہ ہی کا لکھا ہوا بھی ہے۔ ان خطوط پر بھی تفصیل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

مجھے کلیات سراج اورنگ آبادی اور منتخب دیوانہ کا ایک مکمل اور مستند نسخہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ سراج کے شاگرد اور مرید و خلیفہ شاہ ضیاء الدین بردانہ نے مرتب کیا ہے اور اس میں ایک مفصل دیباچہ بھی ہے جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ پورا نسخہ سراج کے ایک اور ممتاز شاگرد میرزا عطاء ضیاء برہان پوری نے سراج کے انتقال سے تقریباً ۸ ماہ کے بعد اپنے قلم سے لکھا ہے دنداد اوراق (۱۵۵) اس کی کثابت کا کام جہاں شنبہ (۱۶ جماد الثانیہ ۱۱۷۸ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۷۶۴ء) کو تمام ہوا تو قریب ہے۔

”کتاب الحروف اصنع العباد نیز اعطاء ضیاء برہان پوری بتائے ہند جم شہر جمادی الثانی روز چہار شنبہ ۱۱۷۸ھ صورت اتمام یافت“ اس نسخہ میں منتخب دیوانہ کا دیباچہ بھی ملے گا اور دیوان سراج کا دیباچہ نوشتہ ضیاء الدین بردانہ بھی ہے جس سے سراج کے بارے میں بعض ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جس کی طرف ابھی تک کسی تذکرہ نگار یا محقق نے اشارہ نہیں کیا ہے۔

دیباچہ منتخب دیوانہ اس نسخہ کی ایک اہم خصوصیت منتخب دیوانہ کا دیباچہ ہے جس کا فارسی متن درج ذیل ہے۔

رب یتربسم اللہ الرحمن الرحیم دقتم بالخیز

عبدالقادر سروری۔ کلیات سراج (مقدمہ) ص ۱۴۲-۱۴۳

۱۔ اس دیباچہ کا ایک اعتبار اس میں لکھا ہے۔ یعنی مولیٰ نغلی احداثات کے ساتھ شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ گل رخا (ص ۲۲۲-۲۲۵) اور چستان شہر میں موجود ہے اور جو عبارت شفیق نے حذف کر دی تھی اسے عبدالقادر سروری نے نوائے ادب جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع کر دیا ہے۔ ۲۔ سکہ یعنی اصل نسخے کے کسی کی مدد سے یہاں درج ہوئے ہیں، مگر ان الفاظ صاف نہیں آئے ہیں، کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے نسخہ پختہ شدت میں باریک قلم سے لکھا ہوا ہے شفیق اورنگ آبادی نے میرزا عطاء ضیاء برہان پوری کی تاریخ ولادت، سوالیہ ۱۱۴۳ھ (۱۴ اپریل ۱۷۳۱ء) لکھی ہے گل رخا ص ۲۲۴) لکھا اس نسخے کثابت کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔

دیباچہ کتاب شرح دیبان حمد سنن آفریں مست کہ فہرست جمیع اسماء صفاتی راجح بذات خود اوست و مطلع قصیدہ کام و زبان
نعت صاحب دین ست کہ رباعی اصحاب اخبار موزوں از حمد صفات و خصوصاً فرد منتخب غزل کائنات کہ حدیث لجمک لجمی و کلام اناد علی من
نور واحد بذات لو شامل است و مثنوی رنگین آل طہ و یلین کہ کریمہ و غلامی و یحییٰ اللہ لیمذہبکم الذی اهل البیت در شان او نازل
وود جان معنی آشنایان اسرار رحمانیت و ذلیفہ زبان سخن سبحان فیض سبحانی پناہ این کجے زبان دستان تحقیق سراج الدین حسین اورنگ
آبادی تخلص بر سراج زبان قاتل باین مقال مترنم دارد لموقع

ز دیوان قصا دارم دو بیت منتخب از بر

محمد مطلع است و حسن مطلع جیدر صفدر

لیکن زبان درین مقدمات معترف بعجز و تصور است و طوالت کلام درین امور نزدیک مختصر پندار نامنطور لهذا تجریر مادیجب نصحت
روانی قلم می دهد کہ این فیتر از کجے دو از دہ ساگی بخلہ شوق بے بہت بہت سال جامہ سربانی در برداشت و تبرک لکلف نشہ بے خودی اکثر
در سواد و عزم مبتکر حضرت بر مان الدین غریب قدس سرہ، شہاب بروزی آورد و از جوش ہماں سستی استعار شورا نگیز و ابیات درو آمیز زبان ناری
از ممکن جان بعرضہ زبان می آمد آورد و با قضاے احوال خصامہ را تجریر آن آشنائی ساخت ایماناً اگر شوق مندے حاضر اوقت
می بود بہت حلاوت ذائقہ طبع خود کاغذ را سیاه می نمود اگر آں اشار تمام تجریری آمد دیولنے مخم تر تب می یافت چون نقاضائے
عمر قابل آن ہمہ سخن سنجی نہ بود با تجماع آن موزونات حالی حالے در در طعوب فی افساد و از جملہ المامات
مقبور می آورد، بعد انقصائے مدت مسطورہ تلاش لذت تحقیق محرک رگ جاں گردیدہ، تابان و ماطت بجناب (حانی تربیت
غرا سالک طریقتہ الاضنی واقف حقیقتہ المولی عارف معرفۃ البکری قبلہ مریدان راسخ الیقین و صاحب الایمان
کعبہ مستغنیان کمال المصدق و ثابت البرمان حضرت خواجہ سید شاہ، عبدالرحمن چشتی قدس اللہ سرہ العزیز کہ وصال (شریفش)
مقدس درسہ احدی دسین و مایہ و الف اتفاق افتاد مستعد ارادت گشتہ فیض یاب ارشاد گردید و میر عہ از بزم عنایت آن ساقی شراب
ہدایت موافق حوصلہ خود چشیدہ و ران (ایام) بے پاس خاطر عزیز عبدالرسول خاں (صاحب) کہ برادر طریق این فیتر (اند) است، اکثر اشعار
آبدار در زبان ریختہ بسک مسطور منسک گشتہ۔

ایشان (انشاء) آن جواہر در (متفرق را کہ قریب پنج ہزار بیت بود بر ترتیب (حروف) دیوان نارد
(مردف) نمودہ حمد مشتاقان خاص (گردید) گردانیدند و رفتہ رفتہ شہرہ (ت) تمام (یافت گرفتہ) کہ بلام ہم رسید و فقیر بعد چندے
بباس فاخرہ الفقیر فخری ممتاز گردید (۵)

لے ملاحظہ ہو تذکرہ گل رعنا مشہور تین تذکرے مرتبہ شاعر احمد فاروقی ص ۲۳۴-۲۳۵ (۱۰ بی ۱۹۶۸ء)

تکے سراج کی ولادت ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء کی ہے اس لے دیکھتے حوالہ تقریباً ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴-۱۷۲۳ء سے شروع ہوئی۔

تکے ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸-۱۷۴۸ء

داز بہان روز موافق امر مرشد برحق تا حالت تحریر کہ سال ہفتم است دست زبان از دامن سخن موزوں کشید *
سرشت ازلی بود اکثر بسیر دیوانہا اشار استادان عنذیب طبع خود را مسرور می ساخت دہر جا کہ دیوان استاد دے می شنید اگر بہ
قیمت میر کا آغیبت فی سرود الاعدایہ بوعده اتمام سیری گرفت۔ ملاحظہ

فی شناسد ہر کہ شد دلدادہ زلف سخن

بیت رنگین را بجلے بیت ابروے تباں

آخر خیالی گذشت کہ اس درد اسیر مدنی درد اگر اتفاق سفر افتاد برداشت ہی با گراں صورت فی بند و لا علاج اکثرے از دیوانہا
شعرانے قدیم و جدید و بعضے از تذکرہ ہا من اولہ الی آخرہ سیر نمودہ چیزے کہ مرغوب طبع صاف پسند افتاد آن را جدا بر صفحہ قرطاس ثبت
نمودہ بر ترتیب تہجی اسمے شعراء در عایت ردیف دیوانے علیحدہ ترتیب داد و دانش دیوان منتخب نہاد تا ہر گاہ خارج از شوق رگ
جان بجزاشد سیر اس مجہوز رنگین تسلی فی تواند بخند و بعد منکے ترکیب عنصری ہر قدر دان سخن کہ گلگشت این کلشن بے خزان میل نمود،
بملادت طبع نور شد گرد و بلغا تو خیر روح مولف را شاد نماید چون تا میفش در سنہ تسع و ستین دمایہ و الف صورت بست رباعی بدینگوہ صدد
صفحہ مزین نشست۔ ملاحظہ۔

این نسخہ کہ دارد ز سخن عنوا نہا یک قطعہ زمین است، در دبستانہا

چون منتخب کلام ہر دیوان شد تاریخ شدہ منتخب دیوانہا (۱۱۶۹)

چون خرف پارہائے موزونات سابق این فیض یاقوت آن ندارند کہ در مسک گوہر ہائے آبدار
اشار سخن سنان کامل عیار منسک شوند ازین جہت مشتے نمونہ از غرور بیتے چند بطریق
یادگار در این جانگارش می رود تا سخن فہاں رنگین فطرت (دوستے) بہ تحسین برآرند و دریابند
کہ مولف این دیوان منتخب طبع موزوں داشت و آن امنیت لے

اسی قلمی نسخہ میں دوسرا دیباچہ انوار السراج یعنی کلیات سرخ مرتبہ شاہ فیاض الدین پر دانہ برہان

دیباچہ انوار السراج

پوری کلمے اس کا متن ہم پہلی بارشائع کر رہے ہیں اس سے سراج کے بارے میں کئی اہم باتیں

معلوم ہوتی ہیں جن کی طرف آگے اشارہ کیا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵

لے دیباچہ ۱۱۶۹/۱۵۵۵ء میں لکھا گیا اس لئے سراج نے اس میں مطابقت ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں تاسوی ترک کی۔

تذکرہ گل رعنا تفسیر اور نگ آبادی میں آیتاں اس فقرہ اس ۱۰۰۰ سالگی سے موزوں کشید تک ہے (ص ۲۳۲ - ۲۳۵)

تلو دیباچہ منتخب دیوانہا (قلمی) ورق ۸ - الف۔

داد ہاتف سال تاربخش ندا شد منور بزم زانوار السراج (۱۲۰۹ھ ۴)

فنی نماد کہ ابن بے لصاعت تلیل الاستطاعت بیت و ششم رجب روز دوشنبہ در سنہ خمس دار بعین دماہ و الف لباس
ہستی پوشیدہ از انکشاف صبح منور کہ سنہ سبحة و خمین دماہ و الف باشد در خدمت میں مروت بعد عالی لب سرور و الاحب درین رجبہ اسناد
تا گرد خواجہ عالی نزد سر حوت زخار تند توری مہر مہدی المیتن انیشا بوری ابرہہ لغوری بقدر مسعدت دت شعر رجبہ متیق کرد و در بہان یام سعادت
اجام مطابق سنہ احد و ستین دماہ و الف آستان بوس جناب تقدس انتساب مجمع محفل ادبا حضرت سراج الانصبا عیشانی بخت افروخت و شرف بعیت
سرمایہ دولت نسیان آمد دست و قریب ستارہ سال در حضور روز آن آفتاب مشرق ہدایت و عرفان راہ نامہ اہل عشق و دودھان ربیت ظاہر و
باطن یافت و در عدد سنہ بعد ہسین مایہ و الف چہار ماہ و ہست و دو روز قبل از وصال مقدس کہ روز عرس شج آن نصرت بود خواجہ مادر حضور
جہور فقر و غصہ و مشائخ نہرا این بے اسعداد معنی را نیاز دمرہس و (حوشیق گردانند و ذرہ بے مقدار را از تحت المری باد
نملک الانلاک رسانند و در سنہ مطور چہارم توالت روز جمعہ وقت نماز پیشینہ خاطر را از اقامت این بزم مانی برداشتند و بقدم فیض توأم محفل
باقی را نورانی ساعد۔

مورحان تاریخ ہائے مراد ان تھہ روح روح مقدس مطہر نمودند از ان جملہ حضرت میرعلام علی آراد مظلمہ السالی کہ داکتر میں
ہی آمد این قطعہ انشا نمودہ اند۔ قطعہ۔

شاہ سراج آنکہ ز نور سخن از ہر آتش نضال گوے بود
ہاتف و موعظہ تاربخ او گفت سراج شعرا جیف مرد
و فخر برادر زادہ آن جناب میرادلاد محمد فاضل بسید امتیاز خاں متخلص بذکا سلمہ اللہ تعالیٰ این قطعہ گفتہ
چراغ دودہ آں جاں سراج الہی کہ بود روشن از و محفل سجداتی

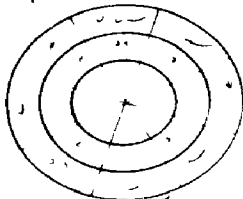
✽ ادلا د محمد حان دکا کے قطعہ تاریخ میں ہوا گئے درج ہوا ہے تیادم شوال مسج آدمیہ نظم ہوا ہے و مگر اس قلمی نسخہ میں چار ہتوال روز آدمیہ ہے ارر رصراحت
ت کا ہے کہ نماز میتیں دطر کے دمت ان کا انتقال ہوا۔

ادلا د محمد حان دکا میرعلام علی آزاد بلگرامی کے بیٹے ۲۰ رجب ۱۱۵۱ھ / ۳ اکتوبر ۱۷۳۷ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸ء - ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۴ء
میں پیدا آزاد بلگرامی کے پاس اورنگ آباد آ گئے۔ پانچ سال رہ کر ۱۱۷۴ھ / ۱۷۵۹ء - ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۴ء میں بلگرام چلے گئے۔ رجب ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۴ء - ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۵ء
میں آنے نواب مصمم اللہ شاہ خاں کے فرزند میرعلی حان نے خطاب عالی اور تاریخ ہراہر سالانہ کی جاگیر والی ریاست سے مقرر کردادی تھی پھر یہ حیدرآباد
چلے گئے۔ (کل مجاہد ۵۳ - ۵۴)

نمود چارم شمال روزن آدینه بشع ابن عمر دامن افشانی
 زتیره بزم جہاں فنا بدار بقا فروغ ناصیہ خویش کرد ارزانی
 کینہ تسلہ تاریخ سرزمین ذکا "سراج بزم ارم را فودہ لورانی"
 (۱۱۴۶ھ)

راہ لچھی نران شفیق غلام از تلامذہ حضرت آزاد این قطعہ نذر گد را بند - قطعہ
 سبقت پرست عرفان سج کہ از دیانت سرحد و حسن رواج
 سال رحلت شفیق کرد رقم مد بر حمان نمود ستاہ سراج
 (۱۱۴۶ھ)

و بدر رنگ مبر غلام علی تنہا تخلص ابن مادہ تاریخ بافتند "سراج راہ بہشت" دین مبارک را حساب مواقیع لفظاً (۱۱۴۷ھ)
 احمد کہ بہجاء دسم است دسام الولایۃ تاریخ تولد و تاریخ دصال اقدس خاتم الولاء احمد بافت۔



دیز فیروز دائرہ تاریخ کہ بحر کز نشاندہ و از ان تواریخ لا تعداد ولا تضحی بر می آید دائرہ انیسیت۔

راہ باب شور مخفی و مستور مباد کہ این دائرہ تاریخ وضع کردہ حضرت مرموصوف است مدظلہ العالی و فقیر این دائرہ بر آن تراشیدہ و
 پیش ازین دائرہ تاریخ چہار دہ خانگی محصی وضع کردہ و اساس آن بر دو تاریخ گذاشتہ در بین الانام مشہور است و آن دائرہ مشہورہ عداد
 سننی دارد کہ بآن - استخراج تاریخ راست فی آید یعنی واحد و چہار دہ و اضافش اول (حضرت میر صاحب در کتاب سمیتہ
 المرجان دائرہ مشتملہ یعنی ہشت خانگی وضع کردہ اند و بناؤ آن بک تاریخ گذاشتند) دائرہ مشتملہ انبیت کہ اعداد منقشی اصل
 دارد از واحد تا لا نہایت بہر عددی کہ شمارند تاریخ بر می آید۔

طریق استخراج تاریخ از دائرہ مشتملہ انیکہ ہر خانہ کہ خواہند مبداء قرار دہند بہر عددی کہ ملاحظہ رسد شمار نمایند و بہر خانہ کہ شمار تمام شود
 عددش بگیرند پس اعداد شمار اگر مرد است ہمسایہ خانہ منتهی مبداء گردانیدہ نمود نمایند مرہ بعد آخری و دورہ دورہ تا آنکہ منتهی حارہ منتهی مبداء اصل
 شود اکنون اعداد غامات را جمع کنند پس مجموع آن تاریخ شود و اگر زوج است خود منتهی را مبداء گردانند پس منط بہ شمار بجز منط تا آنکہ مبداء اصل گردد
 و پس مجموع اعداد تاریخ شود۔

و نیز حضرت میر روش ضمیر در سمیتہ المرجان نوشتہ اند کہ دائرہ چہار خانگی و یا زودہ خانگی ہم اعداد منقشی ندارد و دیگر بر یاران کرم نستہ
 مروض می شود کہ بدو توجہ جناب حاجہ ندیس سرہ ازین خاکدان بحوار لا مکان فقدان این دولت عظمی و حقوق حالت تنہائی طرہ کردہ تے آورد و دل
 و حشت زدہ را کہ خوگر صحبت ارباب کمال بود وسیلہ اطمینان ناگزیر امتداد بطیبہ کہ مصالحہ امراض روحانی تواند کرد و در کار شد خود را البالی حدیث خود
 فضائل دہر زبہ کلامے عصر جدید زمان فرید جہاں امام ائمہ المتقین مقدمہ البیش متاخر حسان ہندوستان سجان این کشور جبت نشان عدم
 فنون عرب و عجم فنامہ افتخار روح و ظلم صاحب حب و نسب گرامی سیدی سندی حضرت میر غلام علی آزاد الحسینی الواسلی البکراچی اوام اللہ ظلالہ
 خلدہ الفضائل رساند و بدولت تلمذ سرمایہ فراوان حاصل کرد و نیز کمند جذب کاٹے حنان مرا سوسے خود کشیدہ اعنی حضرت سیدالانقیاد ابروئے خاندان
 مجدد علا برزخ کبری غیب و نہاد مرج البحرین خیریت و طریقت و آتف رموز سنوی وارث اسرار نبوی مرآۃ نبلیات (ربانی) (شہ) انوار
 بھانی نیکت حسن خلقش معطر () دماغ جہانیوں و سر رستہ تواضع اشش کنند انداز دلمے ز مانیان سید الغفر و الامتاکین

حضرت میرزا غفر اللہ علیہ الرحمہ علی رؤس المجالس الحمد للہ کہ بدستباری توفیق گلبا از ریاض مخفل عالی حیدم و نوتہما از خرم مزروع والا سرداشتم
دبا خواجہ ماقدر اللہ سترہ العزیز این دو برگزیدہ انفس و آفاق را احلاص بمرتبہ اتم بود و احکامات ستر و شکر جادہ سے نود حالاً لعودۃ صلی شروع در
مقصد اصلی می نمایم و بابت تاج آں ابواب فیض رودے مطالعہ کمدگان فی کشایم و در خاتمہ کتاب برغے از ترنات خود ہم اثبات خواہم کرد و خادام
زادہ را در صف سال مقدم زادہ جانخواہم دادہ

اگرچہ نیک نیم خاک باے بیکانم
عجب کہ تشہ نما منم سفال رجا نام

جسی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر

۲

یوسفیہ عبدالقادر سردری نے کلیات سراج کی ترتیب و تدوین اور تصحیح متن بن خاصی محنت کی ہے انہوں نے دستیاب مواد کی مدد سے
کلیات کا مقدمہ بھی خاصی تفصیل سے لکھا ہے، بس اس کے سوا کچھ یہ بہت سی بنیادی معلومات بھی نہیں آ سکی ہیں، سردری نے اعتراف کیا ہے
کہ ان کے خاندان کے متعلق ہم اب بھی بہت کم جانتے ہیں، ان کے اجداد کے حالات دریافت کرنے کا فی الحال کوئی درجہ ہمارے پاس نہیں
ہم نے محظوظہ کلیات کا جو مقدمہ ادب درج کیا ہے اس سے کچھ باتیں پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہیں یعنی (۱) سراج اور رنگ آبادی نسبتاً کالمی
سد تھے، چارلیت ادیر ان کے راد اید محمد مدبہ سورہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے عادات بارہر کے علاقے جالٹھ ضلع مظفر
میں سکونت اختیار کی تھی۔ سید محمد کے بیٹے سید اولیاء ان کے بیٹے سید ویا ان کے فرزند ہو گئے اور ان کے درسد دردنس مند تھے سادات بارہر میں
ان کی رشتہ داراں بھی ہوئیں اور رنگ زب (د ف ۱۱۸ھ / ۱۷۷۷ء) کے آخری زمانے میں سید دردنس مند کے کن طرف ہجرت کی تھی اور رنگ آبادی
میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہ نفل مکانی بارہویں صدی ہجری کی پہلی دہائی میں ہوئی ہوگی، یہاں انہوں نے سید عبداللطیف شہید قادری کی دختر سے نکاح کیا
جن کے بطن سے سراج الدین پیدا ہوئے ان کے اور کسی بہن بھائی کا حال معلوم نہیں ہوتا ہے کہ دردنس محمد سید دردنس کے لیکن
خاتم پر یہ سمجھ کدہ کیا ہوا تھا "دردنس گوہرلیت زدر باے اولیا" اس میں ان کے تین اجداد کے نام آگئے ہیں رائج الموت علم و فضل کے معانی
عربی فارسی، علوم دینیہ اور فارسی ادبات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ وہ بچوں کو تعلیم دینے میں اپنا وقت صرف کرتے تھے اور سراج کی تعلیم
بھی انہیں کی نگرانی میں ہوئی تھی۔

سراج کی ولادت دوشنبہ ۱۳ صفر ۱۱۲۲ھ (مطابق ۱۱ مارتچ ۱۷۱۲ء) کو اور رنگ آبادی میں ہوئی۔ ظہور احمد (۱) اور خاتم الاولایہ سے تاریخ
ولادت برآمد ہوتی ہے سردری نے قیاس و تخمین سے سنہ ولادت ۱۱۲۸ھ میں کیا تھا اور قاضی عبدالودود نے بھی ۱۱۲۸ھ / ۱۷۱۰ء - ۱۷۱۴ء ہی

ملہ میر غفر الدین حسینی ترمذی حاجی عبداللہ حیدر تانی کے نواسے اور سید محمد حیات کے داماد، ابتدا میں سیاحی میتہ تھے، ترک لباس کر کے ماہ ہجرت انتشار کی۔

شہن صاحب لے ہمیں ماز کر کے خرم پہنچایا۔ (گل مجاہد ۱۲۳)

+ عبدالقادر سردری :- مقدمہ ۲۸

لکھا ہے۔ ضیاء الدین پروانہ نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پنجشنبہ ۲۶ رجب ۱۱۴۵ھ / مطابق یکم جنوری ۱۷۳۳ء کو پیدا ہوئے، ان کا نام میرزا عطا ہے، جیسا کہ خود ترقیہ میں بھی لکھا ہے مثل قبیلہ برلاس سے تعلق تھا۔ ان کے نانا میر برمان اللہ سادات حبیبی میں سے ہیں برمان پور سے ۲۰ کوس پر ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ (۷ شوال ۱۱۴۳ھ / ۴ اپریل ۱۷۳۱ء) سن ستور کو پہنچ کر برمان پور آنے اور یہاں سراج اور رنگ آبادی سے ملاقات ہوئی پھر یہ اورنگ آباد چلے گئے آزاد بلگرامی سے استفادہ کیا، ان کی مدح میں اشعار بھی لکھے ہیں گل عجائب کی تالیف کے وقت میر حامد یار خان ارسلان جنگ برادر اعیانی میر موسیٰ خاں رکن الدولہ وکیل مطلق آصف جاہ ثانی کے متوسل تھے۔ مہن برمان پوری کے والد میر محمد امین مرزا عبدالغفار ریدل کے تانگہ رکھتے۔

۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۴ء - ۱۷۴۸ء میں سراج اورنگ آبادی سے سیت ہوئے اور سولہ سال تک ان کی خدمت میں رہ کر فہن حاصل کرتے رہے۔ اپنے انتقال سے چار ماہ ۲۲ بوم قبل دینی ۱۵ جمادی الاول ۱۱۷۷ء مطابق ۲۱ نومبر ۱۷۶۳ء (م) جو سراج کے مرشد حضرت شاہ عبدالرحمن چشتی علیہ الرحمہ دف ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کے عرس کا دن تھا، سراج نے شہر کے متاع اور معزز حضرات کی موجودگی میں شاہ ضیاء الدین پر دان کو خلعت و اجازت سے بھی سرفراز کیا تھا

آخر سراج نے ۵۳ سال عمر پا کر جمادی شوال ۱۱۷۷ھ / مطابق ۶ اپریل ۱۷۶۴ء (م) ظہر کے وقت اورنگ آباد ہی میں انتقال کیا۔ وہ ساری عمر مجروح رہے نفا احمد سے ان کی عمر کے اعداد اور خاتم الاولایت احمد سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

مقدمہ انوار المسراج سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ علام غلام علی آزاد بلگرامی سے سراج کے مخلصانہ تعلقات تھے حکیم بیگ حاکم نے بھی سراج سے دوبار اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے ایک بار وہ سراج کے گھر برمان سے ملا تھا

ضیاء الدین پروانہ برمان پوری نے سراج کے انتقال کے بعد علام غلام علی آزاد بلگرامی سے شعر و ادب میں تلمذ کا رشتہ قائم کیا اور میر فرخ الدین اورنگ آبادی سے فیوض دہانی حاصل کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے سراج کے ملفوظات بھی انوار المسراج کے نام سے فراہم کئے تھے اس میں ان کے آخر زمانہ عمر اور مرض وفات و رحلت کا حال تفصیل سے لکھا۔ اگر یہ مجموعہ دریافت ہو جائے تو سراج کی زندگی کے بہت سے گوشے روشن ہو جائیں گے۔

اپنے بارے میں خود سراج نے جو کچھ دیا چرمنتب دیوانہ میں لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲-۱۳ سال کی عمر تک تحصیل علم میں مشغول رہے تیرہ سال کے ہوئے تو سلطان عثمان کا غلبہ ہوا اور یہ بخودی کے علم میں سات سال تک حضرت برمان الدین غریب کے روئے پر پڑے رہے، راتوں کو جاگتے اور دشت لوروی کرتے تھے، اور دواہانہ انداز میں شعر کہتے تھے، اس کا بڑا حصہ صانع ہو گیا اسی عالم میں کچھ زمانہ وہ بھی گزرا جب ان کے والد سید درویش محمد نے ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

کچھ زمانے کے بعد اناقر ہوا اور انہیں تقریباً ۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۱ء) سید عبدالرحمن چشتی کا دامن ہاتھ آ گیا، انہوں نے فقر و فنا کی ساری منزلیں طے کرادیں۔ سراج نے بیعت کے کچھ زمانے کے بعد مرشد کے حکم کی تعمیل میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ ان کا جوار دو کلام ہمیں ملتا ہے وہ صرف ۲۸ سال کی عمر تک کہا ہوا ہے اور ان کی شہر گوئی کا کل زمانہ ۱۵-۱۶ سال قرار پاتا ہے اتنی عمر اور اتنی نحوڑی مدت میں بہت کم فن کاروں نے اتنا شاندار اور لازوال سرمایہ یادگار چھوڑا ہے سراج نے جب شہر گوئی ترک کی ہے ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) اس وقت تک

میرا رسوا نے شعر کہنا شروع بھی نہیں کیا تھا لے
مجھے بعض تذکرہ نویسوں کا یہ باں صبح ماننے میں نزدیک ہے کہ ”در سک پہا بہاں نوکری می کرد، الحال ترک دوز کار کردہ“ †
سادات بارہ نوح میں نوکری نوکبا کرتے تھے اور اسی کے لئے وہ مشہور تھے، مگر سراج کو اس کا وقت ہی کہاں ملا؟ یہ ممکن ہے کہ
بہت ہی ٹھوڑے وقفہ کے لئے انھیں ان کو لسانی علاج کے طور پر سنل دیا گیا ہو، مگر اس کے لئے انہیں کسی رسلے میں بھرنی کرانا پڑا ہو مگر
ان کی اور کوئی شہادت نہیں ہے۔

سراج کے بارے میں اور بھی بہت سے لے سرو پا ادا نے مشہور ہو گئے ہیں، میں نے لکھا ہے کہ رسول خاں نانی ان کے منظور نظر
تھے حالانکہ عبدالرسول خاں ان کے پیر بھائی تھے اور سب سے پہلے انہوں نے ہی کلام سراج جی کہا تھا، بعض تذکرہ نگاروں نے کسی ہندو عورت
پر عاشق ہونے کی داستان بیان کی ہے لیکن سب جالی تھیں اور بے سرو یا باتیں ہیں، تیسرا اور چوتھا لے لکھا ہے کہ یہ کسی ہندو پر عاشق ہوئے
اور جب لڑکی کے باپ نے اسے مرشد کے حکم سے دونوں عاشق و معشوق کو یکجا ہونے کا منع دیا تو ان کا ایک ساتھ دم نکل گیا، ان کا کام بردار
اور وصل جاننا غیر از حیاں داد و نیت، سراج پرواز دار گرد آن چراغ محفل حس گردیدہ جاں بجاں آفریں سپرد او نیز تنہا کردار لکھتے،
بر سر نقوش سوختہ خویش گریستہ مرد †۔ محمد حسین خاں مولف ریاض الفردوس نے بھی یہی کہانی دہرا دی ہے کہ ”عشق شمع ہوئی ہنگام دسال
جاں دے گیا“ N۔

ای داستان عشق ابدہ سراج نے مثنوی بوستان خیال میں نظم کر دی ہے بعض دوسری مثنویوں میں بھی کچھ سوانحی اشارے مل
جاتے ہیں۔ ان کے آخری زمانے اور ہماری کی کیفیت سراج کے خطوط میں موجود ہے جن کے اقتباسات سروری نے مقدمہ کلیات میں درج
کئے ہیں، تیسرا ”رنگ آمادی کی سراج سے ذاتی ملاقات تھی اس نے لکھا ہے کہ ”تہا سراج خلیہ صاحب سو رو گداز بود“ ان کے کلام سے
بھی طبیعت کے ”دزد گدار اور رقت جھج کا سا چلتا ہے۔“ یہی کہانیاں کہ ان کے گھر پر ہر جمعہ محفل سماع منعقد ہوتی تھی جس میں ہم مسترب اور
ہم ذوق احباب شریک ہوتے تھے اور بعد حال کا ہنگام گرم ہوتا تھا۔

س

سراج اور نگ آبادی آج اردو کے ہایت اہم اور ان سر سر آرد وہ شاعروں میں شمار ہونے میں جنہوں نے اردو شاعری کی بنیادیں
مضبوط کی ہیں، لیکن ایسے زمانہ بہت ہیں وہ ایک صاحب دل مونی اور درویش کی جھبٹ سے پیچھے جاتے تھے اور شاعری ان کے لئے

† لے سراج کو بعض تذکرہ نگار نکات طبع ۱۰۱/۱ متلا میر جس ۱۰۵ اتوق (۲۲) مدعرہ علی دکن کا تارڈ لکھتے ہیں لیکن قدیم تر آخذ سے یہ بات

ثبوت کو نہیں پہنچی —

† جمعۃ السراء (دقاقتال) نعلی۔ آ صغیر (کوالہ مقدمہ کلیات سراج)

† گلشن بے غار میں گلش ہمیشہ بہار ۱۷۲

N ریاض الفردوس ص ۹۱ (لاہور ۱۹۶۸ء) لے گل رعنا (مسلو تیں تذکرے) ۲۳۵

شانوی حیثیت رکھتی تھی۔ (پردانے کھا ہے۔

شاعری ننگ سید مایود ویکراں اقماری دانسند -

انہوں نے اسے اپنے واردات ملی کے اظہار کا ذیل بنایا تھا اس لئے ہیں اس کی شاعری میں تصوف کا وہ رنگ نہیں ملتا جسے برے
مخبر گفتن خوب است کہا گیا ہے، بلکہ وہ ایک عملی صوفی (PRACTISING) کے حدود حال، ذوق و شوق، دل و غرام اور کرب و نشاط

کی سچی تصویر ہے۔ انہوں نے مصطلحات تصوف کا استعمال زیادہ نہیں کیا ہے، لیکن کیفیات وہی بیان کی ہیں جنہیں اصطلاحی زبان میں بہا جاتا
تو وہ مسائل تصوف میں جاتی ہیں۔

سراج حنفی سلسلہ میں بیعت ہیں، اگرچہ ابھی تک اس کے ہر درشد شاہ مدارج میں چہیتی کے بارے میں کچھ معلومات نہیں مل سکی ہیں لیکن
غالب گماں رہے کہ وہ سلسلہ حنفیتہ نظامیہ سے وابستہ رہے ہوں گے کیونکہ اس سلسلے کی اور کوئی شاخ اس وقت تک دکن میں رائج نہیں ہوئی تھی
اور اس سلسلہ کی ایک بڑی خاندان حضرت نظام الدین اورنگ آبادی (د ۱۲ دی قعد ۱۱۴۲ھ / ۱۸ مئی ۱۷۳۰ء) کی اورنگ آباد میں موجود ہے جو ہجرت
شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (متوفی ۲۴ / ۲ / ۱۱۹۹ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۷۸۹ء) کے مرید و خلیفہ ہیں اور حضرت شاہ نظام الدین کے فرزند حضرت شاہ فخر الدین
محب البینی نظامی (۲۷ جمادی الثانیہ ۱۱۹۹ھ / ۷ مئی ۱۷۸۵ء) اپنے زمانے میں سلسلہ حنفیتہ نظامیہ کے مجدد ہوئے ہیں ممکن ہے شاہ عبدالرحمن
چشتی کو حضرت شاہ نظام ہی سے نہیں روحانی ملا ہو کیونکہ دونوں کا زمانہ ایک ہی ہے۔

حنفی سلسلہ کی خصوصیات میں سوز و گداز، وجد و شوق اور عشق و محبت بہت نمایاں ہیں اس کے علاوہ سلسلہ حنفیتہ کے اکثر سرگرم ملک
وحدت الوجود کے فائل رہے ہیں۔ سراج کے کلام سے سوز و گداز یا وجد و شوق کی مثالیں دیا تو باعث طول کلام ہوگا البتہ ان کے نظریہ تو جدید
کی طرف اشارہ کرے والے بعض اشارے پیش کرتا ہوں۔

۱۷۹/۷	ایک دانت میں ظہور ہوا کئی صفات کا	اے بت برست دیدہ بیاسے دیکھتوں
۱۸۰/۳	آب سے شوق پتنگوں کون ہے جل جانے کا	مت کر دیم کون بدنام، جلاقی وہ نہیں
۲۲/۳	عالم ظاہر کا وہ غافل ہوا	پردہ تسری کھلے ہے جس اوپر
۲۲/۷	شکر رحمن کر کہ تو داخل ہوا	یار کا دیدار پا کر اے سراج
۳۰/۴	آہرش دونوں کا سگم ہوئے گا	کھردایاں دندہ ہی عشق کی
۵۵/۱	وہ اسرار وحدت کا حالی ہوا	جو کوئی تنہا کثرت سے خالی ہوا
۹۰/۱۱	جس نے مزہ دیکھا نہیں عشق مجاز کا	مگر نہیں ہے اس کو حصص کی جاتی
۹۱/۱	کہاں ہوتی ہے عشق کے حرف کا	جسے تنہا ہے نحو اور صرف کا
۹۳/۲	اس نے کچھ عمر میں پیدا کیا	اپنی آنکھوں سے جو نہاں نہ ہوا
۹۵/۱	محرم خلوت لاہوت ہوا	جو اٹھا مجلس نامہ سوتی سے

(۷/۶۶)	سراج اب دیدہ دل سے مدد دیکھا صنم بھولا	نظر کو دیکھ ہر شے منظر نور الہی ہے
(۱/۸۶)	سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا	دورنگی خوب نہیں بک رنگ ہو جا
(۱۲/۸۹)	اگر دیکھتا ہے تو دیکھ آئیے بس حدائی دینغیری کا تماشا	مری جشم جبران کے درپن ہی ظالم تو بہتری بے بناری کوں ہیں
(۱/۸)	دوست ہے اس کی جیت میں نور جمال دوست	جس کوں ہوا ہے آئینہ دل حال دوست
(۵/۸)	کوئی دوسرا نظر نہیں آیا جمال دوست	دیکھتا ہوں سب طرف نگہ امتیاز میں
(۵/۴)	طولی تصویر آئینہ نہیں گویا ہنوز	جب تلک عکس دونی ہے تب تلک ہے کھنکھو
(۴/۶)	ہے سار خوشی لب تصور کی آواز	حیرت کے مقامات میں قافوں تو اہیں
(۱/۲)	کہ اصل ہستی نابود ہے عدم کا عدم	صنم ہزار ہوا تو وہی صنم کا صنم
(۱/۵)	ہستی میں نیستی ہے اور نیستی میں ہستی	راہ خدا پرستی اول ہے خود پرستی
	دل میں ترک ماسوا درکار ہے	عشق میں اول فنا درکار ہے
	جس کو دل کا مدعا درکار ہے	ترک مقصد میں مقصد ہے اسے

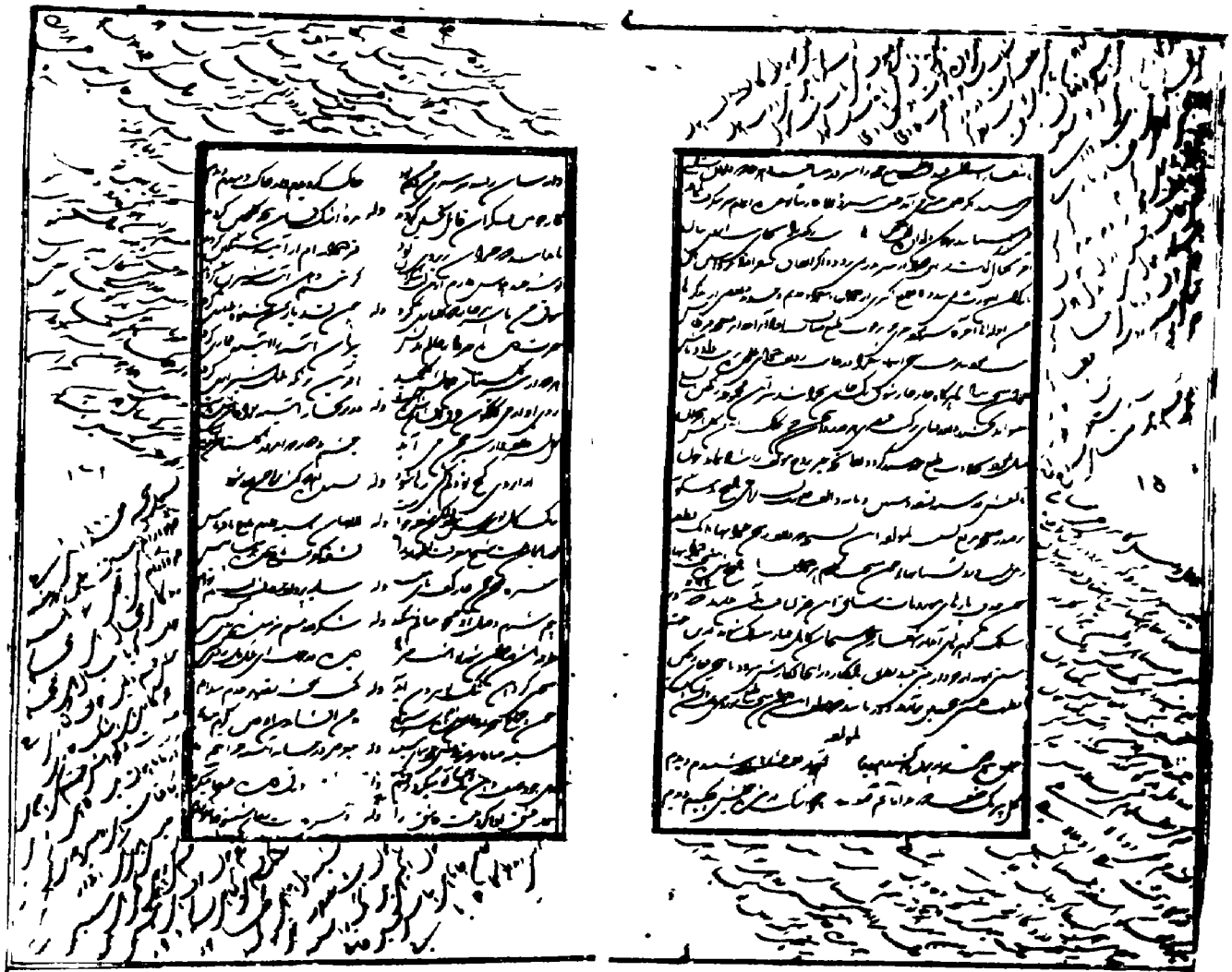
سان بس فی دلتی رسول ہے دامن علی شوق وحدت نوا کی
 درو دیوار اس کو منظر محبوب ہوتا ہے تراب معرفت بی کر جو کوئی مجدد ہوتا ہے
 عالم ظاہری ہیو لا ہے بوالہوس کیوں تو راہ بھولا ہے

سراج کے کلام میں تصوف کے فلسفیانہ مباحث کی تلاش کرنا عبث ہوگا، وہ نظریہ تصوف سے زیادہ عملی تصوف کے آدمی ہیں ہاں ان کی شاعری کا مطالعہ بھیکتی تحریک کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے صاف اور سہل زبان میں عشق مجازی کے مضامین چھوٹی چھوٹی نعروں میں بڑی خوبی سے مانڈھے ہیں، وصل و فراق، باد و سناغر، جشم و گیسو، خال و خطا کی قدیم مہلاتوں اور استعاروں سے انہوں نے اپنی سرمستی و سرشاری، بے خودی و بیقراری و الہانہ کیفیات و واردات کا بڑا پرتا شیر بیان کیا ہے۔ کیفیات عشق اور سوز و سرمستی کے اظہار کی قدرت رکھنے والے ہمارے صوفی شعراء کی فہرست میں سراج اور رنگ آبادی کا نام سب سے پہلا ہے، ان کے بعد ہم خواجہ میر درد، شاہ نیاز احمد بریلوی، امجد حیدر آبادی اور بیدم دار ثقی ہی کا ذکر کر سکتے ہیں۔

بسم الله الرحمن الرحيم
 سبب استخاره با سحر و جادو است و در این میان بارگاه خداوند تعالی و
 جلاله و شانه مشایخ عالم را در دست جبر الیاح عدد و کائنات حیرت انگیز
 عوالم غیبیه است که در این میان در فقه و حدیث و کتب معتبره
 انما اصح التعمیم در این میان است و در میان اینها است که در این میان
 و در این میان است که در این میان است و در این میان است که در این میان
 طراز نسخه نگاشته است و در این میان است که در این میان است که در این میان
 طریقت که در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان
 روح انوار طریقت و طراز نسخه نگاشته است و در این میان است که در این میان
 طریقت که در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان
 مقام خاتم سراج بر روی کلام و در این میان است که در این میان است که در این میان
 سراج المصباح و در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان
 و طراز نسخه نگاشته است و در این میان است که در این میان است که در این میان
 الحیرة النضره و در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان

۱۰۱

و در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان
 در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان
 سبب استخاره با سحر و جادو است و در این میان بارگاه خداوند تعالی و
 جلاله و شانه مشایخ عالم را در دست جبر الیاح عدد و کائنات حیرت انگیز
 عوالم غیبیه است که در این میان در فقه و حدیث و کتب معتبره
 انما اصح التعمیم در این میان است و در میان اینها است که در این میان
 و در این میان است که در این میان است و در این میان است که در این میان
 طراز نسخه نگاشته است و در این میان است که در این میان است که در این میان
 طریقت که در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان
 روح انوار طریقت و طراز نسخه نگاشته است و در این میان است که در این میان
 طریقت که در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان
 مقام خاتم سراج بر روی کلام و در این میان است که در این میان است که در این میان
 سراج المصباح و در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان
 و طراز نسخه نگاشته است و در این میان است که در این میان است که در این میان
 الحیرة النضره و در این میان است که در این میان است که در این میان است که در این میان

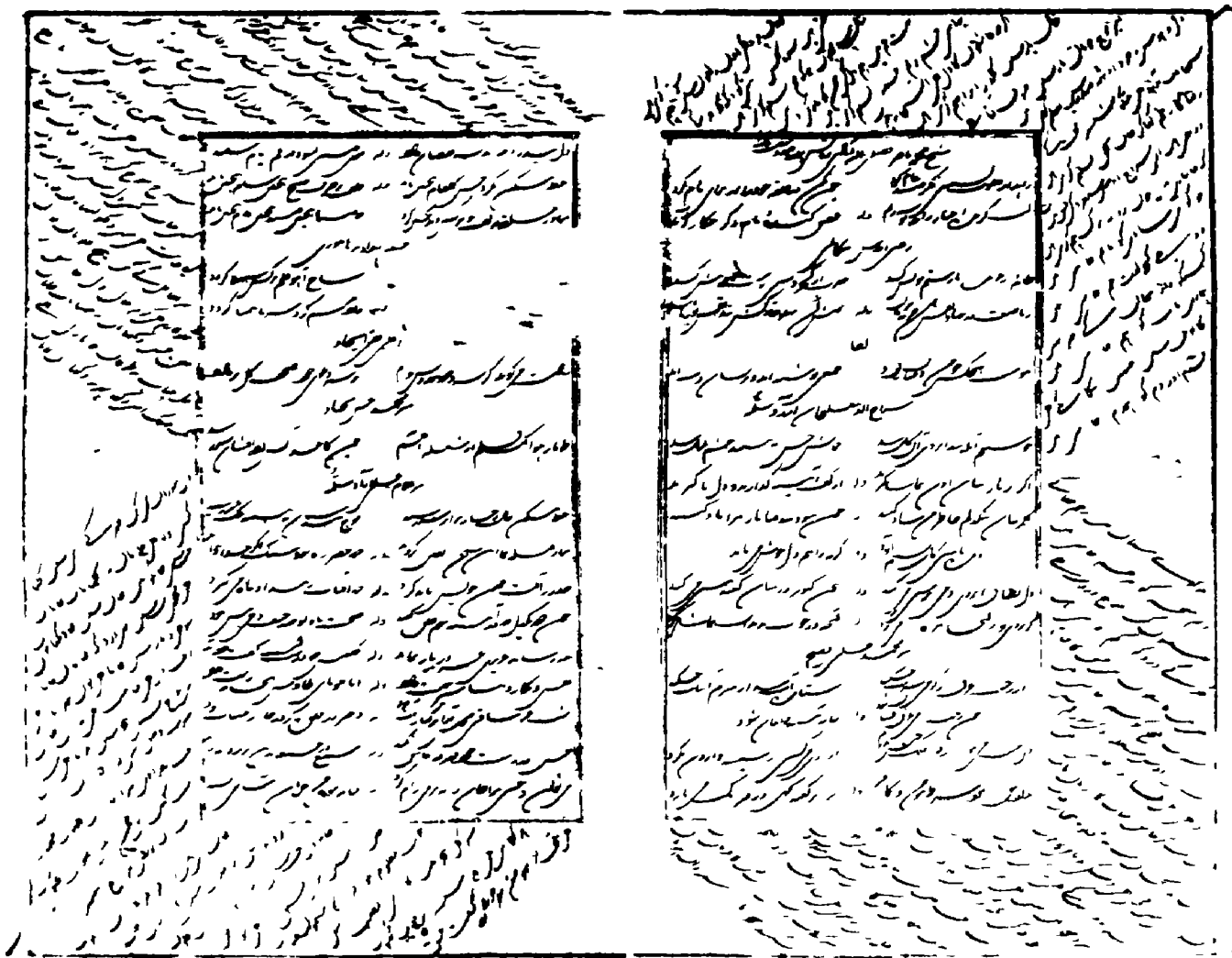


سکبره در این
 و سید علی امیر زمانه بار خدو و عرسه
 مخفی کنجید ز نور کواخده سب خورشید
 راقم ضعیف کو خورشید حضرت خواجه بوسر حقیقت
 ماز سادات کافیه توحید در بحر فکرمه کلام
 سوز کوهن از انجا خست سحر جانت پند و گریه
 ایت در حدو شام در کف لعل رسین قصه جانت
 با عصا دست لعل طر اهل بودند قرات در میان آفتاب
 واحد اودرخی اطن بطن سیر روزگار اعتبار عام سر
 دالایه خواجه ما در ادخرا خسته کمان از جانت بر آفتاب سر
 رسین در لعلی طرح افان ریخت جاسید در علوم مستداده صاحب
 بود همیشه با فان طلبا اوقات شرف معهودید است نقش کمر ای
 است در و سیر کو هر لب ز دل آواز لبیا با لطف سحر
 سه لب دالو بغیر سید در و سیر سید گوهر بن سید دلا
 بعد خند مر سید سید خد لطف شهید قلم در حدو جانت
 دبل کجاست از نوادر نگار با اسون در سبک مذموج
 سین خواجه سیر دهم صفی زنده شنبه سندیج و
 در ادو نگار با بر صفت در آفتاب قمر موند در حدو طوار
 بعد وصول بسین شمر در حدو دالو با حدو نمود

مرج اورنگ آبادی کے حالات نوشتہ ضیاء بان پوری

[illegible]

سراج اورنگ آبادی
کے حالات نوشتہ
ضیا برہان پوری



نقش دیوانها مرتبه مزاج اورنگ آبادی کا ایک ورق

در حله درم نوود ما ست نصیر
خسته به یقین که منو مرع
درست جو نوود حرم سو عالم بالا
بیکه حد شر از نه نو جود زیا
در روز غدا بهر نو اسباب جاکر
کر دین جو نو صفت کسر دین
در چشم نوود نه سیر جوج میخ
ریش و لاک در منو نو نو
یکه در دست خب نه صدر نو
در ناس در قصر نو صد سو و پنج
تا نو سیر کمر مرع سو حذر نو
از فر تو در سینه افلاک طبل
به دست قصا تا کل رو نو نو
حوت نو در صده سیر سو سو
خر صم رسل نو در جیل سو سو
کر در نو کراس لک جوج سو سو
کات الحود اصع العا
نقل بهر سو سو سو سو
نقل بهر سو سو سو سو
نقل بهر سو سو سو سو

کلیات سراج
اوزنگ آبادی مکتوبه
۱۱۸۷ هـ کا آخری ورق

میر کی دریاۓ عشق کا ایک نادر و نایاب مخطوط

مکتوبہ ۱۲۰۶ ہجری (مطابق ۱۷۹۳ء) اور
میر کا غیر مطبوعہ کلام

اکبر حیدر کا شمیری

میر کی دریاۓ عشق اردو کی ممتاز مشنوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ دلی میں تصنیف ہوئی تھی اور غالباً میر کے عالم شباب میں مکتب خانہ ادبیات اردو حیدر آباد میں دیوان میر کا قدیم ترین مخطوطہ محفوظ ہے۔ یہ دیوان دوم ہے۔ اس میں دریاۓ عشق بھی صفحہ ۲۲۶ سے صفحہ ۲۳۴ تک شامل ہے۔ دیوان ”تصدیہ در شکایت لفاق یاران زمان“ ورق ۱۷۵ کے دوسرے صفحے پر ختم ہونا ہے۔ تصدیہ کا آخری شعر یہ ہے :

کہاں تلک میں کروں اس لفاق کا شکوہ
خونیں اب تو ہے ادلی کو اس میں راحت ہے

اس کے بعد ذیل کا ترجمہ ہے :-

”تمت تمام نند دیوان میر تقی بتا رنج بست و ہم شہر شال روز پنجشنبہ سنہ ۱۲۰۶ ہجری

لے میر کے تفصیلی حالات زندگی اور ان کے غیر مطبوعہ کلام دیوان میر نسخہ محمود آباد (مطبوعہ نقوش لاہور اکتوبر ۱۹۸۰ء) کی طرف رجوع کیجئے۔ ذیل میں چند مزید غیر مطبوعہ شعر درج کیے جاتے ہیں تاکہ ایک جا محفوظ رہ سکیں۔

- | | | |
|-------------------------------------|---------------------------------------|---|
| ۱۔ بے جرم تزیین کیا اس نے گلے کو | کچھ بات ہوئی مزے سے نکلتی تھی بھلے کو | (بیاض قدیم آگرہ) |
| ۲۔ دیکھ رونا میرا اس نے منہس دیا | برق چمکی ابر باراں مختتم گیا | (مجموعہ انتخاب ۱۸۷۳ء) |
| ۳۔ غصہ ہے کہ کہینا ہے ہڈوں نے سر | نکالے ہیں دو چار چٹنیوں نے سر | (مثنوی انور نامہ کلکتہ میر نسخہ رامپور) |
| ۴۔ چھڑیں نہ مجھ حاطہ افسردہ کو | مردہ ہکا بھانٹ اکھاڑے سے نہ ہو | (درذمت آئینہ دار نسخہ رامپور) |
| ۵۔ سائل ترے در پر کون آ کر بولا | جس کو نہ موتیوں میں تو نے تو لولا | (دیوان نویدی مطبوعہ ۱۳۵۷ء کلکتہ) |
| یہاں تک تو ترے ہاتھ نے بجھتے یا زوت | جو طشت نے دقت قصد دامن کھولا | (راجہ صاحب محمود آباد) |

ان اشعار کے علاوہ ایک پوری غزل نسخہ سالار جنگ کے ضمن میں مضمون میں شامل کی گئی ہے۔ وہ بھی کلیات میر کے مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتی ہے (اکبر حیدری)

بحسب فرمائش میاں محمد شکر اللہ من مقام شاہ جہاں آباد و بخط احقر العیاد نبذہ رادھا کشن کاتب نجر ریافت ۴
 مشنوی دریائے عشق کا جو دوسرا چرانا مخطوطہ راقم حروف کو دستیاب ہوا ہے وہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۹۳ء کا مکتوبہ ہے اس
 غیر مطبوعہ اشعار بھی ملتے ہیں، بن کی نشان دہی متن کے حواشی میں کی گئی ہے۔ یہ اشعار پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہے ہیں مخطوطے
 ابتداء میں کچھ اشعار غائب ہیں۔ جب اسے ہم نے دوسرے نسخوں سے ملایا اور مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ اشعار میں اختلاف ہے،
 اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً میر نے اس پر نظر ثانی کی ہو۔ راقم کو یہ بیش بہا نسخہ مفتی الہی بخش اکیڈمی کا مرحلہ صلیح مظفر نگر
 کے کتب خانے میں دستیاب ہوا۔ اس کے عکس کی فراہمی کے لیے جناب مہتمم کتب خانہ ہذا شکر یہ کہ مستحق ہیں تفصیلات
 ہیں :-

سائز ۴ × ۸ ۱/۲، متن ۱۲ × ۱۶ ۱/۲، خط جلی نستعلیق مائل شکست، سطر ۱۲ - ترقیہ - مشنوی (کذا) میر تقی میر
 دہش خود تبارتخ دوازدم ذوالحجہ ۱۲۶۷ھ تحریر یافت۔
 نوشتہ بماند سیہ - رسفید
 نویسدہ رانیت سردا امید

دریائے عشق کے جو قطعی نسخے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہیں ان کی تعداد ۱۶ ہے تفصیلات کے لیے جائزہ
 خطوطات اردو حصہ اول مطبوعہ ترقی اردو بورڈ لاہور مرتبہ جناب مشفق خواجہ ملاحظہ ہو۔ جن نسخوں سے ہم نے استفادہ کیا ہے ان
 کا ذکر خواجہ صاحب نے نہیں کیا ہے۔ اس لیے ان کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں :-

۱۔ نسخہ اُگھرہ (۱) اگرہ میں پچھری کے قریب ایک عربی مدرسہ شعیب محمدیہ اینگلو اورینٹل کالج ہے۔ مدرسہ میں
 ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں ایک مخطوطہ ”بیاض قدیم مدۃ ۳۲۷ کے تحت موجود ہے۔ بیاض میں میر تقی میر، میر
 درد، شاہ نصیر دہلوی، میاں روشن شاہ ہستخفی، سودا، افسوس، میر سوز، انشا، ماسٹر، المذخاں، بقا، خسرو وغیرہ وغیرہ
 شعرا کے اردو فارسی کلام کا انتخاب درج ہے۔ اس میں فارسی میں کئی مجلسیں واقعہ کربلا کے حال میں نقل کی گئی ہیں ہامین
 میں میر کا یہ قطع بھی ہے جس کے بارے میں قاضی عبدالودود، پروفیسر آل احمد سرور اور علی سردار جعفری وغیرہ کہتے تھے کہ
 یہ تیسرا نہیں ہے بلکہ اسے محمد حسین آزاد نے آبجیات میں انہی طرف سے گھڑ لیا ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو !

اس قطعے سے پہلی تیسری مشنوی دریائے عشق تیسری عنوان کے درج ہے۔ آغاز مشنوی میں درج ذیل عبارت موجود ہے :-
 ”تقی میر شروع مشنوی“

ابتداء :-	عشق ہے تازہ کا تازہ خیال	ہر گھاس کی اک الگ چال
خاتمہ :-	میرا شباعری کو کر موقوف	عشق ہے اک فتنہ معروف
	بس ہوا ب مہر خامشی بہتر	یہاں سخن کی فراہمی بہتر

پھر ذیل کا ترقیم درج ہے :-
 ”تمام شد مشنوی میر تقی بروز چہار شنبہ تبارک اول رجب المرجب ۱۲۱۶ھ ہجری“ تاریخ کے بعد میر کا غیر مطبوعہ شعر بھی ملتا ہے ۔

بے جرم تہ تیغ کیا اس نے گلے کو
 کچھ بات ہوئی مومنہ سے نکلتی تھی بھلے کو
 ۶۔ نسخہ سالار جنگ (س) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں شاہ کمال کا تذکرہ مجمع الانتخاب مکتوبہ ۱۲۱۹ھ ہجری ،
 (۱۸۷۸ء) موجود ہے ۔ اس میں میر کا انتخاب ورق ۱۶۹۱ سے شروع ہو کر ورق ۳۲ پر ختم ہوتا ہے ۔ انتخاب آنا بھر لو ہے کہ
 کتابی صورت میں ترتیب دیا جاسکتا ہے ۔ پہلی غزل یہ ہے ۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا ۱۰ شعر
 ورق ۴۔ الف سے مشنوی دریاے عشق شروع ہوتی ہے کمال نے اسے غلطی سے ”مثنوی بسجندب عشق“ کے عنوان
 کے تحت درج کیا ہے مشنوی ورق ۱۳ ب میں ختم ہوتی ہے ۔ ورق ۷۰ الف میں اس شعر ۔
 پار دریا کی جلد رخصت کی اس طرح فکر رفع تہمت کی
 کے بعد پانچ شعر کا ایک قطعہ ہے ۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہے ۔

گہر لو ہو نکلتا ہے گہر بخت دل آکھوئی یا ٹکڑے جگر ہیں گے ہر آن نکلتے ہیں ۔
 ان آئینہ رویوں کے کیا تیر بھی عاشق ہیں جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں
 اس کے بعد دولہے کے نیچے خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے ۔ معلوم نہیں ہوتا کہ اوپر کا قطعہ یہاں کیوں نقل کیا گیا ۔ جب کہ یہ اس
 سے قبل مجمع الانتخاب میں انتخاب قیر میں ورق ۶۹ الف میں پوری غزل کے ساتھ جس کا مشہور شعر یہ ہے ۔

مست سہل ہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
 تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
 ملتا ہے کمال نے دریاے عشق ”انتخاب دیوان پنجم“ میں شامل کی ۔ اس میں ۲۵۵ شعر ہیں ۔ کمال نے مشنوی میں ذیل کے عنوان آنا
 قرار دیئے ہیں :-

- ۱۔ مشنوی بسجندب عشق ورق ۴۔ الف
- ۲۔ ثابت شدن عشق بر آں جواں و بدگماں شدن اہل ۔ ورق ۶۔ ب
- ۳۔ در بیان رخصت شدن دختر از پدر ۔ ورق ۷۰ الف
- ۴۔ داستان فریب خوردن ورق ۷۰ ب
- ۵۔ بدون دایہ دختر با آشنائے پدرش و پس از ایک مہفتہ آمدن دختر بخاند و غرق شدن بہاں دریا ۔ ورق ۱۰ ب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مجمع الانتخاب سے میر کی وہ غزل بھی درج کی جائے جو رقی ۳۲، الف میں درج ہے۔
یہ غزل کلیات میر کے کسی نسخے میں نہیں ملتی ہے۔ کمال نے اسے ”انتخاب دیوان سیویم“ دو غزل سر دیوان - انتخاب دیوان سیویم
میر صاحب کے تحت نقل کیا ہے۔ غزل سے پہلے یہ شعر ہے ۷

لکھ ہے گر دونوں پروردنی
ہو دے پیوند زبیں یہ کشتنی

اس کے بعد غزل شروع ہوتی ہے ۷

شب اس سکن کے بناوٹ سے لاجواب کے چلے	اکذا فساد دل کا جو ہم وقتِ خواب کے چلے
کیا ہے حکم غضبِ مجتنب نے یہ کہ کوئی	بقل میں شیشہ نہ مست شراب کے چلے
سمندرِ ناز کو ڈپٹے ہوئے تو جاتا ہے	جو حکم ہو تو یہ فدوی رکاب کے چلے
کس سے یاد مجھے دیر سے شبِ خواباں	کوئی حضور میں اس کے شتاب کے چلے
کبھی نہ لے گئے ہم دل کو اس تک چھی طرح	بولے چلے تو بہ حالِ خراب کے چلے
یہ سر نوشت میں تھا جاوے راہ میں مارا	وہاں سے خط کا جو ناصد جواب کے چلے
یہ شیخ جی کی شیخت ہے آگے جاویں آپ	اور ایک آدمی پیچھے کتا بے کے چلے

موا جو میر ہے ان کا وہ اس کی تربت پر

گل اور شمع برائے ثواب لے کے چلے

(۳) نسخہ لندن (۱) اثر پرستیں اردو اکادمی لکھنؤ کے کتب خانے میں ”تین شتیاں“ کے نام سے فوٹو اسٹیٹ کی کاپی

کتا بی صورت میں مجلہ میں جو انڈیا آفس لندن سے منگوائی گئیں تینوں شتوں کو اب مخطوطے کی حیثیت حاصل ہے۔ شتیاں یہ

ہیں۔ (۱) دریائے عشق میر (۲) شتوی مصحفی در جواب میر تقی (۳) شتوی دیگر میر تقی۔

تیسری شتوی کا پہلا شعر یہ ہے۔ ۷

شنائے عشقِ آفریں ہے محال

زباں اس میں جنبش کرے کیا محال

یہ شتوی ”عجاز عشق“ کے عنوان سے کلیات میر میں شامل ہے۔

(۴) مطبع مسیحائی (م) دریائے عشق کے کئی ادبی نسخے مطبع مسیحائی کا پنور اور مطبع مصطفائی لکھنؤ میں چھپے تھے۔ ان

میں ۱۲۶۲ھ ہجری اور ۱۲۶۶ھ ہجری کے نسخے قابل ذکر ہیں۔ مطبع مسیحائی کے نسخے کے ساتھ عجاز عشق (میر) شتہ عشق (میر) اور

تفسہ جمجاہ بادشاہ بھی شامل ہیں۔ ان دونوں مطبعوں کے بیرونیوں ایڈیٹرس اب بہت کیاب ہیں۔ پرومیر سید مسعود حسن رضوی کے کنیت نامے میں موجود ہیں۔

(۵) نسخہ کلکتہ (ک) کلیات میر پہلی مرتبہ ۱۲۲۶ھ ہجری مطابق ۱۸۱۱ء میں کلکتہ میں جھانگھا۔ یہ نسخہ نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ کتب خانہ نسبی لغمانی ندوۃ العلماء کلکتہ میں اچھی حالت میں موجود ہے۔ تفصیلات کے لیے دیوان میر نسخہ محمود آباد اثر اکبر جلدی ملاحظہ ہو۔ نسخہ کلکتہ میں ص ۸۹ سے ص ۹۱ تک مثنوی دریاے عشق بغیر عنوان کے درج ہے۔ فی صفحہ میں ۲۱ شعر دو کالمی ہیں۔ اس کے بعد یہ مثنوی کلیات میر کے بھی ایڈیشنوں میں چھپی ہے مثنوی کے حواشی میں محققان سے مراد ہے۔

۱۔ نسخہ آگرہ، ۲۔ نسخہ سالار جنگ میوزیم، ۳۔ نسخہ لندن، ۴۔ نسخہ مسجائی۔ اصل۔ مبنیادی نسخہ زیر ترتیب نادر۔ موجود نہیں ہے۔ غیر مطبوعہ۔ متعرا بھی تک نہیں بچا ہے۔

میر نے دریاے عشق کو فارسی متر کے قالب میں بھی ڈھالا ہے۔ کلمات میر (نسخہ رنالا لائبریری رامپور) میں موجود ہے۔ دریاے عشق کے ماخذ کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مضمون 'میر کی مثنوی دریاے عشق کا ایک ماخذ' طاسی اردو کراچی (بابت اپریل ۱۹۵۷ء) اور 'تلقوش' لاہور میر تقی میر نمبر ۲ میں ملاحظہ ہو۔

آخر میں قارئین کی سہولت اور دلچسپی کے لیے دریاے عشق کا خلاصہ مختصر الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

خلاصہ

ایک جا ایک جوان رعنا، سر دبالا، لالہ رخسار، امیر زلف خمدار، آفت زدہ لیل النہار عاشق طر حدار سیر چمن سے گھر والیں جا رہا تھا۔ ناگاہ غرنے میں ایک مہ پارہ سے آنکھ لگ گئی اور اسے دیکھتے ہی صبر و قرار، ہوش و خرد اور دین و دل کھولے لگا۔ رفتہ رفتہ مہ پارہ کے اعتراف کو خیر ہوئی اور اس میں بہ مشورت ہوئی کہ عاشق خستہ حال کو جان سے مار دیا جائے۔ بھریہ خیال آیا کہ اس غیرت ماہ کو بدنامی سے بچنے کے لیے کسی آشنا کے گھر بھیجا جائے اور وایہ کے ساتھ کشتی میں سوار کر کے پار دریا کیا جائے۔ جو نہی گھر سے عاذ نکلا تو جوان حانہ خراب بھی آہ و فغاں کرتا ہوا سہر کباب ہوا۔ وایہ تو پر لے درجے کی مکتار اور عیار رہتی۔ اس نے عاشق جگر کباب کو بھی کشتی ہلال میں سوار کیا۔ جب کشتی بچھڑا تو وایہ نے رشک ماہ کی کفش پانی میں پھینک دی اور اس عاشق نیم جاں سے کہا کہ اگر غیرت عشق ہے تو اسے باہر نکال۔ اس کی گفتگو سے وہ کشتی مہتاب مثل سیلاب تڑپنے لگا۔ بیچارہ دل گرفتہ معاملات عشق سے ناگاہ تھا۔ نہ آؤ دیکھنا نہ تاؤ اور ایک مینی دو گوش دریا میں گود پڑا۔ امواج گرداب نہ بھر پائے ہو گئیں اور ایسا ڈوبا کہ پھر نہ نکلا۔ وایہ مکتار، دشمن عاشق دل انگار رشادیں مہرئی اور کشتی اس گل نو کو پار لے گئی۔ بعد ایک ہفتہ وہ شکر، سراپا فور وایہ سے کہنے لگی کہ وہ عاشق نامراد عدم آباد کو چل دیا۔ اب میرا دل میاں بے قابو ہو رہا ہے اور ایسا گھٹا ہے کہ کھل ہی جنوں سوار ہونے والا ہے۔ پس یہی بہتر ہے کہ مجھے گھر لے چل۔ وایہ بولی۔

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا، سترہ کون ہے نکلنے کا

صبح وہ غیرت خورشید وایہ کے ساتھ گھر سے روانہ ہوئی اور دوپہر کے وقت دونوں کشتی میں سوار ہوئیں۔ جب کشتی بیچ دریا کے

پہنچی تو دایرے میں حرف زن ہوئی کہ جہاں وہ آرزو مند ڈوبا تھا، اس جگہ کا نام و نشان تھا۔ دایرے نے نشان تبایا۔ مہ پاترہ کہاں کہاں کر کے عین اسی جگہ کو ڈپٹی کیشش عشق اس کو بھی تہ دریا کھینچ گئی۔ مہ پاترہ کے اعتراف اور خواہش کو خبر ہوئی۔ وہ دریا میں کود پڑے، غوطہ زن ہوئے لیکن وہ دُورِ نایاب کہیں دستیاب نہ ہوا۔ اس کے والدین اور بھائی خاک پر سر جاکر گریباں فوج کناں کناں پر آن پہنچے۔ دام داروں نے جالی بچھائے۔ آخر کار دونوں جواں مرگ عاشق و معشوق کی لپٹی ہوئی لاشیں برآمد ہوئیں۔

مثنوی دریائے عشق

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال	ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا	کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا	کہیں سر میں جنون ہو کے ہٹا
کہیں رونا ہوا ندامت کا	کہیں ہنسنا ہوا جراحات کا
گر نمک اس کو داغ کا پایا	گر تینگا چہراغ کا پایا
وان طہیدن ہوا جگر کے بیچ	یہاں تبسم ہے زخمِ ترکے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے	کہیں یہ خوشچکاں شکایت ہے
تھا کسی دل میں نالہ جانکاہ	ہے کسی لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسی پلک کی غمت کی	ہے کسی خاطر کی غمت کی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا	کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں اندوہ حبان آگہ تھا	سوزشِ سینہ ایک جاگہ تھا
کہیں عشاق کی نیاز ہوا	کہیں اندوہ حباں گداز ہوا
ہے کہیں دل جگر کی بیتابی	تھا کسی مضطرب کی بے خوابی
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا	کسو محفل کی رہ کی گرد ہوا
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا	بیتوں میں شرارِ ہمیشہ رہا

۱۔ و۔ الگ۔

۲۔ س۔ کسو۔

۳۔ س۔ کہیں۔

دل میں کرنے لگا پلیدن ناز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک
طبع نے اک جنوں کیا پیدا
سوزش دل نے جی میں جاگہ کی
بستر خاک پر گراؤہ زار
خاطر افکار رخسار ہوئی
اس کے مونہہ پر پڑی جو اس کی نگاہ
خو ہوئی نالہ حزیں کے ساتھ
ہونٹھ سوکھے تو خون ناب ہلا
خفق اس کی ہوئی تماشا نی
کچھ کہا گر کشتی نے شفقت سے
جانے اس کے قریب درمیٹھا
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا

ثابت شدن عشق جواں دیدگماں شدن وارثان جاناں

جو کہ سمجھتے تھے اس کو دیوانہ
عاشق اس کو کسب کا جان گئے
کیونکہ باہم معاش مخفی سب کی
وارث اس کے بھی بدگماں ہوئے
مشورت کی کہ مار ہی ڈالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام
کیا گئے تھا جو یہ جواں مارا
ہوئے یہ خون خفتہ گر بیدار

رحم کرتے تھے آشنا یا نہ
سب جبر اس ادا کو مان گئے
ایک جا بود و باش تھی سب کی
درپے دشمنی جان ہوئے
دفعاً اس بلا کے تئیں ڈالیں
سین کے آخر کہیں گے خاص و عام
کتنے مارا اُسے کہاں مارا
کھینچنی ہوگی خفت بہار

۱۳۱۱ ک۔ یس۔ یہ۔ ۱۳۱۲ ک۔ نا امیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ۔ ۱۳۱۳ ک۔ اصل بخون۔ ۱۳۱۴ ک۔ اصل خواب و خورد کو جواب ملا، اے ک۔ یس۔ کہو،
۱۳۱۵ ک۔ یس کہیں، ۱۳۱۶ ک۔ اُنے نے اصل عنوان ندارد کہ۔ ندارد یس میں یس ہے، ثابت شدن عشق برآں جواں دیدگماں شدن اہل،
۱۳۱۷ ک۔ ندارد، ۱۳۱۸ ک۔ دل تھی، ۱۳۱۹ ک۔ یس۔ کہ ۱۳۲۰ ک۔ یس، دل۔ کس نے، ۱۳۲۱ ک۔ ہووے۔

کیجئے ایک ٹھہرے اس کو تنگ
 تہمت ضبط رکھیے اس کے سر
 دے کے دیوانہ اس جوں کو قرار
 کی اشارت کہ کو دکان شہر
 ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا
 ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر
 ایک نے ابتداء ملامت کی
 ایک اُسے تیر سے ڈراتا تھا
 ایک کہنے لگا کہ اے بے تنگ
 گرچہ تنگامہ اس کے سر پر تھا
 مچو تھا اس کے وہ خیال کے بیچ
 ہونٹھ پر حسن کا بیاں اس کا
 ایک دم سرد آہ پھر اٹھا
 دل میں کہتا کہ آہ مشکل ہے
 دوست کو میرے نام سے ہے تنگ
 چشم تر سے لہو بہا کرتا
 کاے نسیم سحر سے تو اس سے کہہ
 ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جئے
 جان دوں پیر سے واسطے سوا تو
 رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودا
 نام کو بھی ترے نہ جانا آہ
 نا امیدانہ جب کروں ہوں نگاہ
 کوئی مشفق نہیں ہے کوئی شفیق
 تانہ عابد ہوا اپنی جانب تنگ
 کیجئے تنگ سار اس کو پھر
 ہو گئے سارے درجے آزار
 آئیں لبریز غصہ پر زلف ہر
 ایک نے آکے زیر تنگ کیا
 ایک بولا کہ اب سے کیا تاخیر
 ایک نے شورش قیامت کی
 ایک برچی اُسے دکھاتا تھا
 زندگی کا ہے یہ بھی کوئی ڈھنگ
 لیک روے دل اس کا اودھرتا
 تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
 سر تھا اور تنگ آستان اس کا
 نالہ گرم گاہ کر اٹھا
 اس طرف یک نگاہ شکل ہے
 دشمنوں سے ہے جی یہ عرصہ تنگ
 صبح کی باد سے کہہ کرتا
 مت تغافل کر اور غافل رہ
 جان پر آہنی ہے تیرے لیے
 آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کہو
 دُور پہنچی ہے میری رسوائی
 تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ
 دیکھتا ہوں ہزار روز
 بے کسی میں نہیں ہے کوئی رفیق

۲۶ ک۔ دیں گے۔ ۲۷ ک۔ ہں۔ آئے لبریز غصہ و پرہیز۔ ۲۸ عین مطبوعہ۔ ۲۹ عین مطبوعہ۔ ۳۰ عین مطبوعہ۔ ۳۱ ک۔ ہں۔ ۳۲ ک۔ ہں۔ ۳۳ ک۔ ہں۔ ۳۴ ک۔ ہں۔ ۳۵ ک۔ ہں۔ ۳۶ ک۔ ہں۔ ۳۷ ک۔ ہں۔ ۳۸ ک۔ ہں۔ ۳۹ ک۔ ہں۔ ۴۰ ک۔ ہں۔ ۴۱ ک۔ ہں۔ ۴۲ ک۔ ہں۔ ۴۳ ک۔ ہں۔ ۴۴ ک۔ ہں۔ ۴۵ ک۔ ہں۔ ۴۶ ک۔ ہں۔ ۴۷ ک۔ ہں۔ ۴۸ ک۔ ہں۔ ۴۹ ک۔ ہں۔ ۵۰ ک۔ ہں۔ ۵۱ ک۔ ہں۔ ۵۲ ک۔ ہں۔ ۵۳ ک۔ ہں۔ ۵۴ ک۔ ہں۔ ۵۵ ک۔ ہں۔ ۵۶ ک۔ ہں۔ ۵۷ ک۔ ہں۔ ۵۸ ک۔ ہں۔ ۵۹ ک۔ ہں۔ ۶۰ ک۔ ہں۔ ۶۱ ک۔ ہں۔ ۶۲ ک۔ ہں۔ ۶۳ ک۔ ہں۔ ۶۴ ک۔ ہں۔ ۶۵ ک۔ ہں۔ ۶۶ ک۔ ہں۔ ۶۷ ک۔ ہں۔ ۶۸ ک۔ ہں۔ ۶۹ ک۔ ہں۔ ۷۰ ک۔ ہں۔ ۷۱ ک۔ ہں۔ ۷۲ ک۔ ہں۔ ۷۳ ک۔ ہں۔ ۷۴ ک۔ ہں۔ ۷۵ ک۔ ہں۔ ۷۶ ک۔ ہں۔ ۷۷ ک۔ ہں۔ ۷۸ ک۔ ہں۔ ۷۹ ک۔ ہں۔ ۸۰ ک۔ ہں۔ ۸۱ ک۔ ہں۔ ۸۲ ک۔ ہں۔ ۸۳ ک۔ ہں۔ ۸۴ ک۔ ہں۔ ۸۵ ک۔ ہں۔ ۸۶ ک۔ ہں۔ ۸۷ ک۔ ہں۔ ۸۸ ک۔ ہں۔ ۸۹ ک۔ ہں۔ ۹۰ ک۔ ہں۔ ۹۱ ک۔ ہں۔ ۹۲ ک۔ ہں۔ ۹۳ ک۔ ہں۔ ۹۴ ک۔ ہں۔ ۹۵ ک۔ ہں۔ ۹۶ ک۔ ہں۔ ۹۷ ک۔ ہں۔ ۹۸ ک۔ ہں۔ ۹۹ ک۔ ہں۔ ۱۰۰ ک۔ ہں۔

نالہ ہوتا ہے کچھ گہے دل جو
سخت خشک ہے سخت ہے بیداد
جو ہے سودشمنی میں ہے سرکرم
آہ جو ہمدی سی کرتی ہے
چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل
در نہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
اب ٹھہرنا نہیں ہے پائے ثبات
سنگ باران سے سخت ہوں دل تنگ
محرم یک نگاہ بیشیں نہیں
کوئی کہے کہ تو نہیں آگاہ
کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز
بس تغافل ہوا ترحم کر
کون کہتا ہے رہ نہ محو ناز
ان بلاؤں پہ اس نے صبر کیا
اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا
اور یہ ماجرا ہوا مشہور
دیکھ کر اس کو بے خور و بے خواب
موتہ پر اس کے بورنگ خونیں
آنکھ اس کی ہے جس طرف مائل
جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں
عشق بے پردہ جب فنا نہ ہوا

گر یہ آنکھوں سے پونچھتا ہے کہو
ایک میں خون گزشتہ سو جلاؤ
تو بھی اگر تو چشم کو کر گرم
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
جی ہے اس سے امیر آرب و گل
صورت اک معنی نہاں ہوتی
ایک میں اور کتنے تصدلیات
شیشہ دل نہیں ہے بارہ سنگ
کم ہے سینے میں جا کر ریس نہیں
اک قیامت بپا ہے یاں سر راہ
اک جہاں اس سے ہے جز بردار
گوش دل جانبِ نطق کر
پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز
اختیار لپنے جی پہ جبر سنا
اس کے اندوہ سے نہ موتہ موڑا
شور رسوائیوں کا پہونچا دور
جانا ہر اک نے عاشق بیتاب
عشق ہے اس کو کچھ جنوں نہیں
اس طرف ہی گیا ہے اس کا دل
چاہ ثابت ہوئی لے گھس میں
مصطرب کہ خداے خا نہ ہوا

۵۳۹ ک بس۔ آنسو۔ ۵۴۰ یہ شعر صرف م میں ہے۔ ۵۴۱ تا ۵۴۲ اصل میں یہ اشار نہیں ہیں۔
۵۴۳ اور ۵۴۴ کے درمیان اس میں یہ سرخی ہے۔ ”در بیان رخصت شدن دختر از پدر“ ۵۴۵ م ہرٹ
۵۴۶ ک بس، م۔ یہ ۵۴۷ س۔ ک۔ ل۔ م۔ ہے بگو اس کی جس طرف مائل۔ ۵۴۸ م جب ہوا قبل وقل
اکثر میں۔

گھر میں جا بہسرِ دفعِ رسوائی بیٹھ کر مشورت یہ شہسرائی
تاکہ یہ غیرتِ مسہِ تانا بان جا کے چندے کہیں رہے پنہاں
فرستادنِ دخترِ ماہِ پیکرِ ہمراہ دایہ غدارِ دریا پار بخاں یار و ہمراہ جواں خوناں

گھر تھا اک آشنا کا مدِ نگاہ واں ہو روپوشِ تباہ غیرتِ ماہ
ہو دے جب اس بلا سے خاطر جمع نور افزائے خانہ ہو جوں شمع
شبِ مخافے میں کر کے اس کو سوار ساتھ دی ایک دایہ غدار
پارِ دریا کے جسدِ رخصت کی اس طرح فکرِ دفعِ تہمت کی
گھر سے باہر محاذِ جونکلا اس جواں کے ہی پاس ہو نکلا
طیشِ دل سے ہو کے دھجے آگاہ ہو گیا اس کے ساتھ گرم براہ
داں کے رہنے سے اس کو کام نہ تھا وہ گلی اس کا کچھ مفتام نہ تھا
جس سے دل کے کمال ہو اُلفت جس سے لہجے کی درست ہو نسبت
جنشِ اس کی پیک کو گردان ہو دل میں یاں کاوش اک نمایاں ہو
واں اگر موشکست کا ہو باب یارِ گبیاں کو ہو دے بیچ و تائب
واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار
یار کو دردِ چشم اگر ہو دے چشمِ عاشقِ لہو میں تر ہو دے
چاکِ دامن ہیں واں پے زینت یا گریباں ہے چاک گل کی صفت
یاں ہے دل تنگ و دہن تنگی حُسن اور عشق میں ہے یک رنگی
دستِ افشانِ وپائے کو باں یہ تھا محلے کے ساتھ گرم براہ
ہر گھڑی تفتِ زباں پر جاری خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
قطرہ زنِ اشکِ سادہ راہ تمام در پے یار تھا یہ بے آرام
مہرِ مہرِ اس کی تھی میسر کب ہے مجھے بختِ وارگوں سے عجب

۵۹ ک۔ ہ۔ یہاں سے یہ غیرتِ مہرتاناں۔ ۶۰ ک۔ ہ۔ اویں سرخی نہیں ہے۔ ۶۱ س۔ یہ۔ ۶۲ ک۔ ہ۔ س۔
ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ۔ ۶۳ ک۔ ہ۔ جی، ۶۴ ک۔ ہ۔ دل۔ ۶۵ ک۔ ہ۔ میں اک نہیں ہے ۶۶ س۔ ندارد، ۶۷
س۔ ندارد۔ ۶۸ ک۔ ہ۔ واں دہن تنگ یاں ہے دل تنگی۔ ۶۹ ک۔ وہ۔ ۷۰ ک۔ ہ۔ گرم رہ۔ ۷۱ ک۔ ہ۔ س۔ ل۔
ہر قدم۔ ۷۲ ک۔ ہ۔ ہیری۔

اس طرف آب کے اترنا ہے
پاؤں اس کے جو ہیں نگار آلود
جس کف پا کو رنگ گل ہو بار
ان پر نرمی میں گل سے ہیں جو پرے
یہ روانے تو اپنے خال پر رو
جی اگر تھا عزیز لے ناکام
سُن کے یہ حسرتِ وایہ مکار
بے خبر کارِ عشق کی تہ سے
تھا وہ کشتی میں یا کہ دریا میں
کھینچ گیا تھر کو وہ گوہرِ ناب
کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
یوں جو ڈوبے کہیں تو جانکے
عشق نے آہ کھو دیا اس کو

برونِ دایہ دخترِ یاشنا سے پدرش و پس از ہفتہ آمدن دختر بخانہ و غرق شدن یہاں دریا۔

کھو گیا گوہرِ گرامی جاں
داں سے کشتی چلی برنگِ باد
لے گئی پار اس گل نو کو
نقہ سازی میں اک قیام
کام سے اپنے یہ نہیں غافل
لاوے معشوق کو یہ تربت
خاکِ خواباں بھی ان نے دی برباد

جب کہ دریا میں ڈوب کر وہ جوان
دایہ حبیلہ گر ہوئی دل شاد
خارِ حسرتِ دلی سے فارغ ہو
یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
خاک ہو کیوں نہ عاشق بیدل
وصل جیتے نہ ہو میسر اگر
یہاں سے عاشق اگر گئے ناشاد

۵۹۹ اصل - جس کف پا کو دیکھو گل ہزار منصفی ہے کہ خاریستی نگار - ۵۹۹ ، تلہ اصل ندارد - ۶۰۰
ک اس ل - تھا سینے میں یا کہ دریا میں ، ۶۰۱ ک اس ، کیوں ایسے کوئی نکلتے ہیں - ۶۰۲ س ل ، ل - ڈوبے جو یوں کہیں
وہ جانکے - ۶۰۳ م - آمدن دختر بسوئے خانہ و غرق شدن درہاں دریا - ۶۰۴ اصل - جس گھڑی پار ڈوب کر وہ جاں -
۶۰۵ تا ۶۰۶ اصل ندارد

قصہ کو تباہ ہے بعد یک ہفتہ
 کھینے لگی کہ اب تو اسے دایہ
 اب تو وہ تنگ درمیاں سے گیا
 تھے جو شگامے اس کے حد سے زیاد
 شرف تھے تھے اس تنگ سارے
 مجھ کو گھر میں نہیں ہے اب آرام
 دل کوئی دم میں خون ہو دے گا
 دل تڑپتا ہے متصل میرا
 وحشت طبع اب تو افروز ہے
 بے دماغی کمال ہوتی ہے
 بے کلی دل کو تاب دیتی ہے
 دل میں آتا ہے ہوں بیابانی
 پس یہ بہتر ہے مجھ کو لے چل گھر
 گاہ باشد کہ دل میرا داہو
 دایہ بولی کہ اے سراپا ناز
 اب تو فتنے کو میں سلایا ہے
 کون انج ہے گھر کے چلنے کا
 ہو محافے میں تو خوشی سے سوار
 دل سے اپنے پدر کا غم کر کم
 کر طافات ہمدوں سے تو
 یہ نہ سمجھی کہ بد بلا ہے عشق
 آئی وہ رشک مدد خود رفتہ
 ہو گیا عشق وہ خرد مایہ
 آرزو مند اس جہاں سے گیا
 ساتھ اس کے گئے وہ شور و فضا
 اب تو بدنامیاں گئیں بارے
 رنج شام و سحر ہے مجھ کو مداہم
 آج کل میں جنون ہو دے گا
 مرغ بسمل ہے پاک دل میرا
 حال جی کامرے دگرگوں ہے
 جان نین کے دباں ہوتی ہے
 طاقت دل جواب دیتی ہے
 پرکھوں ہوں کہ ہے یہ نادانی
 ایک دودم رہیں گے دریا پر
 ورنہ کیا جانے کہ پھر کیا ہو
 حسن کا تیرے در پر روئے نیاز
 اس بلا کے تئیں ڈوبایا ہے
 سترہ کون ہے نکلنے کا
 شاد شاداں کر آب سے تو غزار
 مادر مہرباں کو خستہ کر
 گرم بازی ہو محسوس سے تو
 گھات میں اپنی لگ رہے عشق

اللہ م۔ لگی کہنے اللہ اصل ندارد کہ میں و نہیں اللہ غیر مطبوع میں دہر معریں ہے۔ دل کو شام و سحر ہے رنج تمام اللہ تا اللہ
 اصل ندارد۔ اللہ ک، اس۔ جی۔ اللہ ک، اس، ام، و۔ مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر۔ اللہ ک، اس۔ حسن کا درپہ
 تیرے روئے نیاز۔ اللہ ک۔ اب تو میں فتنے کو سلایا ہے۔ اللہ ک، اس، ل، ام۔ اٹھا۔ اللہ ک، اس، ال، ام۔
 دل خوشی۔ اللہ ک، اس۔ کے۔ اللہ ک۔ اس۔ سوچی۔

جس کہو سے یہ پیار رکھتا ہے
جذب اپنے سے جب کرے ہے کلام
خاک ہو کیوں نہ عاشق بیدل
صبح گا ہاں وہ عزت غور شید
سجی نصف التہار دریا پر
حد سے افزوں جو بقیہ ر ہوئی
حسرت زن یوں ہوئی کہ لے دایہ
موج سے تھا کہ حد کو ہم آغوش
پھر جو ڈوبا تو کس طرف جا کر
مجھ کو دیجو نشان اس جاکا
ہوں میں نا آشنا تے میر آب
تجہ کیا نظر کس کو کہتے ہیں
ہے بستر کہاں یہ سیر عبور
مکرمیں گرچہ دایہ تھی کامل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق
نیچ دریا کے جا کہ یہ حرف
یہاں وہ بیٹھا حباب کے مانند
مٹتے ہی یہ کہاں کہاں کر کے
موج ہر اک کند شوق مٹی اسہ
دام گتروہ عشق تھا تہ آب
حسن موجوں میں یوں نظر آوے
تھیں یہ اس کی خانے بگشتاں

آخر شش اس کو مار رکھتا ہے
عاشق مُردہ سے بھی لے ہے کام
کام اپنے سے وہ نہیں غافل
اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
روئی بے اختیار دریا پر
دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
یہاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
تھا تلاطم سے کس طرف ہمدش
تجھ کو آیا نقش کہاں آکر
میں بھی دیکھوں خردش دریا کا
ماشا سائے موجہ گر داب
گھر میں ہم نام سُختے رہتے ہیں
الفا تھا ہے اس طرح کا امور
لیک تہ سے سخی کے تھی نائل
ہے وہ میر پارہ ناشکیب عشق
یہاں ہوا تھا وہ ماجراے شگوف
پھر نہ تھا کچھ مراب کے مانند
گر چڑی قصہ ترک جاں کر کے
بپٹی اس کو برنگ مار سیاہ
جس کے حلقہ تمام تھے گرداب
نور مہتاب جیسے لہر آوے
غیرت افزائے پنجہ مر جاں

۱۲۵ کہیں ہم ماقت ۱۲۶ غیر مطبوعہ شعر ۱۲۷ اصل ندارد ۱۲۸ کہیں ہم معروضاتی ۱۲۹ اصل ندارد ۱۳۰ م۔ موج ۱۳۱ کہیں
ہیں میر کہاں یہ سیر عبور اتفاقاً ہیں اس طرح کے امور ۱۳۲ اصل ندارد ۱۳۳ کہیں ہم سر کر ۱۳۴ اصل جس کا
حلقہ تمام تھا گرداب ۱۳۵ ۱۳۶ ۱۳۷ وہ ہس۔ دے۔

سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا
کشی عشق آخر اس تہ کو
جاہم آغوشش مردہ یار ہوئی
پاک کر زندگی کی آلاشش
جز کر دن دایہ سنجائے جانان و بر آوردن عاشق
کو دے غراض و آشناسارے
کھینچ کر کوفت ہو گئے بے تاب^{۱۳۸}
سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ
اب دہم مادر و برادر سب
دار و دستہ تمام اس گل کا
سوئے دریا رواں ہوئے گریاں
خلق کیجا ہوئی کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا
نکلے باہر و لے موئے نکلے^{۱۳۹}
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے
عشق میں آہ کھو دیا اس کو
مل رہے تھے وہ دونوں جلی دار^{۱۴۰}
کیوں نہ دشوار ہوئے ان کا فصل^{۱۴۱}
حیرت کا عشق سے مردم،
سطح پانی کا آئینہ سا رہا^{۱۴۲}
لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو^{۱۴۳}
تہ میں دریا کے بہمنار ہوئی
ہو کے دست و بغل کی آسائش
تا بہ مقدم و دست و پا مارے
نہ لگا ہاتھ وہ دُور نایاب
آفت تازہ لے گئی دایہ
خاک افشاں و آہ نالہ بلب
ترک کر آئین تجمل کا^{۱۴۴}
آتش عنہم سے دل بگر بریاں
حشر برپا ہوئی کنارے پر
آخر ان کو اسیر دام کیا
دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کے لبے ایک کو تسکین
ایک قالب گمان کرتے تھے،
آخر آخر ڈبو دیا اس کو^{۱۴۵}
سم دگر سے جدا ہوئے دشوار
جان دے کر ہوا جن کا وصل
شکل تصویر آپ میں تھے گم

۱۳۸-۱۳۹ اصل نثار در ۱۳۹۰ یہ عنوان م میں درج ہے۔ ۱۴۰ ک ہس کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب۔ ۱۴۱ ک ہس، م۔
ترک آئین کر تجمل کا۔ ۱۴۲ ک۔ باہم۔ ۱۴۳ غیر مطبوعہ۔ ۱۴۴ ک۔ کیا کھوں مل رہے وہ وصلی دار۔ ہس۔ کیا کہوں
مل رہے تھے وصلی دار۔ ۱۴۵ س۔ فصل، ۱۴۶ ک۔ دیدے، س۔ دیتے۔

مقولہ شاعر ۱۳۴ھ
 میراب شاعری کو کر موقوف عشق ہے ایک فتنہ معروف
 اپنی قدرت جہاں دکھاتا ہے اُسے جو کچھ کہو، سوا آتا ہے ۱۳۸ھ
 کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے کتنی طاقت تری زباں میں ہے
 لب پہ اب مہرِ غامستی بہتر
 یہاں سخن کی فہرستیں بہتر

۱۳۸ھ یہ عنوان صرف ک میں درج ہے۔ ۱۳۸ھ ک، س، م، ہل، ۱۔
 قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے اس سے جو کچھ کہے سوا آتا ہے

سر سید کے ایک رفیق منشی نجم الدینؒ پروفیسر مختار الدین احمد

”ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ اقبال و خیراں چلے جاتے ہیں مگر ہڈیوں پر پیڑیاں جمی ہیں، پیریں میں پھالے پڑے ہیں... لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے۔ اسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اسے رستے کی تکان ہے، نہ ساتھیوں کے پھوٹے جانے کی پردا ہے۔ نہ منزل کی دُوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی جیتون میں غصہ نہایت جادو بھرا ہوا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہر لینا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیٹا برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار رستے پر پڑ لیے.....“

اں دل کہ رم غم سے از خود برد جواناں
دیرینہ سال پیڑے بُردش بیک نگاہ
حالی

”وہ جزا فیائی طور پر علی گڑھ شہر کے پٹواری اور اس کے گھروں کی دانی تھے۔ ڈیڑھ سی (محمودہ بیگم مراد) کا شہر کا سارا کام بلا مطالعہ دانت و علت کرتے تھے اور یوں بھی دوسروں کی دست نگرانی کے معاملے میں عموماً خود دار تھے۔“

منشی نجم الدینؒ اپنے زمانے کی معتمد خیز (مگر مکر بنیز و علم دین جماعت جہل مرکب) کے بھی ماشیہ نشین تھے، جس کے خان بہادر مولوی بشیر الدین مرحوم صدر نشین تھے اور اب صرف منشی نجم الدین ہی رہ گئے تھے، جو مجھے ”مائی لارڈ“ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ (محمد رفیق خاں شروانی)

۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں جب میں علی گڑھ پہنچا تو بعض ایسے بزرگوں سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی جنہیں سر سید کو دیکھنے اور جنہیں ان کی خدمت میں حاضری کے اکثر مواقع ملے تھے! ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر میں بابائے اُردو

مولوی عبدالحق صاحب (۱۸۷۱-۱۹۶۱ء) کے علاوہ جو اس زمانے میں دہلی میں مقیم تھے اور اکثر علی گڑھ کورٹ کے جلسوں میں تشریف لاتے تھے۔ خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب (۱۸۵۸-۱۹۵۶ء) اخبار "البیتر" اور اسلامیہ کالج اٹماوہ کے روح رواں رہے۔ وہ اٹماوہ میں مقیم تھے اور خان بہادر الحاج حبیب اللہ خاں صاحب (۱۸۶۷-۱۹۳۰ء) اور خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب (۱۸۷۲-۱۹۶۵ء) علی گڑھ میں قیام پذیر تھے۔ اول الذکر نے ۱۹۴۷ء میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی بڑی مفصل اور مستند سوانح حیات شائع کی ہے اور وہ اپنی زندگی کے آخری زمانے میں علی گڑھ کالج کی تاریخ اور اس کی تحریک پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف رہے۔ علی گڑھ اولڈ بورڈر ایسی ہیڈ کوارٹر کا "خبر علی گڑھ" اہنی کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا خان بہادر شیخ محمد عبداللہ نے مسلم گزٹ کالج کی مبنی و ڈالی اور اس ادارے کو بڑی کامیابی سے چلایا اور پوری زندگی سرگرم عمل رہے۔

مہاراجہ تھا کہ سرسید کی زندگی پر ایک کتاب لکھوں جس میں مطبوعہ مآخذ سے قطع نظر کر کے ان اصحاب سے جنہوں نے سرسید کا زمانہ دیکھا ہے اور جن لوگوں کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان سے سرسید کے ذاتی حالات و کوائف سے متعلق معلومات جمع کروں اور سرسید کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوط سے ان کی سیرت و شخصیت کی ایک مکمل تصویر پیش کروں، گویا سرسید کے معاصرین کی یادداشتوں اور خطوط سے اس کتاب کے مانے مانے کا کام لیا جائے۔

سرسید کے ذاتی حالات و عادات و فضائل اور ان کے غیر مطبوعہ خطوط یا آثار کی تلاش و جستجو ہی نے مجھے منشی نجم الدین صاحب سے روشناس کرایا۔

انہیں میں نے علی گڑھ میں معلوم نہیں کتنی بار دیکھا لیکن یہ بات کبھی ذہن میں نہ آئی کہ وہ عرصے سے علی گڑھ میں مقیم ہیں اور ان کا تعلق سرسید اور ان کے معاصرین سے رہا ہے۔ ایک دن میں نمبرہ حالی روڈ کے بنگلے میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ چیک کے پیچھے ان کی شکل دکھائی دی۔ جون کا مہینہ دوپہر کا وقت اور علی گڑھ کی سرزمین، وہ پسینے سے شرابور تھے اور گرمی سے بدحواس! میں نے انہیں آرام سے بٹایا اور میرے پیچھے کا رخ ان کی طرف کر دیا۔ گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر میں ملازم ہیں اور کانفرنس کے نمائندگی قرضے کی رقم کی دالسی اور اس کی تحصیل کی ذمہ داری منشی صاحب ہی کے سپرد ہے اور اس کی پہلی قسط وصول کرنے کے لیے مصروف اس بلا کی تپش اور ٹوہیں یہاں تشریف لائے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا آپ کتنے دنوں سے کانفرنس میں ہیں؟ کہنے لگے تقریباً سب سے کانفرنس کا وجود ہے میں نے کچھ اور پوچھا۔ وہ کچھ اور کھلے ممبر اصحاب کو بھولی بھری باتیں سنانے کا دلیہ ہی شوق ہوتا ہے۔ وہ سرسید اور ان کے رفقاء کے قصے اور اس عہد کے واقعات تفصیل سے سنا تے رہے۔ مجھے منوج پاکر انھوں نے بتایا کہ جس کمرے میں تم بیٹھے ہوئے ہو اس میں ایک زمانے تک ایجوکیشنل کانفرنس کا دفتر تھا۔ اور فلاں فلاں اصحاب اس کمرے میں ان ان جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے اور پھر ان لوگوں کی عادات و خصائل کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ یہاں تک کہ سلسلہ خیال انہیں اس سڑک کے پہلے بنگلے کی طرف لے گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ا۔ حالی روڈ میں سرسید رہ چکے ہیں اور حالی مرحوم نے ایک زمانے تک اس میں سکونت اختیار کی ہے اور اسی مناسبت سے اس سڑک کا نام حالی روڈ رکھا گیا۔

یہ کمرہ سرسید ہال کے مطبخ اور یونین کی عمارت کے درمیان واقع ہے اور ابھی تک بہت اچھی حالت میں ہے کئی سال پہلے تک ملی گڑھ کے قدیم دستور کے مطابق اس پر بھی پھوس کی چھتر تھی۔ اب اسے بدل کر نئی چھت تعمیر کر دی گئی ہے۔ کچھ سرسید کا فیض ہے یا حالی کی کوشش کہ کچھ عرصہ سے یہ بنگلہ اردو میگزین اور یونیورسٹی گزٹ کے مدیرین کے لیے مخصوص سا ہو کر رہ گیا ہے۔ میرے زمانہ ادارت سے پہلے ڈاکٹر محمود فاروقی صاحب جنہوں نے میر حسن پر لیسرچ کر کے اردو میں ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی اور ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۱ء کے سن میں ملی گڑھ میگزین کے مدیر تھے یہیں رہا کرتے تھے خلیل الرحمن اعظمی جو علی گڑھ میگزین اور مسلم یونیورسٹی گزٹ دونوں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انجم اعظمی صاحب کے ساتھ یہیں فروکش تھے اور یاد نہیں ان کے ساتھ میں نے کتنی شامیں اس مقدس کمرے میں گزاری ہیں۔ جہاں سرسید اور حالی کسی زمانے میں قیام پذیر تھے۔

موصاحب گفتگو میں ایک بڑی وقت ہوتی ہے جب مکالمہ پلان کی گفتگو سننے میں مصروف ہو ادا پلان کے مول جیسے ہوئے ہیں اس وقت تک حالات ٹھیک ہیں لیکن جو نہی آپ نے ان کی باتوں میں غیر معمولی دلچسپی لیتی شروع کی، کچھ سوالات کیے۔ ان کی گفتگو میں جرح کی کوشش کی، بعض نکات کی تشریح چاہی، یا اپنے مقصد کی طرف انہیں لانا جا ہا نو پھر معاملہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب میں نے سرسید کی خانگی زندگی کے متعلق سوالات کرنے شروع کیے اور نوٹ لینے چاہے تو انہیں فوراً اس بلا کی گرمی اور غضب کی تپس میں کوئی اور کالفرنس کا قرضہ یاد آ گیا۔ انہوں نے اپنا لبہ سنبھالا، رسیدیں درست کیں، ٹوپی اڑھی، چھتری ہاتھ میں لی اور مصافحہ کے لیے ہاتھ ٹھکانا۔

منشی نجم الدین علی گڑھ کے شیخ زادوں میں تھے جن کا خاندان عرصے سے اس شہر میں آباد ہے۔ وہ محلہ بالائے قلعہ میں رہتے تھے جہاں ان کے بعض اعزہ اب بھی سکونت پذیر ہیں۔

منشی صاحب گندی رنگ کے چھوٹے تذکے آدمی تھے۔ ٹینک لگاتے تھے اور خشکی داڑھی رکھتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ بہت تیز چلتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی ان کی رفتار نوجوانوں جیسی تھی۔

سرسید انہیں بہت چاہتے تھے اور انہیں اپنے عزیز کی طرح سمجھتے تھے یہ بڑی جفاکشی، محنت اور محبت سے ان کی خدمت بجالاتے۔ ہر موقع پر ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ ان کے مزاج داں ہو گئے تھے جس کی وجہ سے سرسید کو بھی بڑا آرام ملتا تھا۔ سفر ہو یا حضر منشی صاحب سرسید کا ساتھ دینے پر آمادہ رہتے سرسید انہیں پیار سے ٹوٹو کہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ پتہ تذ آدمی تھے۔ اور تیز رفتار اور اس لیے بھی کہ وہ ہمیشہ ان کے رفیق اور مصاحب بنے رہے۔ آج پرانے لوگ انہیں اسی عرفیت سے پہچانتے ہیں۔ سید صرف یہ کہنے پر قناعت نہ کرتے کہ بھئی میرا ٹوٹو کہاں ہے لاؤ اسے، بلکہ بعض خطوط میں بھی نام کے ساتھ یہ عرفت لکھنے میں مصافقہ نہ سمجھتے سرسید تو سرسید، اس زمانہ کے انگریز اساتذہ بھی خندہ زیر لب کو دبا نہ سکے۔ تیغیو ڈربک نے ۱۸۹۹ء میں حوان کی ایک درخواست پر سفارش لکھی ہے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہے :

NAJMUDDIN IS AN EXCELLENT "LITTLE MAN"

میرے متفق اور کرم فرما، محمد مقتدی خاں شروانی، خدا ان پر اپنی رحمت کے پھول برسائے، سرسید اور علی گڑھ کے چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا تھے، مجھ پر بڑے مہربان تھے، اکثر و بیشتر تشریف لاتے اور ان کی باتوں میں گھسٹوں گزرتے اور وقت کا پتا نہ چلتا۔ ایک دن ان سے منشی صاحب کا ذکر آیا۔ انہوں نے منشی جی کی بہت سی باتیں سنا ہیں، کچھ گفتنی کچھ ناگفتنی، میں نے ان کے ارشادات پر ذہن کرنے چاہے۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر انہوں نے مجھے روک دیا کہ اس کی ضرورت نہیں، میں ان پر بشرط فرصت ایک مضمون لکھ کر آپ کو دے گا۔ بشرط فرصت“ کی بات ایسی تھی کہ میں اس پر راضی نہ ہو سکا۔ میں نے عرض کیا مضمون ضرور لکھیے لیکن فی الحال ایک مختصر سائوٹ ان پر تحریر کر دیجئے جو انہوں نے چند ہی دنوں کے بعد مجھے لکھ کر دے دیا۔ یہ نوٹ شروانی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے اس لیے انھیں کے الفاظ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

”سرسید منشی نجم الدین کو ”سیراٹھ“ کہتے تھے۔ نام شاہ دونا دہی جیتے تھے، چونکہ ان کا قد پست سے بھی پست تر تھا، بدن گٹھا ہوا تھا، طے ہونے والوں سے کافی تیر گامی کے ساتھ گھٹ گھٹ چلتے تھے۔ میزان کا اردو کا خط اصلاح گرفتہ تھا اور ان کا فرض عام نہایت گرم رنار اور دودھم تھا، راہ داری میں نفطوں کے نشیب و فراز کی مطلق پروا نہ کرتا تھا، لہذا سرسید کو اپنی گشتی چٹھیاں بجائے چھپانے کے ان سے نقل کر کے جاری کرنے میں سہولت ہوتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کفایت بھی۔ گویا سرسید ان کی پیٹھ پر چڑھے اور اٹے اٹے پھرتے تھے۔ پھر سیبے ٹوٹا اور اس کے تمام چھوٹے بڑے، اعلیٰ و ادنیٰ انیسائے جنس، شاہ دونا دہی بیٹھتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں یا کھڑے رہتے ہیں، اسی طرح سرسید کے ٹوٹا صاحب بھی تختہ ریکارڈ کا کام بہ وقت سرسید کی طولانی مزیکہ ایک گوتے پر کھڑے کھڑے کرتے تھے، کرسی، تھان پر اپنی جگہ محض زیب آسناں کے لیے رہتی تھی، اس لیے ٹوٹا کا خطاب ان کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔

وہ شیخ زادہ تھے، طب زکاکوئی نہ کوئی حیلہ، ملازمت کے علاوہ بھی رکھتے تھے۔ مختلف دوسروں کی شرکت میں بیلوں کی نجاست کی، مگر کوئی پھل نہ پایا اور ان کا سرمایہ پال ہی بیٹا اور سٹرا صرف خنڈل کی تانگی کا مزہ پایا۔ ایک زمانے میں سٹرا بانوں میں گھر کر پھنسے، سید زین الدین مرحوم اس وقت علی گڑھ ہی میں ٹی جھڑٹ تھے تعلقات کے باوجود ان کے اجلاس میں فیصلہ ان کے خلاف ہوا، مگر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے قانونی مشورے اور رزاق نجش قادری مرحوم (اپنے وقت کے کامیاب اور مشہور میر سٹری کی بیروی سے اپیل میں وہ بری ہو گئے۔

کالفرنس اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے مسلم ایجوکیشنل کالفرنس کے عروج سے اس کے زوال تک بے مبالغہ لاکھوں روپے ان کے ہاتھوں ڈھل گیا اور میل کی طرح ڈھل گیا۔ ہر سال حساب کی جانچ ہوتی تھی جو بار بار مولوی نظام الدین حسن مرحوم (ناظر الدین حسن نواب ناظم یار جنگ کے والد) یا مولوی سید عبد الباقی مرحوم (برسر و حیف اکاؤنٹنٹ مسلم یونیورسٹی) نے کی مگر کوئی قابل تنبیہ گرفت نہیں ہوئی۔ آخر زمانے میں منشی صاحب بیڑی کی تجارت میں لپٹ گئے جس نے ان کا بیڑا غرق کر دیا اور کالفرنس سے ملنے والا بونس جو کئی ہزار روپے کا تھا، اس میں ایک دم سلفا اور دھواں ہو کر اڑ گیا۔

سرسید کی وفات کے بعد جب نواب حسن الملک آنریری سیکریٹری مقرر ہوئے اور کالج کے بڑے شعبے دو قرار پائے، کالج ادو

نجم الدین

سید صاحب ایک کتاب لکھوانا چاہتی ہیں۔ یمن وہ صرف
دو ہفتہ کیلپی مشغول ہے۔ تم یہ مصلحہ ذیل باتوں کا
جواب مطلوب ہے۔

(۱) تم درود ہے رخصت کبھی ہو یا نہیں اور رستی
نوکب ہے۔ کیونکہ آج اگر رخصت ہے تو آج اس کے کام نہ

ہو جاتا معذور ہے۔
(۲) اصل اگر کتاب کو لکنا ہوگا۔ جس کے خاتمہ
کھانا دن کا سید متا۔ کہ ان سے مشا۔
(۳) اجرت خطہ و خور و رختہ و ہار و خاب۔

غرض حیرت رننی جو ملکر۔ دہا۔ دہا۔
شیر

کالفرنس اور جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ کالج میں اُس وقت کے ذاب منزل اللہ خاں مرحوم اور کالفرنس میں ہمیشہ کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم۔ تو کالفرنس کے ساتھ جہیز کی طرح لگے ہوئے منشی نجم الدین ٹٹو صاحب زادہ صاحب کی پیشانی میں آئے۔ اب چونکہ کالفرنس کے ہدف میں آنے سے اس کام بڑھا دیا یہ کہنا چاہیے کہ انھوں نے بڑھایا۔ تو ظاہر ہے کہ ”ٹٹو“ سے پہلی منزل ہرگز نہ ہرکتی تھی، بلکہ ضرور ایک سینڈویچ روح برق رفتار سواری کی ضرورت تھی چنانچہ صاحب زادہ صاحب نے حساب داری (اکاؤنٹ) کا کام ان کے سپرد کیا جو انھیں نے سیکرٹری صاحب زادہ صاحب کے انڈیا کونسل کا ممبر ہو کر ولایت جانے کے زمانہ تک انجام دیا، پھر صدر بارجنگ کے کالفرنس کے جوائنٹ سیکریٹری ہونے اور کالج کے یونیورسٹی ہرجانے اور کالفرنس کا ایک متغیر شعبہ یونیورسٹی سے جدا ہو جانے اور نئے قواعد کے بموجب ان کے کالفرنس کے سیکریٹری ہونے تک بھی ذاب صاحب ہی کے زمانے میں کالفرنس سے اپنی علیحدگی تک کالفرنس کی حساب داری کا کام منشی صاحب دیکھتے رہے۔ کالفرنس سے سکدوشی کے بعد انھیں کالفرنس کا قرضہ حسنہ وصول کرنے کے کام پر مقرر کر دیا گیا، جو وہ آخر عمر تک جوں توں کرتے رہے۔“

سرستید سے منشی نجم الدین کی پہلی ملاقات غالباً علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴ء) کے توسط سے ہوئی۔ منشی صاحب خوش فہم اور زود فہم ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح فہم میں تھے۔ شبلی ان سے ملاقات کتابوں کی نقل یا اپنے مسودات کی تیسویں سلسلے میں ہوئی ہوگی۔ موصوف اس وقت علی گڑھ کے فزی اسکول میں نائب مدرس تھے، خواہ پانچ روپے ماہوار تھی، تنخواہ کی کمی کی تلافی وہ نقل نویسی کی اجرت سے لیا کرتے ہوں گے۔ حسن اتفاق کہ اس زمانے میں سرستید کو ایک کتاب کی فوری نقل کی ضرورت ہوئی۔ شبلی سے ذکر آیا تو انھوں نے بظاہر نجم الدین صاحب کا ذکر ان سے کیا اور وہ ایک خط انھیں لکھا :

نجم الدین !

تبد صاحب ایک کتاب لکھانا چاہتے ہیں، لیکن وہ صرف دو سہنے کے لیے مستعار ملے۔ تم سے مفصل ذیل باتوں کا جواب مطلوب ہے :-

۱۔ تم سے سے رخصت لے سکتے ہو یا نہیں، اور لے سکتے ہو تو کب سے، کیونکہ آج رخصت ملے تو آج ہی سے کام شروع ہو جاتا ہے۔

۲۔ یہیں اگر کتاب کو لکھنا ہوگا، صبح سے شام تک لکھنا دن کا تبد صاحب کے ہاں سے ملے گا۔

۳۔ اجرت خواہ اجزا پر خواہ ماہانہ حساب سے۔ غرض جس طرح مرضی ہو مل سکے گی۔ والسلام

جواب طلب شبلی نعمانی

شبلی مرحوم کے اس خط پر تاریخ تحریر موجود نہیں، لیکن حسب روایت مکتوب الیہ یہ خط ابتداءً جون ۱۸۸۹ء کا لکھا ہوا ہے۔ منشی صاحب نے آمادگی ظاہر کی اور وہ ارجون سے انھوں نے سرستید کے یہاں جانا شروع کر دیا۔ وہ یہ نہ بنا سکے کہ کتاب کیا تھی جس کی نقل سرستید کو مطلوب تھی، لیکن انھیں اس قدر اب بھی یاد ہے کہ کتاب علمی تھی، عربی زبان میں تھی اور کتب خانہ رام پور

غشی نجم الدین کی درخواست کا یہ مسودہ مولانا شبلی کے قلم کا لکھا ہوا ہے ۔

خائب حالب

برا، سکول پہنچا ہوا ہے کھینچا ۔ ن ب ن ا نام رشتہ ۔ سو دھرمبر
یہ معلوم ہوا کہ ہر حضور کے خستہ ان دیک شعلہ کائب کا کام رکھے
اسی اتر رنہ بن سکول خجہ ہے استخارہ دن اور سہا کام رکھے

سرسید نے مستعار لکھوائی تھی یہ قلمی کتاب صرف دو ہفتے کے لیے آئی تھی، لیکن ضخامت کی زیادتی کی وجہ سے اس مختصر عرصے میں کتاب مکمل نقل نہ ہو سکی۔ شبلی منشی صاحب میں برابر دلچسپی لے رہے تھے۔ انھیں خیال ہوا کہ ان کا تعلق سرسید سے ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا جائے۔ وہ اسکول کی مجلسی سے یہاں رہنا زیادہ پسند کریں گے اور سرسید کو ایک نقل نویس کی عام طور پر ضرورت ہوتی ہے اس طرح ان کے لیے بھی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ شبلی نے نہ صرف یہ کہ انھیں سرسید کے پاس ایک عرضی لکھ کر لے جانے کو کہا بلکہ جیسا کہ انھوں نے مجھے بتایا، وہی عرضی کا مسودہ تیار کر کے ان کے حوالے کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی موصوف کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ شبلی کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ مسودہ منشی صاحب کے ذخیرے میں اب بھی موجود ہے۔

جناب عالی!

میرا اسکول پہلی تاریخ جولائی سے کھلے گا۔ کتاب نامہ تمام رہ گئی۔ مولوی محمد شبلی سے معلوم ہوا کہ حضور کے ہاں ایک متنقل کا تب کام رہتا ہے اس لیے اگر عرضی ہو تو میں اسکول سے استعفا دے دوں اور یہاں کام کروں۔

ان کی درخواست منظور ہوئی۔ انھوں نے اسکول سے استعفا دے دیا اور سرسید نے انھیں اپنی ملازمت میں لے لیا اور وہ کتابوں کی نقل، سرسید کے مسودات کی تصحیف کا کام کرنے لگے۔ کچھ دنوں بعد سرسید اپنے خطوط بھی انہی سے لکھوانے لگے۔

سرسید کی تصانیف میں ازالۃ الغیبن، ترقیم، البطل غلامی کی تنبیض اس زمانے میں منشی صاحب نے کی، زمین کتابیں اور سرسید کے کچھ اور رسالے اور یہ چند خطوط نجم الدین صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب خانہ جامع علی گڑھ میں اب بھی موجود ہیں۔ اب تک سرسید ان کی تنخواہ دستل رو بہ ماہ اپنی جیب سے دیتے رہے تھے۔ انھوں نے اس عرصے میں اندازہ کر لیا کہ

ان سے اور خدمات بہ وجہ احسن انجام پاسکتی ہیں۔ انھوں نے منشی صاحب کا تقرر محمد انجیکشنل کالفرنس میں کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ تنخواہ میں دو روپے کا اضافہ بھی ہو گیا۔ سرسید نے فروری ۱۸۹۳ء کو جو خط الہ آباد سے ان کی تقرری کے سلسلے میں دفتر کے ہڈیلر کو لکھا تھا وہ ذخیرۃ نجم الدین میں موجود ہے۔

مشفق منشی شام بہاری لال صاحب!

نجم الدین عرفٹ ٹو، کو یکم جنوری سے بارہ روپیہ ماہوار کی حساب سے محمد انجیکشنل کالفرنس سے تنخواہ ملا کرے گی۔ آپ لالاسری لال کے ہاں سے مسجد مبلغان کالفرنس سے دو روپیہ سگوا لیجئے۔ بارہ روپیہ زنجم الدین کو بابت ماہ جنوری دے دیجئے اور کالفرنس کے اخراجات میں لکھیے اور یہ روپیہ بابت کرایہ ریل آمد و رفت نجم الدین کالفرنس کے حساب میں لکھیے اور وہ آٹھوں روپے میری امانت روزانہ چھ مدرسہ میں جمع کر دیجئے۔ والسلام

خاکسار سرسید احمد

۲ فروری ۱۸۹۳ء

اب نجم الدین صاحب مستقل طور پر ان کی پیشی میں رہنے لگے اور اپنے کاموں میں ترقی کرتے رہے۔ زمانہ گزرتا گیا اور سرسید سے ان کے تعلقات بڑھتے گئے۔ اب وہ اس عمر کو پہنچ چکے تھے جب ان کے احباب اور اعزہ انھیں شادی کرنے پر مجبور

قرض کے لئے منشی نجم الدین کی درخواست اور اُس پر سید صاحب کی منظوری

خیال بانی

نہایت ادب سے گزارش ہے کہ کمترین کی مشادی کی صرف باپنج سات اند
 باقی ہیں۔ اور روپہ کی سبیل سب سے اختیار کی جا رہی ہے۔ جو کہ بجز ذات سرکار
 اور سب طرف سے قطعی مایوسی ہے۔ اسلئے گزارش ہے کہ لادہ سب سے لال صاحب سے
 باادرس طرغی سرکار سے سب تصور فراوان و مودت کا انتظام فرمادیں۔
 جسکو کمترین عذاب سے مہماری کے بیس فلوں میں ادا کر دی جا۔
 زیادہ صواب

مستین نجم الدین
 مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۵ء

شیخو مودت علی صاحب اپ پریشادہ روم بدین
 قرض نجم الدین کو ایک مہینہ سو روپے میں دیا جائے گا
 ہم اسکو نہ دینا چاہتے تھے مگر دیا گیا ہے
 ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۵ء

کرنے لگے۔ علی گڑھ ہی میں مولوی فیاض علی مرحوم جو عدالت میں مختار تھے ان کی صاحب زادی سے نکاح کی بات پختہ ہو گئی، تاریخ بھی مقرر ہو گئی، لیکن وقت یہ بھی کر شادی کے لیے ان کے پاس رقم جمع نہ تھی، دوستوں اور عزیزوں سے جب مایوسی ہوئی تو انہیں بے اختیار سرسید اور ان کی شہقت و محبت یاد آئی اور انہوں نے بلا تکلف انہیں ایک مہینہ لکھ بھیجا جس میں اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کی شادی کے لیے دوسروں کا سامان کر دیں۔

نفل اسکیپ سائز کے ایک مول دار کا غنہ پر جس کا رنگ (مذاذ زمانہ سے مٹیا لا ہو گیا ہے منشی نجم الدین عرف "ٹٹو" کی عرضداشت بابت شادی اب بھی پڑھی جاسکتی ہے۔

جناب عالی !

نہایت ادب سے گزارش ہے کہ کمترین کی شادی کے صرف پانچ سات روز باقی ہیں اور روپیہ کی سبیل میرے اختیار سے باہر ہے جو کہ (چوکی) بہ جز ذات سرکار اور سب طرف سے مطمئن مایوسی ہے اس لیے گزارش ہے کہ لالاسری لال صاحب یا جس طریقے سے سرکار مناسب تصور فرمادیں دوسروں پر یہاں انتظام فرمادیں جس کو کمترین بحساب حصہ ماہواری کے بیس قسطوں میں ادا کر دے گا۔ زیادہ حد آداب

کمترین نجم الدین

معروضہ ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۵ء

سرسید کو ان کا بڑا خیال تھا، وہ فوراً لالاسری لال کو لکھتے ہیں کہ دوسروں پر بطور قرض منشی نجم الدین کے حوالے کر دیجئے۔ سرسید کی یہ مختصر تحریر ان کی عرضداشت پر موجود ہے۔

شفیق لالاسری لال صاحب !

آپ مہربانی سے دوسروں پر بطریق قرض نجم الدین کو ایک روپیہ سیکڑہ سود پر دے دیں۔ دس روپیہ مہینہ ماہواری ہم اوس کی خواہ میں سے آپ کو دے دیا کریں گے۔ والسلام

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۲۵ اکتوبر ۱۸۹۵ء

کمی وجہ سے سری لال سے انہیں یہ رقم نہ مل سکی، سرسید کو ان کی ضرورت کا اس قدر خیال تھا کہ انہوں نے یہ رقم خود ہی متیا کر کے انہیں دے دی۔

"نقد و نظر کے مدبر ڈاکٹر نور الحسن نقوی کے سامنے ایک بار منشی نجم الدین کا ذکر آیا تو انہوں نے منشی صاحب سے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ سنایا جس سے سرسید کی بذلہ سنجی کا بھی پتا چلتا ہے اور ان کے جذبہٴ ایثار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ چرچا لطیف قصہ سناتے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ تو عرض کیا ہی جا چکا کہ علامہ شبلی کی تحریک پر وہ اسکول سے مستعفی ہو کر بارہ روپے ماہانہ پر سرسید کے نقل و نسو ہو گئے تھے۔ یہ پہلے ہی طے پا گیا تھا کہ منشی صاحب دن بھر سرسید کے مکان پر رہ کر کام کریں گے اور

ستارہ سنی تمام ساری مہل تک
 نجم امین عوف تقوٰی نجم خوری ہے بارہ روپہ ماہواری لکڑی
 نجم ایکیشل لافرنس سے خواہ لکڑی اپ ۲۲ مہل لکڑی

نجم مین لافرنس ۱۱ روپہ منہا تھی بارہ روپہ نو

نجم امین کو ۱۱ مہل خوری ویدھی اور لکڑی

۱ ذرا پختہ بن گئی اور ۱۱ روپہ روپہ ۱۱ مہل اور

نجم امین لکڑی ۱۱ مہل بن گئی اور ۱۱ روپہ انوف

مہل امین روز پیمہ ۱۱ مہل بن گئی اور ۱۱ روپہ

روپہ ۱۱

۱۱ مہل
 ۱۱ مہل

نقش شام بہاری لال کے نام سرسید کی ہدایت

دو پہر کھانا بھی، ہیں کھائیں گے آگے میں کرنشی صاحب کے ناشتے اور رات کے کھانے کی ذمہ داری بھی سرسید نے قبول کر لی بلکہ دیگر اعتراضات کی کفالت بھی کرنے لگے۔ دراصل وہ بہترین خوش نویں ہی نہ تھے بلکہ نو دلوں اور درست نویں بھی تھے، اور بہت محنت سے کام کرنے کے عادی تھے۔ سرسید تدریسی، حوصلہ افزائی اور غریب پروری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور منشی صاحب پر ان کی یہ عنایات و رقیقت ان کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ منشی صاحب کی شادی کا موقع آیا اور کہیں سے قرض نہ مل سکا تو سرسید نے یہ بوجھ خود اٹھایا۔ غرض جب کوئی ضرورت پیش آئی تو سرسید نے ان کی ہر ممکن مدد کی۔

منشی صاحب سرسید کے کاموں سے فارغ ہو گئے تو انھیں ایجوکیشنل کالفرنس کے دفتر میں ملازمت دلا دی گئی۔ کالفرنس کے مالی حالات اچھے نہیں تھے اس لیے تنخواہ میں اضافہ تو ممکن نہیں تھا لیکن سرسید منشی صاحب کے کھانے، کپڑے اور بہت سے دیگر اعتراضات کا بوجھ خود اٹھا کر اس کی تلافی کر دیتے تھے۔ آج تو جبکہ جبکہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اہل اختیار ملازموں سے کام تو ذاتی لیتے ہیں اور ان کی تنخواہ قومی اداروں سے ادا کرتے ہیں۔ مگر سرسید کا طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ منشی صاحب کی ذمہ داریاں زیادہ تھیں۔ اس لیے یہ نگرہ دامن گیر رہتی تھی کہ کسی طرح تنخواہ میں اضافہ ہو۔ ادھر سرسید کالفرنس کے مالی حالات سے مجبور تھے۔ ایک دن موقع پا کر منشی صاحب سرسید سے مخاطب ہوئے۔

”جناب والا! آپ میری تحریر کو تو بہت پسند فرماتے ہیں۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں لکھتا نہیں موتی پروتا ہوں۔“

”جی ہاں اس میں کیا شک ہے؟“ سید صاحب نے جواب دیا۔

”آپ اکثر یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں بہت تیز لکھتا ہوں اور مہابتِ صحت سے لکھتا ہوں“ منشی صاحب نے حوصلہ پا کر عرض کیا۔

”بالکل درست“ سید صاحب نے فرمایا۔

یہ سب کچھ ہے تو پھر میری تنخواہ میں اضافہ کیوں نہیں ہوتا؟ منشی صاحب نے سوال کیا۔

سید صاحب ذرا دیر کو لا جواب ہو گئے۔ مگر فوراً ہی بولے ”آپ کی تنخواہ میں اضافہ تو نہیں ہو سکتا۔“

آخر کیوں؟

”آپ کی داڑھی بوٹیزھی ہے“ سید صاحب اس کے سوا اور کیا جواب دیتے!

اس وقت بات منشی میں اُڑ گئی۔ کچھ دنوں بعد کالفرنس کے مالی حالات قدرے بہتر ہو گئے تو منشی صاحب نے ذرا تلخی سے کہا کہ آخر کیا دشواری ہے، اب میری تنخواہ میں اضافہ کیوں نہیں ہوتا؟ مگر سید صاحب اس سے نہ ہونے ہسکا فرمایا ”وہی داڑھی والی بات؟“ سید صاحب نے منشی صاحب کی تنخواہ میں اضافہ تو نہیں کیا، مگر خود برابر زیر بار ہوتے رہے اور ہمیشہ خیال رکھا کہ منشی صاحب کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یہ تھا سرسید کا جذبہ ایثار۔!

مرستید کے آخری زمانے میں سید محمود مرحوم کی سوزنازگی کی وجہ سے بعض ناخوشگوار باتیں پیش آئیں۔ مرستیدان کی کچھ عادات و افکار سے اس طرح عاجز آ گئے کہ کوٹھی چھوڑ کر ہلال روڈ کے بنگلہ نمبر ۱ میں منتقل ہو گئے۔ سید محمود (۱۸۵۰-۱۹۰۳ء) کی دماغی حالت مشتبہ تھی لیکن یہ ضرور ہے کہ جب وہ صحیح حالت میں ہوتے تو انہیں اپنے کیے پر بعض مرتبہ پشیمانی بھی ہوتی، اور وہ حتی الامکان اس کی تلافی کے لیے بھی تیار ہو جاتے۔ بعض اعزہ چاہتے تھے کہ دونوں میں مصالحت ہو جائے۔ اس خاندان کے ایک رکن مرستید کو لکھتے ہیں :-

جناب اموی صاحب قبلہ نظر اللہ العالی !

بعد تسلیم۔ بجز آپ کے یہاں تشریف لائے بعض امور اہم طے نہیں ہو سکتے۔ ہر امر میں ضرورت ہوتی ہے کہ آپ سے کچھ حالات اس کے دریافت کیے جائیں۔ اس لیے ایک گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد مرزا عابد علی بیگ صاحب اور میں اور سید محمود آپ کے پاس آ دیں گے اور آپ کو یہاں لے آ دیں گے اور آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ اپنا اسباب اور سامان سب یہاں بھیج دیں۔ تاکہ یہاں آ کر آپ کو تکلیف نہ ہوئے۔ زیادہ آداب۔

(عرفیہ سید محمد احمد ۳۱ راکو بر ۱۸۹۷ء علی گڑھ)

مرستید دوبارہ حاجی اسماعیل خاں کی چوٹی کوٹھی میں چلے گئے۔ منشی صاحب بھی برابراں کے ساتھ رہے اور پیشی کا کام کرتے رہے۔ مرستید کی خدمت کرتے ابھی انہیں نوہی سال ہوئے تھے کہ مرستید کا انتقال ہو گیا۔ مرستید کی وفات کے بعد انہیں اپنی ملازمت کی فکر ہوئی۔ اس درمیان میں انہوں نے ٹڈل ورنیکر کا امتحان درجہ اول میں پاس کر لیا تھا۔ انہیں اطلاع ملی کہ محکمہ چونگی میں ہیڈ مٹری کی جگہ خالی ہے، وہ فوراً درخواست دیتے ہیں۔

جناب عالی !

گزارش یہ ہے کہ کمترین عرصہ تین سال تک فری اسکول نمبر اول میں یہ عہدہ نائب مدعی مامور رہا، بعد اس کے عرصہ نو سال تک جناب آرنیبل ڈاکٹر مرید احمد خاں بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی مائل۔ ایل۔ ڈی سیکریٹری ایم۔ اے۔ اڈاکا لکی پیشی کا کام انجام دیتا رہا اور اسی اثنا میں امتحان ٹڈل ورنیکر درجہ اول میں پاس کیا۔ چونکہ وجہ وفات مرستید مرحوم ندوی بیکار ہو گیا ہے اور مرستید چونگی کی ہیڈ مٹری کا عہدہ خالی ہے اس لیے گزارش ہے کہ کمترین کی پرورش اس عہدہ پر فرمائی جاوے۔

کمترین محمد نجم الدین ساکن علی گڑھ محلہ بالائے قلعہ

معروضہ ۳۰ مارچ ۱۸۹۷ء

اس درخواست کی پیشانی پر تنبیہ ڈریک نے چند سطریں سفارش میں لکھ دی ہیں کہ میں اس درخواست کی پُر زور سفارش کرتا ہوں۔ نجم الدین چھوٹے سے قد کے بڑے لائق آدمی ہیں انہوں نے مرستید احمد مرحوم کے ساتھ رہ کر طبی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ ان کی خدمات مجھے مطلوبہ نہیں کیونکہ مجھے انگریزی دان کلرک کی ضرورت ہے۔ اس درخواست پر دو اور مختصر سفارشات ہیں۔ آخر میں نواب منزل خان کی پُر زور سفارش ہے جو یکم اپریل ۱۸۹۷ء کی مکھی ہوئی ہے۔

یہ درخواست تو منظور نہیں ہوئی، لیکن سید محمود مرحوم نے انہیں اپنی پیشانی میں لے لیا۔ موصوف سید محمود کی حاضر جوابی، ظرافت اور ان کی ذہانت اور قوتِ حافظہ کے بڑے دلچسپ واقعات سناتے تھے۔ منشی صاحب نے ان کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا، لیکن مطمئن نہ تھے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ سید محمود کی تلون طبعی اور درشت مزاجی سے گھبراتے ہوں اور طوفانِ ابرو باد سے پہلے ہی ایک بجائے پناہ کی تلاش میں لگ گئے ہوں۔

۱۲ جنوری ۱۹۰۶ء کا محسن الملک کا کھٹا ہوا ایک خط اس ذخیرے میں ملتا ہے جو انہوں نے علی گڑھ سے مولوی عبدالغفور صاحب مددالمہام رام پور کو منشی صاحب کے متعلق لکھا ہے،

جناب من!

منشی نجم الدین کو دو غرض سے آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں، ایک اس کی ذات کے لیے اگر ہو سکے تو اس کی پرورش کیجئے، وہ سہایت نیک، ہوشیار اور محتنتی ہے۔ ضرور آپ اس کے کام سے خوش رہیں گے۔ ان کے لیے آپ کو دہلی میں کھٹا تھا۔ دوسرے اس امید سے کہ انفرنس کی رپورٹ اور حساب اس کے ہاتھ روانہ کر دیجئے تاکہ رپورٹ جو مرتب ہو رہی ہے وہ جلد شائع کی جاسکے اور جو چندہ موعودہ ہے اس کی وصولی کا تو آپ کو خود خیال ہوگا۔ مجھے یاد دلانا فضول ہے۔ زیادہ نیاز۔ مہدی محسن الملک کے اس خط کا اثر کیا ہوا معلوم نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ رام پور نہ جاسکے اور علی گڑھ میں محسن الملک کے پاس رہ کر ہی (اس لیے کہ اب وہ ان کے تحت کام کر رہے تھے) سرکاری ملازمتوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔

سرکاری ملازمت کے حصول میں انگریزوں کی سفارشات کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور وہ اس سے ناواقف نہ تھے۔ تعجب نہیں کہ اس خیال نے انہیں پروفیسر تھیوڈر مارسلین سے ملا یا ہوا۔ ایم اے، اوکالج کے یہ انگریز پرنسپل ۲ اپریل ۱۹۰۶ء کو انہیں سند دیتے ہوئے لکھتے ہیں "میں نجم الدین سے واقف ہوں جو ایک سرے تک سرسید خاں کے تحت کام کر چکے ہیں اور جنہوں نے انہی کی نگرانی میں اپنا کام سیکھا ہے۔ جو خوش نویس ہیں نے اپنی زندگی میں دیکھے ہیں، ان میں یہ بہت بہتر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان میں یہ غریبی ہے کہ بہت تیز لکھتے ہیں، بہت اچھے اخلاق کے مالک ہیں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سرسید احمد خاں ان پر کس قدر بھروسہ رکھتے تھے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ غیر معمولی جفاکش ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بہترین محرر رہنے کی ساری صلاحیتوں کے مالک ہیں؟"

افسوس ہے کہ ان سفارشات اور اسناد کے باوجود انہیں کوئی معقول جگہ نہ مل سکی۔ وہ بدینور محسن الملک کی ماتحتی میں پیشی کی خدمت انجام دیتے رہے اور دونوں ہی کوئی بھی اس بات سے غافل نہیں رہا کہ کسی اور موزوں جگہ کی تلاش ضروری ہے۔

ان کا غذات میں اپریل ۱۹۰۶ء کی کمی ہوئی ایک انگریزی درخواست کی ٹائپ شدہ نقل ملتی ہے جو انہوں نے انسپٹر جنرل آف رجسٹریشن آگرہ و اوڈھ کو رجسٹری کے لیے بھیجی ہے۔ اس درخواست کی پیشانی پر اس زمانے کے انگریز پرنسپل مسٹر آرنج بولڈ کے تلم کی کمی ہوئی مختصر سی سفارش ہے۔

۱۱ جولائی ۱۹۰۶ء کی کمی ہوئی ایک اور درخواست اردو میں ملتی ہے جو ڈسٹرکٹ سیشن جج بہادر ضلع فرخ آباد کے لیے

لکھی گئی تھی :-

حنور عالی !

ندوی ضلع علی گڑھ کے ایک معزز اور تربیت خاندان سے ہے۔ ندوی کو سرسید مرحوم نے صغیر سنی سے مثل اپنے بچے کے پرورش کیا، تعلیم دی اور تربیت کی اور اپنی پیشگی کی خدمت سپرد فرمائی۔ ندوی نے زبردست تک اس خدمت کو نہایت محنت اور دیانت داری سے انجام دیا۔ اور اس اتنا۔ میں امتحان مڈل ورنیکولر اول درجہ میں پاس کیا۔ بعد وفات سرسید مرحوم ندوی نے آنریبل سبجورڈ مروجہ آنریری سیکرٹری ٹرسٹیاں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی پیشگی کی خدمت انجام دی اور ان کی وفات کے بعد سے جناب نواب محسن الملک بہادر مروجہ آنرری سیکرٹری ٹرسٹیاں کی پیشگی کی خدمت انجام دینا ہے

اب ندوی بذریعہ درخواست ہذا مستدعی ہے کہ پرورش ندوی کی صبیغہ دیوانی میں کسی عہدے پر فرمائی جاوے۔ زیادہ آداب۔

ندوی نجم الدین محترم پیشگی نواب محسن الملک

معروضہ ۱۱ جولائی ۱۹۰۶ء

دونوں درخواستوں کا نتیجہ صفر ہی رہا۔

سرسید کے بعد ان کی ذات سے دلچسپی رکھنے والوں میں محسن الملک سب سے زیادہ ہیں۔ وہ ہمیشہ ان کی ترقی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ اس زحیرے میں ان کے لکھے ہوئے متعدد خطوط ملنے ہیں جو انھوں نے دوستوں یا افسروں کو ان کی سفارش کے سلسلے میں لکھے ہیں اور اس پر متعدد سارٹلی ٹیکٹ مستزاد جو انھوں نے لکھ کر وقتاً فوقتاً دیے ہیں۔

اُردو کے مکتوب الیہ ریاست رام پور کے مدارالمہام ہیں۔ دوسرا خط انگریزی میں ہے۔ اور تاریخ تحریر ۸ جون ۱۹۰۶ء ہے۔ بدقسمتی سے مکتوب الیہ کا نام دریافت نہ کر سکا، لیکن ”مائی ڈیئر“ سے خط کی ابتداء ہوتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مکتوب الیہ سے جو غالباً انگریزی ہے، لے نکلتی کے تعلقات نہیں رکھتے۔ پھر بھی منستی صاحب کی محبت میں اسے چار صفحوں کا طویل خط لکھنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ حامل رقعہ ہذا سترہ سال سے کالج اور کانفرنس میں اپنے فرائض چیر چربی انجام دے رہے ہیں اور ان کی خدمات کے معترف مسٹر گارڈن براؤن بھی ہیں جن کی دی ہوئی سارٹلی ٹیکٹ ان کے پاس موجود ہے، مجھے یقین ہے کہ ان کے معاملے کو آپ خاص اہمیت دیں گے اور اس موصلے میں سب رجسٹرار کی جگہ پر تقریریں آپ پوری مدد فرمائیں گے۔

دوسرا انگریزی خط انھوں نے G C C. INGRAM کو لکھا ہے۔ جو اُس زمانے میں علی گڑھ کے کلکٹر اور رجسٹرار تھے۔ خط پر تاریخ تحریر درج ہے لیکن سال کا اندراج نہیں۔ یہ خط اٹاواہ سے لکھا گیا ہے۔ اور قیاس غالب ہے کہ خود منستی صاحب اسے صاحب موصوف کے پاس لے کر پہنچے ہوں گے۔ اس لیے کہ لفافے پر نہ ٹکٹ چسپاں ہے نہ ٹاک کی مہر کے نقوش ہیں۔ محسن الملک نے لکھا ہے کہ آپ کے دفتر میں ایک اسامی خالی ہونے کی مجھے اطلاع ملی ہے۔ اگر اس جگہ پر آپ نجم الدین

مولانا حالی کا خط غشی نجم الدین کے نام

عزیز! آج کا خط پہنچا جسکو پڑھ کر بہ اتہا رخ اور آتشیں ہو
 ایسا محوِ مہرِ عہدِ غایت ہے - میں دل سے اس باب میں کوشش کرو
 جو رمضان اب آ رہا ہے اس قسم کا فکر و غور کا کام ہونا دشوار ہے اور کہتے
 ان کے کہنے کے کچھ زیادہ جلد رکھی ہی مرارت نہیں میں نے آج کا خط پھاڑا
 رکھ دیا ہے لیکن بعد رمضان کے آج ایک دفعہ آفریقہ کے یاد دہانہ مراد
 از ارادہ و از انانیت العارفہ کا حال

کافقہ کر دیں تو میں غایت دیرمیزوں ہوں گا اور مجھے یقین ہے کہ اس انتخاب کے بعد میں خود آپ کو بڑی مسرت حاصل ہوگی۔ محسن الملک نے اپنا پورا خط کا کاغذ استعمال کیا ہے جس پر ان کے نام کا موٹو گرام نقش ہے اور پتے میں حیدر آباد دکن۔

محسن الملک نے انہیں مختلف مرفعوں پر چار سہ ہجری بھی لکھ کر دی ہیں۔ یہ علی الترتیب ۱۸۹۹ء، ۱۹۰۲ء، ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء کی کبھی ہوئی ہیں۔

اس ذخیرے میں کچھ اور سندیں بھی ہیں جن میں ایک انگریزی سند گارڈن براؤن کی ہے۔ یہ علی گڑھ میں پروفیسر خٹے اور کچھ دنوں تک محمد انجیر کیتل کالڈنس کے بوائے سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے سنہ ۲۶ مئی ۱۹۰۶ء کو لکھ کر دی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب منشی صاحب سب رجسٹری کی کورس کر رہے تھے۔

براؤن نے انہیں صرف ایک سند ہی لکھ دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اسی دن انہوں نے ایک خط بھی الیف ای ٹیلر آئی ہسی، اس کے نام لکھ کر ان کے حوالے کیا ہے۔ جو اس زمانے میں دوسرے سفید آقاؤں کی طرح ہندوستان کی دھوپ اور مٹی سے بچنے کے لیے مٹی کی ساداب پہاڑیوں پر فروکش تھے۔ منشی صاحب صحت سے براداشت کرتے، روپیہ بہاتے اور محنت ضائع کرنے، ہانپنے کا نپے پہاڑی کی چوٹی پر صاحب کے درویش برہمن تو معلوم ہوا صاحب مصروف ہیں اور کسی سے مل نہیں سکتے۔ انہوں نے براؤن کا خط بھرا دیا۔ علیحدہ جواب دینے کے بجائے اُس نے بے نیازی سے اسی خط کی پیشانی پر سرخ روشنائی سے لکھ دیا۔

CAN NOT DO ANYTHING FOR NAJMUDDIN

اس ذخیرے میں اور بھی بعض کاغذات ہیں جن کا ذکر کسی اور موقع پر کیا جائے گا۔

محسن الملک سے وابستگی کے زمانے ہی میں منشی صاحب کو ایک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ میں مضمون کی ابتداء میں ان کی شادی کا ذکر کر چکا ہوں۔ ۱۸۹۳ء میں ان کی علی گڑھ میں شادی ہوئی۔ ۲۷ اگست ۱۸۹۷ء کو ان کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام انہوں نے ناچ دار بیگم رکھا، افسوس ہے کہ یہ سات سال کی عمر میں جولائی ۱۹۰۴ء میں دیوار کے نیچے آکر انتقال کر گئی، شبلی، سرستیدار محسن الملک کے علاوہ ان کے تعلقات حالی سے بھی کچھ کم نہ تھے۔ منشی صاحب نے اس حادثے کی انہیں اطلاع دی اور اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ سچی کی وفات پر کوئی قطعہ تاریخ لکھ دیں جسے وہ کتبہ مزار پر نقش کرا سکیں۔ حالی نے انہیں فوراً جواب لکھا۔

عزیز من!

آپ کا خط پہنچا جس کو پڑھ کر بے انتہا رنج اور افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ اتم کو صبر جمیل عطا کرے، میں دل سے اس باب میں کوشش کروں گا مگر رمضان المبارک میں اس قسم کا فکر و غور کا کام ہونا دشوار ہے اور کتبہ لگانے کے لیے کچھ زیادہ جلدی کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کا خط بہ حفاظت رکھ لیا ہے۔ لیکن بعد رمضان کے آپ ایک دفعہ ضرور مجھے یاد دلا دیں والسلام خاکسار، (الطاف حسین حالی، از پانی پت ۱۸ نومبر ۱۹۰۷ء)

محسن الملک کی وفات کے بعد انھیں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی سرپرستی حاصل ہوئی اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۸ء تک ایجوکیشنل کانفرنس میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی ماتحتی میں خدمات انجام دیتے رہے۔ دو سال بعد حسن خدمت کے صلے میں انھوں نے بہت اچھی سند انھیں لکھ کر دی۔ یہ ۲۴ فروری ۱۹۱۹ء کی تحریر کردہ ہے۔ اور اس میں منشی صاحب کے حسن خدمت کے علاوہ ان کی خوش نویسی کی بھی تعریف کی ہے۔ ان کی تیز نویسی کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے: "HE USES HIS PEN AS ONE USES A TYPE-WRITER"

ایم، اے، اوکالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اصحاب سے ان کے تعلقات کی داستان ابھی حرم نہیں ہوئی۔ ابھی اس خاندان کے ایک نامور فرزند کا ذکر ضروری ہے۔ جو منشی صاحب کو دوستوں کی طرح عزیز سمجھتے تھے۔ سرسید کے پوتے سر اس مسعود (۱۸۸۹ء-۱۹۳۷ء) حیدر آباد میں ہیں منشی صاحب ظاہرہ کوئی معقول اسامی جیڈا آب میں چاہتے ہیں۔ مسعود مرحوم کو ان کا پورا خیال ہے، وہ محکمہ امور مذہبی میں چاہتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی جگہ نکل آئے جس کے معتمد اس زمانے میں نواب صدربار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم (۱۸۶۷ء-۱۹۵۰ء) تھے۔ مسعود مرحوم کہتے ہیں:-
ڈیر انجمن تسلیم!

میرے خطوں کے جواب نہ دینے سے تاہم یہ سمجھتے ہو گئے کہ میں تم کو بھول گیا۔ دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ شروانی صاحب مئی کے مہینے میں کئی ہفتے تک دورے پر رہے۔ ان کے آتے ہی میں نے ان سے پورے طور پر تمہاری سفارش کر دی اور آج میں پھر ان سے ملوں گا اور تمہارے بارے میں پھر کہوں گا۔ اگر تم کو میرے ذریعے سے کوئی کامیابی ہوگئی تو مجھ کو بے انتہا خوشی ہوگی۔ دو ہفتے کے اندر میں ان شاء اللہ ولایت روانہ ہو جاؤں گا۔ بہر حال میں تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فقط
خاکسار سید مسعود

میں ابھی شروانی صاحب سے ملا تھا۔ انھوں نے وعدہ کر لیا ہے۔

لیکن یہ وعدے کام نہ آئے اور سرسید، سید محمد، محسن الملک، شبلی حالی، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، غنیو ٹوبک، مارلین براؤن، اس مسعود، صدربار جنگ کی ساری سندیں، تحریروں اور سفارشیں منشی صاحب کے ذخیرہ کاغذات میں اور ان بزرگوں کی مساعی حسنہ ان لوگوں کے نامہ اعمال میں جمع ہوتی رہیں۔ وہ علی گڑھ اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ وہ علی گڑھ میں ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تقریباً ۹۰ سال کی عمر پا کر انھوں نے ۱۹۱۸ء کے اوائل میں یہیں وفات پائی۔ اس طرح منشی نجم الدین کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا یہیں علی گڑھ میں گزرا۔ زندگی کا آخری وقت بھی وہ علی گڑھ کی خدمت میں گزار کر یہیں خاک میں پیوست ہو گئے۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر محمود نازقی تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے۔ میر حسن دہلوی پران کا مقالہ لاہور سے شائع ہوا، اور مقبول ہوا۔ لیکن اس مجموعہ کا حق پر و فیروز حسب فراموشی نے ”میر حسن اور ان کا زمانہ“ لکھ کر ادا کیا جو لاہور سے شائع ہوا اس کتاب پر انہیں جامعہ پنجاب نے ڈاکٹریٹ تفویس کی۔ ڈاکٹر قمر لیتی، تاریخ، عارضی اور اردو کے سناہین متا زادویب اور محقق ہیں۔ ہندوستان اور علی گڑھ کی تاریخ سے بھی ان کی واقفیت بہت گہری ہے۔ میری فرمائش پر انہوں نے معصوم پر ایک فوٹو تحریر کیا جو آخر میں ان کے کسریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

۲۔ انجم اعظمی صاحب، خلیل مرحوم کے عزیز ترین دوستوں میں ہیں۔ علی گڑھ سے اردو میں ایم اے کر کے بمبئی کی کسی درس گاہ میں معلم ہو گئے تھے۔ غالباً ۱۹۵۵ء میں کراچی منتقل ہوئے۔ آپ کراچی میں اردو کے ممتاز اساتذہ اور نامور نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک نثر گو شاعر بھی ہیں۔ متعدد کتابوں اور شعری مجموعوں کے مصنف ہیں۔

۳۔ میں نے بھی ال سے متعدد کتابیں اور مضامین نقل کرائی تھیں، خیراتی لال بے جگر کے تذکرہ متعلق اردو کا واحد علمی نسخہ وزارت ہند (لندن) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کا مکمل شاہد ملک رام صاحب کے لیے میں نے حاصل کیا تھا۔ اور انہی کی فرمائش پر منشی نجم الدین صاحب سے اس کی نقل تیار کرائی تھی۔ ہم دونوں کا ارادہ اسے مل کر مرتب کرنے اور شائع کرنے کا تھا جو دوسرے کاموں کی وجہ سے اب تک معرس التوا میں بڑا ہوا ہے۔ کوئی پان سرفی کی کتاب انہوں نے بہت کم مدت میں لکھ کر دے دی تھی، معاوضہ جہاں تک یاد آتا ہے ساتھ آنے فی صفحہ کے حساب سے انہوں نے لیا تھا۔ کبر سن کے باوجود تحریر ان کی صاف تھی۔ یہ وہی منفق ہیں جنہوں نے جعلی چوکوں کے ذریعہ کالج کی قسم میں سے ایک لاکھ سے زائد کاتبین کیا تھا اور قومی رقم کے اس طرح ضائع ہونے کا غم سرسید کو عمر بھر رہا۔

۴۔ اصل سوشل میں سید صاحب سے ”رہ گیا ہے اور مرت محمد ابجکینسل کا نفرنس لکھ گئے ہیں۔

۵۔ افسوس کہ بگم صاحب کا سوشلزم کے اوائل میں انحال ہو گیا۔

۶۔ یہاں قبل بھی؛ یا اول بھی؛ پڑھا جاسکتا ہے۔

۷۔ اس ذیقیرے میں ایک لغافہ مشٹر ٹیلر آئی ہی، ایس سیکرٹری گورنمنٹ آگرہ وادوہ کے نام ہے۔ اس لغافے میں کوئی خط موجود نہیں۔ میراجیال ہے کہ محسن الملک کا خط اس ٹیلر کے نام ہے جو صحیح معنوں میں ۱۹۵۶ء سے انگریز آئی ہی، ایس حضرات کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس نے محسن الملک کے لغافہ پر بڑی شان لیے نیازی سے سرخ روشنائی سے یہ فقرہ لکھ دیا ہے۔

I AM AFRAID I CANNOT HELP HIM

۸۔ پتے پر یہ عبارت درج ہے۔ بمطالعہ عزیز منشی نجم الدین صاحب دفتر آنریری سیکرٹری محضون کالج، علی گڑھ۔

اس مقالے میں علی گڑھ اور اس کے بعض فرزندوں کا ضمناً ذکر آیا ہے جو اصحاب علی گڑھ کے حالات سے آگاہ نہیں ان کے لیے ممکن ہے ایک آدھ جگہ الجھن پیدا ہو اس لیے یہاں بعض تصریحات ضروری ہیں۔
یہ نوا درجن دور سے متعلق ہیں اس میں علی گڑھ کے آنریری سیکرٹری مندرجہ ذیل اصحاب تھے :-

سر سید احمد خان ۱۸۹۸ء تا مارچ ۱۸۹۸ء
سید محمد رفیع ۱۸۹۸ء تا ۱۸۹۹ء
محسن الملک ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء
دقار الملک ۱۹۰۰ء تا ۱۹۱۳ء
محمد اسحاق خان ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۵ء
سید محمد علی ۱۹۱۵ء تا ۱۹۳۰ء

اور رنپل اس ترتیب سے :-

سڈنس

تھیوڈور مارلیس

آرچولڈ

ٹول

ڈاکٹر منیا الدین احمد تا ۱۹۲۳ء

سر سید کے آخری زمانے کے تین واقعات اہم ہیں۔ (۱) ایک لاکھ روپے کا غبن جس کا اثر کالج کی مالی حالت پر ہوا، اور سر سید کی وفات پر اس کی حیثیت ایک دیوالیہ ادارے کی سی ہو گئی (تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرہ محسن محمد امین زمیری صفحہ ۲۵۹) انگریز پرنسپل مٹربیک کا کالج اور انجمن کے معاملات میں پورا دخل (۳) سر سید اپنے بعد اپنا جانشین اپنے لڑکے سید محمد کو بنانا چاہتے تھے، اور اپنی زندگی ہی میں اس کے لیے جگہ و دو شروع کر دی۔ ٹرسٹیوں میں بڑا اختلاف ہو گیا اور سر سید کے دست راست مولوی سمیع اللہ نے توسخت مخالفت کی۔ جب سر سید نے ”مجموعہ قواعد و قوانین ٹرسٹیان“ پاس کر کے یورپینز کو کالج میں من مانی کرنے کی اجازت دینی چاہی اور سر سید کو فتح اور مولوی صاحب کو شکست ہوئی تو عرصے تک فریقین میں پھلٹ مازی ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ مولوی سمیع اللہ مستعفی ہو کر کالج اور انجمن سے الگ ہو گئے (مطابقات و مضحکات سر سید جلد دوم ص ۱۳۲، ص ۱۳۳) نواب دقار الملک نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی (تذکرہ دقار امین زمیری)

سید محمد کی مادہ پرستی نے انہیں کسی کام کا نہ چھوڑا تھا جی بھی اُن سے پھوٹی۔ اس کے بعد علی گڑھ میں پریکٹس شروع کی اور کالج کے معاملات میں باپ کا ماتہ بٹایا۔ لیکن مدرسۃ العلوم کا کام جیسا کہ ابتداء میں اُنہوں نے کیا تھا، بعد میں قائم نہ رکھ سکے۔ کیونکہ آخر عمر میں شراب ان پر غالب تھی (یاد ایام عبدالرزاق ص ۲۶۸) سر سید کی وفات کے بعد سید محمد دیکر ٹری بن گئے لیکن سال بھر کے بعد ۳ جنوری

۱۹۱۹ء کو ٹرینیڈاڈ کالج کا جلسہ نواب محمد حیات ماں (سیرسندر حیات کے والد) کی صدارت میں ہوا۔ ایک طرف سید محمود اور دوسری طرف محسن الملک موجود تھے۔ سید محمود کے خلاف سرگرمیوں کو سہارا کر لیا گیا تھا۔ اس لیے محسن الملک کامیاب ہوئے۔ سید محمود کو چونکہ اپنی زندگی میں سرسید لائف جوائنٹ سیکرٹری بنا گئے تھے۔ تو ان کی رو سے ان کی موجودگی میں کسی اور کو سیکرٹری نہیں چننا جائز تھا۔ لہذا حاجی اسماعیل خاں صاحب سید محمود کی حمایت میں تھے۔ سب ٹرینیڈاڈ نے سید محمود کی جگہ محسن الملک کو سیکرٹری بنایا تو اس پر بڑا جھگڑا ہوا، سررضنا علی کہتے ہیں: "سید محمود کی حالت زخمی شہر کی تھی۔ چہرے پر تھے اور بزم میں آتا تھا کہہ رہے تھے۔ سب ادھر ادھر دھڑک رہے تھے۔ ٹرینیڈاڈ کی کوشش تھی کہ جس طرح بنیے۔ خوشامد در آمد کے غصب آورہ تہہ کر جیتے کی طرح نام کریں۔ اس کوشش میں سب نمایاں حصہ والے مضر یک تھے۔" بالآخر اس فتنے کی توجہ کو تھکا کر آئی جس کی دست و کادت اور ہوش مندی کا اب سے چند سال پہلے سید آباد میں ڈنکانج رہا تھا۔ محسن الملک بڑے اور سید محمود کے قدموں کی طرف جھکے۔ ان کی آن میں ایک ستہ کی ٹوپی دوسرے ستہ کے قدموں پر تھی۔ سید محمود نے ہاتھ پکڑ کر محسن الملک کو اٹھایا اور فرمایا مہدی نو کیا کہتا ہے۔ "محسن الملک کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا میں یہ کہا ہوں کہ اس وقت قوم کی کسنی کو ڈونے سے سوائے مٹھائے کوئی نہیں بچا سکتا۔" سید محمود نے "اچھا لو کہتے ہو میں راضی ہوں" سید محمود کی آواز میں انوس کا ذرا بھی سانس نہ تھا، ہم سب محو حیرت تھے کلاں جی بزم۔ سدا رسی امت یا رب یا سحاب (احسانا مہ سررضنا علی ص ۱۰۰) اس کے بعد مضر یک انجن پر عادی ہونے لگے اور انجن کے حسابات کے رحم و کرم اسی غویل میں لے لے محسن الملک بے دست و پا تھے۔ اس امدار کا اثر رہا کہ کالج کے انگریز پروفیسر طلبہ سے امتیازی سے سیس آئے لگے اور ٹرینیڈاڈ کے مقابلے میں ان کی خود سری زیادہ ہوتی گئی۔ مارلیس کی بریلی کے رمانے میں بھی یہ مواد جمع ہوا رہا، اور طلبہ اور انگریزی اسٹاف سے احکامات ٹھٹھے کئے۔ اگرچہ مالی حالت سنبھل رہی تھی۔ لیکن انگریزوں کی مہر و دماغی کی وجہ سے کالج تدریس کا مرکز بننے لگا۔ مارلیس کا اور لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس لیے کالج کے معاملات میں کوئی غلبہ دم نہیں مار سکتا تھا۔ طالب علموں میں بھی رنسل کے خلاف نرا انگریز قوم کے خلاف جذبات بھڑکنے لگے۔ مارلس انے بعد پروفیسر کارنا کو اپنا جانشین بنانا چاہے تھے مڑے دریدہ دہس آدمی تھے۔ اور کالج سے اپنی نفرت کا اظہار بڑھ کر کرتے تھے۔ مارلیس کے اثری، دلی کا دور لگانے کے باوجود زبردست مخالفت ہوئی۔ محسن الملک نے مارلیس کی حمایت کی، لیکن دفاار الملک ڈٹ گئے (مذکورہ دفاار، امی زسری صفحہ ۲۸) اور آرجولڈ کا فقر و عمل میں آیا جو انگلستان سے علی گڑھ آئے۔ انھیں علی گڑھ کے حالات سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے مڑے کارنر براؤن پروفیسر علی گڑھ کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ کی نفرت رنگ لائی اور سن ۱۹۱۹ء میں ہڑتال ہو گئی۔

ان واقعات کا نتیجہ یہ تھا کہ محسن الملک کی انگریز اسٹاف سے کبھی نہ بنی۔ انھوں نے حالات کے اظہار کی بجائے ہمیشہ انھما سے کام لیا۔ باوجودیکہ آرجولڈ اور محسن الملک ایک دوسرے کے بڑے مخالف تھے۔ محسن الملک نے عموماً اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ محسن الملک اردو مہدی کے مقابلے میں حکومت کے زیرِ عتاب بھی تھے۔ انگریزی ملازمت کے لیے ان کی سب سے کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ اس لیے نجم الدین نے اس رمانے میں گارنر براؤن اور دوسرے انگریزوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تو سب

نہیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا راز معلوم نہیں ہو سکا۔
محسن الملک نے اپنی نرم پالیسی کی وجہ سے ٹرسٹیوں میں سے بعض کو اپنا مخالفت بنا لیا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر نے اس زمانے میں بڑا ہنگامہ برپا کیا اور ٹرسٹیوں کے جلسوں میں بھی محسن الملک کی مخالفت شروع کر دی۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے افتخار صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کا ستارہ طلوع ہوا، اور محمد علی جوہر کے مقابلے میں ان کی سیاست زیادہ کامیاب ہوا کرتی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کا ایک فقرہ محسن الملک اور آرچرڈ کے بارے میں قابلِ ذکر ہے۔

THE PRINCIPAL IS ARCHOLD AND THE SECRETARY ARCH WEAK

جس کا ترجمہ سر رضا علی نے یوں کیا ہے کہ پرنسپل مہمان چلا ہے اور سیکریٹری مہمان (اعمال نامہ ص ۲۳۲)
محسن الملک کے بعد وقار الملک آئریئر سیکریٹری ہوئے۔ محسن الملک انگریز پرنسپلوں اور وقار الملک کے علاوہ کانفرنس کے نائب سیکریٹری نواب مزمل اللہ خاں اور علی گڑھ کی پارٹی بازی کے رواج رواں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب سے بھی منشی صاحب کے مراسم رہے۔ علاوہ ازیں سید محمود کے فرزند سر اس مسعود بھی منشی نجم الدین کے لیے ملازمت کی تلاش میں کوشاں ہوئے۔ اس مسعود ایک زمانے میں علی گڑھ میں مقیم ہو گئے تھے، اور کالج کی ترقی بہ توجہ صرف کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برادرانِ یوسف نے انہیں چلتا کیا۔ اور بدنامی کا داغ لے کر وہ ریاستوں کی ملازمتیں کرنے لگے۔

منشی نجم الدین صاحب کی سفارشات کو اگر پس منظر میں دیکھا جائے، تو پڑھنے والوں کے لیے شاید زیادہ

قابلِ فہم ہو۔

دیوانِ ناسخ — ایک نادر قلمی نسخہ

محمد حنیف نقوی

ناسخ کا کلیات پہلی بار ان کی وفات (پنجشنبہ، ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۳۸ء) کے ساڑھے چار سال بعد ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ (۲۳ جنوری ۱۸۴۳ء) کو میر حسن رضوی کے مطبع محمدی، لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ خاتمہ سے قبل کے ایک اندراج کے مطابق یہ کلیات تین دیوانوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے دیوان کا نام ”دیوانِ ناسخ“ ہے جس سے یہ قاعدہ زیر و بنیات ۱۲۳۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام میاں غنی شاگرد ناسخ نے تجویز کیا تھا۔ دوسرا دیوان جلاوطنی کے ایام میں مرتب ہوا تھا۔ اسی مطابقت سے اس کا تاریخی نام ”دفتر پریشاں“ خود مصنف کا رکھا ہوا ہے جس کے مطابق اس کا سال ترتیب ۱۲۴۷ھ قرار پاتا ہے۔ تیسرا دیوان ”دفتر شعر“ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام میر علی اوسط رشک (شاگردِ ناسخ) کا مجوزہ ہے اور ۱۲۵۸ھ پر مشعر ہے۔ خاتمہ کے مطابق اس تیسرے دیوان کی غزلیں ردیف و اردیوان دوم کی عزلوں میں ضم کر دی گئی ہیں۔ کلیات کا یہ پہلا ایڈیشن بہ ظاہر حال رشک کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ رشک نے اس اشاعت کا ایک مفصل غلط نام بھی مرتب کیا تھا جو ”تصحیح اخلاط و تنقید الفاظ کلیات شیخ امام بخش ناسخ از میر علی اوسط متخلص پر رشک کے زیر عنوان اس کے آخر میں شامل ہے۔ انہوں نے اس غلط نامے کی ترتیب کی تاریخ بھی کہی ہے جس کے یہ اشعار بطور خاص قابلِ غور ہیں، ۳۵

مرتب ہوا جب کہ دیوان سب	مجھے قصہ صحت کا پیدا ہوا
تلمذ میں ناسخ کے سیکھا جو تھا	وہ تحریر میں آشکارا ہوا
ہوئیں سہو کا تب کی لفظیں دست	بنا جو کہ نسب ان اطا ہوا
مجھے دخل اس سے زیادہ نہ تھا	تبدل میں جو کچھ ہویدا ہوا

رشک کی اس وضاحت کے باوجود ان کے مرتبہ غلط نامے کی رو سے ”تبدل میں جو کچھ ہویدا ہوا ہے“ اسے محض ”سہو کا تب“ اور ”نسب ان اطا“ کی تصحیح نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ جناب رشید حسن خاں نے ”انتخابِ ناسخ“ کے مقدمے میں اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہ ”غلط نامے میں بعض غلطیوں کی تصحیح اس طرح کی گئی ہے جس پر تصحیح کے بجائے ترمیم کا گمان ہوتا ہے“، الفاظ کی تبدیلی کے پہلو بہ پہلو پورے پورے مصرعوں کی تبدیلی کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی مکمل مصرعے کی تبدیلی کو سہو کا تب سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ رشک نے ناسخ کے کلام میں صرف لفظی تبدیلیاں ہی نہیں کی ہیں، مصرعے کے مصرعے بدلے ہیں یا خارج کیے ہیں۔ اس کا ایک حتمی ثبوت محض اتفاقی طور پر محفوظ رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کو لکھنؤ کے مشہور کتب فروش نادر آغا سے جنوں یونیورسٹی کے لیے خریدے ہوئے نسخے کے دیوانِ دوم کے ایک غیر معروف قلمی نسخے میں رکھا ہوا ایک رقمہ دستیاب ہوا ہے جس میں کسی نامعلوم الاسم شخص کو یہ اطلاع دی گئی ہے، ”دیوانِ اول و ثانی شیخ صاحب نوشتہ میر حامد علی ویکے دیوانِ محررہ دست مبارک شیخ صاحب باعتبار تبرک و فقط برائے ملاحظہ“ ”حدیث مفضل“ راتربیل کردہ ام کہ ہیں نسخہ را جناب میر علی اوسط صاحب گرفتہ و اصلاح فرمودہ یہ طبع در آوردند بعض اشعار شیخ صاحب را چنان از قلم محو فرمودہ اند کہ خواندہ نمی شود۔“

اس رقمہ کا آخری حصہ ضائع ہو گیا ہے اس لیے مکتوب الیہ کی طرح مکتوب نگار کا نام معلوم کرنے کا بھی کوئی ذریعہ موجود نہیں تاہم یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس کے لکھنے والے کو نسخے سے تقرب کا شرف حاصل تھا۔ مذکورہ بالا دو اوین کے علاوہ مکتوب الیہ کو عروض و قواعد فارسی سے متعلق چند رسائل پر مشتمل دو جلدیں اور ”بریان قاطع“ کی دو جلدیں بھی بھیجی گئی تھیں۔ ان کتابوں کے متعلق مکتوب نگار کی یہ وضاحت بھی کہ ”پیش نظر شیخ صاحب اکثر بودہ“، نسخے سے اس کے قریبی تعلق پر دلالت کرتی ہے۔ ان شواہد کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نسخے کا جو کلام اس وقت مطبوعہ صورت میں ہمارے پیش نظر ہے وہ قطعاً مستند نہیں اور اس کی روشنی میں ان کے شاعرانہ مرتبے اور لسانی خدمات کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے، ان پر از سر نو غور و فکر کی ضرورت ہے۔

ایک اور اہم بات جو نسخے کے تین دیوانوں کے متعلق کلیات کے آخر میں پیش کردہ وضاحت سے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ یہ دیوان زمانہ تصنیف کے لحاظ سے ترتیب دئے گئے ہیں یعنی دیوانِ اول آغاز شاعری سے ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) تک کے کلام پر مشتمل ہے، دیوانِ دوم ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) کے بعد سے ۱۲۴۴ھ (۱۸۳۱ء) تک کے کلام کا مجموعہ ہے۔ دیوانِ سوم میں عمر کے آخری سات برسوں کا کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے یہ بیان بھی ایک مفروضے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ دیوانِ اول کے سلسلے میں پروفیسر شبیر الحسن نوہروی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس میں ۱۲۳۲ھ کے بعد بھی اضافے ہوتے رہے ہیں۔ ہم اپنے مطالعے کی روشنی میں پروفیسر صاحب موصوف کے اس قول پر اس اضافے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ دیوانِ اول میں ۱۲۳۲ھ کے بعد صرف اضافے ہی نہیں کیے گئے ہیں بلکہ بعض غزلیں اس دیوان سے خارج کر کے دیوانِ دوم میں بھی داخل کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں شواہد کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) کلامِ ناسخ کا قدیم ترین ماخذ جو اس وقت ہماری دسترس میں ہے، وہ مصحفی کا تذکرہ ”ریاض الفصحاء“ ہے اس تذکرے کا آغاز ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں اور اتمام ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں ہوا۔ قرائن کے مطابق اس تذکرے میں نسخے کا حال ۱۲۲۲ھ میں لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نمونہ کلام کے طور پر جو اشعار پیش کیے گئے ہیں، وہ اس سے پہلے ہی ہوتی غزلوں سے ہی انتخاب کیے گئے ہوں گے۔ ان اشعار میں سے جن کی مجموعی تعداد سینتالیس ہے۔

اکیس شعر کسی مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں جب کہ مندرجہ ذیل تین اشعار دیوان دوم کی غزلوں میں ملتے ہیں :
 ملا عکس شفق کو رتبہ اکسیر پانی میں طلائی ہو گئی ہر موج کی زنجبیر پانی میں
 وہ مجنوں ہوں کہ ہر عالم میں پیلے میسے شامل ہے دلِ نالاں جس سے سینہ بے کینہ محمل ہے
 توقع ہے شبِ فرقت میں مجھ کو صبح ہونے کی معاذ اللہ کتنا موت سے انسان غافل ہے
 (۲) اعظم الدولہ سرور کا تذکرہ ”عمدہ منتخبہ“ اضافوں اور ترمیموں کے مختلف مراحل سے گزر کر ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۹ء) میں مکمل ہوا لیکن اس کا نقشبِ اول ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) کے قریب تیار ہو چکا تھا۔ اس کے دستیاب قلمی نسخوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی نسخے کی کتابت محرم ۱۲۴۴ھ (فروری ۱۸۰۹ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ اس تذکرے میں ناسخ کے نمونہ کلام میں جو اشعار پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک کے علاوہ وہ تمام اشعار جو کلیاتِ مطبوعہ اور اس تذکرے میں مشترک ہیں، دیوانِ اول سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی ماندہ ایک شعر جس غزل سے تعلق رکھتا ہے، وہ کلیاتِ مطبوعہ کے دیوانِ دوم میں شامل ہے۔ یہ شعر درج ذیل ہے :

دو شبِ تار سے تشبیہ ہمارے دن کو
 تیرگی سے نظر آتے ہیں ستارے دن کو

(۳) دیوانِ دوم (مطبوعہ) کی ایک غزل کا مقطع ہے :
 ناسخ ہے میرِ سلمہ اللہ کی زمیں اک مٹی شگفتہ کہ بانہ ہزار رنگ
 جیسا کہ اس مقطع سے ظاہر ہے یہ غزل میر کی زمین میں ہے اور ان کی زندگی میں یعنی ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) سے پہلے کہی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اسے دیوانِ اول میں شامل ہونا چاہیے۔
 (۴) دیوانِ اول کے بعض قلمی نسخوں کے مطالعے سے بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس دیوان کی بعض تا تمام غزلیں بعد میں مزید اشعار کے اضافے کے ساتھ دیوانِ دوم میں شامل کر دی گئی ہیں۔
 اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ کلامِ ناسخ کی از سر نو تدوین کی جائے۔ یہ کام کئی اعتبار سے اہم ہے اور پہلے دو دیوانوں کے مخطوطات کی وافر تعداد میں دستیابی کی بنا پر یہ آسانی انجام دیا جاسکتا ہے۔ جناب رشید حسن خاں نے ”انتخابِ ناسخ“ کے مقدمے میں اس ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے :

”کلامِ ناسخ کے بہت سے مخطوطات مختلف مقامات پر محفوظ ہیں۔ ان میں ایسے مخطوطات بھی ہیں جن میں کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔ اور ایسے مخطوطات بھی ہیں جن کی مدد سے ناسخ کے تفسیرے دیوان کی غزلوں کا تعین بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کی ضرورت ہے کہ ان مخطوطات کی مدد سے کلامِ ناسخ کا ایک اچھا ایڈیشن مرتب کیا جائے جس میں تینوں دیوان الگ الگ ہوں۔ زبان اور متروکات کی بحث کے نقطہ نظر سے تینوں دیوانوں کا تعین ضروری ہے لیکن اس سے زیادہ ضرورت

یوں ہے کہ اشاعتِ اول کے غلط نامے سے بعض شبہات تعینِ متن کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ازالے کی واحد صورت یہی ہے کہ کلامِ ناسخ کو پھر سے مرتب کیا جائے۔^{۱۴} کلامِ ناسخ کی طرف از سر نو توجہ اور اصولِ تدوین کے مطابق اس کی ترتیب جدید کی اسی اہمیت کے پیش نظر سطور ذیل میں دیوانِ اول موسوم بہ ”دیوانِ ناسخ“ کے ایک نادقلمی نسخے کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ کلیاتِ مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے مشمولات میں کتنا فرق ہے اور متداول متن پر انحصار تحقیقی نقطہ نظر سے کس حد تک درست ہے۔

زیر تعارف قلمی نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے ذخیرہ لائبریری سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کل چپاسی^{۱۵} اوراق پر مشتمل ہے۔ مسطر عام طور پر انیس سطری ہے لیکن کسی کسی صفحہ پر اٹھارہ یا بیس سطری بھی ملتی ہیں۔ کاغذ کی قدامت اور بحرم خوردگی کے باوجود متن بڑی حد تک محفوظ ہے۔ اس مخطوطے میں ورق ۱۔ الف سے ورق ۵۔ الف کے وسط تک ردیف و ازغزلیں درج ہیں۔ ردیفوں کی ترتیب عام طور پر حروفِ تہجی کے مطابق ہے لیکن کہیں کہیں یہ سلسلہ برقرار نہیں رہ سکا ہے۔ مثلاً ردیف السین کے بعد پہلے ردیف الغین اور اس کے بعد ردیف العین کی ایک ایک غزل، اس کے بعد ردیف الصاد کی ایک غزل اور بعد ازاں ردیف الغین کی ایک اور غزل نقل ہوئی ہے۔ بعض ردیفوں مثلاً ردیف باسے فارسی، ردیف الحاء، ردیف را سے ہندی، ردیف الزاء، ردیف الشین، ردیف الضاد، ردیف الطاء، ردیف الظاء اور ردیف الفاء میں کوئی غزل موجود نہیں۔ ردیف یاء کی آخری غزل کے بعد بالترتیب ردیف لام اور ردیف الف کے دو دو متفرق اشعار منقول ہیں۔ اس کے بعد ورق ۵۔ الف ہی کی اٹھارہویں سطر سے رباعیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ کل سات رباعیاں ہیں جو سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ ورق ۵۔ ب کی آخری سطر پر ”تاریخ“ کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ تاریخوں کا یہ سلسلہ ورق ۵۔ الف کی آخری سطر پر ختم ہوتا ہے۔ ان قطعاتِ تاریخ کی مجموعی تعداد اٹھاسی ہے جن میں بیشتر عنوانات کے التزام سے محروم ہیں۔ صرف پندرہ قطعوں کی پیشانی پر واضح یا نیم واضح الفاظ میں متعلقہ واقعات کی طرف اشارے کر دئے گئے ہیں۔ بہ اعتبار زمانہ قدیم ترین قطعَاتِ تاریخ میر روشن علی کے مکان کی تعمیر اور نواب آصف الدولہ کے سانحہ وفات (۱۲۱۲ھ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں قطعے بالترتیب تیرھویں اور پینتالیسویں نمبر پر درج ہیں۔ چھبیسویں اور ستائیسویں نمبر کے دو قطعَاتِ ۱۲۳۲ھ کے دو واقعات سے متعلق ہیں جب کہ آخر کے گیارہ قطعوں سے ۱۲۳۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ ان میں سے نو قطعے صرف مرزا قنیل کے سال وفات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نسخے کا اختتام اسی سلسلے کے آخری قطعے پر ہوتا ہے۔ ترقیمہ جو ورق ۵۔ ب کی ابتدائی پانچ سطروں کو محیط ہے، درج ذیل ہے:

”تمت تمام شد دیوانِ شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ بتاریخ بست ہفتم شہر صفر سنہ یک ہزار و دو صد پنجاہ پنج ہجریہ حسبِ فرمائش نواب مستطاب، معلی القاب طہاء اہل کمال، ملاذالغرباحسن علی“

بہادر دام اقبالہ دست خط اضعفت العباد محمد حسین علی تحریر یافت فقط تمت تمام شد فقط۔
اس ترقیہ کے مطابق اس نسخے کی کتابت ناسخ کی وفات کے نو ماہ بعد مکمل ہوئی ہے لیکن صفحہ اول کی لوح پر شکر فی
روشنائی سے دیوان شیخ محمد ناسخ دام ظلہ کا اندراج یہ ظاہر کرتا ہے کہ کتابت کی ابتدا شیخ صاحب کی زندگی ہی میں
ہو چکی تھی۔ اس کے برخلاف یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نسخہ جس نسخے سے منقول ہے، اس کی لوح پر بھی یہ عبارت اسی طرح
مرقوم ہو یا لکھنے والا جس نے مصنف کا نام تک صحیح نہیں لکھا ہے، "دام ظلہ" کے مفہوم ہی سے ناواقف ہو۔ یہ نسخہ
جن نواب مستطاب علی القاب کے لیے لکھا گیا ہے وہ بہ گمان غالب امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ کے صاحبزادے اور ناسخ
کے شاگرد رشید نواب حسین علی خاں آثر ہیں۔ کاتب نے غلطی سے ان کا نام "حسن علی خاں" لکھ دیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے
کہ یہ نسخہ اصلاً نواب موصوف کے لیے لکھا گیا ہو بلکہ ان کی فرمائش پر لکھے ہوئے کسی نسخے سے منقول ہو۔ اس کے
باوجود اعتبار و استناد کے نقطہ نظر سے اس نسخے کی اہمیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

دستیاب معلومات کے مطابق "دیوان ناسخ" کا قدیم ترین قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی،
علی گڑھ کے ذخیرہ سمان اللہ میں محفوظ ہے۔ ترقیہ کی رو سے اس کی کتابت سہ شنبہ ۲۱ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ (۹ جنوری
۱۸۱۹ء) کو مکمل ہوئی تھی۔ گیارہ سطرے مسطر کے سپیسٹ اور اوراق پر مشتمل اس نسخے میں ہر سطر میں دو شعر اور ہر صفحے پر اوسطاً بیس
شعر نقل ہوئے ہیں۔ نسخہ بنارس کے مندرجات سے متعلق گزشتہ سطور میں پیش کردہ تفصیلات کے مطابق اس کا
اختتام غزلیات کے آخر میں درج چار متفرق اشعار میں سے تیسرے شعر سے

صدمہ اٹھے گا مجھ سے نہ غوغاے زاغ کا

ہوں بے دماغ نغمہ سرا یاں باغ کا

پر ہوا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اور نسخہ سر سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد میں بھی موجود ہے۔ یہ نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا،
لیکن ثانوی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کے بموجب اس کے اوراق کی تعداد ایک سو چھ اور فی صفحہ سطور کی
تعداد چودہ ہے۔ کتابت کی تکمیل دو شنبہ ۱۶ ربیع الثانی ۱۲۳۴ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۲۸ء) کو ہوئی ہے۔ نسخہ
علی گڑھ کی طرح اس نسخے کا خاتمہ بھی سلسلہ متفرقات کے مندرجہ بالا تیسرے شعر پر ہی ہوا ہے۔ ان تفصیلات کی
روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ اور حیدر آباد کے یہ دونوں نسخے کسی نا تمام یا ناقص الآخر نسخے پر مبنی ہیں۔ اس کے
برخلاف نسخہ بنارس ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ "دیوان ناسخ" کا قدیم ترین قلمی نسخہ ہے۔
نسخہ بنارس "دیوان ناسخ" کے دوسرے تمام نسخوں سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ یہ ظاہر حال ایک طرف تو

اس میں ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) تک کا وہ تمام کلام درج ہے جسے ناسخ شامل دیوان کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف
۱۲۳۳ھ اور ۱۲۳۴ھ کے پانچ مختلف واقعات سے متعلق تیرہ قطعہ تاریخ کے علاوہ کوئی ایسی چیز موجود نہیں جسے
بدیہی طور پر اس کے معلوم زمانہ ترتیب کے بعد کی تصنیف کہا جاسکے۔ ان تیرہ قطعہ میں سے بھی نو قطعے صرف ایک

واقعے یعنی مرزا قاتل کی وفات سے متعلق ہیں جو سہ شنبہ، ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ (۳۱ جنوری ۱۸۱۸ء) کو واقع ہوئی تھی۔ چونکہ اس نسخے کا آخری صفحہ اسی سلسلے کے قطعات پر مشتمل ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ ناسخ ترتیب دیوان کے کام سے اصلاً اسی زمانے میں فارغ ہوئے ہوں۔ اور انھوں نے ایک موزوں ترین تاریخی نام (دیوان ناسخ) کی خاطر اس سے حاصل شدہ سنہ (۱۲۳۲ھ) اور اصل زمانہ اتمام کے اس معمولی فرق کو نظر انداز کر دیا ہو۔ باقی چار قطعات میں سے میر نوروز علی کی وفات (۱۲۳۳ھ) کا قطعہ تاریخ قاتل کے انتقال کے دوسرے اور تیسرے قطعے کے درمیان درج ہے۔ اس سے پرشبہ گزرتا ہے کہ ممکن ہے یہ قطعہ اور اسی طرح باقی تین قطعے بھی اصل نسخے میں حاشیے پر بعد میں اضافہ کیے گئے ہوں اور اس نسخے کے کاتب نے انھیں متن میں شامل کر لیا ہو۔ ان قیاسات کو قابل اعتناء سمجھا جائے تب بھی یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس نسخے میں کوئی ایسی چیز درج نہیں جو حتماً ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) کے بعد کی تصنیف ہو۔

یہ نسخہ ازاول تا آخر نہایت پختہ اور صاف نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر عجبت پسندی یا تیز نویسی کے نتیجے میں تحریر کی روش کسی قدر مختلف ہو گئی ہے لیکن کاتب کم سواد بھی ہے اور غیر محاط بھی۔ چنانچہ وہ الفاظ کی ہیئت اصلی پر غور کرنے کی بجائے انھیں ان کی ہیئت ظاہری کے مطابق لکھ دینے میں مطلقاً قائل نہیں کرتا۔ املا کے معاملے میں بھی اس کے معمولات و مختارات اپنے زمانے کے عام کاتبوں سے مختلف نہیں۔ کتابت کی مجموعی کیفیت کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں پر آسانی کیا جاسکتا ہے :

نہیں جگہتی ہیں مسجد میں جہیں سائیر کی کوئی میں	خجہ مراب پر اوں کو یقین ہے تیغِ بُراں کا
بھٹکتے تیرے کوپے	محراب اُن کو
سراپنا کاٹ ڈالوں آپ اگر شوقِ شہادت ہی	اولیاءوں بوج کیوں سر پر کسی قاتل کی احساں کا
انگڑ ہے	اٹھاؤں بوجھ قاتل کے
وہ ہی دل زندہ جاوید ہی جو پھس کیا اسمیں	کہ دام زلف کا چشمہ ہے چشمہ آبِ حیواں کا
وہی ہے پھنس گیا اس میں	بوجہ او تر نیکی جگہ دم چہرہ کیا مزدور کا
کوئی قاتل بی پہنچ کر سر ہوا مجھ کو و بال	بوجہ اترنے کی جگہ چوٹھ گیا
کوئے میں پہنچ مجھ کو	باتمہ آتا ہے میری تختِ سلیمان ہر برس
یاد وحشت آڈرائی ہی مجھی فصلِ بہار	باتمہ مرے
باد (پر) اڑاتی ہے مجھے	کسی مانگیں جا کی ناسخ اس غزل کی داد ہم
پہلی اپنی عہد سی افسوس سودا اوٹھ گیا	کس سے مانگیں جا کے غزل کی
پہلے اپنے سے اٹھ گیا	

باک و در تیری تجلی سی منور ہیں تمام سے
 ہیں صباں طور کی اطوار تیری کوچی میں
 عیاں کے ترسے کوچے
 حال دل کہنی کی ناسخ جو نہیں پاتا یار
 پھینک جانا ہی وہ اشعار تیری کوچی میں
 پھینک جانا ہے ترسے کوچے
 یوں دلا تجھ کو شب بچراں میں ہم شاہ کریں
 (کیے) ہیں انھیں
 کور زنجیروں سی ڈیوان پو عوض چادر کل
 گور سے ڈھانچو گل
 کیا ہی ناتواں ایسا ہمیں آزارِ فرقت نی
 نے
 ہمصغیر اس باغ کا کب ہوا ناساز ہی
 ہم صغیر باغ کی کیسی ہے
 نہیں عشاق کو آرام بعدِ مردن ہی
 آرام (ملن) بعد بھی
 جذباتِ کمال حسن میں آیا تیری مونہ پر
 ترے منہ
 یارب مدد طلب ہوں تیری بارگاہ سی
 تری بارگاہ سے
 شرمندہ کی کمال ہی عذر گناہ سی
 شرمندگی ہے گناہ سے

یہ قلمی نسخہ اس اعتبار سے بے حد اہم اور نوج طلب ہے کہ اس میں متعدد ایسی غزلیں اور صد ہا ایسے اشعار موجود ہیں جو کلیاتِ مطبوعہ اور عام قلمی نسخوں میں نہیں ملتے۔ دوسری طرف کلیاتِ مطبوعہ کی تقریباً اتنی ہی غزلیں اور اتنے ہی اشعار اس نسخے میں نہیں پائے جاتے۔ یہ صورتِ حال تاریخی اعتبار سے کلامِ ناسخ کی ترتیب کے سلسلے میں اس نسخے کی غیر معمولی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ مصحفی کے تذکرے ”ریاض الفضا“ کے سلسلے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ اس میں شامل ناسخ کے نمونہ کلام میں سے ایکس شعر مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں اور تین شعر دیوانِ اول کی بجائے دیوانِ دوم میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام اشعار اس نسخے میں موجود ہیں۔ اعظم الدولہ سرور کے تذکرے ”عہدہ منتخبہ“ یعنی ناسخ کے کلام کا انتخاب ایک سو سینتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ستاون شعر کلیاتِ مطبوعہ میں نہیں ملتے۔ پیش نظر قلمی دیوان میں ان ستاون اشعار میں سے سینتالیس شعر موجود ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے احمد حسین کا کوروی کے تذکرے ”بہارِ

بلے خزاں کے ایک تحقیقی جائزے میں آتش کے انتخابِ کلام میں شامل ایسے پندرہ اشعار کی نشان دہی کی ہے جو اصلاً ناسخ کی تصنیف ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل شعر کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ یہ ناسخ کے کسی دیوان (قلمی یا مطبوعہ) میں نہیں ملتا ہے۔

ایک جھٹکے میں جُدا حلقے سے حلقہ ہو گیا
جوشِ وحشت خاڑ زنجیر کو سیلاب تھا

یہ شعر بھی اس قلمی نسخے میں موجود ہے۔ جہاں تک اس تذکرے (بہارِ بلے خزاں) میں خود ناسخ کے انتخابِ کلام کا تعلق ہے، ڈاکٹر اکبر حیدری نے دیوانِ ناسخ کی اشاعتِ اول اور تین قلمی نسخوں سے مقابلے کے بعد ایسے بیس اشعار کی نشان دہی کی ہے جو "ناسخ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں لیکن ان کے کسی قلمی یا مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے" اور جو ان کے خیال میں "الحاقی ہیں" ان بیس اشعار میں سے مندرجہ ذیل ایک شعر کلیاتِ ناسخ، طبعِ اول کے پہلے دیوان میں صفحہ ۴۶ پر موجود ہے۔

اُس پری رُو کے کفِ پا میں ہے عالم نور کا
سنگِ پا کے واسطے منگوائیں پتھر طور کا

باقی ماندہ انیس شعروں میں سے مندرجہ ذیل نو شعر "دیوانِ ناسخ" کے زیرِ بحث قلمی نسخے میں شامل ہیں۔

فردِ دل کو چہ سفاک کو گلشنِ سمجھا تیغ کو طائرِ جان شاخِ نشیمن سمجھا
آئی صحرا میں جو اس گرم عناں کی ام یاد چشمِ آہو کو میں نقشِ سم تو سن سمجھا
خوب دھوکا مجھے مستی کی اداہٹ نے دیا دہنِ یار کو میں غنچہِ سوکسن سمجھا
کس نے انگشت رکھی فاتحہ کو خندقِ بند شمعِ معکوس لحد میں جو میں روشن سمجھا
خاکِ برباد رہی دشتِ جنوں میں میری بس بگولے ہی کو میں گنبدِ مدفن سمجھا

کائے کھاتی ہے مجھے فکرِ سخن اے ناسخ
دو زبانی قلمِ اپنی کو (میں) ناگن سمجھا

رنگ میں شوخ ہے ایسا بدنِ سُرخِ ترا جس پہ سرِ سبز نہیں پیرِ بہنِ سُرخِ ترا
ہو ہمیشہ ترے کوچے میں شہیدوں کی بہار رہے سرِ سبزِ الہی چمنِ سُرخِ ترا
ایک بو سے کے تصور میں یہ ہوتا ہے بکود نہیں محتاجِ مسمی کا دہنِ سُرخِ ترا

ناسخ کے سوانح نگاران کی زندگی کے بعض اہم واقعات کے سلسلے میں اُن کے جن اشعار سے استشہاد کرتے رہے ہیں، ان کے معاملے میں بھی یہ قلمی نسخہ خور و فکر کے بعض نئے زاویوں کی طرف رہبری کرتا ہے۔ مثلاً ناسخ کی تاریخِ ولادت کا تعلق ان کے مندرجہ ذیل شعر کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

رہے کیوں کرتے دل بہ دم نشانہ ناوکِ غم کا
کہ ہے میرا تولد ہفتیم ماہِ محبتِ مہم کا
یہ دیوانِ اول (مطبوعہ) کی چھبیسویں غزل کا مطلع ہے۔ پیش نظر قلمی دیوان میں یہ غزل تیرھویں نمبر پر
درج ہے لیکن اس میں یہ مطلع موجود نہیں۔ اس دیوان میں غزل کا آغاز مندرجہ ذیل مطلع سے ہوا ہے جو دیوانِ مطبوعہ
میں نہیں ملتا ہے

مرے رونے کے آگے قلمِ اک قطرہ شبنم کا
شر سے کم ہے پیش سوزِ دل رتبہ جہنم کا
ناسخ ابتدائی سنی العقیدہ تھے۔ بعد میں انھوں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ابتدائی
کلام میں بعض ایسے اشعار موجود تھے جو ان کے بعد میں اختیار کردہ عقیدے کے خلاف تھے۔ جب کچھ لوگوں نے ان اشعار
کی موجودگی پر اعتراض کیا تو ناسخ نے ان کی زبان بندی کے لیے ایک غزل کے مقطع میں یہ اعلان کیا :
کیا ہوا اگر شعرِ ناسخ ہیں عقیدے کے خلاف
آیہ منسوخ کیا موجود قرآن میں نہیں
مطبوعہ دیوانِ اول میں اس زمین میں دو غزلیں موجود ہیں۔ یہ شعر ان میں سے پہلی غزل کا مقطع ہے لیکن
دیوانِ قلمی میں ان میں سے کوئی غزل نہیں ملتی۔

صاحب "خوش معرکہ زیبا" کے بیان کے مطابق سیوارام شائق ساگر دہلوی نے کلامِ ناسخ کو منسوخ
کرنے کی نیت سے ان کی ہر غزل کا جواب لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ خبر ناسخ تک پہنچی تو انھوں نے ایک غزل میں مندرجہ ذیل
دو شعر کہے :
کہ رہا ہے ایک جاہل میرے دیوان کا جواب

بوسلم نے کہا تھا جیسے قرآن کا جواب
کیا کلیم اللہ سے نسبت ہے اس ناپاک کو
چاہیے فرعون کو دے اپنے ہاں کا جواب
متداول کلیات میں نہ یہ اشعار موجود ہیں اور نہ اس زمین میں کوئی غزل ہی ملتی ہے جب کہ قلمی دیوان میں تو
اشعار کی ایک مکمل غزل میں یہ دونوں شعر موجود ہیں۔ اس غزل کے باقی اشعار بھی اسی حریفانہ کیفیت کی عنمازی
کرتے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک بار مشاعرے میں شیخ صاحب ایسے وقت پہنچے جب کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا
مگر خواجہ حیدر علی آتش اور کچھ اور شعرا موجود تھے۔ ان لوگوں نے شیخ صاحب سے ان کا کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا
تو انھوں نے یہ مطلع پڑھا :
جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہ عام نہیں

شمار دانہ تسبیح میں امام نہیں

چونکہ نام بھی امام بخش تھا، اس لیے تمام اہل جلسہ نے نہایت تعریف کی۔ دیوانِ اول (مطبوعہ) میں اس زمین میں ایک غزل موجود ہے جس میں دو مطلع ہیں لیکن ان میں مسندِ رجب بالا مطلع شامل نہیں۔ دیوانِ قلمی میں نہ تو یہ مطلع ملتا ہے اور نہ اس میں کوئی غزل پائی جاتی ہے۔

پروفیسر شبیہ الحسن نو نہروی نے امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ (متوفی ۱۶ رشتوال ۱۲۰۶ھ) کی وفات کے قطعہ تاریخ کو قیاساً ناسخ کی شاعری کا قدیم ترین نمونہ قرار دیا ہے۔ اس قطعے میں ان کا تخلص موجود نہیں۔ اس کے بعد روہیل کھنڈ کے معرکے میں آصف الدولہ کی فتح یابی کے قطعہ تاریخ کو جس سے ۱۲۰۹ھ برآمد ہوتا ہے اور جس میں تخلص موجود ہے، پیش کر کے یہ رائے قائم کی ہے کہ شیخ صاحب نے "ناسخ تخلص ۱۲۰۶ھ اور ۱۲۰۹ھ کے درمیان اختیار کیا ہو گا" پیش نظر قلمی نسخے میں یہ دونوں قطعات تاریخ موجود نہیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے ایک مضمون "ناسخ اور کلیات ناسخ کے چند اہم مخطوطات" میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے اس بیان کو کہ ناسخ ۱۱۸۷ھ میں پیدا ہوئے تھے، تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور مولانا محمد حسین آزاد کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہ انھوں (ناسخ) نے تقریباً سو برس کی عمر پائی ہوگی (کیونکہ وہ اکثر عدیہ سلف کے معرکے اور نواب شجاع الدولہ (متوفی ۱۱۸۸ھ) کی باتیں آنکھوں سے دیکھی بیان کرتے تھے، نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کے درمیان بکسر کی لڑائی (۱۱۷۸ھ) کا قطعہ تاریخ بطور شہادت پیش کیا ہے۔ نسخہ بنارس میں یہ قطعہ تاریخ بھی موجود نہیں۔

قلمی نسخے اور دیوانِ مطبوعہ کے تقابلی مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ دیوانِ اول کی بعض غزلیں یا ان کے منتخب اشعار نئے شعروں کے اضافے کے ساتھ دیوانِ دوم میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ "ریاض الغصا" میں منقول نمونہ کلام کے سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کے تین اشعار دیوانِ دوم میں شامل ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر (اکسیر پانی میں، تصویر پانی میں) یا اس زمین میں کوئی غزل اس قلمی دیوان میں موجود نہیں۔ دیوانِ دوم (مطبوعہ) میں کل چار شعر ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار ۱۲۳۲ھ اور ۱۲۳۶ھ کے درمیان لکھے گئے ہوں۔ بعد کے دونوں شعر (شامل ہے، محفل ہے۔ غافل ہے) جس غزل سے ماخوذ ہیں، وہ اس قلمی دیوان میں اکیس اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں سے سولہ شعر دیوانِ دوم میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ اس غزل کا ایک اور شعر جو مصحفی کے انتخاب میں شامل ہے لیکن دیوانِ دوم (مطبوعہ) میں جگہ نہیں پاسکا، درج ذیل ہے:

پیکتا ہے لہو نکلتے ہیں جب اشعار رنگیں ہم
ہمارے ہاتھ میں خامرے گلوے مرغِ بسمل ہے

دیوانِ اول سے دیوانِ دوم میں اشعار کی منتقلی کے وقت ان میں مختلف النوع تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں متن کی تبدیلی ہے۔ اس نوع کی تبدیلیاں چونکہ عام ہیں اور ان کے متعلق ابتداء ہی میں شک کا اظہار

کیا جا چکا ہے، اس لیے تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف چند مثالیں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) پیش نظر قلمی نسخے میں ردیف سین کی ایک ناقص غزل مندرجہ ذیل تین اشعار پر مشتمل ہے۔

خار پہلو ہرتی ہے یاد گستاں ہر برس لے جنوں آباد کرتا ہوں میں زنداں ہر برس
باد وحشت (پر) اڑاتی ہے مجھے فصل بہار ہاتھ آتا ہے مرے تختِ سلیمان ہر برس
ہیں جو تیسے خجور موج تبسم کے شہید گل انھیں کی خاک سے ہوتے ہیں خندان ہر برس

دیوان دوم (مطبوعہ) میں اس زمین میں سترہ اشعار کی ایک مکمل غزل شامل ہے (طبع اول صفحات ۱۲۴ و ۱۲۵، حاشیہ)۔ اس غزل میں دیوان قلمی کے ان تین شعروں میں سے صرف دو شعر جگہ پا سکے ہیں۔ ان اشعار میں جو ترمیمیں کی گئی ہیں، ان کا اندازہ ان کے اس بدلے ہوئے متن سے کیا جاسکتا ہے۔

فصل گل میں گھر مرا ہوتا ہے براں ہر برس لے جنوں آباد کرتا ہوں میں زنداں ہر برس
فصل گل میں باد پر وحشت اڑاتی ہے ہیں ہاتھ آجاتا ہے اور نگِ سلیمان ہر برس
(۲) قلمی دیوان میں ”ردیف الیاء“ کے تحت ایک زمین میں صرف یہ دو شعر ملتے ہیں۔

بتوں کے عشق میں یلِ مدام روشن ہے چراغِ دیر سے بیت الحرام روشن ہے
وہ بام پر نہیں ہر چند پر تصور سے بساں مطلعِ خورشید بام روشن ہے

دیوان دوم (مطبوعہ) میں اس زمین میں تین اشعار پائے جاتے ہیں (طبع اول، حاشیہ ص ۲۶۹) جن میں مندرجہ بالا دونوں شعروں میں سے کوئی شعر شامل نہیں، لیکن دیوان دوم کے لیے جو نیا مطلع کہا گیا ہے، وہ دیوان قلمی کے دوسرے شعر سے ماخوذ ہے۔ نیا مطلع درج ذیل ہے۔

کمال آپ کے جلو سے بام روشن ہے
برنگِ مطلعِ ماہِ تمام روکشن ہے

(۳) سرسری تقابلی مطالعے کے دوران ارکانِ بحر کے ساتھ ایک دیوان کے اشعار دوسرے دیوان میں منتقل کرنے کی بھی ایک مثال سامنے آئی ہے۔ دیوان قلمی میں ردیف الیاء کی ایک ناقص غزل ان تین اشعار پر مشتمل ہے۔

غم نہیں، دشمن اگر میرا سوارِ فیل ہے کافی اس کے واسطے اک ریزہ سنجیل ہے
ایسے ہیں دُور پوش لوگ آئینہ انصاف سے نازنیں، رشکِ پری ہیں دیو ساگرِ ڈیل ہے
میں کسی کو کیا سمجھتا ہوں، وہ میرا ہے امیر جس کے نوبتِ خانے میں قرناے اسرافیل ہے

ان میں سے دوسرے شعر کے علاوہ باقی دونوں اشعار ایک رکن کی تخفیف اور الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ دیوان دوم (مطبوعہ) کی آٹھ اشعار پر مشتمل ایک غزل میں شامل کر لیے گئے ہیں (طبع اول، حاشیہ صفحات ۲۵۵ و ۲۵۶)۔ یہ دونوں شعر درج ذیل ہیں۔

کیا اگر دشمن سوارِ فیل ہے کافی اس کو ریزہ بھیل ہے
کیا کہوں شان اس کے نوبت خانے کی جس میں اک قرناے اسرا قبل ہے
(۴) دیوان دوم (مطبوعہ) بحر اور ردیف دونوں کی تبدیلی کی بھی ایک مثال موجود ہے۔ دیوانِ قلمی میں ردیف ایسا،
تحت تین اشعار کی ایک تمام غزل کا مطلع ہے ۷

یہ ضعیف ہے، دب جاؤں میں کسار کے نیچے
آجاؤں اگر سایہ دیوار کے نیچے
یہ مطلع الفاظ کے بہت معمولی سے فرق کے ساتھ کلیاتِ مطبوعہ کے دوسرے دیوان کی نو اشعار پر مشتمل ایک غزل میں، جس کی
بحر اور ردیف دونوں مختلف ہیں، شامل کر لیا گیا ہے (طبع اول، حاشیہ ص ۲۹۵)۔ تبدیل شدہ شکل حسب ذیل ہے: ۷
یہ ضعیف ہے کہ دب مروں کسار کے تلے
آجاؤں میں جو سایہ دیوار کے تلے

پیش نظر قلمی دیوان اور دیوانِ مطبوعہ میں اشعار کے متن میں جو لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ تعداد کے اعتبار سے اتنے
زیادہ ہیں کہ اس تعارفی مضمون میں ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں یہ نظر اختصار صرف ردیف الف کی غزلوں سے کچھ مثالیں
پیش کی جاتی ہیں تاکہ نو دریافت متن اور متداول متن (طبع اول) کے فرق کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے۔ ملاحظہ ہوں ۷
صریر خامہ کو وہ شیر کا نعرہ سمجھتے ہیں یقین اعدا کو ہے میرے قلمداں پر نیستان کا (دیوانِ قلمی)
صریر کلک کو اب

کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں نے اٹکایا نہ الجھا خار سے دامن کبھو میرے بیاباں کا (قلمی)
کبھی (مطبوعہ)

صبح دم بھیاں خانہ دل میں ہوا روشن چراغ خانہ دل میں چسپاں شام آیا صبح دم
طوق پالے کا پڑا اس کے گلے میں کس لیے
عالم پری میں عشقِ نوجواں پیدا ہوا (قلمی)
ماہ بھی شاید کہ تیرے عشق میں معجون ہوا (قلمی)
چاند اسی کے (مطبوعہ)

جلبِ یاراں میں کیا کیجے جو ہم کو غم ہوا کیا کہیں مرگِ اجا میں
گر موا دشمن کوئی اُس کا بھی اک ماتم ہوا (قلمی)
بہ (مطبوعہ)

بن گیا ہر روزِ دیوارِ چشم انتظار بس کہ ہے شوق اپنے گھر (کو) آمدِ سیلاب کا (قلمی)
شوق ہے کیا (مطبوعہ)

چاند چھپتا ہے جو دو دن ہونی ہے حیران خلق
مشاق

پھر پڑا پھرتا ہوں میں مدھوش مستوں کی طرح
رتنا بیہوش بدستوں طرح
گیا جو اس کے کوچے میں وہ با چشم پُر آب آیا

مانع رفتار مجھ وحشی کے ہوں کیا خارِ دشت
کو

عشق کے آزار میں مڑتا ہے پر ہے گردِ یار

جلوہ گرا زبس کہ ہے دل میں خیال اک ماہ کا
نور افشاں جب ہے اس

سفلہ ہو جاتا ہے وقت امتحاں بے آبرو

..... ہوتی جو کچھ مہر و محبت تم میں
اے بتو! اگر

کیا سخن سنجی سے حاصل جب سخنداں ہی نہیں

بس کہ بھیاں افتادوں کی ہے دست گیری کا رواج

دست گیری ایسی افتادوں کی ہے منظور طبع

رات بھر ہر ایک اختر سے لڑا کی میری آنکھ

پاؤں پھیلانے (ہیں) جادو کی طرح ہر خاک میں

چاکنے

ایسی دل چسپ س کی صورت ہے، پٹے اس کا جو عکس

شکل اس کی ایسی ہے دل چسپ گر پڑ جائے عکس

یہاں ہوئی قدر اس کی جو نظروں سے پنہاں ہو گیا (قلبی)
ہو گئی (مطبوعہ)

پھر تصور بندھ گیا مجھ کو کسی سے نوکش کا (قلبی)
(مطبوعہ)

حرم سے لاتے ہیں جس طرح زائر آب زمزم کا (قلبی)
جس طرح لاتے ہیں (مطبوعہ)

تیز رو کرتا ہے تو سن کو غلش مہمیز کا (قلبی)
کوٹنا فرس کو کام ہے (مطبوعہ)

ہے خدا حافظ دل بیمار بد پرہیز کا (قلبی)
بلے پرہیز (مطبوعہ)

طور کا شعلہ دھواں ہے میری شمع آہ کا (قلبی)
(مطبوعہ)

ٹوٹ جاتا ہے بہت کھینچنے سے پانی چاہ کا (قلبی)
ہے دلیل اس ادعا پر ٹوٹ جانا (مطبوعہ)

بخدا کوئی بھی کافر نہ مسلمان ہوتا (قلبی)
کوئی کافر بھی نہ واللہ (مطبوعہ)

فکر کے زانو سے اے ناسخ تو اپنا سراٹھا (قلبی)
زالجئے فکر (مطبوعہ)

خاک پر گرتا نہیں سایہ مری دیوار کا (قلبی)
(مطبوعہ)

بس کہ تھا دل میں خیال اس رختہ دیوار کا (قلبی)
تھا تصور دل میں تیسے (مطبوعہ)

یہاں گریباں اے جنوں! صحرا کا دامن ہو گیا (قلبی)
اب (مطبوعہ)

آنسو میں حشر تک ہووے گماں تصویر کا (قلبی)
تا قیامت آنسو میں شبہ ہو (مطبوعہ)

آشیاں باندھے جو آکر چمنِ ناسخ میں
برائے چشمِ بینا ہیں ہزاروں جامِ جمِ پیدا (قلمی)
عیماں ہے ہر جبابِ بحر میں کیفیتِ دنیا
دیرہِ بینا لاکھوں (مطبوعہ)
بارِ احسانِ ملک سے تو ملی آزادی
یہ بھی حاصل ہے اگر کچھ مجھے حاصل نہ ہوا (قلمی)
مزدِ تجھ بن ہوا ہے تلخ عیشِ زندگانی کا
جو بھیاں (مطبوعہ)
مزدِ یہ تلخِ فرقت میں ہے
کس کے کوچے میں جبینِ سا تو ہوا ہے ناسخ

داغ ہے چاند سے روشن تری پیشانی کا (قلمی)
چاند سا داغ ہے (مطبوعہ)
دیوانِ قلمی اور دیوانِ مطبوعہ میں غزلوں کی تعداد اور اشعار کی کمی بیشی کے اعتبار سے جو فرق پایا جاتا ہے، فی الوقت اس کی تفصیل کا موقع نہیں تاہم اس فرق کی اہمیت اور مضمون کی محدود گنجائش، دونوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان دونوں دیوانوں سے سلسلہ وار بارہ بارہ غزلوں کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں جن سے متن کی دونوں رولتوں کے اختلاف و اشتراک کی مجموعی کیفیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے،

(۱) دیوانِ ناسخ (قلمی)

- (۱) مرا سینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ بھراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریبان کا
یہ غزل ایکس اشعار پر مشتمل ہے، ان میں سے سات شعر (اشعار نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۱۳، ۱۴، ۱۵) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۳ میں شامل ہیں۔
- (۲) کوئی مضمون اگر لکھتا میں اس حال پریشاں کا
کبھی بندھتا نہ شیرازہ مرے اچھے دیوان کا
اس غزل میں کل بائیس اشعار ہیں جن میں سے دس شعر (اشعار نمبر ۳، ۴، ۶، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۲۲) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۳ میں شامل ہیں۔
- (۳) عالم کے آگے یارِ مرا منفعیل ہوا
مرکزِ غمِ فراق میں کیا میں نخل ہوا
سات اشعار کی یہ غزل دیوانِ مطبوعہ میں موجود نہیں۔
- (۴) جب زمینِ شعر کا میں باغباں پیدا ہوا
گلشنِ رنگیں بیانی بے خزاں پیدا ہوا
اس غزل کے شعروں کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے ان میں سے صرف سات شعر (اشعار نمبر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵)

و ۱۸) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۴۴ میں شامل کیے گئے ہیں۔

(۵) خنجر ناز سے ناسخ جو تو بسمل ہوگا ہاتھ میں حشر کے دن دامنِ قاتل ہوگا
یہ غزل تیرہ اشعار پر مشتمل ہے جن میں سے صرف چار شعر (اشعار نمبر ۶، ۷، ۸، ۱۳) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۱۶
میں تیسرے، چوتھے، پانچویں اور آٹھویں نمبر پر شامل ہیں۔

(۶) پروں کو قفل سے میں تسخیر نہیں کرتا جزِ نقوشِ درم کچھ بھی تاثیر نہیں کرتا
سات اشعار کی یہ غزل دیوانِ مطبوعہ میں غزل نمبر ۴۲ کی حیثیت سے شامل ہے۔

(۷) سبز خطِ گورے گالوں پر نمایاں ہو گیا یا سمن زارِ صباحتِ سنبھلتاں ہو گیا
اس غزل میں کل سولہ اشعار ہیں جن میں سے نو شعر (اشعار نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۶) دیوانِ مطبوعہ
کی غزل نمبر ۱۱ میں شامل ہیں۔

(۸) دوست ہر اک میسے جی کو دشمن جاں ہو گیا بھیاں دمِ عیسیٰ دمِ شمشیر بُراں ہو گیا
گیارہ اشعار پر مشتمل اس غزل کے پانچ شعر (اشعار نمبر ۳، ۶، ۸، ۹، ۱۱) مذکورہ بالا غزل نمبر ۱۱ میں شامل ہیں۔

(۹) رنگ میں شوخ ہے ایسا بدنِ سُرخ ترا جس پر سبز نہیں پیرِ بنِ سُرخ ترا
سات اشعار کی یہ غزل دیوانِ مطبوعہ میں موجود نہیں۔

(۱۰) کیا اثر میری سیبِ بختی کے آگے نور کا ماہ ہے اک خالی رخسارِ شبِ دیو کا
یہ غزل پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں سے دس شعر (اشعار نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۱۴ میں
دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۱۴ میں (نمبر ۱، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ پر) شامل ہیں۔ غزلِ مطبوعہ میں
کل بائیس اشعار ہیں۔

(۱۱) مر گیا ہوں دیکھ کر جلوہ رخ پر نور کا میری لوحِ قبر کو زیبا ہے پتھر طور کا
اس غزل میں کل انیس شعر ہیں جن میں سے بارہ شعر (اشعار نمبر ۳، ۴، ۵، ۷، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۹) دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۱۹ میں
دیوانِ مطبوعہ کی مذکورہ غزل نمبر ۱۴ میں (نمبر ۲، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲ پر) شامل ہیں۔ اس غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں جو دیوانِ قلمی میں موجود نہ ہو۔

(۱۲) لبِ یزناُس کے ہاتھ میں ساغرِ شراب کا بنتا ہے عکسِ رُخ سے کٹورا کلاب کا
یہ غزل آٹھ اشعار پر مشتمل ہے ان میں سے پہلا شعر دیوانِ مطبوعہ کی غزل نمبر ۲۲ (کل ۲۰ اشعار) میں اور اشعار نمبر ۵،
غزل نمبر ۲۱ (کل ۱۷ اشعار) میں بالترتیب چودھویں اور گیارہویں نمبر پر شامل ہیں۔

(ب) دیوان ناسخ (مطبوعہ) طبع اول ۱۲۵۵ھ

- (۱) ببل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا روح القدس ہے نامِ مکے ہم صغیر کا
سترہ اشعار پر مشتمل یہ غزل دیوانِ قلمی میں موجود نہیں۔
- (۲) دکھا اس کو جہان میں غل ہے جس کی آمد کا الہی ہوں بہت مشتاق دیدارِ محمدؐ کا
سترہ اشعار کی یہ دوسری غزل بھی دیوانِ قلمی میں نہیں ملتی۔
- (۳) مرا سینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجراں کا طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میسے گریباں کا
سترہ اشعار پر مشتمل اس غزل کے سات شعر (اشعار نمبر ۳، ۸، ۹، ۱۲، ۱۳، ۱۵ و ۱۶) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ایک سے اور باقی دس شعر (اشعار نمبر ۲، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ و ۱۶) غزل نمبر ۲ سے لیے گئے ہیں۔
- (۴) جس جگہ ہے حسنِ فوراً قدرداں پیدا ہوا چاہ میں یوسف گرا تو کارواں پیدا ہوا
اس غزل میں کل گیارہ اشعار ہیں۔ ان میں سے سات شعر (اشعار نمبر ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ و ۱۱) دیوانِ قلمی کی چوتھی غزل سے ماخوذ ہیں۔ باقی چار شعر بعد میں کہہ کر شامل کیے گئے ہیں۔
- (۵) گلِ فشاں عکسِ ہوا کس کے رخِ رنگیں کا ہے جو آئینے میں عالمِ سبید گل چہیں کا
بارہ اشعار پر مشتمل یہ غزل دیوانِ قلمی میں موجود نہیں۔
- (۶) مہندی ہے شعلہ قدم اُس رشکِ پری کا پاپوش نے سیکھا ہے چلنِ کبکِ ری کا
گیارہ اشعار کی یہ چھٹی غزل بھی قلمی دیوان میں نہیں ملتی۔
- (۷) زلف سے کجیرو شائے کو نہ زہار جدا کاٹ کھاتا ہے جو ہوتا ہے سر مار جدا
یہ غزل سبیل اشعار پر مشتمل ہے اور دیوانِ قلمی میں موجود نہیں۔
- (۸) خلق کی تسخیر کو ہر نقشِ پا افسوں ہوا سایہ دیکھا اُس پری کا جس نے وہ مجنون ہوا
اس غزل میں کل انیس اشعار ہیں جن میں سے چھ شعر (اشعار نمبر ۳، ۷، ۸، ۱۰، ۱۳ و ۱۶) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ۳ سے (بالترتیب اشعار نمبر ۲، ۴، ۵، ۸، ۱۰ و ۱۱) ماخوذ ہیں باقی تیرے شعر بعد میں کہے گئے ہیں۔ دیوانِ قلمی کی غزل چودہ اشعار پر مشتمل ہے۔
- (۹) اپنے آبرو آئینے میں دیکھ کر بسمل ہوا کھینچ کر تلوار اپنا آپ وہ قاتل ہوا
یہ غزل اکیس اشعار پر مشتمل ہے، ان میں سے صرف چار شعر (اشعار نمبر ۷، ۱۳، ۱۶ و ۱۹) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ۳ سے (بالترتیب اشعار نمبر ۴، ۶، ۸ و ۹) لیے گئے ہیں، باقی سترہ اشعار بعد کا اضافہ ہیں۔ دیوانِ قلمی کی غزل میں کل دس اشعار ہیں۔

(۱۰) رھے جانان کا تصور میں جو نظر آ رہا ہوا دل میں تھا جو داغِ حشر، عرش کا تار ہوا

اکلیں اشعار کی یہ غزل دیوانِ قلمی میں نہیں ملتی۔

(۱۱) سبز خط گورے گالوں پر نمایاں ہو گیا یا سمن زارِ صباحت سنبھلتا ہو گیا
اکلیں اشعار کی اس غزل کے نو شعر (اشعار نمبر ۱، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۲) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ۷ سے اور پانچ شعر (اشعار نمبر ۱۱، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱) غزل نمبر ۸ سے ماخوذ ہیں۔ باقی سات شعر بعد میں کہہ کر شامل کیے گئے ہیں۔

(۱۲) کیا کہیں مرگ اجا میں جو ہم کو غم ہوا مگر موادِ دشمن کوئی اُس کا بھی اکا تم ہوا
یہ غزل ’سولہ اشعار پر مشتمل ہے ان میں سے صرف دو شعر (اشعار نمبر ۱۱) دیوانِ قلمی کی غزل نمبر ۲۸ سے لیے گئے ہیں۔
مؤخر الذکر غزل میں کل تین اشعار ہیں۔ تیسرا شعر جو دیوانِ مطبوعہ میں جگہ نہیں پاسکا، درج ذیل ہے :
یا دگیسو ہو گئی ہے سانپ کے کاٹے کی لہر
دیکھنا سنبھل کی لٹ کا میرے حق میں سم ہوا

دونوں دیوانوں کی ابتدائی بارہ بارہ غزلوں کے اس تقابلی جائزے کے نتیجے میں جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دیوانِ قلمی کی بارہ غزلوں میں سے دو مکمل غزلیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد چودہ ہے، دیوانِ مطبوعہ میں نہیں ملتیں اور باقی دس غزلوں کے کل ایک سو پچاس شعروں میں سے چھتر شعر بھی اس دیوان میں موجود نہیں۔ جب کہ دیوانِ مطبوعہ کی بارہ غزلوں میں سے اٹھانوے اشعار پر مشتمل مکمل غزلیں اور باقی چھ غزلوں کے ایک سو پانچ شعروں میں سے پچپن اشعار دیوانِ قلمی میں نہیں پائے جاتے۔ اگر مؤخر الذکر دیوان میں زاید اشعار اور غزلوں کی دستیابی تحقیق و تدوین کے نقطہ نظر سے اس انتہائی اہم حقیقت کی مظہر ہے کہ ترتیبِ جدید کے وقت اس کے نقشِ اول میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں کی گئی ہیں تو دیوانِ قلمی میں فاضل غزلوں اور شعروں کی موجودگی لسانی و فنی پہلوؤں سے کلامِ ناسخ کے مطالعے کے نئے امکانات کی طرف رہبری کرتی ہے۔ قلمی دیوان میں غیر مطبوعہ اشعار جس کثرت سے پائے جاتے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف ردیفِ الف میں ایسے اشعار کی تعداد تین سو پچھتر ہے جو نہ مطبوعہ کلیات میں موجود ہیں اور نہ عام قلمی نسخوں میں ملتے ہیں۔ رباعیات کے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ ان کی مجموعی تعداد سات ہے اور یہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ قطعاتِ تاریخ کی کیفیت بھی غزلوں سے کچھ مختلف نہیں۔ بہ طور مثال مرزا قنیل کی وفات ناسخ نے ہماری معلومات کے مطابق کل دس قطعے کھے ہیں۔ ان میں سے نو اس قلمی دیوان میں موجود ہیں۔ دسواں قطعہ صرف لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری کے نسخہ جان پامر میں پایا جاتا ہے اور بہ گمانِ غالب دیوان کی ابتدائی ترتیب کے لب کہا گیا ہے، درج ذیل ہے :
آرام و قرار و صبر و تامل ہیہات قنیل بُرداے وائے

تاریخ وفاتِ او نوشتہم ہیہاتِ قتیلِ مُردِ اسے واسے^{۲۱}
 نسخہ بنارس کے نو قطعات میں سے ایک قطعہ کلیاتِ ناسخ کے تمام مطبوعہ ایڈیشنوں میں شامل ہے اور چار
 اور قطعے مختلف مضامین اور کتابوں کی وساطت سے سامنے آچکے ہیں۔ باقی چار قطعات ہنوز غیر مطبوعہ ہیں اور جہاں تک
 ہمیں معلوم ہے، دیوانِ ناسخ کے کسی اور نسخے میں موجود نہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں ناسخ کا جو مقام ہے، بالخصوص
 اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ان کے مختارات و مترکات کو جو اہمیت دی جاتی رہی ہے، اس کے پیشِ نظر اس تمام
 نو دریافتِ کلام کی اشاعت بے حد ضروری ہے۔ فی الوقت ردیفِ الف کے کچھ منتخب اشعار، پانچ رباعیاں اور چند
 قطعاتِ تاریخ بطورِ ارمغان ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

انتخابِ غزلیات

تباہی کا ہے اندیشہ جہازِ اہلِ دُنیا کو
 قدم رکھا ہے میں نے جبِ اقلیمِ قناعت میں
 شبِ فرقت جلاتے ہیں یہ اسبابِ طرب مجھ کو
 بنائے عالمِ ایجاد ہے برباد نظروں میں
 نہ کیوں چھا جائے تیرے سامنے زردیِ مرمر پر
 نہیں ہے کشتیِ درویش کو کچھ خوفِ طوفان کا
 مری پالوش کو رتبہ ملا ہے تاجِ سلطان کا
 کہ کارِ برق کر جاتا ہے پر تو ماہِ تاباں کا
 فلک کھتے ہیں جس کو اک یگولہ ہے بیاباں کا
 طلائعِ خاک کو کرتا ہے پر تو مہرِ تاباں کا

دریا کا نام چشمِ ہوا میرے چہرے پر
 دیکھا جو غور سے تو مستی ہے ایک ہی
 کیا چین سے ہم اس کے تصور میں محو تھے
 ہو روشتیِ چرخوں کی روغن سے جس طرح
 ثابتِ تھم ہم اپنی وفا پر جو ہیں سو ہیں
 دوزخ کا نام سینہ سوزاں میں ڈل ہوا
 نافے میں مُشکِ نامِ ہوا، رُخ پر تل ہوا
 کنجِ لمحہ میں شورِ قیامتِ مغل ہوا
 مرہم سے اور داغِ جنوں مُشتعل ہوا
 ناسخ ہزار بار وہ پیاں گل ہوا

تا بہ ہستی بس تڑپتا ہی عدم سے آگیا
 آزماتا ہے مجھی پر جب نہ تب تیغِ جفت
 گبر و مومن کی پرستش کو بنا دیر و حرم
 یہاں ازل سے جو ششِ سودا بہ رنگِ لالہ ہے
 زخمِ تیغِ عشق سے میں نیم جاں پیدا ہوا
 کیا جہاں میں میں ہی بہرا متحاں پیدا ہوا
 میسے سجدے کو وہ سنگِ آستانِ پیدا ہوا
 داغ سے سینہ ہمارا تو اماں پیدا ہوا

ہوں زمانے میں زمانے سے جدا مثل گھر
کبر اتنا نہ کر اے لیلِ بجاہرہ نشیں
یہ دہن، یہ مژہ، یہ آنکھ، یہ ابرو ہے کہاں
لے فلکِ غم سے مراد دل ہے بالِباں نہ رُلا
بھج داعظ مجھے کہے کو نہ بت خانے سے
قطرہ میرا کبھی دریا سے نہ واصل ہو گا
ایک دن تختہ تابوت ہی محل ہو گا
ماہ کس منہ سے تھے رُخ کے مقابل ہو گا
دیکھ سارا کرۂ ارض ابھی گِل ہو گا
کوچِ دنیا سے مرا اولِ منزل ہو گا

یہاں نہ تھی تابِ نظارہ، وہ تو کیا بے حجاب
صبح کے گراہ کرنے کو شبِ فرقت میں آہ
کچھ قصور اس کا نہیں، میں آپ حیراں ہو گیا
ہرستارہ دیدہ غولِ سیباں ہو گیا

سبز ہوتا نہیں جب سرخ ہو اسبیلے
ہو گیا قہر مری جان کو نظارہ گل
بوسے گل پر ہن گل میں یہ پنہاں ہے وبا
گور میں بھی تجھے خونِ زخموں سے جاری ناسخ
خط سے ہے سبز یہ سیبِ ذوقِ سرخ ترا
آگیا یاد چمن میں بدنِ سرخ ترا
تنِ نازک ہے تیرا پیر ہن سرخ ترا
حشر کو دے گا شہادت کفنِ سرخ ترا

کر دیا ہے حشر کا سماں خرامِ یار نے
بن گیا خمیازہ ناسخِ خندہ جامِ شراب
میرے نالوں کو ہے لازم پھونکنا اب صور کا
جب خیال آیا کسی کی زنگسِ مخمور کا

نامرِ بسانِ ماہی بے آب ہو چلاں
وہ رند ہوں میں روزِ ازل سے کہ محسب!
مضمون لکھوں میں اپنے اگر اضطراب کا
دل کے عوض بغل میں ہے شیشہ شراب کا

غمِ یارانِ رفتہ یہ ہمارا دل جلاتا ہے
جو کیا اس کے دم میں جانِ ماورا دیں اُس کو
خوشی کا ایک دن دیکھنا میں نے آکے دنیا میں
طلحِ خاطرِ سامع کا ہے طولِ سخن موجب
کہ اپنا جسم ہے فانوس گویا شمعِ ماتم کا
دمِ عینسی سے کیا برعکس اثر ہے یار کے دم کا
رہا ہر ماہ پر مجھ کو یقیں ماہِ محسوس کا
بس اب خاموش ہونا نسخ، کہاں تک شکوہِ عالم کا

ہے یقیں سرکٹ کے میرا تیرے قدموں پر گئے
شوق ہے قاتلِ بہت مجھ کو تھے پاؤں کا

پھر ہوئی بے شرابِ عشقِ ناسخِ موجِ زن کوہِ غم سے پھر بھڑا شیشہ مری ناموس کا

لا سکا تاب نہ جب عکس کے نظائے کی دیکھنا آئینے کا وقتِ سحر چھوڑ دیا

دشمنوں سے دل مرا ایمن ہے قیدِ زلف میں طاہر آزاد کو رہتا ہے ڈرِ شہباز کا
خط سے قشقے کے جو دو حصے ہوا ماہِ جبین لے بُتِ مغرور! تو دعویٰ نہ کر اعجاز کا

ہے خوں سے پُر جامِ چشمِ تر کا، و فورِ نالوں میں ہے شرر کا انیس ہے خارِ غم جگر کا ہے داغِ ہمدِ دلِ حزیں کا
ہوا ہے جینا جہاں میں مشکلِ زمانہ ہے میسے جی کو قاتل نہ تڑپوں کیوں کر لبانِ لبیل، بنا ہوں چورنگِ تیغِ کین کا

میناے سبز گردے کیوں نہ مثلِ خضر یحیاں بہرِ غمِ شراب ہے چشمہ حیات کا
ہر آستانِ یار کے سجدے سے ہے عرض پابند کعبے کا ہوں نہ میں سومات کا

حقارت سے نہ دیکھ مجھ کو، ہوں میں تیرہ روز ایسا کھیلہ ہے مرا نالہِ چراغِ آسمانی کا
کرے کوئی نہ میرا ذکر ہرگز اپنی محفل میں کہ خوابِ مرگ لانا ہے اثرِ میری کہانی کا
سُنے ہیں جب سے عالم نے ہمارے ناظمِ موزوں نہیں ہے اب کوئی مشتاقِ دیوانِ فغانی کا

بے دماغی سے کہاں تالیفِ دیواں کا خیال اپنی خاطر ہی کا مجموعہ پریشاں رہ گیا

تیشہ اول میں کام اپنا کیا اے کوہِ کن! مجھ میں تجھ میں فرق ہے شاگرد اور استاد کا
بس کہ تھا ہر ایک مجھ گشتے کا باطن میں رقیب خلق کے نوحے میں ہے عالمِ مبارکباد کا
سینہ کوئی میں نے ایسی کی، مسٹایا داغ کو بے نشانِ صیقل سے جو ہسر کر دیا فولاد کا
بانگِ ناقوسِ برہن ہے بتوں کو ربط ہے کیوں ہوا میرا صنم مانعِ مریِ منہ یاد کا

جس طرف جاتا ہے تو، وہ بھی قدم کے ساتھ ہے فتنہٴ محشرِ قدِ بالا کا مفتوں ہو گیا
مے کشو! جب سے پایا ہے بادۂ ختمِ غدیر میں خیمِ گردوں میں رشکِ صد فلاطوں ہو گیا

ہوں وہ بسل تا قیامت بس تڑپتا ہی رہا دامنِ محشر تمام آلودہ خوں ہو گیا

رہم میرے حال پر آیا نہ ایک اُس کو کبھی روشنی سے منحرف، مائل بہ سوسے تیرگی میں نے اسے ناسخ کیا ظاہر میں گر تقویٰ تو کیا

جو گیا دھان نہ جہاں میں وہ نظر پھر آیا کوئے جاناں کو ہم اشکوں میں گئے بہتے ہو

کوئے قاتل ہے مگر ملکِ عدم کا ناکا جس طرح کرتے ہیں زوار سفر دریا کا

پیشتر شام شبِ فرقت سے پھاڑے پیریں ہو گئیں اس میں تمنائیں مری یکسر شہید بیج دے دھوبی کے بنے تو جو خوشبو ساز پاس جو بختِ صحبتِ مسک سے کچھ حاصل نہیں ہر شہرِ مجھ دل جلے کی خاک کا خنجر بنا کیا عجب دیواں مرا جل جلے یا غرقاب ہو کام میرا ناامیدی نے کیا ناسخ تمام

نخواست سے نہ دنیا میں کوئی خالی نظر آیا شگفتہ غنچہ تصویر ہوں، ممکن نہیں صاحب ! تجتس کرتے ہیں دل کا جو اگر میسے سینے میں پے گلگشت جا کر داغِ عشق ایسے دیے تو نے نہیں اول سے تا آخر نشانِ مضمونِ شادی نا لحد سے جاتی ہے آواز دو دو کو کس نالوں کی نہ چھوٹا سوزِ غم مجھ نا توں سے بعدِ مردن بھی لغات ایسے ہیں جن سے صاحبِ فرہنگ حیران ہیں

ستارے سب کے سب افلاک پر منحوس ہیں گویا تمہارے عاشقوں کے یہ دل مایوس ہیں گویا ستم گر! یہ ترے ناوک نہیں، جاسوس ہیں گویا چمن میں عنایہوں کے جگر طاؤس ہیں گویا ورق سب میرے دیواں کے کفِ افسوس ہیں گویا بتوں کے غم میں اپنے استخوانِ ناقوس ہیں گویا کفن میں استخوانِ شمع تہ فافاوس ہیں گویا ترے دیوانِ ناسخ نسخہ قاموس ہیں گویا

نامہ اعمال سر مشقِ خطِ باطل ہوا
خون سے میسے نہ رنگیں دامنِ قاتل ہوا
نزع میں تن سے نکلنا جان کا مشکل ہوا

رحمتِ حق نے نہ دیکھا کوئی بھی میرا عمل
تھی مجھے ہر حال میں جو کوششِ اخفائے راز
یار کے آنے کا تھا ناسخ جو مجھ کو انتظار

اس قدر حال نہ سنبھل کا پریشاں ہوتا
شہر میں کیوں سببِ داغِ عنبرِ زراں ہوتا
گورِ ناسخ میں نہ کس طرح چراغاں ہوتا

زلف سے اُس کی جو تشبیہ نہ دیتے شاعر
دوش پر ریگِ بیاباں کے جنازہ ہے مرا
لے گیا داغِ غمِ آلِ نبی دنیبا سے

موجِ بوسے گل سے پابندِ سلاسل ہو گیا
سروِ اس کے قدموں کا مائل ہو گیا
جو پتنگ اس نے اڑایا، بس وہ گھائل ہو گیا

مت کرو زنجیر، میں دیوانہ نازک مزاج
سایہ بن کر ساتھ قدموں کے لگا پھرتا ہے وہ
دم بدم پھرتی ہے لے ناسخ جو شمشیر نگاہ

شورِ محشر کو بھی آوازِ حُدی خواں سمجھا
یارِ نامے کا نہ مضمون کسی عنوان سمجھا
عرش سے، طفلی میں، آویزاں مرا گوارہ تھا
دل مرا اُس دن بھی تیرے عشق میں صد پارہ تھا
نہر تھی میرے لہو کی، زخم کا قوارہ تھکتا

شوق اسے کہتے ہیں، مجنوں جو لہر سے نکلا
کاتبِ خط کے قلم بھیجے ہاتھ اسے ناسخ
آسمان پر کچھ جوانی میں نہیں پہنچا داغ
پہلا سی پارہ کیا مکتب میں جب تو نے شروع
گوچرِ قاتل کو سب کہتے تھے گلشنِ جن دنوں

دو دن میں جس مکاں میں رہا، وہ مکاں گرا
کہ ہر اک مور کو دعویٰ ہے سلیمانی کا

دریا میں دو کہ جاری ہیں آنکھوں سے رات دن
بادِ نوحہ یہ ہوتی موجِ زنِ ابعالم میں

دکھاتا ہے مجھے عکسِ دروں آئینہ زانو کا
بنا ہر حلقہ زنجیر، حلقہ ناف آہو کا

نظر آتے ہیں وقتِ فکر بالکل دور کے مضمون
نسیمِ زلفِ مجھ وحشی تک پہنچی جو زنداں میں

قیس جب دشتِ جنوں میں مے شامل دوڑا
ساتھ قاصد کے گیا کتنی ہی منزل دوڑا

اس کو صرغے کہا: مجھ سے بھی کیا جلدی ہے؟
قیس پیغام ہی کہتا ہوا، اللہ رے شوق!

جستجو کہ ہمیں تھی، وہی تھی اُس کی تلاش
مادرہ ہے ترے کوپے کے سوا ہر حساب دہ
رات بھر ساتھ ہمارے مہِ کامل دوڑا
اپنے جاسوس نہ پیچھے مرے قاتل دوڑا

خیال مکہ آیا جو دشت گردی میں
ہر ایک نقش قدم سحرِ شراب ہوا

چراغِ زلیست مرا جب تلک کہ روشن تھا
نہ کیوں لطیف کو ہووے کشمیت سے نفرت
جو موجِ ریگ تھی سنبل تو گرد باد تھے سرو
وہ آشنا ہوتا جو کہ غییر ہو سب سے
میں نالہ زن تھا فقط اور تھے سبھی خنداں
فقیدہ نالہ دل تھا تو اشکِ روغن تھا
کہ رُوح کو تنِ خاک کی غبارِ دامن تھا
نشاں تھے پاؤں کے گلِ مجھ کو دشتِ گلشن تھا
میں شیخِ دیر میں تھا، کعبے میں برہمن تھا
میں عندلیب تھا شاید، زمانہ گلشن تھا

خواب میں تُو نے جو منہ اپنا دکھانا چھوڑا
تجربہ سے، انصاف تو کر، پھٹ نہ سکا ایک رقیب
کیا خبر تھی کہ تری غیر کے دل میں ہے جگہ
اس قدر غوف ہیں خلق کے بہتان کا ہے
حرفِ مطلب جو نکلتے تھے کچھ اُس میں ناسخ
خواب ہی نے مری آنکھوں میں اب آنا چھوڑا
ہم نے کیوں کر تری الفت میں زما نا چھوڑا
رات ہم نے نہ کوئی تیرا ٹھکانا چھوڑا
کہ تصویر میں بھی پاس اس کو بٹھانا چھوڑا
اُس نے اشعار کا بھی ہم سے پڑھانا چھوڑا

شمع ساں مرنے نہیں دیتا مجھے اعجازِ عشق
وائے بر حالِ دلِ حسرتِ نصیبِ عشقِ قبار
تُو نے جو پہنا قلاو، ہم نے بھی تعسید کی
تن سے اُس قاتل نے میرا سرِ مجدا اکثر کیا
سیمِ تن تجھ کو کیا حق نے، مجھے بے زر کیا
جوشِ وحشت میں غل و زنجیر کو زیور کیا

انتظارِ یار ابھی باقی ہے گو میں مر گیا
میرے مرنے کا تو قاتل کو نہ آیا کچھ خیال
رُخ دکھا کر داغِ مثلِ لالہ گل کو دے گیا
یہ کڑی ہیں منزلیں، راہِ دیا رِ عشق میں
عاشقوں کی، محفلِ جاناں، شہادتِ گاہ ہے
رُوح گھر میں رہ گئی لاشہ اگر باہر گیا
اُلٹے کتا ہے، عبثِ خنجرِ لہو میں بھر گیا
سرو کو قامت دکھا کہ بیدِ مجنوں کہ گیا
خضر بھی گزرا تو ہر ہر گام پر مر مر گیا
پاؤں رکھا جس نے، مثلِ شمع اس کا سر گیا

تری گلی سے کبھی اپنا نامہ نہ پھرا
عجبا خاطر یاراں نہ کر صبا مجھ کو
مگر جیسے جا کے عدم کو کوئی بشر نہ پھرا
میرے غبار کو ناسخ تو در بدر نہ کھپرا
بس اضطراب میں مانسہ ابر تر نہ پھرا
مگر یہ چرخ کبھی میرے کام پر نہ پھرا
اگرچہ گردش اسے صبح و شام ہے ناسخ!

ہرزہ گردی ترک کر گر چاہتا ہے آبرو
صاف دل پر تو بزرگوں کا اٹھا لیتے ہیں جلد
بن گیا گوہر سکونت ہی سے قطرہ آب کا
آسمانی ہو گیا ہے رنگ جیسے آب کا

تھی شہادت سے غرض سوا اس ادا میں ہو گئی
روکتا ہے نزع میں دم کو کسی کا انتظار
گونہ قاتل سے نزاکت کے سبب خنجر اٹھا
سخت جانی کا نہ بہتان اسے اجل ہم پر اٹھا

رات سب بے کل رہے سن کر ہمارا حال دل
آب آتش رنگ کی گرمی سے ہونٹوں پر ترے
دشمن خواب عزیزاں اپنا افسانہ ہوا
جو پڑا بت حال سو انگور کا دانہ ہوا
آج اپنی عمر کا لبریز پیسمانہ ہوا
وائے قسمت ہاتھ ہی اپنا نہ کیوں شانہ ہوا
اُس کی زلفِ عنبر افشان تک تو ہوتا دسترس
ان دنوں مٹتے ہیں ناسخ کو ہوا سودائے عشق

سایہ گلبن پر اگر پڑ جائے مجھ دل گیر کا
درد سے بے درد کیا واقف کہ ہر صیاد کو
ہو دے ہر غنچے میں عالم غنچہ تصویر کا
رقص شادی ہے تڑپنا، لولہ شہ نچیر کا

عالم سودا میں ہے ناسخ یہ میرا مرتبہ
کان میں مجنوں کے حلقہ ہے مری زنجیر کا

مست کھتا ہے جہاں کو جام چشم یار کا
کیا رکھیں صیاد و گل چیں میرے گلشن میں قدم
مسجدوں پر بھی گماں ہے خاٹہ خمار کا
تیر ناوک ہے ہر اک نالہ مری منقار کا
پچھوں گر حالِ دل شیدا تو کھتا ہے مجھے
خیر سے کیوں کر کروں شکوہ جفا سے یار کا

پایا جو حسدِ گبر و مسلمان میں تو ہم نے
 رہ رہ کے مجھے یاد دلاتیں تری کہ نکلیں
 پھیلانے میں پھر پاؤں مرے دستِ جنوں نے
 مذہبِ ہی جدا گبر و مسلمان سے نکالا
 یوں مجھ کو غزالوں نے بیاباں سے نکالا
 پھر چاک نے سر چاکِ گریباں سے نکالا

رنگِ نافرماں کرے پیدا جبینِ لالہ گوں
 روندے وہ نازک بدن گر برگِ سوسن زیرِ پا

گفتگو میری سمجھتا نہیں تم سے کوئی
 دہن اک وہم ہے، باطل ہے گمانِ خنکی
 بر ملا رازِ نہاں ہونے پر اب ہے ناسخ
 دوستو! ہے یہی باعثِ مری خاموشی کا
 شکوہ بے جا ہے دلا! یا ر کی خاموشی کا
 جام سے قصدِ صراحی کو ہے سرگوشی کا

ترکِ مطلب کا کرے وصف جو انسانِ سدا
 سرمہ گردِ قنات جو لگے آنکھوں سے
 ظلمتِ گور میں ہو چشمہٴ حیاں پیدا
 روزِ نور سے ہو ملکِ سیماں پیدا

سنبُلِ جنت ہوئی لیلیٰ کی زلفِ عنبریں
 قیس کی دیوانگی کا سلسلہ جاتا رہا

تلف کر دم نہ اے بے قدر! جو دم ہے غنیمت
 دمِ آخر جو ڈھونڈے گا، نہ ہوگا ایک دم پیدا

شاخِ طوبیٰ کا نشین جو اسے یاد آیا
 ترکِ ظاہر سے در دولتِ باطن پایا
 تھا تو صیادِ فلک منکرِ گرفتاری میں
 مرغِ رُوحِ قفسی ماہِلِ پرواز ہوا
 آنکھ جب بند ہوئی، دیدہٴ دل باز ہوا
 ایک ناسخ نہ اسیرِ قفسِ آرز ہوا

میں دمِ وحشت جو اپنے ساتھ دوڑاتا اے
 پاس ہوتا میرے گر تجھ سا صنمِ معجزِ بیاں
 چرخِ سا آوارہ دم لینے کی فرصت مانگتا
 دیر میں پیرِ مغاں سے جا کے بیعت مانگتا

کیا نزاکت ہے کہ دم میں عارضِ گلِ رنگِ یار
 ہے یہ کس کا فر صنم کے عشق کا سودا مجھے
 نطمہٴ بادِ صبا سے مثلِ سوسن ہو گیا
 جیب کا ہر تار ز تار برہمن ہو گیا

جو ترقی کا ہے طالب، چاہیے ہو خاکسار
جی گیا، ایماں گیا، دولت گئی، عزت گئی
خاک میں ملتے ہی ہر (اک) دانہ خرمن ہو گیا
دوست دل سا کیا بغل کا ہائے دشمن ہو گیا

گلہ نہ یار کا باقی رہا نہ شکوہ غیر
موض شراب کے انگور سے چوسے گا لہو
اجل نے خوب مےے مجھلے کو پاک کیا
جو بعد مرگ مجھے دفن زیرِ تناک کیا

ہوا پر تو فگن وہ ماہِ رو، پانی پہ بت ہم نے
ہر اک ببل بہ رنگِ بلبَل تصویرِ حیراں تھی
جباہوں کو ستارہ، گومتی کو کمکشاں باندھا
چمن میں نالہ موزوں کا ہم نے وہ سماں باندھا
نہیں سینے میں دل، ببل نے آکر آسماں باندھا
دورِ داغِ ہجراں سے ہوا گلزار کا عالم

رات بھر مجھ کو خیالِ ساقی دے خانہ تھا
کس نکادِ مست نے تقویٰ کیا میرا خراب؟
جو ستارہ تھا، مری نظروں میں اک پیما نہ تھا
قطرہ مے بن گیا، تسبیح میں جو دانہ تھا
فی الحقیقت پیش ازین کعبہ بھی اک بُت خانہ تھا
یہ حیرم دل ہی کیا، ہر جاتوں کا ہے مکاں

رباعیات

کرتی ہے فزونِ قدرِ بشر خاموشی
ہو مردمِ چشم ساں سراپا بنیا
ہر عیب کو کرتی ہے ہنر خاموشی
انسان سے ہو سکے اگر خاموشی
ہے اب کی محفلِ صوم، ہجرِ جاناں
کیا دیکھوں ہلالِ رمضان تیغ کے ساتھ
ہر عیب کو کرتی ہے ہنر خاموشی
انسان سے ہو سکے اگر خاموشی
ہر دم مجھے کھاتا ہے غمِ زہر چکاں
ہے تیغِ مرے جی کو ہلالِ رمضان

اب کے رمضان میں جو بہ ہوش آتا ہوں
بے یار جو افطار کا وقت آتا ہے
جاے سہمی خونِ جگر کھاتا ہوں
بھراتے ہیں اشکِ آنکھوں میں پی جاتا ہوں

جب سے رمضان کا نظر آیا ہے ہلال
افطار کا ہو کس، بے خودی میں ہے کسے
ہے آٹھ پہرا بروے جاناں کا خیال
رکھتا ہوں فراقِ یار میں صوم وصال
شبیر کے، دوپہر میں، اصحابِ قلیل
لی راہِ عدم کی سب نے ہو کر سیراب
پہنچے سرِ سبیل ہو ہو کے قتیل
رکھی تھی قضا نے آبِ آہن کی سبیل

قطعات تاریخ

(تاریخ وفات شاه عالم بادشاہ)

جہاں تیرہ گردید مانند گور چو شد دفن سلطان عالی جناب
رقم گشت تاریخ ایں واقعہ نہاں شد "بزرگ زمین آفتاب" ۱۲

تاریخ تعمیر مکان میر روشن علی

میر روشن علی روشن دل کرد تعمیر خانہ روشن
سالی تاریخ ایں بنا ناسخ کرد تحریر "خانہ روشن" ۱۲

تاریخ وفات فرزند مہر

ما تم پور اشک ماہ نہاد بر دل مہر داغ ہم چو فتر
سالی ایں ما تم قیامت ز کلب ناسخ نوشت "داغ جبکہ" ۱۲

تاریخ وفات دختر مہر

اول ز جہاں گذشت چون مہر پر شد بعد ازین ہلاک چون مرختہ
تاریخ غم نخست شد "داغ جبکہ" تاریخ غم دگر شد "داغ دگر" ۱۲

تاریخ وفات محمد علی

چون محمد علی بہ عین شباب ناگہاں گشت مائل فردوس
ریخت تاریخ فوٹش از قلم "آہ گردید داخل فردوس" ۱۲

"تاریخ بنائے معتمد الدولہ بہادر"

گوید آن کس کہ ببیند ایں قصر ایں چنین قصر مبارک باشد
گفت تاریخ بنائش ناسخ "یارب ایں قصر مبارک باشد" ۱۲

تاریخ عطاء خلعت وزارت بہ معتمد الدولہ بہادر

یافتی خلعت مبارک را روز افزوں شود جاہ و جلال
سالی تاریخ خانہ ناسخ کرد تحریر "خلعت اقبال" ۱۲

تاریخ وفات سید صاحب

جناب سید والا مناقب چو عزیمت کشن فردوس بنمود
پے تاریخ ایں اندوہ یافت نصیبش جام کوثر یاد "فرمود" ۱۲

تاریخ وفات خواجہ حسین

گفت بے اختیار : صد افسوس ہر کہ بشنید موتِ خواجہ حسین
بہر تاریخِ موتِ او ناسخ ہاتھ لگے گفت "فوتِ خواجہ حسین"

تاریخ وفات میر فتح علی شیدا

جہان سے منوے دار السلام جب چلے شیدا تو کلی سنتے ہی بے اختیار دل سے مرے آہ
خیال آیا کہ اس سانچے کی چپا ہے تاریخ کہا خود نے "موتے ہائے میر فتح علی شاہ"
"تاریخ وفات نواب معلی القاب نواب مبین الدولہ (سعادت علی خاں) بہادر

نواب پادشاہ غش چوں وفات یافت دل داغ گشت و چشم پر آب و جبکہ کباب
رفتم بہ فکد چوں پئے تاریخِ ایں الم ہاتھ لگے گفت : "آہ شد لکھنؤ خراب"

تاریخ وفات میر حیدر علی

میر حیدر علی چو یافت وفات ز مصیبت دلم شدہ نالاں
گشت تاریخِ ایں غم جاں کاہ "بوداے وائے پنجم رمضان"

تاریخ وفات میر باقر

میر باقر کہ بود مومن پاک رُوح او را ملک بہ رضواں بُرد
بود چوں واعظِ زمانہ خویش گشت تاریخ : "آہ و اعظم مرد"

(تاریخ وفات نواب آصف الدولہ بہادر)

کرد ہند از وفاتِ خویش خراب وائے افسوس آصف الدولہ
گشت سالِ وفاتِ آں جم جاہ "ہائے افسوس آصف الدولہ"
"تاریخ تولدِ فرزند جناب والا مناقبِ میر علی صاحب"

پسرے داد حق بہ سید ما خرمی را سزد کہ عام بود
نامِ آبا بہ او شود روشن فزا جادِ نیک نام بود
یک صد و بست سال عیش کند صاحبِ جاہ و احتشام بود
حق نگہبانِش از ہمہ آفات بہ حق سیدِ انام بود
گفت تاریخ مولدش ناسخ "چو پدرِ ذاکرِ امام بود"
"تاریخ وفاتِ دخترِ مرصعہ خود گفتہ شد"

چوں بہ فردوسِ کنیز زینب رفت در خدمتِ اولادِ علی

گفت تاریخ و فاش بافت
"بود اثنا عشری بیگم جی" ۲۵
تاریخ وفات فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر، جعفر تخلص

خون می شود ز دیده رواں و امصیبتا
سرمی زند ز سینہ فقاں و امصیبتا
مهر سپهر عزت و قدر و جلال شد
امروز زیر خاک نہاں و امصیبتا
جعفر لقب امیر فلک قدر، فخر دیں
بر لبست رخت سحر جہاں و امصیبتا
گنڈاشت چرخ بیخ و لے را کہ خون نہ کرد
زین ماقم نشورنشاں و امصیبتا
اقلیدس زمان وارسطوے وقت رفت
زین کند عالم گزراں و امصیبتا
ایں غم بود غمے کہ جہاں را شکست ازان
صد نیش درد در رگ جہاں و امصیبتا
در عین فصل گل بہ گلستانِ عشرتم
ناگہ وزید بادِ خنزاں و امصیبتا
یار لے نہ بطکم شد، طاقت بدل گدخت
بے خواست می رسد زباں و امصیبتا
از ما جوے صبر کہ اکنوں ز جلے رفت
پاے شکیب و تاب و تواں و امصیبتا
بگوشت از جہان بدل ما گداشت داغ
جان جہاں، و حید زمان و امصیبتا
از حکمت بیان و بدیل و اصول و فقہ
بے او نما نہ بیخ نشاں و امصیبتا
ناسخ نمود سالی و فاش چنین رستم
شد گنج چند علم نہاں و امصیبتا
تاریخ ورود نواب غازی الدین حیدر بر مکان قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی قمر
امروز چون حضور مقدس قدم گزاشت
شان و شکوہ خانہ مرزاے ما فرود
بودم بہ فکر سال کہ آمد ندا ز چرخ
"ہاں آفتاب جلوہ بر سج قمر نمود" ۱۲

تاریخ عطاے خطاب بہ ہمارا جہ میوہ رام

بود اے افتخار دول با ترقی نام و جاہ و حشمت
جہاں نوازی شود مبارک، جہاں پناہی شود مبارک
حضور پر نور دام اقبالہ خطابت عطا چو فرمود
بر اے تاریخ گفت ناسخ، خطاب الہی شود مبارک
تاریخ صحت یابی شیخ احمد بخش

شفیق شیخ احمد بخش صحت یافت اے ناسخ
بگو ہر دم: مبارک یا الہی جشن این صحت
پے تاریخ این جشن کہ راحت زاورج افزاست
رقم کر دم: "مبارک یا الہی جشن این صحت" ۱۲

تاریخ تیاری سفینہ

چون جناب وزیر اعظم ہند
کرد پیدا دگر سفینہ نوح
بعد چندین ہزار سال شدہ
زیب دریا دگر سفینہ نوح

چشمِ ہر کس کو افتادِ بگفت شد مہیا اگر سفینہ نوح
بہر الزامِ منکرانِ گردید لُجہ پیا اگر سفینہ نوح
سالِ تاریخِ آن بگو ناسخ گشت زیبا اگر سفینہ نوح
تاریخِ وفاتِ میر نوروز علی

میر نوروز علی واویلا ز جہاں شبِ بچناں عہدِ شباب
گفت تاریخِ وفاتِش ہاتھ چھپتے رفتہ ز جہاں عہدِ شباب
تاریخِ وفاتِ مرزا قاسم

عمرِ جنت کو چوں مرزا قاتل شد خزاں در بوستانِ شاعری
گفت ناسخِ سالِ تاریخِ گزشتے آفتابِ آسمانِ شاعری
ایضاً

تیرہ چوں گور شد از مرگ قاتل دہر در دیدہ من واویلا
سالِ تاریخِ وفاتِش کفتم شمعِ بزمِ سخن واویلا
ایضاً

چوں محمد حسن قاتلِ اے ولے رفت از باغِ دہر سوئے بہشت
سالِ تاریخِ خامہ ناسخ ولے استادِ وقتِ مرد نوشت
ایضاً

زین جہاں رفت بہ فردوسِ قاتل بود کو پشتِ و پناہِ شعرا
سالِ تاریخِ وفاتِش ناسخ ز در قم: شاہِ شاہ شعرا

حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: کلیاتِ ناسخ "طبع اول صفحات ۳۹۸ و ۳۹۹"۔ دیوانِ ناسخ "۱۲۳۲ھ

بہ قاعدہ زبر و بینہ نکالا گیا ہے۔

۲۔ غلط نامے کے اس عنوان میں لفظ "تنقید" بہ ظاہر تنقیح کی تصحیف معلوم ہوتا ہے۔ بہ صورتِ دیگر یہ اردو میں اس لفظ (تنقید) کے استعمال کی قدیم ترین مثال قرار پائے گی۔

- ۱۳۵ "انتخاب دیوانِ ناسخ" شائع کردہ مکتبہ جامعہ، دہلی، اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۲۔
- ۱۳۶ "حقائق" مطبوعہ الرآباد، جون ۱۹۷۸ء، ص ۳۰۲ و ۳۰۶۔
- ۱۳۷ ممکن ہے کہ یہ خط مرزائی صاحب کمال والے کی تحریر ہو جو سعادت خاں ناصر کے بیان کے مطابق ناسخ کے انتقال کے بعد ان کے تمام مال اور اسباب اور اطلاق پر حسب وصیت ان کے..... قابض و متصرف ہوئے تھے۔ (خوش معرکہ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ، شائع کردہ مجلس ترقی ادب، لاہور، جلد دوم مطبوعہ مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۲۰۶)
- ۱۳۸ "ناسخ" — تجزیہ و تقدیر" شائع کردہ اردو پبلشرز، نظیر آباد، لکھنؤ، نومبر ۱۹۷۴ء، ص ۲۰۸۔
- ۱۳۹ "کلیاتِ ناسخ" طبع اول (ص ۲۰۸) اور بعد کے ایڈیشنوں میں اس شعر کا مصرع ثانی اس طرح نقل ہوا ہے:
- تیرگی ہے کہ نظر آتے ہیں تارے دن کو
- ۱۴۰ یہ نزل نہ تو زیر بحث قلمی دیوان میں موجود ہے اور نہ "کلیاتِ میر" میں اس زمین میں کوئی غزل ملتی ہے۔ یہ صورت حال اس سلسلے میں مزید تحقیق کی طالب ہے۔
- ۱۴۱ "انتخابِ ناسخ" ص ۱۲۱
- ۱۴۲ "مقالاتِ حیدری" شائع کردہ اردو پبلشرز، لکھنؤ، فروری ۱۹۷۷ء، ص ۲۱۵ و ۲۱۶ و "جائزہ مخطوطاتِ اردو" از مشفق خواجہ، شائع کردہ مرکزی اردو بورڈ، لاہور، فروری ۱۹۷۹ء، ص ۶۷۔
- ۱۴۳ "بیاضِ رفعت" بہ حوالہ ماہنامہ "شاعر" بمبئی شمارہ نمبر ۵ و ۶ برائے ۱۹۸۱ء، ص ۶۸۔
- ۱۴۴ "تحقیقی نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری، شائع کردہ اردو پبلشرز، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۷۴ء، ص ۴۶۲۔
- ۱۴۵ ایضاً "تحقیقی نوادر" ص ۵۱۶۔
- ۱۴۶ "خوش معرکہ زیبا" مرتبہ مشفق خواجہ، جلد دوم، ص ۵۷ و ۵۶۔
- ۱۴۷ "آبِ حیات" فوٹو آفٹ ایڈیشن (مبنی بر طبع ۱۹۷۷ء) شائع کردہ اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، ص ۳۵۵ و ۳۵۴۔
- ۱۴۸ "ناسخ" — تجزیہ و تقدیر" ص ۴۳۔ کسی قطعہ تاریخ یا غزل کے آخری شعر میں تخلص کا موجود نہ ہونا ہرگز اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اس کی تصنیف کے وقت شاعر نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا۔
- ۱۴۹ یہ بیان ناسخ کے شاگرد مولوی عظیم امڈرغی غازی پوری کا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اسے غلطی سے مولانا محمد حسین آزاد کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ دیکھئے "آبِ حیات" ص ۳۳۹۔
- ۱۵۰ "مقالاتِ حیدری" ص ۱۹۹ و ۲۲۱
- ۱۵۱ مولانا محمد حسین آزاد نے اس زمین میں مصحفی کی تین غزلیں (صفحات ۳۱۸ و ۳۱۹) اور شاہ نصیر کی ایک غزل (ص ۴۰۰ و ۴۰۱) نقل کی ہے۔ مصحفی نے "دہنِ سرخ ترا" کو ردیف اور "گل، بلبل، سنبل" وغیرہ

کو قوافی قرار دے کر کبھی ایک غزل کہی ہے۔ یہ بھی ”آب حیات“ میں موجود ہے۔

۱۲۵ کلیات مطبوعہ اور دیوان قلمی میں مشترک اشعار سے متعلق ان تفصیلات میں دونوں روایتوں کے درمیان ترتیب کی مطابقت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ بہ طور مثال کلیات مطبوعہ کی اس تیسری غزل کے اشعار نمبر ۱، ۳، ۸، ۹، ۱۲، ۱۳ و ۱۵ بالترتیب دیوان قلمی کی غزل نمبر ۱ کے اشعار نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۱۳ و ۱۴ کے اور اشعار نمبر ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲ و ۲۳ بالترتیب دیوان قلمی کی دوسری غزل کے اشعار نمبر ۳، ۴، ۶، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱ و ۲۲ کے مطابق ہیں۔

۱۲۶ برحوالہ ”ناسخ“ تجزیہ و تقدیر“ ص ۱۵۲ و ”مقالات حیدری“ ص ۲۲۵ — اول الذکر کتاب میں اس قطعے کے چوتھے مصرعے کے آغاز میں اور ثانی الذکر مجموعہ مضامین میں تیسرے مصرعے کے آخر میں شاعر کا تخلص (ناسخ) بھی موجود ہے جو ظاہری فرق کے باوجود اصل نسخے کی نقل پر مبنی معلوم ہوتا ہے لیکن وزن شعر کے اعتبار سے زائد از ضرورت ہے۔

۱۲۷ پہلی دو رباعیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہیں۔ انھیں اس لیے شامل انتخاب نہیں کیا گیا کہ ان میں دیگر اصحاب رسول کی منقبت کا پہلو نکلتا ہے۔

۱۲۸ دیوان قلمی کے اکثر قطعات عنوانات سے محروم ہیں اس لیے ہم نے یہ طریق کار اختیار کیا ہے کہ جس قطعے کی پیشانی پر کوئی عنوان درج ہے، اسے ”واوین“ کے اندر من وعن نقل کر دیا ہے۔ اور جن موضوعات سے متعلق قطعات قلمی دیوان اور کلیات مطبوعہ میں مشترک ہیں، ان کی نشان دہی کے لیے کلیات مطبوعہ کے عنوانات مستعار لے کر انھیں قوسین کے اندر جگہ دی ہے۔ باقی عنوانات قطعات کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر خود ہم نے قائم کئے ہیں۔

۱۲۹ اس مادہ تاریخ (ماے آصف الدولہ) سے مطلوبہ سنہ (۱۲۱۲ھ) بہ قاعدہ زبر و بینہ حاصل کیا گیا ہے تفصیل حسب ذیل ہے :

یاے	افسوس	آصف	الدولہ
ہے الف یے	الف فے سین	واؤ سین	الف فم دال
۱۵ + ۱۱ + ۲۰	۱۱ + ۹۰ + ۱۲۰	۱۱ + ۹۵ + ۹۰	۱۱ + ۴۱ + ۳۵ + ۱۳ + ۴۱
۱۴۶	۳۵۴	۲۹۶	۳۱۶

۱۲۵ مرزا جعفر کی وفات سے متعلق ناسخ نے کل چھ قطعات کہے ہیں۔ یہ سب کے سب فارسی میں ہیں اور ان کے اشعار کی مجموعی تعداد بالیس^۳ ہے۔ دستیاب معلومات کے مطابق ان میں سے کوئی قطعہ دیوان کے کسی دوسرے نسخے میں موجود نہیں۔

۲۶ و ۲۷ نسخ نے ان دونوں قطعات کے مادہ یا بے تاریخ میں تسکین اوسط کے قاعدے کے تحت
 فَعْلَاتُنْ کو مفعولن کر دیا ہے جس کے نتیجے میں برظاہر یہ دونوں مصرعے ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔ قتل ہی
 کی تاریخ وفات سے متعلق ایک اور قطعے کے مادہ تاریخی ”شمعِ بزمِ سخن واویلا“ کی بھی یہی
 کیفیت ہے۔

گجدار و مرثیہ

عبد العزیز خالد

اس مضمون کی ابتدائی قسط (مطبوعہ "قنون" لاہور سالانہ جنوری - فروری ۱۹۸۱ء) میں ہم نے اقبال اور رومی کی شاعری میں قرآن و حدیث کے اس استعمال کا جائزہ لیا تھا۔ جس میں ضرورت شعری کے لیے منصوص الفاظ میں یا تو حکمت و اضافہ کیا گیا تھا یا اشتباع سے کام لے کر زیر، زبر، پیش (کسر یا جزم، فتح یا نصب، ضمہ یا رفع) کو کھینچ کر بطور ایک سبب خفیف کے شمار کیا گیا تھا۔ بعد میں خیال آیا کہ کیوں نہ اسی نقطہ نگاہ سے دوسرے فارسی اور اردو شعراء کا مطالعہ کیا جائے۔ ناتمام حاصل مطالعہ ادب و انکسار کے ساتھ نذر اہل نظر ہے۔ اس "حرف گیری" سے بقول تمنا عمادی،

"نہ کسی کی لٹیکہ مقصود ہے نہ تنقیص۔ نہ اپنے تفوق کا اظہار۔ کوکفی باللہ شہید!"

فارسی شعروں کو جیسے ایران کے چھپے ہوئے نسخوں میں ہیں ویسے ہی نقل کیا گیا ہے (اردو کے بھی کم و بیش ایسے ہی) اس سے اندازہ ہوگا کہ اہل اردو کی طرح اہل ایران بھی کس قدر سہل انگار، سست کوش اور بے توفیق واقع ہوئے ہیں اور اپنی زبان کو کس بڑی طرح مسخ کر رہے ہیں۔

شعر صحیح پڑھنا ہی کارے دارد ہے۔ کہیں اعراب (حرکات و سکنات) کا وجود نہیں۔ عربی کے مقولے 'مصرعے، شعر آرہے ہیں مگر اشاراتِ اطلاق کا دور دور پتا نہیں۔ یا بے مہول، ہمزہ اور نونِ غنہ کا اُنھوں نے غاتمہ ہی کر دیا۔ نونِ غنہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ لفظ قطع میں محسوب نہیں ہوگا۔ مگر اس کے برعکس نونِ معلن ہوگا۔ جب سب نون، نونِ معلن ہیں تو مصرعہ وزنی میں کیسے پڑھا جائے گا؟ یا بے معروف بھی ہر جگہ یا بے مہول کی جگہ نہیں لے سکتی ورنہ تو خلطِ بحث پیدا کرے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اردو اور فارسی زبانوں کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ فارسی کے ایران کی حدوں سے باہر نکلنے کا اب بظاہر کوئی امکان نہیں۔

اردو کے ساتھ بھی اردو کے سرکاری ادارے یہی سلوک کر رہے ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ تک —

زاخوں کے تصرف میں عقابوں کے ششیں

بب لالعلقی، لا پروا، بے بہرہ لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جنھیں نئی نسل کی صحیح تربیت سے، ان کی تہذیبِ نفس سے، ناکِ صحیح خطوط پر نشوونما سے سربم کوئی سروکار نہیں — بلند بانگ دعوے مگر طبلِ تہی کی صدا۔

لا پروا میں جوابات ہے، بے پروا میں نہیں۔

جب نصاب کی ابتدائی کتابوں تک میں تلفظ کے ضبط کا اہتمام نہیں ہوگا تو بچے صحیح زبان کیسے سیکھیں گے ؟
کیسے بولیں گے ؟ کیسے لکھیں گے ؟

اے ہمنفساں بودن و آسودن ما چیست ؟
علم و فن تو کوی پیشہ نہیں، عشق پیشہ لوگوں کا کام ہے۔ مگر یہاں ہر چیز جنس بازار ہے۔
وَجِيئَةُ الْمَرْءِ مَا قَدْ كَانَتْ يُحْسِنُهُ
وَالْبَاهِلُونَ لَا هِلَ الْعِلْمِ أَعْدَاءُ
ضمیر کا، خود آگاہی کا، احتساب کا، فکر و ذکا، خوف خدا کا، شرم خلاق کا کوئی وجود نہیں۔
نہ خریدار کا حق ہے نہ حق بائع کا
یہ وہ دانے ہیں جو گر جائیں کھٹ میزاں سے
یہ وہ اسم ہیں جن کا کوئی مستی نہیں۔ وہ سپیاں ہیں جن میں کوئی موتی نہیں۔

بروزِ حشر کہ ابرار لا تخف شنوند

بگوشِ خاطر ایشان رسان کہ لا بُشری

مذکورہ قسط میں ہم نے دونوں شاعروں کے احسن تقویم ۹۵، ہم کو احسن التقویم بنانے پر ادباً یاد کیا تھا۔ بعد
میں جامی، سعدی، عطار اور پیر مرعلی شاہ گولڑوی کے یہاں بھی یہ بدعت نظر آئی۔
جامی :

روی تو در احسن التقویم اگر دیدی حکیم کی نھادی ز آفتاب و مہر رقم تقویم را

سعدی :

اسے پری روی احسن التقویم حذر از اتباع دیو رحیم

عطار :

حق تعالیٰ ہم تو تعلیم داد ہم ز قدرت احسن التقویم داد

مرعلی :

خلقت ما کردی از ما، مہین احسن التقویم کردی ذو الیقین

بیدل اور امیر خسرو نے البتہ قرآنی الفاظ کا احترام کیا۔

بیدل :

چمن خویش نگاہی کہ در جہان ظہور خطاب احسن تقویم داری از خلاق

امیر خسرو :

تختِ خاکی بکنارِ ششِ نھاد ز احسن تقویم شمارشِ نھاد
 ” احسن التقویم “ پر ہمارا اعتراض یہ تھا کہ اس طرح مرکبِ توصیفی مرکبِ اضافی میں بدل جاتا ہے جس سے مفہوم بالکل
 فرق ہو جاتا ہے۔ مرکبِ توصیفی میں جو اعرابی حالت موصوف کی ہوتی ہے وہی صفت کی۔ یعنی معرفہ ہو تو دونوں
 معرفہ، نکرہ ہو تو دونوں نکرہ۔ جب کہ مرکبِ اضافی میں مضاف پر نہ تو لام تعریف (ال) داخل ہوتا ہے نہ تینوں
 برخلاف مضاف الیہ کے۔ مگر یہ بھی فارسی شعراء کا ایسا تصرف و اجتہاد ہے جو صرف اسی ایک ترکیب تک محدود
 نہیں۔ اس میں منجملہ اور الفاظ مثلاً ”بیت المحرام“، ”بیت المقدس“ کے ”کرام الکاتبین“، ”جبل المنین“ اور
 ”صراط المستقیم“ بھی شامل ہیں اور ان کے ساتھ مُزَیَّل اور مُدَثِّر کی تخفیف شد بھی۔ یعنی دونوں کو بجا آئے
 مفعولن کے فعلن کے وزن پر باندھنا — مُزَیَّل، مُدَثِّر۔
 مثلاً

۱۔ کِرَامُ الْکَاتِبِین

رشید الدین و طواط :

آں فتوحی کا مد از اعلام تو اندر وجود عاجز است از شرحش اقسام کرام الکاتبین
 عطار :

کرام الکاتبین دو پاسبان کرام الکاتبین را جرمِ خاکی
 ملائک چاوشان آستان کمالاتی بود در قدس و پاکی
 عبد الواسع جلی :

خون شود بر نوکِ اقلام کرام الکاتبین گاہ تحریر صفاتِ حربھای تو مداد
 نظیری :

ماز دیوانِ عملِ حرفِ ثواب افکنده ایم از کرام الکاتبین منتِ نظیری کی کشم
 فیضی :

سیاحی از کرام الکاتبین ریخت نہ بر خال و نہ بر رخِ مشک چیں ریخت
 صائب :

مد آھی می کشد گاہی کرام الکاتبین در زمانِ رحمتِ مرثا رعیان سوزا و

سنائی :

عاجز آمد از مشیت زلت عصیان تو
وقت در دودہ می مالہ کرام الکاتبین
تا تو سلمانی دگر گشتی مرا در مدح تو
بوذر دیگرہ بھی خواند کرام الکاتبین

امیر معزی :

از کمال حسن زبید زیور کرسی و عرش
تھنیت گویند ہر روزی کرام الکاتبین
ای خداوندی کہ عالم را بعدل تو بھی
تھنیت گویند ہر روزی کرام الکاتبین
بارگاہ ملک دولت را بدین و داد تو
پیش یزدان شکرا گفتہ کرام الکاتبین
از تو بر کردارهای خوب تو ہر ساعتی

قرآنی الفاظ ہیں :

وَرَاتَ عَلَیْكُمْ لِحَافِظِیْنَ كَمَا كَاتِبِیْنَ ۸۲ : ۱۰۰

(حافظ :

تو پنداری کہ بدگو رفت و جان برد
تو پنداری کہ بدگو رفت و جان برد
یہ مرتب توصیفی ہے لیکن درج بالا شکل میں مرتب اضافی بن گیا ہے۔ مگر بعض اوقات رواج قانون اور عرف منہاج
بن جاتا ہے۔ بقول انگریزی شاعر شیلے کے ،
شاعر دنیا کے قانون ساز ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ قلم و ادب میں اُوَلُوا لا مریں۔ اور بمصدق قَاتِ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ
ان کی خطا کو بھی صواب کا درجہ مل جاتا ہے۔ بقول سیبویہ : اِنَّہُ یَحُورُ فِی الشَّعْرِ مَا لَا یَجُوزُ فِی الْکَلَامِ
یَجُوزُ لِلشَّاعِرِ مَا لَا یَجُوزُ لِغَیْرِہٖ۔ پوئیک لا یمس۔ الشَّعْرَاءُ اُمَرَاءُ الْکَلَامِ

۲۔ حَبْلِ الْمَتِّینِ

سنائی :

بودہ چو یوسف بچہ و رفتہ باز
تا فلک از حبز بہ جبل المتین
خال تو بس با جمال و فضل تو بس با جمال
روی تو نور مبین و رای تو جبل المتین
خلق را در دین و دنیا از برای مصلحت
عزوة الوثقی توئی امروز و ہم جبل المتین

حافظ :

لبانت محبذ عیت لیکن
حدیث طرہات جبل المتین است

خاقانی :

شب روکد ید ساختہ نور مبین چراغ بجئی کہ دید بافتہ جل المتین زمام

فیضی :

بہ ترتیب مسعود اوتاد قایم کہ خواہم بجل المتین بست داماں

خواجہ کرمانی :

حلقہ مفقول جعدت روح را جل المتین

امیر معزی :

ای موکہ در کف اجاب توجہل المتین ای معطل در تن اعدای توجہل الوریہ

اہل شیرازی :

رشتہ مهرش کمنہ جان بود بر بام عرش ذرہ را خط شعاع مہر شد جل المتین

صائب :

رشتہ ای از تار و پود جامہ ات جل المتین

ناصر خسرو :

اگر لافی زنی ہم لاف دین زن ہمیشہ دست در جل المتین زن

فرحتی :

اینجہان و آنجہان از خدمش حاصل شود خدمت محمود او شاختیت از جل المتین
برترین جای مرا پایگہ خدمت او ست پایہ خدمت او نیست مگر جل المتین

امیر خسرو :

بہر مہار گردن بینی سرکشان جل المتین زمام بہ کف کفایتست

جوش ملیح آبادی :

خون کی گردش میں مضمہ ہے جہاں ذکر حبیب نبض کی جنبش میں غلطاں ہے جہاں جل المتین

احسن مارہروی :

ہے جماعت کی کرامت یہ مثل مشہور ہے تام اس رشتے کا ہے اسلام میں جل المتین

جعفر طاہر :

یہ وارث حبس المتین
یہ خاتم دیں کے نگین

قرآن میں یہ ترکیب نہیں۔ اس میں حَبْلٌ مِّنَ اللَّهِ ۳ : ۱۱۲ ، حَبْلُ اللَّهِ ۳ : ۱۰۳ ، حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ ۳ : ۱۱۲ ، حَبْلُ الْوَرِيدِ ۵۰ : ۱۶ اور حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۱۱۱ : ۵ کے الفاظ ملتے ہیں۔
 ویسے ایک اعتبار سے یہ ترکیب صحیح بھی ہو سکتی ہے عبد المتین کی طرح۔ اَلْمَتِّينِ اللّٰهُ تَعَالٰی کے اسمائے خُشٰی میں سے ایک اسم ہے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی ہوئے اَلْمَتِّينِ کی رتس، یعنی خداوند کی رتس۔
 البتہ جلالت میں کے معنی ہوں گے مضبوط رتس (مرکب توصیفی)

۳۔ صِرَاطُ الْمُسْتَقِيمِ

حافظ :

در طریقت پیش ساک ہر چہ آید خیر اوست
 در صراط المستقیم اے دل کسی نگراہ نیست

صائب :

موجہ ای از ریگ صحرایت صراط المستقیم

سعدی :

ای کہ در دنیا ز رفی بر صراط المستقیم در قیامت بر صراط جای تشویش است و بیم

نظیری :

رویت خیر الہدیٰ حق الیقینش کردہ دل بر صراط المستقیمش عقل دانا ساختہ

اہل شیرازی :

راستان را راہ عشق آمد صراط المستقیم پای لغز ما بود از عمتل ناہموار ما

ہم نے اُس قسط میں رومی کے اس شعر سے بحث کی تھی :

بھراں مومن ہمی گوید ز بیم
 در نماز اہد صراط المستقیم

عنوی کے دفتر چارم میں ایک اور شعر نظر آیا :

اھد ناگفتی صراط المستقیم
 دست تو بگرفت بردت تا نعیم

(شمس تبریزی :

دایم رہ بخاک ورت اھدنا الصراط المستقیم من ہو یھدی الی الیقین)

قرآن میں الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ دو جگہ ۶۰: ۱ اور ۱۸: ۳۷ میں وارد ہوتا ہے

صراطِ مُسْتَقِیْم ۲۴ جگہ

صِرَاطًا مُسْتَقِیْمًا ۴ جگہ

صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا ایک جگہ

صِرَاطَ دَرِیْکَ مُسْتَقِیْمًا ایک جگہ

صِرَاطُکَ الْمُسْتَقِیْمًا (م) ایک جگہ ۱۶: ۷

اسمِ معروف کی سات قسمیں ہیں :

۱۔ اسمِ عَلَم

۲۔ اسمِ ضمیر

۳۔ اسمِ اشارہ

۴۔ اسمِ موصول

۵۔ اسمِ جو مُنادی ہو

۶۔ وہ اسم جو مُعرَّف باللام ہو۔

۷۔ وہ اسم جو معروف کی مذکورہ قسموں میں سے کسی ایک کی طرف مُضاف ہو۔

چنانچہ آخری اصول کی رو سے صِرَاطُکَ الْمُسْتَقِیْمًا میں صِرَاط (اسمِ نکرہ) ضمیر مخاطب متصلہ (ک) کا مضاف ہونے کی وجہ سے اسمِ معروف بن گیا جب کہ صراطِ المستقیم میں ایسی کوئی شق موجود نہیں۔

۴۔ مَزْمَل ، مَلْثَمَہ

جامی :

بوصفش سورہ طہ مزل ہم دگر لیسین

حکیم ازرقی : گل در لحاف غنچہ خوش خفتہ بد سحر گہ

کمال السمعیل :

واں گردش مزل زریں شگفت را

اہلی شیرازی :

چو بک زن سرایت بر پاسبان گردون

خواجہ عبدالباقی ، باقی :

تاج است از لیمک لولاک بر سرت

(جامی نے بَلَدَکَ الرَّسُلُ فَضَّلْنَا ۲، ۲۵۳ کے الرَّسُلُ کو بھی الرَّسُلُ باندھا ہے)

لیسین قباہی تست مزل ردای تو

اثر کھنوی : خود کہا حق نے منزل اے زہے حسن قبول
 اللہ اللہ وہ عبادت وہ ریاضت آپ کی
 پیر مہر علی : مجھے کیا غم ہے محشر کا مرا حامی ہے جبہ شاہ
 کہا لولاک و لطف و منزل جس کے شان میں
 جعفر طاہر : تو حرمتِ یسین و منزل ہے بجا ہے
 آداب رسالت سے ترا دل ہے خبردار
 عزیز کھنوی : داعی و مقدر و مذکر
 اُمّی و منزل و مدثر
 طوفان : اٹھا جو مژدہ کا گھونگھٹ حوروں نے بلائیں لب چٹ چٹ
 ہر لفظ کے گھونگھٹ میں جلوہ ہے محمد کا
 ۵۔ ہم نے لفظ آردی کو آردی باندھنے پر پیر رومی و مرید ہندی سے مود بانہ اختلاف کیا تھا۔ مگر اب جو دیکھا تو
 معلوم ہوا کہ اُن کا ہم مسک
 تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

سنائی : رب ارنی بر زبان راندن چو موسیٰ وقتِ شوق
 پس بدل گفتن انا الاعلیٰ چو ہامان شرط نیست
 قافی : بترسیم اگر ارنی بگویم
 ز دربان پاسخ آید لن ترانی
 شمس تبریز : طہور نعہ ارنی ہی ز نسہ چرا
 کہ طو یافت ربیع کلیم جان میقات
 نظامی : موسیٰ ازیں جام تہی دید دست
 شیشہ بہ کھپایہ ارنی شکست
 عطار : رب ارنی بگوش خود خود گفت
 خود بخود کرد حسرت دیدار
 جمال الدین ناصر العلوی :

بقا گویدش ہر زمان رب ارنی
 فنا گویدش تا ابد لن ترانی

آشکارا (سچل سرمست) :
 گاہ ارنی گہ ترانی ہر دو جاری حکم او
 خواجہ معین الدین معینی (اجمیری) :
 موسیٰ دل کہ بطور بدغم گفت ارنی
 ویسے اسے ارنی بھی پڑھا جاسکتا ہے۔
 احمد جام تہذیب :
 رب ارنی چو کلیم اللہ می باتید گفت
 گاہ ارنی میز نم بر کوہ طور
 دارا شکوہ (سکینہ الاولیا) :
 ترا تا کوہ ہستی بیش باقی است
 احمد رضا خاں بریلوی :
 ارنی اگر کہا تو یہی ہے سزائے دل
 میں نے ارنی کہا تو یوں بولا
 ہر اک جانب ظہور نور رُوئے جانی ہے
 ویسے شمس تبریز، عطار اور اقبال نے اسے ارنی بھی باندھا ہے حافظ و غالب کی طرح
 حافظ :
 باتو آن عہد کہ در وادی امین بستیم
 ہچو موسیٰ ارنی گوی بمیقات بریم
 غالب :
 رفت آنکہ ماز حسن مدارا طمع کنیم
 سر رشتہ در کف ارنی گوی طور بود
 شمس تبریز :
 بگو موسیٰ عراں کہ شد ہمہ دیدہ
 کہ نعرہ ارنی نیز داز دم دیدار
 عطار :
 گویم ارنی و زار گریم
 تہسم ز جواب لن ترانی
 ارنی گر بسے خطاب کئی
 بانگ آید بر لن ترانی یاز
 اقبال :
 قصہ دار و رسن بازی طفلانہ دل
 التجائے ارنی سُرخِ افسانہ دل

اردو کے اکثر شعرا نے اسے ارنی ہی باندھا ہے۔

انیس :

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھ تو غش کرے ارنی گوے اور چٹور
آتش :

منہ دکھاؤ بہت رہی تکرار ارنی اور لن ترانی کی
فانی :

فانی ارنی نہ اپنے منہ سے نکلا احسان تجلی بھی اٹھایا نہ گیا
قربان علی سالک :

سُن کے تیری حدیث شیریں کو ارنی گو کی صاف ہو تقریر
ہم نغمہ سنچ ارنی بن نہیں سکتے تو بام یہ کیا جلوہ نما ہونہیں سکتا
جلیل :

سب جنہیں سید مکی مدنی کہتے ہیں ان سے ہم حضرت موسیٰ ارنی کہتے ہیں
وجید الدین سلیم :

گیتی پر نظر ڈال ذرا ناز و ادا سے آتی ارنی کی ہے صدا ارض و سما سے
حسرت عظیم آبادی :

مقتبس اس کے نور کا تھا ارنی کا نعرہ زن بازوی زور نور بخش تھا وہی دست بستہ شکن
خواجہ معین الدین معینی (اجمیری) نے ارنی کو یوں بھی باندھا ہے :

مسکین دلم بہ نوحی شد جو یای آں مر روی شد
رب ارنی گوی شد بچارہ موسیٰ دلم
یعنی ارنی کو ارنی فی ربّ ارنی = ربّ ارنی
۶۔ اُس قسط میں دفترِ اول میں درجِ رومی کے اس شعر پر
بر وزن مستفعلن

لی مع اللہ وقت بود آں دم مرا لایسع فیہ نبیٰ مجتبیٰ
ہم نے یہ حدیث نقل کی تھی :

لی مع اللہ وقت لایسع فیہ ملکٌ مقربٌ اَد (وَلَا) نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ۔ (۴، یسع معی)
اقبال نے بھی لی مع اللہ کی ترکیب استعمال کی ہے جس سے ہم نے اس وقت اعتنا نہیں کیا تھا

تاکجا در روز و شب باشی اسیر رمز وقت از لی مع اللہ یاد گیر
لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست آں جو انورے طلسم من شکست
گر تو خواہی من نباشم در میان لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

اب دیکھا تو بکثرت شاعروں کے ہاں یہ ترکیب نظر آئی۔ خصوصاً احمد جام زندہ پیل کے ہاں تو اس کی تکرار ملتی ہے احمد جام زندہ پیل :

در رسوم کفر و دین بیزار می باید شدن	در حرم لی مع اللہ خیمہ می باید زدن
در مقام لی مع اللہ مست عاشق وار بہ	ہر کہ در یاد رموز ستر توحید خدا
در ملک فخر بادشاہیم	بر فرق کلاہ لی مع اللہ
کنت کنزاً از لبش بسیار می باید شنید	لی مع اللہ در میان لوح دل می باید نوشت
لی مع اللہ آشکارا دیدہ ایم	نکتہ از دھو معکم خواندہ ایم
ز سرمستی رہ دیگر گرفتیم	ز جام لی مع اللہ جرعه خوردیم
نگینہ در مقام لی مع اللہ	شمس تبریز :
سرخیل معتربان در گاہ	فرشتہ گرچہ دارد قرب در گاہ
	امیر خسرو :
	اے خاصہ قرب لی مع اللہ

رہ پار لیلۃ الاسری سوی پروردگار	تقائی : ہمنشین لی مع اللہ معنی نون و القلم
ماسوی اللہ را ز استغراق افنا ساختہ	نظیری :
از خدا نبود جدا ہچو شعاع از آفتاب	اتصال لی مع اللہ کردہ حاصل و نمناز
	خواجہ معین الدین معینی (اجمیری) :
	در مقام لی مع اللہ از کمال اتصال
	گرامی :

خزۃ الفقر فخری در برکش	ساج رمزی مع اللہ بر سرکش
بہ شمشاد بلندش بود کوتاہ	جمالی دہلوی :
از حجر سینہ نکہبت آہ	ز قدر او قبای لی مع اللہ
	اوصد الدین کرمانی :
	برده مقام لی مع اللہ
	صفی علی شاہ :

نبود بحرم لی مع اللہ راحت	تا دل نشود بریدہ از دلخواہت
آرایش تحت لی مع اللہ	مغن کا کروی : پیدا ہوئے بادشاہ فیجاہ

خوشی محمد ناظر،
چپکے چپکے کان میں یہ کہہ رہا ہے دل کہ ہم

احمد رضا خاں بریلوی،
نبی سرور ہر رسول و ولی ہے نبی رازدارِ مَحِی اللہ لی ہے

یہاں لی مَحِ اللہ کو مَحِ اللہ لی کر دیا گیا ہے۔
اس کے علاوہ کچھ اور جملے بھی بہت سے شاعروں میں مشترک نظر آتے ہیں
۴۔ لِمَنِ الْمُلْكُ وَاحِدِ الْقَهَّارِ

عطار :

پس بخود گوی و بخود شنوی
ہزار زلزلہ، رجو ہر جہان افتد
لَمَنِ الْمُلْكُ وَاحِدِ الْقَهَّارِ
ز نعرہ لَمَنِ الْمُلْكُ وَاحِدِ الْقَهَّارِ

سنائی :

تا ز خود بشنود نہ از من و تو
لَمَنِ الْمُلْكُ وَاحِدِ الْقَهَّارِ

فیض کاشانی :

بسوخت غیر سر اسرور آتش غیرت
لَمَنِ الْمُلْكُ وَاحِدِ الْقَهَّارِ
مناوی لَمَنِ الْمُلْكُ وَاحِدِ الْقَهَّارِ
زین ندای تومی شویم ہلاک

ببخود موبائی :

یکے بہ ہمہ قہر واحد القہار
یکے بہ زمزمہ دلربای انت غفور

قرآن میں ہے :

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ، لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۱۶: ۴۰

موجودہ شکل میں اس کے کوئی معنی نہیں بنتے اور الفاظ مفہوم کا ساتھ دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اَلوَاحِدِ کو ہر جگہ واحد باندھا گیا ہے۔

جامی نے اسے یوں باندھا ہے :

ہم مقربا تو گفتہ ہم جامد
اَلْيَوْمَ اور اَلْقَهَّارِ ساقط ہیں لیکن مصرع با معنی ہے اور قرآنی الفاظ میں ہے۔
لَمَنِ الْمُلْكُ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ

سید انشا کرتے ہیں :

تھے ریاضی میں جو ماہر حکمائے یونان
سب بجاتے تھے وہ نفاۃ الْمُلْكُ لِمَنِ؟

الفاظ کا تفاوت ظاہر ہے۔

۸۔ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ

سنائی :

این یکی گوید بفرمان کا استجبوا للرسول
این کمرز ایاک نعبد و ایاک نستعین

واندگر خواند ز ایمان یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
واندگر تاجی نہاد از یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ

ابن مبین :

فلا تفرح ولا تحزن بحال
لئن ترضى و انت تسخط سواؤ

بأن الحال ليس له بقاؤ
بأن اللّٰهُ یفعل ما یشاء

امیر معزی :

تا دلیل قوتست و تا نشان قدر تست

یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ یحکم اللّٰهُ مَا یرید

شمس تبریزی :

یا این دل خوخواہ را لطف و مراعاتی بکن
کی برکشایی گوش را ؛ کو گوش مرد ہوش را ؛
زین رنگہا مفرد شود در خنب عیسی در رود
در مجلس ماسر خوش آ برقع ز چہرہ بر کشا
ای معاف یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
آن چہ باشد کو کند کان نیست خوش
اوست مرہر بادشہ را بادشہ
گوش بی گوش دین دم بر کشا

یا قوت صبرش بہ در یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
مخلص نباشد ہوش را جز یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
در صبغۃ اللّٰهُ رونہد تا یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
زان سان کہ اول آمدی ای یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
بی محابا رو زبان را بر کش
قد رضینا یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
حکم او را یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ
بہر راز یفعل اللّٰهُ مَا يَشَاءُ

ردی :

اسمعیل میرٹھی : لگاؤں شیاء اللّٰہ کی صد اکیوں

بہلا دوں یفعل اللّٰہ مَا يَشَاءُ کیا

قرآن میں ہے :

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ۱۳ : ۲۷

إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۳ : ۱۸

سب شعرا نے اللّٰہ کو اللّٰہ ساکن باندھا ہے حالانکہ آیت کے دوران میں متحرک کو ساکن نہیں کیا جاسکتا۔
اور یشاء کو یشاء (یشاء) باندھا ہے جو البتہ ایک حد تک جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

ابنِ یمن نے اِن کو برا بھلا بے ریاکت باندھا ہے۔

اسمعیل میرٹھی کے پہلے مصرع میں شیناً لِلّٰہ درج ہے لیکن تقطیع میں شیناً لِلّٰہ آتا ہے۔ باقی وہی اللہ کا ہ ساکن اور ایشاء کا ء ساقط۔
شمس تبریزی کا شعر ہے،

گفتم کہ ز آتشہای دل بر روی مفرشہای دل
می غلط در سودای دل تا بحر یفعل مایش

قرآنی الفاظ ہیں،

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۲۰:۳

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۱۸:۲۲

یَفْعَلُ کو یَفْعَلُ باندھا گیا ہے۔

۹۔ وَخَذَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ

امیر خسرو،

تن پاکت کہ زیر پرہن است
ادھی رفت و خلق در عقبش
وَخَذَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ چہ تن است
وَخَذَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ می گفت

بیکجہ لاہور کے ایڈیشن میں لہ چھا ہے حالانکہ یہ دیدہ زیب نسخہ خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ ورنہ میں لہ آتا ہے۔ قاری اسے ظاہر ہے لہ پڑھے گا تو وزن کا کیا بنے گا!
شاہ نعمت اللہ دہلوی،

وحدہ لا شریک لہ گفتم
وحدہ لا شریک لہ گفتم
وحدہ لا شریک لہ گویم
غیر اونیست شاہد و مشہود
کردم اقرار، کی کنتم انکار
مومن و صادق و مسلمانیم

جامی،

روی خود را کہ او شریک مراست
در نکوئی کہ لا شریک لہ است

سنائی،

کفر و دین ہر دو در رھت پویان
وحدہ لا شریک لہ گویان

گلزار اردو کافی،

ہمہ اشیا بہ وحدت پویان
ہر گیارھے کہ از زمین روید
وحدہ لا شریک لہ گویان
وحدہ لا شریک لہ گوید

؛

فیضی (انشائے ابرار الفضل؟) :

کفر و اسلام در ہمش پریان وحدہ لا شریک لہ گویان
عطا ٹھٹھوی :

بخدای یگانہ واحد وحدہ لا شریک لہ سبحان

حسرت عظیم آبادی :

جس طرف ہم نے بھرنگہ دیکھا وحدہ لا شریک لہ دیکھ
قرآن میں لا شَرِیکَ لَہ ۶ : ۱۶۳ ہے۔

سب جگہ لہ کو لہ باندھا گیا ہے اور وَحْدَہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

فیضی (ابرار الفضل؟) کا شعر ہے :

اے نام تو ترثو کر ستو سبحانک لا شریک یا ہُو
ناصر خسرو بھی کہتا ہے :

نومید مشور رحمت یزدان سبحانک لا الہ الا ہُو

سُبْحَانَکَ ضمیر مخاطب کے بعد دونوں جگہ ہُو استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ قواعد کی رو سے یا سُبْحَانَہ ہونا چاہیے تھا یا ہُو کی جگہ اَنْتَ۔ یا ہُو کا جواز تو کسی حد تک نکل سکتا ہے مگر 'الاہُو' کا مشکل ہے۔
میر تقی میر :

جس کو کہتے ہیں لا شریک لہ

یہاں بھی لہ کو لہ باندھا گیا ہے۔ محنت کے دوسرے ہم قافیہ مصرعوں کے مطابق :

اعرج واعلیٰ و ابرص واکم سن کے کبک دری ہنسے قہقہہ

دیکھتے ہیں ادھر ہی ہر دمہ

۱۰۔ کُلُّ شَیْءٍ ۛ هَالِكٌ اِلَّا وَجْہُہ

نظیری :

ہرچہ از بحر و بر ہستی بروں آوردہ سر خرج و جہ کل شیء ۛ ہالک الا ساختہ

قاسمی :

در حقیقت ماسوی نبود اندر ماسوی کل شیء ۛ ہالک الا وجہہ پیداستی

عطار :

کل شی ہالک الا وجہہ سلطنت بنمود و بر خوردار شد

رُومی :

می نمازد در جهان یک تار مو کل شی هالک الا وجهه
شاہ نعمت اللہ :

محسن کا کو روی : کل شی هالک الا وجهه
خوش بخواں نص کلام لایزال

احمد رضا خان : رفت سُوئے عرش اعلیٰ رُوح او کل شی هالک الا وجهه
در تو مستحک کو در ذاتِ خدا امداد کن

قرآن میں ہے :

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ ط ۲۸ : ۸۸

ط وقف مطلق کی علامت ہے اور اس پر پھر ناچا ہے۔ یعنی آخری ہ کو ساکن پڑھنا چاہیے۔ سب جگہ هَالِكٌ کو هَالِقٌ باندھا گیا ہے اور وَجْهَهُ کو وَجْهَهُ۔

رُومی کے تین شعروں سے جن میں یہ آیت واقع ہوئی ہے۔ ہم نے اعتنا کیا تھا۔ اس کے بعد چند اور نظر سے گزرے۔

ہر کہ اندر وجہہ ما باشد فنا کل شی هالک نبود جزا
وز ملک ہم بایدم جستن ز جو کل شی هالک الا وجهه
وقت رطت آمد و جستن ز جو کل شی هالک الا وجهه
خضم بر شیر آمد و ہر رو بہ او کل شی هالک الا وجهه
پہلے شعر میں هَالِقٌ پورا باندھا گیا ہے مگر وَجْهَهُ صرف وجہ۔

۱۱- اَنْبَتَهُ اللّٰهُ نَبَاتًا حَسَنًا۔

سلمان ساوجی :

روح امینش ز سر سدرہ گفت انبتہ اللہ نباتاً حسن

حسن سنجر :

انبت اللہ نباتاً حسناً گفت و گزشت خضر آنکہ کہ بگرد شکرت سبزہ دہد

غالب :

کلک از تازگی مدح تو در بارہ خویش شارج انبتہ اللہ نباتاً حسن است
ذوق : جوش رویدگی سبزہ پہ یاد آئی ہے آیت انبتہ اللہ نباتاً حسناً

محسن کا کو روی :
 جملہ انبتہ اللہ نباتاً حسناً
 ان دونوں فصل بہاراں میں ہے طغرائے چمن
 نظیر اکبر آبادی :
 دیکھ سبزوں کی طراوٹ کو زمیں کہتی ہے
 دم بدم انبتہ اللہ نباتاً حسناً
 آیت یہ ہے :
 وَ اَنْبَتْنَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۳۰ : ۳
 حسن سبجہ کو چھوڑ کر سب شاعروں نے اَنْبَتْنَهَا کو اَنْبَتْنَهُ باندھا ہے اور بیج میں اللہ ڈال دیا ہے۔ نبات
 موٹٹ ہے لیکن اس کے ضمیر ہا کو ہو مذکر سے بدل دیا۔ حسن سبجہ نے اَنْبَتْنَتْ باندھا ہے۔
 ۱۲۔ نُونُ وَالْقَلَمُ

حافظ :

چو من ماہی کلک آرم بہ تحریر
 تو از نون والقلم می پرس تفسیر
 خاقانی :
 در صف و سجدہ از قد و پیشانی ملوک
 پشت خم ، راست دل بخدمت او
 ماہ سرگشت خلقی این چون قلم آن چو نُون
 قافی :
 ہم نشین لی مع اللہ معنی نُونُ والقلم
 شمس تبریز :
 چو تو نونی در رکوع چون قلم اندر سجود
 رومی :
 تا مشرف گردی از نون والقلم
 امیر خسرو :
 آنکہ ز پے گزشتن نہ دریا
 گیسو و رو نوردد و خاشش بہم
 جامی :
 ابرو و قد خوشست صورت نون والقلم
 نقش خط و لکشت معنی مایسٹرون

نظیری : آیہ نون والقلم را دیدہ از انوار خویش
 سر باطن را بلفظ ظاہر ادا ساختہ
 خواجو کرمانی : دلم بہ غمزدہ و ابروی او بہ مکتب عشق
 امیدوار چو طفلان بہ نون والقلم است
 عطار : قوس قدرت را قوی زہ لا حیرم
 گشت نازل زین سبب نون والقلم
 حسن : نون والقلم از فضل خداوند تعالی
 معلوم نمودہ بہ ہمہ نوحی محمد
 قرآن میں ہے :

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۶۸ : ۱

نُونُ وَالْقَلَمِ زیادہ سے زیادہ م کو ساکن کر کے فاعلن فعل کے وزن پر باندھا جاسکتا ہے حالانکہ وہ بھی
 نص میں دخل اندازی ہوگی۔ مگر خواجو کرمانی کے علاوہ جس نے ایسے ہی باندھا ہے باقی شاعروں نے نون والقلم
 = نُونُ وَالْقَلَمُ = یعنی مستفعِلن کے وزن پر باندھا ہے۔

۱۳۔ قرآن میں ہے : سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِ ۱۵ : ۸۷

حدیث میں سورۃ الفاتحہ کی فضیلت میں آتا ہے : هِيَ اُمُّ الْقُرْآنِ وَهِيَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَ
 هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِ۔ لیکن شعرا نے اسے یا تو سَبْعُ الْمَثَانِ استعمال کیا ہے یا سبع مثنائی۔
 شمس تبریزی :

نظیری : در رکعات نماز ہست خیال تو شہ
 چراغ پنج ہست را بنور دل بفروزان
 واجب و لازم چنانک سبع مثنائی مرا
 حواس پنج نماز است و دل چو سبع مثنائی

سبع المثنائی میں ولد ثانییم نماںد
 دوبار سبعہ الوان کشیدہ در ہر روز
 ام الولد برفت کہ ام الکتاب شد
 چو نزل سبع مثنائی زخوان سبع شداد
 خواجو کرمانی :

قائمی : مرا از شاعری و شعر تنگ است
 بحق و حرمت سبع المثنائی

خاقانی : مدح تو بود حرز تنم ز انکہ دروہست
 کلامش تالی عقد اللالی
 از فضل خدا خاصیت سبع مثنائی
 بیانش ثانی سبع المثنائی

سنائی :

ز سبع سماوات تا بر پیری ندانی تو تفسیر سبع المثانی

امیر معزی :

ہر آن سرود کہ در عشق عاشقانہ بنجامست مرا چو سبع مثانی و چوں تھیما تست

رشید الدین و طواط :

علیک لدی الوری ما عشت اشئی نعم و بحمدہ سبع المثانی

وحشی بافقی :

۱۴۔ "وہو معکم" کی ترکیب بھی مرغوب شعرا معلوم ہوتی ہے خصوصاً احمد جام ثرندہ پیل کے ہاں تو بکثرت نظر آتی ہے۔

احمد جام ثرندہ پیل :

از رموز و ہو معکم بالیقین
طیلسان و ہو معکم را بسر باید کشید
حدیث و ہو معکم گوش جان
من ز جام و ہو معکم مست و بھوش آدم
من شراب و ہو معکم خورده ام
از جوب و ہو معکم بالیقین
در سرای و ہو معکم گوشہ می باید گزید
ز سر ہو معکم را ز گفتم
رموز و ہو معکم گفت بر ما
حق بدان و حق بین ارض و سما
نخن اقرّب از لب دیدار می باید شنید
رموز نخن اقرّب بر تو ایماست
وز رموز نخن اقرّب سر پنهان یا فتم
مست و بھوشم ازان در سر زمان
مرغ دل را ہر زمانی دانہ کن
در فضای کن فکان اظہار می باید شدن
رموز نخن اقرّب باز گفتم
چو دریاشد نہان آنگاہ دیرا

سب جگہ وَهُوَ مَعَكُمْ کو وَهُوَ مَعَكُمْ باندھا گیا ہے۔

قرآن میں ہے : وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ ۷۵۷

احمد جام ہی کے دو شعراور ہیں :

ہو معکم رمز حق است بالیقین رمز حق را ہم بمعنی بایدار
بالیقین غالباً یقین ہو گا کیونکہ پل سے مصرع ساقط الوزن ہو جاتا ہے وَهُوَ مَعَكُمْ کو ہُوَ مَعَكُمْ
بر وزن فاعلاتن باندھا گیا ہے۔

نکتہ از وہو معکم خواندہ ایم لی مع اللہ آشکارا دیدہ ایم
وَهُوَ مَعَكُمْ كُو وَهُوَ مَعَكُمْ بَانْدھا گیا ہے۔

شمس تبریز :
وہو معکم یعنی باتست درین جستن آنکہ کہ تومی جوئی ہم در طلب اورا جو
وَهُوَ مَعَكُمْ یعنی کُو وَهُوَ مَعَكُمْ یعنی بروزن مفعول مفاعیلن باندھا گیا ہے۔
عطار :

ثم وجه اللہ آیدت بہ نظر وہو معکم نمایدت دیدار
یہاں بھی وَهُوَ مَعَكُمْ ہے۔ پہلے مصرع کا مخرج یہ آیت ہے : قَائِلًا تَوَكَّلُوا فَمَّا وَجَّهَ اللَّهُ ۱۱۵:۲
سچل سرست :

وہو معکم اینما کنتم شنو از خیال ما و من خود شو بدر
وہو معکم زین حقیقت حق چہ خواست یعنی واجب را از ممکن جلوہ ہاست
یہاں بھی وَهُوَ مَعَكُمْ کُو وَهُوَ مَعَكُمْ اور وَهُوَ مَعَكُمْ باندھا گیا ہے۔
— اب ہم فردا فردا شاعروں سے بحث کرتے ہیں :

سنائی

(۱) جو ہرش چون ز اضطراب عقل و نفس اندر گرگشت گفت در گوشش کہ الرحمن علی العرش استوا
[خاقانی :

پس آسمان بگوش خود گفت شک ممکن کان قدر مصطفیٰ است علی العرش استوی
عطار :

چون بر کشید آئینہ کل کاینات عرش آفرید ثم علی العرش استوا
شمس تبریز :

گرد رود قریادی بود در عاقبت دادی بود من فضل رب محسن عدل علی العرش استوی
میر تقی میر :

اے مرتفع نشین علی العرش استوی ذی عز و ماسوای خدا، خویش مصطفیٰ [قرآن : الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ۵:۲۰

پہلے شعر میں الرَّحْمَنُ کو الرَّحْمَان (بنون غنہ) باندھا گیا ہے حالانکہ یہ لفظ کے اوپر بالالتزام پیش ڈالا گیا ہے۔

رومی، تخت دل معمور شد پاک از صوا بروی الرحمن علی العرش استوی

یہاں بھی الرَّحْمٰن نون غنۃ کے ساتھ آیا ہے۔

قرآن میں شِشِ اِشْتَوٰی ہے بروزنِ فاعلن مگر تین اشعار میں شِشِ اِشْتَوٰی باندھا گیا ہے ترکیبِ ل کے ساتھ بروزنِ مفاعلن (ل فاعلن)۔ عطار نے شَم علی العرش استوا باندھا ہے حالانکہ قرآن

کے الفاظ ہیں:

ثُمَّ اِشْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ ۵۴ : ۷

۲ : ۳۲

۲ : ۵۷

(۲) خستہ دل من در حزن گفتی مرا لا تَعْجَلَنَّ چوں گفتی باد بدہ من اِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا

قرآن : اِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۲۵ : ۸۰

صَبًّا کو صَب باندھا گیا ہے اور اِنَّا کی بجائے اِنَّا ہے جو مرتب و ناشر دونوں کی بے پروائی پر

دال ہے۔

(۳) نرم دار آواز بر انسان چو انسان زانکہ حق اَنكَرَ الْأَصْوَاتِ خواند اندر بُنی صوت الحمیر

قرآن : اِنَّا اَشْكُرُ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتِ الْحَمِيرِ ۱۹ : ۳۱
نبی = نبی = نبوی = نبی = نوشتہ، نامہ، قرآن مجید، مصحف

معلوم نہیں اس لفظ کا مادہ اشتقاق کیا ہے؟

لَصَوْتِ کو صَوْت باندھا گیا ہے۔ اَشْكُرُ الْأَصْوَاتِ اِن حرفِ عاملہ کے بغیر

تو اَشْكُرُ الْأَصْوَاتِ پڑھا جائے گا۔ یعنی سُر کی بجائے سُر۔

(۴) چونت عمر و فید باشد کار سز نیک و بد در نبی پس کسیت نعم المولیٰ و نعم النصیب

قرآن : نِعَمَ الْمَوْلٰی وَ نِعَمَ النَّصِیْرِ ۳۰ : ۸

لی و کو و کی زبر کو حذف کر کے لُئو = علا کے وزن پر باندھا گیا ہے۔

(۵) اِن لم یکن طود فتل ان لم یکن وبل فطل اِن لم یکن خمر فخل اِن لم یکن شہد فسم

[شمس تبریز]

یا من هو سیدی و اعلا و اجل یا من انا عبده و ادنی و اقل

حاشا ک تملنی و یوشیک تمل ان لم یکن الوایل بالوصل فطل

قرآن : فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَاِیْلٌ فُطِّلْ ۲۶۵ : ۲

فرق الفاظ ظاہر ہے۔ طباعت میں فخل ہے جو وزن سے خارج ہے۔ لایم مُنْتَوْنَ، مجزوم ہونا چاہیے تھا۔
(۶) ہرگز از بارِ حسدِ خستہ نہ گردد پشت ما کز قلّ اللہ تمّ ذرّہم مومسیانی یافتیم
باش حق را و سواى حق گزار یاں قلّ اللہ تمّ ذرّہم یاد دار
(فیض کاشانی :

ز حق چہ بھرہ برد آنکہ روش باغیر است خدا قلّ اللہ و ذرّہم بہ بندہ فرمودہ)
قرآن : قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ حَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ۶ : ۹۱
اللہ کو اللہ بہ اسکان ہ باندھا گیا ہے۔

فیض کاشانی کے شعر میں ثُمَّ کی جگہ وہ ہے۔ اور اللہ کی اسکان اگر ساکن نہیں تو پھر و ز ایہ اس کے باوجود اسے
فرمودہ خدا کہا ہے۔

(۷) از پس کہ ہمہ نَحْنُ غَالِبُوْنَ گفتند فگند در دل شان کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَاں
لا نَحْنُ الْغَالِبُوْنَ بسیار کس گفتند یک غلبہ نشان گشت آمتا چوں ثعبان شد عصا
قرآن : اِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُوْنَ ۲۶ : ۲۴

پہلے شعر میں اَلْغَالِبُوْنَ کو غالبوں اور دوسرے میں اَلْغَالِبُوْنَ باندھا گیا ہے لَنَحْنُ دونوں میں نَحْنُ ہے۔
(۸) ہرچہ از پیشی و بیشی ہست در اطراف ما مابرآن از دلِ صلامی مں علیہا فان کنیم
(سلان ساوجی :

براندہ چرخ و بامے کردہ پیدا ز کل من علیہا فان و یقی

نظری :

ہرچہ بتی بود با اصل و ولد در با ختم من علیہا فان رقم کردند بر دیوان من
قرآن : کُلُّ شَيْءٍ مِّنْ عَلَیْهَا فَاِنْ وَّ یَبْقِیْ وَجْہُ رَبِّکَ ۵۵ : ۲۶، ۲۷
تینوں شعروں میں فَاِنْ کو فَاں باندھا گیا ہے۔

سلان ساوجی نے و کو بہ تخفیف باندھا ہے۔

(۹) ایں کنوں کمرز الحکم شد نقش دارد بر نگین و اندگرز آیتاک نعبہ حلقستہ دارد بر کمر
بامداد آیتاک نعبہ گفتہ ای در منہ رض حق چاشت گد خود را کمن در خدمت دونی حقیر
ایں کمرز آیتاک نعبہ بست در فرمان شرع و اندگر تاجی نہاد از یفعل اللہ ما یشاء

قرآن : اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۱ : ۴

تینوں شعروں میں نَعْبُدُ کو نَعْبُدُ باندھا گیا ہے حالانکہ دوسرے شعر میں د کے اوپر پیش بھی ڈالی گئی ہے۔

اس سے سخن فہمی عالم بالا معلوم ہوتی ہے۔

[شمس تبریز :
ایاک نعبداست زمستان دعای باغ در نو بہار گوید ایاک نستعین
در طحاش نسخہ ایاک نعبداست در چشمش عنمرہ ایاک نستعین

استاد جمال الدین :
کو را دریں سفر ہمہ تعیند بدرقہ ایاک نعبداست و ایاک نستعین [
ان تینوں شعروں میں بھی لَعْنَدُ کو لَعْبُدُ ہی باندھا گیا ہے۔

[امیر خسرو :
نعبہ ایاک طراز علم فاخلع نعلیک مقام مدام
وصف شرف تو بیش از ادراک آمد سبق ادبت نعبہ و ایاک آمد

عطا ٹھٹھوی :

یا رب کریم ایزد پاک ای نعبہ نستعین ایاک [

یہاں دونوں شاعروں نے ترتیب الفاظ ہی بالکل بدل دی ہے۔
(۱۰) چون الم نشرح شنیدی ربّ یسّر لی بگوی چون ز جنت درگزشتی وصف ملک چین مکن
قرآن : رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۲۶، ۲۵ : ۷۰

یسّر لی سے پہلے رَبِّ نہیں بلکہ وَ ہے۔
(۱۱) امر امت تست یا رب یا پیسہ در نبی گفتہ ان ابرموا امرا فاتا مبرمون

قرآن : اَمْ اَنْتُمْ مُؤْمِنُونَ ۴۳ : ۷۹
شعر میں اَمْ کی بجائے اَنْ ہے حالانکہ اَمْ باسانی آ سکتا تھا اور مُؤْمِن کی س پر زیر کی جگہ زبر ہے۔
(۱۲) ز بعد آنکہ چون سین سپر گرد و در اندرون کہ کا حد ماہ را ہر ماہ حتی عاد کا لَعْرُجُون
اے شدہ ماہ تمام از غایت حسن و جمال چاکرا ز ہجران رویت عاد کا لَعْرُجُون شود

قرآن : وَالْعَصْرَ قَدْ رَنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ ۳۶ : ۳۹
کَالْعُرْجُونِ کے ن کو ساکن اور غنّہ باندھا گیا ہے۔

دوسرے شعر میں عاد اور شود ہم معنی ہیں اس لیے ”شود“ محض حشو ہے۔
(۱۳) الجیشات للجیشین گفت ایزد در نبی تا برہیزند اہل طبّات طبّین
(از جیشات و جیشین تو یہ پرہیزی ہمی روی را بر طبّیات و طبّین باید نہاد)

قرآن: الْخَيْثَاتُ لِلْخَيْثَتَيْنِ ۲۴: ۲۶
پہلے مصرع میں للخبثتین کو صرف خبیثیں پڑھنا پڑے گا تاکہ مصرع وزن سے خارج نہ ہو۔ معلوم نہیں
مرتب نے بل کا اضافہ کس لیے کیا ہے ضروری نہیں کہ ذوق سلیم بھی علم کا ہم سفر ہو۔
(۱۴) بیزین ناکسان و دیگران گیسر کثیر الناس ارض اللہ واسع

قرآن: اَرْضُ اللّٰهِ وَاَسْعٰهُ ۴: ۹۷
وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاَسْعٰهُ ۳۹: ۱۰۰

شاعر نے وَاَسْعٰهُ کو وَاَسِعَ باندھا ہے اور یوں ارض موت کو مذکر بنادیا ہے۔
[رومی: گرزوید خوشتر از روضات هو پس چو واسع باشد ارض اللہ بگو
شمس تبریز و ارض اللہ واسعۃ فسیح الی رب ربوف بالوفود]
پہلے مصرع کی تقطیع یوں ہوگی: مفاعیلن مفاعیلن فعولن۔ عیلن کی جگہ علت اس بحر میں عربی میں
عام ہے گو اردو میں نہیں۔ مثلاً

وَلَا تُبْقِيْ خُمُوْرَ الْاَنْدَرِيْنَ
وَاُخْرٰى فِىْ دِمَشْقٍ وَقَاَصِرِيْنَا
فَجَعَلَ فَوْقَ حَقْدِ الْجَاهِلِيَا
فَمَا بَعْدَ الْعِشِيَّةِ مِنْ عَرَارٍ
آمد بانگ خروکس اذ صب عنا الحزن

قرآن: الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ ۳۵: ۳۴
[ابن مین: آنکہ تانجت بہ درگاہ ویم راہ نمود
ابن مین نے عنا کو حذف کر دیا۔
۱۵۱) در شب میلاد او دایہ دولت چہ گفت

قرآن: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۴۶: ۱۳
فلا کو لا اور وَلَا هُمْ کو وَهُمْ لا باندھا گیا ہے۔
۱۹) ہر کہ لاخوف علیہم گوید اندر گوشش تو ہم تو اند گفت در گورت و ہم لایحزنون

قرآن: السَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ ۹: ۱۱۲
دوسرے مصرع میں السَّائِحُونَ کو سَائِحُونَ پڑھنا پڑے گا مصرع کی صحت کے لیے یَحُو کو يَحُو
چھاپا گیا ہے۔ بِالْمَعْرُوفِ محذوف ہے۔

شمس تبریزی، کی شنود این بانگ را بی گوش ظاہر دم بدم
تایسون العابدون المحامدون السائحون
التائسون کو صرف تایسون باندھا گیا ہے ال تعریف کے بغیر۔
(۱۸) دست در فراق صاحب شرع زن کا یزدھی
گوید اور ابھرا مرش یفعلوا ما یؤمرون
قرآن : وَ یَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ ۱۶ : ۵۰
۶ : ۶۶

یَفْعَلُونَ کو یَفْعَلُوا باندھا گیا ہے۔
(۱۹) اے منزہ ذات تو عما یقول الظالمون
گفت علمت جملہ را ما لم تکنوا تعلمون
قرآن : اِذْ یَقُولُ الظَّالِمُونَ ۱۷ : ۲۷
عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۲۳۹ : ۲
اِذْ کُو عَمَّا بِنَادِیَا ہے اور تَعْلَمُونَ کو تَعْمَلُونَ۔ یہ تصرف بلا ہنما مرتب و ناشر کا ہے یہ سلوک قرآن سے
ایک اسلامی ملک میں ہو رہا ہے

چو کفر از کعبہ بر خیزد
(۲۰) ای گلی کہ کلینت عالم ہمہ گلزار شد
وز گلت بوی تبارک ربنا الاعلیٰ زند
[سلمان ساجی :

بھکاری کہ خواہی کرد اول بر زبان آور
مبارک نام یزدان را تبارک ربنا الاعلیٰ
عبید زاکانی ،
مستحان فلک در سجد گاہ افول
زبان کشادہ بہ تسبیح ربنا الاعلیٰ
قرآن : تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۷۲ : ۷۲
۷۲ : ۷۲

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ۵۵ : ۷۸
مَسْبُوح اسْمُ رَبِّكَ الْاَعْلٰی ۸۷ : ۱
اَنَا سَابِّحُكَ الْاَعْلٰی ۹۹ : ۲۳
قرآن میں رَبُّنَا الْاَعْلٰی کے الفاظ نہیں۔ نمازیں بحالت سجد البتہ یہ پڑھتے ہیں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی۔
(۲۱) گوش حس باطمین کر باد اگر نشنودہ ام
بنایت از جعی کُلُّ الْاِشْنَا یَرْجِعُونَ
قرآن : اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۸۹ : ۲۸
یَرْجِعُونَ سے پہلے کُلُّ الْاِشْنَا کے الفاظ کسی آیت میں نہیں کُلُّ الْاِشْنَا رَاجِعُونَ ۲۱ : ۹۳ البتہ ہے۔

(۲۲) بامدحش مدایح مطلق زهق اباطل است وجاء الحق

قرآن : قَدْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۱۷ : ۸۱

نفس میں حاسے پہلے و نہیں ہے ۔

[فیض احمد فیض ، قَدْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ

پہلے تو قُل کو قَدْ سے بدل دیا ہے ۔ پھر الْحَقُّ کو الْبَاطِلُ پر ٹھنڈا پڑے گا مصرع کو وزن میں رکھنے کے لیے ۔

حذف و کے ساتھ بصورت دیگر : قووا بروزن فعلن ۔

(۲۳) بدست رو و قبول تو چون بدست کریم عزیز و خوارم چون سیم قل هو اللہی

قُلْ هُوَ اللَّهُ کے اللہ کو اللہ ہی باندھا گیا ہے بعینہ جیسے

نامزدش خلیفۃ اللہی میں ۔

(۲۴) اندرین عالم غریبی زان بھی گردی ملول تارخنا یا بلالت گفت باید ہر ملا

[رومی : آفتابی رفت در کازہ ہلال در تاشا کہ ارجنا یا بلال !

جان کمالست و ندای او کمال مصطفی گویان ارجنا یا بلال !

زا اختلاط خلق یا بد اعتدال آن سفر جوید کارخنا یا بلال !

حدیث کے الفاظ ہیں : ارجنا مہا یا بلال

(اذان دے کر نماز کے ذریعے ہم کو راحت و آرام دے)

(۲۵) آدمی چون بداشت دست از سیت ہرچ خواہی بکن کہ فاصنع شیت

حدیث : اِذَا كُنْتَ تَسْتَحْي فَاَصْنَعْ مَا سَأَلْتُ

سنت کو سیت باندھا گیا ہے اور ماقبل کا ما غایب ہے ۔

حافظ

(۱) چشم ہما فظ زیر بام قصر آن حور سرشت شیوہ جنات تجری تحتہا الانہار داشت

قرآن میں ہے :

جَنّٰتٍ تَجْرٰی مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہَارُ ۲۵ : ۲

اور مزید ۲۴ جگہ

اور ہر جگہ تَجْرِی کے بعد مِنْ آیا ہے ۔ جَنّٰتٍ کو جَنّٰتِ فَلَ تَنوین کے ساتھ باندھا گیا ہے ۔

نامی پریس کانپور کے نسخے میں حور سرشت ہے۔ ایک نسخے میں حوریں سرشت ہے۔ تہران کے مطبوعہ نسخوں میں کسی میں حوری سرشت اور کسی میں حور سرشت ہے۔
[رومی : رو بہ سلطان و کار و بار بین
اصل و سر چشمہ خوشی آنست آن
حس تجری تحتھا الانھار بین (ھد پرشد؟)
زود تجری تحتھا الانھار خوان (")

شمس تبریز :
تن چو سایہ بر زمین و جان پاک عاشقان در بھشت عشق تجری تحتھا الانھار ست

ولی دکنی :
چہرہ گلرنگ و زلف موج زن خوبی متیں آیت جنات تجری تحتھا الانھار ہے [ان شعروں میں بھی تجری کے بعد کا من غایب ہے۔ آخری شعر میں جنات تنوین کے بغیر صرف جنات باندھا گیا ہے شعر حافظ کی طرح۔

(۲) وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ وِزْرًا مِّنْ حَيْثُ لَا يَحْسِبُ
یہ شعر دیوان ابن مبین میں بھی پایا جاتا ہے۔ ابن مبین ہی کا شعر ہے :
چو چرخ کہن ہر دم از نو غمی نہد پیش من حیث لا یحسب
قرآن میں ہے : وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِّنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ ۳۶:۶۵
مَخْرَجًا مَّقْدَرًا وَمُخْرَفًا ہے۔

(۳) مَحْتَسِبُ خَمِ شَكْسَتْ وَمِنْ سِرَاوِ سَن بِلَسَنِ وَالْجُرُوحِ قِصَاصِ
قرآن : وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ ۲۵۰
یہاں شروع کے السِّنَّ کو صرف سِن باندھا گیا ہے بغیر الف لام تعریف کے :
(۴) چو ہست آب حیات بدست تشنہ میر فَلَائِمَتْ وَمِنَ الْمَاءِ كُلِّ شَيْءٍ حَيٌّ
[ابن مبین :

ز آب زر باشد م حیات بلی وَمِنَ الْمَاءِ كُلِّ شَيْءٍ حَيٌّ

انوری : میر آبست و حق ہی گوید وَمِنَ الْمَاءِ كُلِّ شَيْءٍ حَيٌّ

فیضی : نوشتہ اند بطاق رواق میخانہ کتابہ وَمِنَ الْمَاءِ كُلِّ شَيْءٍ حَيٌّ

وقار شیرازی :

نظم پر آیت برہل فضل عیاں کرد رمز من الماد کل شئی حی را

صفی علی شاہ :

چو آبی بود آن آبی کہ منمود جعلنا کل شی حی من الماء]

قرآن میں ہے ،

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۚ ۲۱ ۳۰

آخری شعر میں تو ترتیب الفاظ ہی اُلٹ دی گئی ہے باقی شعروں میں دَ مِنْ کے نیچ میں سے جَعَلْنَا حذف کر دیا گیا ہے۔

(۵۱) شایا رواد مار کہ مفعول من یراد گردو بہ روزگار تو فعال ما یرید ابن مبین ۔

شایا رواد مار کہ مفعول من اراد گردو بروزگار تو فعال ما یرید غالب ،

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہر لکھنؤ انگلستان کا

قرآن : فَعَالٌ لِّمَآ يُرِيدُ ۱۱ ۱۰۷

۱۶۰ ۸۵

لِّمَآ بِرُوزِنِ فَاعِلُنْ کول ما بروزن فعل باندھا گیا ہے۔

(۶) لمع البرق من الطور و آنست بہ فعلی تک آتی بشباب قبسی

قرآن : اِنِّیْۤ اَنْتَ نَارٌ اَنْتَ نَارٌ اَنْتَ نَارٌ اَنْتَ نَارٌ اَنْتَ نَارٌ ۲۰ ۱۰۰

اِنِّیْۤ اَنْتَ نَارٌ اَنْتَ نَارٌ اَنْتَ نَارٌ اَنْتَ نَارٌ اَنْتَ نَارٌ ۲۷ ۷۰

اختلاف الفاظ ظاہر و باہر ہے۔

(۷) ارچہ بعد می کشی تیغ جفت بکین من فکر نمی کنی مگر فی عمدہ عمدہ دی

[اقبال سہیل : عشق نے فاش کر دیا سر جیم کبریا ورنہ یہ خاکداں تو تھا فی عمدہ عمدہ]

قرآن : فِیْ عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ ۴ ۹۰ ۱۰۴

مُمَدَّدَةٍ کو مُمَدَّدِی ، مُمَدَّدٌ باندھا گیا ہے۔

(۸) نگارا در غم سوای عشقت توکلنا علی رب العبادی

قرآن : رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا ۶۰ ۴

عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۙ ۸۹

فرق در ولبت ظاہر ہے۔

(۹) مضمون کی پہلی مطبوعہ قسط میں ہم حافظ کے دو شعروں کا ذکر کر چکے ہیں۔
شب قدر است و طی شد نامہ ہجر سلام فیہ حتی مطلع الفجر
جہاں ہی کو حید سے بدل دیا گیا ہے۔ ایک دو نسخوں میں ہی بھی ہے جو تقطیع میں ہی محسوب ہو گا کسرہ کے
اشباع کے ساتھ۔ مگر صاحب قواعد العروض — قدر بگرامی لکھتے ہیں کہ اس بحر میں مکفوف و سالم کا اجتماع جائز ہے
یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولان — مفاعیل مفاعیلن فعولان — انہوں نے مصرع ہی کے ساتھ لکھا ہے اور تقطیع
یوں کی ہے : مفاعیل مفاعیلن فعولان — ساتھ ہی کہا ہے کہ کسی ناواقف عروض نے یہاں ناموزونی کے وہم سے
قرآن میں اصلاح دے کر بجائے ہی لفظ فیہ کا نسخہ بنایا۔ اور صحیح کو غلط کیا۔
حافظ کا ایک اور مصرع ہم نے یوں نقل کیا تھا :
اَفْتَحْ یا مَفْتَحِ الابواب

اب ایک نسخے میں دیکھا تو پورا شعروں ہے :

اَفْتَحْ یا مَفْتَحِ الابواب در میخانہ بستہ اند مگر

فیض کاشانی کے ہاں بھی یہی دوسرا مصرع یوں نظر آتا ہے :

اَفْتَحْ یا مَفْتَحِ الابواب در وصل تو می زند اجاب

در وصل تو چو بستہ ای بر فیض

بر رخم بستہ تا یکی در وصل

ہمارا استدلال حافظ کے مصرع سے یہ تھا کہ افتتاح کی ح ساکن کو بضرورت شعری تحریک دی گئی ہے۔ وہ نکتہ تو
موجودہ شکل میں ساقط ہو گیا۔ البتہ قرۃ العین طاہرہ کے ہاں مصرع کی وہی شکل نظر آتی

اَفْتَحْ یا مَفْتَحِ الابواب در وصل تو می زند اجاب

وہی فیض کاشانی والا شعر ہے صرف افتتاح کی بجائے افتتاح ہے جس سے اُس قسط میں پیش کردہ ہمارے
نکتے کو تقویت ملتی ہے۔ ویسے ”اَفْتَحْ“ کو مفعول کے وزن پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ فعلاتن کا قائم مقام
تسکین اوسط کی رو سے۔

(۱۰) مشورت با عقل کردم گفت : حافظ می بنوش
ساقیامی وہ بقول مستشار مؤتمن

[فیضی :

عقل را مستشار مؤتمنیم]

مشورت کا مستشار مؤتمن

عشق را مستفیض معتقیم

گفت پیغمبر بکن ای را می زن

رومی :

حدیث: الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَسٌ وَهُوَ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَكَلَّمْ — الْمُسْتَشِيرُ مُعَانٌ وَالْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ
دونوں شعروں میں الْمُسْتَشَارُ کا آل غایب ہے۔

عطار

(۱) سُبْحَانَ مَنْ يُمِيتُ وَيُحْيِي وَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَاءَ

(یہ شعر شیخ سعدی کے ہاں بھی ملتا ہے)

قرآن : وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ ۱۵۶. ۳

هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ ۱۰ ۵۶

الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ ۲۳ ۸۰

خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَوَاتِ الْعُلَى ۚ ۲۰ ۴۰

پہلے مصرع میں بجاے یحیی و یمیت کے یمیب و یجیب ہے اور دوسرے مصرع میں وَالسَّمَوَاتِ الْعُلَى
کی بجائے صرف وَالسَّمَاءَ ہے۔

(۲) مُوسَىٰ بِلَنْ تَرَانِي جَان سوز جریہ خورد واد تو بہ زد کہ ما کذب القلب مار آ

قرآن : مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۚ ۵۳ ۱۱

مصرع میں الْفُؤَادُ کی جگہ الْقَلْبُ ہے۔ قلب اور فؤاد میں جو ایک نازک فرق ہے وہ اس حدیثِ قدسی
سے واضح ہوتا ہے :

إِنَّ فِي الْجَسَدِ آدَمَ لَمُضْغَةً وَفِي الْمُضْغَةِ قَلْبٌ وَفِي الْقَلْبِ فُؤَادٌ وَفِي الْفُؤَادِ

ضَمِيرٌ وَفِي الضَّمِيرِ سِرٌّ وَفِي السِّرِّ أَمَانٌ۔

(۳) چو زگرس از نظارہ گلشن نگاہ داشت بشگفت در رخ گل مازاغ و ما طغا
[شمس تبریزی]

سَرِّ مازاغ و ما طغیٰ را من جزاز و از کجا بیا موزم ؟

شاہ فضل اللہ فضل :

طاق ابروی تو محراب دعای خلق است چشم حق بین ترا سر مازاغ و ما طغیٰ

ایاس برنی :

چشم حق میں کیا ہے مازاغ البصر و ما طغیٰ [

قرآن : مَا ذَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۚ ۵۳ ۱۷

پہلے تینوں شعروں میں اَلْبَصَرُ غایب ہے اور غ و ما بروزن فعلن کو غ ما = غما بروزن فعل باندھا گیا ہے۔ آخری شعر کو د کو وا اشباع کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

(۴) کاروانِ نعت میں روحی بسرِ امی تو برکشید بار

کرد تنزیہِ جلوہ در تشبیہ نعمت اللہ نعت روحی فیہ

قرآن : نَفَحَتْ فِيهِ مِنْ رُوحِي ۲۹۰۱۵

۳۸ : ۷۲

[حافظ :

تاما نعت فیہ من روحی شنیدم شد یقین بر من این معنی کہ بازان دیم وی زان ماست]

پہلے شعر میں فیہ غایب ہے اور دوسرے میں من غایب ہے اور ترتیب الفاظ بدلی ہوئی۔

(۵) فَمَتْنُوا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ سَادِقِينَ آمَدَاسْتِ در اخار

قرآن : فَامْتَنُوا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۹۴۰۲

الْمَوْتُ کی جگہ موت پڑھا جائے گا حالانکہ چپا الموت ہے۔ فَمَتْنُوا کی زبر کے اشباع کے ساتھ فَمَتْنَا بن جائے گا۔

(۶) نحن اقرب اليه آمده است دور افتادی تو از پندار

نحن اقرب اليه في القتران غوث ما و علی ماست همان

[احمد جام :

ز سر نحن اقرب باز گویم ترا از خود جدا گردانم امروز

نحن اقرب گفت در معنی خدای راہ حق را در حقیقت گوش دار]

قرآن : وَنَحْنُ اقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۱۶ : ۵۰

اقْرَبُ کو اقْرَب باندھا گیا ہے۔

(۷) کل شئی محیط می بینم آنچه می بینمش بہ نقش و نگار

قرآن : إِنَّهُ يَكُلُّ شَيْءٌ مَّحِيْطٌ ۵۴ : ۲۱

يَكُلُّ کو کُلّ (غالباً پیش کے ساتھ) باندھا گیا ہے۔

(۸) رمز من کان ہذا لاعلمی بشنود اے خزان کو دن کا

قرآن : وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ اَعْمٰی ۷۲ : ۱۷

ایک نسخے میں مصرع میں اَلَا اَعْلٰی کی جگہ اَعْلٰی بھی ہے۔ فی بہر حال غایب ہے۔

- (۹) من طلبنی وجه فی آمد است عاشقان را بدست اوست قرار
 طَلَبْنِي وَوَجَدَنِي كَو طَلَبْتَنِي اور وَجَدْتَنِي باندھا گیا ہے
- (۱۰) اما امل اللسان شود خاموش اما بطل اللسان کنذا قرار
 اَمَلْ كے اَم کو اما اور بَطْل كے بَط کو بٹا باندھا گیا ہے اشباع فتحہ کے ساتھ۔
- (۱۱) من عرف نفسه نمی فرمود گرمی دید حیدر کرار
 من عرف نفسه شود معلوم ہر کہ خود شناخت شد مخدوم
 من عرف زان گفت شاہ اولیا عارف خود شو کہ بشناسی خدا
 [نظیر اکبر آبادی: اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیا ہے اے نظیر!]
 عَرَفْتُ كَو عَرَفْتُ باندھا گیا ہے۔

(۱۲) فسبحان الذی اسری بعبدہ الی الجبوت والملكوت کلہ
 [قاآنی :

بسر از لطف حق تاجت طریق شرع منہاجت بساط قرب معراجت سبحان الذی اسری
 خاقانی :

سبحان من اسری بخاطر عبده لیلہ الی الاقصی بذی الاسراء استاد جمال الدین :

بر مسند شرع دیدہ گردون مثل تو نہ دید و الذی اسری امیر معزی :

گنم چو دیدم آسماں آراستہ چون بوستان شمس تبریزہ سبحان من اسری بنا لیلہ اتی بدر الدجا

ولكن طريق القرب افنى عقولهم فسبحان من اسرى وسبحان من اسرى
 یہ سبحان الذی اسری بعبدہ سے ظاہر ہے کہ تھی منظور حق کس رجہ ان کی عزت افزائی [

قرآن : سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا ۝ ۱۰۱
 پہلے دونوں شعروں میں یہ اضافہ ہے۔ خاقانی اور امیر معزی اور شمس تبریز نے سبحان الذی اسری

کو سُبْحَانَ مَنْ اسری باندھا ہے۔ شمس تبریز کا ادنیٰ غالباً وَالْجِبَالُ أَرْسَاهَا ۝ ۹ : ۳۲ سے مستنبط ہے۔
 استاد جمال الدین نے یہ اضافہ کر دیا ہے اگرچہ ایک دوسرے شعر میں انہوں نے صحیح باندھا ہے۔

سر تو وقت تفکر چو کند معراج عقل آسماں آواز سبحان الذی اسری ہد

اردو کے شعر میں بَعْدِہ کو مفاہیلن باندھا گیا ہے دیکو اشباع کسر کے ساتھ دی بنا کر۔
(۱۳) چون در شات افصح آفاق دم نزد لا احصی بگفت و زبان لبست ہجو لا
گفت پیغمبر کہ لا احصی شن حامد تو صم توفی یا ربنا
[رُومی :

لا تکلفنی فاقی فی الفنا کلت احبامی فلا احصی ثنا [حدیث : لا احصی ثناء علیک انت کما اثبتت علی نفسیک -
پہلے شعر میں احصی کو احصی باندھا گیا ہے اور تمینوں میں ثناء صرف ثنا ہو کر رہ گیا ہے۔
(۱۴) اے چراغِ خلد ازین مشکوۃ منظم کن کنار ثنا شوی نور علی نور کہ لم مسہ تار
[میرزادہ عشقی :

نور علی نور مبیا شدہ [قرآن : وَلَمْ تَسْسِسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلٰی نُورٍ ۲۲ : ۳۵
پہلے شعر میں نور علی نور کا ٹکڑا بجائے موخر کے مقدم ہو گیا ہے اور کو حذف عشقی نے نور کو نور باندھا ہے۔
(۱۵) اسباب رباقی شود ساقی بخود ساقی شود جان ربی الاعلیٰ کند دل ربی الاعلم زند
قرآن : رَبِّیْ اَعْلَمُ ۱۸ : ۲۲۱ ۲۸ : ۳۷
رَبِّیْ اَعْلَمُ کی جگہ شعر میں رَبِّیْ اَعْلَمُ ہے۔
(۱۶) بنمائی بخلق رخ کہ خود گفتی قول ماثور تویہ ہے : تَخْلُقُوا بِاخْلَاقِ اللّٰهِ
بما کہ تخلقوا باحسن لاتی فداک ابی و امی این ممشی
(۱۷) پہلا رکن نظر بظاہر مفاعلتن ہے۔

[حالی : اے چشمہ رحمت بابی انت و اُمّی دنیا میں ترا لطف سدا عام رہا ہے
انیس : حُر پکارا بابی انت و اُمّی یا شاہ قابلِ عفونہ تھے بندہ عاصم کے گناہ
فصیح : السلام اے جگہ فاطمہ و جان نبی انت مولائی فافدیک باُمّی و ابی]

(۱۸) شہزادہ آں قوم بیک بار دریدہ من مطلع اقبال اذا الصبح تنفس
قرآن : وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۸۱ : ۱۸
فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۹) ساحران دیدہ عصای را این گفہ آمنا برت العلین
قرآن : قَالُوا أَمَّا بَرَّتِ الْعَلَمِیْنَ ۱۲۱ : ۱۰
گفہ کی جگہ باسانی قَالُوا آسکتا تھا۔

(۲۰) شعر بر حکمت پناہی یافتست کو یوتی الحکمہ راہی یافتست
قرآن : یُوتِی الْحِکْمَةَ مَن یَّشَاءُ ۲۶۹ : ۲
یُوتِی کو یوتی اور الْحِکْمَةَ کو الْحِکْمَہ باندھا گیا ہے۔ میر درد نے بھی یونہی باندھا ہے،
سوی شعر بچشم تحقیر مبین گر ان من الشعر لحکمہ خوانی
حدیث کے الفاظ ہیں اِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِکْمَةٌ

(۲۱) زانکہ سالی وہ ہزار است ز عدد تا الست ربکم گفتست احد
قرآن : اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ۱۰۲ : ۷
پ ساقط کر دیا۔

(۲۲) فانی الحب از نوی دادہ ترا جہ حب صد نوی دادہ ترا
قرآن : قَالِیُّ الْحَبِّ وَالتَّوٰی ۹۵ : ۶
و کو از سے بدل دیا۔

(۲۳) گردانی کاین کد این منبع است قصہ بی بیصرو بی لسمع است
حدیث قدسی : مَا زَالَ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالتَّوَّاقِلِ حَتّٰی اُجِبَّہُ فَاِذَا اَحْبَبْتُّہُ کُنْتُ
سَمْعُہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصْرُہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدُہُ الَّذِیْ یَبْطِشُ بِہٖ وَرِجْلُہُ
الَّذِیْ یَمْشِیْ بِہٖ ۔

یُبْصِرُ بی اور یَسْمَعُ بی کی بی کو بجائے مونتر کے مُقَدَّم کر دیا گیا ہے۔ درمیان میں و زاید ہے
یَسْمَعُ بھی یَسْمَعُ ہے بروزن منبع۔

امیر خسرو

(۱) ہست اعتصام خلق بمنشور او کہ آن ز بخیر بیت من دخل کان آمنا ست
قرآن : اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وَّمَن دَخَلْہٗ کَانَ آمِنًا ۳ : ۹۶ : ۹۷

دَخَلَهُ كَوْدُ خَلِّ بَانْدھا گیا ہے اور بَيْتِہ کو بَيْتِہ باندھا گیا ہے نکتِ تنوین کے ساتھ۔ اور بَيْتِہ اور مَن کے درمیان فی الفاظ ساقط۔

(۲) روزہ کرم نامہ روزی دھست نامہ حرفش انا اجزی بہ است
حدیث: قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ كُلُّ عَمَلٍ ابْنِ آدَمَ لَهُ، اِلَّا الصَّيَامُ هُوَ لِي وَاَنَا اَجْزِي بِهِ۔
یہ کو رِبَہ باندھا گیا ہے۔

(۳) طاقت بہ دلم نماںد یا رب انزل لقلوبنا سکینہ
طاقت بہ دلم نماںد یا رب بغرست ز بھر من سکینہ
گویان بخدا از درد سینہ انزل لقلوبنا سکینہ
[؟ قرآن نے دیا مجھے دم صبح پیغام و انزل السکینۃ]
قرآن: اَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۲۸: ۲۸
فَاَنْزَلَ السَّكِينَةَ ۱۸: ۲۸
دُعائے رسول ہے: فَاَنْزَلْنَا سَكِينَةً عَلَيْنَا۔

تفاوت عبارت ظاہر ہے۔
(۴) کارشناسی کہ رخ از کار تافت و اربابین بکل اسفار یافت

قرآن: كَمْثِلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۶۲: ۵
اَسْفَارًا کو اَسْفار باندھا گیا ہے۔

(۵) یافته از درگہ تو فتح باب بارگہ اِن الینا ایاب
قرآن: اِنَّا اِلَيْنَا رَاٰیَا بِهِمْ ۸۸: ۲۵
رَاٰیَا بِهِمْ کو ایاب باندھا گیا ہے۔

(۶) من کنم آنچه از دلم آمد بحسب باقی الاتمام علی اللہ فحسب
[آنچه در دل من آید بآں اہتمام من کنم] لیکن اتمام موقوف بر تائید باری تعالیٰ است

حدیث کے الفاظ ہیں:
اَلَسَّعَىٰ مُسْتَىٰ وَاِلْتِمَامٌ مِّنَ اللّٰهِ
شاعر نے مَن کی بجائے عَلٰی باندھا ہے۔
[واقع لاہوری]

فرماؤ کہ بہر دوست شد دشمن کام درکنہن جوی شیر چون کرد اقدام

می گفت دمی کہ تیشہ می زد بر سنگ منی السعی ربّ منک الاتمام [آخری مصرع میں اختلاف الفاظ واضح ہے۔

(۷) نجا المحفون برخوان وکن بدان عملی کرد روی از هلك المشلون شعار بود [قرآن: اَنْفِرُوا جَعًا وَتَقَالًا ۹: ۴۲ ای مَوَسِرُونَ وَ (اَوْ) مُعْسِرِينَ]

الْمُحِفَّاتُ الْفَقِيلُ الْمَالِ الْخَفِيفُ الْحَالِ
وَأَحَفَّ الرَّجُلُ إِذَا كَانَ قَلِيلُ الْبَقْلِ فِي سَفَرِهِ أَوْ حَصَرَهُ سَبَكَار - ہلکا
مُشَقَّل - گرانبار - بوجھل

(یعنی — بہتر ہے اٹھے جتنا سبک بار مسافر — انیس)
حدیث: هَلَكَ الْمُتَقَلُّونَ وَنَجَّى الْمُخِفُّونَ - (کشف الخبیب میں اسے حَنُّ البصری سے منسوب کیا گیا ہے)
المخفون قرب وناشر کی فروگزاشت معلوم ہوتی ہے -
[سنائی:]

هَلَكَ الْمُتَقَلُّونَ بِنَوَازِدِهِ وَپَس خانہ وجنت سازم اینت ہوس
چکنم جنت حسانہ و بنیاد مونس من نجی المحفون یاد [(۸) یہ کہ شہادت کنی از حق پدید
دوسرا مصرع یوں بھی مروی ہے:

کوست گواہیت و کفی بہ شہید
قرآن: كَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا ۴: ۹۰

۲۹ ۱۰ ۱۶۶: ۴

۴۳: ۱۳

۹۶: ۱۷

۲۸: ۳۸

فرق الفاظ واضح ہے۔

(۹) از قلمت یافتہ حرف صواب جائزہ ان علینا حساب
پس بود از مے بخط و صواب

قرآن: وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۱۳: ۴۰ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۸۸: ۲۶
حِسَابُهُمْ صرف حساب رہ گیا ہے۔

[فیض کاشانی : بحاسب نفوسنا و لما اتی علینا حساب ما قدرنا بحودہ]

یہاں، الْحَسَابُ صرف حساب ہے۔
(۱۰) چو سحر دو چشم تو بینم

هَذَانِ لَسَا حِرَانِ بَخْوَانِمِ
قرآن : اِنَّ هَٰذَا لَسَا حِرَانِ ۲۰ : ۶۳

حِرَانِ کو حِرَانِ (بہ نون غنہ) باندھا گیا ہے۔
(۱۱) سرنہم برکف پایت وانگاہ

قرآن : وَكَيْفَ لُ الْكَافِرُ لِيَكُنْتِي كُنْتُ تُرَابًا ۴۸ : ۲۰
یا حذف کر دیا گیا ہے۔ متعہ و شعرا نے تُرَابًا کو تراب باندھا ہے۔
رُومی : کافران گویند در وقت عذاب

قَالَ نِي :
خاکِ اَبُو ترابست این ملک کز رشک او
آسمان گوید ہمی یا لیتنی کنت تراب
قدسیان را ذکر لب یا لیتنی کنت تراب

سلمان ساوجی :
ساقی بزمِ مت اگر بر خاک ریزد جرعه ای
زہرہ گوید بر فلک یا لیتنی کنت تراب

(۱۲) پیکیز لاہور کے ایڈیشن میں یہ شعر ہے :
از شراب شب نشینان درخار
ہات کو ہات ہونا چاہیے۔ ہات = اَعْطِ = دہ = دے = اَخْضَرُ = لا = حاضر کر

حافظ کہتا ہے :
هَاتِ الصُّبُوحَ حَيُّوا يَا أَيُّهَا السُّكَّارُ

(تشنیہ ہاتیا، جمع ہاتوا)
هَاتِ الصُّبُوحَ : (ساقیا) دے دہ ! صُبُّوحی لا !

(۱۳) اسی ایڈیشن میں یہ شعر ہے :
نشد کلُّ مدَّعٍ کذاب
ہر کہ دعویٰ کند ز خوبان صبر

سعدی :
تو باز دعویٰ پر ہیزی کنی سعدی
کہ دل بکس ندہم کل مدع کذاب

رومی : خواب می بینم و لیکن خواب فی مدعی ہستم ولی کذاب فی عراقی : نشیدہ تو این حدیث صواب از نبی : کل مدع کذاب اول تو لفظ مُدَّع ہے م کی پیش کے ساتھ۔ دوسرے کُل کا مضاف الیہ ہونے کے باعث یہ مجرور ہوگا یعنی مُدَّع۔

(۱۳) تہران کے ایڈیشن میں جو آقای سعید نفیسی کا مرتب کردہ ہے۔ یہ شعر ہے :
چہ علامت کنید خسرو را قاتلوا اللہ یا اولوا الالباب
مرتب اضافی پر حرفِ نداد داخل ہو تو مضاف کو فتح پڑھتے ہیں کیونکہ حرفِ نداد نا صیب مضاف ہے۔ اولوا
حالتِ نصبی میں اولی پڑھا جائے گا۔ لاہور ایڈیشن میں البتہ یہ لفظ صحیح چھپا ہے۔
(۱۵) بر سرِ نامہ کہ آصف نوشت قد رحم اللہ من النصف نوشت
النصف کو آصف باندھا گیا ہے۔

(۱۶) چگشت آبہا شیشہ گر گفت بلبل قواریو من فضیہ قد روہا
قرآن، قواریو من فضیہ قد روہا تقدیرا ۱۶: ۷۶
قواریو کو قواریو باندھا گیا ہے تقدیرا محذوف ہے۔

نظیری

(۱) در نہاد ما عبودیت سرشتہ از الست نقش آب و خاک ما طوعا اطعنا ساخته
قرآن، فَقَالَ لَهُمَا وَلِلَّارِضِ اثْنَيْنِ طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ۱۱: ۲۱
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

[سنائی :

چون تو راہ گلبن توبوا الی اللہ آمدی
یہاں طائعین کو طائعین باندھا گیا ہے۔
پای بر فرق اتینا طائعین باید نہاد]

(۲) بر معاندن لاف لانی بعدی زدہ دیدہ اش از سرِ مازاغ روشن کردہ اند
قرآن، قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۱۰: ۱۸ ۶: ۲۱
ما انا لا بشر نزل اجبا ساخته
منزلش در لانی بعدی معین کردہ اند

حدیث : لَا نَبِيَّ بَعْدِي۔

اِنَّمَا کو ما، بَشَرٌ کو بَشَرٌ اور نَبِيَّ کو نبی باندھا گیا ہے۔

(۳) زندہ از اوحی الی عبیدہ دل شبِ اشہ از ابیت عند ربی نزل اجبا ساختہ

قرآن : فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝ ۵۳ : ۱۰

فَأَوْحَىٰ کو اوحی اور عَبْدِ ۝ عَبْدۃ باندھا گیا ہے۔

حدیث : اِنِّیْ اَبَیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَ یَسْقِیْنِیْ (فَاَکَلُوا مِنْ اَلْاَعْمَالِ مَا لُطِیْعُوْنَ) شاعر نے یطعمنی کی جگہ عند ذال دیا ہے۔ مگر وہ اس تصرف میں تنہا نہیں۔ حدیث کے الفاظ یوں بھی مروی ہیں : اِنِّیْ لَنْتُ کَاَحَدٍ کُمُرِیْ اَبَیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِیْ۔ اس کے حساب سے شاعر پر سرِ صواب ہیں۔
سعدی : صاحب دل لا ینام قسبى همان ابیت عند ربی

رومی :

چون ابیت عند ربی فاش شد

جمال الدین اصفہانی :

(۴) خواب تو ولا ینام قسبى خوان تو ابیت عند ربی]
اقتدار تو بہ و اشک سحر کا ہیش وہ تا کند در جنب ہم مستغفرین جاساختہ

قرآن : وَ اَلْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝ ۳ : ۱۷

وَ بِالْاَسْحَارِ رُحُمَ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ ۵۱ : ۱۸

فوق الفاظ ہر ہے۔ ن کو ن (نوں غنہ) باندھا گیا ہے۔

(۵) کار عالم را کفایت کردہ از یک ماجرا ورد خود در ہر دعا رزقا کفا فاساختہ
حدیث کے الفاظ ہیں : اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ کِفَا (یا کُوتَا)
(اَللّٰهُمَّ اَسْرِ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا)

_____ اَنَّهُ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ هَدٰی رَاٰی الْاِسْلَامَ وَ رِزْقَ الْکِفَا وَ قَنَعَ بِہِ
_____ طُوْبٰی لِمَنْ هَدٰی لِلْاِسْلَامِ وَ کَانَ عِشْدُ کِفَا فَا وَ قَنَعَ
رِزْقًا کا لفظ حدیث میں نہیں۔

(۶) اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ از قہر آمد بگو شش آن این راز عرش عبدی موسیٰ نہا رسید
نار شجر زانی انا اللّٰہُ زبان گزد ایمانش از بوا دی ایمن در آورم
نعرہ انی انا اللّٰہُ ز آتش وادی رسید مال وزن بگزاشت در رہ موسیٰ عمران من
قرآن : اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ۝ ۲۸ : ۳۰
اللّٰہُ کو اللّٰہُ باندھا گیا ہے۔

(۷) چوتھی بشود عیان نظیری گویم کہ لا الہ الا
[نسیم امروہوی :

توڑا موسائیت کا چٹہ کلمہ پڑھا لا الہ الا]
کلمہ تو پورا یہ ہے :

لا الہ الا اللہ (مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ)

(۸) اخلع نعلیک گفت زان کہ نہ درخور بود حرف تقدس زدن فکر غنم داشتن
[امیر خسرو :

نعبد ایاک طہ از علم فاخلع نعلیک مقام قدم

قرآن : فَاَخْلَعْ نَعْلَکَ - ۲۰ : ۱۲

یا تو دونوں شاعروں نے (اخلع) فاخلع کی ساکت عین کو متحرک باندھا ہے یا پھر سکین اوسط کے عمل سے
مفتعلن کو بروزن مستفععلن - نظیری نے ف ساقط کر دی (بے وجہ)

(۹) غیرت من گرنہ در شکل بشر ظاہر شدی لم یکن کفوا احد نازل شدی در شان من

قرآن : لَمْ یَكُنْ لَهُ کُفُوًا اَحَدٌ ۱۱۲ : ۴

لہ کو حذف اور کفو کی مضموم ف کو ساکن کر دیا -

(۱۰) ای درھوای نعرہ طوبی لہ مآب از شوق قاتلش دل طوبی صنوبری

قرآن : طُوبٰی لَہُمْ وَ حُسْنُ مَآبٍ ۱۳ : ۲۹

فرق الفاظ ظاہر ہے -

(۱۱) بصدق دعویٰ اوحی شہادت آوردہ ز بعد اشہدان لا الہ الا الہ

ہر کہ بیند شکوہ او گوید وحدہ لا الہ الا الہ

سپہرو ہر چہ خدا آفرید سایہ تست شبیہ نیست ترا لا الہ الا الہ

تینوں شعروں میں آخری لفظ الہ ہے اللہ نہیں - اور آہنگ سے خارج ہے -
اس شعر :

ستون شرع محمد عزیز اعظم خان پناہ دین نبی پاس در قول الہ

سے مزید تصدیق ہوتی ہے کہ الہ الہ ہی ہے ، اللہ نہیں پڑھا جاسکتا - جہاں شاعر کو اللہ کہنا
ہوتا ہے وہاں شعروں چھپتا ہے :

تو خود نظیری خودی لا الہ الا اللہ ہمان کی ست کہ خود اول مسیت و خود ثانی

جامی

اہلہاں را زندہ سر از خاطر انہ عارض لہم ممطر

خان بریلوی :

نوں بہ بینند آں سحاب اینان زدور عارض ممطر بگویند از عسور
 بل ہو ما استعجلوا خزانہ عظیم ارسلت ریحاً بتغذیب الیم
 قالوا ہذا عارض ممطرنا بل ہو ما استعجلتم بہ ریحاً فیہا عذاب الیم ۴۶: ۴۷
 تفاوت الفاظ واضح ہے۔

نوم یحبہم و یحب

قرآن : یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّونَہُ ۵ : ۵۴

یُحِبُّونَہُ مصرع میں سمت کرمف یحب رہ گیا ہے۔

بکج خانہ ماندہ روز تا شب فادسلہ غدائرتہ ونلعب

شدفرش دیبا از سبزہ صحرا ارسلہ معنایرتہم ویلعب

قرآن : اَرْسَلْہُ مَعَنَا غَدًا اِیْرَتَہُ وَ یَلْعَبُ ۱۲ : ۱۲

میں تو لفظ بالکل فرق ہیں۔ دوسرے میں غدا کے علاوہ باقی الفاظ قرآن ہی کے ہیں مگر معنا کو معنا
 باہتہ اسکان ع کے ساتھ۔

یوم یطوی السماء کطی سحیل

می پسندم ازیں صحیفہ تجلی

یَوْمَ نَطْوِی السَّمَاءَ کَطِیِّ السَّجِّیْلِ یَنْکُتُ ۲۱ : ۱۰۳

تفاوت عبارت ظاہر ہے۔

قال فیہا ہدی و ارشاداً وجعلنا الجبال اوتاداً

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِہَادًا وَ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۶۸ : ۷۷

”جَعَلْنَا“ ای زاد شاعر ہے۔

طالباں را بلطف کرو خطاب گفت فاتوا الیوت من ابواب

۱۸۹ : ۲ وَ اَتُوا الْیُیُوتَ مِنْ اَبْوَابِہَا

و کو ت سے تبدیل کر دیا گیا اور ابوابہا کی ہا گرا دی گئی۔

غرق آتش جوارح و اعضا یلعن البعض منهم بعضا

قرآن، وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا ۚ ۲۹ : ۲۵

قرآن : اِنْ تَنْظُرُوا إِلَّا ظَنًّا ۚ ۴۵ : ۴۲

ظَنًّا کو اَلظَّن بنا دیا گیا ہے۔

(۹) تاجداران مبتدیان تمکین جملہ نفل اللہ فی الارضین

مصرع ثانی اس قول ماثور سے ماخوذ ہے : اَسْلَطْتُ خِلَّیَّ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ -

بعض اسے قول رسولؐ بھی کہتے ہیں (بحوالہ لغات الحدیث حصہ ۴) مگر واحد کو جمع بنا دیا گیا ہے۔

(١٠) كل ما كان عندهم يتفد وام ما عنده الى الرمد

[نظیری :

عزت تو عندنا باق نوشتہ بر نگین
 الفدا و اما عند کم نقش رخ ما ساخته

فیض کاشانی :

ماہمہ فانیسم و تو باقی مانا ینغہ و ماک باقی]

قرآن : مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ ۙ ۱۶ : ۹۶

الفاظ کا فرق واضح ہے۔

(۱۱) بر سعادات و ارض و ما فی البین قد عرضنا الامانة و ما بین

لیس فی اکون کاٹنا ما کان کاملی حملها سوی الان

فران : إنا عرضنا الأمانة على السموات والأرض والجبال فأبين أن يحملنها و

اسمفمن منها وحملها الإنسان ٤٢: ٣٣

قریٰ العاطل ہر ہے۔

(۱۲) کُشد آن سنگ سخت تو ز ادبار
تحت ناره و قدحها الاحبار

فران: (فانعو النار التي) وَقَوِّدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ٢٣٧: ٢ ٤: ٦٦

والجہازہ کو الاحجار میں وصال دیا اور بیچ میں سے التماس کو حذف کر دیا۔

(۱۴) نوس بر مدح مدح کو لم به
صفت اخیه فی و کتبه

أُخْتُ الْفَرُّوخِ الْمَلَأَتْ أَحْسَنَ الْأَشْيَاءِ

أَفْوَاهُ

دوسرا مصرع حدیث سے ماخوذ ہے لیکن ترکیب الفاظ شاعر کی اپنی ہے۔

- (۱۴) گفت و بیک قطعت عنق انجیک ساختی روز روشنش تاریک
وَيَحَلِّكَ كَوَيَحَلِّكَ اور عُنُقِ كَو عُنُقِ باندھا گیا ہے سکونِ نوبِ مضموم کے ساتھ۔
- (۱۵) اصل جنات جنة الذات است عرضها الارض والسموات است
گلشنی کان بود اوان العرض جنة عرضها السماء والارض
ذات حق را کہ جنت آئین است عرضها الارض والسموات این است
- قرآن: وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ ۳: ۱۳۳

الفاظ کا فرق واضح ہے۔

- (۱۶) تا مکنی در محیط ز آں شط رہ گفت و تو وجوہکم شطرہ
قرآن: فَوَلَّوْا دُجُوْهُكُمْ سُطْرَةً ۲: ۱۴۴
فولوا کی ف سا ق ط کر دی گئی ہے۔

- (۱۷) ان تحبوا الله فاتبعوني نیست کار از متابعت بیرون
قرآن: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِی ۳: ۳۱
فرق الفاظ کے علاوہ فاتبعونی کے فاتب کو فت تبی بہ اشباع زیر باندھا گیا ہے۔
- (۱۸) از ہمہ در صفات و ذات جدا لیس سنی کمثلہ ابد

[سنائی :

- أَعْدٌ لیس کمثلہ صمد لیس لہ، ضمد اسمعیل میرٹھی، نیست جای گفت و شبیہ و مثال
قرآن: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۲۲: ۱۱۰

سنائی نے تو شیء کو حذف کیا ہے۔ باقی دونوں شعروں میں ترتیب الفاظ بدلی ہوئی ہے۔ بلکہ آخری شعر میں تو مطبوعہ کمثلہ، مِثْلُہ پڑھا جائے گا۔

- (۱۹) قد وہ عارفان بستر قدم قطب حق صاحب فصوص حکم
شیخ اکبر کی کتاب کا نام فصوص الحکم ہے نہ کہ فصوص حکم۔ یعنی حکم معروف باللہم ہے۔
- (۲۰) بلکہ آن پیش صاحب عرفان نیست الا اعوذ بالشيطان
تعویذ یا استعاذہ قرآن سے مستخرج اعوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
قرآن: فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۱۶: ۹۸

أَعُوذُ بِاللّٰهِ كَوِ اَعُوذُ بِالشَّيْطَانِ بِنَادِيَا - تَعُوذُ فِي شَيْطَانٍ سَهْ بِنَاهٍ مَّائِي كُنِي هِي ، يِهَاهُ شَيْطَانِ
کی - بیں تفاوتِ راہ - رومی کا قول بھی کچھ اسی قسم کا ہے ، استعاذتِ خواہ از ربّ الغلیّ (أَعُوذُ بِاللّٰهِ = التَّحِيّ
الی اللہ بِ = الی)

(۲۱) حَسَدُ الْمَرْءِ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ وَانْ اعْتَادَ كَبِيرًا سَنَوَاتٍ
حدیث : اَلْحَسَدُ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ
اَلْحَسَدُ كَوِ حَسَدُ الْمَرْءِ بِنَادِيَا كُنِي هِي -

(۲۲) عِلْمُ اللّٰهِ آدَمَ الْأَسْمَاءِ كُلُّهَا أَيْ حَقَائِقُ الْأَشْيَاءِ
بعد ازان گفت ملائکہ را
ما علمنا وراء ما علمت
نہ اند ذوق ابلیسی
[قَا آ نِی :
نظیری :
رُومِی :
صنّی علی شاہ :
فانی فی الشیخ :
پیر مہر علی گولڑوی :
اسد اللہ تاج :
ہر دو کم اصل را ابہام علم اصل کو
اقبال :
نسیم امروہوی :
باعمل تھے نہ عمل ہی نے جنم پایا تھا
قرآن : وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ
قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۚ ۲ : ۳۱ ، ۳۲
عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كَوِ آخِرِی اَرْدو شاعر کے سوا باقی سب شاعروں نے عَلَّمَ الْأَسْمَاءَ باندھا ہے
یعنی حذف اسم آدم کے ساتھ۔

شیخ خود دریای علم الاسماء
اسجدوا لآدم ہم اندر شان تست
علم الاسماء آدم را گواہ آورده ام
مست آن ساقی و آن صہبیا کہ بود
متر سبجان الذی امری سستی
علم الاسماء آدم را گواہ آورده ام
مست آن ساقی و آن صہبیا کہ بود
متر سبجان الذی امری سستی
علم الاسماء آدم را گواہ آورده ام
مست آن ساقی و آن صہبیا کہ بود
متر سبجان الذی امری سستی

علم آدم الاسماء تو جب آیا تھا
عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ
قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۚ ۲ : ۳۱ ، ۳۲
عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كَوِ آخِرِی اَرْدو شاعر کے سوا باقی سب شاعروں نے عَلَّمَ الْأَسْمَاءَ باندھا ہے
یعنی حذف اسم آدم کے ساتھ۔

أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ كَوَيْلًا لَّيْسَ بِهَذَا الْأَسْمَاءِ مِنْ بَدَلٍ دِيَا هُوَ أَوْ لَا عِلْمَ
لَنَا بِالْأَسْمَاءِ عَلَّمْنَا كَوَيْلًا مَا عَلَّمْنَا وَرَاءَ مَا عَلَّمْنَا - معاً یکساں لغظاً مختلف -

پیر مہر علی نے اُسجُد وَاکْلَامَ باندھا ہے - قرآنی الفاظ ہیں :

وَاذْكُلْنَا لَكُمْ لِكَلِّكَ الشَّجْدُ وَالْأَدَمَ ۲ : ۳۴

ل کو حذف کر دیا گیا ہے اور اِسجُد وَاک کے ل کو تحریک دی گئی ہے -

(۲۳) حق آفتاب وہاں بھوسا یہ است اے دل امدایت الی الرب کیف مد الظل

قرآن : أَلَمْ تَرَ إِلَى ذَبِكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۲۵ : ۲۵

دونوں عبارتوں کا فرق ظاہر ہے -

(۲۴) شد برقع روی چو هست زلف شب آسا سبحان قدیر جبل الیل با

قرآن : وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۸ : ۱۰

جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِبَاسًا ۲۵ : ۴۷

لکم شاعر نے سا قط کر دیا -

(۲۵) خاص کہ بے خاصیت عاشقی است عام کا لانعام بود بل اضل

قرآن : أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّ هُمْ أَضَلُّ ۷ : ۱۷۹

ایک نئے میں کا لانعام کی بجائے کا نعام ہے عام کی جگہ عام ہے اور بَلَّ هُمْ کی بجائے بود بل -

(۲۶) سر آمد حسن او دوزخی شد فاعشی وجہ قطعاً من الیل

قرآن : كَانَتْهَا أَغْشِيَتْ وَجُوهَهُمْ قِطْعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۱۰ : ۲۷

فرق الفاظ واضح ہے - دوسرے مصرع کے دوسرے رکن کا وزن مفاعیلن کی بجائے مفاعلتن ہے -

(۲۷) بردرت جاکنند اہل نجات رفع اللہ قدرہم درجات

قرآن : مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۲ : ۲۵۳

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ ۶ : ۱۶۵

فرق الفاظ واضح ہے -

(۲۸) تو بہ کردی شراب خور جامی اتبع سیات بالחסنات

یہ قرآن کی ترکیب نہیں حالانکہ باوئی النظر گمان یہی ہوتا ہے - قرآن کے الفاظ یہ ہیں :

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۱۱ : ۱۱۳

يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۲۵ : ۷۷

نکلیاتِ شمس تبریز میں ہے :
 ز عشقِ روی تو روشن دل بنیں و بنات
 طراز آستینِ دلقِ تجسید (۲۹)
 قرآن : وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۝۱۱
 بیا کہ از تو شود سیاتِ تم حَسَنات
 و ما توفیقی إِلَّا بِاللَّهِ بِس
 باللہ کو بِاللَّهِمَّ با اضافہ ایم باندھا گیا ہے جس سے ہاے مکسور ہاے مفتوح میں بدل گئی ہے۔
 طاعت میں م پر جزم نہیں بلکہ شد اور زبر ہے حالانکہ شد ل پر ہوئی چاہیے تھی۔ م پر زبر سے مصرع وزن سے گر جاتا ہے۔

(۳۰) نقد عمر ز اهداں در توبہ از می شد تلف قُلْ لِّمَنْ انْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۸۰
 قرآن : قُلْ لِّمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۸۰
 شعر میں لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِذَا جَئَهُمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ
 جرم جامی صوای خوبان است حَسْبِيَ اللّٰهُ وَحْدَهُ وَكُفَى
 قرآن : حَسْبِيَ اللّٰهُ ۝۹ ۱۲۹ : ۳۹ حَسْبِيَ اللّٰهُ
 رومی : عقل قربان کن پیشِ مصطفیٰ
 مستعد آیات میں اس کے بعد صفتِ حَسْبًا ، وَلِيًّا ، نَصِيْرًا ، عَلِيْمًا ، شَهِيدًا ، وَكِيلًا ہے
 وحدہ کہیں نہیں۔

(۳۲) سوائے فلاح چو باشد شراب لعل یا معشرا لاجتہ حیوا علی الفلاح
 اذان میں حَتَّى عَلٰی الْفَلَاحِ بولا جاتا ہے۔ حافظ نے بھی حَيَّوْا استعمال کیا ہے شراب ہی کے ضمن میں
 در حلقہ گل و مل خوش خواند دوش بلبیل هاتِ الصُّبُوْحِ حَيَّوْا يَا أَيُّهَا السَّكَارَاۗءُ
 رومی : عیب باشد اول دین و صلاح لحن خواندن لفظ حَتَّى عَلٰی الْفَلَاحِ
 (۳۳) دوستان این دشمنان آن می ندانم در میان تَابِكُنَّ بِأَشْمِئَزَ النَّبِذِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
 قرآن : مُذَبِّذَيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۝۴۳
 و کو اُدیا و ا باندھا گیا ہے۔

سعدی

(۱) و ر بصد پاره ام کنی زین رنگ بنگردم کہ صِبْغَةَ اللّٰهِمَّ
 [جامی : جامہ ز غم کبود کنم چون نمی رسد جز نیل معصیت زخمِ صِبْغَةَ اللّٰهِمَّ]

قرآن : صِبْغَةَ اللَّهِ ۲ : ۱۳۸
 دونوں شاعروں نے اللہ کو اللہم باندھا ہے۔
 [جہاں نے ایک اور شعر میں بھی بِاللّٰهِ کو بِاللّٰہم باندھا ہے۔ جس سے ہم کچھ دیر پہلے بحث کر چکے ہیں۔]
 طراز آستین دلق تجرید
 وما توفیقی الا باللہم بس [

ظہیر فاریابی اور ابن مبین نے اسے صِبْغَةَ اللہی = صِبْغَةَ الٰہی باندھا ہے۔

ظہیر فاریابی : زلتست چہرہ دین را طراوت از پی آنک
 بتیغ حجت آثار صبغۃ اللہی

ابن مبین : تو نیکہ رنگ خت را بہا نیاں گویند
 کہ چشم بدر سادت کہ صبغۃ اللہی

حافظ نے البتہ صِبْغَةُ اللہ ہی استعمال کیا ہے
 با فریبین خم زنگارگون نیل فام
 (۲) یا طیف ان عذرا الجیب تجانیا
 کار بروقی مراد صبغۃ اللہ کنی
 بینی و بینک موعدا لن یتخلفا

قرآن : وَرَأَتْ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تَخْلَفُهُ ۲۰ : ۹۷
 فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَا نُخْلَفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنْتَ ۲۰ : ۵۸

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۳) وما ابرئ نفسی ولا اذکیہا
 کہ ہرچہ نقل کنند از بشر در امکان است

قرآن : وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي ۱۲ : ۵۳

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ ۵۳ : ۲۲

يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۴ : ۲۹

وَلَا اُزَكِّیْہَا آخری دونوں آیتوں سے مقتبس ہے۔

(۴) چون دل بروی دین مبرہوش از من مسکین مبر
 باہر باناں کین مبر لا تقتلوا صید الحرم

قرآن : لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۵ : ۹۵

بعد لفظ ومعنی ظاہر ہے۔

(۵) هیچ پوشیدہ از تو پنہاں نیست
 عالم السد و الخفیات

زیر و بالا نمی توانم گفت
 خالق الارض و السماوات

[انوری ،

بخدای کہ در ولایت غیب عالم السرو الحفیا تست

صفی علی شاہ :

باہمہ بے خودی و نادانی عالم السرو الحفیا تم [

دونوں ترکیبیں قرآن کی نہیں۔

قرآن میں صرف یہ ہے :

إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا تُخْفِي وَمَا تُعْلِنُ ۚ ۳۸:۱۴

قرآن میں خالق کے بعد الارض والسموات کے الفاظ بھی کہیں نہیں۔ یہ جملہ البتہ اکثر ملتا ہے : خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ (۲۴ بار)۔ سوائے ایک مقام کے (تَنْزِيلًا مِمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَاوَاتِ الْعُلَى ۲۰ : ۷) ہر جگہ سموات ، ارض سے پہلے ہے ۔

(۶) يَقْدُسُونَ لَهُ بِالْخَفِيِّ وَالْأَعْلَانِ يَسْتَبْحُونَ لَهُ بِالْعُدُودِ وَالْأَصَالِ

(عبد المجید سالک کے مجموعے ”راہ و رسم منزلہا“ میں بھی یہ شعر بعینہ موجود ہے)

[رشید الدین و طواط :

کامران فی العلو و البسطہ شادمان فی الغدو و الاصال

فلک متابع تو بالعشی والابکار جہان مسخر تو بالغدو و الاصال

قرآن : يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْعُدُودِ وَالْأَصَالِ ۲۲ : ۳۶

فرق الفاظ ظاہر ہے ۔

(۷) وَلَكِنْ مِنْ هُدَاةِ اللَّهِ أَفْلَحَ ۔

یہ قرآنی جملہ نہیں ۔ أَفْلَحَ کو أَفْلَحَ باندھا گیا ہے ۔

(۸) چنان گمش آورده اندر کسار کہ پنداری اللیل یغشی النهار

قرآن : يُغَشِّي اللَّيْلُ النَّهَارَ ۷ : ۵۴

۳ : ۱۳

شاعر نے یُغَشِّي اللَّيْلُ کو اللَّيْلُ یغشی باندھا ہے ۔

(۹) بدی رابدی سہل باشد جزا اگر مردی احسن الی یا اس

محمد علی فروغی کے مرتبہ ایڈیشن میں ”الی ما“ ہے اور عباس اقبال والے میں ”الی من“ جو درست تر معلوم ہوتا ہے ۔

قرآن میں صرف یہ ہے : وَأَحْسِنَ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۲۸ : ۷۷

حدیث میں ہے :

وَأَحْسِنَ إِلَى مَنْ آسَأَ إِلَيْكَ (وَقُلِ الْحَقُّ وَكَوْا عَلَىٰ نَفْسِكِ)

شاعر نے آخری الیک حذف کر دیا اور آساء کو آسا باندھا

(۱۰) یا غافر الذنب هل ترعد نفسك في قيد الاسارى واخوان على سرير؟

قرآن : اخوانا على سرير ۱۵ : ۴۷

اخوانا کو اخوان باندھا گیا ہے یا چھاپا گیا ہے ۔

(۱۱) اویحسب الانسان ما سلك اهتدى لا من هداة الله فهو المهدى

قرآن : مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۷ : ۱۷۸

فرق الفاظ واضح ہے ۔

(۱۲) طل عمری تصابيا ولعمری يحدث الله بعد ذلك امرا

[ابن مبین :

خروجنا مشويكباره نوميذ لعل الله يحدث بعد ذلك

قرآن : لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا ۱ : ۶۵

پہلے شعر میں اللہ يحدث کو يحدث اللہ باندھا گیا ہے ۔ دوسرے شعر کے مصرع ثانی کا دوسرا رکن بجائے مفاعیلن کے مفاعلتن ہے ۔ امرأ محذوف و مقدر ہے ۔

(۱۳) ما على العامل من لغوى اذا امرؤاكراما لكن الجاهل ان خاطبني قلت سلاما

قرآن : إِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ۲۵ : ۷۲

إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۲۵ : ۶۳

فرق الفاظ ظاہر ہے ۔

(۱۴) عليهم سلام الله في كل ليلة بمقتل زوراء الى مطلع الفجر

قرآن : سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۹۷ : ۵

فرق الفاظ واضح ہے ۔

(۱۵) گو نظر باز کن و خلقت نارنج بین ای کہ باور کنی فی الشجر الاخضر نار

و افانین علیہا جلتار علقت بالشجر الاخضر نار

قرآن : جَعَلَ لَكُمُ الشَّجَرَةَ الْأَخْضَرَ نَارًا ۳۶ : ۸۰

من کو فی اور ب سے بدل دیا گیا ہے نار کو نار اور نار سے ۔

(۱۶) طوبیٰ لمن جمع الدنيا و فرقهما فی مصرف الخیر لا باغ ولا عاد
قرآن : غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ ۲ : ۱۷۳
۶ : ۱۳۵

عید کو لا بنا دیا گیا ہے۔

(۱۷) من استخى بجاه جلیل قدر لقد اوى الى ركنٍ شديد
قرآن : اَوْ اِذْ اِوَىٰ اِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۱۱ : ۸۰

مصرع ثانی میں آؤ، لَقَدْ بن گیا ہے۔

(۱۸) آیتها الظاعنون من حق لیلی عجباً کیف تستطیعون صبرا
قرآن : اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۱۸ : ۷۲
۱۸ : ۷۵

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۹) بہ تهدید اگر برکش تیغ حکم بماند کر و بیان مُصْمُ بِكُمْ
قرآن : مُصْمُ بِكُمْ ۲ : ۱۸۰

مُصْمُ بِكُمْ کو مُصْمُ بِكُمْ باندھا گیا ہے۔

(۲۰) از آب و گل چنین صورت کہ دید است تعالیٰ خالق الانسان من طین
قرآن : اِنِّیْ خَاطِبٌ لِّشَرِّا مِّنْ طِیْنٍ ۳۸ : ۷۱
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۲۳ : ۱۲
وَبَدَا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ طِیْنٍ ۳۲ : ۷۰

فرق الفاظ واضح ہے۔

(۲۱) چنان ماند قاضی بجورش اسیر کہ گفت ان هذا لیومٌ عسیر
قرآن : هَذَا لَکَ یَوْمٌ مِّمَّنْ یَوْمَ عَسِیْرٍ ۷۰ : ۹۰

فرق الفاظ واضح ہے۔

(۲۲) وَاخْوَالِ الْعَدَاوَةِ لَا یَمُرُّ بِصَالِحٍ الْاَوَّلِیْمَزَه بَكَذَا ابِ اَشِیْر
قرآن : بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِیْرٌ ۵۴ : ۲۵
كَذَّابٌ اَشِیْرٌ کو بَكَذَا ابِ اَشِیْر باندھا گیا ہے۔

(۲۳) کاوی کہ زور مقام خود است اسفل السافلین دیو و دواست

[جوش ملیح آبادی :

گھبستہ اوج عرش بریں گے خستہ اسفل السافلیں]

قرآن : ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۵ : ۹۵

سَافِلِينَ کو اَلَسَافِلِينَ باندھا ہے۔ (احسن التقیوم کی مانند جس کی بحث پہلے گزر چکی)

شمس تبریزی

(۱) فرمود رب العالمین یا صابر انم ہمنشین اے ہمنشین صابراں ! افرغ علینا صبرنا

رُومی : دبا افرغ علینا صبرنا لاتزل اقدامنا فی ذاللحوول

قرآن : رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا ۲ : ۲۵۰

صَبْرًا کو صَبْرًا باندھا گیا ہے۔

(۲) ویل لکل ہمزہ بر زبان یہ بود ہماز را لما زرا جز چاشنی نبود دوا

قرآن : وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۱۰ : ۱۰۲

هُمَزَةٍ کو هُوَ مَزَاۃ اشباع ضمتہ اور فتح کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

(۳) شرح جدائی و در آیمختگی سایہ ونور لایتناہی و لٹن جنت بضعت مدد

قرآن : وَکُوْنُ جُنَّتَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۱۸ : ۱۰۹

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) اربا حکم تجلی البصر یعقبکم یلقی النظر یا یوسفینا فی البشر جود وایما اللہ اشترا

نہ مشتری بے نوا بل نور اللہ اشترا

[رُومی :

لب بہ بستہ ہست در بیع و شرا مشتری بے حد کہ اللہ اشترا

می کشد بالا کہ اللہ اشترا مشتری من خدا است و مرا

لے خداوند این خم و کوزہ مرا در پذیر از فضل اللہ اشترا]

قرآن : اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی ۹ : ۱۱

پہلے شعر میں اِنَّ کی جگہ بیا ہے۔ دوسرے میں اللہ، اللہ اور باقی تینوں میں اللہ پڑھا جائے گا۔

(۵) الشمس خوت والقمر نسکامع الاحدی عشر قد امکم فی یقظۃ قد ام یوسف فی الکری

قرآن: رَاقٍ رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ آيَتُهُمْ لِي سَجْدَيْنَ ۲: ۱۲
 فرق الفاظ عبارت ظاہر ہے۔

(۶) از اں خبرا کہ مریم را ندا کرد کلی واشربی و قری عینا

قرآن: فَكَلِمَیْ وَأَشْرَبِیْ وَقَرِّبِیْ عَیْنًا ۲۶: ۱۹
 مصرع یوں پڑھا جائے گا، کلمی وا اشربی وا قری عینا
 قرآن میں دُش ہے مصرع میں وا اَش۔

(۷) چو بر براق سفر کرد در شب معراج بیافت رتبه قاب قوسین او ادنی

قرآن: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۹: ۵۳

قَوْسَيْنِ (فعلان) کو قُسَيْنِ (فعل) باندھا گیا ہے۔

چو بر براق سفر کرد در شب معراج بیافت مرتبہ قاب قوس او ادنی

زبان و تن برھیدی بجزبہ جانان ز قاب قوس گزشتی بجنب او ادنی

ان دونوں شعروں میں قاب قوسین بالترتیب قاب قوس اور قاب و قوس ہو گیا ہے۔

(۸) اے بندہ باز گرد بدرگاہ ما بیا بشنو از آسمانها حتیٰ علی الصلا

اذان کے الفاظ ہیں، حتیٰ علی الصلا

نیم شب چون صبح شد آواز داند مؤذنان ایہا العتاق قوموا واستعدوا للصلا

الصلا مخفف الصلاۃ۔

(۹) قد وجدت امرأة تسلكهم اوتیت من کل شی ولھا

قرآن: رَاقٍ رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ آيَتُهُمْ لِي سَجْدَيْنَ ۲: ۱۲

رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا، تَسْلُكُهُمْ كَوْنَهُمْ لِي كَوْكَبًا، وَلَهَا كَوْنَهَا باندھا گیا ہے۔

(۱۰) کز چہرہ می نمودی لم یتخذ ولدرا

قرآن: وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ۲: ۲۵

وَلَدًا کو وَلَدًا باندھا گیا ہے۔

(۱۱) ای عشق با تو استم وز بادہ تو مستم وز تو بلند و پستم وقت دنا تدلی

[خواجہ معین الدین اجمیری]

زاند شدن دنا تدلی اَن دَارہ گشتہ قاب قوسین

احمد رضا خان بریلوی:

یہ ان کا بڑھنا تو نام کا تھا حقیقتاً فعل تھا ادھرکا تنزلوں میں ترقی افزا دنی تدلی کے سلسلے تھے

نسیم امروہوی :

آئینہ دَنَا فَتَدَلَّى تو خیر ہے پردہ اٹھائیے کہ یہ خلوت میں غیر ہے [قرآن : ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ۵۳ : ۸]

آخری شاعر کے علاوہ باقیوں نے ت حذف کر دیا ہے ۔

(۱۲) نگرہ عیسیٰ دم کہ از دوام سمنہ
چو آب چشمہ حیوان ست یحییٰ الموتی
زدم زدن کی شود ماندہ یا کی سیر شود
تو آن دم کی خدا گفت یحییٰ الموتی

قرآن : وَأَنْتَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۲۲ : ۶

(۱۳) چو بوی یوسف معنی گل از گریبان یافت
دہان کشاد بخندہ کہ ہائی یا بُشرا
قرآن : قَالَ يَا بُشْرَىٰ ۱۲ : ۱۹
شاعر نے ہائی کا لفظ بڑھا دیا ۔

(۱۴) کافراں را گفت حق ضرب الرقاب

قرآن : فَإِذَا لَقِيتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبِ الرِّقَابِ ۴۷ : ۴

فَضْرِبِ کو صَرْب باندھا ہے ۔

(۱۵) روح بخش ایں حماء مسنون را

قرآن : مِنْ حَمَاءٍ مَّسْنُونٍ ۱۵ : ۲۸

ء کو ء اور ین کو ں (نون عتہ) باندھا ہے ۔

(۱۶) باگک تسبیح بشنو از بالا
پس تو ہم تسبیح اسمہ الاعلیٰ

قرآن : سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ۸۷ : ۱

فرق الفاظ ظاہر ہے ۔

(۱۷) تشنہ را کی بود فراموشی
چون سفیر تک فلا تنسی

قرآن : سَنُقَرِّبُكَ فَلَا تَنسَىٰ ۸۷ : ۶

ہر کو اشباع کسر کے ساتھ سرائی باندھا گیا ہے ۔

(۱۸) ای یوسف صد انجمن یعقوب دید استی چو من
اصفر خدی من جوی و ابیض عینی من بکا

[امیر معزی :

طال الیالی بعد کمر و ابیض عینی من بکا
یا حَبَّذَا اِیَّامَنَا فِی وَصْلَکُمْ یَا حَبَّذَا]

قرآن : وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ ۱۲ : ۸۴

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۹) جان باز اندر عشق او چون سبط موسیٰ را بگو اذهب وربك فانتلانا قعودا ههنا

قرآن : قَاذِهِبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۵ : ۲۴

فرق الفاظ واضح ہے۔

(۲۰) سقانا ربنا كاساً دهافاً فتكرا ثم شكراً ثم شكراً

قرآن : وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَّآناً طَهُوراً ۴۶ : ۲۱

(رَانَ لِلْمُتَّقِينَ مَفَآئِرًا) — وَكَأْسًا دِهَاقًا ۸ : ۳۱، ۳۲

کاساً دہاقاً سے پہلے سَقَاهُمْ کے الفاظ نہیں سَقَاهُمْ رَبُّهُمْ مصرع میں سقانا رتبنا بن گیا ہے۔

(۲۱) فَيَادَا دَاوُدُ قَدْ رَحَلْتَ السَّيْرِدَ

اں حالون بار ذالطا لون ان داؤد قدر وافی السرد

قرآن : وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ ۳۴ : ۱۰

أَبِ اعْمَلْ سَبَّغْتَ وَتَدَّرَفِي السَّرْدِ ۳۴ : ۱۱

وَلَقَدْ بَرَدُوا الْجَلْأُوتَ وَجُنُودِهِ ۲ : ۲۵۰

فرق الفاظ واضح ہے۔

(۲۲) چولاتعاف من الکافسرين ويارا دعای نوح نبی است و او مجاہد عاست

قرآن : وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دِيَّارًا ۷۱ : ۲۶

شاعر نے لَا تَذَرْنِي کو لاتعاف بنا دیا ہے اور درمیان سے عَلَى الْأَرْضِ کو نکال دیا ہے۔

(۲۳) مونس احمد مرسل بجهان کبیت بگو شمس تبریز شهنشاه کہ احدی الکبر است

من خمش گردم ای خواجہ و نسکین زخمار

قلت لروح القدس ما هلی قل لی عجباً قال اما تعرفها تلك لاحدی الکبر

قرآن : اِنَّهَا لِاحَدَى الْكُبَرِ ۴۴ : ۳۵

پہلے دو شعروں میں ل غایب ہے اور آخری شعر میں اِثْهَا کی بجائے تِلْک ہے۔

(۲۴) چونک مشقال ذره یرہ است ذره زلہ بے نکایت نیست

قرآن : ذَرَّةٌ خَيْرًا يَرَهُ ۹۹ : ۷۱

ذَرَّةٌ شَرًّا يَرَهُ ۹۹ : ۸۰

فرق ظاہر ہے۔

(۲۵) قدر جعنا قدر جعنا جانیاً من طودکم انظرونا انظرونا نقتیس من نورکم
قرآن : اُنْظُرُونَا نَقْتِیسَ مِنْ تُوْرِكُمْ ۵۷ : ۱۳
ایک اُنْظُرُونَا زاید ہے۔

(۲۶) حیث ماکنتم فوئوا شطرہ باز جاجہ دل پری خوان تو ایم
قرآن : وَحِیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوُئُوا وُجُوْهُکُمْ شَطْرَہُ ۲ : ۱۴۴
شَطْرَہُ سے پہلے وُجُوْهُکُمْ غایب ہے۔

(۲۷) قلب میاوردنک غرہ کنی مشتری ترس زویل لکل جمع مالادعد
قرآن : وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِیْ جَمَعَ مَا لَا وَعْدَہُ ۱۰۲ : ۲۶۱
عَدَدَہُ کی جگہ صرف عَدَّ ہے اور جَمَعَ کے ح کو اشباع فتح کے ساتھ جا باندھا گیا ہے۔
(۲۸) در فتوح فحت ابوابہا گردوت دشوارھا آسان بلی

قرآن : وَفَتْحَتْ اَبْوَابُہَا ۳۹ : ۷۳
فُتِحَتْ کی ف کو اشباع ضمہ کے ساتھ فو باندھا گیا ہے۔

(۲۹) کاه راکوہ کند ذاک علی اللہ یسیر
قرآن : وَذٰلِکَ عَلٰی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۶۴ : ۷
ذٰلِکَ کو ذاک باندھا گیا ہے۔

(۳۰) نیم آن شاہ کہ از تخت بتابوت روم خالدین ابدًا شد رقم منشورم
قرآن : خُلِدْنَ فِیْہَا اَبَدًا ۹۸ : ۸
فِیْہَا کو حذف کر دیا گیا۔

(۳۱) جانم شد زینھا شک یا ذا السماء والجبک ای کلرخ وکلزار من ای روضہ وازھار من
قرآن : وَالسَّمَاوٰتِ الْخُبُکِ ۵۱ : ۷
نظم و ترتیب کلمات کا فرق ظاہر ہے۔

(۳۲) از قل الروح امر ربی فہم شد شرح جان ای جان نیاید در دہن
قرآن : قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۱۷ : ۸۵
مِنْ غایب ہے الرُّوْحُ کو الرُّوْحُ باندھا گیا ہے یا ح اُم کو حُم۔

(۳۳) بانگ آید ہر زانی زین رواق نیلگون آیت آتا بیناھا وانا موسعون فیض کاشانی :

در مقام شرح انا موسعون گنبد دوار می گوید سخن [قرآن : وَالسَّمَاءِ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ۵۱ : ۴۷ پہلے شعر میں انا اضافہ شاعر ہے۔ بآید غایب۔ اور دونوں شعروں میں کمو کو موباندھا گیا ہے۔ (۳۴) زربان حاصل کنید از ذی المعارج بر روید تعرج الروح الیہ والملائک اجمعون قرآن : تَعْرِجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ ۲۰ : ۴۰ فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۳۵) امشب صدقات می دہد شاہ انا الصدقات للمساکین قرآن : إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ ۹ : ۶۱ لِنَفَقَرَاءِ ساقط اِنما = انا اور ول = لیل (۳۶) یومئذ مسفرہ ضاحکہ بود چنان ناعمر لسیعہا راضیہ بود چنین

قرآن : وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ صَاحِكَةٌ ۸۰ : ۳۸ : ۳۹ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ تَاغِيَةٌ تَسْعِيهَا رَاضِيَةٌ ۸۸ : ۹۷ شعر کا وزن مفتعلن مفاعلن ہے اس لیے مُسْفِرَةٌ کو مُسْفِرَةٌ پڑھنا پڑے گا۔ (۳۷) زیستون رحیقاً نوش می کن دخل ذا التحدث یا کلیمی قرآن : يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَّخْتُومٍ ۸۳ : ۲۵۰ مِنْ تَرَحُّوتٍ کو مَرَحِيقاً باندھا گیا ہے۔

(۳۸) کہہ کنزاً کنزاً مخفياً فاجبت بان اعرف برای جان مشتاقان برغم نفس اتارہ حدیث قدسی : قَالَ دَاوُدُ : يَا رَبِّ لِمَاذَا خَلَقْتَ الْخَلْقَ ؟ قَالَ كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا مَا خَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِكَيْ أُعْرَفَ۔ [حق تعالیٰ خواست کہ صنع خود ظاہر کند عالم آفرید خواست کہ خود را ظاہر کند آدم را آفرید]

فرق الفاظ ظاہر ہے۔ (۳۹) ایک تو اشتاب کم کن صبر کن گرچہ فرمود است کہ الانسان عجل قرآن : وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ۱۷ : ۱۱

- کَانَ غَایِب ہے اور عَجُوَ کو عَجُول سے تبدیل کر دیا ہے۔
- (۴۰) چُون لَا تَأْسُوا عَلٰی مَا فَاَتَاكُمْ فَتُكْمَلُوا مِنْهُ دَامَ ، دَانِه
قَالَ لَا تَأْسُوا عَلٰی مَا فَاَتَاكُمْ مِنْهُ دَامَ ، دَانِه
قرآن : لَکِنِّیْلَا تَأْسَوْا عَلٰی مَا فَاَتَاکُمْ ۝ ۵۷ : ۲۳
- دونوں شعروں میں لَکِنِّیْلَا صرف لَآ ہے اور پہلے میں فَاَتَاکُمْ 'فَات'۔
- (۴۱) خاموش کن ای خاسر انسان لفی خسر از گلشن دیدار بہ گفتار رسیدہ
قرآن : اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ ۱۰۳ : ۲۰
اَلْاِنْسَانُ کَا اَل (تعریف کا) غایب ہے۔
- (۴۲) چُون یُخْرِجُ حٰی مِنْ مِّیْتٍ عِیَانُ شَدَّ جَمَادِ مُرْدَةٍ شَدَّ صَاحِبِ عَنَاقِ
قرآن : یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمِیْتِ ۝ ۶ : ۹۵
۱۰ : ۳۱
۳۰ : ۱۹
- یُخْرِجُ کو یُخْرِجُ ، الْحَیَّ کو حَیَّ ، الْمِیْتِ کو مِیْتِٹ باندھا گیا ہے۔
- (۴۳) چہ فرمود است حق کا صلح خیر رهاکن ماجرا را ای بیگانہ
بوی رسالت رسید روضہ رضواں مہید صلح کن الصلح خیر کوری دیو لوند
قرآن : وَ الصَّلٰحُ خَيْرٌ ۝ ۴ : ۱۲۸
- پہلے شعر میں وَ الصَّلٰحُ کَا الصَّلٰح اور دوسرے میں الصَّلٰح باندھا گیا ہے۔
- (۴۴) بخوان مستر آن نسوی تا بنانہ
قرآن : بَلٰی قَادِرِیْنَ عَلٰی اَنْ یَّسَوِّیَ بَنَانَهُ ۝ ۷۵ : ۴
- نَسَوِّیَ کو نَسَوِّیَ باندھا گیا ہے۔ تا اضافہ شاعر ہے۔ تا کی ضرورت
نہیں تھی نَسَوِّیَ بنانہ سے وزن پورا ہو جاتا ہے و اور ی کے اشباع کے ساتھ۔
- (۴۵) رحابینہم آید ہمجو آیم چون اشدّاء علی الکفر بود پولایم
قرآن : اَشَدّٰٓءُ عَلٰی الْکُفَّارِ دُحَمَآءُ یَلٰٓئِنھُمْ ۝ ۴۸ : ۲۹
- اَلْکُفَّارِ کی بجائے الکفر استعمال کیا گیا ہے اور دُحَمَآءُ کَا ءُ حذف کر دیا گیا ہے۔
- (۴۶) اسی شمس تبریزی کہ تو از پردہ شب فارغی لاشرقی ولا غریبی اکنون سخن کو تہاہ کن
زانکہ لاشرقیہ بود است ولا غریبہ زانکہ شرق و غرب باشند در زمین و در زمان

قرآن : لَا شَرْقِيَّةَ وَلَا غَرْبِيَّةَ ۲۴ : ۳۵

فرق الفاظ واضح ہے۔

(۴۷) یَرْزُقُونَ فَرَحِينَ بِخَوَرِمْ اَنْ مِی وَنَعْتَلْ مقعد صدق چون شد منزل عشاق کن

قرآن : یُؤْزِقُونَ ۳ : ۱۶۹

۲۰۰۲۰

فَرَحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۳ : ۱۷۰

دو مختلف آیتوں کے الفاظ کو ملا دیا ہے۔

(۴۸) اِی سَنَاقِی رُوْمِدُوْا اَز رُوْا نِ مُصْطَفٰی مصطفیٰ ما جاء الا رحمة للعالمین

قرآن : وَمَا رَسَلْنَاكَ اِلَّا مَحْمَدًا لِلْعَالَمِیْنَ ۲۱ : ۱۰۷

ما جاء اضافة شاعر ہے۔

(۴۹) شَرابش دہ بخوابانش برون براز گلستانش کہ تاد در گردن او فردا ز غم جیل مسد بند
از بولب و جفتی او چونک ببرم ببینم ز خود جیل مسد را بکلیدہ

قرآن : فِيْ جَيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۱۱۱ : ۵

دونوں شعروں میں حبل مِّنْ مَّسَد کی بجائے جیل مسد ہے۔

(۵۰) آنکہ باشد بر زبانحال احب الافلیں باقیات الصالحات است آنکہ دل حال است

[حالی :

چھوڑ جائیں گے جہاں میں جو کہ تجھ جیسے نشان چھوڑ جائیں گے وہی کچھ باقیات الصالحات

احسن مارہروی :

اے مسلمانوں کی عزت بخش یونیورسٹی تو ہے ایسے نیک دل کی باقیات الصالحات

قرآن : وَ اَلْبَاقِيَّاتُ الصَّالِحَاتُ حَيْثُ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا - ۱۸ : ۴۶

۱۹ : ۷۶

تینوں شعروں میں و الباقیات کی جگہ صرف باقیات ہے۔

سنائی اور عطا کرنے و الباقیات کی جگہ الباقیات استعمال کیا ہے

سنائی :

ای چون ملک ای چون پری برسامری کن ساحری
تا بر تو خواہم یک سری الباقیات الصالحات

عطار :

ذکر باقی را بزرگانِ عمر ثانی خوانند اند
 ایں ذخیرہ بس تو را اباقیات الصالحات
 (۵۱) فی ہا و خاصہ شکر بر طبع ایں بسہ کمر
 قصاں شدہ در نیستان یعنی تعز من تشا

عطار :

شاہ یک روزی بدو گفت ای عقل و تعز من تشاء و تدل

پیر مہر علی شاہ :

انت تہدی انت تضلل من تشاء انت تعز زانت تدل ہو کرا

انت تہدی من تشاء و تضلل من تشا

قرآن : وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ۳ : ۲۶
 پہلے شعر میں تشاء کو تشا باندھا گیا ہے دوسرے میں ذیل کو ندل
 اشباع کے ساتھ و ا باندھا گیا ہے۔ تیسرے کے مصرع ثانی میں قرآنی مفہوم کو انت تعز زانت تدل کے
 الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔

پہلے دونوں مصرعے اس آیت سے مستخرج ہیں :

تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ ۷ : ۵۵ - فرق بین ہے۔

(۵۲) باز کنی صد درو گوئی بار آ فاتی اصباحی و رب الفلق

قرآن : فَالْعَصْبَاح ۶ : ۹۶

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۱۱۳ : ۱

الاصباح کی جگہ اصباحی ہے۔ رُبِّ کی جگہ رُبِّ۔

(۵۳) الف بد رحول بدری سجداً خروالہ طیبو ماحولنا واستشرقوا دیجورنا

قرآن : وَ خَرُّوا لِمُحَمَّدٍ ۱۲ : ۱۰۰

ترتیب الفاظ تبدیل شدہ ہے۔

(۵۴) سومی بحر و چو ماہی کہ بیافت در شاہی چہ بگوید او چہ خواہی تو بگو ایک فارغ

احمد رضا خان بریلوی :

وَ اِلَى الْاِدْلَہ فارغ کو و عرض سب کے مطلب

کہ تمہیں کو تکتے ہیں سب کرو ان پہ اپنا سایہ بنوشافیع خطایا

قرآن : وَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَارْجِعْ ۙ ۹۳ : ۸

فرق الفاظ دونوں شعروں کا واضح ہے ۔

امیر خسرو نے البتہ قرآنی الفاظ کو بعینہ استعمال کیا ہے

منہم و قامت شاہد بروای خواجہ مآذن

تو در مسجد خود زن و إِلَىٰ رَبِّكَ فَارْجِعْ

(۵۵) اقسم بالعادیات احلف بالمورسات غیوک یا ذا الصلات فی لطری کالمدنا

قرآن : وَالْعَادِيَّاتِ صَبِيحًا فَالْمُورِيَّاتِ قَدَحًا ۙ ۱۰۰ : ۲۶۱

و اورت کو دونوں جگہ ب سے بدل دیا گیا ہے ۔

(۵۶) یا من ولی انعامنا ثبت لنا اقدامنا ای بے توراحت ہا عنای بی تو صحت یاقم

قرآن : وَ ثَبَّتْ اَقْدَامَنَا ۙ ۲ : ۲۵۰

۱۳۷۰ : ۳

لنا اضافہ شاعر ہے ۔

(۵۷) زمین لرزید ای خاک پر آن قدس و آن پاکی اذا ما زلزلت برخوان نظر را در زلازل کش

قرآن : اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ ۹۹ : ۱

زُلْزِلَتْ کی ت کو ساکن باندھا گیا ہے اور ماقبل 'ما' کا اضافہ کر دیا گیا ہے ۔

(۵۸) مارمیت اذرمیت ہم ز خداست تیر ناگہ کزین کمان آید
[مارمیت اذرمیت از شکارستان غیب می جھاند تیرهای بے کمان اے عاشقان]

قرآن : مَا رَمَيْتَ اِذَا رَمَيْتَ ۙ ۸ : ۱۷۰

پہلے شعر میں پہلے رَمَيْت کو رَمَيْت باندھا گیا ہے یا پھرت اِذَا کو تہذ ۔

(۵۹) انا منذرا بآیتهم انا صوت بلاانا صورة فی سراجة نورا الارض والسماء

قرآن : اِنَّ لِلّٰهِ نُوْرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِثْلُ نُوْرِهِ كَمِثْلُوْرٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ

فی سراجة ۙ ۲۴ : ۳۵۰

فرق الفاظ ظاہر ہے ۔

(۶۰) ربنا اتمم لنا یوم التلاقی نورنا ربنا واغفر لنا ثم اکسنا ذاك الغفار

قرآن : رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا ۙ ۶۶ : ۸۰

بیچ میں یوم التلاقی کے الفاظ شاعر نے ڈال دئے ہیں ۔

(۶۱) چوں در سخن با سفت و الارض مجاہدا گفت
 قرآن: اَلَمْ نَحْغَلِ الْاَرْضَ مِمَّا دَا ۶ : ۷۸
 و اضافہ شاعر ہے۔

(۶۲) صلا برجہ کہ ان اللہ یدعوا غریبی را رہا کن رو بخانہ
 قرآن: وَاللّٰهُ يَدْعُوْا ۲ : ۲۲۱ ، ۱۰ ، ۲۵
 مصرع اولی میں و کی جگہ را ت ہے۔

(۶۳) سماح آمد رباح از قول یزدان کہ عشقی بہ ز صد قنطار، بر حب
 السّماحُ رِباحٌ وَالْعُسْرُ شُومُ

مگر یہ قول یزدان نہیں
 رومی نے بجا کہا ہے: تا بگفتہ مصطفیٰ شاہ نباح
 (۶۴) یارب ظلمت نفسی بر در حجاب حتی
 قرآن: قَالَتْ رَتِّبِيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ۲۷ : ۲۴
 دبت ، یارب بن گیا ہے اور ما بعد کا راتی غائب

(۶۵) جاء ربك والملائك چون رسید بر محال اکنون شدہ امکان ، یلی
 قرآن: وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلٰٓئِكُ صَفًّا ۸۹ : ۲۳
 وَالْمَلٰٓئِكُ کو وَالْمَلٰٓئِكُ باندھا ہے اور رَبُّكَ کو رَبُّكَ ۔

(۶۶) من الکلیم ولا والرب قد تجلی انی آنست ناراکن هکذا جیبی
 قرآن: رَاٰی اَنْشَتْ نَارًا ۲۰ : ۱۰ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹
 آنشت کو آنشت باندھا ہے۔

(۶۷) ما غریبان فراقیم اے شہان بشنوید از ما الی اللہ المآب
 [جامی : بحر بقای توئی و عالم بر آب منک العبد والک المآب
 قرآن: اِلَیْهِ اَدْعُوْا وَاِلَیْهِ مآب ۱۳ : ۳۶

پہلے شاعر نے اِلَیْهِ مآب کو الی اللہ المآب باندھا ہے اور دوسرے نے اِلَیْک المآب ۔
 (۶۸) سروچہ ماند بخسی ؟ زر بچہ ماند بمسی ؟ تو بچہ مانی بکسی ؟ ای ملک یوم الدین
 قرآن : مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۱ : ۳
 مَلِکِ کو مَلِکِ باندھا گیا ہے اور یوم الدین کو تسکین اوسط کے عمل سے
 مفعول کے وزن پر۔ یعنی مفعول کو مفعول سے بدل دیا گیا ہے جس میں بظاہر کوئی حرج نہیں۔

(۶۹) بسم اللہ ابتدای کلام من الیعتین رحمن والرحیم ترسم لیا طبعین

دارند ہر کسی بتو چشمِ ترحمی رحمن والرحیم بہ بخش و خطا میں
قرآن : بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱ : ۱
۲۷ : ۳۰

الرَّحْمٰن کو رحمان باندھا ہے اور اس کے بعد کا اضافہ شاعر ہے۔

رومی — مثنوی

مثنوی پر دوبارہ نظر ڈالی تو چند شعر اور نظر آئے جو پہلے جائزے میں سہواً نظر انداز ہو گئے تھے۔

دفتر اول

(۱) گفت طوبی من رانی مصطفیٰ و الدی یبصر لمن و جہب یری

یُبْصِرُ کو یُبْصِرُ باندھا گیا ہے۔ الدی کے ل کی بجائے ا پر زبجے یا یلجیب! سہاوی
(۲) هكدا تعرج و تنزل دأشما ذافلا ذالت علیہ قائما

قرآن : مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا - ۲۰۳۲

إِلَّا مَا دُمَّتْ عَلَيْهِ قَائِمًا - ۷۵ : ۳

تَعْرُجُ اور تَنْزِلُ کو تَعْرُجُ اور تَنْزِلُ باندھا گیا ہے۔ باقی اختلاف الفاظ دونوں مصرعوں کا ظاہر ہے۔

(۳) چون پی یسکن الیماش آفرید کی تواند آدم از حوا برید

قرآن : وَ جَعَلَ مِنْهَا ذَوِّ جَمًا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا - ۱۸۹ : ۷

لِيَسْكُنَ کو یَسْكُنَ باندھا گیا ہے۔

(۴) زان امام المتقین داد این خبر گفت اذا جاء القضا عی البصر

آدم اتو نیستی کو راز نظر لیک اذا جاء القضا عی البصر
سبقت را بر کند یک قدر تا بدانی کا لقدر یعنی البصر

سنائی : من ممتی کردم حذر از عشقت ای شیرین لپس آخر در آمد دل بسر جاء القضا عی البصر

امیر معزی : قل ان حالی ذو خطر والقول فیه مختصر جاء القضا عی البصر شكر الهام منعما

رُومی:

مرجا یا مجتبی یا مرتضی
هست هر چندین فنون های قصص
جمله گفتند ای امیر با خبر
حکیم

شمس تبریز :
برخار پشت هر بلا خود را مزین تو هم هلا
سناقی :

تنگ شد برافضای عافیت بے هیچ حُرم عقل می گفت این اذا جاء القضاء ضاق القضاء
اینچنین باشد اذا جاء القضاء ضاق القضاء
جان می گفت اذا جاء القدر ساء الحذر
اذا جاء القدر عی البصر (یا غشی البصر) ————— قولِ عی

وإذا قدر لم يغن الحذر يوم ما قدر لم أخشى الردى
إذا دخل القدر بطل الحذر

(۵) عَمِيَ النَّصْرُ كَوِشَامِرٍ نَعَمَ يَلْ اسْكَا نِمْ كَسَا مَحْمَدٌ بَانَدِهَا هِيَ ۔
 اَنْ جَادِي گشت از فضلش لطيف كلّ شي من ظريف هو ظريف
 هُوَ كَوِ هُوَ بَانَدِهَا گيا هِيَ ۔

(۶)
عطار : چون ابیت عند ربی قاشش شد
یطمع ولیستی کنایت ز اش شد

گر نیابی تا ابد بوی طعم
قوت طعمی و یقینی تمام
قربان علی ساک :

حدیث طعمنی یسقی ہی کافی ہے دِلِ قُربِ خداوند بے عیال و ہمال
 قرآن : هُوَ يَطْعَمُنِي وَيَسْقِيَنِي ۲۶ : ۷۹

حدیث: اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَ یَسْقِیْنِیْ۔ (نظیری کے ذکر میں اس حدیث کا بیان گزر چکا ہے)۔ رومی نے یطعمنی و یسقینی کی جگہ یطعم و یسقی استعمال کیا ہے۔ ساک نے یسقینی کی جگہ یسقی۔ عطار نے یطعمنی کی مُم کو مَ باندھا ہے۔

(۷) همچو گرگ آن شیر بر در اندیش
فانقنا منقسم بر خواندش

قُرْآن : مَا تَقَمَّنَا مِنْهُمْ

۴۹ : ۱۵

۲۵ : ۴۳

۵۵ : ۴۳

مِنْهُمْ کو مِنْهُمْ باندھا گیا ہے تحریک م کے ساتھ۔

(۸) گفٹ الیس اللہ بکاف عبده تانہ گردو بندہ ہر سو جیلہ جو

قُرْآن : اَلَيْسَ اللّٰهُ يَكْفِي عِبْدًا ۳۶ : ۳۹
اللہ کو اللہ باندھا گیا ہے۔ اَلَيْسَ بھی وزن میں لیس ہی پڑھا جاتا ہے کیونکہ و کے ساتھ وزن پہلے رکن کا بجائے فاعلاتن کے فاعلتن بن جاتا ہے۔ ویسے ایک لحاظ سے اسے شاعرانہ رخصت بھی کیا جاسکتا ہے

(۹) بو میلہ را لقب کذاب بود مر محمد را اولوالالباب بود
ماند ماند

اولوالالباب جمع کو واحد استعمال کیا گیا ہے۔

چوں عقل شریف حضرت بیش از حد زیاد بود
شخص شریف شان بنا بقاعدہ واحد کا لائف

بر منزلہ جمع تنزیل و اولوالالباب — صاحبان عقلیہ ، ارباب عقل — نامیدہ شد
ایسے ہی جیسے اولوالالعزم اور اولی الامر (اولوالامر) کو واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سودا :

جیسے کہ کیے اولی الامر ہے حسین شہید امام برحق و معصوم پاک از اجداد

فیض احمد فیض :

ہراک اولی الامر کو صدا دو

انیس :

آؤں طرف رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم
خبر کی خبر لائے مری طبع اولوالالعزم
سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں کے زیر
دادا شجاع باپ اولوالالعزم ہم دلیر
(کاشف الحقائق میں اولوالالعزم کی جگہ جو انور درج ہے)

میر بنس :

جانباز، سرفراز، اولوالعزم، نامدار شایستہ، شیر دل، سمن اندام، بربار

میر نفیس :

عالی مانغ شیر اولوالعزم قلعہ گیر ذی مرتبت سپہروغا کا مہ منیر

جعفر طاہر :

ذی قدر، اولوالعزم، جگہ دار، سخن سنج

(۱۰) اطلب المعنى من الفرقان وقل لا فئوق بين آحاد الرسل

قرآن : لَا تُفْزِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ دُؤْلِهِ ۚ ۲۸۵ : ۲

فرق الفاظ ہر ہے۔

(۱۱) أَبَشِّرُوا يَا قَوْمِ إِذَا جَاءَ الْفَرْجُ افرحوا یا قوم قد نال الحرج

سوی نچیران دویڈ آن شیر گیر کابشردوا یا قوم اذ جاء البشير

قرآن میں أَبَشِّرُوا کا لفظ صرف اس آیت میں استعمال ہوا ہے

وَأَبَشِّرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۚ ۳۰ : ۴۱

اس مصرع کا ماخذ انوری کا یہ شعر معلوم ہوتا ہے :

البشروا یا اهل نیشا بور اذ جاء البشير کاندرا آمد موب میمون منصور وزیر

تاج الدین سمرقندی کا بھی شعر ہے :

وقت مولود تو آمد این ندا از جبرئیل البشروا یا اهل نیشا بور اذ جاء البشير

احمد جام زندہ پیل کا شعر ہے :

بوی خلقش تمازہ گردانید عیسیٰ را نفس

زان نفس بر خلق پیدا کردہ قد جاء البشير

دفعہ دوم

(۱۲) ما کران بسیار یکن در کمین ما کران و دان و هو خیر الماکرین

قرآن : وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۚ ۵۴ : ۳

۳۰ : ۸

وَاللَّهُ کی جگہ و هو ہے جسے وَهُوَ باندھا گیا ہے۔

[احلی شیرازی : ہر جا کہ بستند ز مکر و مشورت ناسخ ز تو
مگر حق جانش ستد و اللہ خیر الما کرین]
(۱۳) در خبر خیر الامور اوسطها

[ابن عیینہ :
وسط گزین کہ گزیدہ است سید عربی بدین حدیث کہ خیر الامور اوسطها
حدیث : آمُرُ بَيْنَ اَمْرَيْنِ وَ حَيْثُ الْاُمُورِ اَوْسَطُهَا (اوسطها)
اوسطها کو اوسطها پڑھا جائے گا۔ اُمُور کی ر کو ساکن ژ۔
گفت یزدانت فَمِنْكُمْ مَوْمِنٌ باز مِنْكُمْ كَافِرٌ وَ كَبِيرٌ كَهْن
(۱۴) قُرْآن : فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَ مِنْكُمْ مَوْمِنٌ ۹۲ : ۴
نشت الفاظ کا اختلاف مبہون ہے۔

(۱۵) قول ان من امة را یاد گیر تا بہ الا و خلا فمیب نذیر
قُرْآن : وَ اِنَّ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا سِدْرٌ ۲۴ : ۳۵
ان سے پہلی و کو الّا اور خلا کے درمیان میں خواہ مخواہ دھانس دیا ہے اور اسے بروزن و ا
باندھا ہے اشباع فقہ کے ساتھ۔

(۱۶) پس عدم گردم عدم چون ارغون گویدم کاتا الیہ راجعون
قُرْآن : اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۱۵۶ : ۷
وَ اِنَّا كُو كَا تَا باندھا ہے۔

دفتر سوم

(۱۷) اجعل الخضر لامری سببا ذاك او امصى واسرى حقبا

قُرْآن : فَاتَّبَعَ سَبَبًا ۹۲ : ۸۹، ۸۵، ۱۸

اَوْ اَمْضَى حَقْبًا ۶۰ : ۱۸

حَقْبًا کو حَقْبًا یا باندھا گیا ہے۔
سَبَبًا کو سَابِیَا ، اَمْضَى کو اَمْضَى اور

آخرون السابقون باش ای ظریف
(۱۸)

[عطار : لا جرم گفت آن رسول ذوقنون

اونبی بود از درون و از برون

شمس تبریز : گر آخر آمد عشق تو گرد ز اولها فزون

بر شجر سابق بود میوه لطیف
رمز سخن الاخرون السابقون
قال نحن الاخرون السابقون
بنوشت توقعت خدا کا الاخرون السابقون]

قرآن : وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۱۰۰ : ۹ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۱۰ : ۵۶

حدیث : نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ -

پہلے شعریں رومی نے الْآخِرُونَ کو اخروں اور السَّابِقُونَ کے ن کوں (نوں غنہ) باندھا ہے۔

(۱۹) دست شد بالای دست این تا کجا تا بہ یزداں کہ الیہ المنتہی

[احمد رضا خاں بریلوی :

نیست خون از غیر تو بل غیر تو خود یس نیست یا الذالٰحق اٰلِک المنتہی امداد گن]

قرآن : وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ ۲۲ : ۵۳

إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَا هَا ۲۲ : ۴۹

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۲۰) بر جہد آن کشہ را آسپش ز جا در خطاب اضر بوہ بعضہا

قرآن : فَقُلْنَا أَضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۴۳ : ۲

بِ ساقط ہے۔

(۲۱) من غلیم تو پس پریش بچک سر بنانی ارانی اذ بچک

قرآن : إِنِّي أَذِي فِي الْمَنَامِ إِنِّي أَذْبَحُكَ ۱۰۲ : ۳۷

أَذِي إِنِّي کو ادائی باندھا ہے۔

(۲۲) ثمالثا تا از تو بیرون رفتہ ام گویا ثالث ثلاثہ گفتہ ام

قرآن : لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۴۳ : ۵

ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ کو ثالث ثلاثہ باندھا گیا ہے۔

(۲۳) سابع از ثامن ندانم ضالہ ام خون ہی گریہ فلک از نالہ ام

قرآن : وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۷۳ : ۹۳

ضالہ کا وزن فاعلن ہے جب کہ اسے فاع باندھا گیا ہے لفظ ضالّا ہے نہ کہ ضالّہ ، جو کہ

صال کا مونث ہے۔ ضالّہ کے معنی گمشدہ چیز کے ہیں (الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ) جبکہ

صالّا (ضالّ) کے گمراہ ، گرشتہ کے۔

ثنوی ہی کا شعر ہے : زین سبب کہ علم ضالہ مومنست عارف ضالہ خود است و موقنست

دفتر چہا سرہ

(۲۴) تا بگوید چون ز چاہ آئی پیام جان کہ یا بشری لی ہذا غلام

- قرآن : قَالَ يَا بَشْرَى هَذَا اَعْلَامُ ۱۹۰۱۲
بَشْرَى کے بعد لی اضافہ شاعر ہے جسے لی پڑھا جائے گا۔
(۲۵) تیرہ کردی رنگ دادی در نہاد ایں بود لیسون فی الارض فساد
قرآن : وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۵ : ۶۲
فساد کو فساد باندھا گیا ہے۔
(۲۶) حاصل آنکہ کم مکن ای بی سرور غیضی واللہ اعلم بالصّدور
بمجنیں ہمراہ بد دوری گزین زینہار اللہ اعلم بالیقین
ذَان : اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِيْنَ ۲۹ : ۱۰
پہلے شعر کے مصرع ثانی میں لیس اللہ یا علمہ بما فی صدور کو واللہ اعلمہ بالصّدور
باندھا گیا ہے اور دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں یا علمہ کو اعلمہ۔

دفتر پنجم

- (۲۷) ایں آلم وحمّ ایں حروف چون عصای موسیٰ آمد در وقوف
این الم وحمّ ای پدر آمد است از حضرت خیر البشر
معلوم نہیں پہلے مصرعوں کی تقطیع کیسے ہوگی؟
اور پھر آلم حم حضرت خیر البشر سے نہیں بلکہ خالق بشر کی طرف سے آئے ہیں۔ اقبال کا شعر ہے :
حمد بے حد مر رسول پاک را آنکہ ایمان داد مشیت خاک را (پس چہ باید کہ
حمد کا لفظ صرف خدا کے لیے مخصوص ہے اور ایمان دینے والا بھی وہی ہے۔ رسول صرف بشارت دینے والا
ڈرلنے والا اور خدا کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے والا ہے۔ شعر وادین میں ہے۔ نیچے
درج ہے : (خواجہ عطار بہ تغیر لفظی)۔ تغیر یہی ہے کہ ”خدا“ کو ”رسول“ سے بدل دیا۔
(۲۸) یاریت در تو فتراید فی درو گفت حق ان تنصروا اللہ ینصُر
قرآن : اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ۴ : ۷۴
اللہ کو اللہ اور ینصروکم کو ینصرو باندھا گیا ہے۔
(۲۹) فی تو اعطیناک کوثر خواندہ ای پس چرا خشکی و تشنہ ماندہ ای
قرآن : اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۱۰۸ : ۱۰
آنکوثر کو صرف کوثر باندھا گیا ہے۔
(۳۰) عقل را با عقل دیگر یار کن امر شوری مینغم را کار کن

قرآن: اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ۚ ۳۶:۲۲ اَمْرُهُمْ كَوْصِفِ اَمْرٍ بَانْدھا کیا ہے۔

دفتر ششم

(۳۱) در نبی بشو بیا نش از خدا آیت اشفقن ان یحملنہا
قرآن: قَائِلَیْنِ اَنْ یَّحْمِلُنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا ۚ ۲۰:۳۳ فرق الفاظ ظاہر ہے۔

دفتر اول میں ہے: خود زبیم ایں دم بے غمتا باز خوان قَائِلَیْنِ ان یحملنہا
قَائِلَیْنِ کو قَائِلَیْنِ باندھا گیا ہے۔

(۳۲) کیست کز ممنوع گردو متنع چونکہ الانسان حر یص ما منع
بودشان حرص لقای متنع چون حرص است آدمی فیما منع

حدیث: اَلْاِنْسَانُ حَرِیصٌ عَلٰی مَا مْنَعَهُ
اِنَّ ابْنَ اَدَمَ حَرِیصٌ مَّا مْنَعَهُ
در میانی علی غایب ہے۔

خاقانی

(۱) اصلہا ثابت صفات آن درخت فرعہا فوق الثریا دیدہ ام

قرآن: اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۚ ۲۳:۱۲
ثابت کو ثابت باندھا گیا ہے فی السماء کو فوق الثریا سے بدل دیا گیا ہے۔

رومی: شد درخت کڑھم مقام حق نما اصلہ ثابت و فرعہ فی السماء

اَصْلُهَا اَصْلُهُ ہے، ثابت ثابت، فرعہا فرعۃ اور السماء سماء

(۲) ہاتھ ہمت کسی ان بیشک آواز داد

قرآن: عَلٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ ۚ ۷۹:۱۷ ک کو ک باندھا گیا ہے۔

(۳) لا تلومونی و لو موأ النفسکم انما المعشوق فینا مختلف

قرآن: فَلَا تَلُومُوْنِیْ وَ لَوْ مُوَاۤءِیْ نَفْسُکُمْ ۚ ۲۲:۱۳

لَوْ مُوَاۤءِیْ نَفْسُکُمْ مصرع میں لَوْ مِّنْ فَوْسُکُمْ پڑھا جائے گا۔

(۴) از من آموز دم زدن بصبر و دم مستغفرین بالاسحار

[خواجہ کرمانی :

بسوز و ساختن صابرین فی الافات باہ و زاری مستغفرین بالاسحار]

قرآن: وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِأَلْسِنَتِهِمْ ۱۷۰: ۳

وَالْمُسْتَغْفِرِينَ كَوْنُ مُسْتَغْفِرِينَ بَانْدھا گیا ہے۔

(۵) رضیت بما قسم اللہ لی وفوضت امری الی خالقہ
لقد احسن اللہ فیما مضی کذلک یحسن فیما لقی
یہ شعر کلیات شمس تبریزی میں بھی ہیں۔ اور دونوں میں کہیں تصریح نہیں کہ یہ اشعار حضرت علیؑ سے منسوب ہیں
پہلے شعر کا مصرع ثانی اس آیت سے مستخرج ہے،
وَأَفْوضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۲۴: ۴۰

چوتھے مصرع میں ل کو لی اور میں کو سی اشباع کفر کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

سورۃ زلزال سے مستخرج حضرت علیؑ سے ایک اور نظم بھی منسوب ہے،

إِذَا هَزَلَّتْ سَاعَةٌ بِأَلْسِنَتِهَا
لَيْسَ الْخَبَالُ عَلَى سُرْعَتِهِ
وَتَنْفَطِرُ الْأَرْضُ مِنْ تَفْخَةٍ
وَلَا بُدَّ مِنْ سَائِلٍ قَائِلٍ
تُحَدِّثُ أَحْسَارَهَا رَتَّهَا
تَرَى النَّفْسَ مَا عَمِلَتْ مُحَضَّرًا
وَذُلْزَلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا
كَمَثَرِ السَّحَابِ تَرَى حَالَهَا
هَذَا لَكَ تَحْرِيجُ أَعْمَالِهَا
مِنَ النَّاسِ يَوْمَئِذٍ مَالِهَا
وَذُبُّكَ لَا شَكَّ أَوْحَى لَهَا
وَلَوْ دَرَّةٌ كَانَتْ مِثْقَالَهَا

قرآن: إِذَا دُزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا
يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بَانَ ذَلِكَ أَوْحَى لَهَا يَوْمَئِذٍ يَقْدِرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا
أَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۱۰۹۹-۱۱۰۰

(۶) یحییٰ صفات بروچ یا سین و ختم او من ینکر المہمیں ان یحییٰ العظام

[جامی:]

منکر حشر را شود روشن
قدت را پایہ گردوں خرامی
سر یحییٰ العظام و ہبی رمیم
لبت را مایہ یحییٰ العظامی

استاد جمال الدین:

لصنع فایض یحییٰ العظام و ہبی رمیم . بقهر صاعقه کل من علیہا فان

حسرت:

پوچھا اعجاز سے تیرے جو سیمائے سخن قال حییت عطا ما ہی قد کان رمیم

میر تقی میر:

وہی احیا کن عظامِ رمیم وہی رحماں وہی رؤف و رحیم
 قرآن: قَالَ مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۚ ۳۶: ۷۸
 خاقانی نے اَنّ يُحْيِ الْعِظَامَ باندھا ہے اَنّ يُحْيِ الْمَوْتِی ۳۶: ۳۳ - ۷۵: ۳۰ کے قیاس پر
 جامی اور جمال الدین کے شعروں میں وہی کو وہی باندھا گیا ہے۔ جامی نے دوسرے شعروں العظام
 کو العظامی باندھا ہے۔

(۷) برزبان ان نعبد الاصنام را ندیم تا کنون دل بانی لا احب الا فلین شد رہبرم

قرآن: قَالَ لَا أُحِبُّ الْاَعْدَاءَ ۚ ۶: ۷۰
 اتنی کا اضافہ کر کے ن کوں (نوں غیر مفلوظ) باندھا گیا ہے۔

(۸) نظربرد زبرت چتر جاء نصر اللہ اجل دھد بعد زھر مالھم من و اق
 قرآن: اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ ۱۱۰: ۱
 جاء کو جاء بچھا پایا گیا ہے۔

وَمَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۱۳: ۳۲
 من اللہ مصرع سے غایب ہے۔

(۹) ایلھم تا فضلہ ماء الحمیم بر لب مومن جہاں خواہم فشانہ

قرآن: لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ اَلِيمٌ ۶: ۷۰
 ماء الحمیم کی ترکیب شاعر کی خانہ ساز ہے۔

(۱۰) ملک ہر آئند آئین کند کہ بخشش را دعوت قد سمع اللہ دعوتی و اجاب

قرآن: قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ تَوَلَّی ۵۸: ۱۰

اُجِیْبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَا ۲: ۱۸۴

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۱۱) اگر نہ فضل تو فریاد من رسدیم است کہ قتل من کند او وقت خشیتہ الاملاق

جمال الدین اصفہانی:

دست جودت چنان بر فشانہ است کز جہان برد خشیتہ الاملاق

قرآن: وَلَا تَقْتُلُوا اِذَا دَاكُمْ خَشِیَّةٌ اِمْلَاقَ - ۱۷: ۳۱

دونوں شاعروں نے املاق پر ال کا اضافہ کر دیا ہے حالانکہ بادی النظر اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

(۱۲) آورده روزنامہ دولت در آستین مہر ش نہادہ سورہ والنجم اذا ہوی
قرآن : وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝۵۳
مصرع میں ہر اور ل کی دونوں زیروں میں سے ایک کو ساقط کرنا پڑے گا اسے وزن سے نہ گرنے
دینے کے لیے۔

(۱۳) حسب رزق از خدای دارم و بس حسبنا اللہ و حدہ ابدہ
چون تمسکت بحبل اللہ از اول دیدند حسبنا اللہ و کفی آخر انشا بینند
[نشاط اصفہانی :

عاشقان را عشق بس باید کفیل حسبنا اللہ ربنا نعم الوکیل

احمد رضا خاں بریلوی :

کسیت مولائے بہ از ربّ جلیل حسبنا اللہ ربنا نعم الوکیل [

قرآن : وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝۳۰
نشاط اور بریلوی نے ذکر حذف کر کے بیچ میں سر بتنا کا اضافہ کر دیا ہے۔ خاقانی نے وحدہ ابدہ
کے الفاظ بڑھا دئے ہیں۔

[اقبال :

ما ہمہ خاک و دل آگاہ دوست ما ہمہ شمس کن کہ جبل اللہ دوست [

مگر جبل اللہ کے ساتھ قرآن میں وَاعْتَصِمُوا

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ ۝۳۰-۱۰

اور عَزَّوَاللَّهِ الْوُثْقَىٰ کے ساتھ استمسک .

فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۝۲۶-۵۶ ، ۲۲: ۳۱

(۱۴) اگرچہ ہر چہ عیال مند خصم منند جواب ندہم الا انہم ہم السفہا

قرآن : أَلَا أَنفَعُ هُمُ السُّفَهَاءُ ۝۲۰-۱۲

آخری غایب ہے۔ دوسرے مصرع کی تقطیع یوں ہوگی ،

جواب ند ہم لا = ہملا

(۱۵) ولی خصم تو غصص جنت و سقر اند کہ ایں ندای قد افع شنود و آں قد خاب

قرآن : قَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَىٰ ۝۲۰-۶۴

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝۲۳-۱۰

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى
وَقَدْ حَاتَ مِنْ أَفْتَرَى
أَفْلَحَ كُو أَفْلَحَ بَانْدَهَا گِیَا ہے۔

۸۷ : ۱۳

۹۱ : ۹

۲۰ : ۶۱

(۱۶) قنوت من بہ نماز نیاز دین است کہ عافنا و قنا شرما قضیت لنا

(۱۷) مصرع ثانی پر باوئی النظر قرآن کی آیت کا گمان ہوتا ہے۔
معقودہ گرد از اثبات دلیل نفی لا تدركه الابصار

قرآن : لَا تَدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۱۰۳۰۶

۸ کے بعد تن کا اضافہ محض حرف مکرر ہے۔ دونوں ہی واحد غایب کی ضمیریں ہیں۔

(۱۸) دعائے غفرم و اکنون پناہ من بخدا ست ایہ ادعوا بر خواندم و ایہ انا ب

قرآن : إِلَيْهِ أَدْعُوا وَإِلَيْهِ مَأْب ۱۳ : ۳۶

مآب کی جگہ انا ب چھپا ہے حاشیہ میں مآب اور مآب بھی لکھے ہیں۔ مگر مآب نہیں جو اصل لفظ ہے۔

(۱۹) فردان چاراند و ملکست دو یزدان و قران و کعبہ و تو (تحفة العراقین)

مُصَعْفٰی : یوں پھر آخر کو دو کوں سے کہا یعنی جو طفل ہو فتران پڑھا

میر تقی میر : مت مانیو کہ ہو گا یہ بیدرو اہل دین

انیس : جو حرف قرآن کا ہے وہ ہے لایق تعظیم

[مرزا غلام احمد :

بجدا هست اس فتران مجید از دھان خدای پاک و وحید (دُشمنین)]

قرآن بروزن فعلان کو زبان و بیان کی طرح بروزنِ فَعول باندھا گیا ہے۔

(۲۰) آسمان بردرش رکوع آورد گفت سبحان ربی الاعلیٰ

سبحان ربی الاعلیٰ تو حالتِ سجدہ میں پڑھتے ہیں و ردِ رکوع سبحان ربی العظیم ہے۔

(۲۱) گویم کہ چھار اساسِ عمرت چون سبع شداد باد محکم

[ظہیر فاریابی : ہمیشہ تاکہ بتقدیر صنع بی علت بود فراختہ اس چار طاق سبع شداد

محمد حسین آزاد : ترے مصالحِ حکمت جو دیویں استحکام جاب بحر ہوں رشکِ بروج سبع شداد

ہیں ایک دم میں بدلتے جہاں کے سورنگ عجب بنا پہ ہے بنیا و قصر سبع شداد

اہلی شیرازی: چشمہ آبی کہ شد جمع در و ہفت بحر صورت تیغ علی است منبع سبع شداد
 عربی: خدا یگانہ از آنگونہ سر بلندم کن کہ ہمتم بکند ہمہری بسع شداد
 فطیری: دو بار سبۃ الوان کشیدہ در ہر روز چو نزل سبع مٹانی زخوان بسع شداد [قرآن: وَبَيِّنَّا فَوْقَكُمُ سَبْعًا مَّيِّدًا ۱۲۰: ۷۸
 شاعروں نے سَبْعًا مَّيِّدًا کو سبع شداد میں ڈھال دیا ہے۔
 (۲۲) این نام بر سر دو جہان حجت مفسر کو نامہ نیست عروہ و ثقی است لا انقصام
 قرآن، فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْعِصَامَ لَهَا ۲۵۶: ۲
 تغیر الفاظ ظاہر ہے۔

فیض کا شانی

- (۱) شد قرشق و ساعت اقربت نقد ساعات صرف ساعت کن
 قرآن: اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَالشَّيْءُ الْقَمَرُ ۵۴: ۱
 فرق الفاظ واضح ہے۔
- (۲) کند طلوع چو خورشید ماحی الاعلان چہ جای نور سنا برق یدھب الابصار
 قرآن: يَكَادُ سَنَآ بِرَاقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ ۲۴: ۲۳
 بَرَاقِهِ کو روق اور بِالْأَبْصَارِ کو صرف ابصار باندھا گیا ہے۔
- (۳) دل بے چارہ چون افتاد درین ورطہ نخست روز و شب و رومی اخرج منها می کرد
 قرآن: قَالَ اخْرِجْ مِنْهَا ۷: ۱۸
 یا تو شاعر نے بج کو ج باندھا ہے یا پھر فعلاتن کو
 فعلاتن = مفعولن کے وزن پر تسکین اوسط کے عمل سے۔
- (۴) کیفن کی الارض بعد الموت را نظارہ کن تاعیان گردد تر البعثی کہ حشر اکبر است
 قرآن: وَيُنَزَّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي الْكَارِثَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۳۰: ۲۴
 فرق الفاظ واضح ہے۔

- (۵) فیض از خود اگر بہرہی نری ان للمتقین حسن مآب
قرآن : وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ۳۸ : ۲۹
لَحُسْنَ کو حُسْنَ باندھا گیا ہے
[گفتش مُرد فیض در غم تو گفت طوبی لہم و حسن مآب
قرآن : طُوبٰی لَہُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ۱۳ : ۲۹]
اسم واحد کے لیے ضمیر جمع غایب لائی گئی ہے۔
(۶) طوبی لہم کہ سربرہ او فکندہ اند بشری لہم کہ از دو جہان پاکشیدہ اند
قرآن : لَہُمُ الْبُشْرٰی ۱۰ : ۶۲ ۳۹ : ۱۷
لَہُمُ الْبُشْرٰی کو بُشْرٰی لَہُمْ باندھا گیا ہے۔
(۷) شہو عشق زنجوای سخن اقرب مست جنود زہدینا دون من مکان بعید
قرآن : اُولٰٓئِكَ بُنَادُوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِیْدٍ ۴۱ : ۲۲
مَکَانَ کو مَکَانَ باندھا گیا ہے۔
(۸) ولیس ذلک الا لمن زجاد غدی ولیس ذلک الا لمن یخاف و عید
قرآن : قَدْ کَثُرَ بِالْقُرْآنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیدَ ۵۰ : ۲۵
مَنْ کو لَمَنْ باندھا گیا ہے۔
(۹) اِن نحن عصینا فیہ معترفونا غفرانک یا رب لنا غیر بعیدی
قرآن : غُفِرَ اَنتَکَ رَبَّنَا ۲ : ۲۸۵
رَبَّنَا، یا رب بن گیا ہے۔
(۱۰) یا من صواقرب لی من جبل الوریدی فی جبک فارقت قریبی و بعیدی
قرآن : وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۵۰ : ۱۶
الورید، وریدی بن گیا ہے۔ باقی فرق بھی واضح ہے۔
(۱۱) از سبھا گزاشتہ اندر جب خرقوا لِحْجِبِ اِرْتَقُوا الْاَسْبَابَ
قرآن : فَلِیْرْتَقُوا فِی الْاَسْبَابِ ۳۸ : ۱۰
فرق الفاظ ظاہر ہے۔
(۱۲) ہریدی سرزند از من ہمہ از من باشد لیس ربی ولہ الحمد بظلام عبید
قرآن : وَآتَ اللّٰہُ لَیْسَ بِظُلَامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۳ : ۱۸۲ ۸ : ۵۱ ۲۲ : ۱۰

میر کو مراد للعید کو عبید باندھا گیا ہے۔
 کو خلیلی کہ رو بحق آرد لا اجبی بما سوا گوید (۱۳)
 قرآن: لَا أُحِبُّ الْأَفْلَیْنِ ۶: ۶ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔
 مگر تو مارا برائی از در خود مانا منک من ولی واق (۱۴)

قرآن: مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ ۱۳: ۳۷
 ولا ساقط ہے۔

ہم تو مارا نگاہ دار از خود مانا منک ربنا من واق (۱۵)
 قرآن: مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ۱۳: ۳۴ مَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ۲۱: ۲۱
 فرق الفاظ ظاہر ہے۔

تایاد گاری از فیض ماند گفتار او را مایسٹرون کن (۱۶)
 اس غزل میں شاعر نے لَا یَقْفَهُونَ ، لَا یَعْقِلُونَ ، ہم یخپرون ، لَا یَبْصُرُونَ ،
 مایسٹرون ، مَا یَعْقِلُونَ سب کے نون معن کو نون غتہ باندھا ہے ، دوسرے شعرا کی طرح۔
 تعالوا الی فیض فیض سنا برقم تخطف بہ الابصار نمش ہمودہ (۱۷)
 قرآن: یَا کَاذِبُونَ یَخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ ۲۰: ۲
 یَا کَاذِبُونَ سَنَأْتِیْهِ یَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ ۲۴: ۲۴

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

مستم زندہ ای لا الہ الا هو مستم زبراہی لا الہ الا هو (۱۸)
 این مستی من ز لا الہ الا هو جانم بہ فدای لا الہ الا هو

دیدیم جمال لا الہ الا اللہ دیدیم جمال لا الہ الا اللہ
 از دوزخ و بہشت آزاد شدیم جستیم وصال لا الہ الا اللہ
 دونوں رباعیوں میں اللہ کو اللہ باندھا گیا ہے اقبال کی طرح

چو گویم مسلمانم بلرزم
 کہ دانم مشکلات لا الہ را

کردہ بانفس و باہوا غزوات ہزموا الجند قاتلوا الاحزاب (۱۹)
 قرآن: جُنْدٌ مَّا هُنَا لَكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ۳۸: ۱۱

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲۰) خدا گواہ و ملائک گواہ و دانایاں کفی بہم شہدا لا الہ الا هو
قرآن: وَالْمَلٰٓئِکَةُ بِشَہَدُوْنَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا ۱۶۶: ۴
فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲۱) مَا مِنْ اَحَاطٍ بِکُلِّ شَیْءٍ وَالْکُلُّ اَحْصٰی اَنْتَ الْجَمِیْعِ
قرآن: وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیْہِمُ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ۲۸: ۴۲
ہر کچھ کو بی کمال باندھا گیا ہے اشباع کسر کے ساتھ۔

تآانی

(۱) وز سلیمان جنت اللہ کو خطای نادی چسیت القینا علی کرسیہ ثم انا ب
بر سلیمان قریش ازیک ترک استثنائود سر القینا علی کرسیہ ثم انا ب
قرآن: وَ اَلْقِیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا اَثَمًا اَنَاب ۳۳: ۳۸
ثَم سے پہلے جَسَدًا کو شاعر نے حذف کر دیا۔ (استثنا: انشاء اللہ گفتن)

(۲) زمھر روی تو بریدہ ام نہ حب وطن اگرچہ دانی حب الوطن من الایمان
وجود ادوطن جان عارفان خداست بدو گرای حب الوطن من الایمان
قول ماثور: حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْکَلَامِ

اَلْوَطَنِ کو اَلْوَطَنِ باندھا گیا ہے اسکان نوں ممتحرک کے ساتھ۔

(۳) ادعوک راجیا و انا ربک فاستجب یا من یحب دعوة داع اذا دعا
قرآن: اُجِیْبْ دَعْوَةَ دَاعٍ اِذَا دَعَا ۱۸۶: ۲

اُجِیْبْ کو یُجِیْبْ اور دعان کو دعا باندھا گیا ہے۔

(۴) فاستغفری لذنبک یا نفس واهتدی بالله ان ربک یهدی لمن یشاء
قرآن: وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ ۲۹: ۱۲

وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۲: ۲۱۳ (آٹھ جگہ اور)

وَاللّٰهُ کو باللہ ان ربک سے بدل دیا گیا ہے اور مَنْ میں ل کا اضافہ کر کے اے

لَمَنْ بنا دیا گیا ہے اور آفری ء غایب ہے شروع شعر میں و کی جگہ ف ہے۔

(۵) شعاع روی ترا دید در مشیت حق چہ گفت گفت الا ان هذه لعجاب

والدی فی کعبہ الکفار لما ابصرہا . کلمہ الحصاء قالوا انه شیء عجیب
 گاہ می گفتم کہ خورتیدہا . تہ گردوں را نہ اصل
 باز می گفتم نہ عاشا نہ شیء عجیب

[گرائی :

شاعر خاص شهنشاهم و لیکن مفلس
انه حرف غریب انه شی' عجاب
موج درامی و فاکان نمک کنج شکر
انه رمز غریب انه سنی' عجاب

سپرکاشانی :

آب و آتش گردیدستی بر آید تو امان برق و باران مرا بین ای سخی عجیب!

قرآن، اِنَّهٗ لَشَيْءٌ عَجَازٌ ۝ ۵

تینوں شاعروں نے کسی "کوئی" باندھا ہے سقوطِ ل کے ساتھ۔

(٦١) الذى ردت اليه التمسر، والسق القمر كان امياً ولكن عدده ام الكتاب

قرآن، وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ۱۳: ۳۹

اس آیت کا پہلا کلمہ ہے، یَتَحَوُّ اللہُ مَا یَشَاءُ وَ یُتَبِّتُ

۸ کے ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ یعنی اُمُّ الْکِتَابِ خدا کے پاس ہے۔ شاعر اسے رسولِ اُمّی کی طرف منسوب کرتا ہے (ویسے وہ اس اقتساب میں تنہا نہیں)

(۷) و گریختی باشد مران بقمش از آنکس
خدا می گوید اَمَّا الْيَتِيمَ لَا تَقْهَرْ

حدائق کوکتا ہے : وَاَمَّا لِيَسْتَمَّ فَلَا تَقْهَرُ ۙ ۙ ۙ

شاعر نے دونوں فٹ اڑا دیے۔ پہلا تو خیر۔ لیکن درمیان کا نہیں اڑایا جاسکتا تھا۔

(٨) مصطفى فرمودان الناسى الذى اصف
حاصلش يعنى لد والتموت وابتنوا للخراب

— برایید برای مرگ بسازید برای خراب شدن

صیف کی جگہ صیوف یا اسیاف کا محل تھا۔ لدو الموت و ابو الخراب کے الفاظ حضرت آدم

کی طرف منسوب ہیں۔ منقول قول یہ ہے: كُونُوا رِی الدُّبَا اَضْبَا

(۹) بر رخ دوزلف مشک فشان چون فکند یار
شاهدت یلتین علی طر فی النهار

قرآن : دَاقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَرُفَا مِّنَ اللَّيْلِ ۝ ۱۱۴ ۝

شاعر نے طوفانی کو طوفانی باندھا ہے۔

سلمان ساوجی

(۱) بزم اجابت ہمدجات عدن حال دین روز اعدایت ہمہ یوماً عبوساً قطریہ
[احمد رضا خاں بریلوی:]

یا طلیق الوجہ فی یوم عبوس قطریہ یا بھیج القلب فی یوم الاسی امداد کن
قرآن: یَحْتِ عَدْنٍ تَجْبِرُ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ حُلْدِینَ دِیہَا ۲۰: ۷۶
یَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِیًّا ۷۶ ۱۰

قطریہ کو قطریہ باندھا گیا ہے۔ عدن کے بعد خالدین ہے۔ درمیان کی
عبارت غائب۔ "خالدین" بھی "دِیہا" کے بغیر ناممکن ہے۔
(۲) تادمای دولت را از سر امن و امان من کنم اندر اناء الیل و اطراف النہا
قرآن: وَمِنْ أَمَاءِ اللَّیْلِ فَسَبَّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ ۲۰: ۱۳۰
آناء کو آناء باندھا گیا ہے اور د کو صرف و۔

(۳) تاندر بستہ نہ گردی ملول نصر من اللہ وفتح قریب
قرآن: نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِیبٌ ۶۱: ۱۳
نَصْرٌ کو صرف نصر باندھا گیا ہے۔

(۴) این آن اساس نیست کہ گرد و خل پذیر لوکت الجبال و انشتت السما
علم تراچہ پاک و لو بست الجبال ملک تراچہ وہم و لو دکت السما
[سنائی بردار بود کہ دوستی او بود بجای مابست الجبال و ما انشتت السما]

قرآن: وَخِیلَ الْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَدُکَّتْ دُکَّةً وَاحِدَةً ۶۹: ۱۲
کَلَّا إِذَا دُکَّتِ الْأَرْضُ دُکَّاً دُکَّاً ۸۹: ۲۱
فَلَمَّا نَجَلَى رَبُّهُ لِّلْجِبَلِ جَعَلَهُ دُکَّاً ۷۴: ۱۳۳
وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۵۶: ۵
فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ ۵۵: ۳۷
إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۸۴: ۱۰

دکت الجبال اور دکت السماء کے مجملہ قرآن میں نہیں پہلے شعر میں فَا داک کی جگہ ہے اور تیسرے میں وما
عزیمینوں سے غایب ہے۔

(۵) نوح را در سکر اگر عبداً شکور اگفت، گفت اذرایت سعیکم مشکوراً ادر هل اتی

قرآن ، دَکَانَ سَعْنُکُمْ مَشْکُورًا ۲۲۰ : ۷۶

اِذْ رَاٰیْتُ — شاعر کے اپنے الفاظ ہیں۔

(۶) ہر صبح فرستند و سان ریاحین بردست صبا غالیہ خیرات حسان را

قرآن ، فِیْہِنَّ خَیْرَاتٌ حِصَانٌ ۷۵ : ۷۰

خَیْرَاتٌ کو حیدرات اور حِصَان کو حِصاں باندھا گیا ہے۔

(۷) ہمہ عقل و روحست و روحی لیدیہ ابا معشر الناس صلوا علیہ

قرآن ، یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَیْہِ ۳۳ : ۵۶

ایا معشر الناس شاعر کی اپنی ترکیب ہے۔

(۸) وبقی وجہ کل ذوالجلال شش شدہ باقی وجہ لایزالش

قرآن ، وَیَقْبِیْ وَحْدَہُ ذَکَ ذُو الْحَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ۵۵ : ۲۷

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۹) بدل رسید سمرگاہ در معتمام حضور ندای آیت استغفر و از رب غفور

قرآن : وَاسْتَغْفِرْ وَاللّٰہُ ۲ : ۱۹۹ ، ۳ : ۷۰ ، ۲۰ :

اسْتَغْفِرْ وَاَرْبَکُمْ ۱۱ : ۵۲

۱۱ : ۹۰

۷۱ : ۱۰

استغفروا کے بعد ز (مِنْ) نہیں آسکتا کیونکہ طلب بابِ اسْتِفْعَال کی خاصیات میں شامل ہے۔

لیکن اگر ز یہاں 'ے' ، 'منجانب' کے معنی میں ہے تو درست ہے۔

(۱۰) صورت اقبال ترا بر جبین اِنَا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا

قرآن : اِنَا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۳۸ : ۱

مُبِیْنًا کو مُبِیْن باندھا گیا ہے۔

شعر کی تقطیع یوں ہوگی :

مفتعلن مفتعلن فاعلات

مفتعلن مفتعلن فاعلات

بقول صاحب قواعد العروض : جو لوگ دوسرے مصرع کے پہلے رکن کو بھی مفتعلن کے وزن پر

پڑھتے ہیں وہ اِنَا کے الف ساکن کو بلا قاعدہ حذف کر کے عبارت قرآنی کو غلط کرتے ہیں ؟

- (۱۱) بقادیکہ سادات بے ستون برپاست بقدرتش و علیٰ کل مایشاء قدير
 قرآن: عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۱۶۵: ۳ (جگہ ۳۲)
 وَهُوَ عَلَىٰ جَنبِهِمْ إِذَا لَشَاءٌ قَدِيرٌ ۲۹: ۴۲
 شئی کی جگہ شاعر نے مایشاء کے الفاظ رکھ دیے ہیں۔
 (۱۲) تاملانک بر فلک منشور حکمش خواندہ اند ز اختران ہر دم ندا سمعاً و طاعاً می رسد
 [رومی]

بود مغلوب او بہ تسلیم و رضا گفت سمعاً طاعاً اصحابنا
 قرآن: سَمِعًا وَاطَّعًا ۲۸۵: ۲
 ۷: ۵
 ۵۱: ۲۴

- فرق الفاظ ظاہر ہے۔
 (۱۳) بہوی رحمت و غفران بدرگاہ آدمیم اینک گنہ گار و نخل فاغفر لنا یا رب وارحمنا
 قرآن: فَاعْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۱۰۹: ۲۳
 یا سب کے الفاظ شاعر کے ہیں۔

فیضی

- (۱) صنمی در دل مایافتہ راہ نحن لا نعبد الا اياه
 قرآن: اَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ ۶۴: ۳
 فرق الفاظ ظاہر ہے۔
 (۲) اللہ انج سیک الاعلیٰ الاحبل ما کان للانسان الا ما سعى
 قرآن: وَ اَنْ لِّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۳۹: ۵۳
 اَنْجَح کو اَنْجَح باندھا ہے اور لیس کو ما کان میں تبدیل کر دیا ہے۔
 (۳) رفتم و ماندہ دل و جان بردت قد جعل الجنة مشواها
 جعل کے جمع کو حقا باندھا گیا ہے اشباع فتح عین کے ساتھ۔
 قرآن میں مشوی کا لفظ تنہا صرف جہنم کے ساتھ آیا ہے ۴۰: ۳۹، ۱۵۱: ۳۰، ۲۲: ۴۱، ۱۶۸: ۴، ۲۳: ۴۱، ۱۶: ۱۲، ۲۹: ۴۰، ۷۸: ۲۹، ۷۸: ۳۹، ۳۲: ۳۹

ضمیمہ فی باب و عائب بمسکلم کی اضافت تمسکی کے ساتھ مطلق ٹھہرنے پر بالمش اور قیام کے معنوں میں
میں مذآیا ب: مَتَوَاكُم ۵۷ ۱۹ متواذ ۱۲ ۱۲ متوای ۱۲ ۲۳

(۵۱) درد س کا د علم لدن در س عیب ثوان

امیر حسرو: عقل حل است علم لدن فی عارفان

صاحب ز نور علم لدن فی نہ از رو تعلیم
(۱۰) صاحب: علم لدن واقف اسرار غنی

چنانکہ هست بدانہ حقائق اشیا
مال کونین سے ہے قلب مظہر آگاہ

خود خدا پیدا کنند علم لدن
بہر چہ بستی در علم لدن

زومی: اسے رادر دست بردار از سخن

از چہ رو دیگر می گوئی سخن

اس نے البتہ من لدن بھی باندھا ہے:

حوش مدارا کن یہ عقل من لدن

ای ترا الطاف علم من لدن

تا بدانی سر علم من لدن

بسیاست حاکم جاہل صبر کن

باز آمد کان محمد عفو کن

کسب کن سعی نما و جہد کن

شمس تبریز کے یاں بھی دونوں ترکیبیں ملتی ہیں:

قصصای خضر و علم من لدن

یا تشنہ حق از علم لدن؟

۶ ۲۷ من ساقط کر دیا ہے۔

چوں بسوزد پردہ دریا بد تمام

کی سیر شود ماسی ز تری

قرآن من لدن ۱۱ ۱

(۵۱) مردم تیغ تو قضا کردہ نقش انت حدید مک با سئل شہید

قرآن وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ كَأْسٌ سَدِيدٌ ۵۷ ۲۵

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۶۱) جاں من و سلسلہ زلف تو غلقت الروح بحبل الوريد

قرآن: وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۵۰ ۱۶

فرق ظاہر ہے۔

(۷۱) لکھی عشاق را غم کاہ ستادی الم نرا غم فی کل وادی

قرآن أَلَمْ تَرَ أَنَّهُ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۲۶ ۲۲۵

قرآن میں شاموں کا ذکر ہے شعر میں عاشقوں کا۔ مصرع ثانی کا پہلا رکن بجای مفاعیلین کے مفاعلتن ہے۔

اہلی شیرازی

(۱) بہ شہد حکمت او از پی شفا را ناس طبیب نعل برد مرہم شفا ی را
قرآن : **وَبِهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ** ۱۶ : ۶۹
عُ لِلنَّاسِ کو عُ النَّاسِ باندھا گیا ہے۔

(۲) این رحمتیت شامل عالم کہ خواجہ گفت الصالحون لله والطالحون لی
سعد الدین ہروی
سعیڈ طائی

از بھر آنکہ سید کونین گفتہ است الصالحون لله والطالحون لی
حالی :

(۳) گمہ بد میں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
ز سورہ شعرا رب نخبی اہلی
[عطا مٹھسوی :

بہ شعر و شاعری آخر ہزار نفرین باد
قرآن : **وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ** ۲۶ : ۲۲۴
دونوں شعروں میں یَتَّبِعُ کو یَتَّبِعُ باندھا گیا ہے سکون عین کے۔ مائتہ۔ دوسرے شعروں میں وَالشُّعْرَاءُ
لکھا ہے پگرو زن میں صرف وَالشُّعْرَاءُ آتا ہے عُ کے بغیر۔

(۴) ہم اودن ظاہر و باطن ہم اودر اول و آخر
[ساقی خراسانی :

فہمدا هو الحق فی کُلِّ حین
کما قالہ فی کتاب المسبب
هو الاول من هو الآخر
هو الباطن بل هو الظاهر م [

آشکارا (سچل سرمست) :
هو الاول هو الآخر هو الظاهر هو الباطن
قرآن : **هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ** ۵۷ : ۳
فرق الفاظ ظاہر ہے۔

خوابجوی کرمانی

- (۱) عارض ترکان نگر در چین جعد مشک فام تا جمال حرم مقصورات مینی فی الخیام
قرآن: حُودٌ مَقْصُورَاتٌ فِی الْخِیَامِ ۵۵: ۲۰
دُ اورٹ کو سر اورٹ باندھا گیا ہے۔
- (۲) ملا زمان جناب تو خالداً فی الحسد مخالفان رضای تو دایماً فی النار
قرآن میں خالد آتین جگہ آیا ہے اور تینوں جگہ ۴: ۱۴، ۴: ۹۳، ۹: ۶۳ نار،
جہنم اور نار جہنم کے ساتھ۔
دایماً قرآن میں استعمال نہیں ہوا، دائِماً البتہ ہوا ہے وہ بھی جنت کے میوؤں کے لیے
- ۳۵: ۱۳

- (۳) تانہ گویند پیش مذب و فرات در مذویت حدیث تلخ و اجاج
قرآن: هَذَا عَذْتُ كُرَاتٍ وَهَذَا مِلْحٌ اُجَاجٍ ۲۵: ۵۳
فرق الفاظ ظاہر
- | | |
|-----------------------------|-----------------|
| [عَذْتُ، مِلْحًا] | [مِلْحٌ، کھاری] |
| [کُرَاتٍ، پیاس بجھانے والا] | [اُجَاجٌ، کڑوا] |
- (۴) گفتش امی لعبتی کہ مثل تو صورت کی متصور شود ز لطفہ و امشاج
قرآن: مِنْ لُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۴۶: ۲۰
امشاج مخلوط
شاعر نے مرکبِ نو صیفی کو مرکبِ عطفی بنادیا جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں بنتے۔

(اُستاد) جمال الدین صفہانی

- (۱) عنو تو دلیل چشمہ حیوان خشم تو نشان طامۃ الکبریٰ
قرآن: فَاِذَا جَاؤَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرٰی ۴۹: ۳۴
الطَّامَّةُ کو طامۃ باندھا گیا ہے۔
- (۲) آوازہ فارمد بصیرا سوی دولت اندر پی و ابیضت عیناہ برآمد
قرآن: وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ۱۲: ۸۴

- شاعر نے وَاَبْيَضَّتْ کی ساکن ت کو متحرک کر دیا ہے۔
 (۳) مسند تو چو کرد رای قضا گفت شرعش بلی ایک مساق
 قرآن: اِلٰی سِرِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۲۹: ۷۵
 فرق الفاظ ظاہر ہے۔
 (۴) از بعصمک اللہ اینت جوشن وز یغفر اللہ آنت مغفیر
 قرآن: وَاللّٰهُ يَغْفِرُكَ مِنَ النَّاسِ ۵: ۶۷
 لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ ۲: ۴۸
 فرق عبارت ظاہر ہے
 (۵) چشم ببل برو قنار از دور کرد ربی و ربک اللمی
 قرآن: سَرَبِیْ وَرَبِّکُمْ ۳: ۵۱
 ۵: ۷۲
 ۱۹: ۳۶
 ۴۴: ۲۰
 ۱۱: ۵۶
 فرق الفاظ ظاہر ہے۔
 (۶) حاسداں در گھت را عقل شیطان می شمرد مہتر فکرت نہ اکر دش کہ لا بلہم اضل
 قرآن: اُوْدِلْکَ کَا لَا نَعَامُ بَلْ هُمْ اَصْلٰ ۷: ۱۷۹
 لا اضافہ شاعر ہے۔
 (۷) ہر روز کہ صبح دم زند گوید در گوش ولی تو لک البشری
 قرآن: بُشْرٰی لَکُمْ ۳: ۱۲۶
 لَہُمْ الْبُشْرٰی ۱۰: ۶۴
 لَہُمْ کو شاعر نے لَکَ بنا دیا ہے۔

امیر معزی

- (۱) بخط عدل و سیاست بروی عالم پر نوشت ہمت او میتا فاحیہناہ
 سنخای مردہ بدو زندہ گشت و از گشتش درست گشت بدو میتا فاحیہناہ
 قرآن: اَوْ مَن کَانَ مِیْتًا فَاَحْيٰنَہُ ۶: ۱۲۳
 دونوں شعروں میں مِیْتًا کو مِیْتًا باندا گیا ہے۔

(۲) اَنَا غَفِرْنَا ذُنُوبَكُمْ قُولُوا غَافِرِينَ رَبِّكُمْ
ان تَنْتَهُوْا نَغْفِرْ لَكُمْ مَا قَدْ سَلَفَ عَنْ مَاضِي

قرآن: يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۚ ۳۳: ۱
كُلَّ تَلَّيْنِ كَفَرُوا اِنْ يَتَنَبَّهُوا نَغْفِرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ ۸: ۳۸

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۳) رعایت تو عدل تو و عنایت تو بدین و دنیا پیوستہ تا بیوم الدین
نظام دین صدی باد و عوہ دین ہدی ترا و زیر و سپہدار تا بیوم الدین
شمار ملک بدست تو تا بروز شمار جمال دین ببقای تو تا بیوم الدین

[قآنی :
بیک نظر ہمہ اسرار دہر را نگردد ز آولین دم ایجاد تا بیوم الدین]
بیوم کی سب سے زیادہ منافق بے شمار است، کہ بک طرح محض آرائشی اور برائے وزن بیت دکھائی دیتی ہے۔

گرامی

(۱) جبل ما از لوح ما آو خ زدود نکتہ تفسیر اذ فوا بالعہود

قرآن: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَذِفُوا بِالْعُقُودِ ۵: ۱

یا لعقود کو بلا وجہ بالعہود سے بدلا گیا ہے۔

شمس تبریز کا شعر ہے :

بنادی رہتا عود و الیسا حیو تا داذ فوا بالعقود

نشاط اصفہانی

(۱) ذکر آموز ذاکر ان طیور داقدًا بالعشی والابکار

قرآن: سَبِّحْ بِالْعِشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۳: ۴۱

يُسَبِّحَنَّ بِالْعِشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۳۸: ۱۸

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعِشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۴۰: ۵۵

داقدًا شاعر کا اپنا لفظ ہے یہ قرآن میں استعمال نہیں ہوا۔

(۲) شد کمال آیت زوال اسے دل عسس ایل کادت الاسحار

قرآن: وَاللَّيْلِ إِذَا عَسَسَ ۸۱: ۱۰

[محمود خاں کاشانی :

چون در آمد بخواب چشم عسس انظم الیل و هو قد عسس]

(۳) ایاک نستغیث و ایاک نستعین فرق الفاظ واضح ہے منک ایک سرت بنا اهدنا الصراط

قرآن : اَبَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۴:۱

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۵:۱

[نسیم امروہوی :

ایاک نعبد میں وہ خالق سے اختلاط جس کی ادا یہ خضر کہیں اِهدِنَا الصِّرَاطِ اس ردیف کے ساتھ فیض کاشانی کی پوری غزل ہے :

ای رہنمای گم شدگان اهدنا الصراط

وی نور چشم راہ روان اهدنا الصراط

نَعْبُدُ کی جگہ شعر میں نستغیث ہے اور المستقیم غایب ہے ۔

قُرَّةُ الْعَيْنِ طَاهِرہ

(۱) روز قیام است اے مہمان معدوم شدلیل غسق

قرآن : اِلَىٰ عَسَقِ النَّیْلِ ۸۷-۱۷۰

فرق الفاظ ظاہر ہے ۔

(۲) طلعت مبین ناگہ طالع از حجاب عزّ مشنوائی عزیز من لطق لن ترائی را

تافیہ بہائی، طائی وغیرہ ہے ۔ لن ترائی ۷: ۱۳۳ کے فی کوئی سے بدل دیا گیا ہے جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں بنتے ۔

مجمع الفصحا (۱) میں اوصد الدین کرمانی کے اس شعر میں ”لن ترائی“ طبع ہوا ہے :

ناخواستہ رویت مکانی

نشنیدہ جواب لن ترائی

لیکن یہ فروگزاشت مطبع کی ہے ۔ مکانی کے مقابل ترائی ہی آنا چاہیے ۔

(۳) حکل جمال زللعش قلل جبال زرفعشش دول جلال زسطوشش متخشعا متزلزلا
چہ شود کہ آتش حیرتی ز نیم بقلہ طور دل فسکلتہ و دکلتہ مستد کہ کا متزلزلا

قرآن : لَوْ اَنزَلْنَاهُ هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ حَبْلٍ لَّوَرَّ اَيُّتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّثْلَ
حَشِيَّةِ اللَّهِ ۲۱ : ۵۹
فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ بِالْعَبَسَ عَلٰى مَا اَوْخِیْتُهُ لَدُنْهُ ۚ اَلَمْ يَكُنْ لَّوَلَدٌ مِّنْ قَبْلُ ۚ
۱۵۳ - ۷
فرق نظم و ترتیب کلمات ظاہر ہے۔

سلطان ولد

(۱) شرح اللہ صدر رحمہ رفع اللہ قدرکم طلع البدر لایحاً معنی الیل اشربوا
قرآن : اَقْمِنِ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْاِسْلَامِ ۲۲ : ۳۹
رَفَعَ لَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۱۵۳ - ۲
صَدْرَهُ کو شاعر نے صدر کہ بنا دیا ہے۔

(۲) ز افلاک و ملک گزشتہ فی گفت حقت لولاک انا لما خلقت الافلاک
امیر خسرو : تَوَقَّعْتُ تَوْكَرُزَ صَحِيفَةٍ پَاکِ آدَمَ
لَوْلَاکَ لَمَّا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ
مَالِیْ لَهٗ خَطَابُ الْاَلَاکِ

سنائی : بَانَقْشِ تَوْگَفْتَهُ نَقْشِ بَنْدَتِ
استاد جمال الدین : لَوْلَاکَ لَمَّا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ

نقش صنعتِ رایت تو محسن کا کو روی : ہے کس کو خطاب ایزد پاک
لَوْلَاکَ لَمَّا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ
عطا بخشوی : کن عفو عطا بختی ممدون
لَوْلَاکَ لَمَّا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ
پہلے شعر میں آتا کا اضافہ ہے اور آخری میں الافلاک کی جگہ افلاک ہے۔ حالانکہ الافلاک
بآسانی آسکتا تھا۔

عراقی

(۱) رحمت عالم رسول اللہ آن کو قدسیان بردرش لبیک اوحی اللہ ما اوحی زبند
قرآن : فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ ۙ مَا اَوْحٰی ۱۰ - ۵۳

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۲) کما اصبر قد صبرت حتی روحی بلغت الی الترافی
قرآن: وَلَا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۲۶: ۷۵

إلی درمیان میں اضافہ شاعر ہے۔

(۳) تبارک الله وارت عبه حجب فليس يعلم الا الله ما الله
قرآن: حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۳۲: ۳۸
وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۷۳: ۷

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) حُذِيتْ شَيْتٌ فَانَ اللَّهُ تَمَّ وَقُلْ مَا شِئْتُ مِنْهُ فَانَ الْوَاسِعُ اللَّهُ
قرآن: وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۲۴: ۲
۵۴: ۵ ۳۲: ۲۲ ۷۳: ۷

جو مسموع میں فان الواسع اللہ بن گیا ہے۔

(۵) حمد بے حد کہ دگر احد صمد لم یلد و لم یولد

[نظم طباطبائی: اور کہیں ہم کہ الہ واحد صمد لم یلد و لم یولد]

صہبا اختر:

دل میں ذوق خود نگر لب پہ اللہ صمد
قرآن: قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۱۰۱: ۳

الصمد کو صرف صمد بانڈھا گیا ہے۔

آخری شعر میں الصمد آسکتا تھا۔ اس کا آل مکتوب تو ہے مگر تقطیع میں غیر ملفوظ و غیر محسوب ہے۔

انوری

(۱) آدم از نسبت وجود تو یافت اخصاص خلقتہ بیدی
دزد را نیک داند از کالا پاسبان خلقتہ بیدی

[تظہیر فارابی: نفس کل از برای راتب رزق بے اساس خلقتہ بیدی]

وَقَالَ نَارَ اِلْتِيسٍ مَا سَعَكَ اَنْ تَشْهَدَ لِمَا خَلَقْتَ بِيدَيَّ ۚ ۵۰-۳۸
خَلَقْتُ بِيدَيَّ تینوں شعروں میں حلقہ سدی بن گیا ہے۔ یَدَیَّ تثنیہ کا صیغہ ہے جبکہ
یکدی واحد کا۔

(۲) زلزله قمر تو شان پست کرد زلزله الساعۃ شیء عظیم

قرآن: اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۱۰-۲۲
مصرع میں ذلزلۃ کی منصوبت کو مرفوع پڑھا جائے گا اِنَّ کے محل کے معطل ہو جانے سے۔
(۳) غرض ذات تو بودار نہ نگشتی بنی آدم بکرنا مکرم

قرآن: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ۱۰-۱۷

فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) سفای صغر صورت بصفت صابریں دین چروصف جنت الفردوس و ماء منہم بادا

قرآن: فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ ۱۱-۵۴
یہ طوفان نوح کے آبِ باران کا ذکر ہے جس کا جنت الفردوس کے آبِ رواں سے کوئی تعلق نہیں۔

(۵) برہشتہ بر کران نان او خط سیاہ لم تکرنا بالغبہ الا لتبق الانفسی

قرآن: لَمْ تَكُونُوا بِالْغَيْبِ اِلَّا لِنَبِّئِ الْاَنْفُسِ ۱۶-۷

۵ اور ۱ میں سے ایک زیر کا ادغام رہا پڑے گا حالانکہ قرآن میں دونوں کا اعلان ہے۔

ابنِ یمین

(۱) نایز و چنین گفت در وحی منزل مع العسر لیسرا مع الیسر عسرا

قرآن: فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۱۱-۹۴

مع الیسر عسرا کے الفاظ جنہیں شاعر نے قرآن سے غسوب کیا ہے قرآن کے نہیں۔

(۲) اخلاقی استکم جمعا ما قالہ اللہ فقال لما شا

قرآن: فَعَالَیٰ لَمَّا یُؤْتٰ ۱۱-۱۰۷

یُؤْتٰ کی جگہ شا ہے، حالانکہ ویسے بھی اسے یسار ہونا چاہیے تھا (فعل مضارع)

ایک لحاظ سے شا بھی درست ہے کیونکہ خلاق وجود و خالق زمان کا زمانہ ایک مَرُورِ دوام ہے جس میں ماضی، حال، مستقبل کی کوئی تقسیم و تعزیم نہیں۔

(۳) برو اقتدا کن با بن یمین توکل علی اللہ فی کل حال

قرآن: وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۱۱-۸۱ ، ۳۳-۳۳ ، ۳۸-۳۸

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ - ۱۵۹ : ۳

۳۷ : ۹۰

(۳۱) يَتَوَكَّلُونَ فِي الْبُشْبُشِ لَدَّةً " وَفِي الْخَمْرِ وَالْمَاءِ الَّذِي غَيْرَ آسِنِ
 قرآن : فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ أَوْ أَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَدَّةً لِلتَّسْرِيبِ ۱۵ : ۴۷
 وَفِيهَا مَا تُشْبِهُهُ إِلَّا نَفْسٌ وَتَكُنُّ إِلَّا عَيْنٌ ۷۱ : ۴۳
 فرق الفاظ ظاہر ہے - مَاءٌ کو الماء الذی بنا دیا گیا ہے -

ظہیر فاریابی

(۱) شبی بنجیمہ ابد اعیان کن فیکون حدیث عشقِ قومی رفت و الحمدِ شبنون
 حسن

يُقَالُ الْحَدِيثُ دُشْبُونٌ - ای بدخل بعصه فی بعض -

سخن از سخن خیزد - سخن سخن را کشد ، سخن سخن آرد - حرف حرف می آرد از حدیث حدیث شکافد -
 سخن از سخن شکافد - والكلام یجر الکلام -

(۲) عنایتش علم ساکنان گردون را طراز ان علیکم لحافطین برزد
 قرآن : وَإِنْ عَلَيْكُمْ لِحَافِطِينَ ۱۰ : ۸۲
 طین کو طین باندھا گیا ہے -

نعم ہمدانی

(۱) ترامی جستم از روز نخستین ترا خواهم الی یوم القیامی
 ہر کہ جام از دست ایں ساقی گرفت مست می افتد الی یوم القیام
 زومی : تاکہ این ہفتاد و دو ملت مدام در جہان ماند الی یوم القیام

قرآن : اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۱۳ : ۵

۶۴ : ۵

۱۲ : ۶

الْقِيَامَةِ پہلے شعر میں القیامی اور باقی دونوں میں انقیام بن گیا ہے -

غالب

- (۱) خوب ست کہ نشنوم ز ہر خود رائی گلبنگ انا ربکم الاعلائی
قرآن : فقال انا ربکم الاعلائی ۷۹ : ۲۳
تساع نے الاعلائی کو الاعلائی بنا دیا وزن شعر کے لیے۔ رومی کے یہاں رب الاعلائی من کی ترکیب ملتی ہے۔

نظامی گنجوی

- (۱) برآوردہ مؤذن باول قنوت کہ سبحان حی الذی لایموت
قرآن : ذنوا کل علی النبی الذی لایموت وسبح بحمدہ ۲۵ : ۵۸
النبی کو حی باندھا گیا ہے۔

[قآنی :

- یارب بروزگار بنسیادھیچس پایان دولت تو بجز حی لایموت
ریاض بروہ دی :
نان و بریان جسم را طم است و قوت قوت جان از نور حی لایموت
سپرکاشانی
ہم تو ذات لایزال ہی ہم تو حی لاینام]
تینوں شعروں میں فرق الفاظ واضح ہے۔

حسن سنجردہلوی

- (۱) ہم آغریں فتح مشرودہ دھند ندای اذا جاء نصر اللہ
قرآن : اذ جاء نصر اللہ ۱۰۱۱
اللہ کو اللہ ہم باندھا گیا ہے۔
(۲) شہنشاہی کہ اندر بہ پنج وقت آوازہ ففتح بھی خیزد ز نوبت خانہ نصر من اللہ
قرآن : نصر من اللہ ۱۳۰۶
اللہ کو اللہ ہی باندھا گیا ہے۔
(۳) حسن از تو سر طلبند تو بشکرانہ بدہ طالب سر شدہ ذلک من فضل اللہ

قرآن : ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۴ : ۷۰۰

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ ۵ : ۵۳

۵۷ : ۲۱

۶۲ : ۴

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

(۴) گر لاف زنند فاعلت غنم فاصغ ہر طائفہ بما لیہم فسر حون

قرآن : فَاَعْتَفُ عَنْهُمْ وَاَصْفَحْ ۵ : ۱۳

شعر میں وَاَصْفَحْ کی جگہ فَاَصْفَحْ ہے۔

دوسرا مصرع قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے :

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۲۳ : ۵۳

جو بذاتِ خود رباعی کا مصرع ہے مفعول فاعلن مفاسیل فاعول

شاعر کو کُلُّ حِزْبٍ کی جگہ ”ہر طائفہ“ لانے کی ضرورت نہیں تھی۔

(۵) ای روی تو و التھار اذا جلّھا گیسوی تو واللیل اذا لیغشھا

قرآن : وَالتَّهَارِ اِذَا جَلَّهَا وَاَلَّیْلِ اِذَا یَغْشَاهَا ۹۱ : ۴

پہلے مصرع میں ر اور ل کی دونوں زیروں میں سے ایک زیر غائب ہو جاتی ہے۔

میرزاوہ عشقی

(۱) بگفتش کہ نکم دینکم ولی دین

قرآن : نَكْمُ دِیْنُكُمْ وِلٰی دِیْنٍ ۱۹ : ۶

وِلٰی کو وِلٰی یا باندھا گیا ہے۔ یا اگر دین کو دین پڑھیں تو وِلٰی کو وِلٰی پڑھنا پڑے گا۔

واقف لاہوری

(۱) مبارک است بنام تو افتتاح کلام تبارک اسک یا ذوالجلالی و الاکرام

قرآن : تَبَارَكَ اِسْمُ رَبِّكَ ذٰی الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ۵۵ : ۷۸

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔

کمال الدین صفہانی

(۱) فزَلَّتِ الْاَرْضُ زَلْزَالَهَا وَ اُخْرِجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا
قرآن، اِذَا دُلْزَلَتِ الْاَرْضُ زَلْزَالَهَا ۱۰۹۹
اِذَا كِي جَكَ ن تَصْرَفُ شَاعِرٌ هے۔ دُلْزَلَتِ كے زَلْ كُو زِلَا اور اُخْرِجَتِ كے ر
كو را باندهاگيا هے۔

(۲) خَشَبٌ مُسْتَدْرٍ ز برای تو منزل است
قرآن، كَا تَهُمُ خَشَبٌ مُسْتَدْرٍ ۶۳ ۶۴
شاعر نے خَشَبٌ كو خَشَبٌ بِر اسكان ش باندها هے اور مُسْتَدْرٍ كو مُسْتَدْرٍ جس تائيش كو تذكر
میں بدل ڈالا۔

شیخ علی حزیں

(۱) بر تافت است روی دلم از بلند و پست وَ تَجْتَ لَذَى فطر الارض و السماء
قرآن، اِنِّى وَ حَقَّتْ وَ حَقَّى لَذَى فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيفًا ۹۰ ۹۱
فرق الفاظ واضح هے۔

(۲) زندا نی جسم کہنم رب ترحم ! اقبل لقبرل حسن رب دعائی
قرآن، فَتَقَلَّلَهَا رَتُّهَا يَقُولِ حَسَنٍ ۳ : ۳۷
فرق الفاظ واضح هے۔

نواب نظامت جنگ (حیدرآباد دکن)

(۱) یا فضلش داشتیم در دل مدام گفتم ان الله معنا صبح و شام

[حفیظ حالندھری :
کہا اللہ ساتھی هے تو کیا اندیشہ دشمن
رکھ ان اللہ معنا پر نظر اے دوست لا تحزن
اقبال سہیل :

قرب ان اللہ معنا جس کی عظمت کا معتم جس کو جبریل امیں اللہ کا لائیں پیام]
قرآن، لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۹ : ۲۰
تینوں شاعروں نے اللہ کو اللہ اور مَعَنَا كے مَعَم كو معا باندها هے اشباع فتحہ كے ساتھ۔

آشکارا۔ سچل سرمست

(۱) فرمودہ است اللہ نور السماء والارض است پس ارض و آسمان را من خوب می شناسم
قرآن: اَللّٰهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ ۲۵: ۲۴
اللہ کو اللہ اور آسمانوں کو آسمان باندھا ہے۔

شمس تبریز: انا مندرایتهم اناصرت بلا انا صومرة في سراجة نور الارض والسماء
منذ، منذ چھپا ہے۔ باقی فرق الفاظ ہیں ہے۔

مسعود سعد سلمان

(۱) أصبحت شمس العلی فی دولة من مشرق
وہو کو وہو باندھا گیا ہے۔
نحمد الرحمن حمداً وهو رب العالمین

(۲) شاہ باشد دران ثواب شریک
و کو دا باندھا گیا ہے۔
وهو عند الاله ليس يضيح

قرآن: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۱۲۰: ۹

۱۱۵: ۱۱

۹۰: ۱۲

۱۷۱: ۳ التَّوْمِينِيْنَ

الفسی

(۱) گل بخندید کہ ای خیر ہم اندر تر آن اثم تو اکبر گفت است خدا نفع تو کم
(دگل و گل کا مناظرہ)

قرآن: قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنْ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ لِّفَعِهِمَا ۲۱۹: ۲
شاعر نے واحد حاضر کا صیغہ استعمال کیا ہے جبکہ قرآن میں تثنیہ غایب ہے یعنی اثمک اکبر
من لفعیک نہیں بلکہ اثمہما اکبر من لفعہما۔

آخوند انور

(۱) من کمال العجب بحسب ان ماله اخذه جان ناپاکش بسوزانی بنابر مودتہ
قرآن: يَخْسِبُ اَنْ مَّالَهُ اَخْلَدَهُ ۱۰۴: ۳

نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطْلَعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۱۰۴ : ۷۰
پہلے مصرع کو بحسب ان مآلہ آخِذۃ پڑھا جائے گا دوسرے میں نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ
کو نَارِ مُوقَدَہ باندھا گیا ہے۔

کمال الدین مسعود خجندی

(۱) صلاح کار نفل است دمی نعل لعل اللہ یرزقنی صلاحا
دوسرا مصرع اعراب کے ساتھ یوں ہوگا :
لَعَلَّ اللّٰہَ یَرْزُقْنِیْ صِلَاحًا
اور اس کا دوسرا رکن بجای مناعیلن کے مفاعلتن ہوگا۔

عطا عرازی

(۱) چشمکانش چنانکہ یوسف گفت اِنَّ رَّبِّیْ لَکَیْدٌ عَظِیْمٌ
قرآن : اِنَّ رَّبِّیْ یَکْبِدُ هَٰٓءِیْنَ عَلَیْمٌ ۱۲ : ۵۰
غالباً فوق الفاظ طباعت میں ہوا ہے یا شاعر نے دوسری آیت سے یہ لفظ لیا ہے :
اِنَّ کَیْدَکُمْ لَکَبِیْمٌ ۱۲ : ۲۸۰

نخستہ کاشانی

(۱) زہی دادار حی فرد بیچون تعالیٰ شانہ عما یقولون
قرآن : سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُولُوْنَ عَلُوًّا کَبِیْرًا ۱۷ : ۳۳
شانہ اضافہ شاعر ہے۔

صفی علی شاہ

(۱) زن بنام من بھی بے ترس و بیم دم زبسم اللہ الرحمن الرحیم
الرحمن تقطیع میں صرف رحمان آتا ہے۔
(۲) بلیس نام او برد با ادب اعوذ باللہ من الجاہلین
قرآن : قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰہِلِیْنَ ۲ : ۶۷

اَنْ اَكُوْنُ ساقط ہے۔

(۳) فَيَنْظُرُ الْاِنْسَانَ مِمَّ خُلِقَ تَبَارَكَ الْاَلِهَ احْسَنُ الْخَالِقِينَ
قرآن: فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۵: ۸۶
مَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۱۳: ۲۳

فرق الفاظ واضح ہے۔

(۴) وَلَنْ اَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحِدًا اِيَاہ نَعْبُدُ وَ بِهِ نَسْتَعِينُ
قرآن: وَلَنْ اَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحِدًا ۲۲: ۷۲
اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۳: ۱

فرق الفاظ واضح ہے۔

ولی دکنی

(۱) تمام پات یسبح بحمدہ کے بحکم زبان حال سوں کرتے ہیں ذکر سبحانی
قرآن: يُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ ۲۴: ۱۷
ح اور ہ دونوں کو سکن باندھا گیا ہے۔

(۲) توں ہے حق سستی ہم زبان ہم کلام ترا قاب قوسین ادنی مقام
قرآن: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ۹: ۵۳
شاعر نے اَدْنٰی کی جگہ ادنیٰ (مقام) لکھ کر قرآنی ترکیب سے انحراف کرتے ہوئے بھی
ایک ذومعنی معنویت پیدا کی ہے۔

داغ نے ادنی مقام کی جگہ مقام عالی لکھ کر ایک نئی کیفیت پیدا کی ہے:

قاب قوسین کا پایا ہے مقام عالی
اللہ اللہ رے یہ مرتبہ و رفعت و جاہ

(۳) وہیچ پاوے مطلب راضیۃ مرضیہ محض اللہ جگ میں جو اعمال پہنانی کئے
قرآن: رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ۲۸: ۸۹ (وہیچ = وہی)

راضیۃ وزن مفتعلن یا فاعلتن کو راضیا کا بروزن فاعلاتن باندھا گیا ہے ی کے اشباع
کے ساتھ۔ مَرْضِيَّةً کو مرضیہ بروزن فاعلتن باندھا گیا ہے۔

(۴) اے ولی ترک کر یہ حرف دراز کہ ہے خیر الکلام قل و دل

قَوْلِ مَا ثَوَّرَ ، حَيْثُ الْكَلَامِ مَا قَلَّ وَ دَلَّ
إِنَّ حَيْثُ الْكَلَامِ مَا قَلَّ وَ دَلَّ
ما در میان سے نایب ہے۔

میر تقی میر

(۱) کچھ مجبوں کا معتقد مت پوچھ بے علی ہی ھُوَ الْعَلِیٰ کبیر
قرآن : وَ اَنَّ اللّٰهَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ۲۲ : ۶۲
الکبیر کو صرف کبیر اور علی کو ہی باندھا گیا ہے۔
(علیٰ کو مقام الوہیت پر فائز کر دیا ہے نصیریوں کی طرح
قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَیُّ یُؤْمِنُوْنَ ۹۰ : ۳۰)

سودا

(۱) سن چکے احوال ساتوں شعر کا اب کہو تم آپنی یا بلغ العلیٰ
تَلَعَّ لَٰنَ کُو بَلَعَّ لَٰنَ باندھا گیا ہے۔
(۲) ہے مجھے فیض سخن اس کی ، مداحی کا ذات پر جس کی مہر بہن کنہ عزّ و جل
کنہ کو کنہ یعنی ساکن الاوسط کو متحرک الاوسط موزون کیا ہے
[فیض : از گنہ کمال او چہ نالیم ما یسج مدان آفرینش]
فائز دہلوی ، عقل باشد ز گنہ او آغمی
عطار : گر بکنہ خود ترا باشد رہی از خدا و خلق بے شک آگھی
عرفی : حد کنہ تو بہ اور اک نشاید دانست ویں سخن نیز باندازہ اور اک منست

نظیر اکبر آبادی

(۱) کیا مجھ سے جس نے عداوت کا پنجہ سَنَلَقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا
(حاشیہ میں // علیہم عذابا ثقیلا)

قرآن : اِنَّا سَنُلَقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۴۳ : ۵

مصرع کو با وزن پڑھنے کے لیے قَوْلَا = قَوْلَا پڑھنا پڑے گا۔ ویسے بھی ضمیر مجھ (واحد متکلم) اور جس (ضمیر واحد غایب) کی رعایت سے عَلَیْہِ آنا چاہیے۔

(۲) کہتاں میں ماروں اگر آہ کا دم فکانت جبال کثیبا مہیلا

قرآن: وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۱۲: ۷۳
وَكَانَتِ الْجِبَالُ = مفاعیلن فعولن کو فکانت جبال = فعولن فعولن باندھا گیا ہے۔

(۳) نظیر اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ نعم الوکیلا

قرآن: فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ ۹: ۱۲۹

وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۱۷۳: ۳

الوکیل کو الوکیلا باندھا گیا ہے۔ نعم الوکیلا کی ترکیب قرآن میں نہیں۔

[آغا حشر: السلام اے ماتمیدستانِ محشر را کفیل السلام اے یومِ پریش حبسنا نعم الوکیل]

قربان علی سالک

اے رشک مہر ماہ کو نسبت ہے تجھ سے کیا ہے وصف تیرے چہرے کا والشمس الضحیٰ

قرآن: وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۱: ۹۱

شاعر کے ذہن میں بدلتا ہی قرآنی ترکیب تھی ویسے مقسم بہ کے طور پر صرف وَالضُّحٰی ۱: ۹۳ میں استعمال ہوا ہے۔ وَالشَّمْسُ ۶: ۹۶، ۷۴: ۷، ۱۲: ۱۶، ۳۳: ۲۱، ۲۲: ۱۸، ۳۶: ۳۸، ۴۱: ۳۷ میں واؤ کہیں بھی قسم کے طور پر نہیں آئی۔

سید النشا

(۱) آپس میں سحر گئے کی چلیں اور پھر بالصوم غدِ نوبت اونکا کہنا
نیتِ روزہ: وَاصُومِ غَدٍ تَوَيْتَ (مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ) یعنی الصوم نہیں بلکہ صوم۔ او
غدا نہیں بلکہ غد۔

(۲) خوش را گن بیا دیش ملتی فاعتصم باللہ تب ما سبق

قرآن: وَمَنْ يَعْصِمْ بِاللَّهِ ۱۰۱: ۳

وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ ۲۲: ۷۸

- فاعتصم بالله قرآن سے مستخرج تو ضرور ہے۔ مگر قرآنی ترکیب نہیں۔
- (۳) انشاء الله جنتی خواہ شد گویندہ لا اله الا الله انشاء الله چھپا ہے یہ سقوطء حالانکہ وزن میں شامل ہے اور الله کو الله باندھا ہے باضافہ ہم۔
- (۴) فاحفظوا اوقا کم حین الصلوۃ نیست غافل راسرورے از حیات قرآن: حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰی ۲۳۸:۲ پہلے مصرع کا حرف مضمر قرآن سے مقتبس ہے۔ الفاظ شاعر کے اپنے ہیں
- (۵) واربم سوال از تو چون ابراہیم رب ارنی فکیف نجی السمویٰ قرآن: مَرَّتْ اَرِبٰی کَیْفَ نَجِی السَّمَوٰی ۲۶۰:۲
- کیف پر ف کا اضافہ شاعر کا خانہ ساز ہے یہ ضرورت شعری!
- (۶) از وادی اضطراب مارا بہ رباں اے قایل قول من تجیب المضطر قرآن: اَمَّنْ یَّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ ۲۷ ۶۲ اَمَّنْ کو مَن باندھا ہے۔
- (۷) مارکتی ہے یہ شعر واجب التعظیم ہے امر تم کو بھی صَلُّوا وَسَلِّمُوا تسلیم قرآن: صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا ۵۶ ۳۳ تسلیما کو تسلیم باندھا ہے عَلَیْهِ حذف کر دیا۔
- (۸) معنی آید و اولی الامر منکم گویا بر آفتاب جبیت نوشتہ اند قرآن: وَاُولٰٓئِکَ اَمْرٌ مِّنْکُمْ ۵۹ ۳ شاعر نے مِنْکُمْ کو مِنْکُمْ باندھا ہے۔
- (۹) انت ازلت علی قومک الیوم کما انزل الله من العرش علی مُوسٰی مَن قرآن: وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ اَلْهَمَّ وَالسَّلٰوٰی ۵۷:۳ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْہُمْ اَلْهَمَّ وَالسَّلٰوٰی ۱۶۰:۷ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ اَلْهَمَّ وَالسَّلٰوٰی ۸۰:۲۰ شاعر کے الفاظ سراسر اس کے اپنے ہیں۔
- (۱۰) ناقوس صنم سے ہم بھی یہاں سنتے ہیں سبحانک ما خلقت هذا باطل قرآن: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۱۹۱:۳ باطل کو باطل باندھا گیا ہے اور رَبَّنَا کی بجائے سُبْحَانَکَ ہے۔

مومن

(۱) تا سحر شام عبادت تری شب بیداری شارح آیت کرسی پس حتی القیوم
[ورد:]

فرمود چنیں حضرت حتی القیوم در گوش دلم کہ اے طلسم مہوم! [قرآن: اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۲۵۵: ۲
اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ یا حتی و قیوم ہونا چاہیے تھا لیکن ترکیب ایسی ہی خانہ ساز اور عامۃ الورد ہے
جیسی کہ غفور الرحیم کی، جسے الغفور الرحیم یا غفور و رحیم ہونا چاہیے۔

مرزا دبیر: تقصیر بخش دیجئے مجھ دل و دہیم کی
مولا تجھے قسم ہے غفور الرحیم کی
لے جل شانہ، وہ غفور الرحیم ہے
رحمان و مستعان و روف الرحیم ہے

میر حسن: پرستش کے قابل ہے تو اے کریم
کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

انیس: کیوں تجھ کو اتنی وحشت نازحیم ہے
بھائی خدا کی ذات غفور الرحیم ہے

جوش ملیح آبادی: سن مری بات میرا کنا مان
یا غفور الرحیم یا رحمان

نیر واسطی: خدا کو لوگ غفور الرحیم کہتے ہیں
گناہ شوق کریں، شوق سے گناہ کریں

پروین شاکر: زیر لب ایک ہی اسم پڑھتی ہوئی
یا غفور الرحیم!

یا غفور الرحیم!
یا غفور الرحیم!

(۲) تیرا راں سے ترے کیونکہ نہ بھاگیں اعدا جانتے ہیں کہ شب بہر شیاطین ہے دجوم
قرآن: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ وَجَعَلْنَاهَا رَاجُومًا لِلشَّيَاطِينِ ۵: ۶۴
حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ — اِلَّا مَنْ خِطَفَ الْخَطْفَةَ فَاتَّبَعَهُ شَيْطَانٌ ثَاقِبٌ ۱۰: ۶۴

قرآن میں شہاب کا لفظ ہے جسے شاعر نے شہب بنا دیا ہے۔

ذوق

- (۱) جو ہویں اس کے ہوا خواہ وہ رہیں سرسبز ہوں اس کے دشمن بدکیش خالدؑ فی النار
قرآن: بَكَتَنَ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ ۱۵: ۴۷
خالدؑ کو خالدؑ بانہا گیا ہے اور پھر صیغہ جمع کی رعایت سے خَالِدِیْنَ ہونا چاہیے تھا۔
- (۲) مصحف رُخ تراے سایہ رب العزت کھول دے معنی اَتَمَّتْ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِ
[نسیم امروہوی:] علم توفیق ازل، علم عطائے قدرت علم مصداق و اتممت علیکم نعمت
قرآن: وَ اَتَمَّمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی ۳۰: ۵
نِعْمَتِی کو نعمت بانہا گیا ہے۔
- [اسمعیل میہٹھی:] قَالَ اَتَمَّمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی ہو گئیں سب خوبیاں اس پر تمام
اس شعر میں دو کو حذف کر کے قَالَ کا اضافہ کیا گیا ہے۔
- (۳) جو ہونہ تابع امر لتساو روا فی الامر تو عقل کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر
قرآن: وَ شَاوَزْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۱۵۹: ۳
عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمْ وَ تَسَاوُرٍ ۲۳۳: ۲
تساوڑھم کو شاعر نے تَسَاوَرُوْا بنا دیا۔
- (۴) الہی کس بے گنہہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے کہ آج کو چے میں اس کے شورِ بایِ ذَنْبٍ قَتَلْتَنِیْ
قرآن: وَ اِذَا النُّفُوسُ سُئِلَتْ: يَا اَيُّ ذَنْبٍ قُتِلْتُمْ؟ ۹: ۸۱
قَتَلْتُمْ کو شاعر نے قَتَلْتَنِیْ بنا دیا ہے۔
- (۵) کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بہ حیات اور کبھی کرتا تھا باطل بسماءِ الشَّقَّتِ
قرآن: فَاِذَا الشَّقَّتِ السَّمَاءُ ۳۷: ۵۵
وَ اَنشَقَّتِ السَّمَاءُ ۱۶: ۶۹
اِذَا السَّمَاءُ اَنشَقَّتْ ۱: ۸۴
فرق الفاظ واضح ہے۔

(۶) گر قتل ہی کرنا ہے قاتل کہیں کر جلدی لاجول ولا قوت کیا دیر لگائی ہے
 حدیث: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ قرآن: لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ۳۹: ۱۸
 قُوَّةٌ كُو قُوَّتْ باندھا گیا ہے۔

حالی

(۱) جزاھم بما صبروا جئات و حریرا
 قرآن: وَ جَزَاۤهُمۡ بِمَا صَبَرُوا۟ جَنَّةً وَّٰ خَرِیرًا ۱۲: ۷۶
 تاریخ وفات غفران مآب نواب مصطفیٰ خان مرحوم رئیس جہانگیر آباد متخلص بہ حسرتی و شیفتہ
 ”چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اس لیے ”جَنَّةً“ کی جگہ ”جئات“ کر دیا گیا ہے
 جیسا کہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجائے ”فروح و ریحان و بنت النعیم“ کے
 ”ٹھننا روح و ریحان و جئات النعیم“ کر دیا گیا ہے۔

(۲) کانہ صرح ممرّد من القواریر

قرآن:

اِنَّهُۥ صَرَخَ مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِرَ

۳۲۰۲۷

”تاریخ بنائے آئینہ خانہ در ریاست گاہ بہاول پور
 ”بہ ضرورت تکمیل اعداد اور نیز بمقتضائے مقام انہ کی جگہ کانہ کر دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس سے بھی
 اعداد پورے نہیں ہوتے اس لیے ”قواریر“ میں الف لام بڑھا کر القواریر کر دیا گیا ہے۔“

(۳) لحاش للہ ما ہذا بشران ہذا الا ملک کیریم

قرآن: حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلٰٓئِكَةٌ کَرِیْمٌ ۳۱: ۱۲

”تاریخ ولادت فرزند در حرم سرائے نواب آسمان جاہ بہادر مدار المہام مہر کار عالی
 اصل آیت میں ”حاش“ ہے۔ مگر بہ ضرورت لام اضافہ کر کے ”لحاش“ کر دیا گیا ہے۔“

اکبر الہ آبادی

(۱) بگڑ جائے گی میری اس بُت کی اک دن
 قول: مَا ثَوْرٌ اَوْ مَلَأَ شَيْءٌ یُّرْجَعُ اِلٰی اَصْلِہٖ
 اِلٰی اَصْلِہٖ یُرْجَعُ کُلُّ شَیْءٍ

(۲) کام کو اٹھو چٹھاؤ آستیں لَا يُضَيِّعُ اللَّهُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

قرآن: فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۱۱۵: ۱۱
ترتیب الفاظ بدل دی ہے جس کے نتیجے میں اللہ کو اللہ لکھا پڑا۔ یعنی منصوب کو مرفوع۔
(۳) ہو جاؤ کھڑے کہیں ہو قُؤ مُوا بِمِطَّةٍ جَوَّارِيں وَلَا تَلُومُوا

قرآن: فَلَا تَلُومُوا مَوْىٰ ۲۲: ۱۴

بی حذف کر دیا گیا۔

(۴) وہ جنزل کہ دبتی تھی جن سے زمین ہیں گر جا میں راکم مع الراکعین

قرآن: وَادْكَعُوا مَعَ التَّارِكِعِينَ ۲۳: ۲

وَادْكَعِي مَعَ التَّارِكِعِينَ ۲۳: ۳

(۵) نجات کے لیے کافی ہے سینہ صافی پیادہ پائی پر خوش رہِ اِلَى الْاِبِلِ انْظُرْ

قرآن: اَمَلًا يَنْتَظِرُ ذَنْ اِلَى الْاِبِلِ ۱۴۰: ۸۸

فرق الفاظ ظاہر ہے۔ اِلَى کے بعد الایل مجبور ہونا چاہیے نہ کہ مرفوع۔

انیس

(۱) کہیں شاہد کس وادہ کا غل برپا تھا عرش تک اَجْرُكُمْ اللّٰهُ کا غل برپا تھا

قرآن: اِنْ اٰخِرَىٰ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۷۲: ۱۰

۲۹: ۱۱

۴۷: ۳۴

۱۶۴: ۲۶

اِنْ اٰخِرَىٰ اِلَّا عَلَى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۰۹: ۲۶

۱۸۰: ۲۶

۱۲۷: ۲۶

۱۴۵: ۲۶

۲۷۷: ۲

۶۲: ۲

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

۱۹۹: ۳

۲۶۲: ۲

۲۷۴: ۳

اَجْرُكُمْ اللّٰهُ کے الفاظ قرآن میں نہیں۔ ویسے بھی انہیں اَجْرُكُمْ عند اللّٰهِ یا عَلَى اللّٰهِ ہونا چاہئے تھا۔

دبیر

- (۱) پانی بھرا گھٹانے یہ طوفان عیاں ہوا یا اَرْضُ ابْلَعِی سَبْقِی آسماں ہوا
قرآن: یَا اَرْضُ ابْلَعِی مَاءَکِ ۱۱: ۴۴
و کو بنایا گیا اور نتیجہ صُب کو صُن اب باندھا گیا ہے۔
- (۲) قرآن کا بطن ہوں خلف انزع البطین قائم مقام قائد غر المحبتین
الانزع البطین — حضرت علی کی صفت، سر کے سامنے کا حصہ کھلا ہوا، بڑے پیٹ والا۔
قائد الغر المحبتین — سفید منہ اور سفید ہاتھ پاؤں والوں کے قائد
غر محبتوں من آثار الوضوء
الانزع اور الغر کو انزع اور غر باندھا گیا ہے۔

شاہ نصیر

- (۱) مکی میں ہر ورق گل پہ بقول شخصے اِنَّ فِی الْجَنَّةِ نَهْرٍ لِّی
قرآن: فِیْهَا وَ اَنْهَرُ مِنْ لَبَنٍ ۴: ۱۵
فرق الفاظ ظاہر ہے۔ دوسرے مصرع میں ایک رکن کم ہے؛ مگر بحر الفصاحت میں یونہی ہے۔

قائم

- (۱) یارب اجاب ترے شاد رہیں تا بہ ابد ہوئیں یا مال جو اعدا میں الی یوم عسیر
قرآن: قَدْ اِلَکَ یَوْمٌ مَّسِیْدٌ یَوْمٌ عَسِیْر ۴: ۹
الی کی وجہ سے یوم کو یوم پڑھنا پڑے گا۔ نصب کی بجائے جر۔

احمد حسن رسوا

- (۱) چوں نظر آگندہ بر ایوان جاہت شد بلند از فلک آوازہ سبحان ذی العرش المجید
قرآن: وَ هُوَ اَعْلَمُ الْوُدُودِ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْد ۸۵: ۱۵
فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ ۲۱: ۲۲
فرق الفاظ ظاہر ہے۔

(۲) شدت بطش تو براے جاہ و دولت من نماید آشکارا شان ذوالبطش الشدید
قرآن: اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۱۲۰: ۸۵
فرق الفاظ واضح ہے۔

منظر الین معلیٰ

(۱) بیان فاتحہ عنی سے یہ حجت مسلم ہے کہ طاعت احمد مرسل کی عین حق پرستی ہے
قرآن: فَاتَّبِعُونِي ۳۱: ۳
۹۰: ۲۰

ب کوزیر کے اشیاء کے ساتھ تہی باندھا گیا ہے۔
(۲) جو آیا ہے قتل کن لہ مضمون قرآن میں
قرآن: يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ ۶: ۳۷
قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۳: ۵۹
اَنْ تَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۱۶: ۴
قرآن میں قتل کن لہ کے الفاظ کہاں ہیں؟

اکبر میرٹھی

(۱) کہا اس کے دشمن کے حق میں خدا نے
(۲) ہر آنکس کہ بر مصطفیٰ بغض و رز و
قرآن: فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا وَيَصْلِي سَعِيرًا ۸۴: ۱۲
وَدْعُوا هُنَا لَكَ ثُبُورًا ۲۵: ۱۳
وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ۲۵: ۱۴
فَدْعُوا (فعلن) کہ فذعو بروزن فعلن باندھا گیا ہے۔ ویسے اگر ف لگانا ہی تھا تو ییدعوا یہ
لگاتے تاکہ باقی الفاظ قائم رہتے۔

حسرت :

(۱) کیا حمد کہوں تیری مجھے کچھ نہیں یارا یا من خلق الخلق ولیلاد و نہاراً

قرآن، وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ الْكَلْبَ وَالْتِمَارَ ۲۱: ۳۳

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۵۵: ۳۰

۹۶: ۲

خلق الخلق کے الفاظ قرآن میں نہیں۔

فرق عبارت ظاہر ہے۔

شبلی

(۱) هَذَا وَلَقَدْ بَلَغْتَ اِقْصَاهُ فَاَسْعَوْا وَتَوَكَّلُوا عَلَى اللَّهِ
مَلَعْتَ كَرًا بَلَغْتَ بَانْدَهَا كَمَا هِيَ لَكَ كَبَلُ الشَّيْءِ كَمَا هِيَ لَكَ كَبَلُ الشَّيْءِ

نظم طب طبائی

(۱) مگر اتنا کہ تو مانو مرا کہ حدوا ما صفا دعوا کدرا
قول ماثور، خذ ما صفا ودع ما کدرا

(۲) اپنی میراث بانٹ دی بے جا ویلنا تلك قسمه ضیضی
(۱۲) (۱۲) (۱۲) (۱۲)

قرآن: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قَسَمْتُ لَّكُمْ شَيْءًا فَخُذُوْهُ

(۳) اِذَا اخْرَجْتُ مِنْكُمْ شَيْءًا فَخُذُوْهُ اِذَا اخْرَجْتُ مِنْكُمْ شَيْءًا فَخُذُوْهُ
جمع المال ثم عَدَّ دَهْرًا مَالَهُ فِي الْجَحِيْمِ اَخْلَدَهُ

قرآن: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قَسَمْتُ لَّكُمْ شَيْءًا فَخُذُوْهُ
يَحْسَبُ اَنْ مَّالَهُ اَخْلَدَهُ ۱۰۲: ۳۶

(۴) پیٹ کے واسطے یہ مکاری فَاتَّقُوا حُفْرَةً مِّنَ النَّارِ

قرآن: عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ۱۰۳: ۳

فَاتَّقُوا اسے بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ آیت کا حصہ ہے حالانکہ نہیں۔

(۵) مَا لَكُمْ تَحْسِبُوْنَ مِّنْ فِعْلٍ مَا لَكُمْ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ

قرآن: لَسْتُمْ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۱۵۹: ۶

فرق الفاظ ظاہر ہے لَسْتُمْ کو لَسْتُمْ باندھا گیا ہے۔

محسن کا کوروی

- (۱) ہوئے پھر بھی جو سیہ دل متنبی گمراہ ختم اللہ علیٰ قلبہم انشاء اللہ
قرآن، حَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ۲: ۷۰
قلوبہم کی بجائے قلبہم اور پھر قبل ماضی کے بعد انشاء اللہ
- (۲) قول ماثور، حدیث ۱، مَوْتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (اَسْتَعِدَّ لِلْمَوْتِ قُلٌّ اَنْ يَمُوْتِ الْمَوْتِ)
کہتا ہے اشارۃً لجالو موتوا من قبل ان تموتوا
ترتیب الفاظ مختلف۔
- (۳) قرآن، قَالَ يَا اٰدَمُ اَنْزِلْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ ۲: ۳۳ اَنْزِلْهُمْ کی بجائے اَنْزِلْ
رحمے گا مرا رب مری آرزو فمن رحمة اللہ لا تقنطوا
قرآن، لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۳۹: ۵۳
ترتیب الفاظ تبدیل کردی اور من پر ف کا اضافہ کر دیا۔
- (۴) قرآن، يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَايَسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۳۵: ۳۴ مری پیش پیپی ہے۔
من حذف کر دیا۔
- (۵) قرآن، وَمِنْ ذٰلِكَ بَابُ الْفَتْحِ کہ من ذق باب الکرم الفتح
فعل کے ساتھ ال؟
- (۶) قرآن، وَإِنَّ الْاَنْبَارَ لَكَيْفٍ نَّعِيمٍ ۸۲: ۱۳۰
وَأِنَّ الْفُجَارَ لَكَيْفٍ حَرِيمٍ ۸۲: ۱۳۲
فرق الفاظ ظاہر ہے۔ الْاَنْبَار کی بجائے الْفُجَار کی بجائے فجّارہم اور دونوں حسب
نکئی کی بجائے صرف فی۔
- (۷) حدیث، مَنْ دَخَلَ الْحَتَّةَ يَمُوتُ لَا يَبْأَسُ، لَا تَبْلَى ثِيَابُهُ وَلَا يَفْنَى شَبَابُهُ وَفِي الْجَنَّةِ مَا لَا
عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اَذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبٍ لَّشَرٍ۔
شاعر نے ان الفاظ کو جو جنت کے نظاروں کے بارے میں ہیں حضور کی آنکھوں پر منطبق کیا ہے۔

(۹) عیاں فرما کے نور ملک مالم ممکن تعلم کلام پاک کے تارے آتارے قلبِ انور میں
قرآن : وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ ۱۱۳ : ۴
عَلَّمَكَ کے ک کو ساکن باندھا گیا ہے۔

(۱۰) ملا اس سے تھی جس کی جس کو طلب بمصدق المرء مع من احب
حدیث : اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ

(اِنَّكَ) (اَنْتَ) مَعَ مَنْ أَحَبَّ (اَحْبَبْتَ)
مَعَ کو مَعَ باندھا گیا ہے اور اَحْبَبَ کو اَحَبَّ۔

نظمِ علی خاں

(۱) سُن لو جبریل امیں کا یہ پیام لَنْ تَنَالُوا النَّبِرَ حَتَّى تُنْفِقُوا
یہ پیام خدا کا ہے جبریل امیں تو صرف پیامی ہیں۔

عرشی امرتسری

(۱) گرچہ نہیں اب کوئی سہارا لَمْ اَكُ بِذُعَائِكَ شَقِيًّا
قرآن : وَلَوْ اَكُنْ بِذُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۴ : ۱۹
وَلَوْ اَكُ بِغِيًّا ۲۰۰ : ۱۹

فرقِ الفاظ ظاہر ہے۔ اَكُ کو اَلْ باندھا گیا ہے چھپا اگرچہ اَلْ ہی ہے۔
(۲) اَزْ نَكْتَةٍ لَا اُحِبُّ الْاَقْلَ عرشی بجدائے ہست شاغل

قرآن : لَا اُحِبُّ الْاَقْلِينَ ۷ : ۶

اَلْاَقْلِينَ کو اَلْاَقْل باندھا گیا ہے۔

(۳) شَرِيبًا طَرِيبًا سَكْرَتًا لَهْوًا اِلٰی اَنْ يَدْخُلَ الْفَجْرَ وَالنَّجْمُ اَفْئِدَ
قافیہ : نوافِل ، غافِل۔

نیچے حاشیے میں معنی لکھے ہیں — تارے ماند پڑنے لگے۔

اَفْل اسمِ فاعل ہے۔ یہاں تعاضلِ ماضی کا ہے اَفْل اُنچا ہے تھا۔ اَفْل نہیں آسکتا کیونکہ
اَفْل (المُضْعِ) کے معنی ہوتے ہیں : (دودھ پلانے والی کا) دودھ سُکھ گیا۔

عبدالباری معنی اجمیری

(۱) جس کے خُص خلق کی آیت علی خلق عظیم جس کا سایہ درحقیقت سایہ ربِّ وودود
قرآن: وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خَلْقٌ عَظِيْمٌ ۶۸-۲
لَعَلٰی کو علی اور خَلْق کو خَلْق باندھا گیا ہے۔ یعنی لام مضموم کو ساکن۔

شاد عظیم آبادی

(۱) کہا فقط غفر اللہ ذنہم میں نے ہمیشہ سخت کلامی سے محترز تھی زبان
تھے سادہ دل وہ سب غفر اللہ ذنہم پہلے مجھے غلش تھی نہ اب ہے کوئی حسد
قرآن: كَيْفَ غُفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۳۱: ۳

۴۱ . ۲۳

۳۱ . ۲۶

فَاَسْتَغْفِرُ وَالِدٌ مِّنْهُمْ ۳۱۵ . ۳

۱۲۷۰ ۳

غفر اللہ ذنہم قرآنی ترکیب نہیں۔ اور پھر محل ذنب کا نہیں ذنوب کا ہے۔
(۲) وسائل اس میں بڑھیں جس طرح کثیر رماد تو اس سے ہوگا پر اگندہ ذہن سامع کا
حلیے میں درج ہے: ”کثیر الرما د۔ بہت سی راکھ جمع رکھنے والا۔ یعنی جس کے ہاں
کھانا زیادہ پکتا ہو اور مہمان زیادہ آتے ہوں۔“
بالکل صحیح۔ مگر یہ معنی کثیر الرما د کے ہیں کثیر رماد کے نہیں۔ جس کا مطلب ہے زیادہ راکھ۔

چند شاعروں نے (خصوصاً مرثیہ گو یوں نے) — فَاِطْمَئِنُّ بِضَعَةِ مِثِّي استعمال کیا ہے۔
حدیث کے الفاظ ہیں: فَاِطْمَئِنُّ بِضَعَةِ مِثِّي یا مُضْغَةِ مِثِّي (۵: اَنَّ فَاِطْمَئِنُّ)
یعنی بِضَعَةُ کو بِضَعَةُ باندھا ہے۔

نیم امرو ہوئی نے اپنے شعر میں مِثِّي کو حذف کر دیا ہے۔
وہ ہو گیا وہیں جسے بی بی نے گن کہا جب تو بی بی نے فَاِطْمَئِنُّ بِضَعَةِ کہا
فرق الفاظ ظاہر ہے۔

جعفر طاهر

(۱) کس شخص کی شان میں یثلاف قریش
یثلاف قریش سے عیاں شانِ پدر ہے
قرآن : لَا يَثْلَفِ قُرَيْشٍ ۱-۶
لِإِي (وتم) کو لی (سبب) باندھا گیا ہے -

اقبال سہیل

(۱) چمن پر اترے کُن صدقہ تری نیز نگ سازی کے لبِ مرغِ نچیر پر ہے کُلّ یومِ ھُو فی شانِ
قرآن : کُلّ یومِ ھُو فی شانِ ۵۵ : ۲۹
ھُو کے ھُو کو اشباعِ ضمہ کے ساتھ ھُو = بروزنِ لُنْ باندھا گیا ہے ۔ کتابِ کو شانِ (سانی) ،
ریحان کی جگہ مریحاب (ریحانی) ۔

(۲) دونوں تفسیر ترکت فیکم الثقلین ہیں آج بھی دونوں رفیق سید الکوین ہیں
حدیث : وَ اِنِّیْ (و اَنَا) تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابُ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ
_____ اولہما کتاب اللہ فیہ الہدی والنور فتمسکوا بکتاب اللہ وخذوا بہ اِحْث
علیہ ودرغب فیہ _____ ثم قال : وَ اَہْلُ بَیْتِی اذکرکم اللہ فی اہل بیتی ثلاث مَرَّات۔
تَارِکٌ کی جگہ تَرْکْتُ ہے۔ الثَّقَلَیْنِ کے ق کو ساکن باندھا گیا ہے۔
(۳) عام ہو اس کی مروت فیض عالمگیر ہو علم اس کا بَنَیْنَهُمْ رُحَمَاءُ کی تفسیر ہو
قرآن : رُحَمَاءُ بَیْنَهُمْ ۲۸ : ۲۹
ترتیب الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ رُحَمَاءُ کی مُتَحَرِّک ح کو ساکن باندھا گیا ہے۔

نصر اللہ خاں عزیزی

(۱) زندگی تیری ہے تفسیر صحابی کا نجوم تو چلے جس پر وہی دین ہدیٰ کی بھی ہے راہ
حدیث: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيْهِمْ إِقْتَدَيْتُمْ إِهْتَدَيْتُمْ (یا) إِنَّمَا أَصْحَابِي مِثْلُ النُّجُومِ فَإِنَّهُمْ
أَخَذُوا بِقَوْلِهِ إِهْتَدَيْتُمْ۔
اگر صحابی، ص مفسر کے ساتھ پڑھا جائے پھر لفظاً تو صحیح ہے لیکن اگر ص مفتوح ہے (واحد) یا شاعر
نے صحابہ سے یہ ترکیب بنائی ہے تو اس میں فیہ ہے۔ (صحاب = اصحاب = صحابہ جمع) صحابی (واحد)

احمد رضا خاں بریلوی

- (۱) تا بما ہم آید انشاء العظیم اس نصیب الارض من کاس الکیم
دوسرا مصرع بدیع الہدانی کے اس مصرع سے مستفاد و مستخرج ہے :
وَلِلْأَرْضِ مِنَ الْكَوْكَبِ نَصِيبٌ
فرق الفاظ ظاہر ہے۔ پہلے مصرع میں انشاء اللہ کی بجائے انشاء العظیم ہے۔
- (۲) دو گروہ باشند مسعود و لتیم کل فرق کان کا لطور العظیم
قرآن : فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ۲۶ : ۶۳
گروہ جو فوجوں کے وزن پر ہے اُسے فعل کے وزن پر پڑھنا پڑے گا۔
- (۳) مذر یا در حشر باشد نا پذیر قاریا برخواں اَلَمْ يَأْتْ نَذِيرٌ
قرآن : اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۹ : ۸۱
گو کہ کو حذف کر دیا اور تاثیر دیا کہ آیت یونہی ہے۔ کان اضافہ شاعر ہے۔
- (۴) حق فرستاد ایں صحاب باصفا کے یطہرنا و یدھب رجسنا
قرآن : اِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۳۳ : ۳۳
فرق الفاظ ظاہر ہے یطہرنا اور یذہب۔ یطہرنا اور یذہب نظم ہوئے ہیں۔
- (۵) اے وقام رحم امت ز شرمستطیر مجرم میجویم از کینفروفا امداد کن
قرآن : وَذَقُوا مِنْهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۵۲ : ۱۸
يَخْافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيعًا ۶ : ۷۰
دو مختلف آیتوں کے الفاظ حسب نشاط دئے۔
- (۶) ربنا انا ظلمنا رحم کن جابلانہ گفتمہ بودیم ایں سخن
[پیر مر علی شاہ :
ربنا انا ظلمنا الامان
قرآن : رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۷۰ : ۲۳
خرمے کش سوخت برق غیظ او
قرآن : سَأَصْلِيهِ سَقَرٌ ۷۰ : ۲۶
فَالنَّارُ مَشْوَى لَهُمْ ۷۱ : ۲۳ وَالنَّارُ مَشْوَى لَهُمْ ۷۲ : ۱۲۰]

- (۸) قرآن نے مصرع میں اس سے فسوب الفاظ بالکل نہیں کہے۔
ما خطا آریم و تو بخشش کنی نعرۃ اتی غفور می زنی
قرآن، بَنَىٰ عِبَادِي أَيْ أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۲۹:۱۵
نعرہ انا الغفور ہے یا انا الغفور نہ کہ اتی غفور۔
- (۹) دبا سبختک لیس لنا علم شی غیر ما علمتنا
قرآن، تَاكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ لَا يُغْنِي عَنْكُمْ كُنُوزُهُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّهُمْ ۳۲:۲
الفاظ کا فرق ظاہر ہے۔
- (۱۰) پند ہا وادیم و حاصل شد فراغ ما علینا یا احی الا البلاغ
قرآن، وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۳۶:۱۰
یا آخری کا اضافہ شاعر کا ہے۔
- (۱۱) سوف یعطیک ربک فترضی حق نمودت چہ پاسداری ہا
قرآن، وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۵:۹۳
کسوف کو صرف سوف باندھا گیا ہے فترضی کا ف وزن سے باہر ہے۔
- (۱۲) نیست فضائش بہر قوم بے ادب یخطف البصار ہم برق الغضب
قرآن، يَكَاذِبُ الْبَرُّ يُخْطَفُ الْبَصَارُ هُمْ ۲۰:۲
قرآن کے الْبَرُّ کو شاعر نے برق الغضب بنا دیا اور الفاظ کی ترتیب بدل دی۔
- (۱۳) قل کذرع اخرج الشطا الی آذر، فاستغلظ ثم استوی
یعبج الزراع کالماء المعین کے یغیظ الکافرین الظالمین
قرآن، كَذَرِعَ أَخْرَجَ شَطَاً فَازَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيُغَيِّظَ
بِهِمُ الْكُفَّارَ ۲۹:۴۸
فرق الفاظ واضح ہے۔
- (۱۴) احسن اللہ لهم رزقا سے دے رزق حسن بنده رزاق تاج الاصفیا کے واسطے
قرآن، قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ يَرْثَقًا ۶۵:۱۱
لہ مصرع میں لہم بن گیا ہے۔
- (۱۵) ان پر کتاب وتری بیاننا کل شئی تفصیل جس میں ماغبر و ماغبر کی ہے
قرآن، وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ بَيِّنَاتٍ لِّكُلِّ شَيْءٍ ۸۹:۱۶

تَنبِيَانَا کو بیانا کر دیا ہے۔ سَتِیٰ کو شِیء باندھا ہے۔
 (۱۶) مَنْ رَارُ تُسْتِی وَحِبَّتْ لَهْ شُعَاعَتِی ان پر درود جن کے نوید ان بشر کی ہے
 لَهْ کو لَه باندھا گیا ہے۔ اگرچہ لکھا لَه ہی گیا ہے۔
 (۱۷) لَا مَلَنَّا حَهْمَ تَحَا وَعَمَدَ اَزَلِ نہ منکروں کو عبث بدعقیدہ ہونا تھا
 قرآن، لَا مَلَنَّا حَهْمَ تَحَا ۱۸۰۷

۱۱۹۰۱۱

۱۳ ۳۲

۸۵۰۳۸

جَهْمَ تَحَا کو حَهْمَ تَحَا باندھا گیا ہے۔
 (۱۸) لَيْلَةُ الْقَدَرِ مِنْ طُلُعِ الْعَرِيقِ مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام
 قرآن، لَيْلَةُ الْقَدَرِ ۳۹۷
 هِيَ حَتَّى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۵۰۹۷

حَتَّى کو مِث میں بدل دیا جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں بنتے۔
 (۱۹) اِیْسَا تَمِی کس لیے ممت کش استاذ ہو کیا کفایت اس کو اقراء ربک الا کریم نہیں؟
 قرآن، اِقْرَا وَذُكِّرْكَ الْاَكْرَمُ ۳۹۷
 درمیانی و حذف کر دیا۔

(۲۰) مومن ہوں مومنوں پہ رَوَف و رحیم ہو سائل ہوں سائلوں کو خوشی کا بھڑکی ہے
 قرآن، اَوْ اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۱۰:۹۳
 تَنْهَرْ کو تَنْهَر میں بدل دیا اور فلا کا ف حذف کر دیا۔

(۲۱) وصف اہل بیت آمد اے رشید فوق اید بہم ید اللہ المجید
 [غالب:]

مگر بحکم ید اللہ فوق اید بہم کرامت تو برونم ازیں فشا رکند
 قرآن: ید اللہ فوق اید بہم ۱۰:۳۸

اس آیت کا پہلا حصہ یہ ہے: اِنَّ الْاٰدِیْنَ یُبَاۤیِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَاۤیِعُوْنَ اللّٰہَ۔ یعنی اہل بیت کا
 ذکر نہیں بلکہ ان کا ہے جو حضور کے دستِ حق پرست پر بیعت کرتے ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے تحریف
 معنوی ہے جس سے عام آدمی گمراہ ہوتا ہے۔ ویسے ہو سکتا ہے شاعر نے اہل بیعت لکھا ہو کہ اتنے

ازراہ عقیدت بیعت کو بیت سے بدل دیا ہو۔

(۲۲) مَا مِنْ لَایَنْبَغِی لِّلشَّمْسِ اِدْرَاکَ الْقَمَرِ خالصہ چون از عادی کا لُحْجُوں در اطمینان توئی

قرآن : لَا الشَّمْسُ یَنْبَغِی لَهَا اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ ۳۶ : ۴۰

حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۳۶ : ۳۹

فرق الفاظ ظاہر ہے مصرع ثانی میں عُرْجُوں باندھا گیا ہے یعنی نونِ معلن نونِ غنہ بن گیا ہے۔

(۲۳) ہاں عمر حق گو زبان آنجناب یَنْطَلِقُ الْحَقُّ عَلَیْہِ وَالصَّوَابُ

حدیث : الْحَقُّ یَنْطَلِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ

(ص) : یَنْطَلِقُ الْحَقُّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ

یا خدا بہر جناب مصطفیٰ امداد کن میں یہ مصرع آتا ہے :

اے ثروت بے ثروتاں اے قوت بے قوتاں ۔

یعنی بحرِ جز میں ڈال کے بحرِ دل چلے

ویسے شروع کا اے گرا دیں تو پھر یہ سقّم دُورِ بحرین دُور ہو جاتا ہے ۔

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام میں یہ شعر اور مصرعے ملتے ہیں :

۱۔ گلِ باغِ رسالت پہ لاکھوں سلام

۲۔ شبِ اسری کے دُلہا پہ لاکھوں سلام

۳۔ سببِ ہر سببِ منتہا سے طلب

۴۔ نمکِ آگیں صباحت پہ لاکھوں سلام

۵۔ حجرِ اسودِ کعبہ جانِ ودل

۶۔ برکاتِ رضا عت پہ لاکھوں سلام

۷۔ جلوہ گیانِ بیتِ الشرف پر درود پردگیانِ عفت پہ لاکھوں سلام

اقبال :

خبرے رفت ز گردوں بہ شہستانِ ازل حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

۸۔ گلِ روضِ ریاضت پہ لاکھوں سلام

معلوم نہیں اہلِ عقیدت ان کے خارج از بحر و وزن ہونے کی کیا توجیہ پیش کریں گے ؟

قرآن : وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ۶۳۰۲
فَقُولَ لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا ۲۲:۲۰

فرق الفاظ ظاہر ہے۔ وکو وا اشباع فتح کے ساتھ باندھا گیا ہے۔
(۸) آں علی غیور و متان و صد راجی خود راجی رسوا کند
غیور کو غیور باندھا ہے (ویسے معلوم نہیں کاتبوں نے شاید کوئی پوشیدہ ایسا کیا ہوا ہے کہ اس
لفظ کو ہمیشہ تشدید کے ساتھ لکھیں گے۔ شاید و نا درہی یہ لفظ غیر مشدد نظر سے گزرا۔ مگر یہاں
تو فاضل سنخو نے خود اسے مشدد باندھا ہے)
میر حسن، اگرچہ وہ بے فکر و غیور ہے سودا، عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک
علی کے اوپر رحم کی علامت نہ ہوتی تو اسے منجملہ اسمائے حسنیٰ سمجھتے ہوئے متان و صد کی
صفات پر آمنا و صدقنا کہتے اور دوسرے مصرع کی بھی تہ دل سے تصدیق کرتے۔

و تا تریہ کیفی

- (۱) بالقوے سب کچھ ہے تو بالفعل لیکن کچھ نہیں تیرے آگے غیر ممکن اور ممکن کچھ نہیں
لفظ بالقوے نہیں بلکہ بالقوۃ (POTENTIAL) ہے بالفعل (ACTUAL) کے مقابل۔
- (۲) قدرت کو تو سب کہتے ہیں نا متناہی جس کی نہیں انتہا کسی کو معلوم
لفظ متناہی ہے نہ کہ متناہی۔
[مرزا منور، سمٹے بھی وہ دامان تو رہے لا متناہی]
- (۳) مطلع ہے یہ سحر غزل کائنات کا یہ وقت حسن مطلع ہے نظم حیات کا
دوسرے مصرع میں مطلع کی ع ساقط الوزن ہے۔ یعنی تقطیع میں مطلع کی بجائے صرف مطلق محسوب ہوتا ہے۔
- (۴) ہے آج رنگ اور ہی یل و نہار کا آئینہ ہے قضا صنع کردگار کا
لفظ صنع ہے نہ کہ صنع
- (۵) دعوت ابناے وطن کو جو عمل کی دی تھی لایحہ کار میں اس کے نہ ہوئی تبدیلی
[جوش ملیح آبادی :
انفاس زندگی کا مرتب ہوا حساب اک لایحہ عمل کی مدون ہوئی کتاب]
پہلے شعر میں لایحہ کار کو لایحہ کار بغیر ہمزہ وصل کے یا لایحہ کار بروزن فاعلاتن باندھا گیا ہے۔
دوسرے میں بھی لایحہ عمل کو لایحہ عمل باندھا گیا ہے بغیر ہمزہ وصل کے۔ اگرچہ کتابت میں دیا گیا ہے

(۶) موقع بن باس کا یوں رام کو جو پیش آیا جامہ تعمیل کا تخیل کو اب پہنایا

موقع کی عین ساقط الوزن ہے۔ یعنی اسے موقعی باندھا گیا ہے۔

(۷) منطقی لاکھ کھے اس کی ہے پانی پہ بنا عالم آب ثبوت قطعی ہے اس کا لفظ قطعی ہے ترکہ قطعی۔

(۸) نارودوزخ کی طرح سنتے ہیں ”هل من“ کی صدا وہ کچھری ہو کہ دفتر کہ ہو گھریا بازار

صدا، هل من مَزِيد ۵۰ : ۳۰

ہے نہ کہ صرف هل من

جس کے اپنی جگہ کوئی معنی نہیں بنتے !

فیض احمد فیض

(۱) نائِب اللہ فی الارض

یہ نائبان خداوند ارض کا مسکن

قرآن کے الفاظ ہیں : اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہٗ ۲ : ۳۰

اس میں مجرّد خلیفہ کا لفظ ہے خلیفۃ اللہ کا نہیں۔

اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ زمین میں (اپنا ایک نائب) بنائے والا ہو

مولانا فتح محمد جالندھری اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ترجمہ بھی یہی ہے اپنا نائب۔

اور مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اس کی تفسیر یوں کی ہے : یعنی وہ میرا نائب ہوگا کہ اپنے احکام شرعیہ کے اجرا و نفاذ کی خدمت اس کے سپرد کروں گا۔

”مُعَالِم“ کی رائے بھی یہی ہے : خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامۃ احکامہ وتنفیذ قضایاہ۔

ویسے عام عقیدہ بھی یہی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ہے وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلْکُمْ خَلِیْفَۃَ الْاَرْضِ ۶ : ۱۶۶

شاہ عبدالقادر، نائب زمین میں شاہ رفیع الدین، جائے نشین زمین کا شاہ ولی اللہ، بادشاہان زمین

(۲) حسرت دید میں گزراں ہیں زمانے کب کے

لفظ گزراں ہے نہ کہ گزراں

فراق، وہی انداز جہان گزراں ہے کہ جو تھا

(۳) کچھ بھی ہو آئینہ دل کو مصفا کیجیے جو بھی گزرے مثل خسروِ دوراں چلیے

مثل = ضرب القثل = کماوت

مِثْل = مانند، طرح
یہاں مِثْل کا محل ہے جسے مِثْل کے وزن پر باندھا گیا ہے۔
(۴) دل سے بس ہوگی یہی حرف و دد کی صورت
دودِ پنجابی میں تو صحیح ہے اور اردو میں بھی شاید مفرد صورت میں کسی حد تک گوارا ہو جائے۔

جیسے

- عکس جاناں کو دودِ کر کے اُٹھی میری نظر
مگر فارسی ترکیب کے ساتھ ————— محض ایجادِ پسندہ
- (۵) جس راہ چلے جس سمت گئے یوں پاؤں لو لہان ہوئے
لہان کو لہان پڑھنا پڑے گا۔
- (۶) یہ مہندی کیوں لگائی ہے
یہاں بھی لگائی کو لگائی پڑھنا پڑے گا۔
- (۷) اس بھرے شہر کی ناسود گیاں
بہر ناسودگی چلے تو منائے نہ بنے
لفظ ناسودگی ہے نہ کہ ناسودگی
- (۸) کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
یہاں مسیحا کا الف گرا نا کسی صورت بھی جائز نہیں۔
- (۹) تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
ایسے ہی یہاں زور آوری سے دنیا کا الف گرایا گیا ہے۔ یہاں دہر کا لفظ بڑی آسانی سے
لایا جاسکتا تھا اور اس سے پہلے شعر کے غم دہر (تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے) کو
غمِ زلیست میں بدلا جاسکتا تھا۔
- (۱۰) یہ رعب کا عالم کہ کوئی پہل نہ کرتا
لفظ پہل ہے بروزن خَل نہ کہ پہل سکونہ کے ساتھ۔
- [عزیز لکھنوی، دیکھ کہ ہر درو دیوار کو حیراں ہونا وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا]
- (۱۱) شاعر نے ایک جگہ وطن کو بھی وطن باندھا ہے (میں اسے جائز سمجھتا ہوں؟)

جوش ملیح آبادی

(۱) شق ہواے گنبد طلسم ظلمات نو دے اے وجہ ذوالجلال واکرام

— متاب میں رخشندگی وجہ ذوالاکرام
— دامنآ تاہاں رہیں گے مثل وجہ ذوالجلال

قرآن، وَبَيْنَهُ ذِكْرُكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۲۷ ۵۵

فرق الفاظ ظاہر ہے۔ پہلے شعر میں ل و ا ل کرام کی بجائے ل و اکرام ہے۔

(۲) تکیہ گاہ کافسردان و مومنین آدمی ہے دَحْمَةُ الْعَالَمِينَ
زندگی فرمانروائے کشور دنیا و دیں موجد حرف خدا و رحمۃ العالمین

دونوں شعروں میں اللعالمین ہے حالانکہ الف حشو محض ہے۔ پہلے شعر میں دوسرے لام کے نیچے بھی ا ہے۔ معلوم نہیں کیوں۔ حالانکہ یہ لام مجزوم ہے۔ جوش صاحب کو جاویدجا حرکات و سکنات لگانے کا بہت شوق تھا تاکہ اشعار وزن دار اور گنجیر نظر آئیں اور یوں شاید قحط خیال کی تلافی ہو سکے۔ پہلے لام کے نیچے بھی صرف ر ہونی چاہیے نہ کہ ا، کھڑی زیر جو کہ می کی قائم مقام ہے۔

(۳) ہاں اس طرف قریب ذرا اور کچھ قریب اچھا جناب خضر ہیں و علیکم السلام
”و غلے“ کو ”والے“ باندھا گیا ہے۔

(۴) عجب نہیں کہ بنے ایک روز نغمہ قُم مری صداے ”سلام“ علیکم اہل قبور
سلام کے اوپر وادین میں حالانکہ م متون ہونا چاہیے تھا۔ اہل قبور کی جگہ یا اَہْلَ الْقُبُور
کا محل تھا۔ اگر فارسی طریقے سے اہل قبور لانا تھا تو پہلے ”اے“ ہونا چاہیے تھا۔

(۵) کہ دہر کا ہے بشر قَادُڑْ علی الاطلاق وراے گُرسی و تحت الثریٰ کی بات نہ کہ
قَادُڑْ کی جگہ قَادُڑْ ہے اور تَحْتَ الثریٰ کی جگہ تَحْتَ الثریٰ ہے۔ عام حالات میں انہیں
کاتب کے کھاتے میں ڈالا جاسکتا تھا لیکن جوش صاحب کو اعراب کے بارے میں جو غلو تھا اسے
دیکھتے ہوئے اسے کاتب کا صہو کتنا مشکل ہے۔

(۶) اے جوش دل میں ہے کہ بگر میں کہاں درد اے شاہد بتوں دو عالم کہیں نہیں
بطون کی جگہ بتوں؟ کہیں یہ بُتان کی جگہ تو نہیں آیا؟

(۷) اور کہنے لگی پیار سے لے لے کے بلائیں اے نورِ نظر سلمہ اللہ تعالیٰ
حاشیے میں لکھا ہے، ہر چند سلمہ اللہ درست ہے مگر اردو نے اسے سلمہ اللہ بنا دیا ہے اور اب
یہی درست ہے۔

اردو نے کب اور کیسے بنا دیا ہے؟ اس کی کوئی سند؟
 درست سلک اللہ ہے نہ کہ سلک اللہ - محل صیغہ واحد حاضر کا ہے نہ کہ جمع حاضر کا۔
 نظیر اکبر آبادی نے یوں باندھا ہے:
 کیا جانے کس حال میں ہووے گا عزیزو!
 دل آج مرا سلمہ اللہ تعالیٰ
 یہاں واحد غائب استعمال ہوا ہے اور یہی اس کا محل تھا۔ جوش صاحب کو صراحتاً تسامح ہوا ہے۔
 اکبر الہ آبادی نے یوں استعمال کیا ہے:
 اجاب میں مرحوم بہت سَلَّمہ کم
 یہاں محل سَلَّمہم کا تھا۔
 سراج اور نگ آبادی،

ہر صبح فلک پر ملک عالم بالا قد دیکھ سجن کا
 تسبیح کریں سلمہ اللہ تعالیٰ من کا لئے من کا

ڈاکٹر تاثیر

(۱) غازیوں کی شہدائی میں قسم دیتا ہوں، جن کے گھوڑوں کے سموں کی تو قسم کھاتا ہے
 وَالْعَدِيَّاتِ ضَبْحًا ۱:۱۰۰
 اس آیت میں سموں کا کوئی ذکر نہیں۔
 شاہ عبدالقادر: قسم ہے دوڑتے گھوڑوں کی ہانپتے!
 شاہ رفیع الدین: قسم ہے گھوڑوں دوڑنے والوں کی ہانپ کر
 شیخ ابند محمود الحسن: قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر
 ڈپٹی نذیر احمد: (غازیوں کے) ان گھوڑوں کی قسم جو دوڑتے دوڑتے ہانپ اٹھتے ہیں
 عبدالماجد دریا بادی: قسم ہے گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں
 مولوی فتح محمد جالندھری: ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں
 غالباً شاعر کے ذہن میں اس کے بعد کی آیت تھی، قَالُمُورِيَّتِ قَدْحًا جس کا ترجمہ انہی بزرگوں نے

بالترتیب یوں کیا ہے :

- ۱۔ پھر آگ سلگاتے جھاڑ کر
 - ۲۔ پھر آگ نکالنے والوں کی پتھر جھاڑ کر
 - ۳۔ پھر آگ سلگانے والے جھاڑ کر
 - ۴۔ پھر (پتھروں پر اپنی ٹاپوں کے) مارنے سے چنگاریاں نکالتے ہیں
 - ۵۔ پھر ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں
 - ۶۔ پھر (پتھروں پر نعل) مار کر آگ نکالتے ہیں
- موقوفہ پہلی آیت کی طرح گھوڑوں کی ہے، ان کے منوں کی یا ان کی ٹاپوں کی نہیں۔

امجد حیدر آبادی

- (۱) صَلَّ كَاَنَّكَ تَرَاهُ هُوَ كَمَا قَابِلُ رَفَعِ يَدَيْنِ كَرَّكَ كَوْنِ ابِ اس نماز سے
شعر کا وزن ہے مفتعلن مفاعلن — بحر جزم مطویٰ مجنون
تراہ کا ہ وزن سے خارج ہے۔ تقطیع میں صرف ترا آتا ہے۔
حدیث: اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ — اُعْبُدُ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ۔
(۲) ان کا کہنا ہے وحی مایوحی نہ بناوٹ نہ اس میں کچھ ہے قصور
قرآن: اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُُّوحٰی ۵۳۔ ۵۴
وحی کو تنزین کے بغیر صرف وحی باندھا گیا ہے اور بیچ میں ما کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

سراج اوزنگ آبادی

- (۱) جی سیس یبقی وجہ سربك کی سدا سمن کون پھر دُور کر من سے خیال من علیہا فانت کا
قرآن: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَسْقٰی وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۵۵: ۲۷
سربك کو سربك اور فان کو فان باندھا گیا ہے خیال بھی خیال پڑھا جاتا ہے حالانکہ اضافت کا کوئی محل
نہیں اگر ہے تو "کا" کا نہیں۔
مخدوم محی الدین

- (۱) او آفتاب رحمت دوراں طلوع ہو اوانجم حمیت یزداں طلوع ہو
شاعر نے مصرع ثانی میں انجم کو سہواً انجم کے معنی میں استعمال کیا ہے اس گمان میں کہ یہ لفظ واحد ہے
حالانکہ یہ جمع ہے نجم کی، نجوم، نجم اور انجام کے ساتھ۔

(اقبال :

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
اس کی جگہ اختر باسانی آسکتا تھا۔

وجید الدین سلیم پانی پتی

- (۱) دینے لگے اس میں صدا خوف و بیم مَرَّ لَزْلَةُ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ
قرآن : إِنَّ مَرَّ لَزْلَةُ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۱۰۲۲
شاعر نے ءَکُوْہُ یعنی منصوب کو مرفوع باندھا ہے اِنَّ کے حذف کی وجہ سے۔
انوری کا یہ شعر ہم پہلے نقل کر چکے ہیں :
زلزلہ قہر تو شاں پست کرد زلزلۃ الساعۃ شئی عظیم

احسن مارہروی

- (۱) فرض ہے جانا وہاں کا عمر بھر میں ایک بار غَيَّرَ ذِيَّ ذَرْعٍ جِسْمٌ كَمَا هُوَ قَرَأَنَ مِی
قرآن : یَوَادُّ غَیْرَ ذِیِّ ذَرْعٍ ۱۴ : ۳۷
مطبوعہ شعر میں غَیْرَ اور ذَرْع ہے۔ سر مکسور کی جگہ مفتوح اور نہ کی جگہ ذ۔ مصرع ثانی میں غالباً
ہے کے بعد وہ تھا جو چھوٹ گیا ہے۔
(۲) جو خلافتِ اِنِّی جاعِل فی الارض ہے مستحق بن کر اسے ثابت کیا مخلوق پر
قرآن : وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۲ : ۳۰
پہلا مصرع یونہی چھپا ہے۔ ایک سببِ خفیف غایب ہے۔

پہلی قسط میں ہم نے غالب کے اس مصرع

وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ

سے بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قرآن کی دونوں متعلقہ آیتوں ۲ : ۲۰۱ اور ۳ : ۱۶ میں رَبَّنَا کا لفظ نہیں —

ساتھ ہی ہم نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ غالباً غالب نے یہ مصرع گلستانِ سعدی سے لیا ہے۔ گلستان کا شعر ہم نے نقل نہیں کیا تھا، وہ یہ تھا :

زینہارا زقرین بد زنہار وقنا ربنا عذاب النار
_____ در اخلاق درویشان

اس کے بعد اور بہت سے شاعروں کے ہاں بھی یہی مصرع نظر آیا
عطار : اذکروا اللہ اولیں مضمود وقنا ربنا عذاب النار
گفتہ میں بد خلافت در توحید وقنا ربنا عذاب النار
صاحب مازندرانی :

چون ز تو نور و نار بہرہ بر بند وقنا ربنا عذاب النار
غلام علی آزاد (بلگرامی) ،
زن بود در زبانِ ہندی نار وقنا ربنا عذاب النار
قائم :

ہم نے دیکھا ہے داغ دل قائم وقنا ربنا عذاب النار
گویا :

کہا کرے یہ عدو سوز آتش غم سے جلا جلا وقنا ربنا عذاب النار
جوش طبع آبادی ،

ہر سخن آگ ، ہر نفس بجلی وقنا ربنا عذاب النار !

انیس — نطقِ عظیم

مُجتبٰی حُسن

انیس پر لکھنا آسان نہیں۔ اُن کی دنیا اردو شاعری کی جانی پہچانی دنیا سے اگر کمیر نہیں تو بڑی حد تک مختلف ہے جس میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کی ہلکی ہلکی آوازیں کبھی کبھی ذرا دیر کے لیے سُنائی دیتی ہیں مگر پھر جلد ہی اس دُنیا کی بلند تر آوازوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ اس کی آب و ہوا، اس کی مٹی، اس کی پیداوار، اس کے رسم و رواج، آدابِ زندگی ہماری شاعری کے موسم، خوبو اور رہن سہن سے الگ ہیں۔

اس کی آب و ہوا گرم — بے حد گرم ہے۔ مٹی سُرخ ہے اور یہاں بے سر لوگ اُگتے ہیں۔ یہاں کے رسم و رواج میں دانا پانی بند ہے اور آدابِ زندگی میں لازمِ قرار دے دیا گیا ہے کہ آدمی "نفس و اموال و ثمر" کو لے کر بہ رضا و رغبت قربان گاہ میں پہنچ جائے۔

مثنوی کے شہزادے، شہزادیاں، قصیدے کے سلاطین اور غزل کے لیلیٰ مجنوں، قیس و فریاد، رقیبانِ روسیہ اور رندانِ باصفا یہاں نہیں ملتے، یہاں بالکل دوسرے قسم کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ماہیں، بہنیں، بیٹے، بھائی، بھانجے، بھتیجے، باپ، دوست احباب ایک طویل اور صبر آزما سفر کرتے ہوئے اُس بے آب و گیاہ سرزمین پر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں جس کا نام کربلا ہے، جہاں شنگی سے ایک ایسا چشمہ پھوٹتا ہے جو آنے والی صدیوں کو مستقلاً سیراب کرتا رہتا ہے۔ اردو، فارسی کی کسی مثنوی یا نظم میں ایسا چشمہ نہیں ملتا۔

ہماری شاعری میں، ظاہری بات ہے کہ یہ دنیا انیس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ فصیح، خلیق اور ضمیر نے اِس دنیا کو کچھ کچھ آباد ضرور کیا تھا۔ لیکن اِس کو پوری طرح آباد انیس ہی نے کیا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں ہمیں اِس کی مردم شماری ہی نہیں، مردم شناسی بھی مکمل طور پر مل جائے گی۔

ہمارے بشر، ناقدین اِس دنیا سے نا آشنا یا کم آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اِس نئی دنیا کی سرحدوں کا پتہ کٹاٹ کر گزر جاتے ہیں اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے رہ جاتے ہیں۔ صرف شبلی نے کلاسیکی انداز میں اِس دنیا پر قلم اٹھایا، موزان آج بھی انیس پر حرف آخر ہے۔ ہمارے نقادوں نے بات اِس سے آگے نہیں بڑھائی، البتہ احتشام حسین کا مضمون انیس پر نئے انداز سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اِس لحاظ سے اہم ہے۔

ہمارے ان تنقید نگاروں نے جو انگریزی تنقیدیں پڑھ کر تنقید نگار بنے ہیں میرا نیس سے کچھ اُسی قسم کا مطالبہ روا رکھا ہے جو ارسطو کی بوطیقا میں پایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان ناقدین نے انیس کو کھو دیا اور انیس کو کھو دینے کا معنی قطعی طور پر ذوق سخن کو کھو دینا ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُسی پر بحث و تنقید کی یہاں گنجائش ہے نہ ضرورت۔ صرف اُس کا خلاصہ سن لیجئے ان کا فرمانا ہے کہ انیس اچھے اور رزمیہ کے مفہوم سے ناواقف تھے۔ انیس کے کردار اودھ کے کردار ہیں بلکہ ہندو اُن کے کردار ہیں۔ انھوں نے تاریخ کو افسانہ بنا دیا۔ کیا خوب کہا ہے انیس نے :۔

اک افسانہ بکسی رہ گیا

نہ قاتل رہا اور نہ سزور رہے

مشریوں میں اکتا دینے والی کیسانیت پائی جاتی ہے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ انیس نے یونانی ڈرامے نہیں پڑھے تھے۔ غالباً بوطیقا کے نام سے بھی وہ واقف نہیں تھے۔ ہمارے عالم فاضل ناقدین کو اتنی بات تو معلوم ہونی چاہیے تھی (انیس نے فارسی عربی کے علاوہ اگر بہت پڑھا ہو گا تو نہ نامہ، مہاجنارت اور رامائن۔ اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ وہ مہاجنارت اور رامائن کے مندرجات سے آگاہ تھے۔ محلے میں ایک مندر تھا (یہ فیض آباد کا ذکر ہے) وہاں ایک سادھو کسی قد عربی فارسی پڑھا ہوا بیٹھا کرتا تھا۔ آپ (میرا نیس) گھڑیوں ٹہل ٹہل کر فارسی اشعار اور دھڑلے اُس کو سنایا کرتے تھے۔ وہ بھی پڑھا کرتا تھا اچودھیا میں کسی دوست کی تقریب میں گئے وہاں سیتا جی کی رسوائی اور بہت سے مندریں، وہاں کسی سستیاسی سے آپ کی ملاقات ہو گئی۔ تین دنوں تک وہاں اس سے گھڑیوں بات چیت ایسی رہی کہ وہ بے حد متعرف ہو گیا اور کہنے لگا کہ آپ تو حقیقت میں جوگی اور سستیاسی ہیں شاہ عظیم آبادی۔

مزید برآں آلباؤڈل کی رزمیہ نظم کو وہ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ چنانچہ انیس پر لکھنے کے لیے اتنے پاکھنڈ کی ضرورت نہیں کہ شرح و بسط سے مغربی رزمیہ نظموں اور یونانی ڈراموں پر باتیں کر کے اُن کو انیس پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان میں مماثلت البتہ تلاش کی جا سکتی ہے مگر ان کے ذریعے سے انیس کو پرکھنا تنقیدی مبادیات سے بے خبری ہے۔ انیس ہر بڑے شاعر کی طرح اپنا معیار آپ ہیں۔

جہاں تک اُن کے کرداروں کا معاملہ ہے وہ یقیناً اودھ کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مگر اس لباس میں بھی وہ حسن، حسین، عباس، قاسم، اکبر، عون و محمد معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بدعت نہیں جو شاعری اور ادب میں ہوتی نہ آئی ہو۔ دُغارک کا شہزادہ ہیلٹ، شیکسپیر کے یہاں انگلستان کا شہزادہ بن گیا ہے۔ داستانوں میں پرندے کہانیاں سناتے ہیں۔ غزل میں مردے قبروں سے بولتے ہیں اور قصیدے میں

کاشفی کی سمت سے متھرا کی جانب بادل اُٹھتے ہیں اور خانہ کعبہ پر رحمت کی گھاچھا جاتی ہے۔ ڈائٹ کے یہاں علیؑ، محمد مصطفیٰؐ کی وفات پر نوحہ کناں ہیں اور اُس مخصوص انداز میں نوحہ کناں دکھائے جاتے ہیں جو خاص مغربی تخیل کا تراشا ہوا ہے۔

اب رہ گیا یہ معاملہ کہ ان کرداروں کا تعلق اودھ کے جاگیرى طبقے سے ہے سو وہ اتنا بھی تشویشناک نہیں کہ ہمارے ناقدین اس صدمے سے سنبھل نہ پائیں۔ بلاشبہ ان کرداروں کا تعلق اودھ کے جاگیرى طبقے سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ سارے کردار مظلوم ہیں ظالم نہیں۔ ساری بحث یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی موشگافیاں وہی تنقید نگار کر سکتے ہیں جو اس نکتے سے واقف نہیں ہیں کہ کوئی بھی موضوع یا اُس سے متعلق کردار ہو، وہ شاعری یا مصوری میں پہنچ کر شاعر یا مصور کی اپنی تخلیق بن جاتا ہے۔ لازمی نہیں ہے کہ ظاہری شبابہت پائی جائے البتہ ہم باطنی شبابہت کو تلاش کر سکتے ہیں۔ میر سے لے کر داغ تک کی شاعری پر جاگیردار طبقے کے خیالات اور معاشرت اثر انداز ہوتی رہی ہے تو پھر اسل پر چراغ پا ہو کر کیا ہم ان تمام حضرات کی شاعری کو قوم دیں۔

بالکل یہی معاملہ اُس تاریخ کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انیس نے اس میں ملاوٹ کر دی ہے۔ پڑھے لکھے ناقدین کو یہ بتانا کیسی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ انیس تاریخ نہیں کہہ رہے تھے وہ تاریخ سے پیدا ہونے والے اُس عالمی انسانی شعور پر لکھ رہے تھے جو ہم سے آج بھی پوچھتا ہے کہ کب تک قرات پر ظلم کے پہرے بٹھائے جائیں گے۔

اب اُس یکسانیت پر دو ایک باتیں کہتا چلوں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انیس کے مرثیوں میں اکتا ہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ انیس نے کہا ہے، ص ۱۷

اک مچھول کا مضمون ہو تو سورنگ سے بانڈھوں

یہ لفظی نہیں ہے بلکہ موضوع کی جامعیت اور پہنائی پر گفتگو ہے۔ غزل کا مرکزی موضوع حُسن و عشق ہے۔ میر کا دیوان مختصر نہیں ہے، بہت ضخیم ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے جتنا پھیلا یا اور جتنی تہیں دی ہیں اُس میں اکتا دینے والی کون سی بات ہے! اب یہ اور بات ہے کہ ہم ضخیم دو اویں اور طویل نظموں ہی سے اکتا جائیں یا زیادہ دیر تک شاعری کے بوجھ کو سہار نہ سکیں۔

انیس کا ایک ہی کردار مختلف مواقع پر مختلف امکانات کا حامل ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اُس کردار کے نشوونما کی نوعیت اور اس کی جذباتی اور فکری کیفیت بدلتی جاتی ہے۔ کہیں وہ باپ ہے، کہیں بھائی، کہیں شوہر، کہیں دوست۔ یونانی المیہ ڈراموں کی ساری کہانیاں کم و بیش ایک سی ہیں۔ یہی نہیں ان ڈراموں کے تمام تماشاخی ان کہانیوں سے پہلے ہی واقع ہوتے تھے۔ مگر ڈرامہ نگار اپنے انداز فکر اور انداز بیان سے انھیں

نیا بناتے گئے ہیں۔ راگ ایک ہی ہوتا ہے۔ بڑا کلاکار اپنے فن سے اس میں ہزاروں جھرو کے کھول دیتا ہے۔
یہ تو بڑی اُن عالم ناقدوں پر غصہ سی گفتگو جنہوں نے ہمارے زمانے میں انیس پر طبع آزمائی کی ہے۔
انیس کا ایک حصہ ہے، ص ۱

مہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینیوں کو
اب پھر اس بستی کی طرف آئیے جو انیس نے بسائی ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے بھی اردو شاعری کی عام فضا سے
بہٹ کر ایک نئی بستی بسائی ہے اور غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مدتوں ناقدین کی نظر اس بستی پر نہیں پڑی۔ نظیر کی یہ
بستی طبریہ ہے جبکہ انیس کی المیہ ہے۔ نظیر کے یہاں ارتکاز فکر کی جگہ امتیاز فکر ہے۔ امتیاز فکر سے ماد بے ربطی یا
الجھن نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو میر نے کہا تھا: ص ۱

آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
نظیر کہیں ٹھہرتے نہیں۔ اُن کے کردار زندگی کو ڈرامہ سمجھتے ہیں ڈرامہ پیدا نہیں کرتے۔ وہ اسٹیج پر نظر آتے ہیں مگر
اسٹیج کے بعد یا اسٹیج کے پیچھے وہ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ پھر بھی نظیر کی یہ دنیا نئی ہے اگرچہ اس میں مناسب منصوبہ بندی
(PLANNING) کی بہت کمی ہے۔

انیس نے جو بستی بسائی ہے اُسے دیکھنے، سمجھنے اور اس سے گزرنے کے لیے ایک الگ انداز فکر اور انداز نظر
درکار ہے۔

ہومر، ویاس، فردوسی، والیکلی اور نکسی داس کی دنیا عالمی شاعری میں مختلف ہے۔ اُن کو پڑھتے ہوئے
ہم شیکسپیر اور گوٹے یا حافظ، خسرو، میر اور غالب کو ہم راہ نہیں لے جاسکتے۔ اس کا مزاج مختلف ہے۔ یہاں
کا ہر کردار ”جوہری کردار“ ہے جو پھٹ پڑے تو زلزلہ آجائے، پہاڑ دھواں بن کر اڑ جائیں۔ دریا اٹلے بہنے لگیں۔ یہ
کردار قد آدم نہیں کائنات گیر ہیں۔ اُن میں بڑی قوت، بڑی جرأت، محبت، نفرت، ہیبت اور سطوت ہوتی ہے
یہ کلاکس (CLOSSUS) ہیں۔ یہ چلتے ہیں تو زمین سے دھمک پیدا ہوتی ہے۔ سر اٹھاتے ہیں تو آسمان
کو چھو لیتے ہیں۔ جیم اگر گرز مار دے تو پہاڑ شق ہو جائے۔ ارجن کے تیروں کا توڑ نہیں۔ بھیشم پتا تیروں کا
تیکہ لگا کر جنگ کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہنومان جی پورے پہاڑ کو اٹھا لاتے ہیں۔ اصل میں یہ عنصری (ELEMENTAL)
کردار ہیں۔ اُن میں اساسی قوت پائی جاتی ہے۔ یہ علم نفسیات یا فلسفہ جذبات کے محتاج نہیں ہوتے۔
یہ اپنی جگہ بلا شرکت غیرے خود قائم ہیں۔ اُن کو دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ ہم میں خوف، دہشت اور
کبھی کبھی جذبہ رحم پیدا ہوتا ہے۔

انیس کے یہاں بھی کم و بیش یہی فضا ہے مگر انیس کا موضوع اساطیری نہیں ہے، تاریخی اور حقیقی ہے اور
تاریخ بھی کوئی قدیم تاریخ نہیں، جس میں ماقبل تاریخ کا عمل دخل زیادہ ہو۔ اُن کے کردار ”دیوتا کردار“ بھی نہیں ہیں

اور نہ یہ یونانی دیوتاؤں کی طرح نیک و بد کو سمجھے بغیر کسی جنگ میں فریتی بن کر دونوں طرف کی فوجوں کو لڑواتے اور تماشا دیکھتے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ جنگ نہیں کرتے۔ صرف اُس وقت میدان میں اترتے ہیں جب جنگ، جنگ نہ رہے شہادت بن جائے ۷

شہ نے فرمایا مجھے خود ہے شہادت منظور نہ لڑائی کی ہوس ہے نہ شجاعت کا غرور
جنگ منظور نہ تھی ان سے پر اب بھی مجبور خیر لڑ لو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور
ذبح کرنے کے لیے لشکرِ ناری آئے
کہیں جلدی کے سر دینے کی باری آئے

انیس نے اپنے کرداروں کو ظلم کے لشکرِ جبار کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ کردار دھوپ میں تپتے، بھوک اور پیاس میں زخم کھاتے اور بیٹوں کی لاش پر آنسو بہاتے ہیں۔ مگر میدان سے ان کے قدم ہٹتے نہیں۔ ان کی ذمہ داری بڑی ہے۔ ان پر آدمی کی تشخیص اور شخص (IDENTITY) کو قائم رکھنے کی ذمہ داری ہے۔ یہ آدمی کو پہچانتے ہیں۔ شاید ہی اتنی بڑی ذمہ داری کسی اور شاعری میں کسی کردار پر عائد ہوتی ہو۔ یہ دیوتا لوی کرداروں کی طرح نقاب پوش (MASK) نہیں ہیں بلکہ خالص آدمی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں وہی طاقت پائی جاتی ہو جو ویاس، ہوتمر، فردوسی، والیک اور تلسی داس کے یہاں ملتی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب ہم انیس کے کرداروں کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد یزیدی لشکر کے کردار نہیں ہیں۔ انیس کے یہ کردار عظیم الجثہ نہیں ہیں لیکن عزم کے قوی ہیں۔ ان میں وہی قوت ہے جو بڑے رزمیوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ کردار بھی زمین کو شن اور آسمان کو اٹھ سکتے ہیں۔ انیس امام حسینؑ کا سراپا بیان کرتے ہوئے پاؤں کے بارے میں کہتے ہیں، ۷

وہ پاؤں معرکے سے کبھی جو نہیں ہٹے یہ کیا ہٹیں، ہٹے تو صفِ فوج کہیں ہٹے
دشوار ہے یہ امر کہ رکن رکین ہٹے سرکین نہ، آسماں ہٹے یا زمیں ہٹے

مسکن سے منہ پہاڑ کبھی موڑتے نہیں

ثابت قدم ہیں جو وہ جگہ چھوڑتے نہیں

ایک اور جگہ رجز میں یہی توانائی گرجتی ہے ۷

دُنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں آئے غضبِ اکا اُدھر، رُخ جدھر کروں
بے جبر نیل کا رقصا و قدر کروں انگلی کے اک اشارے میں شقِ القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالتِ مآب کی

رکھ دوں زمیں پہ چہرے ڈھالِ آفتاب کی

رزمیوں میں مظلوم کرداروں کی گنجائش ذرا کم ہوتی ہے۔ مگر انیس کے یہاں رزمیہ کا تصور مختلف ہے۔

اُن کے کردار قوی بھی ہیں اور مظلوم بھی۔ مظلومیت انھیں کم زور اور ناتواں نہیں بناتی بلکہ قوی تر بنا دیتی ہے۔ وہ ہیمانہ قوت (BRUTE FORCE) کے قائل نہیں ہیں اور نہ وہ پہاڑ ایسے ہیں۔ اس قسم کے کردار انیس نے فوج یزید کے لیے مخصوص کر دئے ہیں جو بادل کی طرح گر جتے اور باتھی کی طرح جھومتے مقابلے پر آتے ہیں مگر جب ٹھوکے پیاسے، خیف و زار آدمی سے ٹکراتے ہیں تو یہ پہاڑ ایسے کردار ریت کے ذروں کی طرح اُڑ جاتے ہیں۔ انیس نے مظلوم کرداروں ہی میں بنیادی اور حقیقی قوت کو دریافت کیا ہے۔ اُن کے مرکزی کردار اپنی خداداد طاقت کو مخفی رکھتے ہیں۔ اصل میں یہ وہ کائنات گیر قوت ہے جو اب تک آدمی میں محفوظ اور مخفی ہے۔ یہ کردار اپنی اس قوت کو میدانِ جنگ میں صرف کر کے ختم نہیں کر دیتے۔ یہ محفوظ رہتی ہے اور اُس وقت سامنے آتی ہے جب وہ قتل کرنے جاتے ہیں قتل کے بعد یہ قوت مخفی پورے وقار اور اعتبار کے ساتھ ابھرتی ہے۔

یہاں ایک اور بات کی توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ انیس کے کردار اگرچہ غیر ارضی نہیں ہیں مگر ان کی یہ مخفی روحانی قوت انہیں عسکر تک پہنچا دیتی ہے۔ ان کرداروں میں "سماوات" اور "ارض" کا فطری اور ضروری نقطہ اتصال پایا جاتا ہے۔ لیکن بہر حال وہ ارضی ہی رہتے ہیں۔ ان کرداروں سے مائٹھولوجی ضروری وابستہ ہے۔ مگر یہ مائٹھولوجی دشمن کو پسپا کرنے میں کام نہیں آتی۔ ان کے ساتھ کوئی لشکر جبار بھی نہیں ہے نہ یہ کسی "ٹرائے" پر حملہ آور ہیں۔ یہ میدانِ جنگ کو تنہا جاتے ہیں اور مرکز ہزار بن جاتے ہیں۔ ان کی جنگ کسی عورت پر بھی نہیں ہے، پانی پر بھی نہیں ہے، دانے پر بھی نہیں ہے۔ پھر کس چیز پر ہے؟ انیس کے تمام مرثیے اسی سوال کا جواب ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ بچوں سے کیا خطا ہوئی ہوگی؟ عورتوں نے کیا قصور کیا ہوگا؟ بوڑھے بچارے کیوں قتل کئے جا رہے ہیں؟ ہم سوچتے جاتے ہیں اور جواب نہیں ملتا بجز اس کے کہ تاریخ کو انسان بنانے کے عمل کو اور تیز بھجانا چاہیے۔

انیس کے مرثیوں بلکہ اُن کے بعد آنے والے تمام مرثیہ نگاروں کے کلام کی ایک اور خصوصیت مد نظر رکھنی چاہیے کہ دوسری رزمیہ نظموں اور ان مرثیوں میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ ان میں حسن و عشق کا کوئی چرچا نہیں۔ شاید ہی دنیا کی کوئی بڑی نظم ایسی ہو جو "سایہ زلف بیتاں" سے "بھاگی" ہو۔ مگر انیس اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے کلام کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ حسن و عشق کے جنسی رجحانات کا شائبہ تک اُس میں نہیں پایا جاتا اور اس کے باوجود یہ اعلیٰ ترین شاعری سے معاف کرتا ہے۔

بہر حال رزمیہ نظموں اور انیس کے کلام کے رزمیہ حصوں کے ان امتیازات اور اختلافات کے باوجود ایک چیز جو ان میں مشترک ہے۔ وہ ہے اساسی قوت جو عناصر کے ہيجان اور برہمی سے یک بہ یک زمیں آسمان کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ انیس کے کلام میں عناصر کا رزمیہ جس طرح اور جس بڑے پیمانے پر گر جاتا اور کڑھتا ہے۔ اس کی مثال دنیا کی رزمیہ شاعری میں خال خال ملتی ہے (ایک طویل مدت بعد جو شش کی شاعری میں ان عناصر

کی رزم آرائی ملتی ہے، وہ بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی (انیس کے مرثیوں میں یہ اساسی قوت قیامت بن کر نمودار ہوتی ہے۔
فضائیہ و تار ہو جاتی ہے۔ خوف، دہشت، سراسیمگی پھیل جاتی ہے۔ درندے، پرندے بدحواسی کے عالم میں
بھاگے جاتے ہیں۔ سمندر ابل پڑتے ہیں اور زمین کانپنے لگتی ہے۔
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا لنگرنہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

نکلی جوں میں تینے حسینی غلاف سے اُڑنے لگے شر دم خارا شکاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشت مصاف سے صاف آئی الاماں کی صدا کوہِ قاف سے
بطعہ فلک کے صورت گوارہ بل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن کیل گئے

شہ کا غضب نمونہ قہرِ الہ تھا تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

راحت میں جن و انس و ملک کے خلل پہ
کھا کھا کے جوشِ خاک سے چشمے ابل پہ
قلم میں ڈر کے مردم آبی اچھل پڑے
بیرِ العلم سے غول جنوں کے نکل پڑے

اٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور مرنے دہل کے چونک پڑے سب میان گور
چلائے گرگ و شیر و غزالان و مار و موہ ہے بازوئے حسینی میں دستِ خدا کا زور
اے اُس مثلِ شیرِ خدا آستین کو
اے کردگارِ عرش بچالے زمین کو

جنگل میں تھی علم جو شمشیرِ خونچکاں تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
تینے علیؑ علم تھی جو دشتِ قتال میں جیتوں نے منہ چھپائے تھے گیندوں کی ڈھال میں

آئینہ مہر کا تھا مکرِ غبار سے گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بنجارے

نیزہ زمیں پہ آپ نے گاڑا جو یک بیک ماہی سے دیکے گاؤں زمیں نے کہا مرک

شاید قیامت آئی زمیں پر گرافلک بس یا حیفظ کہہ کے لرز نے لگی سمک
غل تھا اٹل چکے میں حسین آستین کو
یا بو تراب آکے بجب لو زمین کو

لفظوں میں اتنی طاقت، اتنی ہیبت، اتنا جلال، اتنا شکوہ، اتنی آتش فشاں اور قہر مانی اور لفظوں پر
اتنی حکمرانی انیس کے زور بیان اور قدرت کلام کی دلیل اتنی نہیں جتنی اس بنیادی بات کا ثبوت ہے کہ انیس نے
شاعری کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں فلسفے، نفسیات اور جذبات کا علم اور ان کا شعری اظہار سب کا سب بے بس
اور معذور ہو جاتا ہے۔ اس فضا میں ان کا گزرنے کا مشکل ہے۔ عنصری طاقتوں کا جلال جس انداز میں انیس کے کلام میں
رجز خواں ہے وہ ان کے کلام کو منفرد بنا دیتا ہے۔ نظام شمسی میں اگر اختلال پیدا ہو جائے تو نفسیاتی اور فلسفیانہ
گہرائی کے ساتھ شعروں کی کردار نویسی اور نفاست و نزاکت کے ساتھ غزل سرائی کی ساری صلاحیتیں چشم زدن
میں ختم ہو سکتی ہیں۔ انیس کو پڑھتے وقت دوسرے بڑے شاعروں کی قوت شعروں کی کم زور معلوم ہونے لگتی ہے
اور ہم انیس کی شاعری کی قوت خالص کے حیران کن اثرات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

یہ نہیں ہے کہ شاعری کے نازک مقامات اور کرداروں کی نفسیاتی کیفیات سے انیس آگاہ نہیں تھے۔
وہ مکمل آگاہی کے شاعر ہیں۔ فن شعری کے رمز و نکات پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا کلام شاعرانہ شعور کا معجزہ ہے۔

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ شمع تصویر یہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہر لاد ہو رنگ نول بستا نظر آئے جو دکھا دوں صفحہ جنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھوٹک جائیں ابھی

بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمکائیں ابھی

روزمرہ شرفاء کو ہو سلاست ہو وہی لب ولہجہ ہو وہی سارا، متانت ہو وہی

سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہوتے

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوتے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابر کے لیے نمر زربا ہے فقط زنگس جادو کے لیے

تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے ریب ہے خالی سید چہرہ گل رو کے لیے

داند آں کس کہ فصاحت بہر کلام دارد

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

شاعری کے اتنے مدارج اور مراحل سے واقف ہو کر ہی بڑی شاعری کی جا سکتی ہے۔ اوپر جو کچھ

انیس نے کہا ہے اگر ہمارے ناقدین اُسے پیش نظر رکھیں تو اُن کی شعور فہمی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ انیس نے لانا جانیسن پڑھا تھا نہ کوکرج نہ میٹو آرنلڈ۔ مگر انیس کے جو دو تین بند دے گئے ہیں ان میں "مناست"، "مضمون بھی عالی ہوئے" اور "موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی" کے الفاظ رکھ کر انھوں نے ان تمام مباحث کو سمیٹ لیا ہے جن سے "ترفع" (SUBLINE)، "اعلیٰ سنجیدگی" (HIGH SERIOUSNESS) اور (BEST WORDS IN BEST ORDER) "مناسب لفظوں کی مناسب ترین نشست" کے مفاہم سے بحث کرتے ہوئے لانا جانیسن، آرنلڈ اور کوکرج نے شعروادب کے نکات پر روشنی ڈالی ہے۔

اسی سخن فہمی اور سخن سنجی نے انیس کے کلام میں رزمیہ اور المیہ کا نہایت خوشگوار اور متناسب مزاج اور عمل پیدا کر دیا ہے۔ وہ تمام عناصر جو دنیا کی بڑی رزمیہ نظموں اور المیہ ڈراموں میں ملتے ہیں انیس کے ایک ہی مرثیے میں موجود ہیں۔

یونانی ڈراموں کی طرح انیس کے یہاں بھی ارواحِ جلیلہ کربلا کی جنگ کو دیکھتی ہیں۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ فرق یہ ہے کہ یہ جنگ میں شرکت نہیں کرتیں اور نہ حریفوں کو لڑوانے اور خود فریق بن جانے کے درپے ہیں۔ انیس کے یہاں ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ اُن کے مرثیوں میں صداقت غیر منقسم ہے۔ البتہ اس غیر منقسم جان گداز صداقت کی عملی صورت اختیار کرنے کا نظارہ عرش و فرش دونوں کرتے ہیں۔ آسمان کے در کھل جاتے ہیں۔ انبیائے کرام اور ملائکہ کربلا کی جنگ دیکھتے ہیں۔ سسرزمین کربلا پر اجنہ کا ہجوم ہو جاتا ہے جو حسین کی کمک کو آتے ہیں۔ مگر ان کی التجا اور استعانت قبول نہیں کی جاتی۔ حسین آدمیوں سے آدمی کی طرح جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ شہداء جب زخم کھا کر زمین گرم پر گر جاتے ہیں تو ارواحِ مقدسہ اُن کے سر بلا نے پہنچ جاتی ہیں۔ حسین کے نانا، ماں باپ اور بھائی جنت سے آکر شہیدوں کا پُرس اور جنت کی بشارت دیتے ہیں۔ اس طرح موت زندگی کی تصدیق اور تقدیس بن جاتی ہے۔ آخر زخم کی گرچکا ہے، حسین اُس کے پاس ہیں۔

نیمِ اچشم سے چرخِ رخِ مولا دیکھا زیرِ سزا فونے شبیر کا تکیا دیکھا
مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا شہ نے فرمایا کہ اے خوجری کیا دیکھا
عرش کی تحسینِ رخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرشِ ملک نور نظر آتا ہے

بارخِ فردوس دکھاتا ہے مجھے اپنی بہار صاف نہریں ہیں رواں جھوم رہی اشجار
شاخوں میں ہری طرف بڑھتے ہیں سیوہر بار خوریں لاتی ہیں جواہر کے طبق بہرِ نار
ہے یہ رضوان کی صدا حیاں کدھر تیرا
دیکھ لے شاہ کے مہمان یہ گھر ہے تیرا

مجھ کو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ
خُلد سے شیر خدا نکلے ہیں اللہ اللہ
لو برآمد ہوئے شہر بھی پدر کے ہمراہ
ننگے سر احمد مختار کی پیاری آئی
دیکھنے آپ کے نانا کی سواری آئی

موت کی اتنی بڑی اور شاداب و فرحناک تصویریں (IMAGES) ہمارے یہاں ناپید ہیں۔ یہ امیجز انیس کے یہاں بار بار ملتی ہیں اور زندگی کے تمام تصادم اور نزاع (CONFLICT) کو منور اور حسی آفریں بست کر حل کر دیتی (RESOLVE) ہیں جو ہر بڑی شاعری کا کام ہے۔
حسن اور موت کو دوسرے شعرا نے بھی ایک بنا کر پیش کیا۔ آتش کے یہاں موت ”خُور“ بن کر آتی ہے۔
جگر کے یہاں موت کی آمد بڑی دلاویز ہے۔

خوشا حیات عاشقان کہ موت بھی جب آتی ہے
تو ساتھ ایک حلقہ پری و شاں لیے ہوئے

فانی نے کہا ہے،

مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہمے

انیس کے یہاں بھی اسی طرح موت سے شادی رچائی جاتی ہے

دو لمبا رات لے کے چلا ہے بہشت کو

اس گھر طویل ایج کو دیکھئے جس کے سامنے اردو شاعری کی عنایت کردہ عاشقانہ امیجز پیش پا افتادہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

انیس کے مرثیوں میں المیہ، موت کے سبب نہیں پیدا ہوتا۔ مرجانے کا نام المیہ نہیں ہے۔ اُن کے

یہاں سارا المیہ آدمی اور اُس کے مرتبے کو نہ پہچاننے سے مرتب ہوتا ہے

سید کے مرتبے کو نہ جانا ہزار حیف

یہاں ایک اندھی قوت سے سابقہ ہے جو پھولوں اور کلیوں کو روندتی اور ہرے بھرے درخت کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔

ہاتف غیبی (ORACLES) کی آواز بھی انیس کے مرثیوں میں بار بار آتی ہے،

ہاتف نے دی ندا کہ سمجھ کر اٹھا قدم

یہ ندائیں، یہ صدا ہیں ان کے مرثیوں کو کائناتی (COSMIC) بنا دیتی ہیں۔ اُن کے مرثیوں کے بعض چہروں

پر کبھی کبھی کورس (CHORUS) کا گمان گزرتا ہے جو آنے والے واقعات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

انیس کے مرثیوں کے ان عناصر کی طرف توجہ دلانے کا مقصد دنیا کی دوسری رزمیہ اور المیہ تخلیقات سے

اُن کا موازنہ اور مقابلہ منظور نہیں ہے بلکہ دکھانا یہ ہے کہ انیس کے مرثیوں کی فضا اردو شاعری کی فضا سے کتنی مختلف ہے اور اُن کو پڑھنے کے لیے بہت سی رُٹنی رُٹائی باتوں کو بھول جانے ہی میں عافیت ہے۔

یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ رزمیہ عناصر انیس کے معاصر اور بعد میں آنے والے مرثیہ نگار شعرا کے یہاں بھی کم و بیش ملتے ہیں البتہ اُن میں اتنی ڈرامائی حرکت اور مرکوز قوت نہیں پائی جاتی۔ افسوس کہ مرثیہ کی صنف کی طرف ہمارے ناقدین نے بہت کم توجہ دی ہے ورنہ انھیں معلوم ہو جاتا کہ اس صنف نے ہماری شاعری کو جتنی جہتیں اور ڈرامائی امکانات دئے ہیں وہ اور کسی صنف میں بمشکل ہی تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ خاندان انیس ہی میں چند مرثیہ نگار ایسے گزرے ہیں کہ ہماری شاعری اُن کا جواب پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اُن کے ایک مرثیے میں جتنی چستی، درستی، زندگی کی جہتیں، شعری تسلسل اور تکمیل ہے۔ وہ اس دور کے شعرا کے یہاں مفقود نظر آتی ہے۔ ایک مرثیے میں ہمارے شعرا کے دو تین مجوسے سما سکتے ہیں۔ اس سے نئے شعرا کی تنقیص یا تحقیر مقصود نہیں۔ بات صرف اتنی کہنی ہے کہ ان شعرا میں اتنی توانائی اور بوتلا (STAMINA) نہیں ہے۔ مرثیہ گو شعرا نے شاعری کو درجہ کمال پر پہنچا دیا ہے۔

اقبال نے اپنے ایک خط میں ادبیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ اُن کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔“

اقبال کا یہ جملہ اگرچہ ایک دوسرے سیاق و سباق سے تعلق رکھتا ہے جس میں اس امر پر گفتگو کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے عہد زوال میں شاعری بھی زوال آمادہ تھی۔ مگر اقبال کے اس جملے میں مرثیہ نگاری کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف پھر بھی موجود ہے۔ رہ گیا یہ کہنا کہ عہد زوال میں ادبیات بھی لازماً زوال پذیر ہوں گی اگر کیسے غلط نہیں تو متنازعہ ضرور ہے۔ خود اقبال کی شاعری عہد غلامی کی شاعری ہے۔ آج اردو شاعری سے بحث کرنے والے اس ”جبریت“ کے قائل نہیں ہیں ورنہ میر سے لے کر غالب تک سب کی شاعری اکارت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر اقبال ہی کے نقطہ نظر کو مد نظر رکھا جائے تو واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ مرثیوں نے مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرے کا تہذیبی، روحانی اور اخلاقی تزکیہ کر دیا ہے۔

بہر حال گفتگو یہ تھی کہ انیس کے مرثیوں کا رنگ مختلف ہے۔ اور اُن کے شعری مقامات تک پہنچنے کے لیے ایک مختلف شعری تربیت کی ضرورت ہے۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی کی تربیت ایک حد تک اُن تک پہنچنے میں مدد پہنچا سکتی ہے۔ مگر آگے چل کر ”فروغ بکلی“ سے اس تربیت کے پروں کے جل اُٹھنے کا اندیشہ بھی ہے۔

انیس کے مرثیوں میں جو ڈرامہ ہے اُس میں بالعموم بارہ گھنٹے کا عمل پایا جاتا ہے۔ یہ صبح سے شروع ہوتا ہے اور شام ہوتے ہوئے ختم ہو جاتا ہے۔ صبح، دوپہر، شام ————— یہ تین ساعتیں انیس کی منفرد رنگ آمیزی کی مصنویت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس میں روشنی، جھپٹا، اندھیرا ————— اُمنگ، حوصلہ، دکھ اور درد سب کچھ ہے۔

یہ کلمہ اس کیم "اردو شاعری میں انیس سے پہلے اور انیس کے بعد شاید ہی کہیں اور ملے۔
دیکھیے یہ صبح ہے سہ

تھا بکے روز قتلِ شہرِ آساں جناب
نکلا تھناخوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب

ص ۱ پہو لاشفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح

ص ۲ وہ صبح اور وہ چھانوں ستاروں کی اور وہ نور

ص ۳ ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عسیاں

تکوا پر ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

صبح ہوئی ص ۴

اور ص ۵

سجود سے بچھ گئے عقب شاہِ انس و جاں
نماز ختم ہوئی اور اب دھوپ چڑھنے لگی اور فوج مخالف آمادہ جنگ ہے ص ۶
نغارہ و غار پر لگی چوبِ ناگہاں

جنگ شروع ہوئی۔

اور اب دھوپ کی تمازت سہ

وہ لودہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب

کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب

ص ۷ دھوپ جلتی ہے، خاک اڑتی ہے، ہرے چکر کا ہنگام

پھر دھوپ دھلتی لگی۔ کربلا گرد و غبار سے آئی ہوئی ہے۔ جیسے کی دردناک صدا آتی ہے ص ۸

عباسؑ دھوپ چہرے پر آئی ہے ابلیٹو

اس کے بعد شام ہو جاتی ہے۔ پورا منظر سبکیاں بھرنے لگتا ہے۔ ماں اپنے بچوں کو پکار رہی ہے سہ

دن دھل گیا قریب ہے شام لے مسافر کس بن میں ہوگا شب کو قیام لے مسافر

کچھ تو کرو زبان سے کلام اے مسافر و بھیجے گئے کب پیام و سلام لے مسافر و
 پیٹوں گی پہلوؤں میں جو تم کو نہ یادوں گی
 میں شب کو ڈھونڈتی ہوئی الجھنگ میں آؤں گی
 ہر لفظ میں تاریکی داخل ہو رہی ہے۔ دن ڈھل گیا، شام، رات، شب، کچھ تو کرو کلام کی خاموشی۔ ہر لفظ بات کی
 طرف بڑھ رہا ہے۔

کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے بچنے پائیں بھولے ہیں راستہ نہیں گھر کا بھول جائیں
 دربار میں بھی ہوں تو سویسے سے گھر کو آئیں ہے ہے یہ دشت ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں
 پنچوں گی کس طرح میں جو ڈر ڈر کے روؤں گے
 واری اندھیری رات میں کس طرح سوؤں گے

خون کے رنگ پر سیاہی غالب ہو گئی صحر
 ہے ہے یہ دشت ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں

پوری فضا سو گوار ہے اندھیرے نے مظالم کی شہادتوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔
 ان تہی رنگوں میں انیس نے انسانی تقدیر کا پورا المیہ کہہ دیا ہے۔

انیس کا یہ ڈرامہ دوبارہ گھٹنے میں بظاہر ختم ہو جاتا ہے ہمارے ذہن کو اس کے بعد بھی پکارتا رہتا ہے۔
 اور یہ بارہ گھٹنے ازل اور ابد کے درمیان طناب کی طرح کھینچ جاتے ہیں۔ انیس کے کردار اپنی ذمہ داریوں کو بڑے اعتماد
 اور اثباتی انداز میں تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ یہ کردار حالات اور واقعات کے منطقی نتائج سے بھی ابھرتے ہیں اور بعد
 میں ان حالات اور واقعات پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ انیس کے کردار نگاری کو کئی پہلو سے اجاگر کرتے ہیں۔ کبھی وہ
 براہ راست اپنے کرداروں کے اوصاف بیان کرتے ہیں کبھی رجز کے مواقع پر خود ان کرداروں کی زبان سے ان کے طبی
 میلانات، خصائص اور طرز زیست کا اظہار کرواتے ہیں۔ ان مواقع پر انیس کے انداز بیان کی صداقت ہمیں لہتیں
 دلا دیتی ہے کہ جو کچھ ان کرداروں کے بارے میں کہا گیا ہے یا جو کچھ خود انہوں نے اپنے بارے میں کہا ہے وہ سچ ہے
 اس کی گواہی وہ دشمن سے بھی دلوں سکتے ہیں۔

امام حسینؑ فوجِ یزید کے سامنے تقریر کر رہے ہیں۔

میں ہوں سردارِ شبابِ سپہنِ محمدؐ بریں میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں
 میں ہوں انگشتِ پیغمبرؐ خاتمِ کائناتیں مجھ سے روشن ہے فلک مجھے منور ہے میں
 ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
 محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہو جائے

اس کے بعد براہ راست ایک واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں،
 گچہ یہ امر نہیں اہل سخا کے شایاں کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے سب عیاں
 پوچھ لو خر تو ہے موجود عیاں راہ بیاں اسی جنگل میں مع فوج تھا وہ تشنہ دہاں
 شور تھا آج چلیں جم سے جانیں سب کی
 منہ سے باہر نکل آئی تھیں نہ بایں سب کی
 زلیست ہر شے کی ہے پانی سے شجر ہو کہ حجر مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پیر
 میں نے عباسؑ دلاور سے کہا گھبرا کر مشکوں والے ہیں کہاں اونٹ ہیں پانی کے گھر
 کرم ساقی کو خر کو دکھا دو بھبھائی
 تنہا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی
 ایک دن وہ تھا اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ کہ اسی طرح ہیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ
 چشم آئید ہو کیا سب نے پھرائی ہے نگاہ کوئی اک جام بھی بھر کر نہیں دیتا نہیں آہ
 ہر مسلمان یہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے
 بچے روتے ہیں تو سینہ مراشت ہوتا ہے
 انیس اس بند تک پہنچتے پہنچتے بڑی فنی چابک دستی کے ساتھ اس تقریر کی صداقت میں سُننے اور پڑھنے والوں کو
 شریک کر لیتے ہیں۔ اور اب پڑھنے والے کی دلچسپی تقریر کے ردِ عمل کو جاننے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔
 شہ کی مظلومی پر گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ عمر سعدؓ کی مُڑ کے رُخِ خر پہ نگاہ
 بولا وہ اشد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ محسن و منعم داتا ہے مرا یہ ذی جاہ
 اُن کے احسان کا کیوں کر کوئی منکر ہو جائے
 سخی حق میں بوشک لائے وہ کافر ہو جائے
 اس بند میں دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ خر نے کلام حسینؑ کی تصدیق کی بلکہ انیس نے پورے بند میں ایک
 کلیدی مصرع رکھ دیا ہے جو اس تقریر کی صداقت بن گیا ہے
 عمر سعدؓ نے کی مُڑ کے رُخِ خر پہ نگاہ
 اس مصرعے میں جو خفیف سی ڈرامائی حرکت ہے اور نگاہ کے مُڑنے نے جو کام کیا ہے وہ فنی بلاغت کا انمول جوہر ہے۔
 انیس نے اپنے کرداروں کو کئی جگہ اسی طرح باواوسط طور پر پہنچوایا ہے۔ مرثیے میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف
 بعض نازک طبع حضرات کو ناگوار گزری ہے اور اُن کا فرمانا ہے کہ اس قسم کی تعریف قدرتِ کلام کے بے جا اہلک
 اور شاعرانہ مبالغے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں کیا عرض کیا جاسکتا ہے بجز اس کے کہ انیسؑ کو قدرتِ کلام

اٹھار کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمام تر قدرتِ کلام میں۔ گھوڑا اور تلوار رزمیہ کے جز و لازم ہیں۔ انھیں انیس نکال کر کہاں پھینک دیتے۔ اس کے علاوہ گھوڑا اور تلوار انیس کے کرداروں کو بالواسطہ طور پر ابھارنے اور ان سے متعارف کرانے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ رستم سے اگر ترحش لے لیجئے تو وہ قریب قریب آدھارہ جاتا ہے۔ انیس کے مرثیوں میں بھی گھوڑا جہاں جنگ آزما اور غازی مرد ہے وہاں وہ اپنے سوار کی عظمت اور جلالت کی نشانی بھی بن جاتا ہے۔

نزدیک تھا کہ پھانڈ کے ندی کے پار ہو
رو کے وہی حسین سا جو شہسوار ہو

ص سینے میں دل قوی تھا کہ ہیں پشت پر حسین

س دعویٰ کہ میں براق کی توقیر پائے ہوں
ناز اس پہ تھا کہ بارِ امامت اٹھائے ہوں

اور یہ تلوار ہے، ص

معراج دستِ شاہ میں پائی ہزار بار

ص جیسی وہ ذوالفقار تھی ویسا ہی ہاتھ تھا

یہ گھوڑے اور تلوار کی تعریف اتنی نہیں ہے جتنی حسین کی شجاعت کا ڈرامائی اظہار ہے۔ انیس کے کلام میں کردار نگاری کا پورا ہنر اُس وقت سامنے آتا ہے جب وہ دو یا دو سے زیادہ اشخاص کا مکالمہ نظم کر رہے ہوں۔ ان مکالموں میں ڈرامہ بھی ہے، نفسیات بھی ہے۔ سن و سال اور مراتب کا نسرق بی ملتا ہے۔ وقوع پذیر ہونے والی صورتِ حال کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ رشتوں کی پاکیزگی بھی ہیں خود اپنی طینت سے آگاہ کرتی ہے۔ یہ مکالمے گھر بھی ہیں، دشت و در بھی ہیں۔ تلوار بھی ہیں، زخم بھی ہیں۔ یہ زندگی ہیں۔

انیس کے کلام میں فلسفہ تلاش کرنے والوں کو قدرے مایوسی ہوگی۔ وہ فلسفہ نہیں کہہ رہے تھے نہ کوئی پیغام دے رہے تھے۔ وہ حسین کی حقانیت کو ثابت کرنے کی سعی میں بھی مبتلا نہیں تھے۔ کربلا اُن کے سامنے ہو رہی تھی اور وہ اُس میں اُسی طرح موجود تھے جس طرح اصحابِ حسینؑ۔ کربلا اُن کے لیے محتاجِ دلائل نہیں تھی بلکہ حقیقتِ ثابتہ تھی۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی فلسفیانہ تاویلات سے اُن کا

کلام گرانبار نہیں ہے۔ زندگی کا ہر بنیادی کردار اُن کے سامنے چل پھر رہا تھا۔ گفتگو کر رہا تھا اور اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو رہا تھا۔ انیس کے مکالموں سے زندگی کا یہی مشاہدہ اور مطالعہ نمودار ہے۔ اُن کے مکالمے کچھ اس انداز میں ادا ہوئے ہیں جس میں خود زندگی برکتی ہے۔ یہ مکالمے کبھی آگے بڑھتے ہیں، کبھی مڑتے ہیں، کبھی مڑکتے ہیں، کبھی دیکھتے ہیں، کبھی سوچتے ہیں اور کبھی جنبش لب میں بدل جاتے ہیں۔ پھر سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ قافیہ اور ردیف میں مقید ہونے کے باوجود انیس کے زندگی شناس قلم نے ان کو قافیہ و ردیف کی قید سے اس طرح آزاد کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑا آزاد نظم لکھنے والا بھی ایسی آزادی اور لب و لہجے کے اتنے فطری اتار چڑھاؤ کے ساتھ شعر نہیں کہہ سکتا۔ انیس کو پڑتے وقت یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ قافیہ لائے جا رہے ہیں۔

ساتھ شعر نہیں کہہ سکتا۔ انیس کو پڑتے وقت یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ قافیہ لائے جا رہے ہیں۔ جس مرثیہ کو بھی دیکھ لیجئے یہی رنگ ملے گا۔ ایک جگہ انیس نے دکھایا ہے کہ امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کو علم سپرد کر دیا ہے۔ اس بات پر جناب زینبؑ کے فرزند عونؑ و محمدؑ بچپن کی وجہ سے کچھ ملول ہیں۔ ماں اُن کی

افسردہ خاطر کو سمجھ گئی ہے۔ اب مکالمے دیکھئے :
پھر کر ادھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر
بٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر

بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے ادا کس ہیں

اس کے بعد کچھ اور گفتگو ہوتی ہے پھر ماں کہتی ہے :
کچھ ملگجے میں آؤ میں کپڑے اتار دوں
سُرمہ لگا دوں، گیسوئے مشکین سنوار دوں
یہ میدان جنگ میں صبح کی تیاری — اور مکالمے ماں کے ہیں — !!

اور پھر یہ بند :
شب سے تو صبح تک یہ دعا تھی ہر ایک پر
اب کیا ہوا، یہ کون سا غصہ کا ہے محل
تینوں میں پہلے ہم کو کسے سرخروا حبل
آنکھوں میں اشک اُرخ پر عرق، ابرو و بیل
وہ خوش مزاجیاں نہ وہ باتوں کے طور ہیں

اس وقت دیکھتے ہو کہ تیور ہی اور ہیں
اس کا نہیں خیال کہ کیوں کہ جئے گی ماں
ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحان
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں
مُجھ سے سوا ہے کون تمہارا مزاج داں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصے کی آنکھ کا ہے کو چپ نسی ہوں میں

نوں صاحبزادے شکوے کے لہجے میں جواب دیتے ہیں :
 کیا ورثہ دارِ جعفر طیار ہم نہ تھے
 اس عمدہ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے
 راب انیس نے اس مرحلے پر جو مصرعہ ٹانگ دیا ہے اُس کی دھیمی آواز ایک مکمل ڈرامہ کی گونج میں تبدیل ہو گئی ہے جو
 انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ یا
 ہر اسی سلسلے میں بہت نازک نفسیات کو سموئے ہوئے یہ مصرع آتا ہے :
 دیکھو سُنیں نہ زوہرِ عباسؑ با وفا
 ہمارے بعض ناقدین کو انیس پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انہوں نے صبر و ضبط کی جگہ مردوں، عورتوں کو روتے
 صوتے دکھایا ہے۔ جو ان برگزیدہ شخصیتوں کے رتبے سے فروتر ہے۔ معلوم نہیں اس اعتراض میں یہ حضرات کتنے سنجیدہ ہیں
 ناید یہ چشم و دل کے فرائض اور انسانی زندگی کی ظہارتوں اور عظمتوں سے آگاہ نہیں ہیں۔ نظریوں کو سب کچھ سمجھ لینا اور
 ادھی کی فطرت کو نظر انداز کر دینا کوئی قابلِ گنہگار بات نہیں ہے۔
 انیس کے کردار صبر و ضبط، نیکار ہیں۔ مگر وہ دل کے کٹھور اور بے رُوح نہیں ہیں اُن میں بھرپور آدمیت
 پائی جاتی ہے۔ ان میں انانیت ہے۔ اُن کا عمل موقع و محل کی مناسبت سے غیر فطری نہیں ہوتا ہے۔ ماں باپ
 جو ان بیٹے کو میدانِ جنگ میں پورے صبر و ضبط کے ساتھ بھیج دیتے ہیں مگر جب اُس کی لاش آتی ہے تو آنکھیں
 چمک پڑتی ہیں۔ یہ وہی کرتے ہیں جو دنیا کا ہر باپ اور ماں اس موقع پر کرتی یا اُسے کرنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے
 تو وہ سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر ماں باپ نہیں ہو سکتے۔ انیس جن آدمیوں کو پیش کر رہے ہیں اُن کا مقابلہ شقی القلب
 فوج گراں سے ہے۔ لہذا اُن کے پیش کردار کسی صورت میں بھی شقی القلب نہیں ہو سکتے۔ اُن کے کردار زندہ
 کردار ہیں جو ہر حال میں اپنی انسانی خصوصیات برقرار رکھتے ہیں۔

عون و محمدؑ کی لاش آتی ہے۔
 بیٹھی تھیں ایک گوشے میں زینبؑ جو ننگے سر
 پُرسے کو لوگ جمع ہیں، چلے ذرا اُدھر فرمایا میں نہ جاؤں گی بچوں کی لاش پر
 آپؑ آتما کی دل کو جلائے تو کیا کروں
 مگر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں
 دیکھئے یہ ماں ہے۔ اس ماں سے اب اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ انیس کے کردار اپنے مکالموں کی وساطت سے عالمی
 کردار بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ کربلا سے نکل کر ہر گھر کی روشنی بن جاتے ہیں۔
 ماما کا ایک اور رُخ دیکھتے۔ یہی ماں ہے، یہی بچے ہیں۔ گھسان کی جنگ ہو رہی ہے۔ بچے فوج میں دھنستے

چلے جا رہے ہیں۔ انیس نے اس منظر کو اپنے مرتق نگار قلم سے امر بنا دیا ہے۔ بڑی ملی جلی کیفیتیں لہروں کی طرح اٹھتی بیٹھتی رہتی ہیں۔ ماں میدان جنگ سے دُور بھی ہے اور میدان جنگ میں موجود بھی ہے۔ دکھ، محبت، شجاعت، اُمتنان سب کچھ اس منظر میں ہے۔

زینب کھڑی تھیں پردے کے پیچھے جو بے قرار
کیا ڈرتے ہیں جعفر و حیدر کے یادگار
حضرت سے مدح کرتے ہیں عباسؓ نامدار
جس وقت ذکرِ معرکہ آرائی ہوتے ہیں
رو مال رکھ کے آنکھوں پہ حضرت بھی روتے ہیں
رو کر کہا کہ روتے ہیں کس واسطے امام
مجمہ کو دکھا تو دے کہ کھڑے ہیں وہ لالہ خام
اُس نے کہا کہ چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام
لاکھوں سے معرکہ ہے مگر باحواس ہیں
بی بی وہ ابن سعد کے خیمے کے پاس ہیں

اب اس کے بعد کا بند سنیے۔ شاعری میں دُوری یا فاصلہ (DISTANCE) کا احساس دلانا بے حد مشکل کام ہے۔ محض دُوری اور فاصلے کے الفاظ لانے سے دُوری کا احساس اور اندازہ ممکن نہیں۔ انیس نے ”چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام“ اور ”بی بی وہ ابن سعد کے خیمے کے پاس ہیں“ کہہ کر فاصلے کی طرف چند اشارے کیے ہیں مگر یہ اشارے ناکافی ہیں۔ ان اشاروں کی تکمیل اور آنکھوں سے ’فاصلہ‘ دکھانے کے لیے اب وہ مزید اہتمام کرتے ہیں۔ ”بی بی وہ ابن سعد کے خیمے کے پاس ہیں“ کے مصرعے سے وہ آنکھوں کو دُور تک دیکھنے پر پہلے ہی مجبور کر چکے ہیں۔ اب آگے دیکھئے :۔

تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ
کثرت ہے اس قدر کہ پہنچتی نہیں نگاہ
دُھالوں کی بدلیوں میں چھپے ہیں وہ رشکِ ماہ
وہ بھاگتی ہے اور پلٹتی ہے سب سپاہ
آواز دارو گیر کی گردوں پہ جاتی ہے
دو فوں کے نیچوں کی چمک یا ننگ آتی ہے

آخری مصرعے میں بڑی دُور سے بجلی کو نذرتی ہے جس نے دُھالوں کی سیاہی میں ڈوبنے ہوئے فاصلے کو حدِ نگاہ تک روشن کر دیا ہے۔ کوئی اور شاعر ہوتا تو اس فاصلے کو دکھانے اور جتانے کے لیے نہ معلوم کتنے جتن اور کتنی ”امیجز“ وضع کرتا۔

لڑائی کا ذکر یہاں تک کرنے کے بعد انیس کا قلم اپنا تک ایک نوپنچاں تصویر دیتا ہے جو تصویر کی آنکھ سے دیکھی جاسکتی ہے۔ دفعتاً فوجِ مخالف میں فتح کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔

طلّ ظفر پہ چوب پڑی یک بیک اُدھر
عوق و محمد مارے گئے۔ اس کے بعد کے مصرعے کی حرکت سُست پڑ جاتی ہے اور وہ یوں آہستہ آہستہ چلتا ہے
جیسے زخموں کو سنبھال کر چل رہا ہو۔ پورا شعر یوں ہے :
طلّ ظفر پہ چوب پڑی یک بیک اُدھر
ڈیوڑھی سے آئیں نیچے میں زینب جھکا کے سر

الیے کی تکلیف ہو گئی
ڈیوڑھی سے آئیں — نیچے میں زینب — جھکا کے سر
مصرعے کا ہر لفظ خاموش، سوگوار اور سر جھکائے ہوئے ہے۔ سمندر متلاطم تھا اب پُر سکون ہو گیا۔ لفظ غم ناک میں
ڈوب گئے۔

مگر انیس بند کو ہیں مک لا کر نہیں چھوڑ دیتے۔ وہ یکایک آنے والے مصرعوں میں برقی رُود و رادیتے ہیں۔
ماں اُدھر نیچے میں جاتی ہے۔ اُدھر بچوں کی شہادت کا حال سُن کر جاناں حسینی کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اور مرثیے کے
مصرعے رزمیہ رفتار سے میدان جنگ کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ لفظ اُپی ہوئی تلوار بن جاتے ہیں۔
تلوار لے کے قاسم شیریں سخن بڑھے
عباس کیا بڑھے شہِ خیمہ شکن بڑھے

رزمیے اور الیے کا ایسا امتزاج انیس کے کلام کے قاری اور ناقد کو اُن کے مرثیوں کی ایک نئی تعریف وضع کرنے
پر مجبور کرتا ہے جس کے لیے ہمیں یونانی ڈراموں اور مغربی ادبیات میں الیے اور رزمیے کے اصول و آئین کی طرف پکٹنے
کی حاجت کم پڑتی ہے۔

انیس کے کلام میں جو ڈرامہ پایا جاتا ہے اُسے انیس ہی کے معیار سے پرکھنے اور پہچاننے کی ضرورت ہے۔
اسی ضمن میں دو اور باتوں کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں جا بجا تعلق پائی جاتی ہے۔
قطع نظر اس سے کہ وہ اس قسم کی تعلق میں حق بجانب ہیں۔ یہ تعلیمات اُن کے مرثیوں میں جس انداز اور جس عمل پر داخل
کی جاتی ہیں وہ بجائے خود ڈرامے کو اور گرائے میں مدد دیتی ہیں۔ یہ ایک قسم کی انتظار یہ کیفیت اور وقفہ راحت
(RELIEF) کا کام انجام دیتی ہیں۔

عین اُس وقت جب دونوں طرف تلواں کھینچ چکی ہیں اور وار ہوا رہی چاہتے ہیں۔ انیس بیچ میں
بول اُٹھتے ہیں :
اے شہسوار ملکِ سخن صغریٰ دکھا
جمعیتِ سپاہ کی پھر ابتری دکھا

گیٹی کو زلزلہ ہو وہ زور آوری دکھا
ہاں زور شورِ معرکہ حیدری دکھا

کٹ جائیں رنگ سسینہ اعدا فکار ہوں
پڑھنے میں دونوں لب جو کھلیں ذوالفقار ہوں

گر طبع میں کسی کی روانی ہوئی تو کیا کیا کہ سکے گا، تیز زبانی ہوئی تو کیا
بالغرض فوتِ ہمہ دانی ہوئی تو کیا مثلِ انیس سحسہ بیانی ہوئی تو کیا
فقروں کے ذوالفقار کا مطلب ادا نہ ہو
کٹ جاتے ساری عمر پہ اس کی شانہ ہو

یہ اشعار قاری یا سُنے والے کے اشتیاق کو اوتیر کر لے ہیں اور اُسے آئندہ پیش آنے والے واقعات کی
طرف مزید متوجہ کرواتے ہیں۔

دوسری بات جو انیس کے کلام میں ڈرامائی المناکی کو تیز و شدید کر دیتی ہے۔ وہ ہے حالات کی المیہ ستم ظریفی
(TRAGIC IRONY) کا عمل۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے مناسب ترین مواقع اور مقامات پر اس
نازک حربے کو کام میں لاتے ہیں۔

کربلا میں سب جاننا زکام آچکے ہیں اور حسینؑ تنہا زخموں سے چور میدانِ جنگ میں کھڑے ہیں۔ اتفاقی سے
ایک مسافر اُدھر آ نکلتا ہے صو

آ پہنچا اک مسافر غربت زدہ ادھر
وہ حسینؑ کے پاس پہنچتا ہے۔ اُنھیں اس عالم میں صابر و شاکر یا کراپنے حتیٰ میں دعا کا خواستگار ہوتا ہے کہ
اُسے نجف اور مدینہ کی زیارت نصیب ہو۔ امام پوچھتے ہیں کہ مدینہ میں کیا کام ہے، جواب ملتا ہے: صو
اُس سرزمین پہ ہے مرا آقا، مرا امام
اس مصرعے ہی سے المیہ مصرعے سے نکل کر ہم تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ تمام امور جو مرثیے میں اس کے بعد وقوع
میں آتے ہیں یا جن پر گفتگو ہوتی ہے، مختلف نوعیت اختیار کر لیتے ہیں۔ کربلا میں اُن کا عمل انگ ہے اور ہمارے
دل پر جو کچھ گزرتی ہے اُس کا عمل انگ ہے۔ اس میں التزام یہ رکھا گیا ہے تنہا ہم اس ایلے میں شریک
ہو سکیں۔ جو کچھ کربلا میں ہو رہا ہے اب وہ ہمارے دل میں ہو رہا ہے۔ ”یہ غربت زدہ مسافر“ اس کے بعد جو کچھ
کہتا ہے اُس سے ٹریجڈی اور گمبیر ہو جاتی ہے صو

دنیا ہو اور فاطمہؑ کا نور عین ہو

دیکھوں اُنھیں صحیح و سلامت تو چین ہو

پھر وہ امام کے گھرانے کے ایک ایک فرد کی خیر خیریت پوچھتا ہے اور سب کی درازی طرک دعائیں دیتا ہوا

علی اکبر کے بارے میں کہتا ہے :
 اُس رشکِ گل سے دُور خستراں کی بلا رہے
 یارب چمنِ حسین کا پھولا پھولا رہے
 زمین ایک بارتیزی سے اپنے محور پر گھوم کر رک جاتی ہے اور در دھٹ پڑتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ مسافر نے
 یہ کیا کہہ دیا ! المیہ ستمِ ظریفی کی ایسی مثالیں ہمارے ادب و شعر میں تلاش کرنا خاصا دشوار کام ہے۔
 ہینٹی اعتبار سے انیس کے اکثر و بیشتر مرثیے مسدس میں ہیں۔ اس صنف کو اُنھوں نے اپنے لیے
 منتخب کر لیا تھا اور یہ کچھ اس طرح اُن سے مختص ہو گئی ہے کہ اب کوئی بھی مسدس کے وہ انیس کی چھاؤں سے
 نکل نہیں سکتا خواہ وہ حالی ہوں، اقبال ہوں یا جوش ہوں۔ اقبال کے ”شکوہ“ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :
 شان آنکھوں میں نہ جیتی تھی جہاں داروں کی
 کلمہ پڑتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
 پاؤں شیروں کے بھی میدان سے اکھڑ جاتے تھے

نقشِ توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
 زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

اور اب انیس کو سنئے :
 زاہد ایسے تھے کہ مت از تھے ابراروں میں
 عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

گو مصیبت میں، تلاطم میں، تباہی میں رہا
 سر کٹے پاؤں مگر راہِ الٰہی میں رہے
 مسدس کی صنف کی پہنائی، اُس کے مصرعوں کا تسلسل اور یکے بعد دیگرے قوی سے قوی تر ہوتے جانا
 اور بیت پر پہنچ کر تکمیل کی بھرپور گونج بن جانا۔ ان امکانات اور رموز کو انیس سے بہتر شاید ہی اور کوئی
 پاسکا ہو۔
 انیس اور مسدس کے تعلق سے طویل گفتگو کی جاسکتی ہے مگر اس مضمون میں انیس کے پورے کلام کے

احاطہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے وہ بہت سرسری ہے۔ انیس کے ہزاروں مرثیوں کا جائزہ لینے اور اُن سے بحث کے لیے ضمیمہ کتابیں درکار ہیں۔

اب آخر میں اُن کے ایک اور بنیادی عنصر پر اُچھٹی سی نظر ڈالنی ضروری ہے۔ جہاں انیس کے جذبِ دروں، مشاہدے، بصیرت اور کائناتی ادراک کی بات چل نکلتی ہے وہاں اُس دائرے کا ذکر بھی لازمی ہو جاتا ہے جو اُن کی پوری شاعری کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ دائرہ اُن کی زبان کا ہے۔ اردو انیس کی زبان نہیں ہے بلکہ انیس کی زبان اردو بن گئی ہے۔ یہ میر تقی میر، شیخ ابراہیم ذوق اور نواب مرزا خاں داغ کی اردو نہیں ہے جس میں ”اردو پن“ کی نرمی، برآقی اور چاشنی تلاش کی جائے۔ انیس کی زبان کی پہچان اُس کی چاشنی یا فصاحت و بلاغت سے ہی نہیں کی جاسکتی۔ اس کو پہچاننے کے لیے ہیں وہاں جانا پڑتا ہے جہاں پورا کنبہ بستا ہے اور اپنی گھریلو زبان بولتا ہے۔ اردو شاعری میں خالص دیسی (VERNACULAR) کا پہلی بار استعمال انیس کے یہاں ہوا ہے۔ برسرِ منبر انیس نے بار بار کہا ہے۔ صابو! یہ مرے گھر کی زبان ہے۔ اردو کے جملہ شاعروں کے پاس فارسی یا اردو ہی میں زبان کے ایسے نمونے موجود تھے جس میں شغوی، قصیدہ یا غزل کہی جاسکتی تھی۔ مگر انیس نے زبان کے جس دائرے کو اپنایا ہے وہ اُن کا اپنا کھینچا ہوا ہے۔ اس میں پہلی بار وہ تمام چیزیں ملتی ہیں جن سے اردو شاعری ناواقف تھی۔ انیس زبان کے جس نازک، بلاخیز اور ہلاکت آفریں پیل صراط کو تعمیر کرتے ہیں اور جس قدر سہل سے اس پر سے گزر جاتے ہیں اس کے تصور ہی سے اردو شاعری کی سانس اٹھرنے لگتی ہے۔ اُن کا کلام زبان آوری اور زبان دانی ہی نہیں ہے۔ یہ شعروشاعری کی کاشت، آبیاری اور برومندی کا سب سے نتھرا، صاف شفاف سرچشمہ ہے۔ لفظوں کے جملہ امکانات اور محلی استعمال سے گہری باخبری کا نام انیس کی زبان ہے۔ اُن کی زبان زندگی پر بھرپور گرفت ہے۔ اُن سے پہلے اردو کم گو، کم سماعت، کم بھارت تھی۔ انیس نے اسے بولنے کے آداب سکھائے۔ دیکھنے کے زاویے دئے اور زیر لب گفتگو کو سُسنے کی قوت بخشی۔ اُن کا دعویٰ کچھ غلط نہیں ہے۔

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو تیرم کر دوں بحرِ تواجِ فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں، ذرے کو انجم کر دوں گنگ کو ماہر اندازِ تسکیم کر دوں

دردِ سر ہوتا ہے، بے رنگ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اگر کوئی پوچھے کہ انیس نے اردو کو کیا دیا تو ایک لفظ میں کہا جاسکتا ہے۔ نطق! وہ نطقِ عظیم جو صرف

محض انیس کے پاس ہے۔

مری قدر کر اے زمینِ سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا

زبان کی مکانی حقیقت

۱۵ کٹر شہیل بخاری

پوری انیسویں صدی عیسوی میں لسانیات کے مطالعے پر تاریخی حیاتی رہی ہے اور کسی زبان کے تشریحی مطالعے کو اس تاریخییت سے ہٹ کر قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس تاریخی لسانیات کا نظریہ یہ تھا کہ عام زبانیں کسی ایک ہی قدیم زبان سے نکلی ہیں۔ اسی لیے ان میں کچھ مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ ان مشابہتوں کی بنیاد پر انہیں مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح ممکن ہے آگے چل کر ان خاندانوں کی مشترکہ مشابہتوں کی بنیاد پر تاریخی لسانیات کسی ایک قدیم ترین زبان تک پہنچے ہیں کامیاب ہو جائے جو دنیا بھر کی تمام زبانوں کی مورث اعلیٰ قرار پائے لیکن لوگ ایسی کسی زبان کا سراغ نہیں لگا پائے اور بدگلی میں پھنس کر رہ گئے۔ اسی لیے لسانیات کی تحقیق میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی اور لوگوں میں ایک طرح کی بدگلی اور بیزاری سی پیدا ہو گئی۔

فرڈی نینڈوی سارسہلاما ہر لسانیات ہے جس نے اپنی کتاب کورس ان جنرل لنگویٹکس میں زبان کے مطالعے کو مندرجہ ذیل دو قسموں میں بانٹ کر ان دونوں خیالات کو الگ الگ کیا۔

- ۱۔ ہم وقتی۔ کسی ایک مقام پر کسی ایک دور میں زبان کی حالت کا مطالعہ جسے تشریحی لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔
 - ۲۔ سہ وقتی۔ کسی ایک مقام پر زبان کی دو دربدور حالتوں کا مطالعہ جسے تاریخی لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔
- سارم کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نے تشریحی لسانیات کو تاریخی لسانیات کی غلامی سے آزاد کر کے پہلی بار اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی لیکن ابھی اس کا جائزہ اور واحد منصب دلانے کے لیے کسی پس و پیش کے بغیر و لوگ الفاظ میں یہ اعلان کروینا بھی ضروری اور باقی ہے کہ تاریخی لسانیات نہ صرف الٹی اس کی پابند اور محتاج بلکہ خود اپنی جگہ ایک بے کار مشغول اور گمراہ کن مفروضہ بھی ہے جس نے لسانیات کے مطالعے کو ایک غلط راستے پر ڈال کر اس کی تحقیق اور فروغ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔

ذرا سا غور کرنے پر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مطالعہ زبان کے متعلق ماہرین کا نظریہ اب تک ٹیڑھا رہا ہے ، تشریح اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب تک کسی ایک مقام پر مرکوز زبان کی کسی ایک دور کی حالت کا مطالعہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس دور بدور حالتوں کا موازنہ کیسے ہو سکے گا ، اور اس کی تاریخ کیسے مرتب کی جاسکے گی۔ کیونکہ خط مستقیم مختلف نقاط کے تسلسل کو کہتے ہیں اور تاریخ مختلف ادوار کے تسلسل کا دوسرا نام ہے۔ اس کے معنی یہ سمجھئے کہ ہم وقتی مطالعہ جسے تشریحی لسانیات کہتے ہیں ، ہم وقتی مطالعے یعنی تاریخی لسانیات کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس

تاریخی لسانیات تشریحی لسانیات کی مدد کی محتاج ہے۔
پھر اسے اس پہلو سے سمی دیکھئے کہ کائنات میں زمان کی نشتریں مکان کے حوالے سے ہی کی جاسکتی ہے کیونکہ زمان مکان کی ہی ایک مجر و شکل ہے۔ وقت کی اکائیاں بنیادی طور پر مکانی ہیں۔ زمان کی پیمائش کے طریقوں کی اساس بھی مکان ہے۔ زمانی تصور سخاوی تصور کا محسوس ہے اور تاریخی جغرافیائی سرحدوں سے ہی اپنے طویل سفر کا آغاز کرتی ہے۔ زبان کی تاریخ جانے کے لیے اور جانے سے پہلے اس کی دور بدور حالتوں کا علم ناگزیر ہے۔ یعنی لسانی مطالعے میں بنیادی ملکہ واحد اہمیت مکانی لسانیات کو حاصل ہے اور مکانی لسانیات کو زمانی لسانیات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اب اس حقیقت کو ایک اور زاویے سے دیکھئے۔ تاریخ میں زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال قبل مسیح تک لے جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے کے کوئی آثار ہم کہ نہیں پہنچے۔ تاریخی لسانیات والے یہ نہیں بناتے کہ انھوں نے لسانی تحقیق کی غرض سے اس مدت کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کی مدت کتنی رکھی ہے؟ کیا ایک ایک ہزار سال کا ایک ایک دور مقرر کیا جاسکتا ہے؟ کیا اتنی نثریں دستیاب ہیں کہ انھیں آٹھ ادوار (چھ ہزار قبل مسیح + دو ہزار بعد مسیح) میں تقسیم کر دیا جائے یا پانچ سو سال کا ایک ایک دور ٹھیک اس پر سے مرصعہ کو سولھا ادوار میں بانٹ دیا جائے۔ اور زبان کے سولھا سو نمونے تقابلی مطالعے کے لیے سامنے رکھ لیے جائیں؟ مجھے یقین ہے کہ ان کے پاس اتنے تحریری نمونے اس یکساں حد بندی کی شرط کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔

دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ کس تحریر کو ایسے دور کی نمائندگی کا حق حاصل ہے؟ تاریخی لسانیات کے ماہرین کے پاس وہ کونسا معیار ہے جس کی رو سے وہ یہ طے کر سکتے ہیں کہ فلاں زمانے کی اتنی تحریریں ہیں سے صرف فلاں تحریر اس دور کی نمائندہ ہے اور اس کے علاوہ دوسری کوئی تحریر نمائندگی کی اہلیت نہیں رکھتی؟ یا کسی نمونے کی دستیابی ہی کہ اس کی نمائندگی کا معیار بنالیا گیا ہے۔؟ غالباً بات کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانے کی جو تحریریں مل گئی ہیں وہ اس دور کی نمائندہ تحریر مان لی گئی ہے۔

فرمن کیجئے کہ ایک ہی زمانے میں ایک شاعر شعر کہتا ہے اور دوسرا شخص جزائیے کی کتاب لکھتا ہے تو دونوں میں سے کس کی تحریر اس زمانے کی زبان نمائندہ مانی جائے گی؟ اردو کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی زبان ایسویں صدی میری کے نصف آخر کی نمائندہ زبان مانیں گے یا اس جزائیے کی کتاب کی زبان کو نمائندگی کا حق دیں گے جو اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔

اگر ایک ہی شخص کی دو تحریریں سامنے آجاتی ہیں۔ ایک اس کی شاعری اور دوسری اس کی نثر دونوں میں زبان کے اعتبار سے فرق ہے تو اس کی کون سی تحریر اس کے دور کی نمائندگی کرے گی؟ اگر اس کی شاعری میں بھی دو قسم کی زبان استعمال ہوتی ہے تو اس کی شاعری کا کون سا جز اس دور کی زبان کا نمائندہ ہوگا؟ مثلاً مرزا غالب دہلوی کے خطوط کی زبان

ان کے اشعار کی زبان سے مختلف ہے اور پھر خود اشعار بھی دو قسم کی شکل اور آسان زبان میں کہے گئے ہیں تو ان کی زبان کا کون سا نمونہ اور کون سا جزو نامزد مانا جائے گا۔؟

آج سے گیارہ سال پہلے میں نے ۱۹۷۷ء میں تشریحی یعنی مکانی لسانیات پر ”اردو کا ڈوپ“ نامی ایک کتاب لکھی تھی جس میں زیادہ سے زیادہ کھڑی اور بے میل اردو لکھنے کی حتی المقدور کوشش کی تھی تاکہ اردو کو حقیر اور بے مایہ سمجھنے والوں کو یہ دکھا سکوں کہ اردو خود اپنے پیروں پر اور اپنی ہی سکت سے کھڑی ہوتی ہے اور اس میں فنی اور علمی موضوعات پر بھی لکھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی زبان میری موجودہ تحریر کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اگر مستقبل میں تاریخی لسانیات کے کسی ماہر کو صرف میری ہی دونوں تحریروں دستیاب ہو جاتی ہیں تو کیا وہ میری اردو کو پورے موجودہ دور کی زبان کی نمائندہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا؟ اور اگر وہ صرف ان کی دستیابی ہی کی بنیاد پر انہیں نمائندگی کا حق ہے دنیائے ہر دور کی زبان کے نمونے کے طور پر ان دونوں تحریروں میں سے کون سی تحریر پیش کرے گا۔؟ پھر اگر زبان اور ایام ہی سے تبدیل ہوتی ہے تو کیا وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ اردو زبان صرف تیرہ سال کے عرصے میں اس قدر بدل گئی ہے؟ اور اگر وہ یہ نہیں کہتا، زبان کے فرق کی کیا توجیہ کرے گا۔؟

میرامن دہلوی کی کتاب ”باغ و بہار“ (سین تصنیف ۱۹۷۸ء) اور رجب علی سرور کی کتاب ”فسائے عجائب“ تصنیف ۱۹۷۴ء کی انہو میں جو فرق نظر آتا ہے اس کی وجہ بائیس سال کا بعد زمانی ہے یا دہلی اور کھنڈ کے درمیان مکانی فاصلہ؟ اعظم علی اعظم اکبر آبادی کی طرح ابتداء میں رجب علی بیگ سرور بھی آگرے کے باشندے تھے، لیکن بعد میں کھنڈ میں جا بے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں یعنی جس سال رجب علی بیگ سرور نے ”فسائے عجائب“ لکھا۔ اعظم علی اعظم نے ”قصہ سرور افزا“ لکھا، لیکن دونوں کی اردو میں فرق ہے اور جب دونوں کی تحریروں میں زمانی فاصلہ نہیں ہے تو کھنڈ اور آگرے کے مکانی فاصلے کے سوا فرق کی اوجہ ہو سکتی ہے؟

بہ پچھلی صدی کی بات تھی اور ڈیڑھ سو سال پُرانی بات تھی۔ اب میں آپ کے سامنے اسی صدی بلکہ اس سے بھی نصف آخر کی اردو بول چال کے تین نمونے پیش کرتا ہوں۔ یہ نمونے میں نے تقریباً تیرہ جودہ سال کی عمر کے لڑکوں کی امتحانی کاپیوں سے جو اردو زبان زبانِ بول حیثیت سے پڑھ رہے تھے۔ ان کے نمائندہ اور چیدہ جملے ایک جاکر کے ۱۹۷۱ء میں تیار کئے تھے۔ ان کے سلسلے میں میرا کام بطور مدیر صرف اتنا رہا ہے کہ میں نے مضمون مختصر کر دیا ہے۔ لیکن جملوں کے انتخاب میں یہ دھیان رکھا ہے کہ ان کے خیالات کا تسلسل برقرار رہے اور مقامی بول چال کی زیادہ سے زیادہ خصوصیات سامنے آجائیں۔

۱۔ ٹوہا کے کی اردو :

ہم لوگ کا اسکول ساڑھے بارہ بجے بیٹھا ہے اور ایک بجے چھٹی پڑتی ہے۔ سب سے بعد میں اپنے کلاس سے کھتا ہوں، میں جب اسکول سے آتے ہیں تو اس وقت ڈیر بجاتا ہے۔ اس وقت اتنا گرمی ہوتا ہے کہ سب کوئی اپنا ہرش دھواں اڑا دیتا ہے۔

اسکول سے آنے کے بعد ہم گوسول لیتا ہوں۔ بڑا ابدلی کر نشہ کرنے ہیں۔ صبر توڑا آرام کئے ہیں۔ ایک کھنڈہ مولیٰ صاحب سے پڑھتے ہیں۔ میں بلجے سے اسکول کا کام بنانا ہوں۔ بھیر ہم دوسرا کپڑا بدل کر اپنے دوستوں کے یہاں چلے جاتا ہوں سب کوئی کو ساتھی کی ضرورت ہے۔ بغیر اس کے کوئی رہے نہیں سکنا۔ اس طرح کئی دوست ہو جاتے۔ میرے بھی بہت سے دوست ہیں۔ ان لوگ ہمارے مکاں کے پاس ہی رہتے ہیں۔ اس کا باپ بہت اچھے ہیں۔ میں کوئی دن کرکٹ کھیلتا ہوں۔ کوئی دن فٹ بال کھیلتا ہوں۔ دو تین گھنٹا کھیل کرنے کے بعد گھر آئے۔ کچرا بلی کہا۔ بھیر میں سائیکل پر بیٹھ کر نانی کے گھر چلے جاتا ہوں۔

مغربی، دیر کے بعد وہاں سے کھڑے کھڑے گھر جاتا ہوں۔ بھیر میں سائیکل پر بیٹھ کر نانی کے گھر چلے جاتا ہوں۔

میرے کھانا کھاتے ہیں۔ سردی میں گوسول کے لیے گھنٹا سے پانی گرم کرنا پڑتا ہے۔ بھیر گوسول کر کے گرم کپڑا پہنے تو ٹھنڈا لگتا ہے۔ کھانا بعد میں رات کی سسائی میں ابا پر حائی نکالتے ہیں اور برہنہ کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنی امتحان کا تیاری کرنے ہیں۔ اگر کچھ سوچ میں رہیں آئے تو ابا پر حائی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی کہانی کی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس طرح ساڑھے دو بج جاتے ہیں۔ رات اجڑتی آتا کو سلام کرتے ہیں۔ بھیر کلمہ پڑھنا میں اور اگیا رہ باجے سو جاتا ہوں۔ دوسرا دن جب آکھو کھلتی ہے تو پھر آئینا کام شروع کرنا میں۔ سب کوئی گھر کے یہاں ٹھیک ہیں۔ والد صاحب ہمارے امتحان سے پریشان ہیں۔ وہ بچوں کو امتحان کے بعد کھانا کھائیں گا۔

۲۔ پشاور کی اردو:

جب ہمارا اسکول کا چھٹی کی گھنٹی بجی تو ہم اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ ساڑھے ایک بجے گھر کو پونچھ لگا۔ ماں باپ کا سلام کرتا ہوں۔ پھر کپڑے بدل کرنا ہوں۔ منہ ہات دوتا ہوں۔ جب روٹی کھاؤں تو توڑا دوپہر کا نیند کرتا ہوں۔ جب اٹھ جاتا ہوں تو وضو کر کے نماز کروں۔ نماز کے بعد ہم چائے پیتا ہے۔ پھر وٹ بال کرنے جاؤں۔ میرا فٹ بال کے ساتھ بہت شوق ہے، کچھ شاہی باغ جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ چلا گئیں لگاتے ہیں۔ اٹھنا نہ جاتے ہیں۔ لڑکے شام تک کھیلوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کے بعد دراد صوب کمزور ہو جاتا ہے۔ جب میں کھیلنے سے آجاؤں تو پھر بار بار کو بچکر لگاؤں گا۔ اس کے بعد قرآن شریف کا تلاوت کرتا ہوں۔ تلاوت کے بعد میں اپنے بہن کی گھر جاؤں۔ بہن کی خاوند بالو ہے۔ جب بہن کی گھر سے آجاؤں تو پڑھائی کرتا ہوں۔ باپ ہم کو پڑھائی میں بہت کوشش کرتے ہیں اور بعد میں اس پر خوب سمجھتا ہوں۔ کچھ دیر بعد مجھ سے پوچھنا کہ میں نے اب کیا کیا بنا یا اور میں اس کو بتاتا ہوں۔ جب کسی چیز مجھے غلط ہو جائے تو پڑھائی کا کام ختم کرنے کے بعد پھر میں عشاء کا نماز پڑھوں اور پھر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد میں اپنا دماغ کو نازہ کر رہا ہوں۔ پھر پڑھائی کا کام شروع کرتا ہے۔ پھر میں اپنا لبتہ بند کروں اور پھر پڑے بھائی کے ساتھ مجھ سے لطیفے پیش کرتے ہیں۔ پھر سائیکل کا سعالی کرتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔ اس لیے میں اس کام کو ہمیشہ اس طرح آباد رکھیں گے تو کامیاب ہوں گے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی کاموں کو وقت پر کریں۔

۳۔ لاہور کی اردو :

مجھے سکول سے تقریباً ایک سبجے ٹیچی ہوتی ہے۔ سکول سے آنے کے بعد کمزور بہت تھکاوٹ ہوتی ہے لہذا ابترہ رکھ کر باغیچہ دھو کر کھانا کھاتا ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑا سو جاتا ہوں اور نین سبجے تک سویا رہتا ہوں۔ اُس وقت میں کھلا کرتا اور کھلی شوار پینتا ہوں۔ گرمی اتنی ہوتی ہے کہ اُٹھنے کو دل نہیں کرتا۔ پھر ایسا کام جو دباگیا ہوتا ہے وہ میں نے کرنا ہے۔ اس کے بعد نزدیکی ہنر پر نہاتا ہوں۔ اس سے ایک تو درزش ہو جاتی ہے دوسرا گرمی سے نجات مل جاتی ہے۔ پھر میرا دل کھیلنے کو کرتا ہے تو میں کھیلنے چلا جاتا ہوں۔ میں بہت سی کھیلیں کھیلتا ہوں۔ مرضی آئے تو ہم الوار کو مخالفت ٹیم سے میچ بھی ڈالتے ہیں آگے میرا دوست بلو ہوتا تھا۔ جب دیکھا اس نے کتاب ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہے۔ وہ امتحان میں اچھے نمبر لیتا تھا۔ اب وہ دوسری کامیاب لگا ہوا ہے۔ نین چار دنوں کے بعد میں اس کے پاس بھی چلا جاتا ہوں۔ سب گھر واپس لوٹا تو آگے شام کی چائے میز پر پڑی ہے۔ اور صبح میں بھر کا ڈھوا ہوا ہے۔ پھر میں پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس وقت تک پیسہ سٹوکل چکا ہوتا ہے۔ سکول کا کام کرنے کا میں نے ٹائم ٹیبل بنایا ہوا ہے۔ اکثر نو میں اپنا کام سکول میں ہی ختم کر کے آتا ہوں۔ گھر میں سر کوئی مجھ پر خوش رہتا ہے کیونکہ میں روزانہ کام روزانہ کرتا ہوں۔ اس وقت میں جب لٹے بھائی کو پڑھنے کو کہتا ہوں۔ سکول کے کام کو ختم ہوتے ہوتے مغرب آ جاتی ہے۔ جب سورج غروب ہوتا ہوا دکھائی دینے لگ جاتا ہے اور پرندے اپنے گھونسلوں کو جا رہے ہوتے ہیں تو تب بجلی کا بلب جگاتا ہوں اور ٹی وی دیکھنے لگ جاتا ہوں۔ کیونکہ میں نے کام کر لیا ہوتا ہے اور میرے دوست ٹی وی دیکھنے آئے ہوتے ہوتے ہیں۔ ٹی وی ہم گھر میں اس لیے کم دیکھتے ہیں کیونکہ رانیں بھوٹی ہوتی ہیں بھر ماٹر صاحب نے ہر مضمون یاد کرنے کو دیا ہوتا ہے وہ یاد کر لیتا ہوں۔ اگر کوئی سوال مٹھول جائے تو آج جان سے وہ سوال پوچھ لیتا ہوں۔ رات کو سوتے وقت میں اور میرے بہن بھائی آپس میں پہیلیاں بھی ڈالتے ہیں۔ اس طرح پہیلیاں ڈالتے ڈالتے کوئی دس بجے کے قریب جا در لے کر سو جاتے ہیں کبھی کبھی سونے کے پہلے میں آج جان کو بھی دیتا ہوں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ زبان کبھی اور کہیں بھی ہمارا درک نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ماہرین لسانیات کی چند آراء ملاحظہ فرمائیے:

ایڈورڈ سپر کہتا ہے: ”ہر شخص جانتا ہے کہ زبان رنگ رنگی ہوتی ہے۔“

اشیفی المین کہتا ہے: ”عام زبان کبھی کیسا نہیں ہوتی۔ ہم چاہے تین ہزار سال قبل مسیح کی بات کریں چاہے ۱۹۵۰ء کی مکمل طور پر ایک رنگ زبان ایک مخالف ہے۔“

جون لیونز کہتا ہے: ”کوئی زندہ زبان مکمل طور پر یکساں نہیں ہے۔“

اگر آپ زبان کی مکمل دست اور رنگارنگی کا اندازہ کرنا چاہیں تو کراہ ارض کے محیط کے ساتھ ساتھ شرقاً وغرباً یا شمالاً جنوباً

سفر کرتے چلے جائے آپ کو یوں لگے گا کہ جیسے یہ صغیر زمین نہیں ایک وسیع و بسیط خطہ جس سے جس میں بھانت بھانت کی چڑیاں پہچا رہی ہیں۔ انسان زمین کے مختلف سطحوں اور علاقوں میں بسے ہوئے مختلف زبانیں بول رہے ہیں جن میں پڑوسی ایک دوسرے کی بول چال سمجھ لیتے ہیں، لیکن جیسے جیسے دو علاقوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہونا چلا جاتا ہے اُن کے باہمی ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں وقت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی ملک کے دو سروں پر بسنے والے باہمی انہام و نفہیم سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ زبانوں کا مذہبی فرق جغرافیائی خطوں کے درمیانی فاصلے بڑھنے کے باعث آخر میں اگر مکمل اجنبیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ زبانوں کی تقسیم ہے جس کا تشخیص درمیانی فاصلے قائم کرتے ہیں۔

خود ایک زبان کے سماج میں بھی لوگ یکساں زبان نہیں بولتے۔ ایک ہی زبان کی معیاری اور غیر معیاری دو مختلف نسلیں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ معیاری زبان بولتے ہیں بعض غیر معیاری۔ ایک ہی شخص دو مختلف موقعوں پر، دو مختلف اوقات میں اور دو مختلف موضوعات سے متعلق گفتگو میں مختلف زبان استعمال کرتا ہے۔ جسے اس کا انفرادی اسلوب یا طرز زبان کہتے ہیں۔ دو بولنے والوں کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے کیونکہ ان کے ذخیرہ الفاظ مختلف اور اسلوب بیان جدا جدا ہوتے ہیں۔ پھر ایک ہی لسانی سماج مختلف طبقات میں بٹا ہوتا ہے جن میں سے ہر طبقہ اپنی اپنی مخصوص زبان بولتا ہے۔ علمی زبان، مذہبی زبان، قانونی زبان، طبی زبان، فنی زبان اور عوامی زبان کی زبان وہ طبقاتی زبانیں ہیں جو الگ بچان لی جاتی ہیں۔ یہ معیاری زبانیں ہیں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد، عالم اور عامی، مختلف طبقات والوں مثلاً مذہبی عالموں، ڈاکٹروں، سوداگروں، انجینئروں، وکیلوں، طبیبوں، جوہریوں، سائنسدانوں اور فن کاروں کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کھیلوں کی اور تفریح جات کی زبان بھی الگ الگ ہوتی ہے۔

عورتیں مردوں سے الگ ہی بولی بولتی ہیں۔ ان کے نصاب، محاورے، لہجے، روزمرے، محاورے، بددعائیں، کوستے، قمیص، اور اسلوب لباس بالکل بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ خدامت پرست ہوتی ہیں اور قدیم رسوم اور عادات سے وابستہ رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان پر بیرونی اثرات بھی اتنے نہیں پڑتے جتنے مردوں پر پڑتے ہیں، کیونکہ مردوں کا تعلق باہر کی دنیا سے اور عورتوں کا تعلق گھروں کی اندرونی دنیا سے زیادہ ہوتا ہے اور گھر ایک قلعہ ہوتا ہے جس میں باہر کے اثرات کا نفوذ مشکل سے ہر پاتا ہے۔ عورتوں کے چند اُردو الفاظ، مرکبات اور محاورات وغیرہ کی مثالیں دیکھئے۔

اُپر والیاں (چیلیں پرہاں)۔ اُپر والا (چاند)۔ اندر والا (دل)۔ سبب (موت)۔ انتقال، راتر جانا (بچے کا مرجانا)۔ سدھارنا (رخصت ہونا)۔ چلا جانا، نقرآن درمیان (ایک زمدہ اور ایک مرده انسان کا ساتھ ساتھ ذکر کرتے وقت) بمبشتی (مرعوم)۔ مرا ہوا، بی بی کا دانہ (حضرت خاتون حبت کی نذر)۔ راجا باسک، ماموں، رستی (سانپ)۔ سدھارنا (جاننا، رخصت ہونا)۔ چوڑیاں ٹھنڈی کرنا (چوڑیاں توڑنا)۔ اجلی (دھوپ)۔ اندر رکھے (دُعا)۔ جدا عمر دراز کرے)۔ مانگ کو کہ سے ٹھنڈی رہے (دُعا)

شہر اور اولاد سلامت رہے۔ مانگ اُجڑنا (شہر کا مرجنا)۔ دو دھوں نہاؤ پوتوں پھلو (دعا۔ خدا مال و دولت اور اولاد عطا کرے) کو کھجلی (وہ عورت جس کا بچہ مرجائے)۔ بڑی کتاب (قرآن مجید)۔ مردوار (مرد) آیا لگایا (غیر، اجنبی جسے اپنا یا جانے)۔ کھجڑے پٹیا (بددعا)۔ سوا (بددعا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان مردوں کی واسطہ اور عورتوں کی سہیلی ہے۔ چنانچہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی بول چال میٹھی، آسان اور ہلکی چسکی اور لہجے میں رسانی اور نرمی ہوتی ہے۔ زبان میں خوف، وسوس، شکوک، شرم، لحاظ اور شہید نیک و بد خواہشات اور آرزوئیں شامل رہتی ہیں۔

غیر معیاری زبان بولنے والوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً چھیروں، مزدوروں، قسائیوں، بھٹیاریوں، چڑی ماروں، مختلف کاریگروں، اور راج مستریوں وغیرہ کی اپنی اپنی فنی اور اصطلاحی زبان ہوتی ہے۔ جہازی مزدور اپنی غیر معیاری بولی بولتے ہیں۔ ٹھکوں، لٹیروں، چروہ، مادی بھرموں، غنڈوں اور قانون شکنوں کی بولی الگ ہوتی ہے۔ مڈاری، بازی گراؤ سرکش ناشے والے اپنی اپنی بول چال رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں میں زر زری جیسی خفیہ زبانیں بھی بولی جاتی ہیں تاکہ کوئی دوسرا ان کی بات نہ سمجھ پائے۔

غرض جس طرف دیکھتے مختلف زبانوں اور لہجوں کا ایک گھنا خنک اور ایک گھٹا ہوتا مانا بانا نظر آتا ہے اور زبان کی مختلف آوازوں کا نامہوار، آونچا نیچا اور مہم سا شور مٹائی دیتا ہے۔

ملائائی فرق سے بھی ایک زبان کی مختلف شکلیں سوجاتی ہیں۔ جب ایک زبان کسی سیاسی، کاروباری یا مذہبی سلسلے میں کسی دوسری زبان کے علاقے میں پہنچ جاتی ہے تو وہاں کے لوگ اُسے اپنی مادری زبان کے ساتھ ملا کر بولتے اور لکھتے پڑھتے لگتے ہیں۔ اس لوہاں زبان کو سفر کرنے والی زبان کا مقامی محاورہ کہتے ہیں، جیسے ویدک اور سنسکرت جو آریاؤں کی سندھی بولی میں ہندوستان کی مختلف بولہوں کی ملاوٹ سے تیار ہونے والا محاورہ ہے۔ امریکی انگلش اور انڈین انگلش برطانوی انگریزی کے امریکی اور ہندوستانی محاورے ہیں جو امریکا اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کی آمیزش سے بنے ہیں۔ سبک ہندی ایران کی فارسی کا ہندوستانی محاورہ ہے جو فارسی میں ہندوستانی زبانوں کے میل سے تیار دہلے۔ اکبر آبادی، دہلوی، لاہوری اور حیدر آبادی اور ہماری زبان کے مقامی محاورے ہیں جو معیاری اردو میں بالترتیب برج بھاسنا، ہریانی، پنجابی اور دکنی زبانوں کے میل سے آمیزے ہیں۔

ایک زبان کا دوسری زبان پر اثر مستعار لیے جانے والے الفاظ سب ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ آوازوں، لہجوں اور روزمرہ محاوروں، تعلیم، استعاروں، کہاوتوں اور اسالیب بولی وغیرہ تک جا پہنچتا ہے۔ جیسے اینڈرسن کہتا ہے کہ

مے بلوم فیلڈ لیگنچ ۱۸۵۹ء۔

۵ اردو کی کہانی - پانچواں انگ ۱۹۹ء۔

اسپین میں لاطینی زبان آئبرین لہجے میں بولی جاتی تھی۔ اعلیٰ کے کچھ علاقوں میں اسے لوگ آسکن امبرین لہجے میں اور دوسرے علاقوں میں ڈیٹسکس یا لونیائی لہجے میں بولتے تھے۔ رومانیا میں بلقانی زبانوں نے لاطینی کے تلفظ کو متاثر کر دیا تھا۔ ویدک اور سنسکرت میں ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ٹھ، ٹی، ڈھ، ٹی، ڈھ کی آوازیں ہندوستان کی مختلف مقامی زبانوں سے داخل ہوئی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ آوازیں دوسری آریائی زبانوں مثلاً فارسی اور یونانی وغیرہ میں نہیں ملتیں۔

آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ آجکل آئرلینڈ کے سوائے احریری زبوں علاقوں کا مقامی محاورہ صوتیات اور صرف و نحو میں آئرش زبان سے متاثر ہے اور ہیراکوٹے کی گوارانی انڈین زبان نے اس علاقے میں بولی جانے والی ہسپانوی زبان پر اسنے اثرات مرتب کیے ہیں۔

دوسری طرف جو زبان اپنے سی ملائے میں کسی دوسری آلے والی زبان سے ملتی ہے۔ وہ بھی اس کے اثرات قبول کرتی ہے اور اگر آلے والی زبان سیاسی یا لسانی بالادستی بھی رکھتی ہے تو یہ اثرات اور بھی گہرے اور دور رس ہو جاتے ہیں اس تجربہ کی قریب قریب تمام زبانوں پر سنسکرت، تالیسی، سری اور انگریزی کے اثرات اور اثرات کے تحت چھوٹی بڑی ردوبدل اس کا ثبوت ہیں۔

مختصر یہ کہ زبان پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ زمین کے مختلف خطوں اور علاقوں میں اس کی مختلف قسمیں بولی جاتی ہیں۔ ہر علاقے میں انسانوں کا ایک ہی سماج ہوتا ہے۔ جو ایک زبان بولتا ہے اور ہر دو علاقوں کے درمیان میں ایک لہجہ زبان پائی جاتی ہے جس میں دونوں طریقوں کی خصوصیات باقی جاتی ہیں۔ ہر لسانی علاقے کا ایک مرکز ہوتا ہے جہاں زبان کا معیاری محاورہ بولا جاتا ہے۔ لکھی جیسے جیسے مرکز سے نکل کر سرحد کی طرف بڑھتے گتے ہیں اس کے معیار میں عادت اور ضبط میں نرمی ملنے لگتی ہے۔ پڑوسی زبان کی خصوصیات کا میل شروع ہو جاتا ہے اور یوں گتتا ہے جیسے زبان کا گہرا رنگ بدلا ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی ایک لسانی علاقے میں بھی دو مختلف مقامات کے رہنے والوں کی زبان بالکل ایک سی نہیں ہوتی۔ زبان کا دائرہ عمل کبھی جو میٹری کی سی معین شکل میں نہیں ملتا اور دونوں زبانوں کے درمیان میں کوئی واضح حد فاصل بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ایک لسانی علاقے کی حد پار کر کے دوسرے لسانی علاقے میں دور تک نہیں پہنچ جاتے۔ سرحد کے گزرنے کا علم تو علم احساس بھی نہیں ہو پاتا۔

ہر زبان میں بیک وقت متعدد رنگ نظر آتے ہیں۔ ہر لسانی علاقے میں سماج کے مختلف طبقوں کی بول چال میں

۱۔ جیس ایڈریس کی بیان کی ہوئی ان آواروں کے ساتھ ساتھ بھاری آوازیں (مہا پران) بھی ہندوستانی زبانوں سے ویدک اور سنسکرت میں گئی ہیں۔ اگرچہ یہ بھی دوسری آریائی زبانوں میں نہیں ملتیں۔ سہیل سنجاری۔

۲۔ اسٹیکرل آکپٹس ص ۸۹ تا ۹۲۔

۳۔ لارڈ آلوپرسن۔ لینگویج ص ۲۰۵۔

تھوڑا تھوڑا سا فرق ملتا ہے۔ یہ ملتے پیٹے، مشغلے، علم و فن، جنس (مرد، عورت)، مالی حیثیت اور تہذیب و ثقافت وغیرہ کے لحاظ سے بنتے ہیں۔ ہر طبقے کے افراد کی گفتگو بھی ایک دوسرے سے قد سے جدا ہوتی ہے اور خود ایک فرد بھی مختلف اوقات میں مختلف حالات کے تحت مختلف موضوعات کے متعلق مختلف زبان استعمال کرتا ہے۔

زبانوں میں سدا سے لین دین ہوتا آیا ہے۔ جب دو زبانیں قریب آتی ہیں تو ایک کے دوسری پر اثرات پڑنے لگتے ہیں اور ان میں کچھ نہ کچھ فرق آ جاتا ہے جس کے باعث وہ اپنے معیاری محاوروں سے ذرا سی ہٹ جاتی ہیں۔ زبان کے اتنے کثیر رنگ اور اتنے بہت سے متبادل روپ جو ایک ہی وقت میں نہ صرف ایک ہی سماج اور ایک ہی علاقے میں بلکہ دوسرے سماج اور دوسرے علاقے میں پہلو بہ پہلو مل جاتے ہیں، اس کی ثروت کے منہ بولتے ثبوت اور اس کی مکانی وسعت کے آئینہ دار ہیں۔

زبان کی یہ بوتلمونی قوس قزح سے مشابہ ہے جس کے رنگ کی دھاریاں الگ الگ دور تک چلی جاتی ہیں اور کبھی ایک سرے میں نہ غم نہیں ہوتیں۔ زبان کی طبقاتی شکلیں اور مقامی محاورے دراصل اس کے اصطلاحی رنگ ہیں جن کے متوازی خطوط کبھی ایک دوسرے میں ختم نہیں ہوتے۔

تاریخی لسانیات کی دلدل میں ماہرین کے جھنس کر رہ جانے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے زبان کے مکانی مطالعے یعنی مکانی لسانیات کو پس پشت ڈال کر زبان کی بوتلمونی اور نیچنگی کو جو اس کی مکانی خصوصیت ہے، تاریخی تبدیلی کا نام بھی دے دیا اور پھر اس نام نہاد تاریخی تبدیلی کے اسباب کا سراغ لگانے کو بھی چل کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس تجویزی ہوئی صورت حال میں خیر کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے خود دھوکا کھایا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ جون لیونز اپنی اس غلطی کا اعتراف دیے لفظوں میں یوں کرتا ہے :-

”مکانی بوتلمونی اور تاریخی تبدیلی میں واضح طور پر امتیاز کرنا ناممکن ہے۔“ اور جیمس اینڈرسن کہتا ہے :-

”زبانوں کی بوتلمونی کو ہم وقتی اور زبان کی تبدیلی کو ہم وقتی تصور کیا جاتا ہے۔“

میرے نزدیک حقیقت ایک ہے جس کے دو نام رکھے گئے ہیں (۱) مکانی یا تشریحی لسانیات اور زمانی یا تاریخی لسانیات (۲) بوتلمونی اور تبدیلی۔ فی الواقع زبان کا ایک ہی مطالعہ درست ہے جسے مکانی یا تشریحی لسانیات یا صرف لسانیات کہہ سکتے ہیں اور اس کی ایک ہی خصوصیت ہے جسے رنگ برنگ اپن یا بوتلمونی کہتے ہیں۔

زبان کا مطالعہ کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے متعلق ولیم اٹوٹسٹیل کہتا ہے کہ زبان کا ایک نظام ہے اس لیے اس کے تجزیے کے قواعد ہونا چاہئیں۔ وہ باہر سے جیسے نظر آتی ہے اس کے لحاظ سے اس نے اس مطالعے کے مندرجہ ذیل چار عنوانات قرار دیے ہیں :-

- ۱- فونیکس (علم آوازی)
- ۲- فونیکس (فونیم کا علم)
- ۳- صرف
- ۴- نحو

پی ایچ بیٹھیز نے زبان کے تجزیے کو مندرجہ ذیل چار شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔
۱- آوازوں کا مطالعہ

(و) صوتیات (ب) فونیکس (علم آوازی)

- ۲- نحو - جملوں اور فقروں کی ساخت -
- ۳- معنویات - لفظوں کے معانی کا مطالعہ
- ۴- صرف - مختلف استعمالات میں لفظوں کے رُوب اور اُن کی ساخت - جون لیونز زبان کے تجزیے کی مندرجہ ذیل چار سطحیں قرار دیتا ہے۔

۱- صوتیات

۲- صرف

۳- نحو

۴- معنویات

بیشتر ماہرین لسانیات کم و بیش انہیں چار پہلوؤں پر مبنی ہیں البتہ بہت سے صرف "کی اصطلاح استعمال کرتے اور اس کا مواد صوتیات اور نحو کے عنوانات میں بانٹ دیتے ہیں۔

پروفیسر ایل ایچ گرے نے اپنی کتاب میں البتہ ان سے ہٹ کر ایک اور راہ نکالی ہے اور زبان کے مندرجہ ذیل پہلو بتائے ہیں۔

۱- مادی یا میکانکی

(و) صوتیات (ب) صرف

۲- اشتقاقیات (مادہ)

۱۔ مارفولوجی ص ۳

۲۔ نیوہور آئرنز ص ۲۳

۳۔ دی پرنسپلز آف سیانکس ص ۲۴

۳ - نفسیاتی یا غیر میکائلی۔

(و) نحو (ب) معنویات

یہ تقسیم بھی مندرجہ بالا تقسیموں سے تقریباً ملتی ہے البتہ ناموں میں ذرا سی تبدیلی ہوگئی ہے اور اس تبدیلی میں گرے کا ذاتی لفظ نظر چھٹکتا ہے۔

میرے خیال سے زبان کے مطالعے کا طریقہ طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کوئی ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کریں جو طبعی ہو اور قانون قدرت سے مطابقت رکھتی ہو۔ چنانچہ میں نے وظائف زبان کی بحث میں زبان کا جو آخری لیکن جامع اور ہمگیر وظیفہ بیان کیا ہے۔ اسی سے مطالعہ زبان کا طریقہ اخذ کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

زبان سے دنیا کا گہرا تعلق ہے۔ وہ دنیا کو بیان کرنے کے لیے وضع ہوئی ہے، اسی لیے اس میں پوری دنیا جھکتی یعنی دیا جیسی پہلے تھی، جیسی اب ہے، جیسی آئندہ ہوگی اور جیسی ہونا چاہیے۔ سب کچھ ہمیں زبان ہی بتاتی ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے زبان کی مشابہت دور تک چلی جاتی ہے اس لیے ہمیں زبان کا مطالعہ کرنے کے لیے دنیا پر نظر ڈالنا چاہیے، جسے عالم موجودات کہتے ہیں، یعنی جو صرف مادی موجودات کا ذخیرہ ہے بلکہ غیر مادی موجودات یعنی ہمارے خیالات و افکار کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ جس طرح دنیا زمان و مکان سے محدود ہے اسی طرح ہمارا تفکر اور خیال بھی زمان و مکان سے اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ ہم اس سے ہٹ کر سوچنا بھی چاہیں تو نہیں سوچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے دنیا کو جس طرح سمجھا ہے اور اس کا جو نمونہ سامنے رکھ کر سوچا ہے اُسی کے مطابق زبان کی تخلیق و تعمیر کی ہے۔

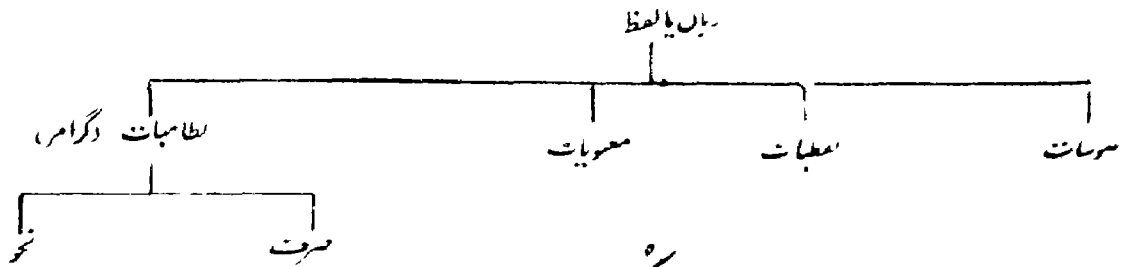
دنیا موجودات کے ذخیرے کا نام ہے اور زبان الفاظ کے مجموعے کو کہتے ہیں جس طرح اشیاء دنیا کی اکائیاں ہیں اسی طرح الفاظ زبان کی اکائیاں ہیں۔ شے دنیا کی جان نہیں بلکہ خود دنیا ہے۔ لفظ بھی زبان کی روح نہیں زبان ہے۔ ہمارے بزرگوں کے پیش نظر یہ حقیقت تھی جنہوں نے زبان کو بولی کہا چار بولی کا لفظ بول ہے بنا ہے جس کے معنی ہیں لفظ۔ اس طرح بولی کا مطلب ہوا "بول والی" یا "بول کی" اس طرح اردو میں زبان کے مطالعے کے لیے لفظ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جو زبان کی اصل اور بنیاد ہے۔ اس لیے زبان کے مطالعے کی ابتداء لفظ سے کرنا چاہیے اور اسی پر اس کی انتہا ہونا چاہیے۔

پھر جس طرح اشیائے عالم عناصر اربعہ کے ملنے سے بنی ہیں اسی طرح الفاظ زبان بنیادی آوازوں کے ملنے سے تیار ہوئے ہیں۔ جب دانا محتاج نے حروف کو جو آوازوں کی بصری شبیہیں ہیں۔ عناصر اربعہ کے خواص عطا کر کے چار درجوں خاکی، مادی، آبی اور سہائی میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح دنیا یعنی اشیاء کی بنیاد عنصر پر اور زبان یعنی لفظ کی بنیاد آواز پر قائم ہوئی جو علم آوازوں سے متعلق ہے اسے لسانیات میں صوتیات کہتے ہیں۔

سائنس (طبیعیات، کیمیا اور جراثیمات وغیرہ) تحلیل و ترکیب کے عمل سے اشیائے عالم کو جانچتی پرکھتی اور قدرت کے ان قوانین کا سراغ لگاتی ہے جو ان میں کام کر رہے ہیں۔ تحلیل و ترکیب کا یہی عمل لفظ پر بھی ہوتا ہے جو آوازوں کی امیٹیں چُنی چُن کر تیار کیا جاتا ہے اور یہی عمل جس علم سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے لفظیات کہتے ہیں۔

خدا نے حواسے عالم خالق کی ہیں اس کی ہر وس و عایت وہ اسی نے طے کی ہے کہ کون کون کا حالت ہی اسی پر مصلحت حرب جانتا ہے کہ اس کی کوئی مخلوق سے کس مقصد کی مکمل ہونے کی اسی طرنا اسے زبان لے بھی ہر لفظ کی گھڑت کے وقت اپنی مصلحت وقت کے مطابق اسے ماسک بھی ملتا کہ دیتے یہ علم لفظ اور معنی کے رستے اور معنی کی اقسام وغیرہ سے تعرض کرنا ہے۔ معنویات کہلاتا ہے۔

اس سلسلے میں مشابہت کی آخری باب ہے کہ جس طرح اساتے عالم الگ الگ غیر مربوط اکائیاں ہیں بلکہ ربط باہم سے ایک سلسلے میں منسلک ہو کر کائنات کی سلیم ہمار کرتی ہیں اسی طرح مختلف الفاظ باہم مل کر ایک مربوط انسانی کلام کا نظام قائم کرتے ہیں اور وہ علم اس نظام سے کہہ کر اسے اسے نظامیات کہتے ہیں جسے صرف عام میں گرامر نامہ اور اعداد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ زمانہ بالفاظ کے مطالعے کی یہ پاروں پر نہیں مندرجہ ذیل سحر سے نظام بہ بنیادی ہیں۔



کتاب حوالہ

انگریزی سے

- ۱۔ لینگویج مصنفہ اڈورڈ سمیٹ نیویارک ۱۹۲۱ء
- ۲۔ وی پرنسپل آف سیماٹکس اسٹیس ال سن سبیل بیک ویل آکسفورڈ ۱۹۶۷ء
- ۳۔ لینگویج اڈلنگوٹشکس۔ جون ہورز کیمرن ۱۹۶۱ء
- ۴۔ لینگویج مصنفہ و ب رے مریج ہال رٹن لڈن ۱۹۵۲ء
- ۵۔ لینگویج مصنفہ لیو مارڈ بلوم فلڈ نیویارک ۱۹۶۶ء
- ۶۔ اسٹرکچرل اسپیکس آف لینگویج پیج پیس ایڈرسن۔ نیویارک ۱۹۶۳ء
- ۷۔ لینگویج مصنفہ آٹو لیسرسن لندن ۱۹۶۳ء
- ۸۔ اسپیکس آف لینگویج مصنفہ ولیم ایڈنٹل۔ لندن ۱۹۵۳ء
- ۹۔ مارفولوجی مصنفہ بی ایچ میتھیور۔ کیمرن ۱۹۶۷ء
- ۱۰۔ جنرل انٹرنیشنل لنگوٹشکس۔ جون ہورز کیمرن لیسٹڈ۔ انگلینڈ ۱۹۸۸ء۔
- ۱۱۔ اردو کی کہانی، مصنفہ ڈاکٹر سبیل بھاری مطبوعہ آزاد بک ڈپو مکتیہ۔

جلال الدین اکبر اور اُن کی غزل گوئی

بشیر ساجد

۱۹۲۳ء میں مشرقی پنجاب کا ایک دیہاتی نوجوان گورنمنٹ کالج لاہور کی فرسٹ ایئر کلاس میں داخل ہوا۔ وہ میٹرک کے امتحان میں وظیفہ حاصل کر کے آیا تھا۔ لیکن گورنمنٹ کالج کے انگریزیت زدہ، فیشن پرست، سٹوڈنٹ بوائڈ طلبہ سے اس کا رنگ ڈھنگ بالکل جدا تھا۔ ابتدا میں بعض طلبہ نے اس کے کھدر کے کرتے، کھدر کی ستلوار، کھدر کی پکڑی اور دھوڑی کی جوتی کا مذاق اڑایا لیکن جب اس کے جوہر کھلنے شروع ہوئے تو سبھی اس کے قائل ہوتے گئے جلدی ہی اس کی شعر گوئی کے پرچے کالج کی فضا میں پھیلنے لگے اور پھر تو یہ عالم ہوا کہ ادھر اس نے کوئی تازہ شعر کہا اور کسی ہم جماعت کو سنایا اور ادھر نہ صرف گورنمنٹ کالج بلکہ دوسرے کالجوں کے طلبہ کی زبانوں پر بھی جاری ہو گیا۔ ابھی یہ نوجوان تھوڑا ایئر میں تھا کہ بیس سال کی عمر میں اس کا پہلا مجموعہ کلام ”نقش ارژنگ“ کے نام سے شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پہلے دو دنوں میں گورنمنٹ کالج ہی میں دو سو نسخے فروخت ہو گئے۔ ماہنامہ ہزار داستان (لاہور) کے دفتر میں جو نسخے رکھوائے گئے وہ بھی گرم نیکوں کی طرح پاک گئے۔ پھر دور دور سے فرمائشیں آنے لگیں مشہور صاحب طرز ادیب اور نقاد اور ماہنامہ ”نگار“ کے مدیر نیاز فتح پوری (مرحوم) نے بھی پچاس نسخے منگوائے اور ماہنامہ الناظر (لکھنؤ) نے پچیس نسخے۔ متعدد نسخے سُرْمُہ مفت نظر کی طرح احباب کی نذر ہوئے۔ حلقہ احباب میں صرف ایک استثنا چودھری محمد علی (مرحوم) سابق وزیر اعظم پاکستان کی ذات تھی جو مصنف سے دو سال سینیئر اور ایم۔ ایس سی (کیمیا) کے طالب علم تھے اور بہت عمدہ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ مصنف نے ایک نسخہ انھیں بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہاسٹل کا ملازم ایک بند لافران کی طرف سے مصنف کو دے گیا جس میں ایک رقمہ اور سو روپیہ (نقش ارژنگ کی قیمت) تھا۔ چودھری محمد علی نے اپنے ایک رقمہ میں ایک انگریز مصنف کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر کسی مصنف کے دوست اس کی تصانیف خرید کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے اور مفت نسخے حاصل کرنے کے متوقع ہوں گے تو مخالفت تو اس کی کتابیں خریدنے سے رہے۔ لہذا اس مصنف کے حشر کا تصور کیا جاسکتا، میں نسخہ کی قیمت بھیج رہا ہوں۔ اگر میرے حالات اجازت دیتے تو میں کہیں زیادہ ہدیہ پیش کرتا۔ پروفیسر سراج الدین مرحوم اور حافظ عبد المجید (سابق چیف سیکرٹری حکومت پنجاب) بھی آپ کے عزیز دوستوں میں شامل تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ طالب علم کون تھا؟ شاید نہیں۔ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل کا عمل دنیا سے شعروادب میں بھی جاری ہے۔ بہر حال یہ تھے جناب جلال الدین اکبر۔ سولہویں صدی کے ہندوستان کے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے ہم نام۔ وہ جو

فرماتے ہیں :

نہ پستیوں پہ مری جا بلندیوں کو بھی دیکھ
کہ آج ملک معافی کا تاجدار ہوں میں

مختصر حالات زندگی

جناب چودھری جلال الدین اکبر دسمبر ۱۹۰۵ء میں مشرقی پنجاب کے ایک پُر فضا کاؤں علی پور نہراں والا (تحصیل بنارس ضلع گورداسپور) میں پیدا ہوئے۔ یہ دریائے راوی سے نکلنے والی نہروں کا سرسبز و شاداب خطہ تھا۔ لاہور کی شریان نہراں پر باری دو آب کی شاخ بھی وہیں سے نکل کر آتی ہے۔ جناب اکبر کے والد محترم چودھری فتح علی ایک معمولی زمیندار تھے لیکن اپنی شہزوری اور سیہ چٹھی اور فیاضی کی وجہ سے علاقے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی محنت اور ذہانت کے بل پر تعلیم حاصل کی اور ہر امتحان میں وظیفہ حاصل کرتے رہے۔ آپ سکول کے زمانے ہی سے تحریک خلافت اور اس کے زعماء مولانا محمد علی جوہر، مولانا جبرت موبانی وغیرہ سے متاثر تھے، شاعری میں بھی اور عام زندگی میں بھی۔ کھد رپوشی بھی اسی کا نتیجہ تھی۔ ایک دفعہ انگریز پریسل مسٹر سہی نے آپ کو کھد رپوشی کی حالت میں دیکھ لیا تو سخت جگڑا اور اگلے دن دفتر میں حاضر ہونے کا حکم دیا لیکن آپ گول کر گئے اور اپنی وضع پر قائم رہے۔

شاعری کا آغاز

”نقش ارژنگ“ کے تعارف نگار ”فلسفی“ نے جناب اکبر کی شاعری کے سلسلے میں یہ عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ”مئی ۱۹۱۸ء میں جب آپ چھٹی جماعت میں تعلیم پاتے تھے، ایک روز ادا اٹے نماز جمعہ کے بعد حساب کا ایک سوال حل کرنے بیٹھے۔ سوچتے سوچتے بخود سے ہو گئے اور خیال میں عالم بالا کی سیر کرنے لگے۔ جب ہوسٹس میں آئے تو دیکھا کہ سوال کے حل کی بجائے کاغذ پر نو شعروں کی ایک مناجات لکھی پڑی ہے۔ ہم نے مناجات دیکھی ہے، کافی اچھی ہے۔ صرف دو تین جگہوں پر اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس وقت سے شاعری کا شوق دامنگیر ہوا۔ نہم جماعت تک ہمیشہ مذہبی، اخلاقی اور ملکی نظمیں لکھتے رہے۔ میں بخوبی طوالت نمونے درج نہیں کرتا۔ نہم جماعت میں حسرت

سے ہادی حسین مرحوم جو ماہنامہ ”ہزار داستان“ (لاہور) کے ایڈیٹر تھے۔ پھر آئی، سی، ایس ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد وفاقی حکومت کے سیکرٹری رہے۔ بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ سرکاری مصروفیات نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو دبائے رکھا۔ سید امیر علی کی مشہور کتاب ”دی سپرٹ آف اسلام“ کا ترجمہ اردو میں ”روح اسلام“ کے نام سے کیا گئے کے بعض نوجوان کا ترجمہ بھی اردو میں کیا۔ ساجد

کی غزل جس کا مطلع ہے :

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الہی ! ترک الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

دیکھ کر غزل کا شوق پیدا ہوا۔ اُس وقت سے غزل ہی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی نظم بھی لکھتے ہیں۔ جناب اکبر نے حسرت کے رنگ غزل کو اس کامیابی سے اپنا یا کہ اہل زبان شاعروں اور نقادوں نے، جن میں سید سلیمان ندویؒ، مولانا تاجو نجیب آبادیؒ، نیاز فتحپوریؒ جیسی عظیم ادبی شخصیتیں شامل ہیں، آپ کو پنجاب کا حسرت موبانی کہا۔ سکول کے زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کا کلام مختلف رسالوں میں چھپنے لگا تھا۔

شاعری میں تلمذ

۱۹۲۵ء تک جناب اکبر نے شعر گوئی میں کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ ذوقِ سلیم ہی کو رہنما بنایا۔ ان دنوں پنجاب میں حکیم فیروز الدین طغرائی امرت سری کی استاد فن کی حیثیت سے شہرت تھی۔ صوفی تقیہ، عابد علی عابد، محمد حسین عرشی، اظہر امرت سری وغیرہ بہت سے شعرا ان کے شاگرد تھے۔ اکبر صاحب ایک غزل اور نظم لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ طغرائی صاحب ایفون کے عادی تھے، اکثر پینک میں رہتے۔ بہر حال انھوں نے غزل دیکھی۔ کوئی خاص اصلاح نہیں دی آپ لاہور واپس چلے آئے۔ کچھ دن بعد طغرائی صاحب کے ایک حاضر باش شاگرد کا خط آیا کہ اگر حکیم صاحب کی شاگردی کرنا ہے تو دس روپے ماہوار ادا کرنا ہوں گے۔ یہ ادائیگی آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ سید عابد علی مرحوم ان دنوں وکالت کرتے تھے۔ طغرائی کے شاگرد رہ چکے تھے اور لاہور کے شعرا میں خاصے نمایاں تھے۔ اکبر صاحب نے ان کی طرف رجوع کیا۔ چند غزلیں انھیں دکھائیں۔ بعد میں دوستانہ تعلقات رہے۔

علامہ اقبال کی مجالس میں حاضری

جناب اکبر نے گورنمنٹ کالج کے زمانہ طالب علمی کے دوران ہی میں علامہ اقبال کی مجالس میں حاضری دینا شروع کی اور تعلیم سے فراغت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے ان مجالس میں بہت فیض اٹھایا۔

انقطاعِ تعلیم

جناب اکبر نے بی اے آنرز کے امتحان میں انگریزی اور فارسی میں بہت اچھی پوزیشن حاصل کی۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنا چاہتے تھے لیکن فارسی میں ایم۔ اے کرنے کے لیے وظیفہ ملا۔ فائنل امتحان میں علامہ اقبال مفتی تھے۔ انھوں نے عام دستور کے برعکس اکثر سوالات کے جوابات فارسی میں مانگے۔ جناب اکبر سے سہو ہوا۔ انہوں نے

بونیورسٹی کی سابقہ پرنسپل کے مطابق انگریزی میں جوابات دئے۔ بعد میں ایک دوسرے طالب علم سے تبادلہ خیال سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آپ پروفیسر شیخ محمد اقبال (مرحوم) جو اوری انٹل کالج، لاہور کے شعبہ فارسی کے صدر تھے (بعد میں پرنسپل ہو گئے) کو ساتھ لے کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ واقعہ بیان کی۔ علامہ آپ کو اچھی طرح جانتے تھے، لیکن پرچے کے سلسلے میں انہوں نے یہ کہہ کر کوئی بات سننے سے انکار کر دیا کہ طلباء کی فارسی دانی کا امتحان مقصود تھا نہ کہ انگریزی دانی کا۔ اس کے بعد اکبر صاحب علامہ کے قریبی دوست سر شیخ عبدالقادر مرحوم کے ہمراہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن انہوں نے سر عبدالقادر کو بھی وہی جواب دیا۔ نتیجہ یہ کہ آپ ایم۔ اے فارسی کے امتحان میں فیل قرار دئے گئے۔ اس سے آپ اس قدر بددل ہوئے کہ دوبارہ ایم۔ اے کا امتحان نہیں دیا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ ٹی کی ڈگری حاصل کی اور درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے تاہم علامہ سے آپ کی عقیدت کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ علامہ کی شان میں آپ کی تین نظمیں اس پر شاہد ہیں۔ آپ اب بھی علامہ کی زندگی کے بعض واقعات بڑے جن عقیدت سے بیان کرتے ہیں۔

ذریعہ معاش اور علمی و ادبی مشاغل

۱۹۳۰ء میں آپ انجمن حمایت اسلام کے اسلامیہ ہائی سکول، شیرانوالہ دروازہ لاہور میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور اسی عہدے سے اسلامیہ ہائی سکول، ملتان روڈ لاہور سے ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ انجمن نے خلاف دستور آپ کو ریٹائرمنٹ کی مقررہ عمر سے کئی سال بعد تک بھی ملازمت پر برقرار رکھا۔ انجمن کے کارپرداز آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔

طالب علمی ہی کے دوران میں شاعری کے علاوہ آپ صحافیانہ اور دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ سید حبیب مرحوم کے روزنامہ سیاست میں پہلے مترجم، پھر ادارہ نویس اور پھر ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ مشاہیرہ محض ساٹھ روپے، وہ بھی کبھی یکشت نہ ملا۔ کبھی تین روپے مل گئے، کبھی پانچ، کبھی سات۔ جناب اکبر نے بتایا کہ اخبار کا عملہ صفحہ پری کے لیے بہت سی بے بنیاد خبریں غیر مالک کے متعلق ٹھوکر چھاپتا اور دوسرے دن خود ہی تردید شائع کر دیتا۔ ایک دفعہ تنہا کے ڈپٹی کمشنر کے خلاف کسی کا شکایتی مراسلہ شائع کر دیا۔ حکومت نے اخبار سے جواب طلبی کر لی۔ تھوڑے دن بعد ایک اور ایسا ہی واقعہ ہو گیا۔ اخبار کے مالک سید حبیب نے آپ کے علم کے بغیر اعتذار شائع کر دیا۔ اس پر آپ نے استغفار دے دیا جو خوشی منظور کر لیا گیا۔

آپ انجمن اراٹیاں، لاہور کے ترجمان اخبار 'الراعی' کے ایڈیٹر بھی رہے اور اس میں ادبی مضامین بھی لکھتے رہے۔ ساتھ ہی اپنا ذاتی رسالہ 'طور' بھی شائع کرتے رہے۔ شاعروں، ادیبوں اور نقادوں سے ملاقات اور خط و کتابت رہتی۔ آپ کے پاس برصغیر پاک و ہند کے بہت سے چوٹی کے مشاہیر شعر و ادب کے خطوط کا

بیش بہا ذخیرہ تھا جو کئی سال پہلے پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) کے سابق لائبریرین محمد حنیف شاہ آپ سے اشاعت کے وعدہ پر لے گئے۔ اب یہ صاحب ملک سے باہر ہیں۔ پتا نہیں ان قیمتی خطوط کا کیا حشر ہوا۔ کاش یہ شائع ہو جاتے! اس زمانے میں لاہور میں دو ادبی گروہ پیدا ہو گئے تھے، ایک کے سربراہ تاجور نجیب آبادی مرحوم تھے۔ اس میں سید عابد علی عابد، تصدق حسین خالد، احسان دانش، اودھ سنگھ شائق، اختر شیرانی، میلارام وفا، دست پر شاد فدا اور بعض دوسرے حضرات شامل تھے۔ جناب اکبر کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ دوسرے گروہ میں محمد دین تاثیر، عبد المجید ساک، صوفی تبسم، ہری چند اختر، حفیظ جالندھری وغیرہ شامل تھے۔ یہ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں باہمی نوک جھونک، تعریف و تنقیص اور ہنگامہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن جناب اکبر فطرتاً خاموش طبع، صلح کل، مرغبال مرغ اور منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ آپ کے خلوص، انکسار پسندی، صلح جوئی اور شریف النفسی کے سبھی معترف تھے۔ اس لیے آپ کی سب سے قیمتی تھی اور تعلقات خوشگوار رہے۔ روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹروں کی چوڑی (مولانا عبد المجید ساک اور مولانا غلام رسول مہر) سے آپ کے گہرے تعلقات تھے۔ آپ اکثر 'انقلاب' کے دفتر تشریف لے جاتے اور ساک، مہر اور آپ تینوں کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے اور شعرو شاعری کا دور چلتا۔ زیادہ تر آپ کا کلام سُنا جاتا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز (مرحوم) سے آپ کا گہرا یار اہل تھا۔ اکثر دونوں ہم طرحی غزلیں کہتے۔ جب عزیز مرحوم سہ روزہ 'مدینہ' (بجنور) کے ایڈیٹر تھے تو آپ ان سے ملنے بجنور جاتے رہے۔ پھر آپ ہی کی کوشش سے عزیز روزنامہ زمیندار (لاہور) میں آ گئے۔ سید سلیمان ندویؒ سے بھی آپ کے قریبی روابط تھے۔ ان سے ملنے کے لیے لکھنؤ اور میرٹھ کا سفر کیا۔ سید صاحبؒ کے بہت سے قیمتی خطوط آپ کے نام تھے جو اب محمد حنیف شاہ صاحب کی تحویل میں ہیں۔ آپ نے خاصی مہم جو یا نہ اور سیاحانہ زندگی گزاری۔ جب صحت و توانائی میسر تھی تو تعطیلات کے ایام میں سیر و سیاحت کے لیے دور دراز سفروں پر نکل جاتے۔ شاعروں، ادیبوں اور روحانی بزرگوں سے ملتا تھا کرتے۔ اس مضمون کے کئی اشعار آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً:

پھر وہی شوق جستجو مجھ کو لگا ابھارنے
دشت کا ذرہ ذرہ پھر مجھ کو لگا پکارنے

اور : ۷

ہے ستم خوردہ جنوں اکبیر
اس کی خانہ بدوشیاں نہ گئیں

لے پطرس بخاری اور اتیا ز علی تاج کی شمولیت کے ساتھ یہی حضرات 'نیا زمیندار لاہور' کہلاتے تھے اور کبھی کبھی پنجاب کے ادباء و شعرا کے خلاف یو۔ پی کے اہل زبان حضرات کی معترضانہ تحریروں کا جواب بھی دیا کرتے تھے۔ حضرت اکبر کے بقول یہ پطرس، تاثیر، تاج، ساک، حفیظ کی تحسین باہمی کی انجمن تھی اور یہ حضرات زیادہ تر اپنے حلقہ کے ارکان کی تعریف اور دفاع میں لکھا کرتے تھے۔

اہل قلم میں احترام

جناب اکبر اپنی شاعری اور دوسری ادبی اور صحافیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے جلد ہی کالجوں کے طلبہ کے علاوہ عام ادبی و شعری حلقوں میں معروف و مقبول ہو گئے تھے۔ اس پر آپ کی سادگی، انکسار، شرافت، رواداری اور صلح کل طبیعت سونے پر سہاگہ۔ ۱۹۴۰ء کے قریب جب تصوف میں زیادہ انہماک ہوا تو شعر گوئی میں دل چسپی کم ہو گئی اور عزت گزینی بڑھتی گئی تاہم کبھی کبھار اہم ادبی انجمنوں کی دعوت یا کسی دوست کے اصرار پر چلے جاتے۔ کئی دفعہ فیض احمد فیض مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ وہ آپ کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو جاتے اور جب تک آپ کو بٹھانے لیتے خود بھی نہ بیٹھتے۔ ایک دفعہ ملحقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں جانے کا اتفاق ہوا اور پھلی صف میں بیٹھ گئے۔ 'نقوش' کے مدیر محمد طفیل مرحوم صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے آپ کو دیکھ لیا اپنی جگہ سے اٹھ کر آئے اور اصرار کر کے اپنے قریب لے جا کر بٹھایا۔ ۱۹۶۹ء میں جب غالب کی صدارت برسی منائی گئی تو پروفیسر حمید احمد خاں (مرحوم) لاہور میں یادگار غالب کمیٹی کے صدر اور روح رواں تھے۔ ممتاز حسن مرحوم بھی اس میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ کراچی سے لاہور آئے تو حمید احمد خاں مرحوم اکبر صاحب کو ہمراہ لے کر ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ عند الملاقات اکبر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ممتاز حسن سے کہا، "کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟" ممتاز حسن آپ سے لپٹ گئے اور کہا، "انہیں کیوں نہ جانوں گا؟" ان کا یہ شعر جس نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا مجھے آج تک یاد ہے۔

ایک آنسو میں کہہ دیا غم دل
کس قدر ہم نے اختصار کیا
پھر بڑے احترام سے بٹھایا اور دیر تک ادبی گفتگو رہی۔

جناب اکبر کا غزل

غزلت میں غزل کے تین حروف پر مشتمل دو لفظ ملتے ہیں،
غزل اور غزل۔

غیاث اللغات کے مصنف نے غزل (بفتحین) کے معنی "بازی کردن محبوب و حکایت کردن از جوانی و حدیث محبت و عشق زنان" درج کیے ہیں۔ یعنی محبوب سے لہو و بازی، شباب کے تذکار و حکایات اور عورتوں کے عشق و محبت کی باتیں۔ دوسرے لفظ غزل (ز پر جزم) کے معنی "رشتن و رسمیدن و معنی رشتہ و ریشماں و رسن آرنڈ" لکھے ہیں یعنی کاٹنا، تانا بانا، دھاگا، رتہ وغیرہ۔ دیکھا جائے تو دونوں الفاظ کے معنی کا ایک لطیف ربط یا ہمی ہے۔ غزل گو شاعر حسن و شباب و محبت کے حرف و حکایت سے اپنے کلام کا تانا بانا تیار کرتا ہے اور اس تانے بانے کے

ڈیزائنوں، رنگوں، نوعیتوں، کیفیتوں کی کوئی حد نہیں۔ ہر شخص کے اپنے اپنے احساسات، جذبات، مشاہدات، تجربات اور واقعات ہوتے ہیں۔ بہر حال غزل کا بنیادی موضوع اپنے تمام تنوعات کے ساتھ حسن و عشق ہی ہے۔ اس کی رُو داد میں دنیا کے افسانے بھی آجاتے ہیں۔ غزل کے سانچے میں ڈھل کر ہر غمِ جانان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ستر و لبراسِ حدیث دیگران کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ غزل کی شاعری بھی معشوقِ طرہ دار کی طرح ہزار شیوہ ہے اور ایک فارسی شاعر کے بقول: **سحر**

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اگر آپ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ غزلِ مملکتِ شاعری کی شہزادی ہے۔ اس کی ہزار شیوگی اور جلوہ ہائے رنگارنگِ مستم۔ شہزادیوں کی طرح غزل کا مزاج بھی متکون اور من موحی ہے۔ اس کے موڈ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ آپ اس پر کوئی منطقی عائد نہیں کر سکتے۔ شہزادیوں کی طرح جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ پھر آپ اس کے ہجے کرتے رہیں اور کسی نظم کے تحت لانے کے لیے نفسیاتی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، روحانی اندیشہ ہائے دور و دراز سے کام لیتے رہیں۔ مختصر یہ کہ اس کا بنیادی اور امتیازی وصف اس کی داخلیت اور ایمائیت میں اور نقطہ پر کارِ عشق اپنی تمام گونا گویوں اور اپنے بدلتے ہوئے تصورات و معیارات کے ساتھ۔ اس کی وسعت افقِ تافقی ہے۔ دُنیا جہان کا کوئی مضمون نہیں جس سے اس کا دامن خالی رہا ہو بعینہ جس طرح ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں سما جاتے ہیں۔ موجودہ صدی شعر و فکرِ اقبال کی صدی ہے۔ وہ اردو غزل کے بھی مجدد ہیں۔ بالِ جبریل میں اقبالؒ کی اردو غزل اپنے نقطہٴ عروج کو پہنچ گئی۔ یہ غزلیں ان کے تفکر، فلسفہ، اسلامیت، تصوف، روحانیت، انسان دوستی اور آفاقیست کی آئینہ دار ہیں۔ حرکت و حیات سے مملو، صحت مند اور توانا زندگی کے پیغام کی حامل۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے کسی فردِ داخل کی بجائے ملت اور انسانیت کا عشق اور غم بیکراں لیے ہوئے۔ اقبالؒ غزل کے غزالِ عطا پر گھاس لادنے میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ وہ گھاسِ مشک و زعفران میں تبدیل ہو گئی۔ یہ معجزہ رگ ساز میں صاحبِ ساز کے لہو کی روانی سے ظہور میں آیا۔ اقبالؒ کی متجددانہ غزل گوئی کے پہلو بہ پہلو روایتی غزل کے فریم ورک میں رہتے ہوئے غزل گو شعرا کا ایک طبقہ ابھرا جس نے روایتی غزل کی عروقی مُردہ میں خونِ زندگی دوڑایا اور اسے نئی توانائی اور نئی معنویت بخشی۔ اس طبقہ کے نمایاں ترین شعرا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گوٹروی، یگانہ چنگیزی اور جگر مراد آبادی ہیں۔ ان میں رئیس المتغزلین حسرت موہانی ہیں۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی پاکیزگی، شائستگی، شرافت، صداقت، خلوص اور عشق کی حرارت کی آئینہ دار ہے۔ جناب جلال الدین اکبر ابتدا ہی سے حسرت موہانی سے متاثر ہیں اور انھوں نے غزل گوئی میں حسرت کا رنگ اپنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں ہم

ترے اشعار میں اکبر نمایاں

سراسر رنگِ حسرت دیکھتا ہوں

اس میں غالباً حسرت اور اکبر کے مشترک طبعی میلانات کو بڑا دخل ہے۔ یعنی خیالی محبوبوں کی بجائے گوشت پوست کے بندے ہوئے حقیقی انسان سے پاکیزہ محبت، شرافت نفس، فکر و جذبہ و احساس کی شائستگی، خلوص، قوی دلی حمیت، اسلام پسندی، اخلاقی روایات کی پابندی اور بالآخر روحانیت اور تصوف۔ اکبر کو کھدر پوشی کی تحریک بھی غالباً اُسوہ حیرت سے ہوئی۔ حسرت نے تحریک خلافت کے دوران میں کانپور میں کھدر کی فروخت کے لیے بہت بڑا اسٹور کھول رکھا۔ دستِ احمد صلیقی مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے:

”جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب سے قریب اور جسم و جاں کے اعتبار سے دور سے دور ہو، وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر اور برتر ہو گا جس کی پوزیشن اس کے برعکس ہو۔“
حسرت اور اکبر دونوں پر یہ قول صادق آتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح جناب اکبر بھی تہذیبِ رسم عاشقی، وضعاری، شائستگی اور رکھ رکھاؤ کے قابل ہیں۔ ’نقشِ ارژنگ‘ کی اشاعت پر علامہ سید سلیمان ندوی ’مدیرِ معارف‘ (اعظم گڑھ) نے آپ کو ایک خط میں لکھا کہ:

”آپ کی غزلیں نہایت ہموار، نہایت شیریں ہیں۔ فارسی ترکیبوں کا اعتدال، ابتذال سے پرہیز، انظارِ جذبات میں احتیاط اور بلندی، العاطف میں سادگی آپ کو پنجاب کا حسرت موہانی کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں آپ کی غزلیں حسرت کا نقشِ ثانی معلوم ہوتی ہیں۔ میں آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ کبھی کبھی ’معارف‘ کو بھی یاد رکھیے گا۔“
مولانا تاج رحیم آبادی مرحوم نے آپ کو حسرت کا ثقی ”کہا۔ متعدد دوسرے مشاہیر ادب مثلاً نیاز فتحپوری، برجپور کینی، جوش ملیح آبادی، خواجہ حسن نظامی وغیرہ نے بھی آپ کے کلام کی رنگینی و شیرینی، مضمون آفرینی، اسلوب کی دلاویزی، سلاست، نفاست، ارتعاعِ جذبات اور اثر انگیزی کی تعریف کی۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے ستمبر ۱۹۲۶ء کے سہ ماہی ’اردو‘ میں اور سید سلیمان ندوی نے ’معارف‘ میں بہت عمدہ، حوصلہ افزا اور خاصے طویل تبصرے کیے۔ ’الناظر‘ (کھنؤ) اور بعض دوسرے موقر رسائل نے بھی تحسین و تعریف کی۔

’نقشِ ارژنگ‘ کی اشاعت کے ساتھ جناب اکبر پنجاب میں آج سے ساٹھ سال قبل کی اردو غزل گوئی کے اُفتی پر ایک نیا روشن ستارہ بن کر نمودار ہوئے۔ پنجاب کے اس وقت کے غزل گو شعرا میں کوئی ایسا شاعر دکھائی نہیں دیتا جسے زبان و بیان کی وہ سلاست، لطافت، فصاحت، عذوبت، ندرت، رنگینی، پاکیزگی اور نقلی نصیب ہوئی ہو جو جناب اکبر کے حصّے میں آئی۔ ان کی غزل کو دیکھ کر کوئی بڑے سے بڑا اہل زبان شاعر یا نقاد بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی غیر اہل زبان کا کلام ہے۔ جادوِ بیاں داغ مرحوم کا ایک شعر ہے:

تم نے جادو گھر اسے کیوں کہہ دیا؟
دہلوی ہے داغِ بنگالی نہیں

اکبر نے کہا : ۛ

اس کے اندازِ بیاں سے ہے عیاں
دہلوی اکبر ہے پنجابی نہیں
یہ حقیقت ہے کہ ان کی شعری زبان اور اندازِ بیان میں 'پنجابیت' نام کو بھی نہیں ملتی (شاید پنجاب کے جدید شعرا و ادبا اسے ایک عیب قرار دیں) کہیں کہیں خوب صورت فارسی تراکیب کا برہستہ استعمال انھیں غالب اور اقبال کی اسلوبی روایت کے قریب کر دیتا ہے۔ ان کا اسلوبِ نچتہ اور سہل ممتنع اندازِ لیے ہوئے ہے۔ جوانی کا کلام بھی پاکیزگی اور شائستگی کا حامل ہے۔ جنسیت زدگی، بخش گوئی اور لذت پرستی سے پاک ہے۔ بقول اسد ملتانى مرحوم ۛ

پسند خاطر اہل صفا ہے میری غزل
کہ اس میں کوئی ہوا و ہوس کی بات نہیں
اگرچہ اس میں حسن و شباب اور رومانیت کا ہونا ایک قدر قبیح امر ہے۔ جناب اکبر نے اپنی عہدِ جوانی کی حسن پرستی کا برملا اعتراف کیا ہے : ۛ

وہ جنت نگاہ ہے پیشِ نظرِ مدام
اکبر مری تو حسن پرستی ہے زندگی
لیکن یہ حسن پرستی ہوس پرستی نہیں۔ جوانی میں غم و ہوم کے باوجود انسان زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اکبر کہتے ہیں : ۛ
مری رگ رگ میں لطفِ زندگی کی موجِ رقصاں ہے
طبیعتِ بادۂ غم سے جوان معلوم ہوتی ہے
جناب اکبر کے ہاں حسرت کی غزلیدہ روایت کا تسلسل ملتا ہے۔ زبان و بیان کی پاکیزگی و صفائی، تہذیبی و اخلاقی اقدار کی نگہداری، کمالِ دلسوزی کے باوجود کھل کر نہ مل سکے کی حزنِ کیفیت۔ غمِ عشق انہیں عزیز ہے کہ یہ انہیں ایک احساسِ نشاط بخشتا ہے ۛ
عشق میں مغموم رہنا ہے خوشی میرے لیے باعثِ تسکین ہے دل کی بیکسی میرے لیے
نیز : ۛ

کھل کے ہم سے کبھی وہ مل نہ سکے
باوجود کمالِ دلسوزی (حسرت)

تیرا کرم عسیریز تیرا فم عسیریز تر
یہ جان آرزو ہے وہ جانان آرزو
جناب اکبر کی شاعری قلبی واردات و احساسات، تہذیب جذبات اور جذبہ و فن کے خلوص اور سچائی کی شاعری ہے۔
غائب نے کہا تھا اسے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی
دل گداختہ کے بغیر شاعری، خاص کر محبت کی شاعری ممکن نہیں جیسے حضور تائب کے بغیر مقبول بارگاہ ابدی نماز ممکن نہیں۔
اکبر کے نزدیک عشق خود ایک دردِ لادوہ ہے لیکن دردِ انسانیت کا علاج بھی ہے اس لیے متابعین سے
اس دردِ لادوہ میں سے انسانیت کا راز
کیونکہ کہوں کہ عشق غنیمت نہیں مجھے
اس لیے محبوب کے جو رستم کا ذکر سن رہی ہے کیونکہ عاشق کو محبوب سے کوئی شکایت ہو ہی نہیں سکتی ہے
کرتا ہوں میں بیاں ستم بر سبیل ذکر
ہر چندان سے کوئی شکایت نہیں مجھے
اس کے برعکس تضاد المعنی ایک دوسرا خوب صورت شعر ملاحظہ ہو۔ اندازِ بیان کی دلکشی و رنگینی اور نفسیاتی کیفیت
و اداسے مستغنی ہیں، عشق است و ہزار بدگمانی ہے
ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ! مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے
جناب اکبر حب محبت کی نازک حسیات کا بیان کرتے ہیں تو ندرتِ تخیل کے ساتھ لہجے کا انوکھا پن، ایمانی اور استعجابی
اندازِ قاری کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

ہو گیا حسن شرمسار جفت عشقِ نادم ہوا گلہ کر کے
آئے تسکین اضطراب کو وہ اور بھی کچھ چلے سوا کر کے

ظلم بھی ان کے لطف ٹھہرائے ————— دل کی نازک خیالیاں نہ گئیں

تجہ کو اللہ نے بخشا ہے یہ کیا حسنِ کلام تیرے انکار میں اقرار نظر آتا ہے
غائب کی زمین میں چند اور اشعار ملاحظہ ہوں اسے

اب انتہاے شوق نے بخود بنا دیا اب امتیازِ خلوت و جلوت نہیں مجھے
کچھ بات تھی کہ ان سے محبت ہوئی مجھے کچھ بات ہے کہ ان سے محبت نہیں مجھے
آتا نہیں ہے چین بھی ان کے سوا کبھی کہتا ہوں یہ بھی آپ سے الفت نہیں مجھے

عذابِ محبتِ یلیٰ و فرقتِ یلیٰ کا بیان ہے

ان کے بغیر سخت پریشان تھی زندگی
وہ آگئے تو اور پریشان ہو گئی
محبوب سے محبت کے باوجود اکبر اس کی ناروا کمکنت پر اپنی خودداری بلکہ خودداریوں کو قربان کرنے پر تیار نہیں، سچی کہ
لبِ شکایت بھی و انہیں کرتے ہے

تمکینِ ناروا میں وہ پرسش نہ کر سکے
خودداریوں میں ہم سے شکایت نہ ہو سکی

محبت میں خودداری سے متعلق ایک اور شعر: ہے

جب حد سے بڑھ چکی ہوں تری بے نیازیاں
کیوں اپنی احتیاج کو رسوا کرے کوئی

جناب اکبر اپنی فطری خودداری اور قناعت کی وجہ سے کسی کا احسان اٹھانے کا دماغ نہیں رکھتے کیونکہ اس سے خودی ضعیف
ہوتی ہے۔ دوسروں کو بھی ہی مشورہ دیتے ہیں ہے

سرزیرِ بدمنت اہلِ جہاں نہیں حدِ شکر ہے کہ مجھ پہ کوئی مہرباں نہیں

جینا اگر نہ آئے تجھے تو خوشی سے مر مرہونِ منت دمِ عیسیٰ مگر نہ ہو

قناعتِ دل سراپا ہے مرا گنجِ غنا اے اکبر میں سمجھتا ہی نہیں ہوتی ہے عسرت کیسی

نقشِ ارژنگ کے بعد

اگلے دس بارہ سال میں جناب اکبر کی غزلِ بختگی کی منزل کو پہنچ گئی جس میں حسرت کے رنگ سے انحراف بھی
نظر آتا ہے اور کہیں کہیں مومن کا رنگ بھی۔ عشق و محبت کی چاشنی کے ساتھ متانت، گھلاوٹ، سوز و گداز، اظہار
ذات، کیف و مسرتی اور تصوف کی بین السطوری کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کل کے فیشن کے مطابق اکبر
کی غزل میں کسی مخصوص نظامِ فکر کی تلاش شاید کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے ہاں بڑا تجربہ اسلامی تصوف ہے،

جس کا ذکر آگے آئے گا۔ جناب زکی زاکانی نے خوب کہا ہے کہ سہ
میں اپنے فکر کی شیرازہ بندی کا نہیں قائل
کہ اڑتے بادلوں سے خود بخود بنتی ہیں تصویریں

”نعتیں ارژنگ“ کے فوراً بعد کی ایک منزل کے چند اشعار دیکھئے سہ
سوز و گداز عشق کے فت بل بنا دیا جس دل کو ٹوٹنے دیکھ لیا دل بنا دیا
اس کی نگاہِ لطیف کی کیفیتیں نہ پوچھ انجام عشق سے مجھے غافل بنا دیا
اس جانِ انجمن کے تصور کی رونقتیں خلوت کو میری روش محفل بنا دیا
یاران کو رزوق کی خوش اعتقا دیاں مہر کج روش کو رہبر منزل بنا دیا

(بد قسمتی سے آزادی کے بعد یہ سانحہ ہمارے ہاں بار بار پیش آ رہا ہے)
محبت میں ایک ایسی بھی منزل آتی ہے کہ عاشق بجز وصال سے بے نیاز ہو جاتا ہے سہ
بے نیاز وصال و فرقت ہوں
دور جا پہنچا ہوں محبت میں

بیخودی محبت سہ

اللہ اللہ یہ بیخودی میری
پاس ہے اور کوئی پاس نہیں
محبوب کے ناز و انظار کی ہر لحظہ نئی شان ہے۔ تجلی کو اعادہ نہیں سہ
میں ہوں اس ناز مجسم کی اداؤں کا شہید
کہ جو اک بار ہوا ناز دو بار نہ ہوا سہ

غالب کی زمین میں ایک سہل متنع منزل کے چند اشعار سہ
جہاں میں اور ہے تیرے سوا کیا
میں تجھ کو دیکھ کر پھر دیکھتا کیا

(فیض مرحوم نے بہت بعد میں کہا: ص ۱
تیری آنکھوں کے سوا دہریں رکھا کیا ہے!)
سہ پسند شوق ہے ہر ناز جانان محبت میں وفا کیا ہے جفا کیا

میں تاثیر وفا کو رو رہا ہوں ترے متکین بے حد کا گلہ کیا !
 پلٹنا ہی پڑے گا سوتے کعبہ نہیں ہوگا درمیانہ وا کیا !
 محبوب کی نگاہ تغافل کا گلہ بھی ہے اور اس کی نگاہ ہوشربا کی تاب بھی نہیں ہے
 اس امتیازِ رمزِ تغافل کے میں نثار ہر اک کو دیکھتے ہیں ادھر دیکھتے نہیں
 تابِ نگاہ ہوشربا بھی نہیں مجھے ان سے گلہ بھی ہے کہ ادھر دیکھتے نہیں
 عشقِ نیر و پیشہ راضی برضا ہونے کا متقاضی ہے راضی برضا عشق میں رہنا ہی پڑے گا
 غم جو بھی ملے عشق میں سہنا ہی پڑے گا خوں ہو کے تجھ آنکھ سے بہنا ہی پڑے گا
 اے دل غمِ الفت کے جو انداز یہی ہیں یہ اور ایسے متعدد اشعار جو الجاتی اور ضربِ انشلی کیفیت کے حامل ہیں۔
 جلوہ حسنِ یار سے قلبِ عاشق میں جذبات کا جو دم و جز پیدا ہوتا ہے، اس کی خوبصورت تصویر کشی ہے
 یہ عالم ہے ترے جلووں سے قلبِ ناشکیبا کا
 تلاطم جس طرح دریا میں ہوا موجِ دریا کا
 اکبر کے ہاں محبت کے اظہار میں دھماپن، نرمی اور شائستگی ہے۔ آج کل کا دھواں دھار، انداز نہیں ہے
 اضطرابِ وفا کا حال نہ پوچھ دل دھڑکنے کی سن ذرا آواز

ضبطِ الفت کی تاب ہے مجھ میں بدگماں تو اگر نہ ہو جائے

اس زبانِ آوری پر اس کے حضور بات کہنے کا ڈھب نہیں آتا
 ایک سادہ و پرکار، سلاست و نفاست بکنا رِغزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو ایک مشاعرے میں پڑھی گئی اور
 زبانِ زو عام ہو گئی ہے
 ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے
 دل میں میں آپ، آپ میں لاکھوں محبتیاں دل کیا ہے ایک حسن کی جنت ہے آپ سے
 کیا آپ جانتے ہیں مجھے تو خبر نہیں کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے
 اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں جس دل میں آرزوئے محبت ہے آپ سے
 ایک طرحی رِغزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ مطالب کی جدت و رنگینی اور اسلوب کی سلاست و شیرینی کے لحاظ سے
 یہ اپنے عہد کی ایک نمایندہ رِغزل ہے

وہ جائیں تو درود دیوار سے تاریکیاں برسیں
مری اک آرزو ہے اور ایسی آرزو یارب!
تمہاری جلوہ گاہ ناز کی تابانیاں توبہ
محبت کو سمیٹوں میں تو آنسو میں سما جائے
دل دیوانہ لے کاش اس قدر دیوانہ ہو جائے
بحسب ذوق میں اس حسن کے جلوے کی تاثیریں
انہیں اپنے ادا ناز سے مطلب ہے لے اکبر!

وہ آئیں تو سراپا نور یہ کاشانہ ہو جائے
مجھے ڈر ہے کہیں دنیا تہ و بالا نہ ہو جائے
یہ وہ محفل ہے جس میں شمع بھی پرواہ ہو جائے
جو پھیلانے پہ آؤں مستقل افسانہ ہو جائے
جہاں دیوانہ ہو کر خلوت جانا نہ ہو جائے
کوئی دیوانہ ہو جائے کوئی فرزانہ ہو جائے
بلا سے کوئی ہو جائے اگر دیوانہ ہو جائے

رنگِ مومن

مومن خاں مومن کے رنگ کے چہ خوب صورت اشعار،
شبِ غم کی سحر نہ ہو جائے
جوشِ سجدہ میں سر کہیں میرا
حسن کی بد گمانیاں توبہ

زندگی مختصر نہ ہو جائے
آپ کا سنگِ در نہ ہو جائے
عاشقی معتبر نہ ہو جائے

خلوصِ عشق کو شکوے بہت ہیں
مرا یحمر امتحاں تہِ نظر سے
ہواے شوق اڑانے جا رہی ہے
تمہاری بدمی کا ایک لمحہ

تمہارے استغاث بد گماں سے
کہہ رہتے ہیں وہ اکثر بد گماں سے
بڑھا جاتا ہوں آگے کارواں سے
کہیں بڑھ کر ہے عمر جاوداں سے

محفلِ ناز میں ہے حشرِ بداماں کوئی
بد گماں مجھ سے ہیں بے وجہ بتان کا فر
دل میں جو دردِ محبت کی کسک باقی ہے
جس میں پیوند نہ ہوں عشقِ تباہ کے لے شیخ!

آج ثابت نہیں رہنے کا گریباں کوئی
کوئی کہہ دو مرا ایمان نہیں ایماں کوئی
رہ گیا مگر اس شوخ کا پیکاں کوئی
مجھ کو ایسا نظر آتا نہیں ایماں کوئی

اب راقم الحروف یہاں ایک ایسی غزل درج کرتا ہے جو جنابِ اکبر کے کلام میں اپنی مثال آپ ہے جو مسلسل موڈ کی ہے
اور حسرت کے رنگِ لغزل کی حدود کو پھانڈ کر میر کی سادگی اور درد و حراں کے کؤچے میں داخل ہوتی معلوم ہوتی ہے۔
خاموش میں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہہ ہم جیتے ہیں
ہم سامنے آن کے بیٹھے ہیں اور قصہٴ فرقت کہتے ہیں

اب حُسن و عشق میں فرق نہیں، اب دونوں کی اک حالت ہے
 میں ان کو دیکھتا رہتا ہوں وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں
 اس شوقِ فراواں کی یارب! آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
 انکار کریں وہ یا وعدہ، ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں
 ہمدرد نہیں، ہمراز نہیں، کس سے کئے، کیونکر کئے
 جو دل پر گزرتی رہتی ہے، جو جان پر صدمے سہتے ہیں
 اکبر شاید دل کھو بیٹھے، وہ جلے وہ احباب نہیں
 تنہا خاموش سے پھرتے ہیں، ہرقت اداس سے رہتے ہیں

اسلامی / صوفیانہ شاعری

جناب اکبر کی حسن و شباب و محبت کی شاعری اپنے عروج پر تھی کہ انہیں تصوف ہو گیا ہے
 اُن دل کہ رم نمودے از خو برو جواناں
 دیرینہ سال پرے بردش بیک نگاہ ہے
 یہ حادثہ ۳۳ - ۳۴ سال کی عمر (۱۹۳۸ء) ہی میں پیش آیا اور شاعری میں ”شلاجوانیاں مانیں“ والی کیفیت باقی
 نہ رہی۔ فرمایا: ۷

گئے وہ دن کہ ان کی جستجو تھی
 اب اپنی جستجو ہے اور میں ہوں
 آپ کو ایک صاحبِ دل بزرگ حضرت حاجی حافظ ابو الرضا حاکم علی (رحمۃ اللہ علیہ) سے ارادت پیدا ہو گئی،
 جس سے آپ کی زندگی اور شاعری دونوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ غزل پر رنگینی و مستی اور حسن رستی کی بجائے
 متانت، پاکیزگی اور معرفت کا رنگ غالب آگیا۔ روحانیت کے جذب و کیف سے سرشار ہو کر انہوں نے جو کچھ کہا وہ عارفانہ
 شاعری میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے انقلابِ طبیعت کا اعلان اس شعر میں کیا ہے
 اکبر کہ جس کے عشق و محبت کی دھوم تھی
 سنتے ہیں آج عابد شب زندہ دار ہے

مزید فرمایا، ۷

میں گنہگار اور تیری یاد!
 انقلاب! انقلاب زندہ باد!

۷ یہ دلچسپ بات ہے کہ اگر لفظ ”اکبر“ کو الٹ دیں تو ”بکا“ ہو جاتا ہے یعنی اللہ والا۔ ساجد

جناب اکبر اسلامی روحانی نظام فکر، توحید خالص، اطاعتِ خدا و رسول، تزکیہ باطن، اخلاق عالیہ، توکل علی اللہ، صبر و رضا وغیرہ کے شاعر ہو گئے۔ لب و لہجہ میں خود اعتمادی اور روحانی رہنمائی کا انداز پیدا ہو گیا۔ فرماتے ہیں: ۱۔

زندگانی جسے نہ اس آئے آئے آئے وہ بے ہراس آئے
جانتا ہوں میں زہرِ غم کا علاج جسے جنیا ہو میرے پاس آئے
جناب اکبر فی تصوف کی تکنیکوں اور باریکیوں میں نہیں اُلجھے، نہ وحدت الوجود اور عجمی رہبانیت کے چکر میں پڑے۔ ان کے لیے تصوف تزکیہ نفس کا نام ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بے مقصد اور بے خدا شاعری بحث ہے۔

سخن اگر نہیں ارشاد کا ترے حامل
تمام قافیہ سنجی ہے بادِ پیمانی
تصوف کی دنیا میں پہنچ کر انہوں نے اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لیا اور محاسبہ نفس شروع کیا۔ فرمایا: ۲۔

اتنے دھتے پڑے ہیں دامن پر
کوئی دھتہ نظر نہیں آتا
ماویت پرستی سے دامن چھڑا کر رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لیا: ۳۔
شاہوں کی بارگاہیں اوروں کو ہوں مبارک
میں بسندۂ حقیر عشقِ محمندی ہوں
مندرجہ ذیل عارفانہ منزل میں سالک کے بعض انتہائی نازک احساسات، روحانی تجربات اور احوال و مقامات کو بڑی حسن کاری سے بیان کیا ہے۔

مرے سامنے ہیں وہ جلوہ گر مری بخودی کا کمال ہے
یہ وصال ہے کہ فراق ہے یہ فراق ہے کہ وصال ہے
ترے ذکر و فکر کے فیض سے مے دل کا اب تو یہ حال ہے
ترا ذکر مجھ کو وبال ہے ترا فکر مجھ کو محال ہے
مرا لاکھ حال خراب ہو، میں تری رضا کا غلام ہوں
مجھے اپنا حال عزیز ہے مرا حال تیرا خیال ہے
میں ہوں در پہ اس کے پڑا ہوا مجھے اور چاہیے کیا بھلا
مجھے بے پری کا ہو کیوں گلہ؟ مری بے پری پر وبال ہے
قرآن مجید میں اللہ کا بندوں سے ارشاد ہے:

فاذکرونی اذکرکم (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا)

جناب اکبر نے اس عظیم ارشاد کو ایک خوب صورت شعر میں ڈھال دیا ہے : ۛ

اب اس سے بڑھ کر اوج طالع عشاق کیا ہوگا کہ جب ہم یاد کرتے ہیں تو وہ بھی یاد کرتے ہیں
- جناب اکبر جب 'رب کا' ہو رہے تھے تو فرمایا : ۛ

اللہ کی ہے مجھ کو طلب اللہ جس کا اس کے سب
یاد میں اس کی گریہ شب میرے لیے ہے وجر طرب
غیروں کا محتاج نہ رکھ لے مے مولا ! لے مے رب !
میرے لیے مشعل راہ اُسوہ روشن ماہِ عرب
آنسو اُٹے آتے ہیں اور نہیں ہے کوئی سبب

یہ اشعار پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سالک شب کی تاریکی میں ذکرِ ہزین میں مصروف ہو۔ ایک دوسری
غزل کے ایک شعر میں انہوں نے اپنا منشورِ حیات بیان کر دیا ہے ۛ
میرا پیمانہ ذکر و سوز و گداز
میرا میخانہ مسجد و محراب

ارشادِ خداوندی ہے :

الا بذكر الله تطمئن القلوب (اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے)
جناب اکبر نے اسے شعر کی صورت دے دی ۛ

جب سے کہ تیرا ذکر ہوا ہے انیس دل
کوئی بھی اضطراب کی صورت نہیں رہی

جناب اکبر قیامِ پاکستان سے پہلے ایک دفعہ دہلی گئے اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پر حاضری دی۔ باہر نکلے
تو ذیل کی غزل بے اختیار زبان پر جاری ہو گئی۔ تعلق باللہ، یادِ خدا اور لاشریک لہ کے حوالے سے کیا نادر اشعار ہیں
موعدانہ غزل : ۛ

یہ بھول بھی کیا بھول ہے یہ یاد بھی کیا یاد تو یاد ہے اور کوئی نہیں تیرے سوا یاد
وابستہ تری یاد سے تسکین دروں ہے مجھ کو تو ہلے لے کے یہی ایک دوا یاد
درس ایسا دیا پیرِ طریقت نے رضا کا مطلب ہے کوئی یاد نہ مطلب کی دعا یاد
اس حسنِ تعلق کا اداِ شکر ہو کیونکر میں نے جو کیا یاد تو اسی نے بھی کیا یاد

اب کوئی عطا یاد ہے تیری نہ بلا یاد
خود مجھ کو نہیں آج کوئی اپنی خطا یاد
دوزخ کی سزا یاد نہ جنت کی جزا یاد
آیا ہے جو تو یاد تو پھر کچھ نہ بلا یاد
جس کو نہ رہا کچھ بھی بکسر یاد خدا یاد
جناب اکبر راجانیت، قناعت، اطمینان قلب کی دولت اور اسوۂ رسولؐ کی پابندی سے بہرہ ور ہیں۔ ذیل کی غزل
سے غم و آلام جہاں کے مقابلے میں صبر و رضا، ذکر الہی میں مشغولیت، دولت دنیا سے بے نیازی اور روحانی شہری
اہلی پڑتی ہیں۔ جذب و جوش و کیف و مستی کا عجیب عالم اس غزل میں دکھائی دیتا ہے۔ جوش بیان، روانی اور
دوسرے ادبی محاسن اپنی جگہ۔ یہ غزل اس لائق ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔

کس علم اگر ہجوم بلا میرے ساتھ ہے
تقلید کفر میرے لیے وجہ عار ہے
ایمان کو میرے کوئی نہیں خطہ زوال
دنیا کی منزلوں میں نہیں خوفِ گمراہی
یہ دم کا کارواں ہے تری یاد میں رواں
اک تیرا ذکر روح میں ساری ہے روز و شب
اب گوش دل ہے اور محبت کے زمزمے
صفت بستہ ہیں نعیم دو عالم مرے لیے
میرے عمل ہیں دوزخ و جنت مرے لیے
اوروں کے پاس دولتِ دنیا کے ڈھیر ہیں
صبر و صلوة و ذکر سے ہے واسطہ مجھے
اکبرتوں کے لطف سے محروم ہوں اگر

مونس ہے میرا صبر، رضا میرے ساتھ ہے
جب اسوۂ رسولؐ خدا میرے ساتھ ہے
جب تیرا خوف اور رجا میرے ساتھ ہے
جب تیرا شوق راہِ سنا میرے ساتھ ہے
دل کیا ہے ایک بانگِ درائیسے ساتھ ہے
اک تیری یاد صبح و مسامیرے ساتھ ہے
یہ کون ہے جو نغمہ سرا میرے ساتھ ہے
دست دعا و ذوق دعا میرے ساتھ ہے
حقا مری جزا و سزا میرے ساتھ ہے
اور تیرا درد روح فزا میرے ساتھ ہے
وہ ذات جو ہے سب سے جدا میرے ساتھ ہے
کچھ غم نہیں کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے

تصرف تزکیۂ نفس کے ساتھ انسان دوستی کی تعلیم دیتا ہے۔ اکبر فرماتے ہیں: س
جن کے دل میں نہیں انسان کا درد لے اکبر
حق تو یہ ہے کہ وہ ظالم کبھی انسان نہ ہوئے

انہیں سارے انسان برابر نظر آتے ہیں

میری نظر میں ہر کوئی یوسف جمال ہے

حقیقت اور مجاز کے سنگم پر واقع دو خوب صورت موحدانہ شعر ملاحظہ فرمائیں :

ذکر تیرا جہاں نہیں ہوتا ہوں بھی تو میں وہاں نہیں ہوتا
ہم کو اس آستان سے کیا مطلب جو ترا آستان نہیں ہوتا
غالب و اقبال کی زمین میں ایک سادہ و پیکارا ہتھوڑا آفریں عاشقانہ و صوفیانہ غزل کے چند اشعار :
دنیا کا غم نہ خواہش عقبی کرے کوئی میری طرح جو تیری تمت کرے کوئی
جب اُن کو دیکھنے کی تمنا کرے کوئی پہلے خود اپنے آپ کو دیکھا کرے کوئی
(حلوہ خورون را روئے باید !)

ہر ایک آن تازہ تجسلی ہے روبرو میری نگاہ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
ان کو تو اپنی جلوہ نمائی سے کام ہے دیکھا کرے کوئی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
سرمایہ نشاط دو عالم ہے دردِ عشق اچھا کرے کوئی جو نہ اچھا کرے کوئی
ایک سچے توحید پرست مسلمان کی حیثیت سے جناب اکبر کا ایمان ہے کہ بالآخر فتح حق ہی کی ہوتی ہے ، باطل اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا :

عشق مغلوب ہو بس ہو کبھی ممکن ہی نہیں
سامنے حق کے نہ ٹھہرا ہے نہ باطل ٹھہرے

”جدید شعرائے اردو“ کے مصنف ڈاکٹر عبدالوحید رقم طراز ہیں :

”ان (حضرت اکبر) کے تغزل میں ایک سادگی، ایک دھیما پن اور ایک مخصوص رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے اکبر صاحب کے جذبات عام طور پر بلند ہیں لیکن ساتھ ہی وہ چونکہ بڑے سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اس لیے ان میں بڑی کشش ہے۔ غزل میں یوں بھی کیا کہا ہے، کے مقابلے میں ’کیونکہ کہا ہے‘ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ یہ ایسا جادو ہے جو پیش پا افتادہ خیالات میں بھی ایک نئی روح پھونک دیتا ہے۔ اکبر صاحب اس ’کیونکہ کہا ہے‘ کے گر سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ ان کی اکثر غزلیات اپنے سادہ مگر حسین اسلوب اور زبان کی بے پناہ لطافت اور روانی کے محاسن سے آراستہ ہیں۔“

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں :

”جہاں تک زبان کا تعلق ہے یقیناً حضرت اکبر قابلِ مبارکباد ہیں۔ ان کی زبان ایسی صاف، سادہ اور

شستہ ہے کپڑھنے والا ان کی * دلی اور لکھنؤ کی زبان میں کوئی خاص امتیاز نہیں پیدا کر سکتا پھر وہ جذبات کے بیان میں ایسے بر محل و پرتاثر الفاظ سے کام لیتے ہیں کہ کلام میں درد و لطافت کی ایک عام کسک محسوس ہوتی ہے ۔
مصنف نے اپنی رائے اور تبصرہ کو جناب اکبر کی قبل تصوف کی شاعری تک محدود رکھا ہے۔ بعد کی شاعری میں جو مقامات، سنجیدگی، پاکیزگی، سوز و گداز، روحانی تب و تاب، اسلامی اقدار اور انسان دوستی ابھری اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں راقم الحروف جناب اکبر کی دو غزلیں جو غالباً ۵۸ - ۱۹۵۷ء میں لکھی گئیں اور ان کے آخری دور کے اسلوب کی نمائندہ ہیں درج کرتا ہے :

غزل نمبر ۱ :

مہرباں وہ نہ ہوئے اور کسی عنوان نہ ہوئے	عقدہ شوق کہ مشکل نہ تھے آساں نہ ہوئے
وہ بھی عالم ہیں نگاہوں میں، نہیں جو موجود	وہ بھی جلوے ہیں نظر میں جو نمایاں نہ ہوئے
سر سے جاتا ہی نہیں عشقِ بتاں کا سودا	ہم تو آزاد بھی ہونے پہ مسلمان نہ ہوئے
ہم نے تائیدِ الہی پہ بھروسہ رکھا	اور کبھی کثرتِ اعدا سے ہراساں نہ ہوئے
بہ انگ بات ہے بر ہم ہے مزاجِ گلچیں	میرے نغمے کبھی آشوبِ گلستاں نہ ہوئے
بے ہنرین کے رہے ان کی نگاہوں میں سدا	ہم کبھی باعثِ آزارِ حریفان نہ ہوئے

غزل نمبر ۲ :

کبھی جو ترکِ وفا کا ارادہ ہوتا ہے	جنونِ عشق و محبت زیادہ ہوتا ہے
نصیب ہوتی ہے تشنہ لبی کی دولت بھی	مقدروں میں اگر ذوقِ بادہ ہوتا ہے
کسی کا نام مرے لوحِ دل کی زینت ہے	اس سے شام و سحر استغاثہ ہوتا ہے
اسی کے واسطے ہے یاں متاعِ عشقِ غیور	جو خوش نصیب کہ یک رنگ و ساڈ ہوتا ہے
جہاں بھی ہمتے ہیں حرص و ہوس کے ہنگامے	وہاں ضرور کوئی شاہزادہ ہوتا ہے
وہی ہے قوم کا رہبر وہی ہے ہادی دین	فریب و مکر کا جس پر لبادہ ہوتا ہے
یہ تحریر ہے کہ دستِ طلب ہو جتنا دراز	تو اتنا دستِ کرم بھی کشادہ ہوتا ہے

عبد شہاب کی عشق و مستی میں ڈوبی ہوئی غزل گوئی اور عہدِ شیب کی نچتر فکری کی غزل گوئی کے متعلق یہاں جگر مراد آبادی مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا ہے

شباب ہیں اس بگر غزل تو حقیقتاً ہی غزل تھی لیکن
غزل میں یہ سعتیں کہاں تھیں شعور فکر و نظر سے پہلے

چند مزید اشعار :
موت و حیات : ۷۷

موت سے اس قدر جو ڈرنا ہے یہ تو جینا نہیں ہے ، مرتا ہے
کہہ رہا ہے ہر ایک نقشِ حیات کہ مجھے مٹ کے پھر ابھرنا ہے
کہہ رہی ہے کشود غنچہ گل یہ بگڑنا نہیں سنورنا ہے
حُسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے : ۷۸
یہ کائنات یہ بزمِ ظہور کچھ بھی نہیں تری نظر میں نہیں ہے جو نور کچھ بھی نہیں
نمک اگر ہو تو ہر ذرہ میں ہزاروں طور نمک اگر نہ ہو ، بالائے طور کچھ بھی نہیں
غیب و حضور : ۷۹

یہ نکتہ مجھ پہ کھلا ہے فتوحِ غیبی سے
جو آنکھ وا ہو تو غیب و حضور کچھ بھی نہیں

پیغامِ دوست دل زندہ کے لیے : ۸۰

دلِ مُردہ پہ ہیں مسدود سب راہیں محبت کی
جو دل زندہ ہو ہر دم دوست کا پیغام آتا ہے

ماورائے غزل

جناب اکبر نے غزل کے علاوہ نعت ، نظم اور رباعی بھی کہی ہے لیکن یہ اصنافِ سخن ہمارے موضوع سے خارج ہیں
اور ویسے بھی درحقیقت وہ غزل کے شاعر ہیں۔ نعت میں ان کا اپنا رنگ ہے۔ چند نعتیہ اشعار تبرکاً درج کیے جاتے ہیں : ۸۱
وہ ہر اک مرحلہ فکر و نظر سے گزرے ہوش جس کو ہو وہ اس بختِ بشر سے گزرے
یہی مخصوص ہے اب منزلِ جاناں کے لیے جس کو جانا ہو اسی راہِ گزر سے گزرے

۷۷ آپ کی رباعیات کا مجموعہ آپ کے عزیز دوست میاں محمد شفیع (مرحوم ، سابق ڈپٹی کمشنر ، لاہور) اشاعت کے لیے
لے گئے تھے لیکن ان کی اچانک وفات ہو گئی اور مجموعہ رباعیات کھو گیا ، واپس نہ مل سکا۔ ”جدید شعرائے اردو“ کے مصنف
نے ان کی چند رباعیاں درج کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب اکبر ایک قادر الکلام رباعی گو ہیں اور بلند مرتبہ کے مالک۔ ساہد

بلند و پست سب پر ہو گئیں رحمت کی برائیں وہ ہر لطف خاص آیا وہ ہر فیض عام آیا
تعلق کی کوئی حد ہے کہ اکبر نام پاک اس کا خدا کے نام کے ساتھ ہر جگہ بالالتزام آیا

ترے سخن کا یہ اعجاز ہے برب و دود شہود غیب ہے اور غیب ہو گیا ہے شہود
خدا گواہ کلام خدا ہے تیرا کلام ہزار تجھ پہ سلام اور ہزار تجھ پہ درود

حرف آخر

راقم الحروف نے جناب اکبر کے تغزل کے بارے میں متعدد مستند اور مشہور ادیبوں اور نقادوں کی آراء کے حوالے دئے ہیں جن پر اضا ذکرنا مشکل ہے۔ موصوف خود فرماتے ہیں: ۱۔

یہ کلام اکبر خوشنوا ہے کمال فکر کا معجزہ
یہ صدائوں کی لطافتوں کی بلاغتوں کی مثال ہے

یہ محض شاعرانہ تعلی نہیں۔ انہوں نے بلند جذبات اور نازک تخیلات کو بڑی حسن کاری، سادگی و پرکاری سے پیش کیا ہے۔ وہ صحت زبان و بیان کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی غزل اپنے عہد اور ان کی شخصیت کی خوب صورت نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے لہجہ کی دلکشی، شیرینی اور پاکیزگی ان کے اپنے مجلسی انداز گفتگو کی یاد دلاتی ہے۔ اگر غزل شاعر کی اپنی ذات کو منعکس نہ کرے تو وہ فن کاری تو ہو سکتی ہے۔ سچی شاعری نہیں ہو سکتی۔ جناب اکبر کے مزاج اور کردار کی طرح ان کی غزل میں بھی لطافت، صداقت، نفاست، طہارت اور مسانت پائی جاتی ہے۔ قاری ذہنی، جذباتی اور اخلاقی ترفع محسوس کرتا ہے۔ جناب اکبر حسن و عشق کے بیان میں بھی کھل کھیلے نہیں۔ کہیں مایا نہ پن ہے نہ جنسیت زدگی نہ لذت پرستی۔ رکھ رکھاؤ ان کی زندگی اور شاعری دونوں کا نمایاں وصف ہے۔ ان کا تصوف برائے شوغفتن نہیں بلکہ اظہار ذات کا وسیلہ ہے اور دلوں کے کنول کھلا دیتا ہے۔ ان کا عارفانہ کلام عصری رویوں سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے اور من تو شدم تو من شدی کی کیفیت کا احساس دلاتا ہے۔ نئی نسلوں کی مغرب پرستی اور تجدید پسندی کے باوجود ان کا کلام اپنی باطنی قوت کے سہارے زندہ رہے گا۔

”تنقیدی اشیر باد“

ڈاکٹر سلیم اختر

مقام : شہر کا فائیو سٹار ہوٹل

وقت : سہ پہر

منظر : ایئر کنڈیشنڈ ہال میں شہر کی خوش پوش خواتین اور حضرات جمع ہیں۔ سٹیج پر ایک وزیر صاحب بطور صدر تشریف فرما ہیں ایک اور وزیر صاحب مہمان خصوصی ہیں۔ ان کے ساتھ صاحب کتاب پراجہ رہے ہیں۔ ایکشن : خطبہ کی کارروائی شروع ہوتی ہے ایک ایک نقاد آتا ہے اور جی دوستی یا حق نمک ادا کرتا ہے، تالیوں کی گونج میں نقاد آتا ہے اور تالیوں کی گونج میں نقاد جاتا ہے۔ تعریف کی حلیم تیار ہو رہی ہے اور ہر نقاد بقدر ہمت اوست اس میں گرم مصالحہ ڈالتا جاتا ہے۔

نتیجہ : تعریفیں سن سن کر صاحب کتاب کا نفس موٹا ہو رہا ہے اور کئی ہزار کے بل کے باوجود تعریف مہنگی نہیں محسوس ہوتی۔

حاصل : ٹائیں ٹائیں فٹس !

کسی تنقیدی مقالہ کا ایسا ڈرامائی آغاز کوئی اچھی بات نہیں کہ تنقیدی عمل کا ڈرامہ بازی سے کوئی تعلق نہیں لیکن کتابوں کی رونمائی کی تقریبات جس کثرت سے ہو رہی ہیں اس نے اب سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا اب تنقید کا منصب صرف یہی رہ گیا ہے کہ نقاد تعریف کے ڈرامہ کا ایک کردار بن کر رہ جائے؟ اس لیے بعض اوقات کسی کا نقاد کہنا الزام لگاتی انگلی کی صورت اختیار کر کے گویا کٹھڑے میں لاکھڑا کرتا ہے، میں کمزور اعصاب کا نقاد ہوں اس لیے فوراً اقبال جرم کر کے معافی کا خواستگار ہوتا ہوں لیکن یہ نہ بھولیے کہ سب نقاد میری مانند کمزور اعصاب کے حامل نہیں ہوتے۔ اس لیے بیشتر کا خود کو مجرم سمجھنا تو درکنار انہیں تو شاید کسی طرح کے مجرم کا بھی احساس نہ ہوتا ہوگا۔ ہر نقاد نے دوستوں کی فرمائش پر کتابوں کی رونمائی کی تعاریف کے لیے کمی نہ کمی ایسے مضامین ضرور لکھے ہوں گے جنہیں لکھتے وقت وہ شرمایا ہوگا چاہے جلسے میں پڑھتے وقت نہ گھبرایا ہو۔ لیکن بعد میں کتاب کے معیار اور اپنی تعریف میں تغاوت کا احساس کر کے یقیناً پشیمان ہوا ہوگا اسے کہتے ہیں :

ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا !

”تقریبی مضامین“ کا تو بطور مثال تذکرہ کیا جا رہا ہے ورنہ دیباچے، پیش لفظ، مقدمے، فلیپ اور بروشر

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے (ایسا تجربہ جس کی دیگر ناقدین بھی قوثین کر سکتے ہیں) بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ تعریف کے باوجود بھی دوست اس لیے ناخوش رہتا ہے کہ یہ تعریف اس کی توقعات کے مطابق نہ تھی، چنانچہ ہم نے توصیفی مضامین لکھ کر بھی دوست گنوا بیٹھے کہ تنقید کی ہنڈیا میں تعریف کا معاملہ کم رہ گیا تھا!

میں نہیں جانتا وہ کون کافر تھا جس نے سب سے پہلے کتابوں کی رونمائی کی تقریبات کی طرح ڈالی لیسکن جو کوئی بھی تھا وہ قطعاً ہمارے شکریے کا مستحق نہیں، لیکن ٹھہریے! شاید میں یہ فیصلہ جلدی میں کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ ہر امر کسی فرد سے متعلق رہتا ہے اور ہر وقوعہ اپنے عصر سے مشروط ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا میر تقی میر نے اپنے کلیات کی تقریب رونمائی کرائی تھی؟ کیا دیوان غالب کو کسی فائیو سٹار ہوٹل میں لایچ کیا گیا تھا، اور کیا مولانا شبلی نعمانی نے ”سیرۃ النبیؐ“ کی تقریب افتتاح کے لیے کسی وزیر اوقاف کو زحمت دی تھی؟ ان سب کا جواب اس لیے نفی میں نہیں کہ اس عہد میں پلسٹی کی یہ صورتیں نہ تھیں بلکہ اس لیے نفی میں ہے کہ وہ لوگ SHOW BIRZ کے عہد میں سانس نہ لے رہے تھے، اس لیے ان کا سب سے بڑا انعام تخلیق ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ میر خود کو ”مستند“ سمجھتے تھے اس لیے انہیں کسی کی سند کی ضرورت نہ تھی۔ غالب نہ سانس کی تمنا نہ صلہ کی پروا کے قابل تھے اس لیے دیوان کی اشاعت پر شیفتہ، حالی اور مجروح جیسے احباب کو مقالات لکھنے کی زحمت نہیں دیتے۔ ویسے یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ اگر غالب نے دیوان کی تقریب کرائی ہوتی تو صدارت کس سے کراتے؟ میری ذاتی رائے میں شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کے برعکس دہلی کے انگریز حاکم سے صدارت کراتے کہ تقریب رونمائی کا پھل اس طرح سے مل سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آج کا زیرک ادیب صدارت کے لیے ہمیشہ کسی وزیر کا منٹلاشی ہوتا ہے کہ اس بہانہ وزیر صاحب سے تعارف کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور دوسرے وزیر صاحب کی ذاتِ بابرکات کی وجہ سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندے اور اخبارات کے فوٹو گرافر بھی ضرور آجاتے ہیں۔ ادھر ہمارے اخبارات کا وٹیرہ بھی یہی ہے کہ خبریں اور تصویر کی اہمیت وزیر یا مہمان خصوصی کے سٹیٹس کے حساب سے بنتی ہے لہذا کتاب، صاحب کتاب یا معاملہ نگاروں کے اسماء اور ادبی مقام کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔

ہم جلد بازی کے دور میں سانس لے رہے ہیں اس لیے ہم انسٹنٹ کافی کے عادی ہیں اور شارٹ کٹ کے ذریعہ سے سفر مختصر کرتے ہیں لیکن کافی کی مانند انسٹنٹ فیم نہیں ملتی اور نہ ہی محنت اور لگن کی بجائے شارٹ کٹ سے شہرت کی بلندیوں کو چھونا ممکن ہے آج ہمیں فیض، ندیم اور اشفاق احمد مشہور اور مقبول نظر آتے ہیں لیکن کون جانے انہوں نے اس مقام کے حصول کے لیے کتنی محنت کی ہوگی!

ادھر ادیب کے لیے اپنی پہلی کتاب کا پتھر ل کچھ پہلے بوسے یا پھلے بچہ کی پیدائش جیسا ہوتا ہے اور مصنف سمجھتا ہے کہ میں نے اس کتاب سے دنیا کو تسخیر کر لیا ہے لیکن وہ یہ اساس حقیقت فراموش کر دیتا ہے کہ

آج شعر کہنا ایک آزاد اور خود کار قسم کا وقوع نہیں ہے اس لیے کہ آج کا شعر کسی غلام میں نہیں تخلیق کیا جاتا اس کے پیچھے کئی سہ سال کی شعری روایات ہوتی ہیں اس لیے شعر کے اچھے برے یا مقبول و نامقبول ثابت ہونے کا انحصار محض اس کی فنی خصوصیات پر نہیں ہونا، یہی نہیں بلکہ صرف اچھے خیال سے بھی وہ اچھا شعر قرار نہیں پاتا۔ دراصل آج کے شعر نے خود کو دو طرح سے منوانا ہے ایک نوئی سو برس پر محیط شعری تاریخ کے تناظر میں اپنے جنم کا جواز فراہم کرنا ہے اور دوسرے صدی شاعری میں اپنے وجود کا اثبات کرنا ہے۔۔۔ اس دوسرے امتحان میں کامیابی کے بعد ہی وہ شعر زندہ شعر قرار پائے گا۔ غزل کی تاریخ ہزاروں ستواؤں پر مشتمل سہی مگر کتنے شاعر زندہ رہ سکے، اس طرح آج کے شعرا جو شاعری کر رہے ہیں ان میں سے کتنے وقت کی میزان کا پلڑا جھکانے میں کامیاب ثابت ہوں گے؟ حالت تو یہ ہے کہ شعری مجھے اور ارقی کل کی طرح آراستہ چھپنے کے ساتھ ہی خزاں گزیدہ پتوں کی مانند وقت کے شجر کی ڈالی سے یوں جھڑ جاتے ہیں کہ۔۔۔ لے گئی پون اڑا۔۔۔ اس لیے تو زیادہ تر گتائیں بڑے تخلیق کاروں کے تخلیقی سفر۔۔۔ "بلند آئی نہایت غبار راہ میں ہے" کے مقابل میں محض گرد راہ ثابت ہوتی ہیں۔ اور اس موقع پر تنقید کے کردار کا آغاز ہوتا ہے ہم اسے مرتباً نہ تنقید کہیں، تقریبی تنقید کہیں یا تنقیدی اشیر باد۔ یہ ایک ہی وقوع ہے اور اس کا نقصان اس امر میں مضمر ہے کہ دوستی، تعلقات یا مفادات کی خاطر یہ ناقص کے نقائص نہیں گنوائی اور خام کی خامیوں کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اگر یہ نقاد کی کم بگاہی کی وجہ سے ہو تو کوئی حرج نہیں کہ وہ اتنی ژرف نگاہی کا حامل ہی نہ تھا کہ تخلیق کا تحلیلی تجربہ کر سکتا لیکن ہوتا یہ ہے کہ نقاد جانتے بوجھتے اپنی تنقیدی بصارت کو MYOPIC بنا لیتا ہے جس کا اعتراف بالعموم تقریباً ہر زمانے کے بعد کچھ ان الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ "یار! کتاب تو بس ایسی ویسی ہی تھی مگر کیا کرتا اپنے دوست کی کتاب جو ٹھہری!"

مرتبانہ تنقید کے فروغ میں انفرادی سطح پر دوستانہ تعلقات سے لے کر اجتماعی سطح پر ادبی گروہ بندیوں تک۔۔۔ کئی طرح کے حوال کار فرمانظر آتے ہیں چنانچہ اپنے گروہ کی ترقی و ترقی قوت اور دہشت میں اضافہ کے لیے جہاں بڑے بڑے منفی حربے اپنائے جاتے ہیں وہاں تنقیدی اشیر باد میں بھی فراخ دلی سے کام لیا جاتا ہے۔ بے معنی نظم میں اسرار حیات تلاش کیے جاتے ہیں، جس افسانہ کی ہر چول ڈھیلی ہوا سے رُوح عصر کا استعارہ قرار دیا جاتا ہے فنی لحاظ سے ناقص ناول صدی کی بہترین تخلیق قرار پاتی ہے اور جاثیاں لانے والے انشائیے میں شگفتگی گل لائے ناز کا منظر دیکھا جاتا ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ انہیں لغو میں الہام نظر آتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس صورت حال بھی کوئی ایسی دل خوش کن نہیں ہے اور یہ ہے مرتبانہ کے مقابلہ میں معاندانہ تنقید۔۔۔ جس میں اگر ایک انتہا پر انفرادی نقص کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری انتہا پر یہ گروہی کینہ کی مظہر ہوتی ہے، اس کا مقصد وحید صرف کردار کشی ہے اور بس! اگر مرتبانہ تنقید میں خامیاں نہ دیکھنے کے لیے نقاد ایک آنکھ بند کر لیتا ہے تو معاندانہ تنقید میں خوبیاں نہ دیکھنے کو نقاد دونوں آنکھیں بند کر لیتا ہے اور یوں تنقیدی

بددیانتی اپنے نقطہ عروج تک پہنچ جاتی ہے ۔

ہمارا معاشرہ ہر معاملہ میں شارٹ کٹ کا متلاشی رہتا ہے ادھر ادبی شہرت کا شارٹ کٹ تقریبات کے بعد اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں اور ادبی کالموں کی صورت میں تلاش کر لیا گیا ہے بلکہ دیکھا جائے تو ادبی ایڈیشن اور ادبی کالم — ادبی تقریبات کی ضمنی پیداوار نظر آتے ہیں ادبی ایڈیشنوں میں رپورٹنگ ہوتی ہے اور تصویریں بھیجتی ہیں جبکہ کالم میں تعریف کے ڈونگرے برساتے جاتے ہیں (یا پھر ٹانگ کھینچی جاتی ہے) شاید اس لیے اب ادبی جرائد کے مدیران کے برعکس ادبی ایڈیشنوں کے نگران اور کالم نگار ”بادشاہ گر“ بن چکے ہیں ۔ ادھر کالم کے خالق اور کالم نگار کی آراء کی اہمیت کا انحصار کالم نگار کی ذاتی پسند و ناپسند اور اسلوب کے ساتھ ساتھ اس کی نیت اور شخصیت میں اخلاقی جرات کے جوہر پر بھی ہوتا ہے صرف اسی ایک بات پر کالم کی اور کالم نگار کی رائے کی اہمیت کا تعین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نام سے لکھنے کی جرات بھی رکھتا ہے یا نہیں ؟

گریہ نہیں تو بابا باقی کہا نیاں ہیں !

صاحب ! یہ ہے ہمارے عہد میں تنقید کا معکوسی سفر — ایسا معکوسی سفر جو اسے اس انتہا تک لے آیا کہ صبح کی تنقید میں شام کو پنساری پڑیاں باندھتا ہے مگر یہ قابل افسوس یا قابل مذمت اس لیے نہیں کہ یہ سب کچھ عصری تقاضوں کے عین مطابق ہے ۔ اگر جیسی روح ویسے فرشتے والی بات صحیح ہے تو پھر جیسے ادیب ویسے نقاد والی بات کو بھی درست ہی سمجھنا چاہیے ۔

ہم دور انحطاط میں سانس لے رہے ہیں جس عہد میں بنیادی صداقت کے حامل اداروں کو گھن لگ چکی ہو، جہاں قدروں کا زوال اجتماعی المیہ جنم دے رہا ہو، جہاں حق اور انصاف جیسے الفاظ محض ”سرف مکدر“ کی صورت اختیار کر چکے ہوں اور جس معاشرہ کا ٹریڈ مارک منافقت ہو تو پھر وہاں کے تخلیق کار اگر محنت اور فنی لگن کی بجائے تنقیدی سرپرستی کے خواہاں ہیں تو یہ مروج چلن کے عین مطابق ہے، اسی طرح نقاد اگر برا لکھنے والے کو حیات جاوید کی سنڈل تقسیم کرتے ہیں تو وہ کیا کریں آخر انہوں نے بھی تو اسی معاشرہ میں اپنے ادیب دوستوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے جب معاشرہ کا ہر سرکردہ قول اور فعل کے تضاد کی عملی تصویر پیش کر رہا ہو تو پھر نقاد کی گفتگو اور تحریر میں نفس کی شکایت کیوں ؟

اور آخری بات —————

یہ مضمون معروضی تجزیہ ہے، اقبالِ جرم ہے یا فرضِ کفایہ ؟ اس کا جواب میں آپ پر چھوڑتا ہوں !

میرامن دلی والے

ڈاکٹر محمد آحمد بیگ

ڈاکٹر جہاں یار تھوک گلکرسٹ (پ ۱۹۵۹ء - وفات ۹ جنوری ۱۹۸۳ء) کی تصنیفی و تالیفی خدمات کے علاوہ ایک اہم کارنامہ گوشہ نگاہی میں سکتے ہوئے میرامن دلی والے جیسے مالِ بذرِ کارِ سندھوستانی مصنف و مترجم کو منظرِ عام پر لانا ہے۔ جن کا شکرہ: جاہلیت درجہ عاجزی کے ساتھ چار درویش 'المعروف' باغ و بہار' کے دیباچے میں ادا کر دیا گیا ہے، لیکن یہ ڈاکٹر جہاں گلکرسٹ ہی ہیں جنہوں نے فورٹ ولیم کالج کے انتخابی مجموعے 'HINDI MANUAL' (مطبوعہ: ۱۸۰۲ء) اور 'باغ و بہار' (مطبوعہ: ۱۸۰۲ء) کے آئٹمن انڈیس کے سرورق پر مصنف / مترجم کے اصل نام کی بجائے صرف میرامن طبع کر والے کی غلطی کر کے میرامن علی دلی والے کے حملہ احوال و آثار اور آئندہ تصنیفی کارناموں کو بحرِ اندھیروں میں دھکیل دیا۔ اس کی نوعیت اجمالاً یوں ہے

۱۔ میرامن کے اصل نام کا معاملہ مدت بہ مدت تک کھٹائی میں پڑا رہا۔

۲۔ سسزیدائن کا نعیش مدت تک دُسواری رہا۔

۳۔ میرامن کی تفصیلی و مالیاتی زندگی و ورثہ ولیم کالج ملکتہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔

۴۔ سسزیدائن کو ان کا سالِ وفات تقویر کر لیا گیا

۵۔ میرامن کی مامور اولاد کے حوالے سے بھی میرامن کے حالاتِ زندگی کی یتالی ممکن نہ ہو سکی اور یوں میرامن کے احوال و آثار کو وقت کی دیز تانے لگی طور پر ڈھانپ دیا۔

میرامن نے اپنے وقت کے دستور کے مطابق اپنا تخلص ہی بننا اور چار درویش 'المعروف' باغ و بہار' اور گنجِ خوبی کے دیباچوں میں اپنا نام میرامن دلی والے 'درج کیا۔

۱۔ "پیلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار، میرامن دلی والا بیان کرتا ہے"

(دیباچہ باغ و بہار سے اقتباس)

۲۔ خداوندِ نعمت، صاحبِ خلق و مروت، جان گلکرسٹ صاحب نے کہ زبانِ اُردو کے قدردان اور نیک زادوں کے فیضِ رساں میں، اس بعید الوطن میرامن دلی والے کو لطف و عنایت سے فرمایا کہ 'اخلاقِ محسنی' جو فارسی کتاب ہے اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کر دو۔

(دیباچہ 'اخلاقِ محسنی' سے اقتباس)

جب کہ بہت پہلے میرامن کے اصل نام کے باب میں مولوی سید محمد (مصنف اربابِ نشر اُردو) اور مولانا حامد حسن

نادرہ (مصنعتِ داستانِ تاریخِ نثر اردو) نے میرامن کا اصل نام میرامان اور تخلص بالترتیب لطف اور امین بتایا تھا، لیکن ان دونوں کے پاس اس ضمن میں کوئی شہادت نہ تھی۔ کچھ سی سبب سے کہ پروفیسر مختار حسین نے ان دونوں کی اس تحقیق کو نا حال مان کر نہیں دیا۔ اور نہ ہی دیگر محققین نے نام سے متعلق اس انکشاف کو کوئی اہمیت دی۔

’چار درویش‘ المعروف ’باغ و بہار‘ اور گنجِ غوثی (ترجمہ: اخلاقِ عسائی) کے بعد کے کارنامے میرامن کو مہرمان علی امن دلی والا ثابت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو سترہ شمس

’مجل: ۱۲۵۳ مطابق ۱۸۳۷ء مطبوعہ: ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء کے دیباچہ از نواب محمد فخر الدین خاں المخاطب

بشمس الامراء حیدر آباد دکن سے اقتباس :

”بندہ نیازمند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب بشمس الامراء اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علومِ فلاسفہ کی جو زبانِ فرنگ میں مرقوم ہیں بسبب میلاںِ طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا۔ میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل انکے اذہن تھے اور اگرچہ بعض علومِ فلاسفہ زبانِ عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں، چنانچہ علمِ جبرِ تعقل اور علمِ انظار وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعض علومِ اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا، چنانچہ علمِ آب و ہوا اور برتک اور متناطیس اور کیمسٹری وغیرہ اس واسطے سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لیے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبانِ فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصتِ قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہوئے۔ چنانچہ ان دنوں میں بحسبِ مدعا چند رسالے مختصر علومِ فلاسفہ کے بطریقِ سوال و جواب کے لکھے ہوئے روپری رنٹ چاس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے۔ بیچم پہنچے۔ ان میں سے رسالہ علمِ جبرِ تعقل۔ علمِ طبیعت اور علمِ آب اور علمِ ہوا اور علمِ انظار کے اس کے آخر میں متناطیس کا رسالہ بھی شریک تھا اور برتک کا کہ ہر ایک ان میں سے بدرجہ اوسط نہ بہت کم نہ بہت زیادہ لکھا ہوا تھا اور ہر چند ترجمہ ان علوم کا ہر ایک زبان میں قلمرو اہل فرنگ میں ہر رواج پایا ہے مگر نظر کرتے فائدے ساکنانِ جہدِ فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے میرامان علی دہلوی اور غلام محی الدین حیدر آبادی اور مسٹر جونس اور موسیٰ تندوس کو جو ملازمانِ سرکار ہیں یکم کرنے میں آیا کہ ان علومِ مذکور کو زبانِ انگریزی سے اردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں، چنانچہ بفضلِ حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے مگر بعض اسماء انگریزی اصطلاح کے جو زبانِ عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے، ان کو اس زبانِ اصلی پر ہمائی رکھتے ہیں آیا اور یہ چھ رسالے جو ترجمہ کیے گئے تھے علمِ پرستش میں اس واسطے نام ان کا سترہ شمس رکھا گیا۔ مناسب جان کے علمِ متناطیس کو علمِ انظار کی جلد سے علیحدہ کر کے آخر

میں بعد رنگ کے متریک کیا اور مادہ تاریخ اس رسالے کا گزرا نا ہوا۔ حافظ مولوی تمس الدین فیض کا یہ ہے۔
(ذاتی فوائس الامراء ۱۲۵۳ھ)

- ۱۔ اب وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مولوی سید محمد اور مولانا حامد حسن قادری نے میرامن کے اصل نام کے تعین کے سلسلے میں تمس الامراء حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ سے منسلک اسی میرامن علی کے کام کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد میرامن کا نام میرامن علی رکھا ہوگا۔ نیز ان کے پاس تحسیری سطح یک کافی داخلی شہادین ہوں گی اسی لیے وثوق اور قطعیت کے ساتھ انہوں نے میرامن کا اصل نام میرامن علی رکھا اور کسی قسم کے حوالے کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔
- ۲۔ زمانی اعتبار سے بھی میرامن علی میرامن ہی ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں معلوم ہوتا ہے اور یہ تخلص میرامن علی کا ہی موزوں تر ہے۔

۳۔ میرامن فورٹ ولیم کالج میں منشی منیر حسین تھے اور یہاں بھی مترجم کا ہی حوالہ موجود ہے۔
۴۔ روائع فی الدین خاں کے مقدمہ میں میرامن علی دہلی کا نام باطن میں کے مزب شہور شاعر اور ماہر لسانیات غلام محمد الدین میں حیدرآبادی۔ اگر بڑا عالم مترجم اور فاضل لسانیات ہو تو سندس سے بھی پہلے لیا گیا ہے۔ تقیاس غالب ہے کہ حیدرآباد دکن کے ان میں بہت بڑے مترجم سے پہلے میرامن علی دہلی کا نام رکھنے میں ان کی فورٹ ولیم کالج والی نہایت کوتاہی رہا ہوگا۔

اس ضمن میں دیگر حوالے مرتبہ محل کی مناسبت کے ساتھ آگے آئیں گے۔ مثال کے طور پر یہ سوال خاصا اہم ہے کہ ۱۸۶۶ء میں فورٹ ولیم کالج کونسل نے میرامن کو ان کی اپنی خواہش کے مطابق چار ماہ کی تنخواہ مبلغ ۳۲۰ روپے ادا کر کے کالج سے الگ کر دیا تھا تو میرامن گئے کہاں؟

اور دوسری اہم بات یہ کہ میرامن کو ان کی خواہش کے مطابق کالج سے الگ کیا گیا۔ علاحدگی کا سبب بڑھا پائاؤن کی طبعی علالت نہیں بلکہ غالب ہے کہ میرامن نے کالج کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر بروقت حیدرآباد دکن کا رخ کیا ہو۔ جہاں شمس الامراء نے دارالترجمہ قائم کرنا تھا۔ اگر یہ شہادتیں قابل قبول ہوں تو کہا جاسکتا ہے کہ میرامن دلی والے کا پورا نام میرامن علی من دلی والا تھا۔

میرامن کے لطف تخلص کرنے سے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق پر کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے

ہیں :- ”وہ معمولی شہید کے شاعر تھے۔ انہیں خود بھی اپنی اس شاعرانہ حیثیت کا احساس ہے۔ گنج خوبی“ کے دیباچے میں اپنی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی
فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی

جس شخص کی شاعرانہ استعداد کا یہ عالم ہو اُس کا تذکروں میں ذکر معلوم بعض متاخر کتب میں ان کے دو تخلص بیان کیے گئے ہیں، آمن اور لطف۔ لطف تخلص کا استدلال باغ و بہار کے اس شعر سے کیا گیا ہے :

تو کوئین میں لطف پر لطف رکھ

خدا یا یہ حق رسول کبار

لیکن شعر میں کوئی قرینہ نہیں کہ میرامن تخلص لطف قرار دیا جائے۔ مرزا علی لطف مولف تذکرہ گلشن ہند شاعر تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔ گارسین دتاسی نے ان کے صاحب دیوان ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے باتا عہدہ ملازم تو نہ تھے، لیکن ان کے تفصیلی کام کی اشاعت فورٹ ولیم کالج ہی سے ہوئی۔ یہ ممکن ہے ہی میں مقیم تھے۔ میرامن نے گنج خوبی کے دیباچے میں ان کے دو شعر دیئے ہیں :

”مرہٹے جب عالمگیر بادشاہ کے بعد عالمگیر ہو کر ہندوستان میں چھائے۔ حضور راغریز کی فوج ظفر موج کے سامنے مرہٹے اور کائی سے پھٹ کر تنزی بنری ہو گئے۔۔۔۔۔ اور عین مقابلے کے وقت کا یہ قطعہ لطف کا ہے :

پلٹن اور تو پس جب سنمکے ہوئیں

مرہٹے مصیبت (کذا) کے مارے مر گئے

فیر سننے ہی ففسد ہو چلے

چھٹی جب بندوق کوئے اڑ گئے

قیاس یہ ہے کہ امن نے باغ و بہار میں بھی اسی لطف کا شعر دیا ہے اور لطف میرامن کا اپنا تخلص نہیں تھا۔“

”باغ و بہار“ کے خاتمہ کتاب میں مرزا لطف علی لطف کے بارہ اشعار شامل ہیں۔ ان غزلیہ اشعار کا مطلع ”باغ و بہار“ کے سالی تصنیف سے متعلق ہے۔ ملاحظہ ہو :

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار

تھے سنہ بارہ سو ستترہ در شمار

کر و سیراب اس کی قم رات دن

کہ ہے نام و تاریخ باغ و بہار

خزاں کا نہیں اس میں آسیب کچھ

ہمیشہ تر و تازہ ہے یہ بہار

مرے خونِ دل سے یہ سیراب ہے اور لختِ جگر کے ہیں سب گدبار

مجھے مجھول جاویں گے منب بعد مرگ
 رہے لگا کر نہ سخن یاد تھا ر
 اسے جو پڑھے باد مجھ کو کرے
 یہی قاریوں سے مرا ہے تدار
 خطا گر کہیں ہو تو رکھیو معاف
 کہ مجھ لوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار
 ہے انسان مکتب زسود و خطا
 یہ تو کے گاہر چند ہو ہوشیار
 میں اس کے سوا جانتا کچھ نہیں
 یہی ہے دعا میری اسے کر دو گار
 نیری یاد میں میں رہوں دم بہ دم
 کہے اس طرح میرا سبیل و نبار
 نہ پرسش کی سختی ہو مجھ پر کبھی
 نہ شب گور کی اور نہ روز شمار
 نہ کوئین پر لطف نہ لطف رکھ
 خدایا یہ حق رسول کبار

۱۱ اشعار میں مرزا لطف علی لطف نے میرامن کے جذبات کی عکاسی کی ہے اور یہ طریقہ اس دور میں مروج تھا۔ شمس الامراء حیدر آباد کن کی میٹرک کتب کا مادہ تاریخ حافظ میرزا یوسف شمس الدین محمد فیض کا نکالا ہوا ہے جب کہ کچھ کتب میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور کچھ میں نہیں۔

۱۲ باع و بہار کے خاتمہ کتاب میں مرزا لطف علی لطف کے اشعار کی شمولیت کا ایک سبب یہ بھی رہا ہوگا کہ لطف ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے بہت قریب تھے اور گلکرسٹ کی ہی فرمائش پر انھوں نے علی ابراہیم خاں کے تذکرہ شعرائے ہند، گلزار ابراہیم (سال تصنیف ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۸۷۴ء) کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا اور تذکرہ گلشن ہند نام رکھا۔ لطف نے یہ ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا تھا۔

مرزا لطف علی لطف "تذکرہ گلشن ہند" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں :

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا اور نام گلزار ابراہیم رکھا ہے۔ ۱۱۹۸ھ اور ۱۸۷۴ء عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور لڑیں ہے کہ بارہ برس میں میرا نکاح ہوا، رفتہ رفتہ جب میری حلقہ بزم

نکتہ دانی مولف افزائے مخلص معانی، سخن کی جان اور سخن دانوں کے قدردان صاحب والا مناقب بٹر گلکرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا، از بسکہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہواور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کو مرغوب ہو۔

میر امن نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ملازمت اختیار کرنے تک کے مختصر حالات زندگی، باغ و بہار، اور گنج خوبی کے دیباچوں میں بیان کیے ہیں، ملاحظہ فرمائیے :

”پہلے اپنا احوال یہ عامی گنہگار، میر امن دلی والا بیان کرنا ہے کہ میرے بزرگ ہاویں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں بشت بشت جاں فشانے بجالانے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے، قدر دانی جتنی چاہیے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے ہر فرد کو کر مالا مال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موردی اور منصب دار غلبی، زبان مبارک سے فرمایا چنانچہ یہ لقب شاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آباد تھے) یہ بخت پہنچی ظاہر ہے۔ عیاں راجہ بیاں۔ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر وہ شہر سے (کہ دہلی اور جنم بوم میرا ہے اور آؤں نال وہی گڑا ہے) جلا وطن ہوا، اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کتنے برس بدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بچی کچھ بھڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تنہا کشتی پر سوار ہوا شرف السلا دکھتے میں آب و دانے کے زور سے آپہنچا۔ چندے بے کاری میں گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بھاگ کر اپنے چوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباد اپنا نہ دیکھا۔ تب کمشنر میر بہادر علی جی کے وسیلے سے، ہنوز تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر ردام اقبال کے دسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوان مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بچے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا اٹھا کر، پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دین آدمی، چھوٹے بٹھے، پرورش پاکر دکھاؤں قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔“

اس کے بعد میر امن نے دیباچے میں امداد زبان کے آغاز کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ اس کے آخر میں کہتے ہیں :

”جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو مڑایا، شاہ عالم پورب کی طرف تھے۔ کوئی

عادت اور ملک ملک کا نہ تھا، شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔
کلب باری تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے کہیں میں کہیں تم ہو کر جہاں جس کے سیٹنگ سمائے وہاں نکل گئے۔
جس ملک میں پیچھے وہاں کے امیروں کے ساتھ شکست سے بات چیت میں فرق آیا۔ .. یہ عاجز
بھی ہر ایک شہر کی میر کرتا اور تماشا دیکھتا میاں ملک بھی ہے :

”خداوند ستمت، صاحب خلق و مروت، جان گلکرسٹ صاحب نے کہ زبان اردو کے قدردان
اور ملک زدوں کے فیض رساں ہیں۔ اس بے بیاد الوطن میرامن و آئی والے کو کُٹھ و عنایت سے
فرمایا کہ اخلاق محسن جو فارسی کتاب ہے، اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو تو صاحبان مالی تان کے
درس کی خاطر مدرسے میں کام آدے۔ یہ موجب حکم ان کے سرانگھوں سے قبول کیا۔ اس لیے کہ
مہرہن اُن کے احسان کا ہوں۔ آدمی سر پر سے رکھنا اتارنے کا احسان یا درکھنا ہے، اُنھوں نے تو
روزی سے لگا دیا۔ اور میں نے بھی انھیں کے سبب یہ مہینہ قبول کیا۔ قطعاً

میں بناد آباد گلکرسٹ صاحب
میں اُن کے خوش آشنا یا رہبائی
دلی مہرمانی جو تھی روز اقل
اسے کُٹھ سے نا باخسر نبھائی

اور بامبدصلہ کے، کہ حکم عام حاضر کا ہوا ہے، واسطے پرورش اطفال کے۔ اس کنیر العیال نے سنہ
ایک ہزار و سوسترہ ہجری میں مطالبی اٹھارہ سے دو ہجری کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو کھنا شروع
کیا۔ انہیں کہ جتنی خوبیاں انسان کو جہنم اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لیے دے دے
سب اس میں بیان ہوئیں۔ اس واسطے اس کا نام بھی گنج خوبی لکھا گیا

میرامن کے سسہ پیدائش سے متعلق ہوم ڈیپارٹمنٹ، بلیک پروسسڈنگز کا امپریل ریکارڈ بابت فورٹ ولیم کالج
کلکتہ (نئی دہلی) کچھ دہائی نہیں کرتا۔ لیکن اگر میرامن کو میرامن علی دہلوی ملازم سرکار شمس العلماء حیدر آباد دکن مان لیا جاتا
ہے تو میرامن کی طبی عمر سے متعلق بہت سے الجھیرے رفع ہو جاتے ہیں۔ ستہ شمسیہ کا دیباچہ میرامن کو ۱۸۳۰ء تک حیات
مابت کرتا ہے۔

یاد رہے کہ اس سے قبل پروفیسر ممتاز حسین اور ان کی تقلید میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری کا قیاس ہے کہ میرامن کی
پیدائش بعد محمد شاہ (وفات : ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۷۸ء) میں ہوئی اور ۱۸۰۶ء میں وفات پانگئے۔ اس قیاس کی بنیاد
”آپ حیات“ از محمد حسین آزاد اور میرامن کی خود نوشت مختصر حالاتِ زندگی (دیباچہ حیات : ”باغ و بہار گنج خوبی“)

محمد حسین آزاد کا بیان مستند تحقیق سے متعلق اپنی وقعت کھو چکا ہے۔ اب آئیے 'باغ و بہار' اور گنج خوبی کے دیباچہ چٹا کی طرف۔ بقول میرامن، اُن کا خاندان، نصیر الدین ہمالیوں کے عہد سے لے کر شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت تک منصب دار قدیمی اور خانہ زاد موروثی میں شمار کیا جاتا تھا اور اُن کے خاندان کا یہ لقب مُغل شاہی دفتر میں درج تھا اس خاندانی افتخار کے اظہار کے بعد لکھتے ہیں :-

”جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آزاد تھے، یہ ذہبت پہنچی، کہ ظاہر ہے عیاں راجہ بیاں۔“

[مغلیہ حکومت کے اختیار ہو جانے، شہنشاہِ ہند عالم گیر ثانی کے قتل (۱۷۰۷ء) اور سورج مل جاٹ کے ۱۷۵۳ء میں دہلی پر حملے کے طرف اشارہ۔
تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کیا۔

[سورج مل جاٹ (وفات : ۲۵ دسمبر ۱۷۶۳ء) کا دہلی پر دوسرا کامیاب حملہ ۱۷۶۱ء اور میرامن کی خاندانی جاگیر کی ضبطی کی طرف واضح اشارہ۔ بقول میر محمد تقی میر ”سورج مل جاٹ نے ۱۲ جون ۱۷۶۱ء میں اکبر آباد پر قبضہ کیا۔ لیکن اس سے کچھ دن پہلے اس کا اکبر آباد کے اکثر محلات پر قبضہ مکمل ہو چکا تھا“ قباس کیا جاسکتا ہے کہ سورج مل جاٹ نے جاگیروں کی ضبطی کا کام اس کے بعد ہی کیا ہوگا۔
اور احمد شاہ درانی نے گھربار تاراج کیا۔

[”ذکر میر“ میں بھی احمد شاہ کو ابدالی ”نہیں“ درانی ”لکھا گیا ہے۔ یہاں ابدالی کے دہلی پر پہلے کامیاب حملے (۱۷۵۷ء) کی طرف اشارہ ہے۔

میرامن دیباچے کے آخر میں رقم طراز ہیں :
”جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا، شاہ عالم پورب کی طرف تھے (شاہ عالم ۱۴ مئی ۱۷۵۸ء میں دہلی چھوڑ کر پورب کی طرف نکل گئے تھے) کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ تھا، شہر بے سر ہو گیا سچ ہے بادشاہست کے اقبال سے شہر کی رونق تھی ایک بارگی تباہی پڑی“

[عالم گیر ثانی کے قتل (۱۷۰۷ء) کے بعد شاہ جہان ثانی ۳۰ نومبر ۱۷۰۷ء کو ۲۱ مئی ۱۷۰۷ء تک حکمران رہا، لیکن اس کے بعد شاہ عالم ثانی کی ۱۷۰۷ء میں دہلی والپتی تک تخت تقریباً بارہ برس تک خالی رہا، اس دوران میں بقول میرامن : ”دعیں دہلی کے کہیں یہ کہیں، تم کہیں ہو کہ جہاں جس کے سینگ سمانے وہاں نکل گئے“

اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کا تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے کہ میرامن نے دہلی کے امراء و رؤساء کے ترک وطن کرنے کی بات کی ہے۔ اسے میرامن کی جلا وطنی خیال نہیں کرنا چاہیے۔ میرامن کی تحریر سے داخل شہادت کو دیکھتے ہوئے ان کی جلا وطنی کا زمانہ جاگیر کی ضبطی کے بعد کا بنتا ہے۔

ایسی ایسی بنا ہی کھا کر

لفظ "ایسی" کے دوبار استعمال کے حوالے سے ابدالی کے پہلے (۱۷۵۷ء) اور دوسرے (۱۷۶۰ء) کی طرف اشارہ۔

دسے شہر سے (کہ وطن اور سبزمی میرا ہے اور آفل نال وہیں گزرا ہے) جلا وطن ہوا اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا پادشاہ تھا) غارت ہوا۔

یہاں جہاز غارت ہونے سے مراد میرامن کے گھرانے کی بربادی ہے، جو منصب دار قیّیٰ اور خانہ زاد موروثی ہوتا رہا جاتا ہے۔ میرامن نے سورج مل جاٹ کے دوسرے حملے (۱۷۶۱ء) اور جاگیر کی ضبطی کا ذکر پہلے کیا اور اس کے دو ایک برس ابدالی کے دہلی پر پہلے (۱۷۵۷ء) اور دوسرے حملے (۱۷۶۰ء) کا ذکر بعد میں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میرامن کی دہلی سے جلا وطنی سورج مل جاٹ کے دہلی پر کامیاب حملے (۱۷۶۱ء) کے بعد ہوئی، فرض کیا سورج مل جاٹ نے اپنی وفات ۱۷۶۶ء مطابق (۶۳-۱۷۶۲ء) تک دہلی کے جاگیرداروں کو ان کی جاگیروں سے محروم کیا، تو اس کے بعد کا زمانہ میرامن کی دہلی سے جلا وطنی کا بنتا ہے، اس لحاظ سے اگر میرامن ۱۷۶۳ء میں بھی جلا وطن ہوئے تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اُس وقت ان کی عمر تیرہ برس رہی ہوگی۔ یوں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ میرامن پیدا ہوئے ہوں گے۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

لفظ "بے کسی" اور گھرانے کے غارت ہونے کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ میرامن بہت کم عمری میں دہلی سے جلا وطن ہوئے یعنی ۱۷۶۳ء میں تیرہ برس کی عمر میں دہلی کو چھوڑا تو یہ داخلی شہادت ہمارے اس بیان کو بھی تقویت بخشتی ہے کہ میرامن ستہ شمسیر (تکیل ۸۳۷ھ) کے دیباچے کے مطابق ۱۸۳۷ء تک حیات تھے اور اس دور میں اتنی عمر پانا حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ ۱۸۳۷ء میں بھی ان کی عمر ۸۷ برس سے تجاوز نہیں کرتی۔

ڈو جے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تنہا کشتی پر سوار ہوا شرف البلاد کلکتے میں آکے دولہ

کے ذور سے آپہنچا۔

دوبستے کو تنکے کا آسرا کے محاورے اور صبیحہ واحد منکلمہ پر غور کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ میرامن کم عمری میں دہلی سے تنہا نکل بھاگے، عظیم آباد میں جوان ہوئے، شادی کی (جسے تنکے کا آسرا قرار دینے میں) ورنہ دہلی سے نکلنے کے بیان میں عیال و اطفال کا ذکر ضرور کرتے۔ یہ داخلی شہادت بھی ہمارے اس بیان کو تقویت بخشتی ہے جس میں ہم نے میرامن کو ۱۸۳۱ء تک خیانت ثابت کرنا ہے۔

چند سے بے کاری میں گزری۔ اتفاقاً نواب دلا در جنگ نے بوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خان کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔

وسط ۱۷۹۷ء تا ۱۸۰۱ء کا زمانہ مراد ہے اور اگر ”چند سے بے کاری میں گزری“ کا خیال کریں تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ۱۷۹۸ء کی ابتدا میں نکلتے آئے۔

تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے، حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر (دام اقبالہ) کے سائی ہوئی۔

میر بہادر علی حسینی نارولی (سیکٹ منشی فورٹ ولیم کالج) کی معرفت ڈاکٹر جان بارہوک گلکرسٹ سے اپریل ۱۸۰۱ء میں متعارف ہوئے ہوں گے۔

بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ پہلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا اٹھا کر، پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی، چھوٹے بڑے، پرورش پا کر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔

پروفیسر ممتاز حسین نے اس اقتباس کے ساتھ اختتام کتاب کے درج ذیل اشعار کو ملا کر پڑھا،

میں اس کے سوا چاہتا نہیں کچھ بی بی ہے دعا میرے لیے کردگار
تیری یاد میں ہیں رہوں دم بدم کئے اس طرح میرا لیل و نہار
نہ پریش کی سختی ہو مجھ پر کبھی نہ شب گور کی اور نہ روز شمار
تو کوئین میں لطف پر لطف رکھ

خدا یا بھگتی رسول گبار

بحوالہ دیباچہ ”کنج خوبی“، میرامن کا شیر العیال ہونا میر بجوالہ دیباچہ ”باغ و بہار“
گلکرسٹ دس چھوٹے بڑے آدمیوں کے پرورش پانے والے بیانات کو ان اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے پروفیسر ممتاز حسین صاحب نے میرامن کو گور میں پاؤں ڈالے لیڈھا گلکرسٹ آدمی

تاج کر دیا۔ جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔
 ۱۔ میرامن کے ڈاکٹر گلکرسٹ کو "جوان مرد" اس کے کم سن ہونے کے حوالے سے
 نہیں بلکہ باہمت ہونے کے حوالے سے کہا ہے۔
 ۲۔ گھر میں دس چھوٹے بڑے آدمیوں کا یہ مطلب قطعاً نہیں لیا جاسکتا کہ میرامن محض کیڑا ال
 تھے اس لیے یقیناً بہت بوڑھے رہے ہوں گے۔ "بڑے" سے مراد میرامن کے والدین بھی ہو
 سکتے ہیں اور اگر خود میرامن اور ان کی بیگم کو بھی "بڑوں" میں شمار کریں تو بھی بچوں کی تعداد چھ
 بنتی ہے۔

عظیم آباد کے قیام کے دوران لٹی ہوئی دلی سے گھر کے بقیہ افراد کا ملنا بعبداً از قیاس
 نہیں۔ یوں چھوٹے چھ افراد میں میرامن کے بہن بھائی بھی شمار ہو گئے۔ ۱۸۰۲ء و "باغ و بہار"
 کے دیباچے کی سب سے تعریف (کمک میرامن کی عمر باون برس کے لگ بھگ رہی ہوگی، اس
 لیے والدین کا حیات ہونا بعبداً از قیاس نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پروفیسر ممتاز حسین صاحب
 نے ان اشعار کو میرامن کی شاعری قیاس کیا جو درست نہیں۔ یہ اشعار مرزا علی لطف
 مولف تذکرہ گلشن مہند کے ہیں۔

اس اقتباس کا سب سے اہم ٹکڑا درج ذیل ہے :
 "ایک ٹکڑا اٹھا کر، پاؤں پھیلا کر سورتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے ،
 پرورش پاکر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں"

چارلس ڈولس اور کیپٹن ٹامس ولیمز کی کتاب "دی یورپین ان انڈیا" (مطبوعہ ۱۸۱۳ء
 لندن) میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کے شب و روز کا بیان اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ
 میرامن فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ہسٹل میں مقیم تھے، جہاں اہل خانہ کو ساتھ رکھنا ممکن
 نہ تھا۔ اسی طرح کلکتہ کے بیان میں چند سے بے روزگاری میں گزری "اور محمد کا ظلم خاں
 کی اتالیقی کے باب میں" نباہ اپنا دیکھا "کی بے یقینی کی صورت احوال یہ ثابت کرتی ہے کہ
 میرامن کے بقیہ گھروالے عظیم آباد یا کسی اور علاقے میں قیام پذیر ہوں گے۔

"باغ و بہار" کے دیباچہ کے سرسری مطالعہ سے ہی میرامن کا شیعہ ہونا ثابت ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو :

"جسم پاک مصطفیٰ اللہ کا اک نور ہے اس لیے پرچھائیں اس قد کی نہ نخی مشہور ہے۔
 حوصلہ میرا کہاں اتنا جو لغت اس کی کہول پر سخن گوئیوں کا یہ بھی قاعدہ دستور ہے اور اس کی
 آل پر صلوٰۃ و سلام جو ہیں بارہ امام احمد حق اور نعمت احمد کو بیان کر انصراں اب ہیں آغاز اس

کو کرتا ہوں جو ہے منظور کام یا اسٹی واسطے اپنے بی کی آل کے کہ یہ مکرر گفت گو بقول طبع خاص عام :
(باغ و بہار کے دیباچے سے اقتباس)

۱۷ اگست ۱۸۰۰ء کے سرکاری اشتہار بابت فرٹ ولیم کالج کے مطابق مندرجہ ذیل اشخاص درج ذیل مختلف

عہدوں پر مقرر کیے گئے :-

ریورنڈ ڈیوڈ براؤن
ریورنڈ کلاؤس بھانن

پرووسٹ
وائس پرووسٹ

یہ قدیم یونانی، لاطینی اور انگریزی کلاسیکی ادب کے پروفیسر تھے۔
پروفیسر عربی زبانی و مترع محمدی

پروفیسر فارسی زبان و ادب

لیفٹیننٹ جان بیلی
لیفٹیننٹ کرنل ولیم کرک پیٹرک
فرانسس گلیڈون
این۔ بی۔ ایڈمانسٹن
ڈاکٹر جان بارنھوک گلکرسٹ
جان ہیری بارلو

پروفیسر ہندوستانی رُردو زبان و ادب
پروفیسر گورنر جنرل کے پاس کیے ہوئے قاعدے قوانین کے
مترجم و مترتب :-

۱۳ ستمبر ۱۸۰۰ء کے اشتہار میں کالج کونسل کے مندرجہ ذیل ممبران کے نام شائع کیے گئے :-

۱۔ ریورنڈ ڈیوڈ براؤن (پرووسٹ)

۲۔ ریورنڈ کلاؤس بھانن (وائس پرووسٹ)

۳۔ پروفیسر جان ہیری بارلو

۴۔ پروفیسر این۔ بی۔ ایڈمانسٹن

۵۔ پروفیسر لیفٹیننٹ ولیم کرک پیٹرک

۶۔ روتھمین (سکریٹری کالج کونسل)

فرٹ ولیم کالج کے دیگر اساتذہ کے نام درج ذیل ہیں :-

پادری ولیم کیری
بنگلہ اور سنسکرت زبان و ادب

جیمز ڈوڈلی ایل۔ ایل۔ ڈی
علم الحساب

ڈوڈلی سی
جدید زبانیں

اسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی
اسٹنٹ

شعبہ انتظامیہ / کالج کونسل کے سیکرٹری
علم قانون اور آئین

رونجھ مین
بارنگٹن

ایشیا بک اینڈ ریسٹ ۸۰۱ لندن (۲۱۸۰۲) صفحہ ۳۱-۳۲ کے مطابق ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء تک فورٹ ولیم کالج کا انتظامی اور تدریسی عہدہ مندرجہ بالا ناموں تک محدود تھا۔ ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کی میٹنگ میں کالج کونسل نے فارسی، عربی، ہندوستانی، اردو اور دیگر شعبوں میں ایک ایک چیف منشی، ایک ایک سیکنڈ منشی اور طلبہ کی تعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق منشی جبرتی کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن جب منشی اور سیکنڈ منشی سمیت ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نہ ہو جائے تو شعبہ فارسی، ہندوستانی، اردو، اردو اور عربی کے لئے کم از کم ایک سب منشی اور ایک ایک سیکنڈ منشی جبرتی کرنے کا فیصلہ ہوا، منشیوں کی تعداد مندرجہ ذیل میں ۲۰، ہندوستانی، اردو میں ۱۲، پنجابی میں ۶ اور عربی میں چار تجویز کی گئی۔ چیف منشی دوسرو روپے ماحوار، سیکنڈ منشی سو روپے ماحوار اور منشی چالیس روپے ماحوار عہدہ کی کیے جانے لگے۔

۴ مئی ۱۸۰۱ء کی منٹ میں ہندوستانی، اردو زبان و ادب کے مندرجہ ذیل اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا چیف منشی کا عہدہ خالی رکھا گیا۔

مہاراجہ علی حسینی نارولی (سیکنڈ منشی)، ماری حرم (سیکنڈ منشی)، مرلنی ناں (منشی)، غلام اکبر (منشی)، نصر اللہ (منشی)، ماس (منشی)، غلام اشرف (منشی)، بلال الدین (منشی)، محمد سادق (منشی)، رحمت اللہ ناں (منشی)، غلام غوث (منشی)، کمدن لال (منشی)، کاسنی راج (منشی)، مہر سید بخش مہدومی (منشی)

اس شعبے کے سربراہ ڈاکٹر جان بارمنوک گلکرسٹ کا تقرر بطور برقیہ ۱۰ اگست ۱۸۰۰ء میں ہوا تھا۔ میرامن کا تقرر بطور منشی جیسا کہ ان کے اپنے بیان (دیباچہ "باغ و بہار") سے معلوم ہے، میرمہار علی حسینی نارولی کے توسط سے ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو بٹنہ ۴۰ روپے ماحوار عمل میں آیا۔ تب اس کی جاکتا ہے کہ ملازمت پر باقاعدہ حاضری کے لیے کچھ وقت ضرور دیا گیا ہوگا۔

انیسوا کا دن یوم تعطیل تھا۔ صرف امیرا کو تصور کر سب اور سیکنڈ منشیوں کو جھٹیوں میں بھی صبح دس بجے سے ایک بجے تک کالج میں حاضر رہا کرتا تھا، تاکہ طلبہ جب جاہل ان سے مدد لے سکیں۔ ان کی چھٹی صرف پر دو سوٹ منظور کر سکتا تھا۔ سیکنڈ منشی، چیف منشی کے ماتحت تھے۔

منشیوں سے متعلق حارس ڈوٹلے اور کمپنٹ ماس ولیمز لکھتے ہیں :

منشی صرف مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ بہ بات درست نہیں۔ ہندو منشی بھی ہوتے ہیں، لیکن بہت کم۔ ان کا کام نہ تو مستقل ہے اور نہ ہی کسی فرتے یا اس کی کسی ذات تک ہی محدود ہے۔ منشی لوگ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ ان کے لڑکے پڑھانے کے قابل بن جائیں لیکن اس میدان میں انھیں بہت سے ایسے دولت مند اشخاص سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو اپنے لڑکوں کو اچھی تعلیمی سہولیت فراہم کر سکتے ہیں۔ اس میں خرچہ یقیناً زیادہ اٹھتا ہے، لیکن انھیں محنت بہت کم کرنی پڑتی ہے۔

منشیوں کا علم عام طور پر محدود ہوتا ہے۔ قرآن کے لیے اہم اقتباسات سنانے اور فارسی کی وہ چند کتابیں جو تجارت میں ملتی ہیں، ان کا معمولی علم ان کے حصے میں آیا ہے۔ زیادہ تر بڑے آدمیوں کی زندگیوں سے متعلق یا حافظ کی غزلوں سے سناسائی کے علاوہ غور سے خط ہونا، علاقائی جھگڑوں سے واقفیت اور علمی مخطوطات کا علم، جن کا متن انگریزی کی نہ بڑھی جاسکے والی کتب کی طرح مشکل ہوتا ہے اور اس علم کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے ہر وقت نیا رہنا۔ بس یہی کچھ مشرق میں عالم کہلائے جانے کے لیے کافی ہے۔ گہری واقفیت کی طرف وہ نہ صرف دھیان ہی نہیں دیتے بلکہ اس سے نفرت کرتے ہیں۔

منشی ہر روز ناساتھ کے بعد سے دوپہر کے کھانے تک پڑھاتا ہے اور کبھی کبھار شام کو بھی۔ اس کی خواہ اس کے آقا کے عہدے یا آقا کی ہمت پر منحصر ہے۔ دس روپے سے لے کر چالیس یا پینتالیس روپے ماہانہ تک پاتا ہے۔ وہ سب نوکروں کا افسر سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے نوکر اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ بہت سے (بڑے عہدوں سے) متعلق طلبہ اُسے جوتے سمیت اپنے کمرے میں آجائے دیتے ہیں، جب کہ کوئی دوسرا نوکر جو تاپہنے ہوئے کمرے میں آجائے تو قابلِ نفرت خیال کیا جاتا ہے اور اُسے سخت سزا دی جاتی ہے۔

سرکاری شعبوں میں جو سیکڑوں منشی کام کرتے ہیں وہ عموماً بہت کم خواہ پاتے ہیں ایسی لحاظ سے وہ اپنی پوشاک کی طرف سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ نہ تو کوئی عزت دار انتخاب ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی علیت کا درجہ بلند ہوتا ہے کسی سمجھا دھنسی کی باتوں سے واقفیت رکھنا دیسی لوگوں میں خاص طور پر بڑے لوگوں میں القابات کے استعمال سے متعلق حوصلہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کسی طویل تحریر کا بلکہ حصہ تو ان کے القابات کی نذر ہو جاتا ہے (اور تیز بڑھنے کے ساتھ سرعت کے ساتھ لکھنا ان کی خوبیاں سمجھی جاتی ہیں۔

زبانوں کا مطالعہ کرنے والے دوستوں کے منشی کے پاس ایک بلکا نوکر رہتا ہے جو گھر آنے جانے کے وقت اس کے مکھن کا سامان بچڑے رہنے کے ساتھ اپنے آقا کے اوپر چھتری تانے دیتا ہے۔ ان میں سے بہت سے لڑکے اپنے آقاؤں کی محنت اور مہربانی سے ٹوٹی پھوٹی فارسی جان جاتے ہیں اور وقت آنے پر دفتروں میں نوکری حاصل کرنے کے لیے کافی پڑھنا لکھنا سیکھ لیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بڑے آرام کی اور اونچی جگہوں پر پہنچ جاتے سُنے گئے ہیں۔
فلسفی آثار (مطبوعہ کتب)

میرامن نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران دو کتابیں (فارسی سے آزاد ترجمہ) تیار کیں۔

۱۔ "باغ و بہار" (قصہ چار درویش" پر ۱۸۰۲ء میں نظر ثانی کے حوالے سے تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا) سنہ تالیف

۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء

طبع اول ہندوستانی پریس، کلکتہ ۱۸۰۳ء

۲۔ "مہنج خوبی" (ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف "اخلاق محسنی" کا چالیس ابواب میں آزاد ترجمہ)

"اخلاق محسنی" کے ترجمے سے متعلق خود میرامن "مہنج خوبی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

”لیکنی لفظ ماری کے برہنہ معنی کہنے میں کچھ لطفت روزہ نہ دیکھا، اس لیے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا۔“
عام طور پر یہ غلط فہمی آتی جاتی ہے کہ گنج خوبی ”فورٹ ولیم کالج سے شائع نہ ہو پائی۔“ جب کہ عتیق صدیقی نے ثابت کیا ہے کہ ”گنج خوبی“ کی اشاعت کی بجائے فورٹ ولیم کالج کی طرف ۱۵ اگست ۱۸۰۳ء تک ہو چکی تھی۔
اب ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میرامن کی اس کتاب کا نہ صرف پہلا ایڈیشن بلکہ دوسرا ایڈیشن بھی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہی جمع ہوا۔ پرنسٹن یونیورسٹی لائبریری ڈی کالج فورٹ ولیم حیدرآباد، امپریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ، سی ڈی اے بھارت کے مطابق میرامن کا ”اخلاق حسنی“ سے ترجمہ ناگری بی میں گنج خوبی کے نام سے جان گلکرسٹ نے پریس کے حوالے کر دیا تھا، جسے ۹۰۰ چوبیس صفحات پر شائع ہونا تھا اور اس پر لاگت کا اندازہ ۴۰۰ روپے بایا گیا تھا۔
”گنج خوبی“ کا تیسرا ایڈیشن ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں مطبع محبوب میمن سے شائع ہوا۔

کالج کونسل کی کارروائیوں اور مہندی مینول (HINDI MANUAL) مطبوعہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ ۱۸۰۲ء کے مطابق ”بائع و بہار کا پہلا نام“ یا ”درولیس“ ہے اور پہلی بار ہرکارہ پریس کلکتہ سے طبع شدہ ”مہندی مینول“ کے ۱۰۲ صفحات اسی نام سے شائع ہونے لگے۔ نظر ثانی ۱۸۰۲ء کے بعد میرامن نے سال تصنیف ۱۸۰۲ء (جسے نظر ثانی کا سال کہنا مناسب ہوگا) کی مناسبت سے ”بائع و بہار“ کا نام دیا۔

یاد رہے کہ میرامن نے ”بائع و بہار“ کا اول مسودہ ”چار درولیس“ کے نام سے وسط ۱۸۰۱ء میں تیار کر لیا تھا۔ ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے زیر جمع کتابوں کی اشاعت کا تحفیہ کالج کونسل کے سامنے پیش کیا تھا جس کے مطابق (۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کی تاریخ میں) ”چار درولیس“ کے فارسی رسم الخط میں ۵۸ صفحات ہرکارہ پریس کلکتہ سے چھپ چکے تھے۔

اس رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ ”چار درولیس“ کے چھوٹے چوتھائی کے ۴۳۲ صفحات پر مشتمل پانچ سولہوں پر تحفیہ اخراجات ۸۸۰۰ روپے تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے توقع ظاہر کی تھی کہ یہ کتاب اگست ۱۸۰۲ء میں شائع ہو جائے گی نیز ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کی اس رپورٹ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہرکارہ پریس کلکتہ کو چھ ماہ پہلے پرنٹ آرڈر دیا گیا تھا۔ یہی وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ میرامن نے ”چار درولیس“ ترجمہ کرنے کا کام اوائل مئی ۱۸۰۱ء میں شروع کر کے جولائی ۱۸۰۱ء میں اولین مسودہ تیار کر لیا تھا۔ انڈیا آفس کے محظوظات کی فہرست بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ ”چار درولیس“ ۱۸۰۱ء میں ترجمہ / تالیف ہو چکی تھی۔
ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی کتابوں سے منقول ”تحفیہ رپورٹ“ کے جواب میں یکم فروری ۱۸۰۲ء میں کالج کونسل کی طرف سے گلکرسٹ کے نام لکھی گئی چٹھی میں مندرجہ ذیل کتب کا حوالہ ملتا ہے۔

۳۶ مطبوعہ صفحات	ہرکارہ پریس، کلکتہ	(زیر طبع)	۱۔ "بتیسی سنگھاس"
۲۴ مطبوعہ صفحات	کلکتہ گزٹ پریس	"	۲۔ "شکنتا نامک"
چھپائی کا آغاز	ٹیلی گراف پریس کلکتہ	"	۳۔ "اخلاق ہندی"
۵۸ مطبوعہ صفحات	ہرکارہ پریس کلکتہ	"	۴۔ "چار درویش"
۳۶ مطبوعہ صفحات	کلکتہ گزٹ پریس	"	۵۔ "مثنوی میر حسن"
چھپائی کا آغاز	سیرویس، کلکتہ	"	۶۔ "مگستان"
چھپائی کا آغاز	ٹیلی گراف پریس، کلکتہ	"	۷۔ "توتا کھانی"
۴۰ مطبوعہ صفحات	مارنگ پوسٹ پریس کلکتہ	"	۸۔ "ہندوستانی پرنسپلز"

حکم دیا گیا تھا کہ تولد بالا زیر طبع کتب کے جتنے اجزاء چھپ چکے ہیں، ان میں سے "مرثیہ مسکین" کے انتخاب کے ساتھ طلبہ کے لیے ضروری حصوں کو یکجا کر کے کل ۵۰۰ صفحات کی صرف ایک کتاب تیار کروالی جائے اور اس کام پر دس ہزار روپے سے زیادہ خرچہ اٹھے۔ واضح رہے کہ اس منظور شدہ رقم میں "مرثیہ مسکین" کی اشاعت کا خرچ بھی شامل تھا۔ چنانچہ یہ انتخابی مجموعہ ہندی مینول (HINDI MANUAL) کے نام سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں میرامن کی "چار درویش" کے ۱۰۲ صفحات شامل تھے۔ "چار درویش" کے ان ۱۰۲ صفحات کی طباعت پر ایک ہزار تین سو ستائیس روپے خرچ ہوئے۔ ۱۹ فروری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کی منظوری کے بعد ۱۲ اپریل ۱۸۰۲ء کو یہ رقم ہرکارہ پریس کو ادا کر دی گئی۔

یکم فروری ۱۸۰۲ء میں جب زیر طبع کتب کی اشاعت روک دی گئی تو میرامن نے "چار درویش" کے مسودے پر نظر ثانی کر کے بقول میرامن "چار درویش" کے قصے کو ہزار جلد کے اردو معلا کی زبان میں "باغ و بہار" بنایا۔ "باغ و بہار" کے اعداد اور خود میرامن کے بیان کے مطابق اس کا سنہ تالیف ۱۲۱ھ مطابق ۱۸۰۲ء ہے۔ اپنی دوسری تالیف "گنج خوبی" کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری مطابق ۱۸۰۲ء سودو میسوی کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔ یاد رہے کہ نظر ثانی کا کام جن ۱۸۰۲ء میں تمام ہوا۔

"باغ و بہار" فارسی قصہ "چار درویش" کا آزاد ترجمہ ہے، لیکن فارسی زبان سے براہ راست نہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حافظ محمد شیرانی کو "چار درویش" کا ایک فارسی نسخہ مصنف حکیم محمد علی الخاطب بہ معصوم علی خاں ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۷۳۳ء کا لانا تو انھوں نے اسے حکیم محمد علی کی تصنیف سمجھ کر "چار درویش" کا مصنف اول قرار دے دیا۔ جب کہ ان کا یہ قیاس درست نہ تھا۔ مسلم یونیورسٹی لاہور میں علی گڑھ کے حبیب گنج انتخاب میں فارسی "چار درویش" (۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء) کا ایک نسخہ (کل صفحات ۶۲۰) موجود ہے جس سے ثابت ہے کہ محمد علی مصنف نہیں محض راوی تھے۔

میرامن کی "چار درویش" یا "باغ و بہار" کی بنیاد میر حسین عطا خاں تحسین کی فوٹو زمر تصحیح ہے۔ اگر میرامن نے اسے میر خسرو

سے منسوب کیا، اس میں ان کی حدیث طبع یا دروغ گوئی کو دخل نہ تھا، بلکہ انھوں نے محض ایک مقبول عام روایت کو نقل کیا۔ اب تک ماری کے جس مدرسے میں ان کا اسلوب امیر خسرو کے اسلوب سے نہیں ملتا، اور نہ ہی تاریخ کی اس بات کا حوالہ دہی ہے کہ اس نام کا کوئی قصہ امیر خسرو نے تصنیف کیا۔ یہ ایک مقبول عام روایت تھی کہ ”قصہ جادوئیں“ امیر خسرو نے اپنے ہر دفتر سند نظام الدین اولیا کی ہمارواری میں کہا۔ یاد رہے کہ بخیار نامے کے سبب مالیف میں ہی ایک ایسی ہی کتاب درج ہے۔ جناس غالب ہے کہ میرا میں نے جبکہ اپنے بزرگوں سے سنا ویسا لکھ دیا۔

۲۰ اگست ۱۹۰۲ء تک جو بھائی کی صورت میں باغ و بہار، نقیر سبھا چھپ چکی تھی۔ کالج ریکارڈ کے مطابق ۲۰ اگست ۱۹۰۰ء کو باغ و بہار ۵۰ جلدیں فی جلد ۲۰ روپے کے حساب سے خرید کر حکومت نے مہی کی حکومت کو بھجوائیں۔ ۱۶ فروری ۱۸۱۳ء کے فیصلے کے مطابق ”باغ و بہار“ کے نئے ایڈیشن کے لیے کالج وٹسل نے مالی امداد دینا منظور کیا۔ اس طرح باغ و بہار کے ۱۹ مارچ ۱۸۱۳ء کی سولہویں ولے ایڈیشن کے لیے ایک ہزار سات سو سولہ روپے دیتے گئے اور کیپٹن روکس نے ”باغ و بہار“ کے اس ایڈیشن کی دسکی کے لیے ممبرانہ رقم کا مطالبہ کیا۔

کالج کونسل نے ۲ نومبر ۱۸۰۱ء کو ایک تجویز منظور کی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ ”وہی زبانوں میں ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی جنت اور ان کے خیال سے متجزو دہی لوگوں کو انعامات دیتے جائیں گے۔ کالج کونسل کے نام میرا میں کی لکھی ہوئی حسب ذیل عسی، ”باغ و بہار“ کی مینر اشاعتوں میں شامل کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

میرا میں دتی والے

بہم خود

عمر

جو

مدرسے کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی۔

صاحبان والا انسان، نخبیوں کے قدروالوں کو خدا سلامت رکھے۔ اس بے وطن نے حکم اشتہار کانس کرپاڈیشن کے فیصلے کو ہزار جہد و کد سے اُردو سے مملاک زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضل الہی سے سب صاحبوں کے سپر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب اُمیدواروں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غنچہ دل مانند گل کے کھیلے بقول حکیم فردوسی کے کہ شامنا میں کہا ہے۔

بے رنج جُرم دریں سال سی

عجم زندہ کردم بہ ایں پارسی

سوار دو کی آراستہ کر زبان کیا میں نے نگاہا ہندوستان

خداوند آپ قدر دان ہیں، حاجت عرض کرنے کی نہیں۔ الہی تارا اجمال کا چمکتا رہے۔“

واضح رہے کہ یہ وہ عرضی ہے جو میرامن نے چار درویش بر نظر ثانی کا کام ختم کرنے کے بعد ۱۴ جون ۱۸۰۲ء کو باغ و بہار کے مسودے کے ہمراہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ذریعے کالج کونسل کو بھجوائی۔ اس عرضی کے جواب میں ۱۴ جون ۱۸۰۲ء کے اجلاس میں کالج کونسل نے میرامن کو ۵۰۰ روپے انعام دینا منظور کرتے ہوئے لکھا:

”فاضل دیبی میرامن، جو کالج سے وابستہ ہیں۔ ان کو چار درویش کے ہندوستانی ترجمے کے لیے، جسے ہندوستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے، بائچ سو روپے بہ طور انعام دیئے جاتے ہیں۔“
اس مختصر برکی داخلی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ میرامن کو یہ انعام ”باغ و بہار“ کے مسودے پر دیا گیا، نہ کہ مطبوعہ کتاب پر۔ اگر کتاب ڈاکٹر گلکرسٹ مطبوعہ کتاب پیش کرتے تو کتاب کا حوالہ موجود ہوتا۔ نیز یہ کہ اس درمیں ”باغ و بہار“ کی تصنیف کی کتاب میرا ایک سال میں حجب کرنا رہتی تھی۔“

میرامن کو باغ و بہار کے مسودے پر انعام ملا تو فوراً ولیم کالج کے انگریزی علمائے نام نے بھی ڈاکٹر گلکرسٹ کے توسط سے اپنے مسودات کالج کونسل کو بھجوائے۔ اس کا ثبوت ڈاکٹر گلکرسٹ کی وہ چٹھی ہے جو ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے نام لکھی گئی۔“

ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے مسودات برتاری چوں منز، مولوی امانت اللہ، مدل مسرینٹ، متری لال کوی اور مرزا کاظم علی بوان کے ناموں کی سفارش کی تھی جب کہ میر مہادر علی حسینی کے لیے لکھا تھا کہ اگر انہیں انعام نہ دیا جائے تو کم از کم ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہوار سے ۱۰۰ روپے ماہوار کر دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر گلکرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء میں میر مہادر علی حسینی نارولی کو چیف منشی بنانے کی سفارش کی تھی۔“

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی اس چٹھی کے جواب میں کالج کونسل نے لکھا کہ:

”کونسل کا یہ ارادہ بھی نہیں تھا کہ جو دیبی علماء کالج سے مقررہ تنخواہ پاتے ہیں انہیں بھی انعام دیا جائے یا غیر مکمل یا مذکورہ کتب کے لیے پہلے سے ہی انعام کا اعلان کر دیا جائے۔ کونسل محنتی اور قابل اشخاص کو جنہیں کالج سے اچھی تنخواہ نمل رہی ہو، کبھی کبھی خاص مواقع پر انعام دینے کے لیے تیار رہے۔“

اس چٹھی کی آخری سطر میں واضح طور پر میرامن کی حوصلہ افزائی کا حوالہ موجود ہے۔

۱۶ ستمبر ۱۸۰۵ء میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے مستعفی ہونے کے بعد ہندوستانی شعبے کے نئے پروفیسر کیپٹن جیمز ٹوٹ تھے۔ ۳ ستمبر ۱۸۰۵ء کی کالج کونسل کی ٹیلنگ میں پروفیسر کیپٹن جیمز ٹوٹ نے ہندوستانی شعبے کے منشیوں کی جو تفصیل لکھ کر پیش کی تھی اس میں میرامن کو ڈورن (DORIAN) ظاہر کیا گیا تھا اور ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہانہ بتائی گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۳ ستمبر ۱۸۰۵ء تک میرامن منشی کے عہدے سے

ترقی پاکر سیکھ منشی مقرر ہو گئے تھے۔

رسالہ ہماری زبان "علی گڑھ میں فورٹ ولیم کالج کونسل کے ریکارڈ کا حوالہ دے کر لکھا گیا ہے کہ:
"۴ جون ۱۸۰۶ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ کے پروفیسر کی شکایت پر کہ
میرامن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے، کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے الزامات
کو تسلیم کرنے ہوئے پیرانہ سالی اور جہانی معذوری کا: انھوں نے معذرت پیش کیا۔ ان کا بیان سننے کے بعد کالج
کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میرامن کالج کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں، طے
ہو گیا کہ اس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ اور چار مہینوں کی تنخواہ دے کر کالج کی خدمات سے ان کو سبکدوش
کیا جائے۔

فورٹ ولیم کالج کی کارروائیاں جلد دوم ۱۰۶، اس تاریخ کے بعد ان کا نام کالج کونسل کی کارروائیوں
میں نہیں ملتا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کالج سے نکلنے کے بعد کہاں گئے اور کب تک زندہ رہے۔"
۴ جون ۱۸۰۶ء کی مشک میں کالج کونسل نے میرامن کو ان کی خواہش کے مطابق چار ماہ کی تنخواہ مبلغ ۳۲۰ روپے مع
جون ۱۸۰۶ء کی پوری تنخواہ ۶۰ روپے ادا کر کے کالج کی ملازمت سے الگ کر دیا۔

"تذکرہ ہمیشہ بہار۔ از نضر اللہ خاں خوجوی اور "مواقیت القواۃ" از مولوی مجتبیٰ علی خاں جو ناموسی کے دو
تذکرے ۱۲۱ھ مطابق ۱۸۰۲ء یا ۱۸۰۳ء میں میرامن کی وفات بتاتے ہیں جو درست نہیں۔ یہ بات بھی تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ
میرامن محسن ۵۶ برس کی عمر میں درس دینے کے قابل نہ رہے تھے۔ فورٹ ولیم کالج سے میرامن اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ
کے متعلق ہونے کا انداز ملتا ہے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی کالج کونسل سے نہ بنی اور میرامن کو سب سے صدر شعبہ پروفیسر کیپٹن
جیمز موٹس سے بناہ شکل نظر آیا۔

میرامن جو "باغ و بہار" کے ترجمے پر نقد انعام پانے والے اولین منشی تھے، نیز ان کی کتاب "باغ و بہار" فورٹ
ولیم کالج کی بہترین کتاب کا اعزاز حاصل کر چکی تھی۔ اگر اس پر بھی میرامن بطور سیکرٹ منشی ۸۰ روپے ماہانہ پر کام کرتے
رہے تو اس میں ان کی اعلیٰ ظرفی اور ایک حد تک مجبوری اور مفلسی کو دخل تھا۔ اب نئے صدر شعبہ نے جب ان کے
ساتھ عام منشیوں والا برتاؤ روا رکھا تو ان کا بد دل ہونا یقینی تھا۔ پھر یہ وہ دور ہے جب کھنڈر اور حیدر آباد کو
کے رؤسائے نجی رصد گاہیں قائم کرنا شروع کر دی تھیں اور ان کے دارالترجمہ میں اعلیٰ درجے کے مترجمین کی کمیت
ممکن تھی۔ پھر اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ۲۱ مئی ۱۸۰۶ء میں پہلی بری (برطانیہ) کے مقام پر فورٹ ولیم کالج
طرز کے ایک ادارے کے قیام کا فیصلہ ہو چکا تھا اور فورٹ ولیم کالج کا مستقبل تاریک تھا۔

ایسے میں اگر میرامن نے جان بوجھ کر پیرانہ سالی اور جہانی معذوری کا عند پیش کیا تو بعد از قیاس نہیں۔ خود ڈاکٹر
جان گلکرسٹ جیسے نمایاں پروفیسر کو بھی فورٹ ولیم کالج کی ملازمت چھوڑنے کے لیے جہانی معذوری کا بہانہ بنانا پڑا۔

ملازمت سے مستعفی ہونے سے متعلق میرامن کا فیصلہ بردقت تھا، اس لیے بھی کہ صرف چھ ماہ بعد جزیری، ۱۹۰۷ء میں فورٹ ولیم کالج کے اعزاجات گھٹانے کا حکومتی فیصلہ سامنے آیا تو کالج کے عملے میں تحصیف کر دی گئی اور متعدد منشی جبری طور پر ریٹائر کر دیے گئے۔

۶ جون ۱۸۰۶ء کے بعد فورٹ ولیم کالج کا ریکارڈ میرامن سے متعلق ہماری راستنائی نہیں کرتا۔ اب لازم ہے کہ میرامن اپنی خواہش کے مطابق ملازمت سے علاحدگی کے بعد ریٹائرمنٹ کی زندگی بھی گزار سکتے ہیں اور کسی نئے دارالترجمہ کا رخ بھی کر سکتے ہیں۔ ”باغ و بہار“ اور گنج خوبی کے ”دیباچوں نیز باغ و بہار“ کے مسودے پر انعام کے لیے لکھی گئی درخواست میں وہ کثیر العیال اور ضرورت مند ہی دکھائی دیتے ہیں، اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے دوسری راہ اختیار کی ہوگی۔

میرامن سے متعلق ایک حوالہ کارسین دتاسی کے ہاں ملتا ہے^{۱۲۱} انہوں نے مشہور ریختی گو شاعر میر یار علی جان صاحب کو ریختی کے حوالے سے شاعر و تصور کر کے میرامن کی بیٹی لکھا ہے جس کا ہمارے محققین نے خوب مضحکہ اڑایا لیکن اتنا نہ کیا کہ میرامن سے متعلق اس حوالے کو جان صاحب کے حالات زندگی سے جوڑ کر ہی دیکھ لیتے۔ اس لیے کہ جان صاحب سے متعلق تو تذکرے خاموش نہیں۔

۱۔ عبدالغفور نسار مولف سخی شعراء، ”لکھتے ہیں“ :
”جان صاحب : میر یار علی خلیف میرامن لکھنوی شاگرد عاشور علی خاں بہادر، ریختی اپنے طرز پر بہت خوب
کہتے تھے“^{۱۲۲}

۲۔ سید محمد مبسب نقوی الا آبادی مرتب ”تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب“ کے مطابق :
”ان کے والد میرامن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے، لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی“^{۱۲۳}

۳۔ محمد عبداللہ خاں خوشیگی مولف ”فرنگ عامرہ“ نے اردو زبان کے ارباب قلم کی فہرست میں میر یار علی جان صاحب کے والد کا نام میرامن بتایا ہے۔^{۱۲۴}

۴۔ نادم سینا پوری نے میرامن کو ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء یا ۱۸۱۸ء تک حیات بتایا ہے۔^{۱۲۵}
مقام حیرت ہے کہ ہمارے محققین نے میرامن کو ۱۸۰۶ء کے بعد زندہ تصور نہیں کیا۔ جب کہ ان کے حیات ہونے کے شواہد موجود ہیں۔ مولوی سید محمد مبسب نقوی الا آبادی مرتب ”تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب“ لکھتے ہیں :

جان صاحب کی ولادت فرخ آباد میں غالباً ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء - ۱۹) میں ہوئی تھی۔ نام تو ان کا میر یار علی تھا، مگر والدین پیارے جان صاحب کہتے تھے۔ اسی لیے ریختی کی مناسبت سے اسی عرف کو تخلص قرار دیا۔ ان کے والد میرامن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ (صفحہ ۳۹ یا ۴۰ سے اقتباس)

اس تحریر سے میرامن کا ۳۳۴ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں فرخ آباد سے متعلق ہونا ثابت ہے جب کہ نواب فخر الدین خاں الخاطب شمس الامراء حیدر آباد دکن کی مرتب کردہ کتاب "تسنت شمس" کے دیباچے میں درج ہے کہ ربوہی رنٹ چارلس کی طبیعات سے متعلق کتاب (مطبوعہ ۱۸۱۸ء لندن) حیدر آباد دکن پہنچی تو اسے اردو میں ترجمہ کروانے کا کام منجھن کو سونپا گیا۔ سنہ ۱۸۱۵ء (انظار) صفحات ۷۴ کا ایک قلمی نسخہ منومر ۱۸۱۸ء انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ وہی سال تھا ہے جب جان صاحب کی فرخ آباد (سویہ جات مندرہ کا ایک ضلع فتح گڑھ کا صدر مقام) میں ولادت ہوئی اور اس کے بعد بچپن میں سی جان صاحب کو کنسنر بھیج دیا گیا۔ قیاس غالب ہے کہ جان صاحب میرامن کے بیٹے تھے۔ میرامن کے اصل نام میرامن علی کی مناسبت سے یہاں نام میرا یعنی احمد جان صاحب ہی اس قیاس کو تقویت پہنچاتا ہے پھر جان صاحب کی ولادت ۱۸۱۹ء کی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ میرامن فورٹ ولبر کالج کلکتہ سے مستعفی ہونے کے بعد کچھ سرحد فرخ آباد میں مقبرہ رہے اور اس کے بعد بطور منتر جہ دارالترتیب شمس الامراء حیدر آباد دکن سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے اہل و عیال کو کنسنر میں چھوڑا اور خود دارالترتیب کا کام کرنے لگے۔ بہت ممکن ہے میرامن کے کنسنر سے اس تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے عبدالغفور نساخ نے سچا سچ سوانح (منومر ۶۳/۶۴) میں میرامن کو میرامن کنسنری لکھا ہو۔

حیدر آباد دکن میں شمس الامراء کا سسٹی چھاپہ خانہ ۱۸۲۰ء میں قائم ہو چکا تھا۔ صاف ظاہر کہ اسی سال اس چھاپہ خانے سے "مدرسہ فریہ" کا اولین نسخہ سائے ہونا شروع ہو گیا ہوگا اور انصاف ساز کمیٹی نے کم از کم برس بہر پہلے ابتدائی انصاف بنیاد کر لیا ہوگا۔ میرامن کا فورٹ ولبر کالج سے ۱۸۲۰ء میں اس زمانے میں ایک ٹری کو البیٹسن بھی رہا۔ کہ میرامن کی باغ و بہار "ہائی بروئینسی" اور "ڈگری آف آئرن" کے امتحانات کی تصانیف کتاب تھی۔ "باغ و بہار" کے راجہ غیر ملکی زبانوں خصوصاً عربی، لاطینی، ہنگاری اور انگریزی میں ہاتھ جوڑ چکے تھے۔ ہاتھ چاہتے تھے۔ ۱۸۳۶ء میں پرتگالی مستشرق ڈی، ایس دی روزاریو نے "باغ و بہار" کو لاطینی رسم الخط میں کلکتہ سے سائے کروایا تھا۔ بعد میں اسی ایڈیٹن کو معمولی سی تبدیلی کے ساتھ مونیر ولبر نے چارلس ٹرولسن کی مرمانش پر دوبارہ طبع کر دیا۔ یہ لڑکی فابلس نے لاطینی رسم خط میں لندن سے ۱۸۴۶ء میں "باغ و بہار" کا ایک مستند ایڈیشن شائع کیا۔ ولبر کی جہد سنانی ڈاکٹر "میں نقطوں کے خیال کے سلسلے میں جس ۳۲ کتب سے استفادہ کیا گیا۔ ان میں "باغ و بہار" شامل تھی۔

پروفیسر ٹیٹن فائرس ایل ایل ڈی کلرک کالج لندن، میرامن ایل ایٹیک سوسائٹی برطانیہ و آئرلینڈ کے مطابق ۱۸۰۳ء میں حنفیہ انگریز ملازمین کی کتاب تجویز کیا تھا ۳۱ مئی ۱۸۴۲ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے جنرل آرڈر مجریہ ۹ جنوری ۱۸۴۷ء کی نوٹ سے جو تیس ملازمین کے علاوہ تمام ٹری اور میڈیکل جو نیئرز آفیسرز کے لیے ہندوستانی (اردو) میں امتحان پاس کرنا لازمی قرار دیتے ہوئے امیدواروں کے انصاف میں "باغ و بہار" اور "تالیف پیمپی" کا ترجمہ اور کتاب خوانی ضروری قرار دیا۔

قرین قیاس ہے کہ شمس الامراء کی طرف سے میرامن کو ۱۸۰۶ء میں ہی ملازمت کی یقین دہانی کرائی گئی ہوگی جبکہ

نتیجہ میرامن کے استغنا کی صورت میں ظاہر ہوا، اور میرامن کلکتہ سے فرخ آباد پہنچے اور اس کے بعد اپنے اہل و عیال کو کلکتہ میں چھوڑ کر ۱۸۲۰ء سے قبل حیدر آباد دکن چلے آئے اور مدرسہ فزیئٹکس الامراتہ کی نصاب ساز کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ یاد ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا تالیف و ترجمہ کردہ ادب انگریزی سرکار کی وضع کردہ مخصوص تعلیمی پالیسی کے تحت سطحیت کا رجحان پیدا کر رہا تھا۔ نواب فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی نے یہ سب دیکھتے ہوئے اپنے علاقے میں داتاؤں کی قصوں کے مقابلے میں سائنٹیفک سوچ کو عام کرنے کی خاطر ۱۸۳۳ء میں ”مدرسہ فزیئٹک“ اور سائنسی علوم کی ترویج کے لیے رصد گاہ ”جہاں نما“ حیدر آباد دکن میں قائم کی۔ مدرسہ فزیئٹک کے نصاب میں یورپی دانش گاہوں کی نصابی کتب کو شامل کیا اور جدید طالب علموں میں سائنٹیفک سوچ کو عام کرنے کی خاطر مغربی علوم و فنون کی نصابی کتب کو مقامی اور فرانسیسی مترجمین سے ترجمہ کروا کر ذاتی سنگی چھاپہ خانے (قیام : ۱۸۲۰ء) سے شائع کیا۔

دارالترجمہ شمس الامراء حیدر آباد دکن سے میرامن کے منسلک رہنے کی یادگار ”ستہ شمسیہ“ نامی کتاب ہے۔ اس کتاب میں شمس الامراء ثانی نواب محمد فخر الدین خاں نے ریوری رنٹ چارلس کے سائنسی رسائل (مطبوعہ ۱۸۱۸ء لندن) کا انگریزی ترجمہ کروا کر ۸/۵ کی تقطیع پر ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں اپنے سنگی چھاپہ خانے سے طبع کروایا۔ دوسری اور تیسری بار یہ کتاب اسی چھاپہ خانے سے ۱۲۶۶ھ مطابق ۵۰ - ۱۸۴۹ء میں چھپی۔ اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ۱۲۷۲ھ مطابق ۵۶ - ۱۸۵۵ء میں مدراس کے مطبع اسلامیہ میں شائع ہوا۔ پانچواں ایڈیشن ۱۲۹۵ھ مطابق ۷۸ء اولیٰ سے شائع ہوا۔ چھٹا اور ساتواں ایڈیشن ۱۳۱۶ھ مطابق ۹۹ - ۱۸۹۸ء میں منشی میر احمد کے مطبع سے شائع ہوئے۔ خط نسخ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ سائز ۵x۸ ۱/۲ صفحات ۲۸۴، نمبر شمار ۵۳۲ (۱۳۲ حدید) کے تحت اسٹیٹ سدرٹ لائبریری حیدر آباد آئندہ رپورٹس کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

”ستہ شمسیہ“ نامی کتاب میں ریوری رنٹ چارلس کے سات رسائل کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

- ۱۔ رسالہ علم بر ثقیل (ترجمہ) مطبوعہ سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدر آباد دکن، ۱۲۵۶ھ مطابق ۶۱۸۴۰ء۔
- ۲۔ رسالہ علم ہیئت (ترجمہ) مطبوعہ سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدر آباد دکن، ۱۲۵۶ھ مطابق ۶۱۸۴۰ء۔
- ۳۔ رسالہ علم آب (ترجمہ) مطبوعہ سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدر آباد دکن (۱۲۵۴ھ مطابق ۶۱۸۳۸ء)۔
- ۴۔ رسالہ علم ہوا (ترجمہ) مطبوعہ سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدر آباد دکن، ۱۲۵۵ھ مطابق ۶۱۸۳۹ء۔
- ۵۔ رسالہ علم مناظر (ترجمہ) مطبوعہ سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدر آباد دکن، ۱۲۵۵ھ مطابق ۶۱۸۳۹ء۔
- ۶۔ رسالہ علم بر تنک (ترجمہ) مطبوعہ سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدر آباد دکن، ۱۲۵۵ھ مطابق ۶۱۸۳۹ء۔
- ۷۔ ریوری رنٹ چارلس کا سوالات و جوابات سے متعلق مکمل رسالے کا ترجمہ اسی کے علاوہ ہے، جس کے چھ حصے الگ الگ کر کے علم بر ثقیل، علم ہیئت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر اور علم بر تنک نامی رسائل کے آخر میں شامل کر دیا گیا۔
- یوں ان چھ رسائل میں ۸۱ صفحات کا انگریزی سے ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

میرامن غلام محمد الدین متین حیدر آبادی، مسٹر جونس اور موسیو تندرٹس کی مشترکہ کاوش ”ستہ شمسیہ از ریوری رنٹ چارلس

کے سامنے رسائل کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ رسالہ علم جبر ثقیل :

”یہ تہہ شمس“ سلسلے کی پہلی جلد ہے جو ۸/۵ کی تقطیع پر ۳۰۷ صفحات کی کتاب ہے۔

صفحہ ایک اور دو سے احناس ملاحظہ ہو۔

”اس میں ہوا اور اس کے انقعات بے نہایت اور شش انجماد اور شش ثقل اور مرکز ثقل اور کیات حرکت اور جبر ثقیل کی تمام قوتوں اور شمول کا بیان ہے۔“

طلبہ کے واسطے سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپہ خانے میں شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد

کے درمیان ۱۲۵۵ء میں مطبوع ہوئی۔“

اسد میں ۳ صفحات کو فہرست، کتاب کے آخر میں تین صفحات کا غلط نامہ اور ۴ صفحات میں علم جبر ثقیل کے آلوں کی ۳ اشکال کو نسخوں میں چھاپ کر شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں یوسنیدہ درج ہے، کے عنوان کے تحت ذیل عبارت شامل کتاب ہے۔

”حکیم رولبری سنٹ چالس صاحب نے ۱۸۱۸ء میں سات کتابیں علوم ریاضی کی بنیاد کے جو

چھوٹی تھیں ان میں سے چھ کتابیں ترجمہ کر کے سہ شمس نام رکھا گیا اور باقی ساتویں کتاب تعریفیات اور

سوالات علوم مذکور میں اس واسطے لکھی تھیں کہ علوم مذکور کی تحصیل کے بعد شاگردوں سے ہر علم کے امتحان

کے لیے سوال کے جواب اسکا دن سے سننے کو یاد ہے یا نہیں اور ہم نے اس حکیم کے آئین کو بہتر جان کے

ساتویں کتاب کا بھی ترجمہ کیا مگر اس میں سے ہر علم کی تعریفیات اور کیفیتیات اور سوالات علیحدہ کر کے

ہر علم کے رسالے میں اسطورہ شریک کیے کہ آغاز رسالے میں دیباچہ کے بعد تعریفیات اور کیفیتیات اور آخر

رسالے میں سوالات اس کے داخل کرنے میں آئے تا اُستاد ہر علم کی تعلیم کے بعد اسی کتاب سے شاگردوں

سے سوالات کر کے جوابات پوچھے تا دوسری کتاب سے سوالات کی احتیاج نہ ہو۔ تمت بالخیر“

ترجمہ، مثالیں ملاحظہ ہوں :

”عمر من خدمت رکھتا ہوں“

”آپ نے یہ بات پرسوں کے دن فرمائی تھی۔“

”موجودہ وقت تمہاری تعلیم کے ہوتا ہوں۔“

”ساتھ ایسے ہی اعلیٰ مراتب کے متعصفت ہے۔“

کتاب میں شامل اکثر الفاظ اور اِطلا کا استعمال اب متروک ہے، مثلاً :

وہ کی بجائے دے
 کو کی بجائے تبتیں
 مٹی کی بجائے مٹی
 کنوئیں کی بجائے کوے
 بحث کی بجائے تکرار
 کسی کو کی بجائے کسو کو
 بند ہونا کی بجائے موندھنا
 ان سے کی بجائے ون سے
 اسی طرح عبارت میں شامل اکثر حروف اور الفاظ کا رسم الخط بھی مختلف ہے مثلاً :

ٹ _____ ت
 ژ _____ ز
 ٹوٹ _____ قوٹ
 سننے _____ سنے
 قوٹ _____ قوٹ

چند انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

PUDDING	پڈین
CORK	چوب شولہ
SPUNGE	اسفنج
LINE OF DIRECTION	خط راہ
AIR PUMP	ایئر پمپ

(۲) رسالہ علم ہستییت

یہ سترہ شمیہ سلسلے کی دوسری جلد ہے جو ۵/۸ کی تقطیع پر ۳۴۴ صفحات کی کتاب ہے ۔
 صفحہ ۲ سے اقتباس ملاحظہ ہو :

”دوسری جلد سترہ شمیہ“ کی جو علم ہستییت میں ہے طلبہ کی تعلیم کے واسطے سرکار شمس الامراء
 بہادر امیر کبیر کے منگی چھاپے خانہ میں شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے درمیان ۱۲۵۶ھ میں مطبوع ہوئی ۔“

ہوئے مال کے نکالنے کے واسطے دوبار دریا کے اندر جا کر نیکلے اور دفعہ سوم جو ڈولے ایک ساعت تک
رہے جب وقت بہت گزرا اور اوپر کے مدوگاڑوں نے کچھ اشارہ مراجعت کا نہیں پایا، آلودہ طرانی
کو اوپر کھینچی لے دونوں کی رُوح پر واز ہو گئی تھی :
کتاب میں برتے گئے متروک لفاظ درج ذیل ہیں :

ماٹی ————— مٹی
قیمت دار ————— قیمتی
وسکا ————— اس کا

دوڑنے لاگا ————— دوڑنے لگا

جاگہ ————— جگہ

عبارت میں بعض جگہوں پر 'نے' کا استعمال ہی نہیں کیا گیا مثلاً
"اوپر آپ فرمائے تھے"

اسی طرح لفظ کر کا استعمال ملاحظہ ہو :

'امتحان کر دکھائیے' (امتحان کر کے دکھائیے)

کتاب میں برتی گئی چند انگریزی اصطلاحوں کا اردو ترجمہ دیکھتے چلیے :

زبردستی کا پمپ - FORCE PUMP

ہیڈرامیٹر - HYDRAMETRE

علم آب - HYDROSTATICS

علم آب کی ترازو - HYDROSTATIC BALANCE

چوسنے کا پمپ - SUCKING PUMP

۴ - رسالہ علم ہوا :

"یہ ستہ شمسیہ سلسلے کی چوتھی جلد ہے جو ۵/۵ کی تقطیع پر ۳۳۵ صفحات کی کتاب ہے۔ دیباچہ کے علاوہ آخر میں
۴ صفحات کا غلط نامہ اور ۵ صفحات پر علم ہوا سے متعلق ۳۴ آلوں کے نقشے شامل کتاب کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی اُستاد
اور شاگرد کی گفتگو کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

۲۳ دیں گفتگو سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :-

"نہیۃ خرد حضرت پیرامیٹر کی معنی بیان کیجئے ؟"

اُستاد: ”یہ لفظ یونانی ہے اور اس کی معنی آتش پہا ہے اور یہ ایک آلہ ہے منجمد چیزوں علی الخصوص معدنیات کے بڑھاؤ کی پیمائش کے واسطے جو بہ سبب گرمی کے ان کو حاصل ہوتا ہے۔ اور چیزیں کتنی بھی تھوڑی بھیلیں اس آلے کی استقامت سے تیسویں شکل کی مانند فقط آنکھ سے نظر آویں گی۔“
 کتاب میں بعض مقامات پر حاصل مصدر کی بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً:
 ”نہج ہے کہ گونجا اکثر سننے میں کہیں نہیں آتا۔“
 بعض الفاظ کی جمع رکھنی قاعدہ کے مطابق بنائی گئی ہے مثلاً سیخ سے سینخاں اور شاخ سے شاخاں۔

(۵) رسالہ علم مناظر:

”یہ شمشب کے سلسلے کی پانچویں جلد ہے جو ۸/۵ کی تقطیع پر ۷۷۷ صفحات کی کتاب ہے۔ شروع میں دیباچہ اور تعریفات علم مناظر کے علاوہ آخر میں ۸ صفحات کا غلط نامہ اور متن کے متعلق ۲۴ اشکال شامل کتاب میں یوری نٹ چارلس کی اصل کتاب میں علم مناظر سے متعلق مختصر رسالہ بھی شامل تھا جسے اس سے الگ کر کے ”ستہ شمس“ سلسلے کی چھٹی جلد میں داخل کر دیا گیا۔

یہ کتاب بھی سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ پندرہ دی گفتگو سے اقتباس ملاحظہ ہو:-
 ”تلمیذ فرد: حضرت ہنر مندہ ایسا ہی عمل کرے گا لیکن کچھ آپ نے آبرو اور مرثاں کا ذکر نہ کیا،

کیس کا پڑاتی ہیں
 اُستاد: آبرو بہت آنکھ کو پناہ دیتی ہے جس وقت کہ بہت روشنی آنکھ پر آتی ہے اور کوئی جسم اگر پیشانی پر سے پھسل کر آنکھ پر گرے آنکھ کو مضرت نہیں پہنچتے دیتی ہے اور مرثاں کام کرتی ہیں آنکھ کے پردے کی مانند کس واسطے کہ جب کوئی شخص سوتا ہے تو وہ سنبھالتے ہیں۔ حادثہ روشنی کو یعنی زیادہ روشنی آنکھ میں جانے نہیں دیتی ہیں اور یہ مرثاں ہزاروں صدقات سے آنکھوں کو بچاتے ہیں اور جو گرد کہ ہوا میں بھری ہوئی ہے ان کو آنکھوں میں آنے نہیں دیتے ہیں۔“
 چند انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ دیکھتے چلیے۔

LOOKING GLASS	منہ دیکھنے کا آئینہ
MICROSCOPE	کلاں بین
REFLECTING TELESCOPE	منکس دور بین
CONVERGENT RAYS	موازی شعاعیں
	القصاصی شعاعیں

DIVERGENT RAYS	انبساطی شعاعیں
REFLECTED LANTERN	منعکس روشنی
MAGIC LANTERN	قندیل سحری
LANTERN	لنٹریا لانٹرن

(۶) علم برزخ

”سنتہ شمسیہ“ سلسلے کی چھٹی جلد ہے جو ۸ رۛ کی تقطیع پر ۲۰۹ صفحات کی کتاب ہے جس میں علم برزخ (یعنی جھکے کا علم) اور مقناطیس سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ دیباچے کے علاوہ آخر میں ۳ صفحات پر ۳۱ اشکال اور کتاب کے خاتمے پر متن سے متعلق آلوں کے چھ نکتے شامل کتاب کیے گئے ہیں۔ کتاب میں علم برزخ سے متعلق ۱۶ مکالمے، گیل دی نیزم اور علم مقناطیس کے متعلق چار چار مکالمے شامل کیے گئے ہیں۔
نمونہ عبارت ملاحظہ ہو :-

”حضرت آپ نے ابھی ذکر کیا تھا کہ سوئی کو مقناطیس دسنے کے بعد وہ جھکتی ہے۔ کیا جھکاؤ تعلیمہ کلاں اُس کا بچاں رہتا ہے یا کچھ کچھ فرق کرتا ہے؟“

یہ درسیہ الفہم ہے کہ اسی حالت میں ہوگی اسی جائے میں اور راپٹ صاحب نے کہ خطبہ بنانے اُستاد : والا تھا۔ تارے کے ملک میں ۶، ۵ اعر میں دریافت کیا کہ جھکاؤ سوئی کا قریب ۷۲ درجے کے تھا اور اس کی تحقیق بادشاہی مدرسے میں بھی ہوئی اور یہ بات راست نکلی۔“

کتاب کی عبارت میں ڈاکٹر کو ’ڈاکٹر‘ اور نوار کو ’نوار‘ لکھا گیا ہے۔ باقی وہ تمام خصوصیات اس کتاب میں بھی موجود ہیں جن کا ذکر دیگر رسائل کے ضمن میں ہوا ہے۔

ایوری رنٹ چارلس کے سات رسائل کے علاوہ شمسی الامراء کے سنگی چھاپہ خانہ واقع حیدر آباد (دکن) سے طبع ہونے والی دیگر کتب میں دو کتابیں ایسی ہیں جن پر پتہ نہیں۔

۱۔ اصول علم حساب ہندی زبان میں، مطبوعہ : ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء۔

۲۔ رسالہ کسورات اعشاریہ، مطبوعہ : ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء۔

اول الذکر کتاب کے دیباچے میں اسے اہل فرنگ کے دستور پر ”لکھی گئی کتاب بتایا گیا ہے، لیکن اس کتاب کا ترجمہ ہونا یوں ثابت ہے کہ کتاب میں سکوں اور اوزان کی شرح برطانوی سکوں اور اوزان کے مطابق دی گئی ہے۔ دورہ حیدر آبادی سکوں اور حیدر آبادی اوزان استعمال کیے جاتے جب کہ رسالہ کسورات اعشاریہ کو ترجمہ بتایا گیا ہے نیز اس میں ”سنتہ شمسیہ“ والا سوال جوابات کا انداز اختیار کیا گیا۔

شمس الامام کی مطبوعہ کتب سے یہ ثابت ہے کہ ۱۸۴۷ء تک شمس الامام کی رسد گاہ جہاں نما کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ میں سید شاہ علیؒ، میر سجاد علیؒ، بنڈت رتن لعل مست، میرامن دہوی، غلام محی الدین، مبین حیدر آبادی، ہوسوندرس، حافظ مولوی میر شمس الدین، محمد حبیب، مرشد جونس اور کیپٹن جوزہ جیسے تادم، سائنسدان، انجینیر اور ماہر لسانیات کمال منشی (مترجم) ملازم تھے۔ جہاں مرقس ۴۰-۱۸۴۶ء کے کتب خانہ پر ہم مقرر ہوئے۔ جب کہ ابوعلی، رائے منوالال، شیر علی بن محمد قاسم، مرزا جان قندھاری، مرطفعلی علی، مولوی احمد اور سید عبدالرحمن بہت بعد میں مترجم مقرر ہوئے۔ جب کہ ابوعلی، رائے منوالال، شیر علی بن محمد قاسم، مرزا جان قندھاری، میر طبع علی، مولوی اندا اور سید عبدالرحمن بہت بعد میں مترجم مقرر ہوئے۔

محوالہ بالا دونوں تراجم کے مترجمین کی غلامی کے سلسلے میں ذرا سی کوشش بار آور ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سید شاہ علی (موسط ادھونی) اور بیٹن رتن لعل مست (ولد سبنا لعل) بے سالہ علم و ادب کے تھے۔ (رسد تالیف ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۶ء طبعیت ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء) ترجمہ کیا ہے۔ ان دونوں مترجمین کی زبان بھی سلیس ہے لیکن ”سنہ سمس“ کی زبان اور ان کی زبان میں واضح فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے رسالہ علم و اعمال کرے گا، اسے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

”جب زمین، چاند اور سورج کے درمیان میں حامل ہوتی ہے تو زمین کا سایہ چاند پر گر کر اس کا نافع نور ہوتا ہے، اسی کو جوت فہ کہتے ہیں اور اس سبب سے جوت فہ حالت بد میں ہونا ضروری ہے۔“

(ترجمہ ارشد شاہ علی درین لعل مست)

اب صوف سید شاہ علی کی زبان ملاحظہ ہو:-

”اس ذرہ بے مقدار شاہ علی متوطن ادھونی نے مشہور شرح چینی کو کہ جس کی عبارت کی وقت اور معانی کی نزاکت باریک بنیان نازک خیال پر ظاہر و باہر ہے۔ زبان ہندی میں بہ عبارت سلیس و صاف ترجمہ کر کے اس مہر منیر شمس الامام کی رائے روشن سے مسائل میں تقدیم و تاخیر کی اور مستند و معنی کی قوی سے تبدیل۔“

(ترجمہ شرح چینی کے دیباچے سے اقتباس)

اس سے قبل سید شاہ علی نے مادری زبان کے ادھونی انگ میں تعلیم و تدریس کے ذرا بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں

وہ لکھتا ہے :

”دانا یان روزگار اور عاقبتان تجربہ کار پر پوسیدہ نہیں کہ جس قوم میں زبان مروج سے جو فن تحریر و تفریم پاتا ہے۔ صاحب زبان نہایت آسانی کے ساتھ اس فن کا فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ نسبت دوسری زبان کے مدت قلیل میں حاصل اور کامل ہوتا ہے۔ کیونکہ جمہورت وہاں معرفت الفظ میں جاتی ہے۔ یہاں وہ تحصیل معانی میں کام آتی ہے۔“

(ترجمہ شرح چینی کے دیباچے سے اقتباس)

یہاں چینی کا ترجمہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں کیا گیا۔ اس کا قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو، خیریت آباد، حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے۔

اب صرف پنڈت رتن لعل مست کی زبان ملاحظہ ہو :

”یہ رسالہ ہے مہرم منتخب البصر بیچ علم دورنگ کے کہ اسے علم انظار بھی کہتے ہیں اور اس علم کی معلومات سے نقشے اجسام و سطوح کے کھینچے جاتے ہیں... اس علم میں اگرچہ ایک کتاب مبسوط فارسی زبان میں مہرم بہ رفیع البصر لکھی ہوئی صاحبزادہ بلند اقبال عالی قدر محمد رفیع الدین خاں المحاطب یہ عمدۃ الدولہ بہادر... کی ہے۔“

پنڈت رتن لعل مست کے ترجمہ کردہ رسالہ منتخب البصر کے متن سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

س ”حضرت اگر ہم کو شکل الٰہی نظر آتی ہے تو ہم کو سیدھی کہیں نظر آتی ہے۔“

ج ”ہم لوگوں کو ایک مدت سے عادت ہو گئی ہے کہ سبب کثرت امتحان کے ذہن تیز کرتا ہے کہ یہ سیدھی ہے بلکہ اس کے اوپر ایک جبران ساطع یہ ہے جو نیچے شیرخوار ہیں ان کے سامنے جوشے آتی تھے اس کو بلاشبہ پکڑ لیتے ہیں اور جس لامسہ کے سبب سے اور لوگوں کے کہنے سے ان کو چند مدت میں تیز سیدھے اُلٹے کی ہوتی ہے اور اس کی مفصل تہرار اور براہین علم مناظر میں لکھی ہوتی ہے اور یہ علم اسی میں سے وضع ہوا ہے، اس کو علم انظار کہتے ہیں...“

رسالہ منتخب البصر، سنہ تالیف ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء سنہ طباعت ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء سے اقتباس ۲

بہ سید شاہ علی اور رتن لعل کے ترجموں کی زبان کے مقابلے میں اصول علم حساب ہندی زبان میں، اور رسالہ کسور آ

ہے ایک ایک ٹکڑا دیکھیے :

۱۔ ”مرفوم ہے وہ مثال کہ گزری اس میں معنی بخشتی ہے۔“

۲۔ ”اس کسورات عشر کے اعمال مانند کسور مشہور کے ہوتے ہیں۔“

نہ درجہ بالا پلاٹھ کوڑا تو ایسا ہے کہ جیسے ”باغ و بہار“ میں سے اُچک لیا گیا ہو۔

دوسرا ٹکڑا میکینیکل ہونے کے باوجود اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ میرامن دہلوی کا ہی ہے۔ اس لیے کہ اس میں کے ساتھ اشارہ قریب ان کی بجائے اُس لکھا گیا ہے جو باغ و بہار والے منفرد اسلوب کی ایک پہچان کے علاوہ اصول علم حساب کے ترجمے میں میرامن دہلوی کی لفظیات اپنی صاف پہچان کرواتے ہیں مثلاً :

بغیر کی بجائے بدون

باوجود کی بجائے باوصف

اس کے بعد کی بجائے نفس بیچھے

ضرورت کی بجائے حاجت

غلط کی بجائے خطا

طریقہ کی بجائے ٹول

تفسیر امترجم غلام محی الدین متین حیدر آبادی ہے جس کی زبان کا دکنی انگ (جس کی مثال 'رسالہ علم ہوا' کے باب میں دی گئی ہے) ان دونوں کتابوں میں ناپید ہے۔ جبکہ حافظ مولوی میر حسن الدین محمد مصطفیٰ کی زبان معرب ہے اور مولوی نذیر کی زبان معرکس۔ یہ دونوں خصوصیات ان کتابوں میں نہیں پائی جاسکتی۔ بانی رہا سٹر جٹس اور کمپٹن جوہرہ کا معاملہ تو یہ طے ہے کہ دونوں احرار منشی مقامی مترجمین کی سہولت کے لیے تھے۔ ان کا کام صرف گنجک انگریزی عبارت کو صاف کرنا تھا تاکہ اُردو میں ترجمہ کرنا ممکن ہو۔ اب اگر ان دو محضرات میں سے کسی ایک نے میر امن دہلوی کی مدد کی تو کچھ بعید نہیں لیکن ان دو کتابوں کا اسلوبی تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا ترجمہ میر امن دہلوی نے ہی کیا۔

یوں میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" کے علاوہ مطبوعہ کتب میں نو انگریزی سے ترجمہ کردہ کتب کا اعداد اُس نالغہ روزگار سستی سے متعلق تحقیق کے دائرے کو وسیع کرتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

- ۱۔ میر امن کے فزیمی معاصرین میں نس الامراء کے دارالترجمہ سے منسلک ایک نامور مترجم پنڈت رتن لعل مست ولد چنیا لعل کے ساتھ بھی کچھ ہوا۔ نواب غفر الدین خان ے رسالہ منتخب البیتر (سال تصنیف ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء) کے سرورق پر "رتن لال" نام شائع کیا۔
- ۲۔ "باغ و بہار" مع مقدمہ و فہرست مرتبہ ممتاز حسین، برومیسر مطبوعہ کراچی، اُردو ٹرسٹ، طبع اول، نومبر ۱۹۵۹ء۔ پرومیسر صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ کو "باغ و بہار کا تحقیقی مطالعہ" کے عنوان سے اپنی کتاب "نقدِ عرب" مطبوعہ مکتبہ اسلوب، کراچی طبع اول ۱۹۸۵ء میں بھی شامل کیا ہے۔
- ۳۔ پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی۔
- ۴۔ دیباچہ: "باغ و بہار ایک تجزیہ"، از ڈاکٹر وحید قریشی مطبوعہ: لاہور۔ سنگ میل پبلی کیشنز چوک اُردو بازار لاہور، طبع اول ۱۹۶۸ء۔ طبع دوم، نصرت پبلشرز، بکھنوا (بھارت) ۱۹۸۲ء۔
- ۵۔ بحوالہ نمونہ مشوات، "مرتبہ: احسن ماہروی اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع ثانی ۱۹۸۲ء، صفحہ ۸۷۔
- ۶۔ ایضاً صفحہ ۷۷۔ واضح رہے کہ بقول احسن ماہروی یہ تذکرہ حیدر آباد دکن کی ایک طغیانی میں بہ گیا تھا، جسے مولوی عبداللہ خاں حیدر آبادی نے پہلی بار دارالاشاعت پنجاب: رانا عامر اسٹیم پریس، لاہور سے ۱۹۰۶ء میں طبع کروایا۔

”گل کرسٹ اور اس کا عہد“ از عتیق صدیقی، صفحہ ۲۱۰۔

”THE FALL OF THE MUGHAL EMPIRE“، جلد اول، صفحہ ۲۷۱۔

ات دارالحکومت دہلی، جلد اول، صفحہ ۶۶۳۔

”لاغ و بہار“ مرتبہ ممتاز حسین کراچی: اردو ٹرسٹ طبع اول نومبر ۱۹۵۸ء۔
ب مقدس / مقدس ناب۔ کینیڈا کے فرنیس میں پادری کی جگہ ”ریورنڈ“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
ی ۱۸۰۵ء سے واس پر دوست کا عہد و ختم کر دیا گیا تھا۔

نگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء، سوم ڈیپارٹمنٹ میونس جلد نمبر ۶۹، اپریل ۱۸۰۱ء۔

۱۸۰۵ء صفحہ ۳۱ اپریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ، نئی دہلی (بھارت)

ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲ء) صفحہ ۳۱-۳۲۔

”پن ان انڈیا“ اریچا س ڈوٹے و کیپٹن ٹامس ولیمز مطبوعہ لندن، ۱۸۱۳ء۔
”اریچا س ڈوٹے“، از سید محمد۔

”گل کرسٹ اور اس کا عہد“ از عتیق صدیقی، صفحہ ۱۹۰-۱۹۴۔

بجیہ کالج کونسل کی رپورٹ بابت ۲۰ ستمبر ۱۸۰۴ء۔

پریسیڈنٹ آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

ایضا

ایضا

بہار“ کا تحقیقی مطالعہ، ”مشمولہ“ مقالات شیرانی۔

لات کے لیے دیجیہ: ”اردو نثر کی داستانیں“، از ڈاکٹر گیان چند جین: کراچی: انجمن ترقی اردو

ل ۱۹۵۴ء۔

”بہار“، مرتبہ ڈاکٹر غائب مطبوعہ: لندن طبع چارم ۱۸۶۰ء۔

سیدنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

”چاردریش“ کے ۸ صفحات ہرکارہ پریس کلکتہ سے چھ ماہ میں طبع ہوئے۔ دیجیہ: گلکرسٹ کی چٹھی نام

ونسل مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء۔

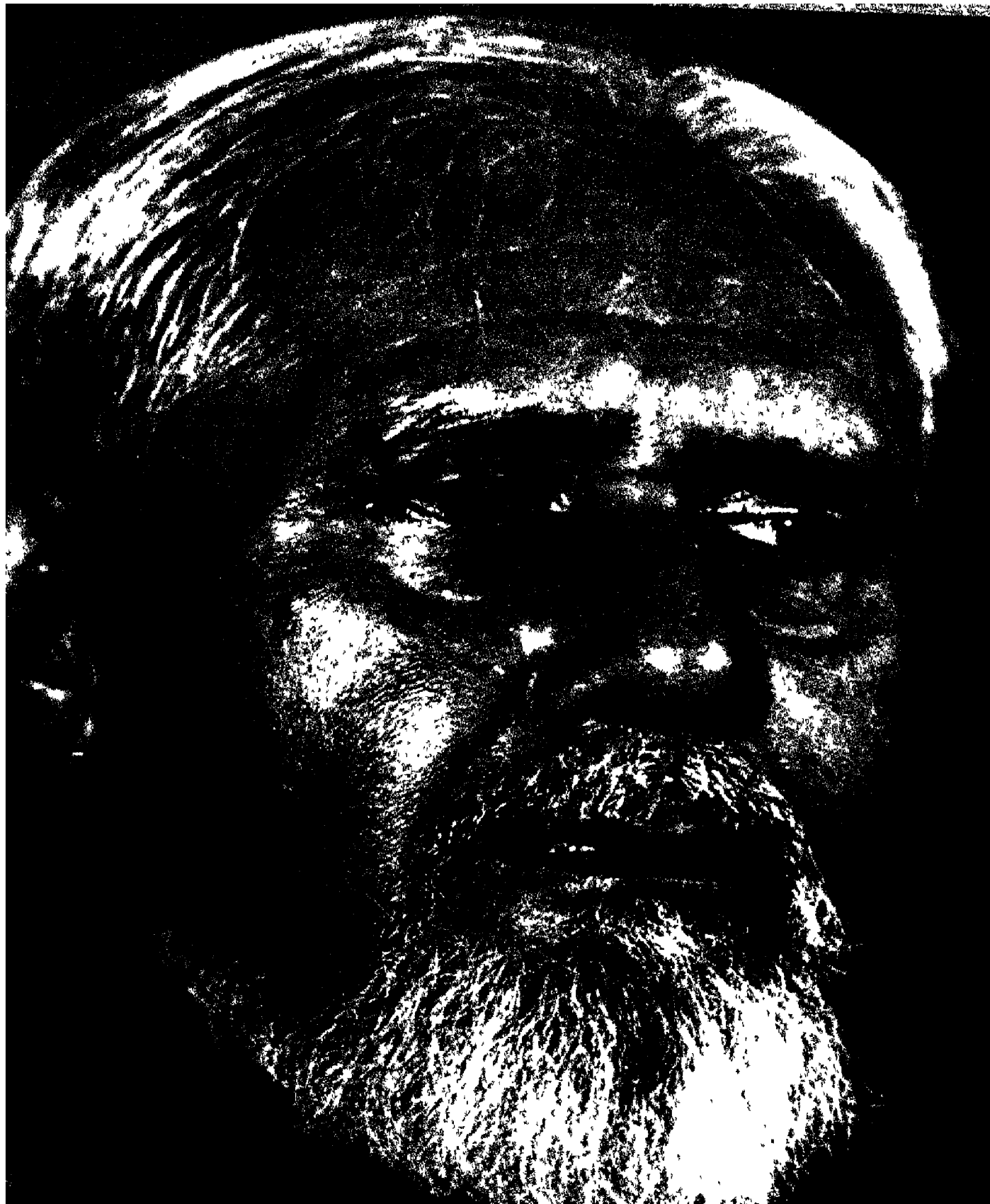
بڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

کتب میں میر بہادر علی حسینی نازولی کو ۱۸۰۱ء میں سی چیف یا ہیڈ منشی بتایا گیا ہے جو درست نہیں۔

یڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔

- ۳۲۰ بروسیڈ نگر آف دی کالج آف فورٹ ولیم۔
۳۲۱ بحوالہ: "مفالات گارسل دتاسی" از کارسین دتاسی (منتزحین، عزیز احمد، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری) نظر ثانی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، کراچی، اسٹین نرٹی اردو، طبع ثانی: ۱۹۷۷ء۔
- ۳۲۲ بروسیڈ نگر آف دی کالج آف فورٹ ولیم، جلد دوم ۱۹۷۱ء۔
۳۲۳ بحوالہ: "مفالات گارسل دتاسی"۔
۳۲۴ بحوالہ: "مفالات گارسل دتاسی" (تالیف: ۱۲۸۱ء مطابق ۱۸۶۳ء) مرتبہ: عطا کا کوئی: بطنہ: عظیم الشان کبڈ پوسطان گنی مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۷۲ء، صفحہ ۲۹۹۔
- ۳۲۵ بحوالہ: تاریخ رنجنتی مدد دیوان جاں صاحب "مرتبہ: سید محمد حسین نقوی الا آبادی، نامہ: عبدالواسع جعفری، الا آباد، مطبع الزار احمدی، س۔ ن۔
- ۳۲۶ بحوالہ: "فرہنگ عامرہ" مؤلفہ: محمد عبداللہ خلیلی مطبوعہ: کراچی: ٹائمز پریس، طبع چہارم جون، ۱۹۷۵ء صفحہ ۷۲۲۔
۳۲۷ بحوالہ: "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" از نامہ سینا پوری۔
- ۳۲۸ بحوالہ: "میت لفظ، باغ و بہار" مرتبہ: ڈوکی فابریس، لندن طبع چہارم ۱۸۶۰ء پر و فیروز ٹیکی فارس نے "باغ و بہار" مطبوعہ: کلکتہ ۱۸۰۳ء، "مبادی متن" "باغ و بہار" مکتبہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور رسول سروس سے متعلق میرامن کے شاگرد مشرور و مر کے نیار کردہ متن کو بنیاد بنا کر بلغ و بہار، کولنڈ سے ۱۸۳۶ء میں طبع کروایا۔ واضح رہے کہ ڈوکی فارس نے "باغ و بہار" کو جو بھی بارلندن سے ۱۸۶۰ء میں طبع کرواتے وقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک مسودہ سے مراد متن کے ساتھ ساتھ خصوصی جائزہ کے بعد اعراب و اوقاف میں بعض تبدیلیاں کرنے کے ساتھ ساتھ کیپٹن ڈبلیو این۔ لیس ڈائریکٹ آف پبلک انٹرکیشن و پرنسپل کلکتہ یونیورسٹی کے ایما پر "باغ و بہار" کے محض لافلاقی حتموں کو حذف کر دیا تھا۔
- ۳۲۹ مرتبہ: "الزادہ رید" قلعہ ادھونی حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔
۳۳۰ بحوالہ: ۵۵۳ نمبر شاطلات ۳۰۶ سائز ۱۸ x ۹ صفحات ۱۹ سطر ۲۰ خط نستعلیق: قلمی مخطوطہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد آندھرا پردیش کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔





ماں جی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی کی سدا ئس کا صحیح علم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائس اور کا صلیع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے برصغیر کے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے نئی کالونی میں جون درجون کھنچے طے آرہے تھے۔ عرب عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو مار، کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں ماں جی کی عمر دس مارہ سال بھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش بھٹی صدی کے آخری دس بندہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آئی وطن تحصیل روڈ پر ضلع، سالہ میں ایک گاؤں میدان نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ اُس دنوں روڈ میں درباے سب سے سہ سہ سہ کی کھدائی ہو رہی تھی۔ ماں جی کی اراضی سہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روڈ میں اگر برحاکم کے دوسرے ایسی زمین کے معاوضے دیئے جالے تھے۔ ناں جی دہیں مار معاوضے کی لائس میں نہر گئے، لیکن سیدھے آدمی تھے، کہیں اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ اگر برکا دہر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرلے کے لیے کہا دم اٹھا جاتا ہے۔ انجام کار صبر سکر کے ٹھگئے اور سہر کی کھدائی میں مردوری کرنے لگے۔

انہی دنوں یہ چہ لگا کر باری کالونی کھل گئی ہے اور سئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ ناں جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا گھنہ سا محلے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی لومبن۔ تھی، اس لیے باپا وہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محب مردوری کر کے پٹ پالتے۔ ناں جی جگہ جگہ تلی کا کام کر لیتے یا کسی مثال پر کھڑیاں چہرہ دے۔ مانی اور ماں جی کسی کاسٹ کاٹ دینیں یا مکانوں کے فرش اور دوا بریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صبح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پانچ کر دنوں کی منزل ہنومن میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑا نوالہ پہنچے۔ باپا وہ جلے اور محنت مزدوری کی مستقت سے سب کے جسم ڈھال اور پاؤں مٹو جے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ باہم کہا۔ ناں جی دن بھر عذہ مڈی میں لوریاں اٹھالے کا کام کرتے۔ مانی پر خد کات کر سوت بچتیں اور ماں جی گھر سلہا لیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں تسل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ ناں جی کے ماس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیئے۔ ننگل میں پہلی بار اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا، لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ دن بھر میں ایک آدھ روٹی تک مرتج کی چٹنی کے ساتھ میٹر آجائے نو مزید نقدی کس کام آتی ہے؟ یہ فلسفہ سادی عمر ماں جی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔

عبدی کے میں آئے کسی روز ملن جی کے دو بٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے جس دور وہ جڑاوالہ سے روانہ ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اسے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے پورے ہوجاتے وہ فوراً مسجد میں پہنچا دیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو وہ اس عمل پر پڑی و جمعراتی سے پابند رہیں۔ روضہ مہنت سی مسجد میں بجلی آگئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انھیں ایسی مسجدوں کا علم رہا تھا جن کے چراغ اب بھی جل رہے ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں کے سر پر ملے ملے کے رومال میں بندھے ہوئے چد آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے صل کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ بھی تبرعات کی سب سے تھیں۔

ان ہند آلوں کے علاوہ ماں جی کے پاس۔ کچھ اور رقم تھی۔ کوئی زلیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چندیریں تھیں۔ تین سوڑے سوئی کپڑوں کے، ایک جوڑا دلہنی جوڑا، ایک جوڑا ریشم کے صل، ایک سیک، ایک انگوٹھی جس میں تین جھوٹے چھوٹے فردنسے چڑے سوئے تھے ایک جائے نماز۔ ایک تسبیح اور بانی اللہ

پیسے کے بن جن چڑوں کو وہ خاص تہام سے رکھی تھیں ایک ربین، دو سراپے ہاتھوں سے دھو کر پیچے کے نیچے رکھا رہنا تھا تاکہ اسری ہو جائے، سرادھوے کے بے سار۔ ان کے علاوہ اگرچہ تو کپڑا ان کے پاس آنا تھا تو وہ پیچکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انھیں سوٹ کس رکھے کی حاجت محسوس نہ تھی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انھیں تیار ہی میں ہد منٹ سے زیادہ۔ مگلتے تھے۔ کٹروں کی ٹوٹی بنا کر انھیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاپڑوں میں آونی فرد اور گرمیوں میں مل کے دوپٹے کی نقل ماری اور ہاں کہیے ملے کو سار سدر آخر بھی انھوں نے اسی سادگی سے اخذ کر لیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر پیچے کے نیچے رکھے۔ ہنادھو کر مال سکھائے اور حد ہی گھسٹوں میں رمدگی کے سب سے آخری اور سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں جس عاموسی سے دنیا میں رہی تھیں اسی خاموشی سے بعضی کو سدھا رکھیں غالباً اسی موفد کے لیے وہ اکثر دُعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ پاؤں چلتے چلا لے اٹھالے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے

کھانے پینے میں وہ کپڑے لٹے سے ہی ربا وہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرعوب نہیں غذا مکی کی روٹی دھینے بودینے کی مٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی پیریں بختی سے تو کھا لینی تھیں، لیکن شوق سے نہیں۔ نصیباً ہر روز لے پالہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ بچوں میں بہت ہی محبوب کیا جائے تو کبھی کبھی کیلے کی فراقت کرتی تھیں۔ البتہ ناستے میں جائے کے دو پیالے اور نمیرے بہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں کھا نا صرف ایک وقت کھانی تھیں۔ اکثر دستر دہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پہلی مکھن مٹی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاٹی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رعبت سے کھاتے دیکھ کر نفی ہوتی تھیں اور ہمیشہ دُعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا۔ سب کے لد ہمارا بھی بھلا۔ خاص اسے یا اپنے بچوں کے لیے انھوں نے براہ راست کبھی کچھ نہیں مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دُعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوق خدا کی حاجت روائی کے طفل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انھوں نے اپنی زبان سے کبھی میرے بیٹے "یا میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال ہی کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ہی جی پر بہت گراں گزرنا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم ذرا بد رفتاری کا کار کردہتا تو انھیں ایک عجب قسم کی سرمنشگی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اور احسان مندی سے سارا دن اُسے دُعا میں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور دلچسپی کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر مدرس نے ماں جی کی سرسنت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے روبرو ملنے سکھایا تھا۔

حیث الہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور حور دسال مہیا بنوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لاکھ لیر کی کالونی کی طرف متعلق ہوئیں، تو انھیں معلوم ہوا کہ انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کر لے کے لیے کا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتا کر کہیں کہیں اس زمانے میں ان کے دہن میں کالونی کا تصور ایک درس سیرت سرگ کا تھا۔ جو کہیں سر راہ میٹھا زمین کے پروانے نعیم کر رہا ہوگا۔ کسی سے یہ جھوٹا سا مانعہ لاکھ لیر کے ملازم میں یا پیادہ ٹھکانہ لاکھ لیر کسی راہ گزر پر انھیں کالونی کا حضور صورت رہنا۔ مل سکا۔ آخر سب اگر انھوں نے چیک نمبر ۳۹۲ میں حواں دلوں سیانیا آباد ہو رہا تھا ڈیڑے ڈال دیجے۔ لوگ جو درجن آباد آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اسی سادگی میں سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا سنا ہی ایک طریقہ ہوگا۔ حواں انھوں نے ایک جھوٹا سا احاطہ کر گھاس مھوس کی جھوٹی بنائی اور خیر ارضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کاری کرنے لگے۔ اسی دنوں محکمہ مال کا عملہ پٹنال کے لیے آیا نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انھیں جب سے سال و ما گیا۔ اور سرکاری زمین پر مابا تر تھوڑی سا مالے کی پاداش میں ان کے برتن اور بسہ قری کر لیے۔ محلے کے ایک آدمی نے جادی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کالوں سے اُتر والیں۔ ایک بالی اُتارنے میں درادیر لگی تو اُس نے زور سے کہنے لگی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا ریریں جھٹک مری طرح سے پھٹ گیا۔

جب نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو اس سہ سائے آیا اس بریل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر ٹھہرتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا بیلہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کسواں نظر آتا ماں جی اپنا دوپٹہ بھولیں تاکہ پیاس گھٹنے پر اسے بھولے جہاں کو چٹائی جائیں۔ اس طرح چلے چلے ۵۰ ایک مہرے ۵۰ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آباد کار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلا لے تھے۔ نانی مریشی جہاں لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گائیوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انھیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک دمت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بھیروں پر گرا رہا ہوتا تھا۔ کبھی خروڑے کے پھلے اُبال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچھ انبیال گری ہوئی مل گئیں تو اُن کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے نور بے اور گھٹے کا جلا ساگ ہاتھ آگیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ پچھلے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہو گیا، اور ساگ کو اتل لگا کر گھوٹنے کا دفت آتا تو ماں جی نے ٹوٹی اسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پینڈا لٹ گیا اور سارا ساگ بکریوں کے چوٹے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈاٹ بھی پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چوٹے کی کڑیوں پر گرا ہوا ساگ لٹچوں سے جاٹ جاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

جب نمبر ۵۰ نانا جی کو خُوب راس آیا چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آباد کاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر اُن کو ایک مربع زمین بھی مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور دو تین سال میں ان کا شمار گاتوں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی تو انوں آبائی وطن کی یاد تازہ ہونے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل

میں میچ کر نیل کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو جہت پسند آباد وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر ماضی دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کئی کئی بہت سے ذرے آں کی آنکھوں میں پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آتش پشیم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انھوں نے ساری عمر بے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے سفر کا اس زمانہ ڈیلے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی ٹھکان اور راستے کے گرد و عنار کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اُن کے درحوں میں وہ بہت بیزار ہوتیں۔ ایک دو بار جب انھیں محو راہ بیڑ کا بسنس ڈیلے میں سفر کرنا پڑا تو وہ ٹھک کر نپوڑ ہو گئیں اور سارا دن جید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزارا۔ مسئلہ پہنچ کر ماضی لے آنا آسانی کا نہ دوست کیا۔ عزت و ادب کو مخالفت دے۔ رعنائیں ہوتیں اور پھر ماں جی کے لیے بڑھوٹے کا سلسلہ متروک ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مریض، اروں کی ٹری دھوم بھی اور ان کا شمار حس قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ بارہوں طرف سے ماں جی کے لیے یہ دہلے پیام آئے گئے۔ لوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ مٹا رہے تھے۔ بڑا دوسری والوں پر عجب گاتھے کے لیے نالی جی انھیں ہر روز نئے کہنے بہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر کہتی تھیں۔

کبھی کبھار رانی یادوں کو نازہ کرنے کے لیے ماں جی رٹے معصوم خیر سے کہا کرتی تھیں: ”ان دنوں میرا نوکاڑ میں نکلا ہوا دو بھر ہو گیا تھا۔ میں اس طرف سے گزر جانی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے: یہ خیال تجس مریض وار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھئے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔“

”ماں جی، آپ کی اپنی نظر میں کئی البسا خوش نصیب ہیں تھا؟“ ہم لوگ پھیلنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

”وہ تو بہت“ ماں جی کاؤں کو ہاتھ لگائیں: ”میری نظر میں بھلا کوئی کہے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے البسا آدمی ملے جو دوسرے بڑھاکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدائے یوں کو یاد کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبد اللہ صاحب کا طوطی بل رہا تھا۔ وہ ایک امیر کی گھرانے کے جینم و چراغ تھے لیکن پانچ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے، اور بے حد معزول الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پر طوی ہے۔ چنانچہ عبد اللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جمہور پڑے میں آٹھ آئے۔ زرا در زمین کا یہ انجام دیکھ کر انھوں نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجروں کے ہاتھ گرو نہ رکھی جاسکے۔ چنانچہ عبد اللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک پولیشن میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا مرقعہ تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں دیکھا رٹا نام کیا ہو۔

اُڑتے اُڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں بھی پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنا خاص

منشی کا دل بھیجا اور عبد اللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبد اللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی لے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہو گئے۔

سرستید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انھوں نے عبد اللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلایا کہ وہ انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھل صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پاک کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبد اللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبد اللہ صاحب کی سعادت مندی اڑے آئی اور انھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرستید کو بے حد غصہ بھی آیا اور کوکھ بھی ہوا۔ انھوں نے لاکھ سمجھایا، بھجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبد اللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

”کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفادات پر ترجیح دیتے ہو؟ سرستید نے کڑک کر پوچھا۔“
”جی ہاں“ عبد اللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ نکالسا جواب سن کر سرستید آپے سے باہر ہو گئے۔ بکرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انھوں نے عبد اللہ صاحب کو لالوں، بھوتوں، قہیڑوں اور جوتوں سے خوب ہٹایا اور پھر کالج کی نوکری سے برخاست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا: ”اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمھارا نام بھی نہ سن سکوں“

عبد اللہ صاحب جتنے سعادت مند بنے تھے اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نفیسے پر امنیں سب سے دور افتادہ اور دستوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سسہ میں گلگت پہنچے اور دیکھنے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جس دن ماں جی کی مگنی کی ٹکر ہو رہی تھی اپنی دونوں عبد اللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے قسمت میں دونوں کا سب جوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی مگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبد اللہ صاحب وہاں کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

مگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبد اللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لیے۔ عبد اللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کیے۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ جب اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

”اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا روگی؟“ عبد اللہ صاحب نے پوچھا۔

”اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوادوں گی۔“ ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبد اللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔

اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گھٹت میں عبد اللہ صاحب کی ٹری شان و شوکت تھی۔ جو بصورت جنگل، وسیع باغ، لوکر پارک دروازے پر سیاحیوں کا پہرہ۔ جب عبد اللہ صاحب دورے پر باہر جانے سے باز آتے تھے تو ان کو سات نوکروں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گھٹت کا گورنر ایک خاص سیاسی اور اختطاطی افسر کا تامل تھا، لکن ان جی براس سارے جاہ و جلال کا در اسی اترہ ہوا کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ان جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی بہ ماحول پر ناموسی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم جلی حکومت برطانوی طرف سے گھٹت کی زوسی اور جینی سرحدوں پر پولیسنگ ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے واک سہجے ہوئے تھے اور سڈلن کھلی سیں۔ یہ بے جھائی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے ہڈی سہل سے کہا: ”معاذ ہو میرے گزرنے ہی دے گئے، یہی کئی ہے۔“ اسی سی سنی کی مافٹ نو حراب نہ کر دے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مس سہل کو اسے ماس رکھ لیا اور سہل سہنوں میں اسے کھا کھا۔ سہل بروما برس مابھنا، کثیر سے دھونا کھا کر ماں جی کے پاس بھیج دیا۔

جب رُوس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچر سرحدوں کا معاہدہ کرنے گھٹت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے صیانت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس مارہم کے کھانے بکائے۔ کھالے لہذا تھے۔ لارڈ کچر نے اپنی لہریں کیا: ”سٹر گورنر جس خانہ ماں نے رکھائے پکے ہیں۔ براہ مہربانی سری طرف سے آب اس کے دھو خرم لیں۔“

دعوت کے بعد عبد اللہ صاحب فرحان و شادال گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک کونے میں جھائی پر مچھی مک، در مچھی کی چٹنی کے ساتھ مچھی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبد اللہ صاحب نے ماں جی کے دھو جوئے اور کہا: ”اگر لارڈ کچر مرماس کرنا کہ وہ خود خانسا ماں کے ہاتھ جوڑنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کریں؟“

”میں“ ماں جی سک کر بویں۔ ”میں اس کی سونچیں کیڑ کر جیسے اُکھاڑ دی۔ پھر آپ کیا کرتے؟“

”میں“ عبد اللہ صاحب نے ڈرامہ کیا ”میں ان سونچوں کو روٹی میں پیٹ کر ڈالنے کے ماس بھیج دیتا اور جنس ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا، جیسے سر سید کے ہاں سے بھاگا تھا۔“

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار — صرف ایک بار — ماں جی بھی رشک و حسد کی اس آگ میں جل نہیں کر کہ باب ہو گئیں جو ہر عورت کا انڈی ورنہ ہے۔

گھٹت میں سہل کے اسکات گورنری کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ جیر پان جی تک پہنچا تو انہوں نے عبد اللہ صاحب سے گلہ کیا۔

”بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ عریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!“

عبد اللہ صاحب علی گڑھ کے پٹے ہوئے تھے دگ نظر انت پھر ک اٹھی اور بے اعنائی سے فرمایا: ”بھاگو ان یہ بھنا رانام پھر“

ہی میں گورنری زور اصل مختاری سکن ہے چون رات میرا بھیجا کرتی رہتی ہے۔“
مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی تھی ہوگئی لکین ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس علم میں وہ اندر ہی اندر
کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کسبر کا مہاراجہ پر ناپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے درے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا
دُکھ سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آگئی۔ ”ہائے ہائے مہاراجہ! میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراجہ سے کہوں گی کہ
وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔“

جب یہ مخدوم مہاراجہ پر ناپ سنگھ تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران
تھے کہ بیٹے بھائے بہ کبسا دُعا آن پڑی یکیں جب معاملے کی منتہی پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضع دار تھے چنانچہ
مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے مہاراجہ راجا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی
تک گلگت میں ہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں

بحکم نامہ رسن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراجہ نے گورنری کو دلین نکالا دے دیا ہے۔

”اسم دو دھوں ہناؤ۔ دونوں پھل۔“ مہارانی نے کہا ”کبھی ہمارے لیے بھی دُعا کرنا۔“

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دُعا کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا دانفعی خوش مصعب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے کہ جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک
اُٹا کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دُکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔
سب سے بڑا بیٹا عین عالم شہاب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو نو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کامل تھا۔ اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رو یا نہ

کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچیس سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب

ماں کی کھردری حیرانی پر حسبِ معمول گاؤں بھیک گا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائین پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر اُن کو دے رہی تھیں وہ
مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے۔ اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر بکا یک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے ”حاگوں شادی سے پہلے بیٹے
میں میں نے تعین کیا رہ پیسے دیئے تھے۔ کیا اُن کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا۔؟“

ماں جی نے نئی نویل دُہن کی طرح مرتھکا لیا اور گنا پھیننے میں مصروف ہو گئیں۔ اس کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال

اُٹا آئے۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے سرتاج شادی کے پہلے گیارہ بیسوں کی تو بڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ

نجاہ کیا ہے اس پر میں نے تھوڑے پائوں دھو کر پہنے ہیں۔ اپنی کمال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی دنت کہاں آیا ہے، میرے سرتاج.....

لیکن نغنا وند رکے بھی کھاتے ہیں دنت آچکا تھا۔ سب ماں جی نے سرائٹھا یا تو عبد اللہ صاحب گئے کی کاش منہ میں لچھے گاؤ تلخیتے پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتر بلایا، بلایا، چمکارا، پکارا، لیکن عبد اللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی مادہ، ویٹیل اور ایک بیٹی کو بیسنے سے رکا کر نغنین کی کہ ”بچو۔ رونا مست۔ بھاسے آبا جس آرام سے رہے تھے اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مست۔ ان کی رُوح کو نکلیف پہنچے گی۔“

کچھ کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے آبا جی کی یاد میں نہ رونا اور نہ ان کو نکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس فائدہ کی یادیں۔ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انھیں ایک الحڑولہن سمجھا اور جس نے گورنری کے علاوہ اور کوئی سوچن اس کے سوا لاکر میں بٹھائی۔۔۔

جب وہ خود چل دی تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ لٹان چھوڑ گئیں جو قیامت تک انھیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر جنرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے آگے ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملا پر لسان ہے کہ بھلی کا دریٹ بڑھ گیا ہے اور نیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے مام پر ناتھ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے۔ لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ ناتھ وڑو دین نو بلاؤ اور زرو سے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی رُوح کو نکلیف نہ پہنچاؤ اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔۔۔

چمکور صاحب

قدرت اللہ شہاب

سنت ابراہیم روڈ سے کوئی نو میل کے فاصلے پر ہنر سرہند کے کنارے چکور کا قصبہ آباد ہے۔ یہاں اسے چکور صاحب کہتے ہیں۔ کیونکہ اس گاؤں میں سکھوں کی تاریخ کا قدس گئی بارہنا اور گئی بارہنڈا۔

چکور صاحب میں چار دوارے اور ایک خانقاہ ہے۔ گوردواروں میں سب سے اُونچا درجہ کلنی والے بادشاہ ساتویں گرو کے گوردوارے کا ہے۔ سکھوں کی روایت کے مطابق ایک چٹان صوبیدار نے گرو کے درمکن صاحب اداوں کو اس گوردوارے کی جزی دیا۔ زیدہ چنوا دیا تھا۔ صاحب زادوں کے نام بابا اجیت سنگھ اور بابا جھجار مہری تھے اور آج کل ان کے نام پر اس گوردوارے کے ساتھ بابا اجیت سنگھ جھجار مہری خالصہائی سکول بھی قائم ہے۔

دوسرے گوردوارے کا نام دد صاحب ہے۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے طبل بجایا تھا۔ تیسرے گوردوارے کا نام مسواک صاحب ہے۔ اس مقام پر ایک گرو صاحب نے اپنے دندان مبارک پر مسواک فرمائی تھی۔ چوتھا گوردوارہ جھاڑ صاحب کہلاتا ہے۔ یہاں پر ایک گرو صاحب نے جھاڑا پھرا تھا۔

چکور صاحب کی اکثریتی خانقاہ "بابا صاحب" ہے۔ بابا صاحب دراصل بابا شہاب الدین حضرت مجدد الف ثانی کے ہم عصر تھے اور اپنے زمانے کے صاحب کرامت بزرگ مانے جاتے تھے۔ زیدہ عبادت کے علاوہ بابا شہاب الدین اپنے علاقہ کے قاضی بھی تھے اور سب معائن کے لیے نیل کا کاروبار کرتے تھے۔ بابا صاحب کے مسمن میں نیل سے بھرے ہوئے مشکوں کی قطاریں پڑی رہتی تھیں۔ ایک روز آدھی رات گئے سکھوں کے ساتویں گرو ارجن دیواچانک بابا صاحب کے احاطے میں آگئے۔ گرو صاحب عالم روپوشی میں جان بچاتے پھر رہے تھے کیونکہ ان کے تعاقب میں سرہند کا حاکم فوج کی ایک بھاری جمیعت لے کر نکلا ہوا تھا۔

گرو صاحب نے کہا "بابا جی اگر میں اس جلیتی بہتی مٹی میں کود جاؤں تو شاید میری روحانیت مجھے آگ کے ضرر سے بچالے۔ لیکن سرہند کے مغل حاکم سے بچنے کے لیے انسانی وسیلہ درکار ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی وسیلہ ہو تو بتاؤ۔"

بابا صاحب نے جواب دیا: "گرو جی مہاراج۔ وسیلہ روحانی ہو یا انسانی خدا کے حکم کے بغیر میسر نہیں آتا۔ آپ اللہ کا نام لے کر نیل کے اس ٹکے میں بیٹھ جائیں۔ شاید خدا اسی میں بہتری کرے۔"

گرو ارجن دیواچانک نے نیل سے بھرے ہوئے ایک مشکے میں بیٹھ گئے۔ بابا صاحب نے مشکے کا منہ کپڑے کی جالی سے ڈھانپ دیا۔ سرہند کے حاکم نے اپنی فوج کی مدد سے چکور صاحب کا کونہ کونہ چھان مارا۔ گوردواروں کے گرنیتھوں اور نہنگ لالوں کو زمین پر لٹا کے خوب پٹوایا بھی۔ بہت سے گھروں کی تلاشی لی۔ گتے کے کھیتوں کو کاٹ کاٹ کے رکھ دیا۔ کچھ سپاہی سلام کرنے

کے بہانے بابا شہاب الدین کے ہاں بھی آئے۔ بانوں باتوں میں انھوں نے بابا صاحب کے گھر کا جائزہ بھی لیا اور مالویس لوٹ گئے۔ راتوں رات منظر فونی اپنی مہر بر آگے بڑھ گئی۔ صبح سریے بابا صاحب نے گرداجن دیو کو نیل کے ملنے سے لباس تبدیل کرنے کے لیے انھیں سے کپڑوں کا ایک جواڑا پیش کیا۔

گرو صاحب نے کہا ”بابا جی۔ اب میں کبھی سفید کپڑے نہ پہنوں گا۔ آج سے بنلا رنگ میرے پنچہ کا رنگ معزز۔ گرو صاحب بابا شہاب الدین کا سرکاری ادا کر کے رخصت ہوئے۔ چند روز بعد چکور کے گھر دواروں کے گرنے کی ایک صورت میں بابا صاحب کے پاس آئے۔ انھوں نے بڑے ادب و نیاز سے بابا صاحب کی خدمت میں ریشم کی ایک ستیا سخی میں گرداجن دیو کے اپنے ہمد کا کھانا ایک فرماں مناجس میں سارے سکھ پنچہ کو نصیحت کی گئی کہ وہ بابا شہاب الدین محسن مانیں اس احسان کے بدلے چکور کے گھر دواروں کی آمدنی میں روپے میں دو پیسے کا حصہ بھی دائمی طور پر بابا شہاب الدین کی اولاد کے حق میں وقف کر دیا گیا تھا۔

بابا صاحب نے اس سرمان کی پشت پر گورکھی زبان میں ایک تحریر لکھ دی۔ جس کا منہم یہ تھا ”اگر یہ کے خلاف جہاد کا ہوتا تو سدا شہاب الدین خود اسے ہاتھ سے گرو صاحب کا سر قلم کر دینا۔ لیکن یہ جنگ حاکم اور مجتہد سے ہے۔ گرو صاحب کے ساتھ میں نے کوئی احسان نہیں کیا، فقط اپنا اخلاقی فریضہ ادا کیا ہے۔ اس کی اجرت نہیں۔ میں اس آمدنی کو اپنی آل اولاد پر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیتا ہوں۔ البتہ میری خواہش ہے کہ چکور کی حدود میں اسے یا کھانا بند ہو جائے۔ اگر سکھ قوم اس خواہش کو پورا کرے تو یہ اس کی حق عنایت ہوگی۔

سکھوں نے برصا در عبت اس شرط کو قبول کر لیا اور اس روز سے چکور صاحب میں سور کے گوشت کی سختی۔ چند سال بعد جیٹا صاحب کی وفات ہوئی تو دور دور سے ہزاروں ہندو سکھ اور مسلمان ان کے جائزے میں شرکت کرنے پہنچے۔ عقیدت مندوں نے اسے ہاتھ سے بابا صاحب کا مقبرہ تعمیر کیا۔ مقبرہ ایک سادہ سی حار دیواری برسنسل کی وصیت کے مطابق اس پر چھت نہ ڈالی گئی۔

بابا صاحب کی زندگی ہی میں برسم جل نکلی تھی کہ گاؤں میں آنے والے یا گاؤں سے جانے والی ہر برات ان حاضر ہوتی تھی۔ بابا صاحب کچے چاولوں میں شکر ملا کے ایک ایک ٹھٹھی برائیوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان کو دہا دہن کے لیے بیک فال سمجھتے تھے۔ بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد اس رسم میں اور بھی شدت آگئی۔ اب کے مزار پر حاضر ہوتی۔ براتی لوگ کچے چاولوں میں شکر ملا کے مرار پر پھیکتے اور پھران کو اکٹھا کر کے دوبارہ برائیوں چاولوں کے جودے مزار پر پڑے رہ جانے ان کو نیچے کے لیے بہت سے کمبوز عام طور پر وہاں جمع ہوتے تھے۔ بابا صاحب کے عقیدت مندوں کے متعلق طرح طرح کے قصے بن گئے اور رفتہ رفتہ کمبوزوں کو اتنا نقد سس حاصل ہو گیا کہ چکور صاحب ان کا شکار حرام شمار ہونے لگا۔

جس مقام پر بابا شہاب الدین کا مزار واقع تھا اس کے پاس ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا

کہتے تھے۔ چکر کے خوش فہم بڑے بوڑھوں کو اس بات کا یقین تھا کہ کروں پانڈو کی مہا بھارتی لڑائی اسی میدان میں ہوئی تھی۔ ذرا سا کریدنے پر اس میدان سے طرح طرح کے پرانے سیکے اور جنگی ہتھیار مل جانے لگے۔ یوں بھی تیز بارش کے بعد جگہ جگہ انسانی ڈھانچوں کی ہڈیاں اور کھوڑیاں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر ہاتھ ہو تو ان ہڈیوں کی رگڑ سے جاسجا حراع سے جل آتے تھے۔ برسات کی اندھیری راتوں میں یہ دوستانہ حراس طور پر مافوق الفطرت سماں باندھ دیتی تھیں۔ رمد رمد یہ شہر ہونے لگا کہ روحانی دنیے بھی بابا صاحب کی کرامت سے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس کبھی رات کے وقت یا ڈوان کے میدان میں بابا صاحب کی پیرامت بگ کالی گاؤں کی بڑی بوڑھیاں سر ڈھانپ کر کوٹھڑوں پر چڑھ جاتی اور دامن پھیلا پھیلا کر بابا صاحب سے رکت کی دعا نہیں مانگنے لگتیں۔

بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد ان کے اکھڑنے والے فرزند بھولے میاں نے نیل کا کاروبار سنبھالا۔ بھولے میاں کا اصلی نام ہاشم تھا۔ وہ محض دیندار تھے۔ دیاداری سے قطعی سیکڑتے۔ سیدی سادی صبر شکر کی زندگی بسر کرنے لگے تھے، ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے بھی۔ اسی ڈگر پر ثابت قدم رہے۔ لیکن چودھری مشتاب بن جاکر چودھری مشتاب بننے لگے۔ ایک بار بنگ پڑا سب سے پہلے انھوں نے گوردواروں کے گرتھوں سے مل کر دیے میں دو پیسے کی آمدنی پر قبضہ جانے کی کوشش کی۔ یہاں سے ناکام ہو کر انھوں نے سیل کا ایک چرانا مٹکا لے کر اسے ٹیولوں سے خوب سجایا۔ گھر کے صحن میں ایک رک رک سامیانہ تان کر اس کے نیچے ایک خوبصورت تخت سجایا۔ اس تخت پر رہینی ٹیکریں اور گدوں کے درمیان اس مٹکے کو جاکے رکھ دیا۔ دو خوش بوس ملازم مورچیل بیکھے اٹھائے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اور بڑے ادب سے بٹکے پر آہستہ آہستہ بھی ہلا رہتے تھے۔ چودھری مشتاب بن نے چارہ ایک عالم میں چرچا کر دیا کہ یہ وہ مقدس حکا ہے جس میں بابا شہاب الدین نے گوردوارہ دیو کوٹھا کے رکھا تھا۔ یہ ایک آکاؤ کا سیکھنے کی زیارت کے لیے آئے۔ یہ عقیدت مند دلوں پر چڑھانے کے پھول حلوہ ٹھانیاں اور پھل لاکر دوس گئے گیس چدھینوں کے بعد جب سنگھ سبھا کے موقع پر چیکو دیں سکھوں کا سالانہ اجتماع چڑاؤ ہزاروں زائرین نے مٹکے کو تعظیم دی۔ چودھری مشتاب دین نے تعظیم دینے کا علیٰ طریقہ رائج کر ڈالا تھا کہ عقیدت مند پہلے ہاتھ جوڑ کر مٹکے کو نوا کرتے تھے۔ پھر گھٹنوں کے بل ٹھک کر اسے بعد ازاں احترام دینے لگے اور آخر میں جاندی کے روپوں یا سونے کی مہ دیں کا نذرانہ مٹکے میں ڈال دیتے تھے۔ پہلی گھٹ سبھا پر دو ہزار روپے جمع ہوئے۔ دوسری بار پانچ ہزار۔ اسی طرح بڑھتے بڑھے آخر البادلت بھی آیا کہ سنگھ سبھا کے روز ٹھکا مارا مہرتا تھا اور دن بھر کی آمدنی میں ہزار تک جا پہنچتی تھی۔

پانچ سات برس میں چودھری مشتاب دین ایک معمولی نیل مردوش سے ترقی کر کے لکھ پنی رتس بن گئے۔ چکر کے ارد گرد انھوں نے سیکڑوں ایکڑ اراضی خرید لی اور بابا شہاب الدین کے کچے مکان کو مسمار کر کے ایک عالی شان حویلی تعمیر کر ڈالی۔ جس کے چاروں طرف کی چھت بلندی میں گوردوارہ دمد صاحب کے کلس کا مقابلہ کرتی تھی۔ گرتھیوں کو یہ گستاخی ناگوار لگے۔ یوں بھی کچھ عرصہ سے جگہ گرتھی چودھری مشتاب دین سے بیزار ہو رہے تھے۔ مٹکے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے گوردواروں کی آمدنی پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور چودھری مشتاب دین کی روز افزوں امارت میں گرتھیوں کو اپنے حقوق کا ٹھون نظر آ رہا تھا۔ ادھر سکھوں میں صلاح مشور سے شروع ہوئے کہ چودھری مشتاب دین کے چاروں طرف کی بلندی گوردوارہ دمد صاحب کے کلس سے بہر حال کمتر ہونی چاہیے۔ ادھر چودھری صاحب نے اس سادھن کا منہ تو جواب دینے کے لیے اپنے چاروں طرف سے پر سکھ پنہ کے لیے شہر جھنڈے

ٹوڑ دینے۔ اندر وہی رکھتا میاں زمان کراس کے نیچے سخت بوس بچا با اور سخت پوش پر رہی گدوں اور گدیوں کے درمیان نیل کا خالی ایک جا کے رکھ دیا۔ اب یہ کمرہ حمارہ مشکا صاحب "کھلائے نکا اور کتھوں میں دور دور تک سہرت ہو گئی کہ وہاں بستی وا چودھری صاحب مہتاب نے بھی کمال کر دیا۔ اپنے حرج پر شکا صاحب سے بلیا بند والا حمارہ بنایا ہے کہ چکور کے گوردواروں کرام کر دیا۔

مرشد سبھا کے بعد چودھری مہتاب دین سونے یا مدد کے سکوں کو کلا کر سلاحوں میں ڈھال لیتے تھے اور ان سلاخوں کو تانبے کی کاکڑوں میں بھر کر اپنی جوبلی کی اندرونی دلواریں میں خیمہ طور پر لگا ڈھنسنے تھے۔ اس حزانے کی حفاظت کے لیے چودھری صاحب نے ایک نرالی نریب نکالی۔ انھوں نے کوئی درجی بھرتاری اور حفاظت جمع کر کے ملازم رکھ لیے۔ اندر کے کمرے میں ہر فاری باری ماری سے دو دو گئے بابا شہاب الدین کے لیے درآں حوائی کرتا تھا۔ ایک دو لوکران کی خدمت پر سہدف مامور رہتے تھے۔ چنانچہ اندر ٹنی کمروں میں پوسیس گھنٹے چراغ جلتا تھا اور نرآں حوائی ہوتی تھی۔ ایک پنڈ وکاح۔ مانا سہاب الدین کی روح کو ایصالِ نواب بھی ہوتا رہا تھا۔ اور چودھری مہتاب دن سے گڑے ہوئے نرآں کی حفاظت بھی بھوواں سالتہ ہوتی رہتی تھی۔ دن رات قرآن حوائی کی حیمیل نوکروں نے ذمہ داری سہرت سے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ راہ بھی وا۔ چودھری مہتاب نے کیا بات ہے۔ بابا صاحب کی روح پاک کے لیے دن رات چراغ جلتا اور مرآں سرلیٹ پڑھواتا ہے۔ یہ چودھری صاحب نے بھی ایسی سعادت مندی کا مزید ثبوت دینے کے لیے بابا شہاب الدین کے مرآں کی مرمت پر لے در لے دو سبب خرچ کیا۔ نبر کا نوید میں بہا سنگ مرمر کا بنایا اور مرآں اور دلواریں پر بے شمار حموٹے حموٹے حوسنا سے بڑھوا دیئے۔ اب مرآں ایک چراغ بدلتا تھا تو مرض اور دلواریں پر اس کے سینکڑوں مکس بکسا اٹھتے تھے۔ عید مد سرشار ہو کر حموٹے تھے اور چودھری مہتاب دیں کی امارت اور سخاوت کو گاتے تھے۔ دیں کی طرف سے بے شمار ہو کر یہ چودھری مہتاب دیں نے ایسی دولت کا رخ دیا کہ طرف سہی موٹا شروع کیا۔ جوبلی کے بڑے حلوے میں وہ صبح و شام دربار رکھا کر بیٹھنے کے۔ شرح بانات پر سہری گولہ کاتا میاں لگاتا تھا۔ نفرتی مآوں والی زرکار سہر پر چودھری صاحب خود بیٹھتے تھے۔ آٹھ دس چوبار شام وار عشاء لیے مسعد کھڑے رہتے تھے۔ دایں مآں خوشس پوساک خادم دست بستہ حاضر رہتے تھے۔ سامنے درباریوں کی لشتیں تھیں۔ درباریوں میں قل اعوذ بے مآوں، شراد کھانے والے بیٹوں اور بھنگ کے رسیا نہنگ کالیوں کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں کو اپنے دربار کے ساتھ دالہ رکھے کے لیے مہتاب دین طرح طرح کے یا پڑھتے تھے۔ مولویوں کے لیے دو وقت بلاؤ گوشت اور مرغ پختے تھے۔ پیٹوں کے لیے ہودی کچوری، حلوے اور کھیر کا دور چلتا تھا۔ نہنگ اکالیوں کے لیے بڑے بڑے کوندوں میں بھنگ بھکوئی جانی تھی اور بالٹیاں بھر بھر کے تقسیم ہوتی تھی۔ یوں بھی گرد و نواح کے اٹھائی گیرے، رستہ گیر اور نامی گرامی چوراچکے وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے اور چودھری مہتاب دین کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم رکھتے تھے۔ اپنی نوابی کا مکمل ٹھاٹھ جانے کے لیے چودھری صاحب نے چھ فٹ کے سپاس تنومند گھوڑ سواروں کا دستہ بھرتی کیا اور اپنی سواری کے لیے ایک بوڑھا سا ہاتھی بھی کیس سے خرید لیا۔ اس ہاتھی پر چاندی کا ہودہ لگا کے وہ چکور کے گلی کو چوں میں ہوا خوری کے لیے نکلا کرتے تھے۔ مصافحات میں اپنی زمینداری کا دورہ کرنے کے لیے وہ اور ان کا حلوہ رتھوں پر سوار ہوتا تھا۔ ان رتھوں کے لیے

انہوں نے ہریانے کے جاتی و چوبندیلوں کی خوبصورت جوڑیاں پال رکھی تھیں۔ جب بلی دھنوں میں جھپٹتے تھے تو ان پر زبردست کے جھول ڈالے جاتے تھے۔ لگے میں چاندی کی تھپی تھپی گھنٹیاں لٹکی تھیں اور سنگیوں پر سونے کے خول چڑھائے جاتے تھے۔ اپنے بیلوں سے چودھری مہتاب دین کو خاص الفت تھی۔ ہر صبح وہ ال کا چارہ اپنے سامنے ڈالتے تھے۔ دن میں کئی ماراں پر چھیرا ہوتا تھا اور ہر جمعرات کو خالص گھی اور شکر میں مٹھی کی روٹی کی چوری کوٹ کر انہیں کھلائی جاتی تھی۔ رختہ کھینچنے کے بعد بیلوں کو بانی میں گلاب کا عرق ملا کر پلایا جاتا تھا۔

توں حوں دولت کی ریل پیل بڑھی گئی۔ چودھری مہتاب دین کی دلچسپیاں بھی گھوڑوں، بیلوں اور ماہیوں کی دنیا سے نکل کر ابھی جولاہنوں کے لیے نئے نئے میدان مارنے لگیں۔ طبیعت میں اقتدار کی ہوس اور دماغ پر امارت کا مہوت سوار تھا۔ ان کی سب سے عزیز ترین حواش یعنی کہ چارواگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکے بجے جس طرف سے وہ گزر جائیں لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں۔ چودھری مہتاب دین کی سواری جاری ہے۔ جو بارہ شکا صاحب کے مالک۔ راجوں کے باردار۔ مہاراجوں کی ناک کے بال چودھری مہتاب دین جن کے حاہ و بلال اور تزک و احتشام کے سامنے سارے ماتھے میں کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا، میلے آؤد کے اس جنون میں چودھری صاحب نے سب سے پہلے روپڑ کے راجہ بھوپ سنگھ کو بڑی خوشامد سے چکھو صاحب ترفیہ لٹکی دی۔ بھوپ سنگھ کو مبارک بنجیت سنگھ نے روپڑ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا۔ دریائے ستلج کے کنارے یہ ایک چھوٹا سا تہر تھا جس کی اہمیت ابتدا میں صرف اتنی تھی کہ بہاں سے جنید کشتیل اور ماتھے کے راجاڑوں پر نظر احتساب رکھنا آسان تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا دام قنار پھیلنا پھیلنا دریائے ستلج تک پہنچ گیا۔ سکھوں کی سلطنت ستلج کے دائیں کنارے تک محدود ہو کے رہ گئی۔ اس موقع پر انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ایک سرحدی شہر کی حیثیت سے روپڑ کو بڑا اہم مقام حاصل ہو گیا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں کے خلاف رنجیت سنگھ کے ساتھ اور بنجیت سنگھ کے خلاف انگریزوں کے ساتھ ساز باز کا کچھ ایسا جال بنا کہ وہ دونوں بھوپ سنگھ کو اپنا جگری دوست ماننے لگے اور سازسوں کے اس اُلجھاؤ میں بھوپ سنگھ رفتہ رفتہ روپڑ کا خود مختار حکمران سا ہو گیا۔ لاہور کا دربار اور انگریزوں کے ایجنٹ راجہ بھوپ سنگھ کو مزہ مانگی رقیں۔ پیچھے رہنے تھے۔ جنہیں وہ شراب، کباب اور عورت پرے دریغ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر کبھی یہ رقیں وصول ہونے میں تاخیر ہ جاتی تو بھوپ سنگھ کے سپاہی روپڑ کے گرد و نواح میں نکل جاتے تھے اور دن دھاڑے ڈاکے ڈال کے سونا چاندی اور نلڈ کے علاوہ گائے، بھینسوں، گھوڑوں اور جوان عورتوں کو بھی ایک ہی لاشی سے ہانک لاتے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ عرصہ سے چودھری مہتاب دین کی دن دگنی اور رات چوگنی امارت کے چرچے سن رہا تھا۔ اُسے وہ طلسمی شکا بھی دیکھنے کا شوق تھا جو سال میں کئی بار دولت کے اسرار اُگھا ہے۔ اس کے علاوہ چکھو صاحب کے مقدس گھوڑوں کی زیات بھی ایک بیانا تھی، چنانچہ جب بھوپ کو چودھری مہتاب دین کا دعوت نامہ ملا تو اس نے بسر و چشم قبول کر لیا۔ خبر سن کر چودھری صاحب کا سرو و فرشتہ سے چکرانے لگا اور انہوں نے فوراً بابا شہاب الدین کے مزار پر حاضر ہو کر دو نفل شکرا ادا کیے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی خاطر تو امن و امان استقبال کے لیے چودھری مہتاب دین نے جس پیمانے پر انتظامات شروع کیے وہ اپنی مثال

آج بچے۔ سارے کا دل کے دو دیوار ہو چکی۔ ہری صاحب نے اپنی جیب سے سبیدی پیروائی لکلی کوچوں میں حلوان بھجوا دیا۔ بچوں کو نیلے اور سبز ریشم کی دریاں سلا کے دیں۔ وہ رنگ برسی جھڈیاں لے کر بیچ شام جلوس نکالتے تھے اور لٹری لگانے کی مشق کرتے تھے۔ ہر مہینے کے بعد انھیں دو ماہ میلبی اور مونی یور کے لٹری باٹے جانے تھے۔ یا نڈوانہ کے میدان میں راجہ سوپ سنگھ کے سواروں اور ساہیوں کے لیے نیموں اور ساہیوں کی نظاروں اسناد ہو گئیں جب میں سیکڑوں منگول ہموں اور ناٹوں کا انتہام کیا گیا تھا۔ گرد بٹھالے کے لیے ہسپتال سننے سے سام جادوں طرف چھڑکاؤ کرنے سے بچے بیڑ کا دھکے ہانی میں مرقی کلاب کی بونیس بڑی فیاضی سے ملائی جاتی تھیں۔

چودھری مہتاب دین کی حویلی ۱۰۷ میں راجہ سوپ سنگھ کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہاں خانے کی دیواروں پر ابرو ڈال کر سبیدی کی کٹی بھی۔ دروازوں پر سونے اور کچھاب کے بڑے بہ طرت لٹکے ہوئے تھے اور صفا کو ہر لحاظ معطر رکھنے کے لیے کئی حارہ معطر کی بچکا۔ ہاں اٹھائے منعقد کھڑے رہتے تھے۔

راجہ سوپ سنگھ کو کھوکھلا سب میں صرف ایک دن اور ایک رات نباہ کر مانا۔ ان کی آمد سے ایک ہفتہ قبل راجہ صاحب کے ڈیوٹی افیسر صاحب استقامت کا جائزہ لینے کے لیے سر لف لائے۔ انہوں نے تقریباً ہر چیز میں کچھ۔ کچھ میں منج نکالی اور راجہ صاحب کے پیام کو آرام دہ سانے کے لیے چودھری مہتاب دین کو بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔ ایک منورہ یہ تھا کہ راجہ سوپ سنگھ کے لیے اعلیٰ درجے کی شراب کی مقدار میں موجود ہو۔ شراب کے ساتھ کتاب بھی لاری ہو، کبھی حلال گوشت نہ ہو، خالص چھکا ہو۔ شراب اور کباب کے بعد راجہ صاحب صرف سڑکا کوشت نوش نہ مانے ہیں۔ سوز جواں اور نرم ہوں اور کھانے کے بعد اگر اعلیٰ درجے کے ناچ اور گالے کی محفل پر پام ہوں چودھری صاحب کے دفن میرانی برادر صاحب کی حوسودی کی مہرست مہنا امر بھینی ہے۔

یہ دبا باسٹس کر چودھری مہتاب دین ایک لحاظ کے لیے سکے میں آگئے۔ ان کی رگوں میں بابا سہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خون کا جھنڈا تھا اس نے دم بھر کے لیے نری طرح جہش مارا، ایک دوسرے لمحے وہ سہیل کر بیٹھ گئے۔ سونے یاد ہی سے بھری ہوئی کاگردوں کا خوش آمد نصرتوں کے ہنس پر غالب آ گیا اور جہاد و جلال کی شہرت نے سرور ثقی توہمات کے تانے بانے اور جبر کر چھینک دینے چودھری صاحب نے اپنا خاص رتھ و خوش سلید مساجدوں کے ساتھ انبال کی طرف بھگا بانا کہ وہ سہارن پور کی کیتائے روڑ گا و موسبقار رہ رہ جان اور جگا دھری کی مشہور عالم زفاصر رنجن ہائی کو جس قیمت پر ہو سکے اپنے ساتھ لائیں۔ دونوں کے ساتھ تین تین ہزار روپیہ نقد، ایک ایک بڑا ڈکلویند اور دو دو تاملہ جڑوں پر معاملے ہوا، اور یا نڈوانہ کے میدان میں ان کے طائفوں کے لیے کئی ایک اور نیچے بھی نصب ہو گئے۔

شراب کے لیے چودھری صاحب نے اپنے گماشتے لدھیانہ روانہ کیے۔ وہاں پر انگریزوں کا پولیٹیکل ایجنٹ کرنل وڈ تھا۔ وہ سامی ریشہ دواہیل کے علاوہ درپردہ انگریزی شراب کا سویا رہی کیا کرتا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے آدمی اس سے پانچ ہزار روپے کے عوض اعلیٰ درجہ کی دلائی شراب کی تین حاریشیاں خرید لائے۔

مزید اور جواں سوز فراہم کر لے کے لیے چودھری صاحب کو البتہ قدرے وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے وہ چاروں

گودواروں کے آسمینوں کے پاس گئے کردہ اپنی وساطت سے منہ مانگے داموں پر چدا ایک اچھے سونے والا دی، لیکن سکہ گرتیوں اور پانچوں نے واکر دو اور گورو کے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ ہم بابا شہاب الدین کے ساتھ اپنے عہدہ مار کو نوڑنے کے روادار نہیں ہیں۔ ہر چند جو دھری مہتاب دیں نے انھیں نہیں دلا یا کہ عہد نامہ کی شکست و ریخت کا بوجھ خود ان کی اپنی گریں پر ہوگا۔ لیکن گودوارہ دھرم صاحب کے بوڑھے گھر بھی گیبانی کھڑک سکہ نے انھیں سختی سے ڈانٹ دیا۔ جو دھری مہتاب دیں۔ ہم اپنے آپ کو کس کیفیت کی مولیٰ سمجھتے ہو۔ آج مرے کل دوسرا دن کسی کو مہارا نام بھی یاد نہ رہے گا۔ لیکن بابا شہاب الدین کا دربار اور سکہ دھرم لوہیت زندہ رہے گا۔ ان کے معاہدہ کو لاٹھ لگانے والے ہم کون۔

جو دھری صاحب کا بس جلتا تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گیبانی کھڑک سکہ کا منہ نہ بچ لینے، لیکن راجہ بھوپ سنگھ کی آمد کے موقع پر سکتوں سے لڑائی تھکرائی مول لبنا مرس مسکرت نہ تھا۔ چنانچہ جو دھری مہتاب دیں توں کا کھونٹ بی کر رہ گئے اور دل ہی دل میں کڑھے اور جملہ سکہ میسر کو کالساں دینے والے لوٹ آئے۔ گھر پہنچ کر انھوں نے کوئی دس بھرجا دیوں کو جمع کیا اور انھیں لوڑے دار مندوں اور سردھار دیوں سے منج کر کے بیلے کے سگوں میں بیچ دیا کہ وہ سو مند اور چوال سال سوروں کا تھکا کر لائیں۔

خدا خدا کر کے آئندہ روز سعید بھی آئیگا، جس کے انتظار میں جو دھری مہتاب بھجاری سے گھڑیاں گین رہے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ اپنے جکی رنڈر سوار محکوم صاحب تشریف لائے۔ ان کے جلو میں ہاتھوں، اکھڑوں، نکاری کتوں اور فوجی سپاہیوں کا لاڈ لنگر تھا۔ جب یہ جلوس جھکور صاحب کی مدد میں داخل ہوا، جو دھری صاحب کے مسیوں غلام پتوں کے ٹوکے اٹھائے دور دیکھ کر مہرے۔ جہاں جہاں سے ونا غلہ گزرنا تھا۔ یہ لوگ گلاب جینیلی اور گنبد سے کے پھول رنڈ کے راستے میں پھاتے جاتے تھے بھوٹے نیچے رنگ برنگی جھبڑیاں لہرائے تھے اور گلی گلی میں باوردی جھبڑ سکتوں کے منہ زانے سجا سجا کر سلامی دیتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ نے پہلے چاروں گودواروں کی زیارت کی۔ پھر وہ بابا صاحب کے مراد پر حاضر ہوئے اور اس کے بعد انھوں نے چار بارہ ٹھکا صاحب جا کر اس طلبہائی کے کو تعظیم دی، جس کے بطن سے سونا چاندی بڑی افراط سے پیدا ہونا تھا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے نیلے رولفت کا سر پوش اٹھا کر ٹھکے کے اندر لپکائی ہوئی نظروں سے اندر جھانکا تو آج خاص طور پر سونے چاندی کے سکوٹ اور زبورات صلاب ہوا تھا۔ جو دھری مہتاب دیں نے لپک کر ٹھکا انڈیل دیا اور راجہ بھوپ سنگھ کے قدموں میں یہ رتیل بنا لگا کر بڑی لجاجت سے عرض کیا: ”حضور فقیر کا یہ جھرنڈ رانہ قبول ہو۔“

راجہ بھوپ سنگھ کے خاص مصاحبوں نے یہ سارا اناج بیٹ کر بڑے بڑے مڑوالوں میں باندھ لیا۔ راجہ صاحب نے اظہار خوشنودی کے لیے ٹھکا صاحب کو دوبارہ تعظیم دی۔

انگریزی سراب کی بوتلیں راجہ بھوپ سنگھ کو خاص طور پر پسند آئیں۔ سر شام پاؤ دار کے میدان میں بڑے بڑے سوروں کی کھالیں اترنے لگیں اور رات گئے جب زہرہ جان اور ترنجن بابی کے ملائے، انا پنا ساز و سامان سجا کر محفل میں جم گئے تو یکایک چکور کے منہ پر مسلمان اور سکہ بڑے بوڑھے اپنے گھروں کی گڈیاں چڑھا کر اندر دیک کر بیٹھ گئے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں آج پہلی مرتبہ چکور کی سرزمین پر سورو کا گوشت کا ملا گیا تھا۔ آج تک اس قصبہ کی فضا زہرہ جان کے طبلے کی تھاپ اور ترنجن بابی کے گھنگھروں کی جنبکار

سے نا آسانی۔ رات کے بڑھتے ہوئے میں سب ال ساروں کی آواز فضا میں زور و زور تک پہنچتی تھی، لگاتار والوں کے دل دھک دھک کرے لگتے تھے جو سن مفیدہ عورتیں جو جمعرات کو بابا صاحب کے مرار پر دیا جانے جاتی تھیں یہ ہم سہم کو کوٹوں کی منڈیر سے لگی مٹی میں۔ طوفان زور اندھری راتوں میں دوا خنب کو ٹھوں پر چڑھ جڑھ کر ان مقدس چراغوں سے اپنی مرادیں مانگا کرتی تھیں جو بابا صاحب کے فغض سے یا نڈوا کے مبدان۔ روتی نوا کرنے سے آج اسی مبدان میں رنگ و بو کا ایک سیلاب سا آبا ہوا تھا۔ قدیوں اور مٹیوں کی مٹی، مانتہ نظر ٹھکا رہی تھی لیکن سراب میں بدست فوجوں کی ہر ہنگام کے ساتھ گاؤں والیوں کے دل لرزے کئے تھے کئی زبردستی ان کی باہیں بکھر کر بھجے رہا ہو۔ بے زبان گزاریاں جو سپینوں کی ماراٹ لے کر بابا صاحب کے مزار پر پہنچے مائل اور سو کی مٹا ہواں ہر جہ کے تھا در کیا کرنی تھیں، ٹوں حیران پریشان تھیں، جیسے بھرے ہوئے حورا ہے پر ان کا ٹھہاگ ٹٹ رہا ہو۔ سارا کا دل کٹی ہوئی تنگ کی طرح، انسانی مساؤں میں ڈھلکا رہا تھا۔ روایات کی ڈور کٹ گئی تھی، سبات کا بیج کٹ گیا تھا، سکوں کی دولٹ لٹ گئی تھی، مصفت کی روسی نارنج کے لے نور ساغوں میں ڈھل ڈھل کر مہیل کے لیے ایک بے جس، بے جان اور بے رنگ بیت کا رُوب دھار رہی تھی۔ صدیوں کے سکوت کو مٹا ایک رات کے سورنے سکھ لیا تھا۔ ایک بھیکا سا انقلاب، ایک بد مرہ سالانہ ماروں طوفان مدرو کے کنارے مانی کی طرح ابل رہا سا۔ شاید یہ وہ لمحہ تھا جب دم کا سربا ہوا بادشاہ بیداری کی کردٹ لبتا ہے یا جب دمن کا جاگٹا ہوا پاسبان اُدھنے گنا ہے۔ مات و مہ کا نہیں، دمن کی مصعب کا لیے دام غلام ارضی شطرنج پر سما دی پانہ پینکھ کی گوسس ما سہا بہ کرتا ہے۔ جیسا جیسا آہستہ گنا۔ ت مانا جاتی ہے۔

دوسری صبح نور کے ٹکے حب راجہ بھوپ سنگھ اور اُس کا لاؤشکر جمع ہو کر جیلا گیا نو چکو صاحب کی صورت کچھ یوں نکل آئی، جیسے ہزاروں گھڑوں نے کسی خوب صورت قبرستان کو یادوں تلے روند ڈالا ہو۔ نکلے ہارے کا رندے اور خادم جہاں جگہ بڑا کر سگئے۔ اندر بولی میں چودھری مہتاب دی بھی ایک تحت یونس بریلے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ابھڑھاس صاحب ان کا سر اور پاؤں دبار سے تھے۔ کئی روز کے لیے سب جگہ لے آئیں جو کر دیا تھا۔ ٹوں بھی کل رات سے دو کی زیادہ ہی کس مند تھے۔ رمن و ننگی محفل میں راجہ محبوب سنگھ لے آئیں کئی مار سرب یعنی کی دعوت دی تھی، لیکن چودھری صاحب ہر بار عرض سلینہ جیلوں بہانوں سے ٹالتے گئے۔ انجام کار جب راجہ صاحب خود لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور سرب کا جام بے نفس نفیس اُن کے ہوشوں سے لگا کر کھڑے ہو گئے تو چودھری مہتاب دی کی مروت انکار کی تاب نہ لاسکی۔ دوسرا جام اُنھوں نے زہرہ جان کے ہاتھ سے پیا۔ تیسرا نرخیں بائی سے تلین بادہ گساری کے اس دور نے چودھری مہتاب دی کے دل و دماغ میں ایسے ایسے نرخیں قفسے روکن کر دیے جن کی تعبلیوں سے وہ آج تک روشن نہ ہوئے تھے۔ بولی کے درو دیوار ایک خوبصورت غنار میں ڈوب گئے۔ زہرہ جان کے گلے سے آواز کی جگہ مہتابیاں سی چھوٹنے لگیں۔ نرخیں بائی کے تھرکتے ہوئے تن بدن میں سونے اور چاندی کے تار لہلہانے لگے۔ رنگ و نور کے اس سیلاب میں چودھری مہتاب دی غبار سے کی طرح اڑ رہے تھے۔ لیکن جب صبح ہوئی تو ٹوٹا ہوا شمار چودھری صاحب کے رگ دپے میں ٹیس مارنے لگا۔ وہ لپے تخت پر پڑا پراوند سے پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ اس عالم میں سردار نو بہال سنگھ نے انھیں ایک فرزدہ جانفزا سنایا۔ سردار نو بہال سنگھ چوہا ملک صاحب کی سیوا پر مامور تھے اور اس روحانی کا دبار میں چودھری مہتاب دی کے دست راست تھے۔

سردار نونہال سنگھ نے چودھری صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”چودھری اٹھو۔ اس طرح حاملہ عورت کی طرح پڑے پڑے کتب تک اہتے رہو گے۔“

چودھری صاحب اپنا ڈکھنا ہوا بدن سنبھال کر تخت پر اکرٹوں بیٹھ گئے۔

”چودھری کو بالو سے کوکاٹا ہے۔“ سردار نونہال سنگھ نے کہا۔ ”شراب کا کسل بھی تراب ہی سے جائے گا۔“

سردار نونہال سنگھ کے اصرار پر چودھری مہتاب دین نے تراب کے ایک دو گھنٹہ بیٹے نواں کے کیلے مہ کا ذائقہ بدل گیا۔ زبان برزاد آگئی۔ گلا کھل گیا اور جسم کے دکھتے ہونے جڑوں میں ارمیر نو نشا ط خود کر آیا۔ زندگی کے کیفیت کا یہ تیر بہیت لٹخو چودھری صاحب کو بھید پسند آیا۔ انگریزی تراب کی کچی کچی بولیں جو ٹوکر ابھر کر باہر پھینکوائی جا رہی تھیں، انہوں نے واپس منگو الیس اور لینے دہان خانے کی الماری میں کھ کر خبیاط سے نالا لگا دیا۔

شام کے دغ حسب چودھری مہتاب دین ہانچی پر بیٹھ کر حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے تو انہیں اپنے گاؤں کا ماحول کچھ برابیر ایسا سا لگا، جیسے بھوٹے بچے جو گلکاریاں مار مار کر ہانچی کی سونڈ سے لٹک جانے لگتے اور ہانچی انہیں اٹھا اٹھا کر چودھری مہتاب دین کی گود میں ڈال دیتا تھا آج کہیں نظر آئے۔ وہ نو نیر اور تیریر لڑکیاں بھی غائب تھیں جو چودھری کا راستہ روک کر چاندی کے گھنگنوں اور سونے کی بالیوں کی فرمائیں کیا کرتی تھیں۔ آج کسی نے سیرا اس کے ساتھ ہکا بھکا مذاق نہ کیا۔ وہ سارا گاؤں گھوم آیا، لیکن کسی کو ٹپے کی خدمت سے مومائوں کی آواز نہ آئی کہ ”اد بابا صاحب کے خوش بخت وارث۔ خداتجہ سدا ہی سکھی رکھے۔“ اس بے کیفیت سیر کے بعد جب چودھری صاحب کھر آئے تو محبوب اور منرمندہ سے تھے۔ لیکن سردار نونہال سنگھ نے تراب کی بوتل کھول کر ان کے سامنے رکھ دی۔ دتین یگیب کی چودھری صاحب بھر جبک اٹھے۔ جھوڑ کی سنان گھیاں جادو کے زور سے پھر آباد ہو گئیں۔ خاموش کوٹھوں پر خوبصورت پرلوں کے بھیر مٹ ناچنے لگے۔ آسمان پر دوس قریح چھا گئی

راجہ بھوپ سنگھ نے خوش ہو کر چودھری مہتاب دین کو اپنے ہاتھ سے دو خط لکھ کر دیئے تھے۔ ایک پروانہ لاٹو ولیم شنگ کی طرف تھا جو حکومت میں لکھ مظفر کے نام پر ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل تھے۔ اس خط میں راجہ بھوپ سنگھ نے چودھری مہتاب دین کو ”فرزند دلپذیر حکومت انگلشیہ و فاشا رقیعہ یہ ہند اور شہر سلطنت و معاون دولتِ برطانیہ“ کے خطابات سے نوازا تھا اور لاٹو ولیم شنگ کی خدمت میں بڑے وقوق سے یہ تصدین کی تھی کہ بھوپ سنگھ کے بعد سلج کے اس پار انگریزوں کا سب سے بڑا ہی خواہ چودھری مہتاب دین ہی ہے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی دوسری سند مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام تھی۔ اس میں چودھری مہتاب دین کو سکھ مینجہ کی آنکھ کا تارا اور خالصہ حکومت کا راج دلا راثا بت کر کے برسرِ شفیکیٹ دبا کہ سلج کے اس پار راجہ بھوپ سنگھ لاہور دربار کی نوا اور چودھری مہتاب دین مہاراجہ اہیرا ج کی ڈھال ہے۔ سرکاری اکال پورکھ نے ان دو دغا دار سپوزوں کو پیدا کر کے خالصہ دربار کو سلج پار کی سرحد سے بالکل بے فکر کر دیا ہے۔ راجہ بھوپ سنگھ و انگریزوں کا خالصہ اور چودھری مہتاب دین و انگریزوں کی فتح ہے۔

چودھری صاحب نے ان نایاب پروانوں کے لیے رلیم اور کنواں کی تہہ ورتہ تحلیلیاں سلوائیں۔ دن میں کئی بار وہ ان تحلیلیوں

کو نہ نہیں کے راجہ اسل کے ٹہریں کی طرح سہلانے مجھے کیسی مٹھیا تے مٹھے مٹھیا نہ ایک ایسی صفت ہے جس کو سمجھنے اور بانے کے لیے یا تو مہر
 مہا چاہیے یا بھڑا۔ باز اگرچہ پردہ ہے لیکن ماری پردہ ہے۔ درمہ ہے۔ سب کچھ وہ ہے جو میں سوچا چاہیے۔ رات کے وقت
 مسک لہ کر وہاں مسکایں کو ٹھے اسہام سے کھڑے اور دونوں طول کو انتہائی ادب و احترام کے ساتھ سرانکھوں سے لگاتے اور
 جھوم جھوم کر بار بار پڑھے۔ مادائی کا مد کے بہ پڑے چو دھری صاحب کے ذہن میں حل بریل کی طرح مانجئے اوراں کا ایک ایک
 حرف الہامی بیوا کی طرن ال کی روح کے سے ریچر اردوں میں رنگ برنگ ترشح کرتا۔ لاہور اور کلکتہ کے سیاہی و رباروں کا تھور ان کے
 دل و دماغ میں جھلپٹا ہوا سی بیوا نا اور خیالوں کے اس گلی و کلز اربن جھکڑ کی لمبی ٹیسی دسل اور بے معنی نظر آتی۔ یہاں کے لوگ طوطا جہنم
 تھے۔ وہ دھری مہتاب دیں سے کسی کرا کر گر جانے تھے۔ اہوں نے کسی کو خصل نہ کیا تھا کسی کے ہاں ڈاکر نہ ڈالا تھا، کسی عورت کی آبرو
 نہ لٹی تھی اس کے سرس انھوں نے تو اس کا دن کا سر طر کر دیا تھا۔ چو دھری مہتاب دیں کے طفل آں دور دور تک چھوڑ کا ڈسکا بچتا تھا۔
 لکین یہاں کے کہنے لوگ ابھی فلمت کے اس احساس سے بے بہرہ تھے۔ دن بدن مغارب کی ایک ٹھوس دلواد سو دھری صاحب
 کے کرا کر اگرو اٹھی جلی گئی اور رنہ رنہ وہ ایک کورسی کی طرن سے لٹ کر ایک بھٹک ٹھے رہ گئے۔ حج کی سبر بند ہوئی رنہ کو اٹھنی
 کی سوار جی مروف ہوئی۔ دن بھر وہ اپنی حلی میں بد رہتے تھے ماکر کادوں والوں سے ٹٹہ جہنم جو جو کچھ ہی مسہ دوسری طرف پھیر
 لینے تھے ماحول کی اس مائل کر رہنے والی سکاخی سے لہر کر جو دھری مہتاب دیں نے رنہ سفر بادہ صا اور ایک ہنسی نین رنہ جاس
 یاد دی سوا اور مہاوں کی جمعیت لے کر اہوں لے کھڑے کا رخ کیا۔

جب چو دھری مہتاب دیں کی سوارن عمار ہوئی تو کو طاطا حلق کا ٹیو ہا کاؤں سے باہر نکل گیا لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے
 کو مبارک باد دی۔ محوں لے اور نو حلی کے وسیع میدان میں کلی ٹٹہ اکھبنا شروع کر دیا اور حواں لڑکیوں نے حسب معمول کوٹھوں پر
 منہ کر بابا صاحب کے دھنے کا ماحروع کر دئے۔ بابا مہتاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اسے وطن کی خوشیزاؤں سے خاص اس تھا جو
 لڑکی مضرب مندی سے بابا صاحب کے دو تھے کافی سخی اس کا داکس مراد پھیلوں سے کھار ہو جاتا تھا۔ جہاں چھوڑ صاحب کی مائیں بڑی
 توجہ سے ایسی شبوں کو بابا صاحب کے دے حفظ کرا با کرنی تھیں۔ یہ دو تھے بابا سہا الدین نے عسری الہی کی یاد میں جل جل کر نصیف
 کیے تھے اوراں کا ایک ایک لفظ دیکھنے انکاروں کی مانند تھا۔ لیکن جب یہ دو تھے شریلی کنواریوں کے ہونٹوں پر لرزتے تھے تو
 بھی انکار سے امانوں کی مسک جادنی اور سپینوں کے مہانے آلبنا رہ جالے تھے معرف کے راجب حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے تھے
 تو بابا سہا الدین کے دھوں میں لوجر کنواریوں کے آرزو انجمن سینے سی ڈھنوں کے منلاطم دلو لے اور منظر سہا گزن کی اس
 محب انداز سے بھکتی تھی۔

اد میرے یار میں لے ابھی مک نیرے باغ میں مذم نہیں رکھا
 مجھے کیا معلوم نیرے نبول پیے میں یا شریخ میں یا سجدہ میں
 جویرا رنگ ہے وہی میرا رنگ ہے۔
 اپنے باغ کا دیکھ ذرا سا نو کھول

اگر میرا مذم طے تو میں اپنے یاؤں کاٹ ڈالوں
میں تو اپنے یار کے باغ میں آنکھوں کے بل جاؤں گی۔

اومیرے یار برے داس کو میں نے کبھی نہیں جھوٹا
تیرا داس بادلوں سے برے سناروں سے اونچا ہے
میں بیماری تو کبھی تیرے خیال کے داس کو بھی نہیں ٹھوسکی
تیرا خیال نچھ سے بھی زیادہ تاناک ہے
کونکہ میں اس کو خود اپنے ہاتھوں سے سماتی ہوں

میرے یار رات کی نلوت میں مے تھجھ کو لمحو بھر کے لیے آخر پاسی لیا
اب مری سہلباں مجھے طلعہ دیتی ہیں کہ بہ محض خواب تھا۔
بلو خواب ہی سہی اومیرے یار
ایسے خواب پر ہزاروں بیداریاں مٹا رہاں
اے حقیقت — رات کی ننہائی میں ایک بار بھر لے حنفت بن کر آجا
میں تو اسی انتظار میں جڑی سوئی ہوں۔

اومیرے یار میں بھی تو تیرے بہت کام آتی ہوں
دیکھ میں نے تیرے رخ پر اپنے نعتور کا حجاب ڈال رکھا ہے
اگر میں اپنے نعتور کی آنکھ ذرا اسی بند کر لوں
نوساری دہنا تجھے بے نقاب دیکھ لے گی۔

اومیرے یار نوا بد ہے نوارل ہے۔
تو آمد ہے تو صمد ہے
سکر کر کہ تو میری گلی کا الیلا جان نہیں
دورنہ میں تجھے سناتی، خوب تر ساتی
لیکن یہ ستانا اور ترسانا مجھ بٹ موٹ کا ہونا

یہ تو محسوس ہی آزمائش ہوتی
درہ سج تو یہ ہے کہیں سارا سارا دل اپنے دروازے کی اوٹ سے تجھے ہانکا کرتی ۔

او میرے یار تو عزت ہے تو حفیظ ہے
تو حکیم ہے تو علیم ہے
شکوہ کر کہ تو مہرے سینے کا ارمان نہیں
ورنہ اگر میرا سیدہ پھٹ جاتا عمر بھی تو نکل نہ سکتا

او میرے یار تو دہاب ہے تو ستار ہے
تو زآب ہے تو خفا ہے
شکوہ کر کہ ہمارے کعب کا رکھا نہیں
ورنہ ہر روز میں تجھے چوری حوری طے آیا کرتی
تو رکھوالی کر ہی نہ سکتا ۔
سارے کھیت کو چڑھاں ٹپک حامیں

او میرے یار تو مہر ہے تو مفسود ہے
تو موجود ہے تو مستور ہے
تو سب کچھ ہے
لیکن شکوہ کر تو میں نہیں
ورنہ نہ جانے میرا کیا حال ہوتا

(نادل کا ایک باب)

قدرت اللہ شہاب

اللہ کا 007

ممتاز مفتی

قدرت اللہ شہاب اور میں نے زندگی کے ۲۸ سال اکٹھے گزارے اس کے باوجود ہم دوست نہیں تھے قدرت ایک باکدار فرد تھا۔ اس کے قول اور فعل میں ربط تھا۔ میں اس ربط سے محروم تھا قدرت اور میں ساتھی بھی نہیں تھے۔ چونکہ ہمارے مشاغل مختلف ہونے لگے تھے۔ ہمارا تعلق عریض تعلق تھا۔ دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی وہ پاکیزہ تھا میں چکٹ میلا۔ وہ ٹھنڈا تھا میں سگنا جلتا۔ وہ گونگتا میں باتونی۔ وہ کر دکھانے کا رسیا تھا۔ میں منہ زبانی۔ اس کا مسلک ایک تھا۔ ایک راستہ تھا۔ ایک منزل تھی میں آوارہ تھا۔

میری دلالت میں افراد کے درمیان کوئی تعلق پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک دونوں میں قطعی برابری کا احساس نہ ہو۔ بڑا چھوٹا نہ ہو ہم دونوں میں کسی لحاظ سے برابری نہ تھی رتبے کے لحاظ سے وہ بڑا تھا انسانیت کے لحاظ سے بہت بڑا تھا میں بہت چھوٹا تھا میرے اہل قدرت کے درمیان احترام کی ایک یو آر جیل تھی۔ احترام کو میں تعلق کی نفی سمجھتا ہوں چونکہ احترام قریب آنے نہیں دیتا۔

میرے مشاغل ممنوعات پر مبنی تھے وہ صراطِ مستقیم تھا اس لئے وہ میرے مشاغل نہیں اپنا سکتا تھا وہ راستہ جس پر قدرت کا منزل تھا بہت کٹھن تھا مجھ سے آرام طلب کے میں کی بات نہ تھی۔ اس راستے پر چلنے میں ٹوٹ لازم تھی۔

آپ قدرت کی۔ ۱۹۶۰ کی تصویر دیکھیں پھر ۱۹۸۶ کی تصویر ملاحظہ کریں ان دونوں میں صرف عمر سیبگی کا فرق نہیں ہے ۱۹۶۰ میں وہ ایک ثابت اور قائم فرد تھا ۱۹۸۶ میں ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا۔ یہ ٹوٹ ناکامی کی نہیں تھی بلکہ آزمائش میں ثابت قدمی کی ٹوٹ تھی اس کے بعد میں منزل کی بھیج تھی۔ میں سوکھا کاٹھ تھا ۲۸ سال دریا بہتا رہا۔ اور میں کنارے پر سوکھا بیٹھا رہا۔ ۲۸ سال روتا دھری، خدمت اور عیالت کی دیکھتے رہی میں اس دیکھ میں سے کوکڑو کی طرح اشیائے بے ہنگام بن گیا۔

مشفق خواجہ نے اپنے ایک مضمون میں کیلپتے کی بات کی ہے کہتے ہیں: قدرت اللہ شہاب مرحوم میں بے شمار خوبیاں تھیں عیوب صرف دو تھے اشتقاق احمد اور ممتاز مفتی۔

مشفق خواجہ کی بات بالکل درست ہے سوال یہ ہے کہ قدرت نے یہ عیوب کیوں پائے۔ اشتقاق احمد کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ممتاز مفتی کو پائے کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔

ایک یہ کہ قدرت ذات کا دھوبی تھا۔ راہ چلتے چلتے اسے ایک چکٹ میلا کپڑا نظر آیا اس نے اُسے اٹھا لیا۔ اور پھر زندگی بھر اٹھا لینے کی کاج پاتا رہا۔ ۲۸ سال صابون اور میل کے درمیان جنگ جاری رہی آخر صابون جھاگ جھاگ ہو کر رہ گیا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہر بزرگ کے ساتھ آزمائش کا ایک کاشا لگا ہوتا ہے ممتاز مفتی وہ کاشا تھا۔

بنیادی طور پر قدرت اللہ اشتقاق احمد کا دوست تھا۔

جیسا اشفاق احمد روم میں پرفیسری کے عہدے پر فائز تھا ان دنوں قدرت سرکاری دوسرے پر روم گیا۔ وہاں اتفاقاً اشفاق احمد سے ملاقات ہو گئی اشفاق نے کہا یہ کیا ہوٹل بازی میں پھنسا ہوا ہے تو چل میں تجھے گھر لے جاؤں۔ میں گوجروں کے محلے میں رہتا ہوں وہاں دودھ ڈبل روٹی کھائیں گے اور کٹر کتہ باتیں کریں گے ان دنوں قدرت ایڈووکیٹ کا رسایا تھا اور باتیں سننے کا تو وہ ہمیشہ ہی شوقین رہا بوقتِ نشہ اشفاق کی زمین باتوں کے جال میں پھنس گیا۔

اس زمانے میں میں راولپنڈی کے ایک انفیمٹن ہسپتال میں ملازم تھا۔ بڑے صاحبِ شہدائ بن گئی۔ انہوں نے مجھ پر دیکھ کر رکھے تھے ایک فرزند کا دوسرا سیوریائی کا۔ انھوں نے ہو رہی تھی اشفاق کہنے لگا یا مراد ایک دوست ہے جو بڑے عہدے پر فائز ہے اسے کہوں کہ تیری سفارش کسے میں نے کہا کہ اسے سفارش نہ کرنا کہہ دیتا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک روز وزارت کے سیکرٹری اظفر نے مجھے طلب کر لیا۔

اظفر نے پوچھا کیا آپ قدرت اللہ شہاب کو جانتے ہیں؟

میں نے کہا جی نام سنا ہے۔

انہوں نے کہا کبھی ان سے ملاقات بھی ہوئی ہے کب؟

میں نے کہا جی کبھی نہیں۔

اظفر نے میری دراز سے ایک خط نکالا بولا مفتی صاحب قدرت اللہ شہاب کا یہ خط مجھے آج ہی موصول ہوا ہے اس خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ مفتی میرے عزیز دوست ہیں ان کا خیال رکھئے اور دیکھئے اب کہتے ہیں آپ قدرت اللہ شہاب کو جانتے ہی نہیں۔

میں نے کہا جناب یہ آپ ان سے پوچھئے کہ وہ مجھے دوست کیوں سمجھتے ہیں میں نے تو آپ سے سچی بات کہہ دی ہے۔

تب سے عہدے کے باوجود اظفر ایک شریف النفس اور دیانت دار آدمی تھا وہ یہ بات سن کر شگوا کرتا تھا کہ گمال غالب ہے کہ اظفر نے قدرت کو فون پر سنائی ہوں گی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد اشفاق نے مجھے خط لکھا کہ قدرت اللہ شہاب پٹنڈی آرہے ہیں ان سے ملو۔ انہوں نے تہااری سفارش بھی

کی تھی، میں نے جواب میں لکھا کہ اگر اس نے سفارش کی تھی تو تیرے کہنے پر کی تھی مجھے تہاار شکر یہ یاد کرنا چاہیے اس کا نہیں دوسرے یہ کہ اس

کی سفارش کا کوئی ثبوت نہیں نکلا پھر شکریہ کیا۔ تب سے یہ کہ میں کسی جیسے آدمی سے میں حول رکھنا نہیں چاہتا اشفاق نے یہ خط قدرت کو بھیج دیا۔

قدرت ان دنوں کراچی میں مقیم تھا۔

اس کے بعد انکو انری افسر کی سفارش پر میرا تبادلو کراچی ہو گیا۔

اشفاق کراچی آیا تو وہ مجھے زبردستی قدرت کے گھر لے گیا جب اشفاق لاہور واپس جانے لگا تو اس نے مجھے بہت بھجایا کہنے

لگا شہاب سے ملے رہا وہ بڑا اچھا آدمی ہے میں نے کہا یاد دنیا میں بیسیوں اچھے آدمی ہیں اب میں کس کس سے ملتا رہوں کیوں مجھے خوار کرتا ہے۔

پھر ایک دن دفتر میں قدرت کا فون آگیا کہنے لگا مفتی صاحب مجھے چند کتابیں خریدنی ہیں اگر آپ کو فرصت ہو تو براہ کرم میرے

ساتھ چلئے میری مدد کیجئے۔ آپ دفتر سے باہر دروازے پر کھڑے ہو جائیں، میں ابھی پہنچتا ہوں۔

اس کے بعد ہر چند دنوں کے بعد قدرت کا فون آجانا۔ فلاں کام ہے اگر آپ کو فرصت ہو تو میرے ساتھ چلے یوں قدرت اور میں ملنے لگے۔ ان دنوں ابن اثار احمد بشیر اور میں ہم تینوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے حفیظ جانہ ہری دفتر کا سربراہ تھا۔ انہی دنوں میری پے فلکیشن کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ۱۹۵۱ء میں فیکٹرل بیلک سروس کمشن نے مجھے ایک آدمی پر غائر کیا تھا مگر میری پے فلکیشن نہیں ہوئی تھی۔

قدرت نے اس مسئلے میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ حالات کو جاننے کے لیے وہ اکثر مجھے اپنے دفتر میں بلا لیتا تھا۔ میری پے فلکیشن کے لیے اس نے جگہ جگہ میری سفارشات کیں قدرت سفارش کرنے کے فن سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ جب وہ سفارش کر رہا ہوتا تو صاف نظر آتا کہ وہ اذیت سے گزر رہا ہے زبان نہ کھڑاتی، آواز مدھم ٹر جاتی پسینہ چھوٹ جاتا اس کے باوجود وہ میرے کہے بغیر میری سفارشات کو نہ رہا۔ اگرچہ مجھے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ وہ اپنے سے چھوٹے افسروں کی کیوں منتیں کرتا ہے لیکن میرے دل میں تکر گزاری کے جذبات بیدار ہو گئے اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیسا آدمی ہے افسر ایسے تو نہیں ہوتے۔ انہی دنوں پاکستان کا دارالخلافہ پٹنڈی منتقل ہو گیا۔ قدرت اللہ پٹنڈی چلا گیا اور میں کراچی میں اکیلا رہ گیا۔ پھر ایک دن اطلاعات کے وزیر سارے دفتر میں آ گئے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ فوراً راولپنڈی جاؤ اور پریذیڈنٹ ہاؤس میں پورٹ کرو۔ پریذیڈنٹ ہاؤس میں گیا تو قدرت اللہ شہاب نے حکم دیا کہ اپنی جاننگ رپورٹ دے دیکھئے آج سے آپ ہمارے او۔ اس ڈی ہیں یوں میں قدرت اللہ شہاب کا ماتحت بن گیا اور مجھے اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔

مجھ سے قدرت کا برتاؤ عجیب تھا ہر بات پر وہ مجھ سے کہتا اگر آپ کو فرصت ہو تو۔ اگر آپ پسند کریں تو... اگر آپ کو ناکوار نہ ہو تو اس کا برتاؤ مجھ سے ایسا تھا کہ ایسے لگتا جیسے میں نہیں بلکہ وہ میرا ماتحت ہو، صرف مجھ سے ہی نہیں، دفتر کے چھوٹے سٹاف سے اس کا برتاؤ ایسا ہی تھا۔ لوگ باری باری اس کے پاس ذاتی مسائل لے کر آتے اور وہ آڈٹ آف دی وے جا کر ان کی مدد کرنا ایک روز قدرت مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ کہنے لگا مفتی صاحب آپ کی تنخواہ کے کاغذات بڑی دیر کے بعد کراچی سے پہنچی آئیں گے پھر آپ کی تنخواہ پر نظر ثانی ہوگی۔ پانچ چھ ماہ تنخواہ مہینے ملے گی۔ قدرت نے لوہے کی ایک الماری کھولی اس میں نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے کہنے لگا جب بھی آپ کو ضرورت پڑے حسب ضرورت اس الماری سے روپیہ نکال لیجیے اور نیت یہ کیجیے کہ جب بھی تنخواہ ملے گی روپیہ ادا کر دوں گا۔ یہیں رکھ دوں گا اس پر مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ کیسا افسر ہے جو سرکاری خزانہ یوں اٹھا رہا ہے میں چاہے جتنا اٹھاؤں واپس رکھوں نہ رکھوں۔

ابتدائی ایام میں مجھے قدرت اللہ کے متعلق چار ایک باتوں کا پتا چلا پہلی بات یہ تھی کہ وہ دفتری انگریزی نہیں بلکہ ادبی انگریزی لکھتا تھا۔ دفتر میں اس کے کھے ہوئے نوٹس کا بڑا چرچا تھا لوگ بڑے اشتیاق سے اس کے نوٹس پڑھا کرتے تھے جو بڑے مختصر اور جامع ہوتے تھے۔ اپنے نوٹس میں اسے ان کہی بات سمجھانے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ بات سمجھنے میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ آپ ابھی تمہید باندھ رہے ہوتے کہ وہ بات کا سبب بتا کر سمجھ جاتا تھا۔

میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ جتنی دیر میں ایک ٹائپ شدہ صفحہ پڑھتا تھا وہ چار صفحے پڑھ لیتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے پوچھا کیا آپ پورا صفحہ پڑھتے ہیں یا عیدیت کو نگاہ سے ٹٹول بیٹے ہیں اس نے جواب دیا پورا صفحہ پڑھتا ہوں میں نے جلدی پڑھنے کی مشق کی ہوئی ہے۔ تیسری بات یہ تھی کہ اسے دفتری سازشوں کو نظر انداز کرنے کا انوکھا گڑھا تھا۔ صدر کے دفتر میں ڈیوٹنٹ تھے۔ دوسرے یونٹ کا سربراہ قدرت اللہ کا مخالف تھا وہ قدرت اللہ کے ہر کام میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ اور اس کی ہر تجویز کی کاٹ کرتا تھا۔ اس کی مخالفت ڈھکی چھپی نہیں رہی بلکہ علانیہ ہوتی تھی قدرت اللہ اس کی مخالفت کو ہر طرح "انگور" کرتا تھا۔

قدرت اللہ کے یونٹ کے افسر شکایت کرتے تو وہ بڑی جالا کی سے بات مال دیتا یہ رویہ دفتری روش سے ہٹ کر تھا قدرت اللہ کاٹاف اس بات پر ناخوش تھا مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسا افسر ہے جو دفتری سیاست میں التزاماً دلچسپی نہیں لیتا ایک روز دفتر میں کراچی کا ایک سیٹھ آگیا۔ قدرت نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میرے دوست ممتاز مفتی ہیں سیٹھ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا دیکھو مفتی ہم تمہیں متورہ دیتا ہے کہ اس شخص کو اس نے تہاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہرگز دوست نہ بنانا۔ یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اسے دوست بنایا جائے میں چیرانی سے قدرت کی طرف دیکھ رہا تھا وہ چپ چاپ بیٹھتا تھا ہونٹوں پر لمبی سی مسکراہٹ تھی۔ سیٹھ بولے۔ دیکھو مفتی ہم نے اس سے اچھا تعلق بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ہماری یس میں رپورٹ کر دی

قدرت چپ چاپ بیٹھا رہا۔

سیٹھ بولا۔ ہمارا ایک دستہ رہے کہ ہم افسروں کو عیدی بھیجتے ہیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ کوئی کام کرنے کو نہیں بولتے نہ جائز نہ ناجائز۔ صرف عیدی بھیجتے ہیں۔ جب یہ نیا نیا کراچی آیا تو ہم نے دوسرے افسروں کے ساتھ اسے بھی عیدی بھیجی۔ شہاب نے کہا مفتی صاحب عید کا چاند دیکھنے کے بعد میں سر کرنے کے لیے باہر چلا گیا واپس گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بڑا کمر ڈھکا

کے ٹوکروں سے بھرا ہوا ہے اور دوسرے کمرے میں کپڑے کے تھانوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ سیٹھ بولا۔ اس نے ہمیں فون کیا۔ بولا سیٹھ اپنی عیدی ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں سے اٹھوالیں ورنہ میں پولیس کو اطلاع کر دوں گا ہم نے اسے بہت سمجھایا کہ یہ رشوت نہیں ہے ہم تم سے کوئی کام نہیں کروائیں گے۔ ہماری عیدی واپس نہ کرو۔ لیکن شخص نہ مانا۔

شہاب مسکرا رہا تھا

سیٹھ بولا، بھئی اس کی مسکراہٹ کو نہ سمجھو۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اس شخص پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ صدر ایوب کے ساتھ شہاب کا رویہ عجیب تھا۔ چڑا اسی نے ہر قدرت سے کہا لاٹ صاحب نے سلام دیا ہے۔ صدر گھر کے چڑا اسی صدر کو لاٹ صاحب کہا کرتے تھے۔ برطانوی راج کی یہ روایت ابھی تک چل رہی تھی شہاب اچھا کہہ کر پھر سے کام میں مصروف ہو جاتا۔

پانچ منٹ کے بعد چڑا اسی پھر آتا۔ لاٹ صاحب نے سلام دیا ہے۔ اچھا کہہ کر قدرت پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ میں نے علیحدگی میں چڑا اسی سے پوچھا وہ ہمیں معلوم ہے کہ لاٹ صاحب کے میسرے بلا دے پر صاحب حاضری دیتا ہے۔

پہلے دوسرے پر نہیں اس لیے ہم باہر سٹولی پر بیٹھ جاتے ہیں پانچ منٹ کے بعد بلاوے کو از خود دہرا دیتے ہیں۔ ایک روز میں نے قدرت سے پوچھا کہ آپ صدمہ کئے تیسرے بلاوے پر کیوں جاتے ہیں پہلے پر کیوں نہیں جاتے قدرت بولا میں انفرادی ایسا کرتا ہوں تاکہ صدر صاحب کو یہ احساس ہو کہ ان کے بلاوے کے علاوہ اور ضروری کام بھی ہو سکتے ہیں۔

قدرت! شہاب! صدر ایوب کو بات بات پر بڑے مؤدبانہ انداز میں ٹوکنے کا عادی تھا یہاں تک کہ صدر صاحب اکثر کہا کرتے

SHOHAB MUST YOU THROW A BRICK ON MY HEAD EVERY TIME I SPEAK (جب بھی

میں بات کرتا ہوں آپ میرے سر پر پتھر دے مارتے ہیں) مثلاً کابینہ میں پچاسی کی مرسی پیشین کی بات ہو رہی تھی۔ صدمہ نے کہا یعنی ہم کی آخری اپیل میرے پاس ہوگی۔ قدرت بولا جناب آخری اپیل آپ کے پاس نہیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگی۔ صدر بڑے وہ تو ظاہر ہے اسے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ شہاب نے کہا جناب اسے کہنے کی اند ضرورت ہے بار بار کہنے کی ضرورت ہے۔ باواز بند کہنے کی ضرورت ہے ورنہ انسان یہ اہم ترین حقیقت بھول جاتا ہے۔

قدرت کے کردار کو دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا یہ کیسا افسر ہے یہ کیسا انسان ہے اس سے پہلے نہ میں نے ایسا افسر دیکھا تھا

نہ انسان۔

قدرت کے نام بعد خط موصول ہوتے تھے۔ زیادہ تر خط تقریفوں سے بھرے ہوتے تھے انھیں پڑھتے ہوئے قدرت بہت چھپتا تھا اور پڑھ کر فوراً پھاڑ دیتا تھا کبھی کبھی سخت تنقیدی خط بھی موصول ہوتا۔ اسے وہ بار بار پڑھتا۔ پھر مجھے پڑھنے کو دیتا۔ مجھ سے کہتا اس کی باتوں میں وزن ہے معقول اعتراضات ہیں نا۔ پھر وہ ضروری کام چھوڑ کر اس خط کا جواب لکھنے بیٹھ جاتا۔

ایسے خطوں کے جواب میں وہ متر پامنت بن جاتا۔ پھر مجھے دکھاتا۔ کہتا دیکھئے تو یقین دہانی بنی ہے یا نہیں۔

قدرت کی منت سے خدا محفوظ رکھے۔ اس کی منت بڑی خوفناک ہوتی تھی۔ وہ ہونٹوں سے منت نہیں کیا کرتا تھا اس کا تہمت

وجود منت بن جاتا۔ منت کرتے وقت وہ یوں پھوٹ جاتا جیسے کچا انڈا جو رچورچ ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں نے قدرت کی شخصیت پر چھ سات مضامین لکھے ہوں گے۔ اشاعت کی اجازت لینے کی غرض سے اُسے سنئے۔ سُن کر وہ

بہت خوش ہوا۔ چٹکیاں بجانے لگا۔ بولا۔ سن کر میری انا کو بہت تسکین ملی ہے۔ خوب ہے بہت خوب۔

پھر وقتاً انڈا پھوٹ کر بے شکلا مفتی صاحب اس کی اشاعت نہ کیجئے۔

دو ساتوں مضامین آج تک میرے پاس پڑے ہیں یہ مضمون لکھتے ہوئے بھی میں ڈرتا ہوں کہ میری نگاہ سامنے ہلکی ہوئی شہاب کی تصویر

پر نہ پڑ جائے اور تصویر انڈے کی طرح پھوٹ کر یہ نہ نکلے۔

پہلے چار ایک مہینے تو میں شہاب کے کردار پر حیرت میں ڈوبا رہا۔ اس کے کردار میں بلا کا مجھ تھا۔ پھر اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو

میرے سامنے ابھرا۔ ایک مزید حیران کن پہلو۔ اس قدر حیران کن کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شہاب کن ہے ضرور وہ کوئی ہے۔ کوئی پارلر

ہستی۔ یا تو کسی خفیہ عالمی تنظیم کا۔۔۔ ہے۔ یا کوئی شعبہ باز ہے اور یا کوئی پہنچا ہوا بزرگ۔

اس نمانے میں مجھے بزرگوں کے متعلق کوئی تجربہ نہ تھا۔

نبادی طور پر میں بڑی نڈرسل۔ مائٹین کیلے۔ ڈاڈ اور اڈلر کا پروردہ تھا نہ میں خدا کو مانتا تھا نہ اسلام کو۔ جب پاکستان کے قیام کی بات چلی تو میں پاکستان کے حق میں نہ تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اگرچہ میں برائے نام مسلمان ہوں، پھر بھی پاکستان میری داعد جائے پناہ ہے۔

ابتداءً ۱۹۵۵ء میں میری زندگی میں ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہوا تھا۔ مری کے ایک بزرگ بھائی جان خواجہ جان محمد نے مجھ پر رقت پلائی کہ وہی تھی۔ دس دن میں باوجود پھوٹ پھوٹ کر دتار ہوا تھا اس پر میری تعصیب بنیادیں بری طرح سے ہل گئی تھیں اور مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ ایسی پراسرار طاقتیں بھی وجود رکھتی ہیں جو دوسرے کا رخ بدلنے پر حاوی ہوتی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں جب میں تباد لے کر اچے کی وجہ سے کراچی گیا تھا تو اس وقت میرا دل بھائی جان اور ان کے مرشد بابا اللہ بخش مرحوم کی عقیدت سے بھرا ہوا تھا۔

بھائی جان رسی قسم کے بزرگ نہ تھے وہ بزرگ نظر ہی نہیں آتے تھے۔

اونچے لمبے متعہ عام شکل و صورت اور طرز اطوار انہوں نے کسی محفل نہ لگائی تھی۔ چند ایک لوگ انھیں ملتے تھے۔ پٹنڈی کے معروف صاحب طرز ادیب عزیز ملک منہور شاعر یوسف ظفر آغا حیف راجہ شیخ جالبے بھانے کشمیری میٹر غلام دین دانی اور میں بھائی جان سے ہم کوئی مسئلہ پوچھتے تو وہ مسکرا کر کہتے بھئی میں عالم نہیں ہوں، میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ سرکار قبلہ نے دو لفظ بتلے تھے ان کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا بھائی جان اعلیٰ کردار کے مالک تھے جھوٹ نہیں بولتے تھے وعدہ ایفا کرتے تھے۔ جیسے بن کر بات نہیں کہتے تھے۔ ان کا مسلک خدمت تھا وہ ہر وقت ہمتن ہامی خدمت میں لگے رہتے تھے وہ ہماری توجہ خود پر مرکوز ہونے نہ دیتے تھے بلکہ اپنے سرکار قبلہ کی طرف موڑ دیتے تھے جب میرا تباد لہ کراچی ہوا تھا، تو بھائی جان نے کہا تھا مفتی جی تجھ پر یہ نہیں بہت جلد آپ کو واپس بلا لیں گے۔

دو سال کراچی میں قیام کرنے کے بعد مجھے اپنے دوست راجہ شیخ کا خط ملا لکھا تھا بھائی جان بار بار کہہ رہے ہیں کہ مفتی کو جس کام کے لئے کراچی بھیجا تھا وہ تو ہو گیا اب مفتی دباں کیوں بیٹھا ہے۔ راجہ شیخ کا خط پڑھ کر مجھے بے حد غصہ آیا کی میں کراچی میں کسی کام کے لیے بھیجا گیا ہوں اور مجھے طعویٰ ہی نہیں کہ وہ کیا کام ہے۔ کتنی بے ہودہ بات ہے۔

بہر صورت بزرگوں کے متعلق مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔

پھر دو چار واقعات ایسے ہوئے کہ میں بری طرح سے کنفیوز ہو گیا۔

ایک روز جب شہاب دورے پر گیا ہوا تھا تو ایک عمر رسیدہ معزز آدمی جھنگ سے آگیا۔ میں نے کہا جناب شہاب صاحب تو گئے ہوئے ہیں اگر کوئی پیغام ہے تو مجھے دے دیجئے اس نے کہا جناب پیغام تو کوئی نہیں، مجھے دو مریلے واپس کرنے ہیں۔ مریلے واپس کرنے ہیں، میں نے جرت سے پوچھا۔ جی۔ وہ بولا دو مریلے اراضی تفصیلات بیان کرنے میں پہلے وہ ہچکچاتا رہا۔ آخر اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ کہنے لگا جناب جھنگ کے ایک گاؤں میں، میں پرائمری سکول میں پڑھاتا تھا مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ میری تین بیٹیاں تھیں، وہ سب ایک دم جوان ہو گئیں تو میں گھبرا گیا۔ یا اللہ میں ان کے لیے جہیز کہاں سے لاؤں گا میں نے ہر ناز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آہ وزادی کرنا شروع کر دی تہجد میں رورہ کر عرض حال کرتا رہا۔ پھر ایک دن رات کو خواب میں حضور تشریف لائے فرمایا کہ

کھلی کچہری میں جاؤ اور عرض حال کرو۔

اس زمانے میں قدرت اللہ شہاب جھنگ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ عوام کی مشکلات دُور کرنے کے لئے وہ ہفتے میں ایک بار کھلی کچہری مٹاتے تھے جس میں ہر کوئی بلا روک ٹوک جا سکتا تھا اور وہ وہیں حکم جاری کر دیا کرتے تھے۔

جھنگ کے اسکول ماسٹر نے کہا کہ خواب میں حضور اعلیٰ کا اشارہ پا کر مجھے کھلی کچہری میں جانے کی ہمت نہ پڑی، سوچا کہ وہاں جا کر کیا کہوں گا پھر خواب میں دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی تو میں خوفزدہ ہو کر شہاب صاحب سے جا ملا۔ شہاب صاحب نے میری بات یوں سنی جیسے وہ پہلے سے ہی میری مشکل سے واقف ہوں۔ انہوں نے تحقیق کئے بغیر دو مرتبے زمین میرے نام الاٹ کر دیے اب میں تمام بیٹیوں کی شادیوں کے فرائض ادا کر چکا ہوں وہ مرتبے لوٹانے آیا ہوں۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک بڑی پاکیزہ خاتون شہاب کی بیگم ڈاکٹر عفت شہاب کے پاس آئی کہنے لگی میں اعتکاف کرنا چاہتی ہوں کل رات تہجد کے دوران میں مجھے آپ کا ٹھہر دکھایا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس گھر میں اعتکاف کرو جب شہاب کو بتا چلا تو وہ قطعی طور پر حیران نہ ہوا ایسے ٹکا جیسے وہ پہلے سے ہی جانتا ہو کہ فلاں عورت اس گھر میں اعتکاف کرنے آئے گی اس بات پر میں شیشا کر رہ گیا بار بار مجھے خیال آتا کہ یہ کیا بھید ہے کسی کو کہا جاتا ہے کہ کھلی کچہری میں قدرت اللہ سے عرض حال کرو کسی کو قدرت اللہ کا مکان بتایا جاتا ہے کہ وہاں جا کر اعتکاف کرو۔ قدرت اللہ کون ہے۔

چار ایک دن میں سوچا رہا۔ سوچا رہا پھر قدرت اللہ کی بیگم ڈاکٹر عفت سے جا ملا۔ میں نے عفت سے کہا۔ مجھے بتاؤ کہ شہاب کون ہے۔

وہ ہنسی کر بولی میں تو خود حیرت کے عالم میں ہوں اس گھر میں آ کر میری توجہ بدھ ماری گئی ہے وہ سامنا کر دیکھتے ہو وہ بولی شہاب کے کہنے پر ہم نے یہ کمر مقفل کر دیا ہے پتا ہے کہیں آٹھ دن سے اس کمرے سے تازہ گلابوں کی خوشبو آرہی ہے۔ خوشبو کے اتنے پلٹے آرہے ہیں کہ۔

میں نے کہا مجھے شکھاؤ۔ بولی شہاب نے منع کر رکھا ہے میں نے کہا چلو میرے لئے جھوٹ بول دینا۔ بڑی منتوں کے بعد وہ اس شرط پر رضامند ہوئی کہ میں کمرے کے اندر داخل ہونے بغیر دروازے میں تھوڑی سی دھڑبکا کر سونگھ لوں خوشبو کا ایسا پٹا آیا کہ میں ڈر گیا۔

میں نے پہلے بھی کچھ باتیں بھائی جان کو بتائی تھیں جنہیں سن کر وہ چپ ہو گئے تھے بھائی جان کی شہاب سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ لیکن انہوں نے قدرت کا نام تارہ رکھا ہوا تھا وہ کہا کرنے تھے چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، ستارہ قائم رہتا ہے۔

ان تازہ واقعات پر میں شیشا گیا۔ میں نے سوچا کہ بھائی جان سے جا کر پوچھوں کہ یہ قدرت کون ہے اور یہ پُر اسرار واقعات کیوں ہر دے ہیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ لاہور سے اشفاق احمد آ گیا۔ کہنے لگا تجھے بھائی جان سے ملا دو۔ ہم بھائی کے گھر پہلے گئے بھائی جان اشفاق احمد سے مل کر بہت خوش ہوئے پھر قدرت اللہ کی بات چل نکلی۔ باتوں کے دوران اشفاق احمد نے تبے بکھن سے قدرت کو گالی دے دی اس پر بھائی جان اٹھ کر کھڑے ہو گئے ان کا منہ غصے سے لال ہو رہا تھا بڑے سختی صاحب آپ اپنے دوست

کو منع کر دیں کہ وہ ہمارے سامنے اُن کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال نہ کریں ہم برداشت نہیں کر سکتے۔
بھائی جان کی بات سن کر میں تو حیران رہ گیا۔ بھائی جان نے تو ہمیں کسی بات سے کبھی نہ ٹوکا تھا ابھیں تو کبھی غصہ نہ آیا تھا اور پھر قدرت اللہ کی اتنی طرف داری ابھی تو وہ قدرت کے طے ہی نہ تھے۔

بھائی جان کے دل میں تارہ کی اتنی عزت ضرور کوئی بات ہے۔
میں نے قدرت کو بھائی جان اور اشفاق احمد کی ملاقات کی بات بتائی تو قدرت بہت محظوظ ہوا۔ میں نے کہا بھائی جان تو آپ سے ملے ہی نہیں پھر ابھیں آپ سے اتنا لگاؤ کیوں ہے قدرت ہنسنا کہنے لگا شاید انہوں نے میرے متعلق کوئی خوش فہمی پال رکھی ہو۔ میں نے کہا آپ ان سے ملتے کیوں نہیں۔

قدرت نے کہا اچھا اتوار کو جائیں گے۔ میں نے کہا آپ کیسے جائیں گے آپ کو تو راستہ نہیں معلوم فیصلہ یہ ہوا کہ اتوار کو صبح دس بجے، مرٹھ چوک کے دونالی پل پر میں قدرت کا انتظار کر دوں اور وہاں سے اسے ساتھ سرکار قبلہ کے مزار پر لے جاؤں بھائی جان اور راجہ شفیع کو میں نے مطلع کر دیا کہ اتوار کو قدرت اللہ مزار پر آئیں گے۔ اتوار کو دس بجے میں دونالی پل پر جا کھڑا ہوا گیارہ بج گئے بارہ بج گئے قدرت نہ آیا۔ مایوس ہو کر میں پیدل مزار پر پہنچا۔ وہاں بھائی جان نے بتایا کہ ستارہ آئے تھے ابھی ابھی گئے ہیں، میں اس پر حیران ہوا قدرت کو تو راستے کا علم نہ تھا پھر وہ از خود وہاں کیسے پہنچ گیا۔

اس روز بھائی جان خلاف معمول ڈیسے مضمیں تھے۔ کہنے لگے ستارہ کی آمد پر سرکار قبلہ خود آئے تھے ان کے ساتھ پانچ دلی اللہ بھی تھے انہوں نے ستارہ کی دستار بندی کی۔ بھائی جان تو کبھی اس قدر جذباتی نہ ہوئے تھے ابھوں نے کبھی ایسی بات نہ کی تھی کیا بابائے واقعی قدرت کی دستار بندی کی کیوں قدرت اللہ کون ہے۔ ضرور قدرت اللہ کوئی ہے لیکن کون۔

پہلی مرتبہ میرے دل میں بڑی سچیدگی سے یہ سوال پیدا ہوا کہ قدرت اللہ کون ہے بھائی جان جھوٹ نہیں بول سکتے اور بھائی جان کے نزدیک سرکار قبلہ سے بڑھ کر کوئی ہستی نہ تھی۔ سرکار قبلہ نے قدرت کی دستار بندی کی۔ کیوں۔ قدرت اللہ کون ہے کئی ایک دلی راجہ شفیع اور میں دونوں حیرت میں ڈوبے رہے۔

ابھی دنوں قدرت نے مجھے بلایا۔ کہنے لگا سیکورٹی سے ابھی ابھی فون آیا ہے کوئی دیہاتی باہر دروازے پر کھڑا ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے آپ اس سے جا کر میں اگر وہ کوئی پیغام دینا چاہتا ہے تو اس کی بات سن لیں اگر وہ مجھ سے ملنے پر مصر ہو تو مجھے فون کریں میں گیٹ پر آ جاؤں گا۔

دروازے کے باہر ایک دیہاتی کھڑا تھا۔ میں نے اس سے بات کی وہ کہنے لگا نہ جی مجھے ملنا دلنا نہیں، میں تو گاؤں سے آ رہا تھا تو ادھر اس بچے کے پیچھے مجھے ایک ساندھنی سوار ملا کہنے لگا، یہ جو سامنے مکان ہے وہاں چلے جاؤ اور جا کر کہو کہ مجھے شہاب سے ملنا ہے شہاب سے ملو اور اسے ہمارا پیغام دے دو۔

میں نے کہا جی کیا پیغام ہے۔

دیہاتی بولا ساندھنی سوار نے کہا ہے کہ جو کا قدم کھد کر چھاڑ چکے ہو وہ ٹھیک تھا جواب کھد رہے ہو وہ غلط ہے۔

میں نے آکر قدرت کو وہ پیغام سنایا اس کا رنگ نئی ہو گیا، اس نے بیک کرویسٹ پیپر ٹوکری اٹھالی اور کاغذ کے پٹھے ہوئے ٹکڑے اٹھا کر جوڑنے لگا اس پر میں حیرت میں ڈوب گیا ضرورت قدرت کو ہدایات موصول ہوتی ہیں۔ کون ہدایات دیتا ہے۔ وہ سائنسی سوار کون تھا قدرت اس قدر سنجیدگی سے اس پیغام پر کیوں عمل کر رہا ہے۔ کیوں میرا حرام مغز ہل گیا۔ یا اللہ یہ کیا بھیج رہا ہے۔

میں ڈاکٹر عفت سے جا کر ملا۔

ڈاکٹر عفت شہاب سے مل کر میں نے کہا ڈاکٹر قدرت سے میری ایک سفارش کرو گی کیا اس نے پوچھا میں نے کہا میرا تبادلہ کر دو وہ گھبرا گئی، بولی یہاں کوئی تکلیف ہے کیا میں نے کہا اگر میں تمہارے میاں کے پاس رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں نے اسے سائنسی سوار کی بات سنائی ڈاکٹر ہنسی بولی میرا بھی یہی حال ہے تپا ہے کھل اوار کر کیا ہوا۔ شہاب اور میں باغیچے میں بیٹھے تھے چار سائے چائے کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سفید کبوتر اڑتا ہوا آ رہا ہے۔ ہم دونوں اسے دیکھتے رہے۔ قریب آ کر اس نے ٹوٹی ہوئی کھائی اور ہمارے پاؤں کے قریب آگرا۔ میں نے اٹھ کر اسے پکڑا چاہا تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرے ہاتھ میں کبوتر نہیں بلکہ ایک سفید کاغذ ہے جس کے ایک طرف کچھ لکھا ہوا ہے، پڑھنے لگی تو شہاب نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھپ کر جب میں ڈال لیا۔

ضرور اس پر ہدایات لکھی ہوں گی، میں نے کہا۔

پتا نہیں وہ ہنسی۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ڈاکٹر میرا کیا بنے گا۔

اگرچہ بھائی جان نے مجھ پر رقت طاری کر کے میرا ریشن سلف مترزل کر دیا تھا۔ پھر بھی بنیادی طور پر میں ایک عقلی آدمی تھا۔ بابا اللہ بخش کی حیرت انگیز باتیں سن کر میں حیران ہوا کرتا تھا لیکن وہ باتیں سنی سانی کی حیثیت رکھتی تھیں، میرے دل سے ایک آواز اٹھاتی تھی کہ یہ باتیں جذباتی باتیں ہیں۔ مریدوں کی عقیدت مندی بڑی شعبہ باز ہوتی ہے جو معجزاتی سراپ پیدا کرتی ہے۔ میرے دل میں شک و شبہات کے جیونے رینگتے رہتے تھے، بابا کے ڈر سے میں لالہ لپٹھار تھا لیکن ساتھ ہی شک و شبہات کا دھواں اٹھتا رہتا۔

قدرت کے پاس رہ کر جو مشاہدات دیکھنے میں آ رہے تھے وہ منہ زبانی باتیں نہیں بلکہ ہتھی باتیں تھیں ان مشاہدات کی وجہ سے میرے ریشن سلف پر بڑی طرح سے ضرب پڑی تھی اور ان باتوں کی وضاحت کرنے والا کوئی نہ تھا جس راستے پر میں زندگی بھر چلتا آیا تھا وہ معدوم ہو چکا تھا۔ سامنے کوئی نیا راستہ نہیں تھا۔ میں گھبرا گیا۔

پھر میں بھائی جان سے جا ملا۔ میں نے بھائی جان سے کہا ازراہ کرم اشارہ سے کہہ کر مجھے یہاں سے تبدیل کر دو ایسے ہی بھائی جان نے حیرت سے میری طرف دیکھا بولے کیوں کیا ہوا۔ میں نے بھائی جان سے کہا ہوا تو کچھ نہیں لیکن کیا نہیں ہوا، جو کچھ یہاں ہوا ہے اسے دیکھ کر میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میری عقل کا جنازہ نکل چکا ہے، کیسے نہ سکے بھائی جان یہاں کبوتر اڑتے ہوئے آتے ہیں اور پھر بذات خود نا سے بن جاتے ہیں۔ عورتوں کو اشارہ ہوتا ہے کہ اس گھر میں اختلاف کرو۔ حاجت مندوں کو حکم ہوتا ہے کہ کھلی کچری میں ماری دو، سائنسی سوار ہدایات بھیجتے ہیں کہ فلاں کاغذ غلط ہے۔ جانی جان یہاں رہ کر میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔

چند ساعت کے لیے بھائی جان گردن جھکانے خاموش بیٹھے رہے، پھر سر اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے لمبے مفتی صاحب آپ اتنے شکر گزار انسان ہیں۔ اللہ نے آپ کو اتنے بڑے اعزاز سے نوازا ہے، پہلے آپ کو کراچی بھیجا گیا اس لئے کہ آپ تارہ بے رابطہ پیدا کریں آپ کو اس کام میں آسانیاں جیسا کی گئیں، اب انہوں نے آپ کو پرسنل اسسٹنٹ کا مرتبہ دے رکھا ہے آپ کی خوش قسمتی پر زندگی آتا ہے آپ ان باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو ایک دن پاکستان کی تاریخ میں سہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ ایک دن کے گا جناب آپ کو سب بتا چل جائے گا۔ لیکن اگر آپ کا رویہ ایسا ہی رہا تو دودھ سے کھنکھن کا دیا جائے گا اللہ کے کاموں میں منفی رویے کی کوئی کنجاش نہیں۔

بھائی جان نے اس روز مجھے اتنی جھاڑ پلائی کہ میری ڈباں چٹخ گئیں میں ادھ موٹا ہو کر دفتر میں جا بیٹھا میرے دل میں ہلکے گزاری کا جذبہ تو پیدا نہ ہوا البتہ چپ چاپ ٹریڈر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کرنے کی صلاحیت ضرور پیدا ہو گئی، پھر میں نے ساہا سال دیکھا۔ اتنا کچھ دیکھا کہ میری آنکھیں سمجھا گئیں۔

میں نے دیکھا کہ قدرت اللہ کی خاطر بھائی جان اپنے اصولوں کی قربانی دے رہے تھے حالانکہ وہ اصولوں پر بڑے پابند تھے مثلاً وہ عورتوں سے نہیں ملتے تھے انہوں نے میری والدہ سے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر عفت کو انہوں نے مٹی بنا لیا۔

بھائی جان تعویذ نہیں لکھتے تھے، لیکن یہ جان کر کہ عفت کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ جو بھی تو دلالت سے پہلے ہی بچہ ضائع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ قدرت اللہ کے گھر بچہ ہو ہی نہیں سکتا یوں کہ میاں بیوی کے خون میں نام نہایت ہے بھائی جان نے از خود عفت کو کالی مرچیں دم کر کے دینے کی پیش کش کی اور دیر تک اسے کالی مرچیں دم کر کے دیتے رہے۔

میں نے دیکھا کہ ان جیسے لوگ قدرت کے لیے دعا گو تھے۔

اس بارے میں پہلا خط جنوبی بند سے موصول ہوا۔ لکھا تھا۔ اٹھارہ سال سے میں آیا ہج ہوں۔ عبادت کے سوا میرا کوئی شغل نہیں۔ چند سال سے میں ہر نماز کے بعد دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فرزند عطا کرے حالانکہ میں آپ کو قطعی طور پر نہیں جانتا۔ پھر بھی میرے دل سے آپ کے لیے دعا ملتی ہے۔

قدرت کے بیٹے کی پیدائش سے ایک سال پہلے خوشاب کے ایک ایڈوکیٹ عبدالغفور کا خط موصول ہوا لکھا تھا میں آپ کو نہیں جانتا لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ اچھے آدمی ہیں، میں نے کبھی تہجد قضا نہیں کی۔ پچھلے چند ایک سال سے ہر تہجد میں دعا کرتا رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد سے نوازے۔ کل رات تہجد کے دوران میں میری گود میں ایک بچہ ڈال دیا گیا اور کہا گیا کہ آپ کو اطلاع کر دوں کہ آپ کے ہاں بچہ ہو گا۔

عین ایک سال بعد شہاب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا۔

قدرت اللہ کے پاس ایک اور صاحب تشریف لائے انھیں مسجد نبوی کے چابی بڑا رہنے بھیجا تھا۔ مسجد نبوی کا چابی بڑا ہونا، بہت بڑا اعزاز ہے وہ جہلم کے رہنے والے تھے مسجد نبوی میں حاضری دینے کے لیے گئے تھے وہیں کے ہو رہے پھر تبدیج چابی بڑا کا اعزاز حاصل

ہو گیا۔

انہوں نے پیغام بھیجا کہ کئی ایک سال پہلے ہم نے خواب میں دیکھا کہ مسجد نبوی سے ایک پودا پھوٹا اور درہا کر اس پر دو تپان نکلیں ہم نے پھر خواب دیکھا۔ دیکھا کہ وہ پودا سوکھ گیا ہے تپانیں جھڑ گئیں۔

اب پھر ہم نے خواب دیکھا ہے کہ وہ سوکھا ہوا پودا پھر سے ہرا ہوا ہے۔ ہماری جانب سے سربراہ مملکت کو پیغام دے دو کہ بیڑیوں کا رکھوالا خود حیاؤں میں نہیں بیٹھتا۔ اس پیغام سے میں بے حد متاثر ہوا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ پودا مملکت پاکستان ہو۔

قدرت کی زندگی میں صرف مثبت طاقتیں ہی کام نہیں کر رہی تھیں منفی طاقتوں کی بھی بھرمار تھی۔ ان کا مقصد قدرت کا راستہ کاٹنا تھا۔ اس کے مشن کی تکمیل میں روٹے اٹکانا تھا۔

پرانے زمانے میں رشی مونی اور یوگی دھیان لگا کر ٹھہ جاتے تھے تو ان کے حریف ان کا دھیان توڑنے کے لیے حسن و جہیز ترکیاں بھیجتے تھے۔ نرمکی یوگی کے کرواقص کرنے لگتی۔

پنا نہیں وہ کون تھا جو قدرت کا دھیان توڑنے پر مصرفا۔

یامکی حسین پھوڑا طرح دار عورتیں اس پر یورش کئے رکھتی تھیں۔ قدرت انھیں چکاوڑی کہا کرتا تھا میں اسے کہا کرتا تھا کہ تو ان چکاوڑوں کو کیوں لفظ دیتا ہے ان سے جان کیوں نہیں چھڑاتا جواب میں وہ کہتا مجھے ابھی لگتی ہیں۔

جب بھی کوئی چکاوڑ آتی تو وہ قدرت کا دھیان توڑ کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتی۔ قدرت اس کی توجہ کو اپنی طرف سے ہٹا کر مینے شریف کی طرف منعطف کرنے کی کوشش کرتا۔ دونوں طاقتوں کا تصادم ہوتا۔ گھمان کارن پڑتا بالآخر قدرت کامیاب ہو جاتا وہ جائے نماز، پہلو پہلو بچھ جاتے۔ دنوں سلو سو ہو جاتے۔ اس روز قدرت اس قدر خوش ہوتا پھولے نہ سہاتا، جیسے تپا نہیں کیا پایا ہو۔

ایک بار ایسا بھی ہوا کہ قدرت بری طرح سے ناکام ہوا اور میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھا۔

وہ ایک نہایت جاذب نظر خاتون تھی۔ بات کرتی تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ نہستی تو فضا نشہ آلود ہو جاتی تھی۔ اس کی راکش گاہ پر جو ان افسروں کی کاروں کی قطار لگی رہتی تھی۔ وہ آئی تو سب نے اسے اپنا لیا بھائی جان نے اسے ہمیشہ بنا لیا۔

کنے لگے یہ خاتون کام کرے گی دنیا سے اسلام میں نام ہوگا۔

راجہ شیخین اور میرا برا حال تھا ہم جذبات سے بچ بچ کر رہے تھے۔ مقام احترام نہ ہوتا تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔

قدرت نے جائے نماز بھی بچا دیئے سجدہ ریزی بھی ہو گئی لیکن اُس نے سجدے میں بھی سامنے قدرت کو ٹھائے رکھا اس خاتون کا جسمانی مطالبہ عفریت بن گیا۔ قدرت اپنے تحفظ کے لیے اٹھ بھاگا۔ روپوش ہو گیا، خاتون ناکامی کو برداشت نہ کر سکی خود کشی پر تیل لگئی۔ بچ تو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھول ممدوم ہو گیا نیچے سے دھنسل نکل آیا۔

قدرت کو محبت کا عارضہ بھی ہوا تھا جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں آخری سال میں تھا چند اوقیٰ ایمن آباد کے دیوانوں کی ٹوکلی کی بیٹی تھی۔ وہ بی بی کی آخری شہینج میں تھی قدرت سائیکل پر ۲۰ میل کا سفر کر کے روز حاضری دیتا۔ سارا دن چند راوتی کے کپڑے مالا پڑھتا

اسے دوائیاں پلاتا اور تمام کو واپس لاہور پہنچتا۔
 قدرت عجیب پسوی تھا۔ وہ ادھر سے حدت مستعار لیتا تھا اور ادھر لگا دیتا تھا وہ آگ کا آٹا بھانپھڑ لگا لیتا تھا کہ حدت جلانے
 کی قوت کھو کر نور بن جاتی۔ بھیارب واک پوناں، ایدھروں پینا او دھروناں -

حدف قدرت کی بات نہیں۔ اللہ کے یا سرار بندے اپنا اپنا طرز عمل وضع کرتے ہیں کوئی آگ سے دامن بچاتا ہے۔ کوئی آگ سے
 کھینتا ہے کوئی آگ کو پانی بنا کر پی جاتا ہے۔

میں نے ایک بزرگ دیکھے جو تین ماہ کے بعد ہیرا منڈی جاتے خوب طوائف کو بک کرتے۔ بڑبڑہو کر اس کی گود میں مٹیٹھ جاتے اور
 دھیان لگاتے جب جسم کا پھیر پھین پھلا پھلا کر اور شوگر بنی مار مار کر تھک بار جاتا اور سر زمین پر رکھ دیتا تو وہ اٹھ کو کپڑے پہن لیتے اور
 طوائف کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر بیڑیاں اتر آتے۔

بھائی جان خواجہ جان محمد کے مرشد اللہ بخش کا بھی یہی ویلہ تھا۔
 قدرت اللہ کے حیرت کو الف نزل سے بہت کرتے اس کا نازل ٹیر پچر ڈیڑھ درجہ اونچا تھا۔ منہ زبانی تیز بھی۔ ہڈ پر فیروز سے
 نیچے نہیں گرتا تھا اس میں یکمف بسنے کی طاقت عام آدمی سے بہت زیادہ تھی۔

قدرت اللہ میں وقت کے متعلق آبلش تھی کہیں جانا ہوتا تو وہ گھنٹوں پہلے تیار ہو کر مٹیٹھ جاتا اور اگر وقت بڑھتا تو
 سخت ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتا۔

اسے جوانی سے ہی دل کا عارضہ تھا اس کا دل اچھا رہتا مٹ بٹ مس ہو جاتی ساری عمر وہ دل کی دوائیاں کھاتا رہا زندگی
 بھر بیسیوں ہارٹ ٹیک ہوئے ہیں اسے کہا کرتا تھا۔ دوائیاں کھانے کا کیا فائدہ ہے جب تمہارے مشاغل ہی ایسے ہیں کہ دل کو اندھے
 کی طرح پھینٹتے رہتے ہیں پھر دوائیاں کھاتے کا مطلب۔

قدرت اللہ کو بندیوں کا خوف ناشدید تھا کہ جب وہ ہوائی جہاز کے زیسے کی آخری سیڑھی پر پہنچتا تو ایک تباہ موت جاتی۔
 اسلام آباد میں جب وہ نئے گھر میں منتقل ہوا تو اس نے جان بوجھ کر اوپری منزل کا کمرہ اپنے بیسے چنا میں نے اسے کہا، کیوں
 خود پر ظلم کر رہے ہو۔ بولا۔ یہ خود اسی لائق ہے کہ اس پر ظلم کیا جائے اسے آرام پسند بنا دوں تو یہ محض بیت بن جائے گا صرف
 قدرت ہی نہیں اس کے گھر کے دوسرے افراد بھی عجیب تھے۔

اس کے والد عبداللہ صاحب نے علی گڑھ میں ایم اے انگلش میں امتیازی پوزیشن حاصل کی سرسید نے انھیں آئی
 سی، ایس کے لیے ولایت بھیجے کا فیصلہ کر لیا عبداللہ صاحب نے ولایت جانے سے انکار کر دیا چونکہ اس کی والدہ نے اجازت
 نہ دی۔ اسی پر سرسید اس قدر سیخ پا ہوئے کہ عبداللہ صاحب کو خزانہ ہو گئے اور علی گڑھ سے روپوش ہو گئے۔ گلگت پہنچ کر
 خود کو میٹرکولیت ظاہر کر کے گورنر گلگت کے دفتر میں لا کر بن گئے۔ گورنر انگریز تھا وہ بھانپ گیا کہ لڑکا بہت بڑھا کھٹا ہے اس
 نے کھوج لگایا اور جب ریٹائر ہوئے لگا تو عبداللہ صاحب کو گلگت کا گورنر بنا دیا گیا، قدرت وہیں گلگت گورنر ہاؤس میں پیدا ہوا۔

قدرت کی والدہ بڑی عابدہ خاتون تھی۔ بیٹا آئی سی ایس تھا صدر مملکت کا سیکرٹری تھا لیکن والدہ کا سامان ایک گٹھڑی پر مشتمل

تھا جس میں دو موٹے جوڑے تھے۔ وہ روزانہ اپنے ہاتھوں سے ایک جوڑہ دھوتی تھیں اور اگلے روز اسے پہن لیتی تھی۔ جب والد فوت ہوئیں تو قدرت اکیلے میں دہائیں مار مار کر رو یا۔

قدرت کی بیگم ڈاکٹر عفت ایم بی بی ایس تھیں وہ دن میں دو بار پریڈنٹ ہاؤس کا راونڈ کرتی تھیں۔ ہر مریض کے پاس بیٹھ کر اس کا حال سنیں، ہفت دوا دیں اور اگر خصوصی غذا کی ضرورت ہوتی تو ساتھ رقم پیش کرتیں مارغ وقت میں وہ دوا ساز کمپنیوں سے غریب مریضوں کے لئے ادویات اکٹھی کرتیں۔ انہوں نے ایک سوسائٹی بنا رکھی تھی جو غریب مریضوں کے لیے ادویات کا ایک ڈپو چلا رہی تھی، ڈاکٹر عفت انگریزی دوا کے علاوہ طب ہومیوپیتھک اور لوک دوائیاں بھی استعمال کر ایا کرتی تھیں۔ جب وہ ہالینڈ میں تھیں، تو تر بھلا یہاں سے منگوا یا کرتیں۔ پانچ روپے کے تر پے پر ۳۵ روپے محصول ڈاک ملتا تھا۔

اپنے چھوٹے بھائی حبیب کے بارے میں قدرت کہا کرتا تھا کہ ہم دونوں بھائیوں کے متعلق خدا نے ایک اینجنٹ قائم کر رکھا ہے۔ بھینس حبیب کی طرف منتقل کر دی جاتی ہیں اور خوشیاں میری جانب اور اگر کوئی تکلیف میری جانب آئے تو حبیب کو اس کا پتہ چل جاتا ہے اور اسے اس قدر اذیت ہوتی ہے جو میری تکلیف سے کہیں زیادہ اذیت دہ ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ رمضان شریف میں ۲۷ ویں رات کو میں نے قدرت سے کہا کہ تم عبادت کرو تو مجھے بھی پاس بٹھا لینا میں بھی دیکھوں عبادت کیلئے کی جاتی ہے۔

ساری رات وہ کھڑا نعل پڑھتا رہا اور میں ایک کونے میں بیٹھا اسے دیکھتا رہا صبح سویرے وہ گر پڑا، اسے دل کا دورہ پڑ چکا تھا میں نے ڈاکٹر کو فون کیا ڈاکٹر کے ساتھ ہی کراچی سے حبیب اور لاہور سے عفت آ گئیں، عفت نے کہا، میں نے محسوس کر لیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے، اس بے صبح سویرے میں ایئر پورٹ آ بیٹھی، حبیب نے کہا شام ہی سے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور ہر لمحہ شدت اختیار کرتی گئی تھی کہ ناقابل برداشت ہو گئی اور میں ٹائٹ کوچ میں جا بیٹھا۔

قدرت اللہ کو ہدایات کے ساتھ ساتھ دازنگز بھی موصول ہوتی رہتی تھیں دازنگ دینے والے بزرگ کہا کرتے تھے، حیرت ہے کہ تمہیں خبردار کیا جا رہا ہے ورنہ اصولی طور پر ہمارے ہاں دازنگز نہیں ہوتیں۔ بلکہ نام کاٹ دیا جاتا ہے۔

قدرت کو دازنگ دینے کے لیے بزرگوں کو جیل میں بند ہونا پڑتا تھا۔ ہسپتال میں داخل ہونا پڑتا ہے۔

دازنگ دینے والے ایک بزرگ مجھے کبھی نہیں بھول سکتے کالے پتلے۔ دبے لمبے وہ اس قدر تیغ کلام تھے کہ میں نے ان کا نام

مرچ رکھ دیا تھا۔ وہ انگریزی بولتے تھے۔ آتے ہی کہنے لگے "FLAY YOU ALIVE PUT BRON ON YOU AND PUT YOU IN THE SUN"۔ تمہاری کمال کھینچ کر نمک مرچ مل کر تمہیں دھوپ میں رکھ دیا جائے۔

قدرت نے پوچھا آپ کے کریڈنٹس کیا ہیں۔ بوسے ہم جید رآباد دکن میں آئی جی پولیس تھے حکم نامہ آ گیا ہم نے استعفا دیا اور باہر نکل آئے۔

ان بزرگ کا سامان ایک ٹکڑا ایک جوڑا کپڑے، ایک جائے نماز ایک تسبیح اور ایک ٹوٹا تھا۔

پھر منفی طاقتوں کو شعور ہو گیا کہ قدرت کو یہ اثر کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ قدرت کو صدر الوب سے الگ کر دیا جائے،

تاکہ صدر مقبوت اثبات سے محروم ہو جائے، امریکہ بہادر قدرت سے ناخوش تھا چونکہ صدر اس کے موصی پر نہیں آتا تھا انہوں نے دباؤ ڈال کر قدرت کو سکریٹری اطلاعات کے عہدے پر فائز کرادیا۔ اور الطاف گوہر کو صدر کا سیکریٹری بنا دیا۔ الطاف گوہر جانا پہچانا زیرک انشوی تھا۔ مگر اس میں کیریہ بنانے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہی حضور یہ بن گیا۔

کچھ دیر کے بعد امریکہ نے محسوس کیا کہ صدر اور قدرت کے درمیان مزید فاصلہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے لہذا قدرت کو ہالینڈ کا سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔

ہالینڈ سے قریب نے مجھے خط لکھا کہ یہاں سکون ہی سکون ہے آٹھ آٹھ دن کوئی بات کرنے والا نہیں ملتا یہاں میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جسے کرنے کا مجھے کبھی موقع نہ ملا تھا ظاہر تھا کہ وہ عبادت میں ڈوبا ہوا ہے۔

پھر پاکستان کے ایک سرسبزہ جرنیل نے قریب کو ملک بدر کر دیا۔

پیرس اور لندن میں قدرت اس کی بیوی اور بیٹے نے دوسرے فہرے کئے یونیسکو کا ڈائریکٹر ہونے کی وجہ سے پیرس میں ہر ماہ اسے مینٹنگ میں حاضری دینی پڑتی تھی اس حاضری کا کافی اے ڈی سے اس کی واحد آمدنی کا ذریعہ تھا جو گزارے کے لیے بہت تھیں تھا قدرت کو گزارنا کرنے کے لیے پاکستان سے زونجی افسر بھیجے جاتے تھے قدرت، محض اور ان کے بیٹے کو چھپ چھپ کر زندگی گزارنی پڑ رہی تھی۔ پھر اس کے بیٹے کو اغوا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ رما۔ انہوں نے بڑی عزت اور خوف دہرا اس میں گزارا۔

پھر عربوں نے اسے اسرائیل بھیج دیا۔ جب اسرائیل کو تیا جلا کہ وہ اسرائیلی جھنڈوں کے بھید لے گا ہے تو انہوں نے قدرت پر جادو کر دیا اسرائیلی جادو کے تحت وہ ایک زندہ لاش کی طرح پڑا رہا۔ اس کے اعضا متسل ہو گئے۔ حرکت کی قوت سلب ہو گئی۔ ان دنوں قدرت سے اس قدر بدبو آتی تھی کہ لوگ قریب آتے تو پاک پر روناں رکھ لیتے۔ قدرت نے ایک خط میں مجھے لکھا کہ دو سال ناگوار ہتھوڑوں سے مجھے توڑتے رہے اب اللہ کا فضل ہو گیا ہے چھ مہینے سے وہ مجھے پھر سے جوڑ رہے ہیں لیکن معنی صاحب جوڑے جانے میں بھی اتنی ہی افیت ہے معنی توڑے جانے میں۔

جوڑ کر بھی قدرت کئی ایک جگہوں سے ٹوٹا رہا اس کی بائیں ٹانگ مردہ تھی لندن کے ایک ڈاکٹر نے جب قدرت کا معائنہ کیا تو جبریت سے بولا۔ آپ یہاں کیسے آئے ہیں، قدرت نے کہا جناب گاڑی میں آیا ہوں ڈاکٹر بولا گاڑی سے یہاں تک کیسے آئے ہیں قدرت نے کہا جناب چل کر آیا ہوں ڈاکٹر نے سر ہٹ لیا بولا یہ نہیں ہو سکتا کیسے ہو سکتا ہے تمہاری بائیں ٹانگ میں دوران خون نہیں ہو رہا یہ ٹانگ مردہ ہے۔ قدرت اس مردہ ٹانگ کو زندگی بھر گھسٹتا رہا۔ ہر قدم ایک افیت تھا۔

میو ہسپتال کے ڈاکٹر آج بھی حشر میں گم ہیں، میو ہسپتال میں باؤتھ سیدہ زندگی کے آخری سانس سے رہی تھی کمرے پر موت کی فضا چھائی ہوئی تھی ڈاکٹر یاکس ہو چکے تھے پھر ایک ڈیسا سنٹی بجتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور ایک طرف کونے میں کرسی پر بیٹھ گیا کسی نے اس بے کی طرف توجہ نہ کی لیکن کچھ دیر بعد کمرے کی فضا بدلتے لگی بانو کی کیفیت میں تبدیلی پیدا ہونے لگی ڈاکٹر حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے وہ بار بار بانو کی طرف دیکھنے پھر بڑے کی طرف دیکھتے۔ نجف و زار بڑھا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ چند گھنٹوں بعد بانو اٹھ بیٹھی ہیں ٹھیک ہوں مجھے مگر جانے دو۔

قدرت اللہ شہادت کی شخصیت کا بنیادی پہلو ہے۔ تھا طبعاً وہ ایک ملا متبیہ تھا اپنے مشاف کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بڑی فراخ دلی سے اپنا لیا کرتا تھا۔ اور حکام بالا کی جھاڑ چھاڑ کے لئے خود کو پیش کر دیا کرتا تھا ایک دن میں نے قدرت سے کہا یہ نازب و خلعت اور عبادت میرے بس کی بات نہیں مجھے کوئی آسان راستہ بتاؤ کہنے لگا کسی شخص کو اپنے سے کم تر نہ سمجھو

چار ایک دن کے بعد میں اسے ملا، میں نے کہا میں تو سمجھا یہ آسان کام ہے۔ لیکن یہ تو بڑا مشکل کام نکلا۔ مجھے نہیں ہوتا ہے لگا ہاں مشکل کام ہے، مجھے سے بھی نہیں ہوتا لیکن میں مسلسل کوشش کئے جاتا ہوں

جب میں نیا نیا اس سے ملا تو مجھے نجوم پیش گوئوں اور ای ایس پی کا بہت شوق تھا۔ قدرت نے ایک دن سنجیدگی سے مجھے کہا یہ بے کار شوق ہے کیوں میں نے پوچھا۔ بولا اس کے بارے میں کوئی یقین سے بات نہیں کر سکتا کل کی بات اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا میں نے کہا بزرگوں کو کشف جو ہوتا ہے قدرت بولا کشف بزرگوں کے راہ کی ایک رکاوٹ ہے ایک آزمائش ہے۔ وہ بزرگ جو کشف کے سراب میں پڑ جاتے ہیں اپنا راستہ کھٹا کر بتتے ہیں مفتی صاحب اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا ایک بات پلے بات دہ لیجئے کہ :-

FINALITY RESTS WITH GOD

کہ آخری حکم باری تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ یہ اصول اس کی زندگی کے ہر نتیجے پر حاوی تھا۔

کوئی کام ہو مشکل ہو یا مشکل ہو۔ اسے حل کرنے کے لئے قدرت صرف دہرا کوشش کیا کرتا تھا۔ اگر تیسری کوشش پر کامیابی کے امکانات واضح ہی ہوتے تو بھی وہ تیسری دفعہ کوشش نہیں کرتا تھا کہتا تھا۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کچھ اور مقصود ہوا اللہ کو بھی تو موقع دینا چاہیے۔

اگر قدرت کی کوششوں کے خلاف نتیجہ نکلتا تو وہ بڑی خوش دلی سے اسے قبول کر دیتا شکوہ یا شکایت کرنا اس کے نزدیک ناشکری کے مترادف تھا۔

دو کرامات کے حق میں نہ تھا اور مافوق الفطرت واقعات کو قطعاً اہمیت نہ دیتا تھا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں اور حضور کا مسلک بندہ بن کر جینا تھا انہوں نے کبھی مافوق الفطرت کا سہارا نہیں لیا تھا۔

جب میں نے چند ایک سال قدرت کے ساتھ رہ کر دیکھا کہ اسے پراسرار طور پر ہدایات موصول ہوتی رہتی ہیں اور اس کی زندگی مافوق الفطرت واقعات سے بھری ہوئی ہے تو ایک دن میں نے کہا آپ تو مافوق الفطرت کے حق میں نہیں تھے پھر آپ کی زندگی میں مافوق الفطرت واقعات کیوں ہو رہے ہیں۔

ایک ساعت کے لئے وہ چپ رہا پھر بولا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میری زندگی میں مافوق الفطرت واقعات ہوتے ہیں، تو یقیناً کہنے وہ میری جانب سے نہیں ہوتے ہیں تو ایک عام سائنہ ہوں اگر مجھے مافوق الفطرت قوتیں پیش کی جائیں تو میں انہیں قبول نہیں کروں گا یہ میرے مسلک کے خلاف ہوگا۔

پھر یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے ہدایات ملتی ہیں، احکامات ملتے ہیں کیوں ملتے ہیں یہ وہ جانیں جو ہدایات دیتے ہیں میں تو ایک چاکر ہوں مجھے بہر حال قیصل کرنی پڑتی ہے۔

میں نے ایک بار قدرت سے پوچھا کہ افضل ترین عبادت کون سی ہے قدرت نے کہا حضورؐ کی سوانح اپنے سر ہانے رکھ لو۔
روز ایک واقعہ پڑھا اور بھر سارا دن سوچتے رہا کہ اس واقعہ پر حضورؐ کے جذبات کیا ہوں گے حضورؐ نے کیا سوچا ہوگا۔

قدرت اللہ کا مسکندہ ہڈا (MOHAMMAD HOOD) محمد مجید (IDENTIFICATION WITH MOHAMMAD)
قدرت ایک بڑا عاجز بندہ تھا میرا اندازہ ہے کہ وہ کچھ کا عاجز ترین غلام تھا۔ قدرت ایک کشیدہ افسر تھا۔ وہ ایک کام کے لیے بھیجا گیا تھا جس طرح
گورنر کی آمد سے پہلے ایک کارکن بھیجا جاتا ہے کہ جاؤ جا کر چھوٹا کراؤ دریاں بچھاؤ، ڈانس بنواؤ کرسیاں لگواؤ۔ اسی طرح پاکستان میں
ایک عظیم اسلامی ہستی کی آمد سے پہلے قدرت کو بھیجا گیا تھا کہ جا کر چھوٹا کراؤ دریاں بچھاؤ۔ آنے والی ہستی اس قدر اہم ہے کہ اس کے
بیسے چھوٹا کرنا بھی بہت بڑا اعزاز ہے۔

صاحب قدرت اللہ شہاب کی الفیلوی بینی ایک بڑی لمبی داستان ہے جو سمٹ کر ایک مضمون میں نہیں ساسکتی۔ یہ موضوع خود
ایک کتاب کا موضوع ہے۔

صاحب میں اتنا بڑا اقم کار نہیں ہوں کہ قدرت کے عظیم کردار اور سن کو بیان کر سکوں بھر یہ بھی ہے کہ قدرت اللہ ایک گیت بزرگ
تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بھید کھلے۔

قدرت کے ساتھ رہ کر کچھ پر ایک بہت بڑا انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ بات کہہ دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ضروری نہیں کہ بات کہہ دی
جائے اور کھل جائے قدرت دل دلا دیا کرتا کہ بات نہ کھلے اور وہ نہیں کھلتی تھی۔

پتا نہیں قدرت نے کیا منتر پڑھ رکھا تھا کہ اس کے گھر والے سب کچھ دیکھتے تھے لیکن ابھیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ گھر پر پردہ ہی
بڑا رہا۔

جب بھی میں نے دانشوروں سے بات کی تو انہوں نے ہنسی میں اڑا دی۔ روزنامہ مشرق کے ادبی کالم نے نوکئی ایک سال
مہم چلائے رکھی۔ سلسلہ شہابیہ کے چادر و ریش۔ انہوں نے میرا مذاق اڑایا۔ مغنی کو مرشد کہاں لاپریڈ پرنٹ ہاؤس میں۔

میرے قریبی دوست مجھے رہے کہ قدرت سے تعلق قائم کرنے میں میرا بنیادی مقصد دنیاوی معادلات کا حصول تھا۔ بیشک قدرت
کی وجہ سے میں نے بہت سارے دنیاوی مفادات حاصل کئے لیکن میرا مقصد حاصل کرنا نہ تھا۔

سات سال میں بانو اور اشفاق سے فینیں کرتا رہا کہ اللہ کے واسطے ذرا گہری نظر سے دیکھیں یہ شخص جسے تم صرف اچھا آدمی
سمجھ رہے ہو، وہ تو بہت کچھ ہے۔ وہ میری باتیں سن کر بہت متاثر ہوتے تھے جیگ جاتے تھے لیکن پھر پرچھاڑ کر آدم سے سوکھے پیٹے سجا
سات سال کے بعد بانو نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور وہ کی بکی رہ گئی، بانو ایک پاکیزہ خاتون ہے اس میں دیکھنے سمجھنے اور محسوس کرنے
کی صلاحیت مجھ سے کہیں زیادہ ہے لیکن اشفاق احمد دیکھ کر کبھی نہ دیکھ سکا کبھی نہ سمجھ سکا وہ اپنی ذات کے حصار سے باہر نہ نکل سکا۔

قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامے کے پیش نقد اقبال جرم میں میری کہہ دینے کی عادت کے خلاف اپنا تحفظ کر لیا
ہے۔ لکھا ہے،

”خاص طور پر ممتاز مفتی انتہائی ذکی، محسوس، ضدی، بے باک اور شدت اور حدت پسند تھیں۔ کسی وجہ سے میری کوئی حرکت انہیں پسند آگئی اور انہوں نے بیٹھے بٹھائے ایسی عقیدت کا روگ پال لیا کہ میرے چہرے پر مشک کا فور سے مہکتی ہوئی حنائی وارسی چسپاں کر کے میرے سر پر دستا فضیلت باندھی اور سبز پوشوں کا پراسرار جامہ پہنا کر اپنی سدا بہار تحریروں کے دوش مجھے ایسی مسند پر لٹھایا جس کا میں اہل تھا نہ خواہش مند۔ اس عمل سے تو کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ میرے لیے وہ ایک طرح کے مرشد کا کام دے گئے۔ ان کی وجہ سے میں نہ اطمینان پر ثبات قدم رہنے پر اور بھی زیادہ مستعد ہو گیا تاکہ ممتاز مفتی کی عقیدت کے آگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ بظاہر میرا نفس تو بہت بھولا۔ لیکن اندر ہی اندر عرقِ ندامت میں غوطے کھاتا رہا کیونکہ منِ آثم کہ منِ داغم۔

بے شک شہاب جیسے بزرگ کو جس کا مسلک پردہ بحر اور رواداری تھا یہی کہنا سمجھتا تھا اس نے اٹا پتل پر ملمع کر دیا، لیکن میں نے کہتے ہیں۔ بات چپائے نہیں چھتی۔

دیکھ احسان ضبط لازم ہے، تشنہ انکشاف ہے ہر راز
شہاب نامے کے آخری باب میں چھوٹا منہ بڑی بات میں بتا نہیں کیسے قدرت اللہ شہاب کے قلم سے بات نکل گئی، اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ اسے پراسرار ذرائع سے ہدایت موصول ہوا کرتی تھیں۔ قدرت اللہ نے بڑی دھنات اور تفصیل سے اس بات کا ذکر کیا ہے اگرچہ قدرت نے اس نوے سالہ بزرگ کا نام ظاہر نہیں کیا جو اسے ہدایت بھیجا کرتے تھے۔ تاہم قدرت نے اس پر مزید خضر راہ کے وجود کو تسلیم کر کے قدرت اللہ شہاب کے متعلق ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کو حقیقت نگاری کا مرتبہ عطا کر دیا ہے۔ قدرت کے اس طویل بیان سے ایک چھوٹا سا اقتباس پیش خدمت ہے۔

اس کے بعد کم و بیش پچیس برس تک ہمارے درمیان اس عجیب خط و کتابت کا سلسلہ قریباً قریباً ہر روز جاری رہا بعض اوقات ہمارے درمیان کی آمد و رفت دن اور رات میں دو دو، تین تین یا چار چار یا تک پہنچ جاتی تھی حبیب ہمارا پوسٹ آفس تھا ہمارا ایڈریس کسی اماری ہوئی تھی کسی اپنی حبیب کسی کوئی کتاب یا کا پی یا کسی یوہی سہراہ چلتے پھرتے ہانٹی کے تحریر کردہ خطوط ہمارے دوش پر سوار بھول کی تہیوں کی طرح سر پر آتے تھے۔

ایک روز میں نے اپنے رہنما سے دریافت کیا آپ کون ہیں کہاں ہیں کیا کرتے ہیں اور روحانیت کے کس مقام پر فائز ہیں جواب ملا، پہلے تین سوالی فصول ہیں ان کا جواب تمہیں کبھی نہیں ملے گا باقی رہی روحانیت کے مقام کی بات۔ اس مڑک پر سب راہی ہیں کوئی آگے کوئی پیچھے کوئی صرف ایک بشر کو ملی ہے اس بشر کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

(بشکرہ: انجمن ترقی اردو کراچی)

پیر و مرشد

احمد بشیر

شہاب نامہ مجھے پسند نہیں آیا اگرچہ رپورٹ پڑھاری مفصل ہے۔
میں کتاب کی گرفت کی بات نہیں کرتا۔ یہی اس کی خرابی ہے کہ آدمی شروع کرے تو پھر چھوڑ نہیں سکتا۔ میں شہاب کی بات کرتا ہوں اس نے کتاب نہیں لکھی۔ بیان صفائی مرتب کیا مگر ملزم مجھے باعزت بری ہوتا نظر نہیں آتا۔ انتقال سے کچھ پہلے وہ میرے گھر آیا تھا۔ دوپہر کے وقت جب آہستہ آہستہ چلنے والی گلی میں بوجھیل رہی تھی۔ اسے گرمی بہت لگتی تھی میں نے کہا: ٹھہریے، پہلے میں آپ کو ٹھنڈا پانی پلا دوں۔

”مجھے پیاس نہیں۔“ اس نے بیزاری سے جواب دیا
شہاب پانی بار بار پیتا تھا اس لیے مجھے اس کی بات کچھ عجیب لگی۔ اس نے کہا: ”میری طبیعت پر بڑا بوجھ ہے۔ کچھ بجائی نہیں دیتا۔“

”جی ہاں! گرمی نے سب کی مت مار دی ہے۔ ویسے آپ کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟“
”صحت ٹھیک ہے، بوجھ دل پر ہے۔ اسی لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے کچھ آپ سے کہنا ہے۔“
شہاب بالعموم ذاتی احساسات کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی شکست کی جھنکار سن کر کسی قدر خفت ہوئی۔ اس قسم کے کچھ واقعات اس سے پہلے بھی ہوئے تھے۔ جب اس نے دوستی کی دہلیز پر کھڑے کھڑے میرے سامنے اپنے کچھ راز اگل دئے حالانکہ اس کے بڑے بڑے امانت دار دوست منتظر رہتے کہ وہ کوئی ذاتی بات کرے۔ وہ ان سے ذاتی باتیں کرتا تھا مگر اوپر کی سطح پر۔ اپنی طاقت یا اپنی کمزوری کا اعتراف کسی کے سامنے کم ہی کرتا تھا۔ میری بات اور تھی۔ میں اس کے مقام سے واقف نہیں تھا اور اسے محض ایک شریف آدمی سمجھتا تھا جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، جس کی رائے کو نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے اور جس سے ہر قسم کی بات کی جاسکتی ہے۔ اس لیے بعض مشکل لمحات میں اس نے مجھ سے سہارا مانگا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے ایک عام انسان سمجھا جائے اور مجھ سے بات کر کے اس کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنی خفت کو ناپائیدار نہ کیا، سمجھ گیا کہ وہ دل کا کوئی گھاؤ دکھانے آیا ہے۔ میں نے کسی حیرت کا اظہار کرنے کی بجائے سہمہری طور پر کہا: بوجھ تو سب کے جی پر ہے۔

یہی بات مجھے بے چینی کے دیتی ہے سب کچھ چکنا چور ہو گیا۔ میں سخت ندامت میں مبتلا ہوں۔ جینا دو بھر ہو رہا ہے۔

مگر آپ کا کیا تصور، کس بات کی ندامت آپ کو جینے نہیں دیتی !
میں نے اُسے تسلی دینے اور اس کا احساسِ گناہ گھٹانے کی کوشش کی مگر شرمندگی کے جس جذبے میں وہ جکڑا
ہوا تھا اس میں میری آواز اُس تک نہ پہنچ سکی۔ وہ میرے بے تاثیر لفظوں سے محفوظ ہو کر منمنایا۔ قومِ ذلت کی جس انتہا
کو پہنچ چکی ہے اس کی کچھ ذمہ داری ذاتی طور پر مجھ پر بھی آتی ہے۔ میں نے ایوب خاں کی خدمت اپنی سرکاری ڈیوٹی
سے بہت آگے بڑھ کر انجام دی۔ میں نے اسے اس کی پسند کے مشورے دئے اور اس کے بعض فیصلوں میں شریک
رہا جن کی بدولت ڈکٹیٹر شپ جڑ پکڑ گئی اور قوم کا ہر فرد ذلیل و خوار ہوا۔ اخلاق تبدیل ہو گئے۔ اقدار بگڑ گئیں۔
معاشرہ نفسا نفسی کا شکار ہو گیا اور آگے بھی ذلت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جس کی لاشی اس کی بھینس۔ اس رذالت
میں میرا جو حصہ ہے میں اس کی وجہ سے سخت ندامت میں مبتلا ہوں مگر اب کچھ ہو نہیں سکتا۔

اس نے اپنا کلیجہ ایک ہی سانس میں الٹ دیا حالانکہ وہ سیدھی سادی بات بھی رک رک کر ٹکڑوں میں بیان
کرنے کا عادی تھا۔ ایسا پچکا ہوا میں نے پہلے اُسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ عام لوگوں سے محبت کرتا تھا مگر یہ احساس
مجھے پہلے نہ ہوا کہ عوام کی عزت نفس کے ذبیحے پر اُسے چھری سے کوئی شکایت ہے !

یہی خاں کے مارشل لا کے خلاف اُس نے کھلا مورچہ لگایا تھا۔ ضیاء الحق کے مارشل لا کو اس نے ناپسند
کیا۔ اس نے بتایا کہ میں اسی دنیا کے مسائل سے لہجڑا ہوا ہوں اور کسی روحانی رفعت کی آرزو نہیں رکھتا۔ یہ معاملہ
میری اور میرے جیسے کٹرے موڑوں سے تعلق رکھتا تھا جو شرفِ انسانی کھو بیٹھے ہیں۔ اس نے یہ بات مجھ حقیقی سے
کرنا پسند کی۔

پھر میں بھی بڑا بن بیٹھا جیسا کہ چھوٹے لوگوں کا طریقہ ہے۔

پس مافی چاؤ ! ایک رومن کیتھولک پادری کے انداز میں میں نے سوچا خداوند خدا نے ہم سب کے گناہوں کا
کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اب ہماری نجات کے لیے اعترافِ گناہ ہی کافی ہے۔ یہ بات اُسے میں نے ذرا مختلف
لفظوں میں کہی۔ میں نے کہا آپ کو اگر ندامت کا احساس ہے تو قوم کے سامنے کھل کر اعترافِ گناہ کریں اور معافی
مانگیں۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ شہاب نامہ کا دیباچہ بھی لکھ چکا ہے۔

رومانسا ہو کر وہ بولا، اعترافِ گناہ اور اقبالِ جُرم میں پوری پستک لکھ ڈالی اور اس کا نام شہاب نامہ
بھی اس لیے رکھا کہ یہ میرا ہی کتا چٹھا ہے مگر کتاب لکھ کر بھی مجھے سکونِ قلب میسر نہیں آیا۔ نجات کا بوجھ میری
روح کو کھل رہا ہے۔ اچھا اب اجازت !

وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا کیا وہ مجھے کوئی پیغام دینے آیا تھا؟ نہیں وہ تو اپنا بوجھ ہلکا کرنے آیا تھا اور
اس نے اس شدید گرمی میں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پیا۔ گاڑی تک چھوڑتے ہوئے میں نے اس سے کہا
آپ کا وزن اچانک گھٹ گیا ہے یہ بات اچھی نہیں اس عمر میں !

مجھے جسمانی طور پر کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ کچھ عرصہ قبل میں نیند سے آزاد ہو گیا تھا اب طعام سے بھی فارغ ہوں۔ اس سے میرے روزمرہ کے مسائل کم ہو گئے ہیں اور میں بڑے آرام سے ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ شہاب نامہ اُسے بھی پسند نہیں آئی تھی کم سے کم اس کا وہ حصہ جس میں اس نے ایوب خاں کی دہلے دہلی تعریف کی اور پھر اپنی بعض ناقابل قبول حرکتوں کی وضاحت سے صفحہ کا لے کیے۔ شہاب نامہ پڑھنے والے کو عالم تحیر میں لے جاتی ہے اور اگر وہ عذرخواہی نہ کرتا تو بھی یہ ایک منفرد کتاب ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے جب لکھنے کا قصد کیا تھا تو وہ صرف اپنی صفائی پریش کرنا چاہتا تھا۔ باقی واردات اپنے زور پر اس میں در آئی۔ اگر اس نے اقبال جرم کسی سچے مجرم کے خلوص سے کیا ہوتا تو وہ آسودہ ہو جاتا اور اس کے قاری کی ملاقات ایک ایسے کردار سے ہو جاتی جو روح اور جسم کی سیخ پر چلتے ہوئے پہلو بدل رہا ہے۔ مگر اس کے پھسے بیان سے جس کی تصویر ابھرتی ہے وہ صبح کو صفتِ فعال ہے تو شام کو خسرو شام۔ فقیر اور آئی سی ایس کا دو آتشہ حلق سے اترتا، تو چھالے پڑ جاتے ہیں۔

شہاب نامہ ایک سچی کتاب ہے مگر شہاب نے اس میں سارا سچ نہیں بول دیا جیسے روسو نے بول دیا تھا یا جس طرح قناز مفتی نے علی پور کا اعلیٰ میں بول دیا ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ سچ کی کوئی معروف شکل نہیں۔ سچ ایک بات تھی جسے صرف انداز سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے کہ ہر شخص کا سچ الگ الگ اور ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ اس کی کلیت کسی کے ہاتھ نہیں آتی اس کے مکمل جزائیے کا بھی کسی کو علم نہیں۔ مسیح ایک ذاتی تجربہ ہے ایک خفیہ معاہدہ ہے ایک چلبلا معشوق ہے جو چاہنے والوں کو اپنے روپ کے چھل بل سے رجھاتا ہے مگر سارے بھاؤ کسی کو نہیں بتاتا۔ شہاب پر جو کچھ بتایا بیان کیا۔ ایک خاص زاویے سے بیان کیا۔ وہ زاویہ سچا ہے۔ مگر جو اس سے نظر ملا کر نہ دیکھے کیا اس کی نظر بھی سچی ہو سکتی ہے؟

شہاب ایک مجموعہ اَضدادِ شخص تھا بیک وقت کمزور اور طاقتور۔ ذرا خیال کرو کہ شہاب جیسا معمولی قد و قامت کا ایک شخص جس پر راہ چلتے کوئی شخص دوسری نظر ڈالنی ضروری نہ سمجھے بچپن میں ایک مندر بیٹے کو چڑانے کے خیال سے زور زور سے درود شریف کی تلاوت کرتا ہے اور اسی مستی میں روزانہ بائیس میل کا پیدل سفر کر لیتا ہے بڑا ہوتا ہے آئین آباد کی چند راتوں کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے کہ روزانہ بائیس میل پر ستر میل آتا جاتا ہے مگر لڑکی کو ہاتھ نہیں لگاتا کیا اس سے بڑی بہادری کہیں ممکن ہے؟

وہ مزارات سے نذر نیاز کے پیسوں کا ایک مقررہ حصہ نہایت ایمان داری کے ساتھ اٹھا لیتا ہے۔ صاحبِ مزار سے اس کے تعلق کی بنیاد یہی ہے۔ ایک دن جب وہ نہیں اٹھاتا تو اس کی کائنات کی حرکت رک جاتی ہے اور نادوم ہو کر وہ اپنے سر پر جوتے مارتا ہے اور پھر سے پیسے اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ کیا یہ پیارے بات نہیں ہے؟

یہ وہی شخص ہے جو بچپن میں پلنگ کے مُردہ چُڑھے دم سے پکڑا کر دوسروں کو ڈراتا ہے مگر خود نہیں ڈرتا حالانکہ پلنگ کی دہشت اس زمانے میں بے حد و حساب تھی اور بڑی بڑی دلربا صادق بیگیں دیکھتے ہی دیکھتے نوخیز شہاب کے دئے ہوئے لہریاں دوپٹے اوڑھنے کی بجائے چُپ چاپ لمحہ میں اتر جایا کرتی تھیں۔

پھر جب وہ آئی سی ایس کی تربیت پا کر قحط زدہ بنگال کے قصبے تملوک میں رضا کارانہ طور پر ایس ڈی او مقرر ہوتا ہے تو جھوک سے سسک سسک کر مرنے والوں میں چاول کے سرکاری گودام لٹوا دیتا ہے جو سرکار نے جاپانیوں کے حملے کے خیال سے ذخیرہ کیے تھے۔ اس پر اس کو کٹھن میں پلویا جاسکتا کہ جاپانیوں کا ایجنٹ ہے یا کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا تحریب کار۔ مگر جب اُس نے خلی خدا کو بے موت مرنے دیکھا تو اس نے نتیجے سے بے پروا ہو کر بوریاں خالی کرا دیں۔ انسان دوستی کی اس سے بڑھ کر اور مثال کیا ہوگی!

کنک میں ایک آسیب زدہ بنگلے میں وہ مہینوں ایک حسرت زدہ مقتول ہندو لڑکی کی نرم و لطیف رُوح اور اس کے بے وفا عاشق قاتل کے بھوت سے جسمانی طور پر راتوں کو دھینگا مٹشتی کرتا رہا جو نہیں چاہتا تھا کہ شہاب لڑکی کی خواہش کے مطابق اس کے قبل کی اطلاع الہ آباد میں اس کی ماں کو پہنچا دے جو اس کی منتظر تھی۔ وہ اس بھوت بنگلے میں ڈرتا بھی تھا مگر وہ کسی خاص وجہ کے بغیر اس قسم کے کٹھن امتحانوں سے گزرتا رہا۔ بسا اوقات بھوت ایک طرف سے دروازے کو دھکیل رہا ہے اور شہاب دوسری طرف سے، جب کہ لڑکی کی لاش خوشبوؤں میں بسی ہوئی پازمین پر پڑی ہے یا ہلکے دُودھیارنگ کے گول دائرے کی شکل میں کمرے میں کھڑی تماشا دیکھ رہی ہے۔ ایسے شخص کو آپ احمق نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔

یہ واقعہ شہاب نے زبانی بھی مجھے سنایا تھا اور اسی قسم کے ایک دو اور واقعے بھی میں نے اس سے سنے اس کی ملاقات لندن میں چند راتوں کے ہوئے سے بھی ہوئی جس نے اسے جسمانی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا کیونکہ اس کے پاس کرایہ نہیں تھا۔ چند راتوں نے اُسے بتا دیا کہ تمہاری بیوی عفت کی روانگی قریب ہے۔ اس واقعے کا بچانے اس نے شہاب نامہ میں ذکر کیوں نہیں کیا۔ اگر وہ سچا آدمی نہ ہوتا تو میں اس کی ہنسی اڑاتا۔ مگر میں سوچنے پر مجبور ہوا کہ کیا مادی اجسام غیر مادی قوتوں سے متحرک ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت کا سامنا کرنا بڑے دل گزدے کی بات ہے۔ مگر شہاب جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

شہاب ان افسوں میں سے تھا جنہوں نے بڑا نوئی استعمار کی بنیاد رکھی تھی مگر اس کے اور ہی لہجے تھے اڑیسہ کے چیف فیسٹر ہری کشن منتاب کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے اُس کے ہاتھ کانگریس کا ایک انتہائی خفیہ سرکلر لگا جس پر نمبر لگے ہوئے تھے۔ اس میں کانگریسی حکومتوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ چونکہ تقسیم ہند کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لیے مسلمان افسروں کو کیلیدی عہدوں سے ہٹا دیا جائے۔ تھانوں کا چارج بھی ہندوؤں کو دیا جائے اور پولیس کی مسلمان نفری کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ شہاب کو جھٹکا لگا، اس کی سرکاری تربیت اس کا راستہ روک

نسکی اور اس نے دہلی جا کر یہ دستاویز قائد اعظم کو دے دی۔ انھوں نے اسے ڈانٹا کہ تم نے اپنے فرائض میں غفلت برتی ہے تمہیں سرکاری راز افشاء کرنا چاہیے تھا مگر انھوں نے دستاویز رکھ لی اور پھر کانگریس حکومت کی منافقت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس موقع پر شہاب نے توہری کشن متاب سے ڈرا اور نہ اس نے قائد اعظم کی خطگی کا خیال کیا جو پٹے سے اُسے جانتے نہ تھے۔

اس میں بری کشن متاب کی بھی بڑائی ہے جس پر سردار پٹیل نے لعن طعن کی مگر اس نے شہاب سے شکوہ نہ کیا بلکہ پاکستان بن جانے پر اس نے کہا اگر سارے مسلمان افسر پاکستان چلے گئے تو ہندوستان میں مسلمان عوام کی خطرات کون کرے گا۔

شہاب نے سی ایس ایس پی افسروں کی بھری مجلس میں کچی خاں کے مارشل لا پر نکتہ چینی کی جہاں بڑی بڑی سینئر سی ایس پی زبانیں خشاہ کی مٹھاس سے چپک رہی تھیں۔ پھر اس نے نوکری سے استعفا دے دیا حالانکہ اس کے پاس کوئی سامان رست نہ تھا۔ وہ کوئی سیاسی آدمی بھی نہ تھا مگر وہ کچی خاں کو جانتا تھا اور مارشل لا کی خون آشامی سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کی واپسی ملک کی خانہ بربادی کا باعث ہوگی اور اگرچہ خود اس نے اس قوم شکن نظام کی کھائی میں اپنا پسینہ بھی ڈالا تھا، پاکستان سے اسے بہر حال محبت تھی اور عوام بھی اسے عزیز تھے کہ وہ بے گناہ تو صرف بوجھ ڈھونڈتے ہیں۔ کسی سی ایس پی افسر کا جو کہ اصلاً آئی سی ایس ہو اپنے عہدے کے بھرپور جلال کے باوجود کسی اصولی مسئلے پر جھک کر لاکر کے نوکری چھوڑ دینا اور جلاوطن ہو جانا غیر معمولی بات ہے۔

شہاب نے یہ غیر معمولی بات زندگی میں چار مرتبہ کی۔ بہار میں اُس نے اپنے انگریز افسروں کو جو کانگریسیوں کا ایک گاؤں جلانے کے لیے پٹرول کا ٹینکر ساتھ لائے تھے قید کر لیا اور یہ بات بھی ہم میں سے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔

لندن میں جلاوطنی کے زمانے میں اس نے ایک ایرانی پاسپورٹ پر خفیہ طور پر اسرائیل کا دورہ کیا اور وہاں سے یونیسکو میں پیش کرنے کے لیے وہ کتابیں لے آیا جو اسرائیلی مقبوضہ فلسطین کے مسلمان بچوں کو پڑھاتے تھے اور جن میں اسلام اور اسلامی نظریات کی ریڑھ ماری گئی تھی۔ اس قسم کے کارنامے باقاعدہ تربیت یافتہ جاسوس بھی مشکل سے کرتے ہیں مگر یہ کام معمولی قد و قامت کے ایک گول مٹولی سی ایس پی افسر نے کیا جس سے اس بات کی توقع بھی نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھے۔ اس قسم کی مہمات اس نے بہت سرکیں جن کے تذکرے سے کتاب بھری پڑی ہے۔ مگر شہاب کی سب سے بڑی بہادری یہ ہے کہ اُس نے پاکستان میں ایک پانی کی ٹوٹ مار بھی نہیں کی حالانکہ جتنے موقعے اسے ملے اور کسی کو ملے ہوتے تو صمم بھی کہتا ہری ہری !

ایسا جری شخص میاں افتخار الدین کے پاکستان ٹائمز اور امروز وغیرہ پر قبضے کے بعد اپنے عمل کے بارے میں ایسی پچھسی بات کرے جیسی کہ اس نے کی تو اس پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے اور جو لوگ کسی بھی طور اسے معاف کرنے پر تیار نہیں وہ سچے ہیں۔

شہاب لکھتا ہے پاکستان ٹائمز کا اگلا شمارہ پریس میں جانے کے لیے تیار ہوا تو ایک ایڈیٹوریل کسی نے نہ لکھا تھا۔ جنرل شیخ اور بریگیڈیئر الیت، آرخاں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ آج کا ایڈیٹوریل لکھ دوں۔ مجھے اس میں کلام تھا کہ مجھے صحافت کا عملی تجربہ نہیں ہے اور یہ سپرِ قلم کرنے کا۔ اس کے علاوہ مجھے تو ابھی تک یہ علم بھی نہ تھا کہ اس اخبار کو حکومت کے قبضے میں لینے کے کیا کیا محرکات تھے۔ اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ وہ کیا الزامات تھے جن کی پاداش میں سرکار نے اتنا شدید اور غیر معمولی قدم اٹھایا ہے۔ اس لاعلمی کی وجہ سے میں کوئی پُر معنی اور معقول اداریہ لکھنے سے قاصر تھا لیکن بریگیڈیئر الیت آرخاں بھی انتہائی ضدی اور اڑیل ذات شریف تھے۔ وہ اپنے اصرار پر اڑے رہے اور آخر مجبور ہو کر میں نے جنرل شیخ کے بتائے ہوئے خطوط پر وہیں کھڑے کھڑے بے دلی سے ایک مختصر سا اداریہ گھسیٹ دیا جو نیولیت (NEW LEAF) کے عنوان سے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا۔ یہ تحریر کسی صورت بھی میرے لیے باعثِ فخر و مباحثات نہیں بلکہ دراصل یہ نامعتولیت اور کج فہمی کے اس پھندے کی حکاسی کرتی ہے جو ایک سرکاری ملازم کو بسا اوقات اپنی مجبوریوں کے دباؤ میں آکر خواہی نہ خواہی اپنے گلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔

شہاب یہاں جتنا بودا اور فضول آدمی نظر آتا ہے اس کی کہیں مثال نہ ملے گی۔ بھلے آدمی اگر تم مان لیتے کہ پروگریسو پیپر کے تم دل سے خلاف بھی تھے کیونکہ وہ سوشلزم کا دم بھرتے تھے اور بین الاقوامی امور میں کمیونسٹ ممالک خاص طور پر سوویٹ یونین کی حمایت کرتے تھے جو نظریاتی طور پر ہمیں ناگوار گزرتی تھی کیونکہ جیسا کہ پرانے نوآبادیاتی مغربی نظام کے حامی کہتے چلے آئے ہیں۔ کمیونزم کا خدا اور مذہب کی دشمنی کے سوا اور کوئی کام نہیں اور تم بھی یہی سمجھتے تھے۔ سرمایہ داری پر حسد بہ کرتا ہے تو دراصل وہ الحاد پھیلاتا ہے۔ اور تم نے جو کچھ جنرل شیخ کے بتائے ہوئے خطوط پر جو اداریہ لکھ کر دیا اس میں تمہاری اپنی آگاہی بھی شامل تھی اگر تم یہ سب کچھ مان جاتے تو تمہارا کچھ بھی نہ بگڑتا جب تم آخری مرتبہ میرے گھر آئے تو محض مجھے ملنے کے لیے نہیں آئے تھے، تمہارے ضمیر کا فرنگی کوڑے مارتا ہوا انہیں پکڑ کر لایا تھا کیونکہ تم نے اقبال جرم بھی کھلے دل سے نہ کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ دم آخر تمہارے دل میں کون کون سے کانٹے چبھے رہ گئے مگر یقیناً ایک کانٹا پروگریسو پیپر نے لمیٹڈ کا بھی تھا۔

میں اس قابل نہیں کہ کسی کے لیے دعا کر سکوں، مگر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری روح کو سکون عطا کرے کیونکہ تم بنیادی طور پر ایک انکسار پسند تھا اور نیک شخص تھے اور تم نے بے شمار لوگوں کو جن میں بعض نااہل

اور بے ایمان بھی تھے کسی ذاتی لاپچ کے بغیر غائب ہو گیا۔ ایسا کوئی جرم نہیں جو کسی سی ایس پی نے نہ کیا ہو اور تم اپنے جرم و انگسار کے باوجود سی ایس پی بھی ضرور تھے۔ تم جب اس کیچر میں پوری طرح لتھڑ گئے تو پھر اسے پسند بھی کرنے لگے کیونکہ جیسے کہ تم نے شہاب نامہ میں لکھا ہے حسب ضرورت دنیا کو بھی ہاتھ میں رکھنا چاہیے اگرچہ متعین نہیں کیا کہ حسب ضرورت کی حد کہاں تک ہے!

شہاب نے ایوان صدر میں معززین کی قلابازیاں بھی دکھیں۔ ٹیڑھے انگٹوں میں سیدھے اور سیدھے انگٹوں میں ٹیڑھے ناپچ بھی دیکھے اور جاہ و جلال کے چہرے پر زردی اور بدن پر لرزہ بھی دکھا وہ کبھی برسرِ بام آکر مرغِ بلبل کے ترپنے کا بھی مظاہرہ کرتا تھا مگر تماشائی کا چولا اس نے سوچ سمجھ کر پہن رکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے اتار کر پھینک دیتا تھا، ایک نوکری ہزار افسانے!

مگر میں تو شہاب نامہ پر مضمون لکھنے چلا تھا یہ قدرت اللہ شہاب بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا۔
قدرت اللہ شہاب بیچ میں کہیں نہ کہیں سے آہی ٹپکتا ہے اور بعض ایسے لوگ بھی اسے گالیاں دیتے ہیں جنہوں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔

جس طرح بعض لوگ ایسے بھی اس کے شناخاں ہیں جو اس سے کبھی نہیں ملے۔ وہ ایک خاموش آدمی تھا اور اپنی خاموشی سے اُس نے میرے پٹے جو تیرے منہ پر بھی چپ کا ڈھانٹا باندھ دیا۔ یہ بات نہیں کہ میں اس کے آگے بولتا نہ تھا مگر اس نے میرے دل میں اپنی عظمت کا شک ڈال دیا تھا اور مجھے اس سے جھگڑا کرتے وقت اچانک اس بات پر شرمندگی ہونے لگتی تھی کہ وہ تو میری ہاں میں ہاں ملتا رہا ہے میں کس پر خفا ہو رہا ہوں۔

شہاب دنیا داری کے بھید خوب جانتا تھا اور جب ضروری سمجھتا تھا تو جھوٹ بھی بول دیتا تھا۔ اس کے جھوٹ یا تو دفتری کاموں سے متعلق ہوتے تھے یا کسی کی دل جوئی کی خاطر کسی کو دھوکا دینے یا کوئی فائدہ اٹھانے کے لیے اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جھوٹ بول کر وہ کسی فضول ذمہ داری سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسے سرکاری کاغذ بھی چھپاتا تھا جن سے افسروں کو ظلم کرنے کا جواز ملے۔ ایسے موقعوں پر وہ ایسے گول مول نوٹ لکھتا تھا جن کے دو دو تین تین معنی ہوں۔ وہ اپنی تکمیل ذات کے راز بھی نہایت دیدہ دلیری سے چھپاتا تھا۔ مبہم گوئی کا وہ گاماں پہلوان تھا مگر صاف گوئی میں بھی اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی صاف گوئی بعض منتخب لوگوں کے لیے ہوتی تھی۔ بعض اوقات ایوب خاں اس کا نشانہ بنا۔ کبھی کبھار جھوٹ نے بھی کڑوی سیلی سنی۔ سبھی خاں کا ذکر میں کر ہی چکا ہوں۔ ان کے علاوہ کئی وزیرِ سفیر اور امریکی ڈپلومیٹ اس کی زبان سے زخمی ہوئے۔ مگر جھوٹے ٹوٹے ٹوٹے کی تلخ ترشش پر اُسے غصہ نہیں آتا تھا۔ ان کے حضور میں عاجزی سے ہکلاتے دیکھ کر یہ قیاس کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ اتنی سی ایس کے زمانے میں اس نے ایک انگریز افسر سے چانٹا کھا کر چانٹا جڑا دیا تھا اور سی ایس پی کے زمانے میں مری کے مقام پر اُس نے صدر ایوب

نواب کالا باغ اور منعم خاں کی موجودگی میں ایک وزیر خزانہ کا گال سجا رکھا تھا جو کھلم کھلا پاکستان کو امریکہ کا پائیدار بنانا چاہتا تھا۔

جب امریکی افسروں نے اسے ایوان صدر سے نکلوا دیا تو وہ اپنا گال سہلاتا ہوا ہالینڈ چلا گیا۔ شہاب کے اندر کا آئی سی ایس جانتا تھا کہ میرے چاٹنے کی انتہا کیا ہے۔

جب ممتاز مفتی نے مجھ پر اس کی روحانی عظمت کا بہت رعب ڈال کر اسے قضا و قدر میں ذخیل بنایا تو میں نے سوچا کہ میں شہاب سے بھی پوچھ لوں۔ ممتاز مفتی میں لاکھ خرابیاں ہوں گی مگر وہ ایک سچا آدمی ہے اور ان سے کبھی جھوٹ نہیں پڑتا جن سے وہ اخلاص رکھتا ہے یا جو سچے کی کڑواہٹ برداشت کر سکیں۔ میں اسے ایک نامعقول اور توہم پرست آدمی سمجھتا ہوں جس کا مشکا احساس کی دولت سے باللب بھرا ہے، بیان کی ندرت بھی رکھتا ہے مگر عقل اور معقولیت کو جسے شہاب شرط ایمان قرار دیتا ہے اپنے محلے میں گھسنے نہیں دیتا۔ وہ اپنی جہت پر خوش بھی بہت ہے۔ اسے کوئی شخص عقلمند کہے تو اسے بے لفظ سناتا ہے۔ میں نے چونکہ یہ غلطی کبھی نہیں کی اس لیے میری اس کی بہت اچھی گزری۔

اس نے جب شہاب کی روحانی عظمت کا مصلّا بچھا ہی دیا تو پوچھا ”شہاب صاحب! ممتاز مفتی کہتا ہے کہ آپ کوئی بہت پہنچے ہوئے ولی ہیں آپ میرے سامنے بھی اعتراف کر لیں تو اچھا ہے۔“

”مگر آپ کا کیا خیال ہے؟“ شہاب نے سادگی سے پوچھا ”آپ بھی مجھے جانتے ہیں، آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟“

میں نے جواب دیا: ”میرے خیال میں آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ مذہب پر آپ کا اعتقاد پختہ ہے۔ آپ بہت چالاک بہت منجھے ہوئے بیوروکریٹ ہیں اور درجہ دوم کے ادیب ہیں شاید اس سے زیادہ ہوں میں نے صرف آپ کی یا خدا پر مبنی ہے یا کچھ افسانے۔ سوشلسٹوں کو آپ شیعہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔“

”آپ ہی درست سمجھے۔ میں دراصل ایسا ہی ہوں جیسا آپ نے بتایا۔ مگر یہ ممتاز مفتی مجھے جینے نہیں دیتا۔ وہ میرے چہرے پر ڈاڑھی لگا کر سر پر سبز غلام رکھ دیتا ہے۔ اب اس خیال سے کہ اس کی توقعات پر پورا اتر سکوں، میں جو تھوڑی بہت عبادت کر سکتا ہوں کر لیتا ہوں۔ پیر اور ولی تو وہ ہے جو لامٹی لے کر مجھے صراطِ مستقیم پر قائم رکھتا ہے ورنہ میں ایک دنیا دار آدمی ہوں۔ کچھ اچھی باتیں اگر آپ کے خیال میں مجھ میں ہیں تو کچھ اچھی باتیں آپ میں بھی ہیں اور آپ بھی ولی ہیں۔ خوبیوں کی کچھ نہ کچھ ولایت سے کوئی بھی محروم نہیں۔“

شہاب نے بات سادگی سے کہی ہوگی مگر جس پر کاری سے اس نے مجھے جواب دیا اس سے ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ وہ کسی راز کا امین ہے۔ مگر میں نے اس خیال کو وہیں چھوڑ دیا۔ ممتاز مفتی شہاب

کی عظمت کے افسانے سنا کر دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ میں علت اور معلول کی منطقی میں پھنسا بیٹھا تھا اور اس کی بات سن کر بھی اپنے سر پر قلندری کا استرا پھر دانے پر تیار نہ تھا۔ میری بلصیہی پر اسے سخت غصہ آتا تھا مجھ پر خاص کیونکہ اسے میرا بڑا خیال ہے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں ان ہکات سے محروم ہو جاؤں جو شہاب کے قرب کی وجہ سے میرے آس پاس بکھری پڑی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اسے مرشد بان کر اور اس کی پیروی کر کے دنیا میں مجھے جو تیکہ میسر آسکتا ہے میں اس کے بغیر بھگتا ہوا مر جاؤں۔ وہ میری جہالت پر بہت کڑھا۔ اس نے اپنا جی بہت جلایا۔ مگر میں اس کے ہاتھ نہ آیا اور یہ اس کے دکھوں میں ایک دم ہے۔

شہاب کا طریقہ دوسرا تھا اس نے کبھی کسی کو سیدھا راستہ نہیں دکھایا۔ کسی نے پوچھا تو اس کی رہنمائی کر دی کہ آپ فلاں دُعا پڑھیں فلاں وظیفہ کریں۔ جب کچھ بتاتا تھا تو ایک عام مولوی یا پیر لگتا تھا جس کی نگاہ یا جس کے کلام میں بجلی کا کوئی لوندانہ نہیں لپکتا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے میرا افسر بھی رہا۔ اس لیے اس کے بعض رویوں کا میں ذاتی طور پر شاہد ہوں۔

مجھے اس کے شروع کے روز شب کا علم نہیں مگر جب میں نے اُسے قریب سے دیکھا تو وہ سرکاری فوکر کی کاتت نکال کر مزے میں بیٹھا تھا۔ وہ مجھے کہتا کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں فقط خال بھرنی چاہیے۔ میں نے کام کرنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ کر سکا اور اس پر مجھے ذاتی طور پر تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ یوں بھی کرنے کے کام سال بھر میں دس سے زیادہ نہیں ہوتے اور میں سال میں دس کام بھی کرتا ہوں۔ باقی روٹین ہے۔ اس میں غلط اور صحیح سے کچھ فرق نہیں پڑتا اور چھوٹے قصاتی، سیکشن افسر اور ڈپٹی سیکریٹری خوش ہو جاتے ہیں کہ صاحب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم جو چاہیں اس سے کروالیں۔ اس طرح وہ زیادہ فرمانبردار ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا طریقہ ہے مگر تم چونکہ نہایت کچی فوکر کی پر ہو اور بہت تیر مارو گے تو دو چار سال نکال کر پنشن کے بغیر ریٹائر ہو جاؤ گے۔ تمہیں کام بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ سیکریٹری میں تمہارے دشمن پیدا ہو جائیں گے اور تمہارا پتہ بہت جلد کٹ جائے گا۔

وہ مجھے کہتا تھا کہ اصول اور فلسفہ اپنی جگہ درست ہے مگر عملی حقیقت یہ ہے کہ ریاست اور حکومت میں کوئی فرق نہیں اور بیوروکریسی ریاست صرف اپنے آپ کو سمجھتی ہے تم حکومت کے خلاف زبان بند رکھا کرو تاکہ تم پر ریاست سے غداری کا الزام نہ لگے۔ شکر کرو کہ ہماری ریاست ابھی پوری طرح فاشسٹ نہیں ہوئی ورنہ تم اب تک کئی مرتبہ پھانسی پر لٹکا دئے گئے ہوتے۔ وہ مجھ سے ایسی عجیب عجیب باتیں کہتا تھا جو تھوڑے عرصے کی فوکر کی تجربے کی روشنی میں بھی مجھے صحیح لگنے لگیں مگر میں نے اس کی کوئی بات نہ مانی اور اس کی پیش گوئی کے مطابق سیکریٹری میں پرانگو خیالی پھیلا کر اور اپنا پتہ جلدی کٹوا کر گھر آ گیا۔ اس پر بھی شہاب کو کوئی خاص قلق نہ ہوا میرے آخری وقت میں وہ حکومت سے الگ ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود اس نے میرے بچاؤ کی کوشش کی۔ اس عظیم سول سروس کی روایت ہے کہ اگر کوئی ریٹائرڈ ونسی ایس پی افسر

کسی حاضر نوکری سی ایس پی افسر سے کوئی درخواست کرے تو اسے حکم سمجھا جاتا ہے مگر شہاب نے میرے سلسلے میں جو ڈی او لکھا حاضر نوکری سیکرٹری نے اسے نظر انداز کر دیا اس پر شہاب کو جو صدمہ ہوا ہو گا اس کا اس نے مجھ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ مجھے تمہاری بیروزگاری پر تشویش ہے۔ اس نے میرے لیے قضا و قدر پر بھی کوئی ہاتھ نہ ڈالا حالانکہ وہ مجھے عزیز جانتا تھا۔

شہاب بالعموم مصیبت زدہ لوگوں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے سے اجتناب کرتا تھا کیونکہ پھر اس پر ان کی امداد کرنے کی ذمہ داری آن پڑتی تھی۔ ایک اس کا یہ فلسفہ بھی تھا کہ مصیبت زدہ آدمی تقدیر کے کسی امتحان میں سے گزر رہا ہے۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے مگر وہ اپنے قریبی دوستوں کی امداد سو قانون توڑ کر بھی کرتا تھا اور اس سلسلے میں جائز ناجائز کی پروا بالکل نہ کرتا تھا اس کے خیال میں نوکری اور روزگار میں جائز اور ناجائز کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس کو اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ کون حکومت کو کتنا ٹوٹ رہا ہے! حکومت اس کے خیال میں خود لٹیری تھی جس نے ریاست بھی لوٹ کر گھر میں ڈال لی تھی۔ اس لیے اگر اس کا کوئی دوست لوٹ لیتا بشرطیکہ حسب حیثیت لوٹتا تو وہ بُرا نہیں مانتا تھا اور جو نہیں لوٹتا تھا اس کے بارے میں بھی نہیں کہتا تھا کہ دیکھو بیچارہ کتنا ایمان دار آدمی ہے!

ایک مرتبہ اس نے میری تبدیلی ایک ایسے عہدے پر کرنی چاہی جہاں ٹوٹ مار بہت تھی میں نے انکار کر دیا تو اس نے پوچھا، آخر وہاں آپ کو ایسی کون سی تکلیف ہے؟ میں نے کہا اگر یہاں میں دس لاکھ روپے رشوت لوں گا تو بدنام بھی ہو جاؤں گا اور کامیاب بھی ہو جاؤں گا اور اگر میں دس لاکھ روپے کی رشوت نہیں لوں گا تو بدنام بھی ہو جاؤں گا اور کامیاب بھی نہیں ہو سکوں گا، اس لیے

”تو پھر آپ رشوت لے لیں اور کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔“ اس نے کہا
”جی نہیں، میں رشوت نہیں لے سکتا، مجھے لاکھوں کی حسرت بھی نہیں۔ دو ڈھائی ہزار ماہوار میرے لیے کافی ہیں۔“

”اچھا تو پھر جانے دیں۔“

یہ بات بھی اس نے اسی لاپرواہی سے کہی جس لاپرواہی سے اس نے کہا تھا کہ رشوت لے لو اور کام کرو۔ رشوت لینے والوں پر اسے ایک اعتراض ہوتا تھا کہ رشوت لیتے ہیں تو کام مکمل نہیں کرتے۔ مجھ سے شہاب کی بات چیت عملی زندگی کی سطح پر ہوتی تھی اس نے مجھے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میں کسی معاملے میں اس سے یا اس کے کسی دوست سے کسی بھی طرح کم ہوں حالانکہ میں بہتوں سے کم ہوں اور یہ

بات میں رہتا نہیں کہتا۔

اس کی مجلس کے جن مستوں پر انگلیاں اٹھتی ہیں ان میں ابن انشا جیسے بے خبر جہیل الدین عالی جیسے خبردار، اشفاق احمد جیسے بقا بالعثق اور ممتاز مفتی جیسے فنا فی العشق لوگ شامل ہیں باوجود اس کے ان میں سے کوئی بھی طرح مصرع کی غزل نہیں اور ان میں وہ سفید پروں والی بھیری ہانوقہ سیہ بھی بیکل مارے بیٹھی ہے۔ وہ اڑتی ہے مگر اشفاق احمد کے بادلوں کے شامیانے کے اندر اندر اور انسان لباس طعام ترک کر کے یہیں تک جا سکتا ہے اس سے اُوپر کھلنے کے لیے عقیدوں اور عصبیتوں پر قہقہہ کرنے پڑتے ہیں۔

ہانوقہ سیہ کو اس قدر ہنزا احساس اور قوتِ اظہار ملی ہے کہ اگر وہ اس سے آگاہی پھیلانے کا کام لیتی تو راستوں میں چراغ جلنے لگتے۔ اگر وہ بے خبر ہوتی تو گلہ نہ ہوتا مگر وہ بارہ سروں کے بھراؤ کے بھیروی ہو کر تین سر نہیں لگاتی۔ سات سروں کی دُندھی مار کر بھی کمپورن ہے۔ وہ انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتی ہے مگر اس کی فطرت کو اگر وہ کی فطرت سے قیاس کرتی ہے جو غلاظت کھاتا ہے تو کہتی ہے دیکھو بیچارہ اپنی فطرت سے کتنا مجبور ہے مگر کیا وہ اتنی گودن ہے کہ وہ انسان اور گدھ کے فرق کو نہیں جانتی؟ نہیں نہیں وہ بے ایمانی کرتی ہے تاکہ اس کا جاگیردار اس سے خوش رہے جس کا جی اپنے بچپن میں جاٹکا ہے جہاں اپنی دادی کی گود میں بیٹھ کر مکھن کا پیڑا کھایا کرتا تھا اور کتوں کے بیٹے اس کی بھینسیں چرایا کرتے تھے۔

ہانوقہ سید عورت سے نفرت کرتی ہے۔ کہتی ہے کہ یہ ایک بے وفا جنس ہے۔ مرد سے پیار نہیں کرتی بلکہ اس کی نظر اس کی ڈاب میں ہکتے ہوئے نچتے پر ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہو گا مگر وہ عورت کو اس کی فطرت کی رعایت بھی نہیں دیتی۔ وہ خود جہنم سے متی مانتا ہے اور مرثیہ چٹا پر بیٹھتی ہے۔ یہ ہندو عورت کا تصور ہے۔ عیسائی عورت کا تصور ایک گنہگار کا ہے۔ مسلمان عورت کا تصور ایک کینز کا ہے اور وہ ان تینوں تصورات کے سہاگ پڑے سے جوڑا سمجھا کر اپنی نفی کرتی ہے کیونکہ اس کا سب سے بڑا تضاد اس کا اپنا وجود ہے، وہ عورت سے نفرت کرتی ہے کیونکہ وہ اس کی ہم جنس ہے مگر وہ اتنی غیر منطقی اور بے رحم نہیں کہ خواہ مخواہ اپنی کمزور، مظلوم اور بوجھ ڈھونڈ والی بہن سے بیر رکھے۔ اس کی کچھ عجوبیاں اور معذرتیں ہیں جنہوں نے اس کے ایمان کو دبایا ہوا ہے اور اس دباؤ ہی میں اُس نے اپنی ذات کو کھویا بھی اور پایا بھی۔

ابن انشا ایک سیدھا سادہ رومانٹک آدمی تھا جو لذاتِ زندگی کے لیے اپنا خون پی اور پلہا سکتا تھا۔ وہ ایک دُنیا دار شخص تھا اور اس بات کو مانتا بھی تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں اپنی ذات سے بالا ہو کر سوچنے کی صلاحیت نہیں تھی یا مرگِ مغاہات پر اسے حاکم پر غصہ نہیں آتا تھا یا وہ اسے اللہ کی رضا سمجھتا تھا۔ وہ ایک بے ریا شخص تھا۔ وہ غم خور بھی تھا۔ لطیف گو بھی تھا۔ حسن پرست بھی تھا اور اسے کسی ایسی روحانی بلندی کی آرزو بھی نہ تھی جس کا مقصد اپنی ذاتِ گرامی کے لیے اس حیاتِ مستمار میں یا حیاتِ بعد از حیات کی ابدیت کے لیے جنت الفردوس

حور و قصور، شراب طہور، سدرۃ المنہا، شاخ طربی یا آسمان کے کسی گوشے کا استحقاق حاصل کرنا ہو۔ وہ تو اس زندگی میں بھی سکون قلب کا طلبگار نہیں تھا اور پرچھیوں لمبوں سے اپنے دل کو چھلیا رہتا تھا۔ اسے اس بات پر بڑی غمی آتی تھی کہ اگر کوئی کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو کسی دوسرے مصیبت زدہ شخص کی دامن درمے امداد کر کے اٹھائے گا اور راضی کرنے کی بجائے نفل پڑھنے میں رات بتا دے اور یہ بات وہ شہاب سے بھی کہتا تھا۔ خود ایک مرتبہ اپنے بچے کی بیماری کے دکھ میں ایک بھکارن کو جس کی گود میں ایک نیمخف تجتہ تھا اچانک دو ہزار روپے دے دیے اور وہی اس کی روحانیت تھی۔

انشا اپنی تمام تر روحانیت کے ساتھ ساتھ ایک پریکٹیکل شخص تھا۔ جو تھوڑی بہت جائیداد اس نے پیدا کی اخلاقی اور ملکی قوانین کے مطابق بنائی اور اس پر اس نے کبھی معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ مگر اسے عوام الناس کا غم بھی ستاتا تھا۔ اسے پرانے نظام سے بھی نفرت تھی۔ وہ باغیوں سے محبت کرتا تھا۔ وہ ایک باشعور مڈل کلاس سیٹھا تھا۔ شہاب اسے بہت چاہتا تھا۔

شہاب جمیل الدین عالی کو بھی بہت چاہتا تھا مگر وہ ایک مراعات یافتہ مڈل کلاس سیٹھا ہے۔ انسان ہرے پیٹ کی ضرورت میں جس قسم کے غم پال سکتا ہے عالی نے وہ سارے غم پال رکھے ہیں۔ اس کے مزاج میں اور اس کے کلام میں آہا اودل کا لٹکا بھی ہے اور یوپی کے ریس زادوں کی رضا بھی، جو تو نگری اور خود پرستی کی دین ہوتی ہے۔ پاکستان سے اس کو اس لیے بھی عشق ہے کہ یہیں آکر اس نے اپنے آپ کو دریافت کیا۔ چھپ تو وہ ہندوستان میں بھی نہ سکتا کیونکہ منہ زور آدمی ہے مگر کمان اس کی اس طرح نہ چڑھ سکتی۔ اس کا اپنا تحفظ ہو چکا مگر وہ جانتا ہے کہ وہ اقدار جن کو لے کر وہ گھر سے نکلا تھا خطرے میں ہیں۔ وہ سیانا بہت ہے اس لیے بڑا کسی کو نہیں کہتا، مگر نصیحت ہر ایک کو کرتا ہے۔ اس طرح بھی بعض لوگ بزرگ بن جاتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں عدل کا دور دورہ ہو جائے، لوگ سچے پاکستانی بن جائیں اور کچھ تبدیلی بھی نہ ہو۔ اس کو ایوب خاں کی کوتاہیوں پر بڑا غصہ آتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ وہ اگر ہماری بات ماننا نہ ہوتا تو ہم اسے نہرو سے بڑا آدمی بنا کر چھوڑتے۔ وہ پاکستان کے زوال پر دل سے روتا ہے مگر اس کو بالکل یاد نہیں کہ اس کا عروج اس وقت شروع ہوا تھا جب ایوان صدر میں اس کے سانسوں کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ وہ ایک پر شکوہ خردماغ باشعور مڈل کلاس سیٹھا ہے جو جانتا ہے کہ مراعات یافتہ طبقہ تاریخ کے بہاؤ میں ہے اور اگر محروموں اور مظلوموں کو زندگی کے اسباب اور کم سے کم عزت نفس نہ ملی تو دریا چٹانیں توڑ کر اور پہاڑ کاٹ کر نکل جائیں گے۔ پھر نہ رہے گا جمیل الدین عالی اور نہ بچے گی بانسری۔ شہاب جس کے نغمے بڑے شوق سے سنتا تھا۔

اشفاق احمد یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ وہ تاریخ کے جبر سے نا آشنا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ ساری شورش چند شورش پسند سٹلسٹوں کی پھیلائی ہوئی ہے جو خواہ مخواہ زمینداروں کے دشمن ہیں۔

غیر ملکی سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ ملا کے مذہب کو نہیں مانتے اور اسلام اور اتحاد کے نام پر حکومت کرنے والے طبقوں کے رقیب ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اگر پاکستان ان چند شر پسند سوشلسٹوں کے وجود سے پاک ہو جائے تو ملک طبقاتی انتشار اور تضادات سے پاک ہو جائے اور ان کو کوئی صدمہ نہ پہنچے جن کو کبھی صدمہ نہیں پہنچا۔ وہ درد مندی سمجھاتا ہے کہ لوگو! تم کتنے ناشکرے ہو۔ پاکستان نے تمہیں کیا کچھ نہیں دیا۔ یہ جنگل، پہاڑ کس قدر خوشنما ہیں۔ ان کے سینوں میں کتنے دھننے ہیں! افسوس! تم نے مشرقی پاکستان کھو دیا۔ مشرقی پاکستان کے اتنا س کس قدر شیریں ہوتے تھے! نظام کو تبدیل کرنے کے چکریں پڑنے کی بجائے اب ہمیں چاہیے کہ ہم حق ہمسایگی ادا کریں اور انفرادی طور پر جس کی حاجت روائی کر سکیں، دریغ نہ کریں۔ یہ نظام تبدیل کرنے والے سنگدل ہیں، نظریہ پاکستان کے دشمن ہیں، روسی اور بھارتی ایجنٹ ہیں۔ ان عوام عوام پکارنے والوں پر کڑی نظر رکھنا چاہیے۔ عورتوں کا بھی مغز پچی کرنا چاہیے جو حقوق مانگنا سیکھ گئی ہیں۔ اب کوئی کس کس کو حقوق دے!

اشفاق احمد ایک ہنرمند بڈل کلاسیا ہے جو ادب اور تخلیقی عمل سے صرف اپنے خیالات کے پرچار کا کام لیتا ہے اور پروپیگنڈے کی خاطر اس نے ادب تک کو ترک کر دیا جس کی صلاحیت اس میں بے پایاں تھی۔ اب چونکہ اس کی جھولی موتیوں سے بھری ہے اس لیے اس کے پڑھنے اور دیکھنے والے ایسے بھی ہیں جن کو بعد میں غصے سے تپ چڑھ جاتا ہے۔

اشفاق احمد عمدہ خیالات کا ایک بہت بڑا بورا ہے۔ زندگی کو اس نے گلے لگا کر دکھا کر وہ ان جہانوں کے راستے بھی پوچھتا ہے جو ستاروں سے آگے ہیں۔ تلاش اس کا عہد ہے۔ اُس کے چاہنے والے بہت ہیں مگر وہ یا تو خوشحال لوگ ہیں جنہیں نصیحت کرنے اور نصیحت سننے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا یا ڈرے ہوئے ناکام لوگ جنہیں مایوسی کی انتہا پر پہنچ کر یا شکست قبول کرنے کے بعد وعدے اچھے لگتے ہیں۔ اشفاق احمد کو بطور فنکار نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا کوئی ایسا ہے بھی نہیں جو اتنے تسلسل اور یقین کے ساتھ حقیقتِ منتظر کی نفی کرتا ہو۔ وہ کسی ایک مظلوم پر رحم کھا سکتا ہے مگر کشکول سازی کی صنعت بند کروانے کے لیے کچھ کرنے پر تیار نہیں۔ ظالم کے خلاف کوئی ثبوت ابھی تک اس کو ملا نہیں۔ طبقوں کے ذکر سے اس کا جی مالش کرنے لگتا ہے اس کے نزدیک فرد ہی مرکز کائنات ہے۔ اجتماع کو وہ سالم اکائی نہیں سمجھتا اس نے ذاتی طور پر بھرپور زندگی بسر کی جس میں زیادہ وقت اس نے جاگ کر اور دیواروں پر تصویریں لٹکا کر گزارا۔ وہ ایک مشقتی قیدی ہے۔

شہاب کے دوستوں میں سب سے بے لوث، سب سے زیادہ عقیدہ پرست، سب سے زیادہ غلصہ، سب سے زیادہ جذباتی اور سب سے بڑا اہل متنازع مفتی ہے۔ اس نے شہاب سے محبت ہی نہیں کی اُسے پوجا بھی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بھی فائدہ نہیں اٹھایا مگر اس کو اپنے کردہ گناہوں کی جب بھی سزا ملی اس نے فرض کیا کہ میں نے تو کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ یہ شہاب ہے جس نے تربیتِ نفس کے

کسی پھیر میں مجھے امتحان میں ڈال رکھا ہے اور بعض اوقات اس نے شہاب سے اس کا گلا بھی کیا۔ وہ ایک بے شعور شخص ہے۔ جوانی میں وہ برٹرینڈ رسل کا مرید رہا اور اب بھی اس کی عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ مگر وہ سمجھتا ہے کہ زندگی ظالم اور مظلوم، اونچے اور نیچے اور اچھے اور بُرے کے معاہدے کا نام ہے۔ دنیا ازل سے اسی طرح چلی آتی ہے اور اب تک اس کا ٹھک تبدیل نہ ہوگا اس لیے اس کو امنگ میں عمر ضائع نہ کرنی چاہیے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ انسان فعل مختار نہیں۔ وہ طرح طرح کے دھاگوں سے لٹکا ہوا ایک پیٹ ہے جسے بچانے والے چھپ کر بیٹھے ہیں، کچھ ایک مزار میں کچھ دوسرے مزار میں جن کی اپنی اپنی ولایات اور اپنی اپنی بادشاہتیں ہیں۔ یہ ان کا کام ہے کہ جس کو چاہیں اس کی اللہ کے حضور میں فائل پیش کر دیں یا رسول اکرم کی بارگاہ میں شفاعت کی سفارش کر دیں۔ اب جس پر ان کی نگاہ نہیں پڑی وہ پیاسا بھٹکتا پھرے چاہے وہ اپنے طور پر رحم کا کیسا ہی حقدار کیوں نہ ہو۔ اس لیے وہ اس کوشش میں رہا کہ جو اس کے پیارے ہیں وہ ہمیشہ بزرگوں کی نظروں میں رہیں۔ وہ ایک بے مثل ادیب ہے جو نئی تھیمیں، نئے نظریے اور نئی نگاہیں لے کر آیا۔ قاری نے اُسے آنکھوں پر بٹھایا مگر وہ اس کے لیے کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ پڑی ہوئی چیزوں کو چھیڑنا ادیب کا کام نہیں۔ ادیب کی حیثیت سے وہ کوئی سماجی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اس معاملے میں اتنا آڑیل ہے کہ شہاب کی بات بھی نہیں مانتا۔ وہ نہیں جانتا کہ ادیب لفظوں کا سوداگر ہوتا ہے اور لفظ اگر سوشل کنٹریکٹ نہیں ہوتے تو کتے بٹے کی آواز ہوتے ہیں۔ سماجی ذمہ داری لفظوں کی سرشت میں نہیں ہوتی تو پسیدہ ہی نہ ہوتے اور حیوانوں کو اسی لیے لفظ نہیں آوازیں ملی ہیں۔

وہ اپنے مسلک میں شہاب کو جو مقام دیتا ہے خود شہاب نے کبھی اشارے سے بھی اس کی تصدیق نہیں کی مگر ممتاز مفتی نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی گپت گوروا اپنے بھید نہیں بتاتا۔ اس کا مقام اس سے نہیں کوئی مجھ سے پوچھے۔ شہاب کے بارہ حواریوں میں یہی تھے جن کو میں کسی حد تک جان سکا۔ یہی اس کے ٹوٹا، یوحنا، پطرس اور متی ہیں اور جو حدیث وہ بیان کریں گے وہی انجیل ہوگی۔ مجھ بے جال پھیرے کے ہاتھ تو کچھ بھی نہیں آیا۔

مگر مرشد اور مرید سب کے سب ڈل کلاستے ہیں۔ اپنی نیک دلی، روحانیت اور عجز و انکسار کے باوجود ان میں سے کسی نے اپنے طبقے سے بغاوت نہیں کی۔ خالق اور مخلوق کو سب نے ہمیشہ الگ الگ رکھا اور ایک کو دوسرے کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ سب کا بھلا چاہتے ہیں مگر سب کے بھلے کے لیے خود کچھ کرنے پر تیار نہیں۔

ڈل کلا سے مراد ایک خاص قسم کی نفسیات ہے۔ اس نفسیات کے مالک دینی اور دنیوی امور میں اپنی ذات کے لیے ادنیٰ سے اعلیٰ کے سفر پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر جن امور میں سے ان کا ذاتی نفع خارج ہو وہ

فقر ہی کا میدان کیوں نہ ہو ان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ مجھے اہل سلوک سے یہی لگ رہا۔ خدا کی خلقت میں سے جو ذاتی طور پر ان کے پاس پہنچ گیا اس کی امداد اگر وہ خوش ہو گئے تو انہوں نے حسبِ توفیق کر دی۔ مگر ایسے معاشرتی نظام کو جس کی بنیاد ظلم پر ہو تبدیل کرنے میں وہ یقین نہیں رکھتے۔ یہی نہیں جو لوگ تسبیح کی بات کرتے ہیں وہ ان پر شبہ کرتے ہیں یا انہیں حقیر جانتے ہیں یا قابلِ رحم سمجھتے ہیں یا گردن زدنی قرار دیتے ہیں کہ ہونہ ہو وہ سیدھے سیدھے اللہ کے دشمن ہیں، ملک اور قوم کے دشمن ہیں اور ایسوں کو فنا ہو جانا چاہیے۔ شہاب ایک جالی آدمی تھا۔ اس نے اپنے اظہار پر قابو پایا تھا مگر اس کے حلقہ نشینوں کا رویہ یہی ہے وہ دنیاوی لحاظ سے بڑے چھوٹے میں فرق کرتے ہیں۔

ممتاز مفتی ان میں ایک چھوٹا آدمی ہے وہ یقین کرنے والوں میں سے ہے۔ وہ روپے پیسے یا جاہ و شہرت سے داغ نہیں گیا اور جذباتوں کے زندان میں اس کے لیے عرقید لکھی ہے مگر ہے وہ بھی مڈل کلاس یا کیونکہ وہ بھی صرف اپنی نجات چاہتا ہے یا اپنے پیاروں کی۔ اس کی شدت احساس مجھ جیسے سبک دنیا کو بھی ڈرا دیتی ہے۔ اس کو خشکیاں دیکھ کر مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے جذبے کی سچائی کوڑا ہاتھ میں لیے بغیر باہر نہیں نکلتی مگر وہ حقیقت پر یقین نہیں رکھتا غائب کو مانتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ حضرت یحییٰ علیہ السلام یاد آتے جو لائچی ہاتھ میں لے کر گلی بشارت دیتے پھرتے تھے ممتاز مفتی بھی ایک ہاتھ میں بشارت کی لائچی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا کٹا ہوا سر لیے گلی گلی مانکا کرتا ہے اسے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ جب میں لوگوں کو ہلاکت اور اندھیرے سے خبردار کرتا ہوں تو وہ سیدھی راہ پر کیوں نہیں چلتے۔ سیدھی راہ میں عبادت کی حدود شامل ہیں مگر وہ شریعت کی پابندی نہیں کر سکتا اور اسی پر اس کی لٹیٹا ڈوبی۔ شہاب شریعت کی پابندی کو تمام دیگر رفتوں کی بنیاد مانتا تھا اور شریعت سے اس کی مراد نماز روزے اور اللہ اور رسول کی طرف سے بندہ پر انفرادی طور پر عاید فرائض کی بجا آوری ہوتی تھی۔ آگے کی مسافت کوئی طے کرادے تو کرادے مگر آگے کا ویزا شریعت کی پابندی ہی سے ملتا ہے۔ اس کی توفیق ممتاز مفتی کو نہ ہوئی۔ وہ عقیدے کا گھنٹا تہ کر کے بیٹھا رہا۔ اور اگرچہ میں اُس کا بہت دُور سے ساتھی چلا آتا ہوں۔ روحانیت کے موڑ پر ہم الگ ہو گئے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہیں پہنچا بھی یا نہیں۔ مکن ہے اس کے کندھوں پر بھی فرید الدین عطار کی منطقی الطیر کے مسافروں کی طرح جو کسیرغ کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے اچانک چاندی کے پرنعل آئے ہوں۔ تلاش کا حاصل خود تلاش بھی ہوتا ہے اور یہ بات سیانوں نے کتابوں میں لکھی ہے۔

میرے خیال میں شہاب کے حواریوں میں سچا درویش ممتاز مفتی ہی ہے۔ حماقت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ دنیا اس نے کھائی نہیں اور یقین محکم سے وہ مالامال ہے۔ وہ لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔ اپنے آپ کو حقیر جانتا ہے۔ جنت اور دوزخ کی بھی اسے کچھ خبر نہیں۔ وہ حور و قصور کا طلب گار بھی نہیں مگر وہ کسی

ایسے کیف کی تلاش میں ہے جس کو وہ صحیح طور پر جانتا بھی نہیں اب چونکہ وہ سو فیصد تپا ادا بہ لوٹ آدمی ہے اس لیے سمجھتا تھا کہ اگر شہاب کے بعد میں زندہ رہا تو شہاب مجھے وہ سب کچھ ایک نظر سے عطا کر دے گا جو خود اس نے اتنی عنایت سے حاصل کیا کیونکہ میں ہی اس کے مسک اور مقام کا راز دار ہوتا۔ مگر شہاب جب اچانک بھری مجلس سے ابھرا تو اسے بڑا دھچکا لگا۔ اُسے دھچکا لگا کہ وہ نظر تو اس نے مجھ پر ڈالی ہی نہیں جس سے مجھ پر سات زمینوں اور سات آسمانوں کے بھید کھل جاتے۔ پھر اُسے شک ہوا کہ ہونہ ہو وہ جو انتقال سے پہلے اچانک لاہور گیا اور تین چار دن وہیں گزار کر آیا تھا تو لازماً اپنا سب کچھ اشفاق احمد پر لٹا کر آیا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ملتان کی باؤنٹلری شہانجے صدیق راعی کو دے دی تھی اور باقی جو کچھ بچا وہ اشفاق احمد لے گیا یہ سب کچھ حساب ہیں۔

اشفاق احمد نے کہا، مجھے تو کچھ بھی نہیں ملا مگر جب اس نے اچانک ڈاڑھی رکھ لی اور پھر نمازوں اور وظیفوں میں شدت کرنے لگا تو ممتا زمینی کا شک کہ تعین میں بدل گیا مگر یہ دوستوں کا داخلی معاملہ ہے۔ ہم باہر کے لوگ اس میں دخل نہیں دے سکتے۔ اگر اشفاق احمد کو کچھ ملا ہے تو آگے چل کر اس کے اعمال صالحہ اس کی شہادت دیں گے اور اس کے آنے والے ڈرامے اس کے سینے کا روحانی ایال باہر انڈیل دیں گے۔

ڈراموں کی بات میں نے جان بوجھ کر کی۔ اس کے ڈراموں کا آخری سلسلہ جب چلا تو شہاب لندن میں تھا۔ لوٹ کر آیا اور اس نے ان کے بارے میں میری رائے پوچھی تو میں نے اشفاق احمد کی غیبت میں اس کو اس کے خیالات کو اور اس کے مقاصد کو بے نقط سنائیں کیونکہ ڈراموں کی روشنی میں میں نے اسے دشمن ایمان و آگہی دشمن خلقت خدا ذاتی طور پر مشکبہ اور جاگیر دارانہ سرمایہ دارانہ نظام کا علمبردار پایا تھا۔ شہاب نے میری تنقید کرید کرید کر سنی اور میں نے بھی کوئی کسر اٹھانہ دیکھی حالانکہ خوب جانتا تھا کہ شہاب کو اشفاق احمد کتنا عزیز ہے! اسے پتا تھا کہ میں بات کرنے میں احتیاط نہیں کرتا شاید اسے میری یہی کمزوری پسند تھی۔ اسے پتا تھا کہ ظلم پر میرا دل کڑھتا ہے مگر اپنے نئے میں کچھ نہیں مانگتا۔ اس کے قریب کے لوگوں میں مجھ جیسا معمولی اور بے حیثیت دوسرا کوئی نہ تھا۔ شہاب کو سب کچھ معلوم تھا وہ مارشل لا کے بارے میں بھی میری تنقید شوق سے سنتا تھا۔ اس کے حلقے کے عام اور خاص لوگ اس کے خلیفے اور مرید اس کے فقیروں اور صوفیوں کی مارشل لا کی لائی ہوئی پریشانیوں پر دُکھی نہ ہوتے۔ اسلام کے بارے میں خاص طور پر اسلام کے سماجی نظام کے بارے میں ان کے تصورات کبھی نکھر نہ سکے۔ اسلام سے ان کی مراد تھی پرانے اقتصادی اور تہذیبی نظام میں اللہ کا ورد۔ شہاب کو تو آخری وقت میں مارشل لا کی خدمت گزاری پر ندامت ہوئی اور وہ میرے پاس حساب دینے اور گناہ کا اعتراف کرنے آیا تھا مگر اس کے خاص مرید آج تک نہ سمجھے اور وہ ان سب لوگوں کو جو اپنی کسی غرض کے حوالے سے بالا ہو کر تبدیلی کے علمبردار ہیں تاکہ خلق خدا کو اجتماعی طور پر سب کے ملے وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ خلق خدا کا معاملہ خدا پر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ خود ملے کر ناپا چاہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی —————

شہاب جب آخری مرتبہ میرے پاس آیا تھا تو وہ مجھ سے رخصت ہونے بھی آیا تھا مجھے اس وقت تک یہ احساس نہ تھا کہ یہ میری اس کے ساتھ آخری ملاقات ہے۔ رخصتی کے بارے میں بھی بہن اس نے فقط مجھ ہی سے کی تھی۔

یہ غالباً ۱۹۷۵ء کا زمانہ تھا۔ وہ مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم کا سیکریٹری اور میرا افسر تھا۔ اسے پتا تھا کہ میں کسی صورت بھی دس بجے سے پہلے دفتر نہیں آ سکتا۔ ایک روز صبح نوہی بجے اس کا فون آ گیا۔ لائن پر وہ خود ہی تھا۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا آپ فوراً دفتر پہنچیں۔ شیو نہیں کیا تو نہ کریں، ناشتے کا انتظام بھی یہیں ہو جائے گا۔

میں گھبرا گیا۔ شہاب ایسی مضطرب بات کبھی نہ کرتا تھا۔ ”آج کون سی قیامت ٹوٹ پڑی؟“ میں نے پوچھا اس کی زبان میں کفایت تھی

آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

بولا: ہاں بالکل ٹھیک ہے۔

مجھے یقین نہ آیا، الفاظ اس کے منہ سے نہ نکلتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ دل کے دورے میں مبتلا ہے اور اس نے مجھے فوراً طلب کیا ہے شاید مجھے اسے ہسپتال لے کر جانا ہوگا۔ میں نے ایک دفعہ پھر کہا: مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی، آپ سچ بتادیں!

سچ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے، آپ دفتر پہنچ جائیں وقت ضائع نہ کریں۔

وہ کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے کہا نہ مجھ سے کوئی ٹیلی فون ملایا جائے اور نہ کوئی ملاقاتی اندر آئے۔ سمجھ گئے؟

زبان اس کی لڑکھڑاہی تھی جیسے اس نے شراب پی رکھی ہو۔

یا اللہ! اخیر۔ میں نے سوچا اور اس کے سامنے ہر تین گوش بیٹھ گیا۔ چھوٹے ہی اس نے کہا، آج میں بے حد خوش ہوں۔ آپ کو بلایا ہے کیونکہ اتنی خوشی مجھ اکیلے سے منہا نہیں جاتی۔ اس میں آپ کو شریک کرنا ضروری تھا۔

شہاب اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا کرتا تھا۔ اب چاہے یہ اس کی آئی سی ایس ٹریننگ کی دین تھی چاہے اپنی طبیعت پر اس کی گرفت۔ وہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی پتا نہیں لگنے دیتا تھا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں اس قسم کی بات اس نے کبھی اپنے حلقہ خاص میں بھی نہ کی ہوگی۔ مجھے اس نے اس قابل کیون سمجھا اور اسے ایسی کون سی نعمت اچانک مل گئی کہ راگیروں میں اشرفیاں بانٹنے پر مجبور ہے۔ میں نے پوچھا کہ آخر آپ کس بات پر اتنے خوش ہیں! اس نے کہا، ”مجھے پتا لگ گیا ہے کہ مجھے مرنا کب ہے“ اس کی آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی تھی۔

”تو کب مرنا ہے؟“ میں نے لاپرواہی سے پوچھا

یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ مجھے پتا لگ گیا ہے۔ مگر آپ کو اجازت نہیں کہ کسی اور سے اس واقعے کا ذکر بھی کریں۔
مگر ابھی کچھ مہلت تو ہے؟

ہاں، ابھی مہلت ہے اتنا اور بتا دوں کہ میری موت متاثر مفتی سے پہلے آئے گی اور یہ بات بھی متاثر مفتی تک نہ پہنچے۔

نہیں پہنچے گی جی!

پہلے مجھے خیال آیا کہ میں اس پر جرح کر کے اس کے وجدان کے بچے ادھیڑ دوں۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میری منطق کے آگے ٹھہر نہیں سکے گا۔ مگر مجھے اس پر ترس آ گیا۔ وہ ایک بچے کی طرح کلڑی کے گھوڑے پر سوار دوڑ لگا رہا تھا۔ وہ واقعی بہت خوش تھا۔

پھر وہ وہی تباہی بکنے لگا جیسے اس نے ایک بوتل ویسی شراب کی پی ہو۔ لگتا تھا ابھی اُٹھ کر کمرے میں جھنگڑا ڈالنے اور بولیاں گانے لگے گا۔ میں چونکا ہوا گیا اور ایسی کوئی بات نہ کی جس سے اس کی طبیعت کے بہاؤ میں رکاوٹ آئے۔ جراتی میں میں نے میسا کھی کے میبلے کے لیے گوجرانوالا کے ریلوے اسٹیشن پر ایک بزرگ سکھ کو کاڑی سے اترتے دیکھا تھا اس کے کپڑے ڈاڑھی اور بھنویں سفید تھیں۔ اس نے پان کھایا ہوا تھا، شراب پی ہوئی تھی۔ تیرہ سال کا بچہ بھی اس کی انگلی پکڑ کر ساتھ ہی اترتا تھا اُس نے بھی پان کھایا ہوا تھا اس نے بھی شراب پی ہوئی تھی اور اس کی پکڑی بھی گلوں میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ بچہ اس کا پوتا تھا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی بزرگ سکھ نے پوتے کا ہاتھ پکڑ کر ناپا چا اور لہک لہک کر گانا شروع کر دیا اُونے اوتھے عملاں دے ہون گے بیڑے کسے نہ تیری ذات گچھنی! اسی قسم کی کیفیت میں نے ایک زمانے میں جالندھر کے ایک دیہاتی میبلے میں بھی دیکھی تھی ایک بوڑھے سکھ نے خود بھی شراب پی رکھی تھی اور ایک بوتل اپنے اونٹ کے پیٹ میں بھی ڈال رکھی تھی۔ سکھ نے پان کھایا ہوا تھا اس کے ہونٹ سُرخ تھے جس وقت میں نے اُسے دیکھا وہ لگے ہوئے پانوں کا ایک بوجھ الاٹھی سپاری اور خوشبو سمیت اونٹ کے منہ میں ڈال رہا تھا تاکہ اس کے ہونٹ بھی سُرخ ہو جائیں۔ قدرت اللہ شہاب کی مستی پان کھانے اور شراب پینے ہوئے اونٹ کی مستی تھی جس کے گھٹنوں پر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ میں کم و بیش دو گھنٹے بیٹھا اسے لیتے دیتا رہا جیسے قوال اہل حال کو لے کا لقمہ دیتا ہے غلطی کہ اس کی ہنڈیا اہل اہل کر کسی قدر ٹھنڈی ہو گئی اور وہ اشیاء کی ماہیت کو پھر سے پہچاننے لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس نے اس عالم میں اور کیا کیا کیا۔ مگر اس کی بات چیت بے ربط تھی اور اس میں مزید کوئی انکشاف نہیں تھا۔ ہاں کچھ گالیاں اس نے اس کیفیت میں ضرور دیں۔

ایک بات مجھے یاد آئی جو میں نے اس سے اس واردات کے دوران پوچھی تھی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو اپنی موت کی خبر مل چکی ہے اور آپ اس پر خوشی سے جاے میں نہیں سماتے تو اس راز میں شریک کرنے کے لیے میں ہی کیوں منتخب ہوا۔ میں آپ کے ڈھب کا آدمی نہیں۔ آپ کے حلقہ خاص میں بھی شریک نہیں۔ خدا سے میرا

رشتہ ایک دُور کے دوست کا ہے۔ پھر آپ نے راہِ سلوک کے ساتھیوں کو چھوڑ کر مجھ ہی سے ایسی نازک بات کیوں کی؟

وہ بولا، خدا سے صحیح رشتہ یہی ہے کہ آدمی اس کو دوست سمجھے۔ رہی یہ بات کہ میں نے اپنے رازداروں کو چھوڑ کر ایسی نازک بات آپ سے کیوں کہی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات میں آپ ہی سے کر سکتا تھا اور ایک طرح آپ بھی میرے رازدار ہیں۔ ان میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر کبھی خوبیاں ان میں نہیں ہیں۔ بعض خوبیاں آپ کو ان سے ممتاز کرتی ہیں اس لیے میں نے ان کو تکلیف نہیں دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بعض مقامات پر میں آپ جیسا ہوں یا آپ میرے جیسے ہیں۔ یعنی ہم دونوں میں ایک دوسرے کا کچھ عکس بھی ہے۔

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو ایک گنڈا اور سیلا آدمی ہوں۔ کہاں راجا بھوج، کہاں گنگو تیلی! یہ بات نہیں میں آپ کو خوش نہیں کر رہا۔ بعض مقامات پر ہم ایک جیسے ہیں اور یہاں ہم برابر کی سطح پر بات کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ بھی کسی وحشیانہ طاقت کے سامنے نہیں جھکتے اور اپنے سچ کی خاطر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ میں بھی وحشیانہ طاقت کے سامنے نہیں جھکتا اور اپنے سچ کی خاطر بڑے سے بڑا خطو مول لے سکتا ہوں۔ آپ نے بھی اپنی ذات کے لیے دنیا میں کچھ نہیں مانگا۔ آپ بھی منہ پھٹ اور بے ریا ہیں، میں بھی منہ پھٹ اور بے ریا ہوں۔ مگر یہاں آپ کو مجھ پر کسی قدر فضیلت حاصل ہے۔ میں آپ کی طرح ہر وقت، ہر مقام پر اور ہر مسئلے پر ہر غلط شخص کو نالی کا پانی نہیں پڑا دیتا اگر وہ جھوٹا، متکار اور مغرور ہو۔ بعض اوقات میں طرح سے جاتا ہوں مگر جب حریف کو طاقت کا زعم ہو یا اس کے سامنے چُپ رہنے سے کسی بڑے دھوکے کا اندیشہ ہو تو پھر میں زبان، قلم اور تلواریں تیز نہیں کرتا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر پھر میرا ہجو آپ ہی کا لہجہ ہوتا ہے اگرچہ جیسی گاڑھی گالیاں کھڑے کھڑے آپ دے سکتے ہیں ان کی مجھے حسرت ہی رہی۔ میں نے اپنی موت کی خبر آپ کو اپنے جیسا جان کر بتائی، میرا کوئی دُوسرا دوست اس کا اہل نہ تھا۔

شہاب نے اس ایک واقعے کے سوا مجھ سے کبھی کسی ذاتی واردات کا ذکر نہیں کیا اور اس ایک واردات کے باوجود جس کا میں شاہد ہوا میں نے اس میں شاہد و مشہود کا کوئی جلوہ نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا ریسور بند ہو یا انٹینا الٹا لگا ہو۔ مگر میں نے اسے ایک نیک دل عبادت گزار، دلیر، منکسر المزاج اور خاموش آدمی پایا جو طبعاً غریب شہر تھا اور جہاں گھنی چھاؤں دیکھتا تھا دم لینے کو بیٹھ جاتا تھا اب وہ گھنی چھاؤں کسی پرانے مزار کے حجرے میں ملے یا کسی مسجد کے نشکلیں گنبد کے اندر۔

خافہ نشینی بھی شہاب کی روح کو قوت بخشی تھی اور ایک مدت تک کم سے کم جوانی کے زمانے تک غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خاں کی سیکرٹریٹ بھی اس کے لیے حدیثِ دل رہی۔ لوگ اسے بُرا کہتے تھے تو وہ مزالیتا تھا مگر آخر میں جب اس نے حساب لگایا تو اپنی گھڑی اُسے ذرا بھاری لگی پھر اس نے کوشش کی

کہ اس میں سے کچھ بوجھ کم ہو جائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اقبالِ جُرم کی ہدایت اسے اس کے گپت گورو نامنٹی بابے نے دی ہو۔ وہ نوے سال کا ایک بزرگ تھا جو اپنے آپ کو جوان فقیر کہتا تھا اس لیے اسے بابا نہ کہنا چاہیے۔ وہ مسلک ادیبیہ کا ایک بزرگ تھا جو بظاہر جتوں میں مقیم تھا مگر اس نے شہاب کا ہاتھ پکڑ کر اسے افلاک کی سیر کرادی۔ وہ اپنے ساک سے کبھی نہیں ملا اور ان میں جو گزری وہ ایک ناقابل یقین داستان ہے۔ شہاب نامہ کا یہ حصہ اس قابل ہے کہ آدمی یہاں سے اٹھ کر گیان کے نگروں میں جا بسے۔ وہ ہم میں نہیں ہے اس لیے کہا نہیں جاسکتا کہ اب وہ خود بھی راہ طلب میں کسی کی دستگیری پر آمادہ ہو گا یا نہیں مگر سفر شرط ہے۔

شہاب کی یہ واردات غیر معمولی تھی ایسی باتیں میں نے پڑنے تذکروں میں بہت پڑھی ہیں یا ضعیف الاعتقاد لوگوں سے سنی ہیں جو زندگی میں سسی کے باوجود ناکام رہے یا جی کو محنت کے بغیر بہت کچھ مل گیا اور پھر انھوں نے عالمِ تحیر میں زندگی گزار دی۔ بعض آئی سی ایس ایوب خاں کے زمانے سے قوالیاں تو سنتے چلے آ رہے ہیں انھیں بھی چونکہ محنت کے بغیر بہت کچھ مل گیا تھا اس لیے وہ بھی عالمِ تحیر میں اسباب کے اسباب تلاش کرتے اور تصوف سے رومان لڑاتے رہے مگر جو کچھ شہاب پر گزری اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ میں اگر اسے ذاتی طور سے نہ جانتا ہوتا تو اس کی اور اس کے ہوتے سوتوں کی خوب فہمی اڑاتا جس واردات سے وہ گزرا وہ عالم امکان اور عمل اور ردِ عمل کی منطق سے خارج ہے۔ مگر شہاب نے اس معاملے میں جھوٹ نہیں بولا۔ اشفاق احمد کے دل میں ایک خواہش ہے کہ میرے بعد میرا مزار بنے اور اس پر عرس اور قوالی کے میلے لگیں۔ شہاب کو تو اس کی آرزو بھی نہ تھی۔

اسلام آباد کے جس قبرستان میں وہ دفن ہوا اس کے دو سیکٹر ہیں، ایک سیکٹر میں حوام الناس یعنی ڈپٹی سیکریٹری کے عہدے سے کم کے لوگ دفن ہوتے ہیں اور میری معلومات کے مطابق اس پریکشن آفیسر اتنے ناراض ہیں کہ وہ تو مرنے ہی نہیں چاہتے کہ پھر یہیں لکڑیوں اور پھر اسیوں کا سٹیٹس قبول کرنا پڑے گا۔ دوسرا سیکٹر ڈپٹی سیکریٹری اور اس سے اوپر کے افسروں کا ہے جس کا نام بھی دی آئی پی سیکشن ہے۔ ظالموں نے شہاب کو اس سیکٹر میں دفن کر دیا حالانکہ اس میں دی آئی پی والی کوئی بات نہ تھی وہ پیدل چلتا تھا۔ ہنڈوؤں نے کھانے کھانا تھا اور چہر اسیوں لکڑیوں کے احکام بجا لاتا تھا اب وہ دی آئی پی سیکٹر میں دفن ہوا ہے جہاں اس کا مزار بھی نہیں بن سکا کیونکہ قبروں کے پلاٹ بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کے آس پاس جو لوگ دفن ہیں سب کے سب دی آئی پی ہیں، اور بعض کے کتبوں پر تو یہ بھی لکھا ہے کہ مرنے والے نے نیو یارک یا ٹوکیو یا جنیوا میں موت قبول کی۔ اس سٹیٹس کے لوگ مگر بھی یہ گوارا کیسے کر سکتے ہیں کہ ایک دی آئی پی جو پاکستان ہی میں مرا ہوا ان کے پہلو میں پڑا صاحبِ مرقہ و علم کہلاتے اس کا عرس منایا جاتے، اس پر چڑھا دے چڑھیں اور حال کھیلے جائیں۔

قبرستان کے دی آئی پی سیکٹر میں جس میں شہاب دفن ہوا دل بھی تنگ ہیں اور زمین بھی۔ شہاب سے

پوچھا گیا ہوتا تو وہ کبھی اس سیکٹر میں دفن نہ ہوتا بلکہ عوام الناس کے سیکٹر میں جاتا کیونکہ اس کے آشنا وہاں بھی بہت ہیں۔ مگر شہاب سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ یہ اتنی معمولی بات تھی کہ وہ جو اپنی روانگی کے وقت سے واقف تھا اس کا ذکر کرنا بھول گیا مگر مٹی تو مٹی ہے جہاں بھی لگ جائے۔

مرنے سے ڈھائی گھڑی پہلے اس نے شہاب نامہ کے ٹائٹل کی منظوری دی تھی اس کے سارے کام اب ختم ہو چکے تھے۔ اس کا بیٹا ثاقب اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو چکا تھا اس کی پیاری مرحومہ بیوی اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اور اس سے کچھ پرے ہٹ کر چند راوتی گھڑی اپنے دوپٹے سے اس کی بائیسکل جھاڑ رہی تھی۔ کتاب کا ٹائٹل منظور کرنے کے بعد وہ پچھاڑ کھا کر گرا۔ پھر ثاقب اور عکسی مفتی جس کو ہسپتال لے کر گئے وہ مٹی کا ایک تودہ تھا۔ اس کا جنازہ بوجھل نہیں تھا کیونکہ وہ ہلکے سفر کا عادی تھا۔

مگر وہ گپت گورو کوں تھا جس نے اس کی زندگی بدل ڈالی اور زمین سے اٹھا کر اسے زمان و مکان سے آگے کی سیریں کرا دیں اور زمین سے اس کا رشتہ بھی نہ ٹوٹنے دیا۔

ممتاز مفتی کا خیال ہے کہ وہ خواجہ بختیار کاکی تھے مگر ممتاز مفتی علم و خبر کے معاملے میں کوئلہ ہے۔ بختیار کاکی صوفیائے چشت سے تعلق رکھتے تھے جب کہ گپت گورو سیدھا سیدھا اولیسی تھا جسے رسول اکرمؐ نے بی بی فاطمہؓ کی سفارش پر شہاب کی دستگیری کے لیے خود مقرر فرمایا کہ چلو اس کو راستہ دکھا دو اور بی بی فاطمہؓ نے شہاب کی ایک جرم بھائی کو یہ بات خواب میں بتادی تھی وہ عقیقہ بھی جب سے رات دن ہوتی میں کاٹ رہی ہے۔

پیر اور مرید کا رابطہ انگریزی زبان میں خطوں کے ذریعے ہوتا تھا جو کبھی کتابوں کی الماری میں سے نکل آتے تھے کبھی چھت میں سے ٹپک پڑتے تھے مگر شہاب کو ان میں سے کسی کا غذ کے محفوظ کرنے کی اجازت نہ ملی۔ اب اس داستان سرائی پر کیا کہئے۔ ہے اس میں کوئی مانسنے والی بات؟

نانٹنی سے اس کا تعلق کچھ پس برس سے زیادہ رہا اور جب اُس نے مجھے اپنے دفتر میں اچانک بلا کر بتایا تھا کہ میری موت کی رسید مل گئی ہے تو غالباً اُسے نانٹنی کا کوئی رقعہ ملا تھا جس نے اونٹ کے منہ میں الاچی سپاری اور خوشبود الاپان ڈال کر اس کے ہونٹ لال کر دیے تھے اور وہ فروغ میں بے خودی کے گھنگھرو باندھ کر ناپتے لگ گیا تھا اونٹوں کو میں نے ایوب خاں کے میلہ مویشیاں میں پہلے بھی ناپتے دیکھا مگر اس اونٹ کی بات ہی کچھ اور تھی اور جو لوگ مجھے جانتے ہیں انھیں پتا ہے کہ جھوٹ میں بھی نہیں بولتا۔

میں جدیدیاتی مادیت کا قائل ہوں اور اس پر تعین محکم رکھتا ہوں۔ زندگی کی مادی حرکت و ترقی کے بارے میں بھی مجھے آگاہی ہے۔ میں نہیں مانتا کہ روح اگر ہے تو امام غزالیؒ کے بقول مادے کی مقطر شدہ حالت سے سوا کچھ اور ہے۔ انسان میں چونکہ ایجاد و تعمیر کی خلاقی و دیعت ہے جس کا زیادہ تر حصہ وہ برفے کا رہنیں لاتا تو پھر روح ان تخلیقی قوتوں کا نام ہو گا جو بروئے کار نہ آسکیں اور پھر ازجی کی شکل میں فنا کے بعد کائنات میں آوارہ ہوں کہ

کچھ تخلیق کریں یا کروائیں، اچھی یا بُری یہ ان کی انفرادی فطرت پر موقوف ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں کچھ سٹھیا گیا ہوں اور مجھے اپنے یقین پر اتنا یقین نہیں رہا۔ بعض جوابات بے شک موجودہ سائنس اور منطق کے پاس نہیں مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قبروں اور مزاروں پر بیٹھا ہوا ہر بھبھوتی یا علوہ کھانے والا یا سفید چادر اوڑھ کر نذر وصول کرنے والا ہر پیر حتیٰ آگاہ ہر جب یہ بھی طے نہیں کہ حق کیا ہے اور یہ بات شہاب نے بھی کھول کر نہیں سمجھائی۔

شہاب نے جو کچھ بتا دیا ہے اس پر بھی اس کے حلقے کے خاص لوگ خوش نہیں کیونکہ اہل حق اپنے راز فاش نہیں کرتے۔ انھیں اپنے مریدان باصفا کے سینوں میں منتقل کرتے ہیں یا مخطوطوں میں اشارے کر کے منہ پھیر جاتے ہیں شہاب نے یہ رسم توڑ دی اور بہت کچھ کھول کر بتا دیا۔ راستے کے کچھ بھید بھی ظاہر کر دیے کہ جس میں بہت ہوا گئے بڑے منزل اسے طے کی جو اپنی اہلیت ثابت کرے گا اور قسمت کا دھنی بھی ہو گا کیونکہ سب کچھ محض مشقت سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے اگر اشفاق احمد کو کچھ دیا ہے اور ممتاز مفتی کو کچھ نہیں دیا تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اشفاق احمد ممتاز مفتی کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ جفاکش ہے وہ جس چیز کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لے اس کے لیے اسے عمر بھر ایک ٹانگ پر کھڑا ہونا پڑے تو وہ کھڑا رہے گا۔ ممتاز مفتی سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ پنج وقتہ نماز ہی پڑھ لے شہاب کے معیاروں کے مطابق اہل خیر کی رسائی کے لیے نماز آئینہ نئی کارڈ کی حیثیت رکھتی ہے تو پھر ممتاز روتا نہیں اس کی شکل ہی ایسی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اشفاق احمد سے زیادہ نڈر ہے مگر جب زمین میں اہل ہی نہ چلے تو نمی کسی کام کی نہیں۔

بعض امور میں وہ اشفاق احمد سے افضل ہے کیونکہ اس کا یقین اس کے حاصل سے تعلق نہیں رکھتا۔ بعض امور میں وہ اشفاق احمد سے کم تر ہے کیونکہ وہ رسوم و قیود کی جمانی اور ظاہری صعوبتیں نہیں اٹھا سکتا وہ شہاب کو بہت پیارا تھا مگر وہ اس کے کام کی چیز نہیں تھا کیونکہ وہ عقیدہ پرست ہے اندھا ہے۔ شہاب کی ہدایت کے برعکس وہ قرآن شریف پر عقل سلیم کی روشنی میں غور نہیں کرتا۔ دین کو مجازی اور استعماری اشارات کا مجموعہ سمجھتا ہے اور جوابات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اس پر اور بھی زیادہ نچمہ ایمان رکھتا ہے۔ وہ عقل اور عقل آدمیوں کا ٹھٹھا اڑاتا ہے کہ لوجی یہ بھی عقل والے ہیں انھیں بھی کچھ معلوم ہے! وہ انھیں قتل کر سکتا تو اچھا ہوتا مگر وہ ان پر رحم کھاتا ہے اور ان پر تحقیر کی ایسی نظر ڈالتا ہے کہ بچا رہے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ ایسا مجہول آدمی اپنی نیک دلی اور صفائی کی بدولت حتیٰ کوشش ہو سکتا ہے مگر اس کی اڑان محدود ہوگی الا اس کے کہ کوئی گپت گوروا نگلی سے پکڑ کر اسے بھی لے لے۔ شہاب سے اس نے کچھ ایسی ہی آس لگا رکھی تھی۔

جس روز شہاب نے رخصت لی میں ممتاز مفتی کے پاس تھا۔ ایک رات میں نے اس کے ساتھ خوف کے عالم میں گزاری کہ اس کے جلال کا نشانہ کہیں میں غافل نہ بن جاؤں اب یہ چند سطریں لکھنے ہوئے بھی میں ڈر رہا ہوں شہاب کو زندگی میں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔ اُس نے مجھے کبھی راندہ درگاہ، گمراہ، سیاہ بخت اور جہنم کا

جنہی نہ سمجھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ میں کائنات کو ایک خود کار کارخانہ سمجھتا ہوں جس کا ایندھن مادے کی داخلی جلائی ہے کیونکہ یہی اس کا کارا چونا ہے۔ اس سطح پر اس حقیقت سے کوئی بڑے سے بڑا اہل خبر بھی انکار نہیں کر سکتا کہ مادہ خود بھی خلاق ہے۔ یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ یہ خلاق بھی کسی انتہائی قوت کا عطیہ ہے۔ اس قسم کی باتیں میں شہاب سے کرتا تھا تو وہ بڑی قہر سے سُنتا تھا۔ ہر بات کا جواب میرے پاس بھی نہیں تھا اور ہر بات کا جواب اس کے پاس بھی نہ تھا۔ شہاب نامہ میں اس نے جو مجید بتائے ہیں وہ ہم عامیوں کے کسی کام کے نہیں۔ ہم عامی جو خلقتِ خدا کو دکھوں کے منجد ہمارے چھوڑ کر اپنے لیے کنارہ ڈھونڈنے کے لیے تیار ہیں۔

میں نے غلط کہا کہ کتاب مجھے پسند نہیں آئی۔ یہ میں نے جمل کر کہا تھا کیونکہ یہ ایک کتاب مجھ پر حاوی ہو گئی تھی حالانکہ میں نے اس سے پہلے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب

پروین عاطف

غلام محمد، سکندر مرزا، جنرل محمد ایوب کے اودار میں، جب قدرت اللہ شہاب کو ابو الفضل فیضی کا درجہ حاصل ہوا، میں وقت کے شجر کی اس ڈال پر تھی، جہاں لہجوں اور رنگوں میں بھبکا انسان، اپنے وجود کے تحیر میں گم، تمام خارجی حقائق سے بے خبر ہوتا ہے۔

مفتی جی کی دوستی کے ستارے میرے ارد گرد، بھڑنے شروع ہو گئے تھے، لیکن جھولی لبالب نہیں بھری تھی دوسروں سے ان کی عقیدتوں اور ان کی محنتوں کی شدت نے ابھی مجھے اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ باوجود سب کے مٹے مٹے ظاہر میں ہمتی اس کے اندر کی بجلیاں مجھے ٹپکنے لگی تھیں۔ اشفاق احمد میرے ساتھ سدا کے پیڑ و ناگزین تھے۔ خدا اور رسول کا تصور بچپن ہی سے کسی جابر ایس پی اور تنہا نیدار سے ملتا جلتا تھا۔ اس لیے، ان کے حلقہ بگوشوں کی قربت کی دھیمی سی خواہش بھی سر نہیں اٹھاتی تھی اس لیے شہاب صاحب سیاسی، ادبی یا مذہبی ہواؤں کا رخ رکھتے تھے یا نہیں، یہ جاننا میرے بس میں نہ تھا۔

بوں روایتاً بھی ان دنوں پتا نہیں کیوں اکثر گھروں میں سنجیدہ سیاسی و معاشی معاملات کو فوجوانوں بالخصوص فوجان لڑکیوں سے کوک شاستریا کا ماسٹر کی طرز پر مخفی رکھا جاتا تھا۔

دراصل دو سو برس کے جبر اور غلامی نے ہمارے اندر ہر گدھے گھوڑے کی لاشی پر لبیک کہنے کا ایک مستقل وائرس اس طرح پھیلا دیا تھا کہ آج بھی ہم اس وائرس کے انڈے غر سے ہتھیلیوں پر سجائے پھرتے ہیں اور ہماری اجتماعی نفسیات، ایک آزاد ملک کے وقار اور احترام کے تصور سے بدرجہ اتم خالی ہے۔

سکندر مرزا، ایوب کے زمانے میں تو میری بے بصیرت آنکھیں چوک میں رکھی جمہوریت کی برہنہ لاش کو دیکھ سکتی تھیں۔ قدرت اللہ شہاب جیسی ہمہ جہت مقبول عام و خاص شخصیت کی قربت کیسے حاصل کرتی۔

وہ تو اچھا ہوا، اچانک میں کٹھالی میں کٹی، میز پر رکھا میری ذات کا اندھا بہرہ بُت گڑ گڑ چور ہوا اور میں گڑ گڑتی ریت مٹیوں میں دوپچے، ہر اس امانت مفتی اور باوجود سیر کی طرف بھاگی۔ یہ دیکھے میرا انوکھا لاڈلا وجود اسے میں کسی قسم کی زک نہ پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے تو کائنات، ازل اب، آج کل سب کچھ کا منبع اپنی ذات کو بنا رکھا تھا۔ یہ نیلے سر اسردھاندلی ہے۔ آپ لوگوں کی شفقتوں پر بڑا مان ہے مجھے دیکھئے

پر وہاں تو سماں ہی بدلا ہوا تھا۔ آشرم کے دروازے بھڑے تھے۔ ایک پراسرار ستارہ چھایا تھا چاروں

طرف، میں نے دروازے میں سے جھانکا، کستوری اور لوبان کے کاسنی دھوئیں میں بانو، اشفاق اور ممتاز مفتی، پنڈے پر بھسھوت لے، اپنے اپنے وجودوں کی گھٹڑیاں سروں پر دھرے، گرد و پیش سے بے خبر ہرے رام ہرے کرشنا کے ینوریا (EUPHOREA) میں گم، قدرت اللہ کے نام کی مالا جپ رہے تھے یا مالکِ حقیقی ایسی جھم جھم کرنے والی شاہانہ گڑسی پہ راجان ایسے مانے ہوئے، مستند بیوروکریٹ کے وجود میں تیری کون سی بجلیاں سرایت کر گئیں کہ میرے یہ تینوں مہرباں بچکا سب کچھ مٹا کر نیا اُسارنے کے کشت میں مبتلا ہیں۔

یہ بات تو قابلِ فہم تھی کہ قدرت اللہ شہاب، اپنی ادبی پذیرائی کی خاطر ممتاز مفتی، ابنِ انشا جیسے بوریا نشیلوں کو ایوانِ صدارت میں بلا کر برابری کی سطح پر بٹھاتے، یا کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے میں اُن کے مدد ثابت ہوتے لیکن یہ بات میرے ذہن کا کوئی گندہ گوشہ بھی قبول کرنے پر تیار نہیں تھا کہ صدارتِ عظمیٰ کا ہاتھ تھا مے تھا مے وہ معرفت کے سمندروں کے ایسے مشاق تیراک ہوں گے جن کے قرب سے کسی کی پیشانی پر تیسری آنکھ کھلنے لگے۔ شاہی محلوں کے ظلم ہو شرابا میں لاقت کے مشکلی گھوڑے پر سوار کوئی مجاز سے حقیقت کی طرف آئے ایک سیکولر ذہن کے لیے ناقابلِ قبول وقوعہ تھا۔

بانو قدسیہ تو پتا نہیں کس مصلحت کی بنا پر، شاید اس لیے کہ تپسیا کا بھید نہ کھلے، بھگتی کی مندر لیں نہ کھوٹی ہوں۔ ہر قسم کے احساس کی آتش سیال پر تپتو تانے رستی ہیں۔ بس برس کی قربت کے باوجود ان کا نفسیاتی یاد اعلیٰ وجود میرے لیے ایک زیر زمین احرامِ مصر کے سوا کچھ نہیں لیکن مفتی جی، جنہیں منظر در منظر، زندگی کی تمام چھوٹی بڑی جزئیات سمیت مادرِ زاد رنگے ہو کر جینے کا چسکا تھا۔

چوک میں کھڑے ہو کر مذہب کے بچے ادھیڑنے والا، موجودات کی لگن میں مست، عقلیت کا پجاری، ایسے مٹے مٹے رنگوں کے گلیمریس (GLAMOURLESS) بیوروکریٹ ادیب کے ہاتھوں گیلی پور سلین کا ڈھیر کیسے بن گیا۔ اب اس نرم ڈھیلی پور سلین کا وہ گھگھو گھوڑا بناتے یا کچھ اور۔

ممتاز مفتی کا بطور دوست، بطور ایک جینیس (GENIUS) ادیب، ایک مستبد، فعال، ہمہ گیر وجود برسوں سے میرے دل پر نقش تھا، اچانک ان کو ایسی نفی کی منزل پر دیکھا نویمین ویسار کی یاسیت دو چند ہو گئی۔ لیکن ان کی ذات کے تمام پیش منظر پس منظر سمٹ کر شہاب صاحب کے اصرار میں گم ہو چکے تھے۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ ٹرانس میں اُٹھے اور اپنی عقیدت کی مالا جپتے، شہاب صاحب کے پیچھے پیچھے جگمگاتے ہو گئے۔ ابھی یار لوگ اس انوکھے حادثے کو حلقے سے نیچے اتارنے کی جدوجہد میں تھے کہ مفتی جی بڑے طعراق سے حاجی بن کر واپس آئے اور 'لبیک' کا ایسا سنسکر میزائل چھوڑا کہ تمام ریشنل (RATIONAL) کی دھجیاں اڑا دیں۔

عقلیت پسندوں نے شور مچایا۔ کوئی بُت پوجے بنا مفتی کی اپنی شخصیت کی ٹھیکریاں بکھرنے لگی ہیں۔ بندگی کا چسکا پورا نہیں ہوتا۔ زندگی بھر عورت کے سامنے دوزا نو بیٹھا رہا۔ اب عمر کے بھوسے سرمئی علاقے میں عورت کے

کالے کرس چھٹے، جہان دیگر کی باتیں ہوئیں تو شہاب صاحب کی آرٹی اتارنا شروع کر دی یا وحشت مذہبی بولے صراطِ مستقیم پر کنکر کنکر چن کر چلنا، ہڈیوں کا گودا تک جلانے کا کام ہے۔ محبوب حقیقی تک شرع کے سوا کوئی راستہ نہیں جاتا۔ دوسروں کی بیساکھی پر اپنی گٹھڑی لٹکا کر یا اترنے کی کوشش، سہل انگاری ہے۔ مفتی گردن زدنی ہے۔ میں بارہ من کی دھوبن کی طرح شیشے سے آنکھ لگا کر دیکھتی رہی۔ میرا کچھ پر بھوگر دھرنا گر۔

بازو بھی کسی پوشیدہ آواز کی ڈور سے بندھی مانتھ پر ملک لگاے گیر و اباس پہننے ناجیتی چلی جا رہی تھی۔ تھنی تھنی تانہ تھنی۔ چہرے پر نئی بیاہیوں کی لالی سجائے نفسا نفسی کے عالم میں۔ ”آسودگی چاہتی ہے تو تو بھی قدرت اللہ شہاب کی چھاؤں بیٹھ۔ اس کا دامن تمام“ مفتی جی نے مجھے ہر اس اُن دیکھ کر کہا

”میری جنت گم گشتہ وہ چہرے ہیں مفتی جی! جن کو چھو کر، جن سے بات کر کے، جن کے انتظار میں دے جل کر بیٹھنے سے میری ذات کے کلزار سیراب ہوتے ہیں۔ مرشدوں کے لائق چہروں میں خالق کی شبیہ ڈھونڈنا، انہیں چھو کر مالکِ حقیقی کو چھو لینے کی لذت میں سرشار ہونا میری بساط سے باہر ہے۔

پھر اچانک ہمارا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا اور مفتی جی سے قربت شب و روز رہنے لگی۔ وہاں بھی مفتی جی کے ارد گردان کے گھر کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ہرے بھرے درختوں، کیاریوں میں کھلے پھولوں، کھڑکیوں دیرپوں سے گزرتے ہوا کے جھونکوں میں چاقو قدرت اللہ شہاب کا وجود دیکھ کر چڑسی ہونے لگی۔ ”اگر وہ شہرگ سے قریب ہے مفتی جی! تو پھر یہ دوئی کا حجاب آپ از خود اٹھانے کی قوت کیوں نہیں پیدا کرتے؟ کیا وہاں بھی آقا اور بندہ کے درمیان وفاق جیسا لال فیتہ حائل ہے؟ جو آپ شہاب صاحب کی سفارش کے ایسے محتاج ہیں؟

یہ شہاب صاحب بھی یقیناً کوئی نرگسیت مارے انا پرست ہوں گے جنہیں شاہی ایوانوں سے نکل آنے کے بعد بھی واہ وا کی لت لگی ہوئی ہے۔

پھر وہاں اسلام آباد میں افسروں کی ایک بند دروازہ ادبی تحریک سلسلہ میں شہاب صاحب سے باقاعدہ ملاقات کے مواقع میسر آنے لگے۔

ان جھم جھم کرتی، معطر شاموں میں بھوسلا، بے رنگ سا کوٹ اور پُرانے جاگر پہن کر جب وہ ایک شانیت سی دبی دبی مسکراہٹ چہرے پر سجائے آہستہ روی سے بات کرتے کو نے میں بیٹھ جاتے، تو مجھے تھوڑا سا دچکا لگتا۔

وہاں وفاق کی جگہ کرتی، فلک بوس عمارتوں کے سایہ دیوار میں ایسی ایسی ذوالجناح کی طرح بھی بُنی فولاد

میں جکڑی گردنوں والی برکتیں بھیرتی وفاقی سیکریٹریوں کی سواریوں کے درمیان ایسی طیلیاں، بلا تروہ شخصیت پر معنی دار! اشد مفتی جی، یہ تو ٹیکسلا کی جولیاں یونیورسٹی کے کوئی بد مست پروفیسر یا ثابت کی بھید بھری پہاڑیوں سے اترے کوئی دلائی لائے لگتے ہیں۔

ان کے چہرے پر تو سبز غلاموں والے نام نہاد بزرگوں اور اللہ والوں کی رعوت، خشونت اور رکڑک کا بھی شائبہ تک نہیں۔ ان کے چہرے پر چھایا معسوم بچوں والا تخیل اور نارنجی روشنی دیکھ کر تو ایک مٹا بھمے PATHOS کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں ابھرتا آپ جو اس یقین میں ڈکھو ڈکھو لے کھاتے پھرتے ہیں کہ شہاب صاحب جب چاہیں آگ میں گلزار کھلا دیں، تو مان لیں کہ یہ صرف آپ کی اپنی ذات کا کھٹا رس ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ مفتی جی نے مجھ پر کسی خاص سمت کا وزن کھولنے کی شرط نہیں بدھی تھی، بس جیسے کہ وہ دوستوں کے بارے میں دیا لو ہیں۔ ان کا جی چاہتا تھا ہم اپنے چھوٹے چھوٹے دکھوں روزمرہ کی غلامیوں کے دشت کرب و بلا سے نکل کر اسی مدار کے اسرار میں گم ہو جائیں جہاں وہ خود ہیں۔

پھر ایک روز میری کچ بچی سے تنگ آ کر بولے، ”تم امین آباد ہے۔ میری بیوی سمیت، اپنی انا کے نوکیلے لیکروں پر چڑھے رہتے ہو۔ خدا اور رسول کے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے حالانکہ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ روحانی لوگوں کا بھی ایک انتظامی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ وہاں بھی کشنر ہوتے ہیں، ڈمی سی ہوتے ہیں، رابطہ آفسر ہوتے ہیں، مسندوں پر بیٹھے والے ہوتے ہیں۔ دہلیز پر لٹکنے والے ہوتے ہیں۔

اور تم خود، جب تمہارے داخل، تمہارے خارج میں سے تمہارا کوئی عالم کسی کڑے امتحان میں ڈلتا ہے تو تم کسی عارف، کسی مددگار کے لیے ایسی چیخ و پکار ڈالتی ہو کہ خدا کی پناہ۔ اور اب جب میں ڈنکے کی چوٹ کھد رہا ہوں کہ قدرت جیسا بھر بھر لٹا نے والا، صاحب علم و عمل ہمارے درمیان موجود ہے تو تمہارے دل میں دوسووں کی سلاخیں کھبی ہیں۔

مفتی جی کے وجود سے پگھلتی شریفی جیسی سچ اور خلوص کی منہ توڑ مٹھاس نے مجھے شہاب صاحب کی چوکھٹ پر جانے کے لیے مجبور تو کر دیا۔ لیکن شک کی مکاری نے اپنا جالا اور تیزی سے بننا شروع کر دیا۔

وہ مجھے راستہ بھر سکھاتے رہے ابھرتے بچے کی مشفق ماں کی طرح۔ جھکنا نہیں، دل کی بات کھل کر کرنا، اکیلے اندر جانا، مجھے ساتھ گھسیٹنے کی ضرورت نہیں۔ اب قدرت اس مقام پر ہے۔ اس کی بات رد نہیں ہوتی چاہتا ہوں تم بھی شکھی ہو جاؤ۔ غمز میں بھیگی بی بی بیٹیوں کی طرح دبے پاؤں شہاب صاحب کے پاس پڑی گری پر بیٹھ کر میں نے اپنے بوسیدہ بدبودار کھانڈ ننگے کرنے شروع کر دیے۔ پیٹ کے اندر خوف اور تحسّس کا جلا کھاؤ، ایک درد کی سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

شہاب صاحب کے چہرے پر یوگیوں کی سی مسکراہٹ تھی۔ میری کمر میں جو بھالا کھبا ہے اُس سے خون کی

دھاریاں بہتی ہیں شہاب صاحب مجھے اپنے لیے شفا مانگنے کا چلن نہیں آتا۔

”اپیل تو صرف اوپر والے کورٹ میں دائر کی جاسکتی ہے۔ یہاں تو بات کرنا ہی بے سود ہے۔“ وہ دھیرج سے بولے ”تقسیم کے وقت مہاجر کیمپ میں اپنے خاندان برباد کرن اور اس کی لٹی پٹی حرام نصیب بیوی کو دیکھ کر آپ کے حساس دل میں آگ کے الاؤ دینے لگے تھے۔ اور انسانی وحشت و بربریت کے متعلق آپ نے صبح کی سپیدی غور ہونے سے پہلے ”یا خدا“ کی صورت میں انسانیت کو بھنبھوڑ کے رکھ دینے والا لازوال ادب پارہ تخلیق کر ڈالا تھا لیکن غلام محمد، سکندر مرزا، جنرل ایوب کی آمریت اور مفاد پرستی نے جمہوریت کو جڑ سے اکھاڑ کر پاکستان کی نیوں میں ڈالنا مائٹ کی تاروں کے جال بچانے اور آپ کی کھلی چاک چوبند آنکھیں دیکھتی رہیں۔ لوگ کہتے ہیں گلڈ کی صورت میں آپ نے ایوب شاہی مارشل لا کی تقویت کے لیے کادمی ادبیات بنانے کی روایت ڈالی اور آپ کے رویے نوکری کے دوران بہت حد تک وہی رہے جو انگریزی حکومت کی روایات پر چلنے والی باقی نوکر شاہی کے رہے۔ سدھارتا کی طرح کن حادثات زمانہ کے تحت آپ کے اندر یہ جہان دیگر دھڑکنے لگا۔ میرے ذہن میں سوالات کے سیکڑوں سرکنڈوں نے سر اٹھایا۔

”آپ یہ دو لفظ پڑھ کر خلوص دل سے دُعا کریں، قبولیت کی گھڑی ضرور آئے گی۔ مانگتے رہنا ضروری ہے کس لمحے فریکوئنسی قائم ہوتی ہے، کوئی نہیں جانتا۔“ انھوں نے قرآن پاک کے دو لفظ کا غڈ پر لکھ کر پکڑا تے ہوئے حلی سے کہا

”میرے اندر کی جدید عورت چلائی۔ میں فہم و ادراک کی خیرہ کر دینے والی روشنیوں سے باہر کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ آپ کے دیے ہوئے یہ دو معصوم لفظ میرے درد کا مداوا کیسے ہو سکتے ہیں!“

”میں مطمئن ہوں، جتنی توجہ تمہیں دی گئی دوسروں کو کم کم ملتی ہے۔ بارود کے فیلٹے کی طرح تر تڑپ نہیں ہوا کرتی روحانیت میں۔۔۔ جو کہا گیا وہ کر۔“ مفتی جی نے قرآنی حروف کو دیکھتے ہوئے کہا

پھر میں نے وہاں ممتاز مفتی کی دہلیز پر ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھے۔ گمشدہ، زخمی بکریوں، پھٹی ہوئی جھولیاں، نئی نکر جھولیاں، خالی جھولیاں، بھری ہوئی جھولیاں۔ اور ممتاز مفتی ایک داس کی لگن سے، کسی کے منہ میں ہومیو پتھی کی پڑیا ٹھونستے ہوئے، شہاب صاحب سے لوگوں کی ملاقاتوں کے اوقات لیتے ہوئے، کسی کی اشک شوئی کے لیے اپنا کندھا آگے بڑھاتے ہوئے

کت کڑے نی کت کڑے !

یہ جو آپ صبح و شام ڈھول پیٹتے ہیں میں شہاب صاحب کا ”ایرینڈ بوائے“ ہوں ”ٹیلیفون ایکسچینج“ وغیرہ وغیرہ۔ اس میں بھی کچھ گڑ بڑ ہے۔ مجھے تو آپ بھی کوئی لامتی سے فقیر نظر آنے لگے ہیں۔ حاجتمندوں کے آگے گھٹنے ٹیکنا۔ میلے کچیلے کو گلے لگانا۔ وجود حقیقی میں انجذاب کا ایک ارفع راستہ۔ نہیں تو اور

کیا ہے؟

شہاب والے کشت تو میں کئی زندگیوں میں بھی نہیں کاٹ سکتا بگلی میرا تو کڑا رشتہ صرف اس کی مخلوق سے ہے، زمین پر رہنے والوں سے۔ ولی ابدال بنا میرے بس میں نہیں۔ مفتی نے مسکراتے ہوئے کہا ایک روز شہاب صاحب کے گھر کے مسجد نما محل میں، ان کی جدیدیت کا پیکر ہنس مکھ، ذہین بھتیجی سے ملاقات ہوئی۔ دوپار منٹ میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی حیثیت قدرت اللہ شہاب کی برفانی بھیل جیسی خاموش زندگی میں وہ ایک کلابی کنول کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

”گدھی، آپ تو شام و سحر شہاب صاحب کی قربت میں رہتی ہیں۔ خلوت اور جلوت کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ کبسا محسوس ہوتا ہے آپ کو؟“ میں نے اخبار نویسوں کے مخصوص لہجے میں پوچھا ”عام طور پر میں ان سے دوستوں جیسی لبرٹیز (LIBERTIES) لے لیتی ہوں۔ وہ ہنستے رہتے ہیں میں ان کے ذاتی معاملات میں متکسب نہیں ہوتی۔ بس کبھی کبھی ان کے کمرے کے سامنے سے گزرنا عذاب ہو جاتا ہے۔ ایک بار تو میں ان سے لڑ ہی پڑی تھی۔“

”لیکن کیوں؟“ میں نے کانپتی نچیف آواز میں پوچھا عجیب، ان جھوٹی بے دست و پا کر دینے والی خوشبو کے بھبھکا کے آنے لگتے ہیں ان کے کمرے سے اچانک۔ سارا گھر بھیک جاتا ہے۔ میں تو خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ ایک روز میں ناراض ہو گئی یہ پتا نہیں کون سے SCENT کی بارش ہونے لگتی ہے گھر بھر میں۔ یہیں ڈر لگتا ہے۔“

”کسی نیک رُوح کی آمد ہوگی، گھرایا نہ کرو۔“ وہ شرارت سے بولے میں نے قلم از مفتی سے کہا، مفتی جی! اتنی باتیں سنیں، سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن روحانیت کا چھوٹا سا جرم تو بھی اندر گھر نہیں بنا سکا۔ آپ کا رخ مڑتے ہی رسل، ڈیکارٹے، کرک کارڈ آوازے کسنے لگتے ہیں۔ شہادت، عمل ردِ عمل۔ نقیشت کے پاؤں میں پسینے لگتی ہوں میں۔“

ایک روز مفتی جی نے شہاب صاحب کا لندن سے آیا ہوا ایک پرانا خط دکھایا ”اسے پڑھ کر اور صدقِ دل سے بتا، کوئی دوسرا ایسا دیکھا جو محض ایک یقین کی قندیل ہاتھ میں لیے، جانِ تحقیقی پر رکھ کر اندھے تاریک کنویں میں اتر جائے ایسے کڑے امتحانوں کے لیے محض جذبہ حب الوطنی کافی نہیں ہوتا۔ وجود کے اندر کچھ اور سوتے چھوٹ رہے ہوتے ہیں۔“

(میں نے شہاب صاحب کے متن کو معذرت کے ساتھ اپنے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے) جب دشمنوں کے جھوٹ کے پول کھلے تو انہوں نے انتقاماً کالے علم کے ذریعے میرے بدن کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ میں زندوں میں ہوں یا مردوں میں۔ یہودی صدیوں پرانی شیطانی

قوت بدستور فعال ہے۔ بستر پہ پڑا پڑا بھی آہنی شکنوں میں جکڑا رہا ہوں ٹائم اور سپیس سے پرے حواس گم کر دینے والا یہ دوزخ پتا نہیں کب تک بھڑکتا رہے گا۔ کچھ روز پہلے ایک ضروری میٹنگ کے لیے ہمت کر کے گھر سے نکلا تو ایک ویگن قریب آ کر کھڑی ہوئی ”چلتے ہم آپ کو آپ کی منزل پر پہنچا دیں ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں“ ایک سوڈو بوڈو آدمی نے باہر نکل کر بڑے اخلاق سے کہا، اور اس تذبذب اور بے یقینی کے لمحے کے بعد مجھ پر اغوا اور تشدد کی جو غیر انسانی واردات گزری، آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو ہم سب بھی جانتے تھے کریونیسکو میں پاکستان کی نمائندگی کرتے کرتے یہودیوں کے جھوٹ اور جعل سازی سے تنگ اگر شہاب صاحب نے گوریلا تربیت حاصل کی اور فلسطینی بچوں پر ڈھائے ہوئے یہودیوں کے مظالم کی ایک سچی تحقیقی رپورٹ حاصل کرنے ایرانی ٹورسٹ کا بھیس بدل کر اسرائیل جا پہنچے۔ کسی خطرناک زہر کی گولیاں جیب میں رکھے بھوکے پیاسے شب و روز جا گئے، لومڑی کی سی ہوشیاری کے ساتھ۔ یہودیوں کو بھل دے کر ایسی تحقیقی رپورٹ جمع کی کہ یونیسکو کی یہودی لابی بغلیں جھانکتی رہ گئی۔

مسجد اقصیٰ میں چپ کمرات گزارنے کے موقع پر لکھتے ہیں ”قبلہ اول کی چار دیواری کے اندر جب میں اکیلا رہ گیا تو تاریخ اور تقدس کے ایک مہیب سناٹے نے مجھے سر سے پاؤں تک غراپ سے نکل لیا، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی پاکیزہ شیش محل میں ایک گنا غلطی سے بند ہو گیا ہے۔ لرزے کے بخار کی طرح میرے تن بدن پر کپکپی رہی ہو گئی اور دانت بے اختیار کٹ کٹ بجنے لگے۔ مرگی کے مریض کی مانند تشنگی میں گرفتار ہو کر لڑھکتا ہوا میں ایک ایسی ٹائم ٹنل (TIME TUNNEL) میں جا کر اجماں پر نسل انسانی کی ہزاروں سال کی تراویہ تاریخ انکڑائی کے کربیدار ہو گئی۔“

ممتاز مفتی کا خط پڑھنے سے پہلے اس بات کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ شہاب صاحب کا سارا مشن کامیابی سے مکمل ہو جانے کے بعد یہودیوں کی مسلمانوں کے خلاف صدیوں پرانی کینہ پروری اور خباثت خوفناک انتقام کی صورت شہاب صاحب کے گھر کی دہلیز تک جا پہنچے گی۔

وہ مفتی صاحب کے خط میں شاید اسی طرح کچھ لکھتے ہیں: ”یونیسکو کی میٹنگ پر جانے کے لیے گھر سے باہر نکل کر کسی ٹیکسی یا ویگن کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک ویگن نما ڈبہ میرے قریب آ کر کھڑا ہوا، اور سوڈو بوڈو گورے نے بڑے مہذب انداز میں پوچھا: آپ یونیسکو کی میٹنگ پر تو نہیں جا رہے، ہم بھی ادھر ہی جا رہے ہیں، چلتے ہمارے ساتھ۔ ادھر مغرب میں کسی سے لفٹ لینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں، میں شکریہ کر کے سوار ہوا پھر اس کے بعد وقت اور سپیس سے الگ کسی ڈاکشن میں، جس تشدد اور اذیت سے مجھے گزرنا پڑا اس کے بیان کے لیے الفاظ ناپید ہیں۔ پتا نہیں کتنی مدت کے بعد آنکھ کھلی تو اپنے گھر کے قریب اسی جگہ گرا ہوا پایا گیا جہاں سے ان یہودیوں نے اٹھایا تھا۔ غفت تلاش میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

گھر چلے آنے کے بعد بھی بہت دن تک یہودیوں کے فاسد جادوئی عمل نے مجھے اس مقام پر لٹکا رکھا ، جہاں انسان زندگی اور موت کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا۔ پھر بھی الحمد للہ میں مطمئن ہوں۔“

اور یہ بات میں شہاب صاحب کی زندگی میں انہیں کھل کر بتانے کی جرأت پتا نہیں کیوں نہ کر سکی کہ ان کی اس عظیم قربانی پر میرا پاکستانی دل رستی دنیا تک ان کا اور ان کی اولادوں کا ممنون رہے گا۔

اور جہاں تک قدرت اللہ شہاب کی تازہ ترین اور بد قسمتی سے آخری کتاب ، شہاب نامہ کا تعلق ہے۔ اس منجھی ہوتی شگفتہ رسیل نشر کا مقام ادبِ عالیہ کی چنیدہ مسند پر ہوگا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

”آئینہ خانہ ہے دلیر“ کے مترادف زندگی کے چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات کے رنگین شیشوں سے مزین یہ کتاب شروع سے آخر تک رنگ میں بھگوئی ہے کہانی در کہانی ، عکس در عکس ، نرمی اور محبت سے ہاتھ پکڑ کر بٹھاتی ہے اور پھر آخری سطر تک جلنے نہیں دیتی۔

علاوہ انہیں جس بات نے مجھے چونکا یا وہ شہاب صاحب کے ہم گیر سیاسی اور تاریخی تجزیے ہیں۔ یہ ہماری بد بختی کہ قائد اعظم کے بعد ’بب بھی در دا ہوا‘۔ گھر پر خرکاروں اور لیٹروں کا قبضہ ہوا ، جنھوں نے طاقت کے مندرجہ ذیل پر سوار ہوتے ہی نواز ایڈ پاکستان کو اغوا شدہ بچے کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر ٹیبلٹ منڈ کر کے ریڑھی میں ڈالا اور شکول ہاتھ میں دے کر دروہیہ مانگنے جوگا کر دیا اور اپنی سیاہ کاریوں اور چہرہ دستیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے آنے والی بے گناہ نسوں کے لیے دھوئیں اور دھند میں لپٹے جھوٹ کے پلندے باقی چھوڑ دیے۔

یہی وجہ ہے کہ ان بند دروازوں کی گھٹی فضا میں ، کرنی جی دار اگر سچ کے چار جگنو مٹھی میں بند کر کے لاتے تو حب الوطن چاک گریباں اُس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب جس مصفا مٹی سے بنے تھے۔ روشنی کے کچھ دریچے واکرٹان پر بہر طور واجب تھا۔

در اصل شہاب نامہ کتاب نہیں زندگی کی داخلی اور خارجی کیفیات کی اونچی نیچی سنگلاخ پہاڑیوں کے درمیان ایک طویل سفر ہے۔ کہیں اچانک بچہ بھاگ اڑا تے پر شور سمندر ، اپنی تھکن اور نامکون وسعتوں سمیت چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ پل بھر میں قاری آتش فشاں کے دہانے پر متعلق ہوتا ہے تو دوسرے ٹائیپے ، رنگوں کی پھیلاؤ میں ڈوبے نارنجی ، کاسنی ، عنابی گستاں اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زندہ ، دھڑکتی ، جلتی ، بھڑکتی حقیقتوں کے جہوم میں بھاگ بھاگ کر میرا تو سانس پھول گیا ہے زندگی کرنے کی وہ تمام تشبیہیں جو میرے فہم نے اپنے ارد گرد اتنے برسوں میں کھڑی کی تھیں ، جھٹکے سے چکنا چور ہو گئیں ”نائنٹی“ کے طویل ، سبز ، نیچرل ، پراسرار تجربے سے ، شہاب صاحب نے میرے اتنے سارے برسوں کو زیر و پوائنٹ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے عالم کے ساتھ اور کون کون سے عالم گڑ بڑ ہیں ؟ مصفی جی کے تمام مشاہدات

مجھے پوسٹیشن اور فینڈی پر مبنی نظر آیا کرتے تھے لیکن قدرت اللہ شہاب نے جاتے جاتے جو آگ بھڑکائی ہے
 انہیں وہ اصل کی طرف کوئی سمت کھولتی ہے یا نہیں! مری کی شاداب و سرسبز پہاڑیوں میں جاڑے کی
 چائے کی طرح جب میں نے شہاب نامہ گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارا تو میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ
 ب دوستوں کے درمیان ایک داستان کشش و گریز بن جائے گی اور رفقا، ادب عالیہ سے الگ، اسے
 ست اور تاریخ کی کسوٹی پر رگڑنا شروع کر دیں گے۔ بالخصوص اس وقت جب قدرت اللہ شہاب ہمارے
 بان موجود نہیں۔

نقوش کے خاص نمبر

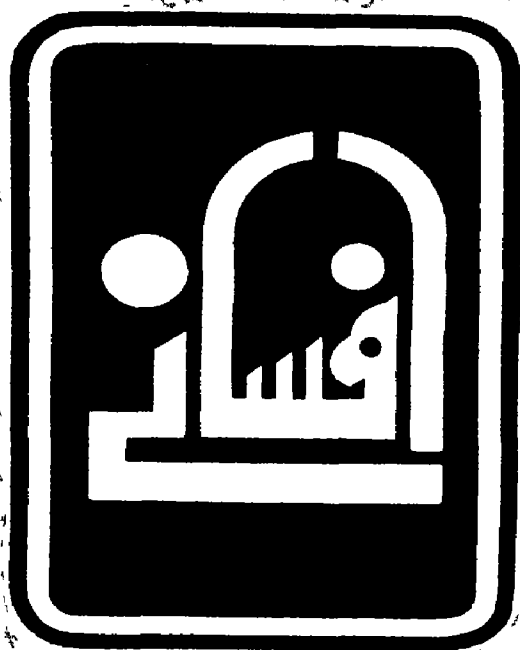
حکومتی منظوری متدارد میں دستاویز ہیں

(۱) رسول منیر	(۱۳ جلدیں) فی جلد	۱۲۵ روپے
(۲) ساجد غالب (مختصر غالب)	فی جلد	۱۰۰ روپے
(۳) غالب نمبر ۳	فی جلد	۵۰ روپے
(۴) افسانہ نمبر	(دو جلدیں) فی جلد	۷۵ روپے
(۵) ادبی سفر کے نمبر	(دو جلدیں) فی جلد	۷۵ روپے
(۶) خطوط نمبر	(تین جلدیں) فی جلد	۵۰ روپے
(۷) آبِ مستی نمبر	(جلد دوم) فی جلد	۱۰۰ روپے
(۸) میر نمبر ۱	فی جلد	۱۰۰ روپے
(۹) میر نمبر ۲	فی جلد	۹۰ روپے
(۱۰) اقبال نمبر ۲	فی جلد	۵۰ روپے
(۱۱) انیس نمبر	فی جلد	۱۰۰ روپے
(۱۲) غزل نمبر	فی جلد	۵۰ روپے
(۱۳) عصری ادب نمبر	فی جلد	۶۰ روپے
(۱۴) سائنس نمبر ۱۹۷۷ء	فی جلد	۵۰ روپے
(۱۵) سائنس نمبر ۱۹۷۹ء	فی جلد	۵۰ روپے

نقوش کے عام شمارے

(۱۶) شمارہ نمبر ۶	فی جلد ۲۰ روپے
(۱۷) شمارہ نمبر ۱۱	فی جلد ۲۰ روپے
(۱۸) شمارہ نمبر ۱۳	فی جلد ۲۰ روپے
(۱۹) شمارہ نمبر ۱۴	فی جلد ۲۰ روپے
(۲۰) شمارہ نمبر ۱۵	فی جلد ۲۰ روپے
(۲۱) شمارہ نمبر ۱۶	فی جلد ۲۰ روپے
(۲۲) شمارہ نمبر ۱۷	فی جلد ۲۰ روپے
(۲۳) شمارہ نمبر ۱۸	فی جلد ۲۰ روپے
(۲۴) شمارہ نمبر ۱۹	فی جلد ۲۰ روپے

رسالہ نقوش، بکیر اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور



فقیر افقیری دُور ہے

اعجاز حسین بٹالوی

میرا خیال تھا کہ اس کا انتقال ٹی بی سے ہو گا مگر اس نے تو اپنی موت کا انتظار ہی نہ کیا اور مڑک کے حادثے کی نذر ہو گیا۔ یوں تو اس سے ملاقات بھی حادثہ ہی تھی مگر ملاقات سے موت تک آتے آتے شناسائی کی کئی منزلیں طے ہو گئی تھیں۔ یاد کرتا ہوں تو نقش دھندلے دھندلے سے نظر آتے ہیں مگر اول ملاقات کے نقش بالکل واضح ہیں۔ میں پریس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر پاکستان آیا تھا اور کیا زمانہ تھا کہ مجھے پڑھے لکھے پاکستانی بھی جاہل معلوم ہوتے تھے۔ میں علم کی برجھل گھڑی سر پر اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ کبھی علم کا غارہ منہ پر جاتا اور کبھی اپنے علم کو تیز خنجر کی طرح استعمال کر کے حریف بذلہ کو تر تیخ کر ڈالتا۔ یہی زمانہ تھا جب میری اس سے ملاقات ہوئی۔ سردیاں گزر چکی تھیں، کھلے موسم کا آغاز تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں غسل خانے میں قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا سیٹی بجاتا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ گیزر میں پانی گرم ہو جائے تو نہاؤں۔ کھڑکی سے باہر نظر پڑی تو دیکھا کہ نہایت پختے پرانے کپڑے پہنے ایک فقیر صحن میں آم کے پیڑ کے نیچے اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تازہ گندھے ہوئے آٹے کا بڑا سا پیڑا تھا جس پر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر جھونکتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے وہ پیڑا ملازم کے حوالے کر دیا اور بولا:

”لو، بھینس کو کھلا دو، مولا برکت دے گا۔“

اب وہ اٹھ کر باہر جانے لگا۔ اس کے پاؤں میں گھنگر و بندھے ہوئے تھے۔ جب وہ میرے دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے آواز دی:

”ٹھہرو، ادھر آؤ ذرا!“ مجھے یاد ہے میری آوازیں رعونت بھی تھی اور غصہ بھی۔

”یہ تم کیا کر رہے تھے؟“

”آٹے کے پیڑے پر دم پڑھ رہا تھا۔“

”کیوں؟“

”مائی ہو راں نے کہا تھا کہ بھینس دودھ نہیں دیتی۔ میں نے کہا لاؤ آٹے پر دم پڑھ کر اسے کھلا دیں۔“

”اچھا تو تمہارے دم پڑھنے سے بھینس دودھ دینے لگے گی!“

”اللہ کی مرضی ہوگی تو دودھ دے گی اس کی مرضی نہ ہوگی تو نہیں دے گی۔“ اس کا فقرہ گویا غلٹا تھا

یعنی بات ختم۔
میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمبا میلا کچلا مٹی رنگا کرتا، ٹخنوں سے ذرا نیچے تک، جس پر جب گرجا
موٹے دھاگے سے رنگا رنگ پوند لگے ہوئے تھے۔ ٹانگیں برہنہ، پاؤں جوتے کے بغیر، سر کے بال ایسے
جیسے گاؤں کے کچے راستے کے ساتھ اُگی ہوئی جھاڑیاں، جن پر گرد کی تہیں جم جاتی ہیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی،
آنکھوں میں گیر، دانت گندے، اکثر گرچکے تھے، باقی یونہی اٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے، کسی وقت بھی
بھر جائیں گے۔

میں نے پوچھا: ”اور تم اپنے دانت کیوں صاف نہیں کرتے؟“
وہ خاموش رہا اور میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کیسا فضول سوال کیا ہے تم نے!
اس کے کپڑوں سے بہت بدبو آ رہی تھی، میں نے پوچھا:
”تم نہائے کب تھے؟“

اس نے سوچ کر کہا،
”یہی شور شرابے سے دو تین سال پہلے۔“
مجھے یاد ہے اس نے شور شرابے نہیں روئے گئے کالفاظ استعمال کیا تھا۔ روئے گئے سے
دو تین سال پہلے۔

”رولا گولا کیا؟“ میں نے پوچھا
وہ بولا: ”یہی جب کھتری یہاں سے اُدھر گئے تھے اور مسلمان اُدھر آئے تھے۔“
میں نے حساب لگایا تو اس کے آخری غسل کا سال کوئی ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ نکلتا تھا۔
”تم کرتے کیا ہو؟“
”بُوٹی پیتا ہوں۔“
”بُوٹی کیا؟“

اس سوال پر اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔
”بھنگ بُوٹی۔“
”اور رہتے کہاں ہو؟“

”یہ مڑھیاں ہیں نا، جہاں رولا گولے سے پہلے ہندو مُردے جلاتے تھے وہاں رہتا ہوں۔ اب
مڑھیاں خالی پڑی ہیں۔“
”کیوں اب مُردے نہیں جلتے وہاں؟“

”نہیں، پچھلے سال ایک مُردہ جلا تھا وہاں۔ مگر اُنھوں نے پوری لکڑیاں بھی نہیں ڈالیں۔ مردہ آدھا جلا آدھا نہیں جلا۔ وہ تو چلے گئے مگر دو دن بعد جب کُتے جمع ہونے لگے تو میں نے کتوروں کو بھگایا اور لکڑیاں جمع کر کے لاش جلا دی۔“

اس آواز میں نہ افسوس تھا، نہ حیرت نہ غصہ، نہ میری رحمت سے نفرت، نہ کوئی جگہ نہ شکایت، نہ ڈر نہ خواہش۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور ایک نکتہ مجھے ایک خیال آگیا۔ میں نے اُسے کمرے میں بلا کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا، اور خود اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ حیرت سے آئینے میں تکتا چلا گیا اور تکتا چلا گیا، خاموش تھا اور آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا:

”ساڈے تو کسی کام کا ہے نہیں، جس کا ہے اس کے کام کا ہو تو خبر نہیں۔“ پھر اس نے آئینے سے نظریں پھیر لیں۔

یہ فقرہ سن کر میں ٹھٹک گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پہلی دفعہ اس کی ذات میں دل چسپی لیتے ہوئے اس سے پوچھا:

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نام صرف اس کا ہے، میرا نام کیا ہو گا!“

”پھر بھی تمہیں لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟“

”اڑنگے شاہ۔“

”اڑنگے شاہ!“ میں نے میز سے اٹھا کر مٹھی بھر سکتے اس کے ہاتھ پر رکھ دئے ”یہ تم لے لو۔“

اس نے مٹھی کھول کر سکوں کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر مٹھی بند کر کے میری طرف بڑھا دی۔

”یہ تم رکھ لو۔“

”تم کیوں نہیں لیتے؟“

”ساتیں! اتنی دولت میں کہاں رکھوں گا!“

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ کہیں بیوقوف نہ بنا رہا ہو مگر اس کا چہرہ تو دیوار تھا، آئینہ تھا۔

پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”اچھا، لاؤ ایک چوٹی دے دو، تم بادشاہ آدمی ہو ناراض

ہو جاؤ گے۔“

”مگر اس چوٹی کا کیا کرو گے؟“

”تمہاری طرف سے بوٹی میں الائجی گھوٹ لوں گا۔“

اور یوں اڑنگے شاہ سے دوستی کی ابتدا ہوئی، ایسی دوستی جس پر پچیس سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا۔ وہ ہماری لہنتی کے ویران مرگھٹ میں رہتا، جہاں اس کی ایک کوٹھڑی تھی اور اس کے قریب ہی ایک قبر تھی۔ اکثر کوٹھڑی میں رہتا لیکن قبر میں اُتر جاتا اور وہیں پڑا رہتا۔ کسی نے اس کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ دنیا کی کسی چیز کے لیے اس نے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ کھانا مل جائے تو کھا لیتا۔ نہ ملے تو کئی دن بغیر کھائے گزار دیتا مگر بوٹی کے بغیر ایک دن گزارنا اسے موت معلوم ہوتا۔ مگر موت سے اسے کوئی ڈر نہ آتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ زندگی میں کئی دفعہ مر چکا تھا۔ شروع شروع کی ہر ملاقات پر میں طرح طرح کے تجربے اس پر کرتا۔

”اڑنگے شاہ! ایک بات بتاؤ، تمہیں کبھی کسی چیز سے ڈر بھی لگتا ہے؟“

”نہیں سائیں! ڈر کس بات کا، ڈر صرف اس کا۔“ پھر وہ قدرے خاموش ہو گیا اور بولا: ”ماں مگر ایک بات ہے ساتیں! رات کو جب میں بوٹی پی کر اکیلا آرام سے آسمان کے نیچے بیٹھا ہوتا ہوں تو کبھی کبھی مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دھرتی ماں مجھے دھتکار رہی ہے اور کتنی ہے، اُٹھ بدبختا، اُٹھا لے اپنا بوجھ یہاں سے۔ بس ساتیں بادشاہ! اس وقت مجھے ڈر لگتا ہے۔ پھر میں بڑا روتا ہوں اور کہتا ہوں ماما! تو تو مجھے دھتکا نہ دے میں تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں۔“

یہ سن کر میرے ذہن کا بے ہودہ کپیوٹر چل پڑا۔ دھرتی ماں، ماما، ماما، ماں بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا کیڑا لیا چور۔ ایک دم سگمند فراہم نے میرے دماغ پر قبضہ جمالیا اور میں نے سوچا بے چارے اڑنگے شاہ کو تو ”مدر ٹیکس“ ہے۔ یہ بے چارہ تو ”ایڈی پس“ کا شکار ہے

”اڑنگے شاہ! تمہاری ماں کہاں ہے؟“

”اللہ جانے سائیں! پتا نہیں کہاں ہوگی، بچپن میں اُسے دیکھا تھا، شاید اب تک گزر گئی ہوگی۔“

”مگر اڑنگے شاہ! تم اس سے ملنے کیوں نہیں جانتے؟“

”کہاں ملنے جاؤں بادشاہ، جب دنیا ہی چھوڑ دی تو پھر ناتے رشتے کہاں رہے۔ باپ تو میرا بچپن میں گزر گیا تھا۔ ہماری ماں نے ایک اور بچے کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ میں ماسی کے پاس چلا گیا۔ کوٹھے میں اکیلا بیٹھا رہتا تھا۔ پھر گاؤں کا ایک لڑکا ساتھ بن گیا۔ اس کے ساتھ مل کر بوٹی کے پتے توڑتے ماسی باہر جاتی تو۔۔۔ پر ذرا سا بھونستے اور گڑ میں ملا کر کھا لیتے۔ سارا دن آندر رہتے۔ ماسی نے یہ دیکھا تو سردار بگے کے پاس نوکر کروادیا۔“

”اچھا تو اڑنگے شاہ! تم نے کبھی باقاعدہ نوکری بھی کی ہے؟“

”نوکری تو صرف مرشد کی کی ہے ساتیں! سردار بگتا تو سید نہیں تھا۔ میں تو ماسی کے کنبے پر اس کے ڈیرے پر بٹا بیٹھا تھا۔ اُس وقت میں واہ وا گبھرو تھا اور سردار بگتا پنڈ کا مالک تھا۔ اس کے پاس بھری ہوئی

بندوق پڑی ہوتی تھی۔ گھوڑا زین ڈالے ہر وقت تیار کھڑا رہتا تھا۔ سفید دوتھی والا پلنگ بچا ہوتا تھا۔ یہاں شماں تو اس کے سامنے زمین پر بیٹھتے تھے اور میں اس کا اوپر کا کام کرتا تھا۔“

میں نے اس اڑنگے شاہ کی طرف دیکھا جو اس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا، مسلسل فاقے سے نڈھال وجود، آرام اور آسائش سے محروم جسم، قد کاٹھ تو اب بھی اچھا تھا مگر سا لہا سال یکم نشے کی زیادتی اور خوراک کی کمی سے وجود ڈھسے گیا تھا۔ میں نے سوچا کیا واقعی یہ شخص بھی کبھی جوان ہوا ہوگا۔ کیا اس نے بھی گاؤں کی کسی لڑکی کی طرف محبت یا ہوس کی نظر سے دیکھا ہوگا۔ کیا اس کی طبیعت کبھی دنیا داری کے معاملات پر مچلی ہوگی۔

”اڑنگے شاہ! تم سردار بگے کا کیا کام کرتے تھے؟“

”بس یہی گھوڑی باندھ دی، کاٹھی ڈال دی۔ آئے گئے کے لیے حُفّے پر آگ دمردی۔ شکار پر گئے تو اس کے ساتھ ساتھ۔ شکار اٹھا کر لایا جب اس نے کہا اس کی بندوق پکڑ لی مگر بادشاہ، اچھا آدمی نہیں تھا سردار بگے!“

”خوابی کیا تھی؟“

”خوابی یہ تھی کہ جو چیز اسے پسند آجاتی وہ اسے چُرا لیتا یا چھین لیتا۔ کسی کا ڈنگر کھلا لیتا، کسی کی عورت اٹھا لیتا۔ تین بیویاں تو گھر میں تھیں مگر باہر بھی کمی نہ کرتا تھا۔ ایک دن ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ ایک بیٹا کو دیکھا جو اپنا چھوٹا سا بال اٹھائے جا رہی تھی، سردار بگے نے بال کو تو وہیں پھینکا اور عورت کو گھوڑی پر ڈال کر ڈیرے پر لے آیا۔ شام کو اس جہنی کا گھروالا اس بال کو اٹھا کر سردار کے پاس آیا کہ یا تو میری عورت واپس کر دو یا یہ بال بھی رکھ لو۔ سردار بگے نے اس جنے کو تو ایک دو ہتھڑا مارا، بچہ اٹھا کر میرے حوالے کیا اور خود اس جہنی کو لے کر کوٹھڑی میں چلا گیا۔ سائیں بادشاہ! وہ بال بیچارہ ساری رات روتا رہا، نہ دودھ پیتا تھا نہ سوتا تھا، میں بھی ساری رات اس کے ساتھ روتا ہی رہا۔ صبح کو میں نے بگے سے کہا: ”یہ کام اچھا نہیں کیا تم نے، اس آدمی کی بد دعائیں اور تجھے کی باتیں تم کو لگیں گی، واپس کر دو دونوں کو۔“ میری بات سن کر سردار بگے کو ایسا غصہ چڑھا کہ وہ اٹھ کر مجھے ہوراٹتی کرنے لگا اور حد یہ کہ گالی بھی دے دی۔ بس سائیں! پھر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا: ”سردار ترے گھر کا پانی بھی مجھ پر حرام اور باہر آکر کُرتا گلے سے اتارا اور جھولی کو آگ لگا دی۔“

”جھولی کو کیوں آگ لگا دی؟“

”سائیں! جھولی کی تو ساری خوابی ہوتی ہے نہ جھولی ہوگی نہ کسی کے سامنے پھیلے گی۔ سردار بگے کے ڈیرے سے نکل کر میں نے کہا: بندیا! اب کسی دنیا دار کی نوکری نہ کرنا۔ سوچا کہ کسی بزرگ کی خدمت کروں گا یا کسی فقیر کا غلام ہو جاؤں گا۔ جھولی کو تو آگ لگا دی تھی صرف لنگوٹی میں اس کے گھر سے نکلا۔ پنڈے پر رکھ مل لی

اور لوئی اٹھا کر چل پڑا۔

یہ سب کچھ میرے سوالوں کا جواب اور اڑنگے شاہ کی ذات تک پہنچنے کا راستہ تھا۔ اس پر میرے سوال اور تجربے تو عمر بھر جاری رہے۔ دنیا دار اور درویش کی دوستی ایسی پختہ تھی جیسے رند اور زاہد کی یاری ہو جائے تو پختہ ہوتی ہے۔ شاید ایک کو دوسرے میں اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ اڑنگے شاہ نے اس دوستی سے کیا پایا، مجھے معلوم نہیں لیکن میں نے تو اس دوستی سے زندگی کی ایسی ایسی سطوح دریافت کیں جن سے شناسائی تو کہاں حاصل ہوتی شاید میری نظر بھی وہاں نہ پڑتی۔

اڑنگے شاہ سردار بگے کے ڈیرے سے دامن جھاڑ کر یوں نکلا جیسے رانچا تخت ہزارے سے رخصت ہوا ہوگا۔

”پھر کیا ہوا اڑنگے شاہ؟“

”ہونا کیا تھا سائیں! نہ کوئی سنگی نہ ساقی۔ نہ کوئی رتنا سامنے تھا۔ نہ کوئی تھاں ٹھکانا۔ نہ یار

نہیلی۔ الفی پہنی اور چل کھڑا ہوا۔

”مگر کدھر کو چل پڑے!“

”کدھر جانا تھا بادشاہ! مرشد کی تلاش میں جدھر پاؤں چلتے رہے اُسی طرف چلتا رہا۔ ما جھے کا علاقہ تھا دیکھا کہ شیر جاؤ لی مشایخ کے دربار کی ڈاچیاں جا رہی تھیں، میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ شام ہو گئی تو میں ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں لوگ ایک نیا چک اُسا رہے تھے۔ کوئی کوٹھالیپ رہا تھا۔ کوئی ڈنگروں کے پاس منجی ڈال کر بیٹھا تھا۔ ابھی تھی پورنی تھی لوگ چک باندھنے لگے تھے اور گڑ بانٹ رہے تھے۔ مجھے دُور سے آنا دیکھ کر سب خوش ہو گئے کہ چلو اچھا ہوا فقیر آگیا بھانویں مٹی کا ہووے فقیر تو سید کا نشان ہوتا ہے۔ رات کو چک والوں نے منجی بستر اچھی دیا۔ بوٹی بھی پلائی اور بک بھر بھر کر تمباکو بھی دیا۔

دوسرے دن چک والوں نے مجھے کہا کہ گاؤں کے فقیر بن جاؤ، یہیں رہو۔ گاؤں کے باہر جو رکھ کھڑا ہے وہاں سچی سرکار کا دربار بنا لو، جھاڑو دو، پانی بھرو اور دُھواں کرلو۔ ”مگر سائیں! میں تو بے مرشد تھا۔ یہ کام کیسے کرتا۔ جب دل نہ مانا تو میں چل پڑا۔ بس اس وقت سے لے کر اب تک چلتا ہی جا رہا ہوں۔“

”مگر اڑنگے شاہ! کوئی مرشد ملا کہ نہیں؟“

”مرشد ملا، سائیں بادشاہ! مگر مشکل سے ملا۔ گاؤں والوں نے کہا کہ اب جانا ہے تو بابا شاہ قلندر کے تکیے پر چلے جاؤ، وہاں سائیں کرم شاہ قلندر بیٹھا ہے، بڑا جلالی فقیر ہے، گایاں بھی دے گا، مارے گا بھی اور چاہے گا تو لنگوٹی بھی لیراں لیراں کر دے گا۔ میں ڈر گیا سائیں! اُدھر گیا ہی نہیں۔“

”تو پھر مرشد کیسے ملا؟“

”مرشد الہ نے ملا دیا۔ میں چلتے چلاتے سائیں گھگھری شاہ کے دربار میں پہنچ گیا اور اُسی دربار کا خادم ہو گیا۔ بڑے مرشد تھے سرکار، گھگھری پہنتے تھے اور آتے گئے سے چاہتے وہ عورت ہو کہ مرد، ایک ہی بات پوچھتے بتاؤ میں جتنی ہوں کہ جانا دربار کی جگہ صاف سُتھری تھی، مگر کنواں بند تھا، صرف ڈال کھڑی تھی۔ حکم ہوا کہ جھاڑو دو، چکی پیسو، تنور تاؤ، پانی بھرو، کھوہ گڑاؤ اور آئے گئے کی خدمت کرو۔ میں سات سال تک اس دربار کا خادم رہا اور اگر مرشد پردہ نہ کر جاتے تو آج بھی ان کی خدمت میں وہیں ہوتا۔“

”مرشد نے پردہ کیسے کیا؟“ میں نے دریافت کیا
 ”سائیں! ایک رات مجھے خواب آیا کہ کہیں آسمانوں پر ایک بڑا عالی شان روضہ ہے، چاندی کے دروازے، سونے کے کیل لگے ہوئے، چاندی کی دہلیزیں اور چاروں طرف غوثی، قطبی، اولیائی سب کسی کا انتظار کر رہے ہیں صبح اُٹھ کر میں نے مرشد کو اپنا خواب سنایا۔ مرشد بولے، ہمیں معلوم ہے۔ اور خاموش ہو گئے۔ گھگھری شاہ سچا پیر تھا۔ اُسی روز بیٹھے بیٹھے میرے سامنے آہستہ آہستہ زمین میں گم ہو گیا۔ جاتے جاتے آواز آئی، اڑنگے شاہ! ہماری ڈھیری یہیں بنادینا اور اس کے بعد تم یہاں سے چلے جانا۔ میں رونے لگا۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ زمیندار کا مال مر جاتا تھا اس نے کہا، سائیں گھگھری شاہ کی ڈھیری وہ بنائے گا۔ زمیندار نے ڈھیری بنادی تو کھینٹی بھی ٹھیک ہو گئی اور مال بھی بچ گیا۔ میں نے مرشد کا حکم مانا اور ڈھیری کو سلام کر کے چل پڑا۔“

یہاں پہنچ کر اڑنگے شاہ کا حافظہ گڑبڑا جاتا تھا۔ ایک تو اسے یہی یاد نہیں تھا کہ گھگھری شاہ کی ڈھیری سے چلے اسے کتنے سال ہو گئے تھے اور یہ بھی یاد نہ تھا کہ سا رازمانہ کہاں کہاں گزرا۔ ٹوٹی ٹوٹی تصویریں ذہن میں آتی تھیں۔ اس سارے زمانے کو وہ سفر کہتا تھا۔ مختلف درگاہیں، مزار، دربار، مگر سلسلہ دار نہیں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ لگتا یوں تھا کہ مرشد کی ڈھیری سے رخصت ہونے کے بعد اس کے غم اور بوٹی کے استعمال دونوں میں اضافہ ہوا تھا ”سائیں! ایک دفعہ ایک درویش اور میں ایک ایسے علاقے سے گزرے جہاں چاروں طرف بوٹی ہی بوٹی اگی ہوئی تھی۔ ہم نے سوچا ایک دو دن رک جاتے ہیں مگر بوٹی نے پاؤں پکڑ لیے۔ کئی دفعہ یوں ہوتا کہ گھونٹنے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ ہم بڑے بڑے ہاتھ بڑھا کر بوٹی اتارتے اور پتوں کو دونوں ہاتھوں کی تیلیوں میں مل کر کھا لیتے اوپر سے پانی پی کر پڑے رہتے۔ گاؤں والے کھانے پینے کی کوئی چیز رکھ جاتے تو کھا لیتے ورنہ کھانے کی ہوش کماں تھی! کچھ معلوم نہیں بادشاہ! اس درخت کے نیچے کتنا وقت گزر گیا!“

اڑنگے شاہ کا یہ سفر نامہ بالآخر مرگھٹ پر ختم ہوا جہاں اس نے قیام کیا اور جہاں اس کی کوٹھڑی اور قبر ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر آباد ہو گئیں۔ یوں تو وہ اب بھی سفر میں رہتا تھا۔ دورِ دُمد کے میلے اور عرس اسے کھینچ بلاتے مگر کچھ عرصے بعد اس کی قبر اور گلیاں اسے واپس لے آتیں۔ اتوار کی چھٹی اور ہم دونوں کی ملاقات لازم و ملزوم ہو گئے تھے بلکہ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اسے اتوار کا دن یاد کیسے رہتا ہوگا۔ وہ دور دراز کے

کسی عرس سے واپس آیا تھا اور مجھے دھمال کے قہقہے سُنا رہا تھا۔ میں نے ایک دم پوچھ لیا ”اڑنگے شاہ!“
تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔“ اس غیر متوقع سوال پر وہ ٹھٹک گیا اور بولا،
”شادی تو گھر والوں کی ہوتی ہے سائیں! اور فقیر کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔“
پھر سوچ میں پڑ گیا، یوں جیسے وہ اپنے جواب سے مطمئن نہ ہو۔ میں نے پوچھا،
”کیا سوچ رہے ہو؟“

بولا، ”بادشاہ! اب تو میں دُور دُور کے میلوں اور عرسوں پر چلا جاتا ہوں، نہ بس والا پیسے مانگتا ہے نہ ریل والا ٹکٹ مانگتا ہے۔ اگر زنا نہ ساتھ ہو گیا تو اس کا ٹکٹ کہاں سے بھروں گا!“
اڑنگے شاہ مجھے جنوں اور پر یوں کے عجیب و غریب قہقہے سناتا، اس کا نظام اعتقادات ایک ایسے شیش عمل کی طرح تھا کہ اس میں گھس جاؤ تو باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ ایک روز ملنے آیا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا، کیا ہوا؟ بولا، ”گھومنا گزر گئی تھی اس کو دفن کرنے میں لگا رہا۔“ میں اس کی اس نئی مصیبت سے واقف تھا۔ ہوائیوں کہ ایک بوڑھی مرل سی گائے کا مالک اسے بوجھڑ خانے لے جا رہا تھا کہ راستے میں اڑنگے شاہ سے ملاقات ہو گئی۔ اڑنگے شاہ نے ایسی باتیں کیں کہ مالک کا دل پسچ گیا۔ اس نے گائے اڑنگے شاہ کے حوالے کر کے خود گاؤں کی راہ لی۔ دودھ تو وہ دیتی نہیں تھی البتہ اڑنگے شاہ کی زندگی حرام ہو گئی۔ وہ دُور دُور سے چارہ مانگ کر لاتا اور گائے کی سیوا کرتا۔ پھر گائے مر گئی اڑنگے شاہ نے درویشوں کے ساتھ مل کر دُور کی مسلسل محنت کے بعد گرٹھا کھود کر گائے کو دفن کیا اور ڈھیری پر چادر ڈال کے پاس کالے کپڑے کا نشان کھڑا کر دیا۔ میں نے پوچھا،

”اڑنگے شاہ! یہ کیوں؟“

بولا، سائیں! ہماری دھرتی اُسی کے سینگوں پر تو کھڑی ہے۔ ہم اس کی سیوا نہ کریں گے تو کون کرے گا؟
باتیں کرتے کرتے بجلی کا پنکھا بند ہو گیا۔ میں نے کہا،

”اڑنگے شاہ! یہ بجلی کہاں سے آتی ہے؟“

اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں اس کے جواب کا اہل بھی ہوں یا نہیں۔ پھر اس نے رازداری کے لہجے میں آہستہ سے کہا،

”سائیں! بجلی ایک جن ہے۔“

”جن تو ہے مگر کہاں ہے؟“

”سلیمان بادشاہ کے کنویں میں!“

”وہاں کیسے؟“

”سیلمان بادشاہ کا ایک بہت بڑا گنواں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ سورج سوا نیزے پر آگیا اور عین اس کنویں کے اوپر اس کا لشکارا پڑا۔ بس پھر کیا تھا سیلمان بادشاہ نے اپنے جنات کی مدد سے کنویں پر پتھر رکھ کر اسے قید کر لیا۔ اب یہ مستری لوگ لمبی لمبی تاریں لے جا کر اس کنویں میں ڈال دیتے ہیں۔ سائیں! یہ بجلی سیلمان بادشاہ کا جن ہے۔“

اڑنگے شاہ سے دوستی کے دن یوں نہ گزر رہے تھے کہ ایک دن میں نے اتفاق سے ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھ لیا۔ آگے آگے تین چار ڈھول تھے جو پوری گڑگڑ کے ساتھ بج رہے تھے۔ ان کے پیچھے نو جوانوں کی ایک ٹولی تھی۔ یہ لوگ فرط مسرت کے عالم میں دھمال ڈال رہے تھے۔ ان کے جسم پسینے میں شرابور اور چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ اس گروہ کے پیچھے ایک سفید گھوڑا تھا جس پر اڑنگے شاہ بیٹھا تھا۔ گھوڑے کے ارد گرد لوگوں کا ایک گروہ تھا جو ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ اڑنگے شاہ نے سبز رنگ کا صاف ستھرا لباس پہن رکھا تھا۔ سر گھٹا ہوا تھا۔ حجام نے سر پر بالوں کی ایک لمبی سی لٹ پھوڑ دی تھی جسے پنجابی میں بودی کہتے ہیں اڑنگے شاہ کے بازوؤں میں ایک نو عمر بچہ تھا اسے بھی سبز کرتا پہنا دیا گیا تھا۔

میں نے موٹر سٹرک کے ایک طرف روک لی اور اس جلوس کو دیکھنے لگا۔ میں نے گاڑی بند کی اور جلوس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ مجمع اڑنگے شاہ کی کوٹھری اور قبر تک پہنچا جسے روشنیوں نے منور کیا ہوا تھا اور نائی چوڑھوں پر دیگیں پکانے میں مصروف تھیں۔ میں نے دُور سے یہ نظارہ دیکھا اور بغیر اڑنگے شاہ کے سامنے آئے واپس ہوا۔ سوچا رہا مگر اس سارے ہنگامے کا مطلب میری سمجھ میں بالکل نہ آ سکا۔

دو روز بعد اڑنگے شاہ ملنے آیا تو معلوم ہوا کہ یہ سب جلسہ جلوس دراصل چودھری مکھن اور اس کے گاؤں والوں کا اظہارِ شکر تھا۔ ہوائیوں کہ آج سے دو برس پہلے مضامات کے ایک گاؤں سے اڑنگے شاہ کا گزر ہوا۔ گاؤں کے گتے ایک اجنبی فقیر کو دیکھ کر سمجھنے لگے۔ اڑنگے شاہ اپنے راستوں پر چلتا رہا اور کتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ خطرے کا یہ منظر دیکھ کر چودھری مکھن کو اڑنگے شاہ کی مدد کو آنا پڑا۔ اس نے کتوں کو بھگا دیا تو اڑنگے شاہ کی زبان سے اس کے لیے دعا نکلی ”جہا بھلے لوگ! خدا تمہیں پُتر دے گا۔“ مکھن نے عقیدت سے اڑنگے شاہ کے پاؤں پکڑ لیے کہ اب فقیر کے بابرکت پاؤں اس کے گھر سے ہو کر جائیں۔ چودھری مکھن کی درجنوں بھینسیں تھیں جن کا دودھ ہر روز ریڑھوں پر شہر جاتا تھا۔ بیٹے کی امید میں خدا نے ایک کے بعد ایک سات بیٹیاں دے دی تھیں اور ہر بیٹی کی ولادت کے بعد بیٹے کی خواہش شدید تر ہوتی چلی گئی تھی۔

اڑنگے شاہ نے چودھری مکھن کی توبہ کا رخ کیا۔ اس کے پاؤں جوتے سے بے نیاز تھے مگر ٹخنوں سے اوپر گنگنہ و بندے ہوتے تھے۔ اس بکھرتی ہوئی موسیقی کے ساتھ وہ گلی سے گزرا تو گلی کی عورتیں کام کاج چھوڑ کر اس کے پیچھے چلنے لگیں۔ اڑنگے شاہ نے مکھن کے صحن میں جا کر دھمال ڈالی اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر اس گھر کے

وارث کے لیے دُعا مانگی اور رخصت ہوا رستے جوگی اور چلتے فقیر کا کیا ٹھکانا۔ اڑنگے شاہ گاؤں سے رخصت ہو کر خدا جانے کس طرف نکل گیا۔

دو تین برس بعد جب پھر اڑنگے شاہ کا گزر اس گاؤں سے ہوا تو فرط عقیدت سے سارے گاؤں نے اسے گھیر لیا کہ اس دوران میں مکھن کے گھر کا چراغ روشن ہو چکا تھا اور گاؤں والے تو گویا انتظار کر رہے تھے کہ کب فقیر کا گزرا دھر سے ہو اور وہ قبولِ دُعا کا جشن منائیں۔

اڑنگے شاہ ہمیشہ زمین پر بیٹھا تھا مگر اب اسے پلنگ پر بٹھا کر سارا گاؤں اس کے ارد گرد زمین پر بیٹھ گیا۔ ایک ایک کر کے عورتیں، مرد اور بچے اس کے سامنے آئے، سلام کرتے اور دُعا لے کر بیٹھ جاتے۔ چودھری مکھن نے حکم دیا کہ اڑنگے شاہ کے لیے نیا لباس تیار کیا جائے۔ جام بلا کر اس کا سر گٹھایا گیا البتہ اڑنگے شاہ کے اصرار پر ایک لمبی فقیرانہ لٹ سر پر چھوڑ دی گئی۔ پھر فیصلہ ہوا کہ اسے پہلے دودھ سے اور پھر پانی سے غسل دیا جائے گا۔ ابھی تک تو اڑنگے شاہ گاؤں والوں کی بات ماننا ہی لیکن غسل والی بات پر آکر اس نے انکار کر دیا۔ سمجھوتہ یہ ہوا کہ صرف دائیں گھٹنے کو غسل دے دیا جائے۔ جب یہ جشن ہو چکا تو چودھری مکھن اور اس کے ساتھی اڑنگے شاہ کو سفید گھوڑے پر بٹھا کر ڈھول کی تھاپ اور بھنگڑے کی چاپ کے ساتھ اس کے ڈیرے تک چھوڑنے آئے۔

میں نے یہ واقع بہت دلچسپی سے سنا۔ اڑنگے شاہ کی شکل، حلیہ اور لباس تبدیل ہو چکے تھے۔ مگر اس وقت تو مجھے خیال ہی نہ آیا کہ یہ واقع اڑنگے شاہ کی زندگی کو اس حد تک تبدیل کر دے گا۔ اس کے اثرات آہستہ آہستہ نمودار ہوئے۔ چودھری مکھن کو یہ گوارا نہ تھا کہ اڑنگے شاہ بغیر منجی بستر کے رہے۔ اڑنگے شاہ نے پلنگ لینے سے انکار کر دیا کہ پلنگ پر سونے سے فیر جاتی رہتی ہے مگر چودھری مکھن دوستی اور کھیس ڈیرے پر چھوڑ گیا۔ اڑنگے شاہ قبر میں اتار کر لیٹے لگتا تو مکھن نیچے کھیس بچھا دیتا۔ اڑنگے شاہ کھیس اٹھا کر باہر بھینک دیتا۔

شام کو مکھن گھر کا پکا ہوا کھانا لے کر اڑنگے شاہ کے ڈیرے پر پہنچ جاتا۔ بونی ٹنڈو اپنے ہاتھ سے گھوٹا۔ کبھی کبھی بھنگ کے ساتھ بادام بھی گھوٹ دیتا۔ دھواں کرتا، چلیں بھرتا اور دُور دُور کے علاقوں سے فقیروں اور درویشوں کو پکڑ پکڑ کر اڑنگے شاہ کے ڈیرے پر لاتا کہ او ایک پستے فقیر کی زیارت کرو۔ اڑنگے شاہ بیچارہ مجھوری کے ہاتھوں صدرِ محفل بنا خاموش بیٹھا رہتا اور مکھن کی طرف دیکھ کر کہتا "بھلے لوک! فقیروں کی خدمت کرو۔ کر سبوا، کھا میوہ"۔ مکھن پیالے بھر بھر کر ان کو تھاتا رہتا۔ اڑنگے شاہ کی جان پر ایک عذاب تھوڑے تھا۔ مکھن کے گاؤں میں کوئی مصیبت پڑتی، کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا تو اس کا بوجھ اڑنگے شاہ پر پڑتا۔ اب کے بارش بالکل نہیں ہوتی، فصلیں خراب ہو رہی ہیں۔ کسی کو تھانے والے پکڑ کر لے گئے ہیں کسی کی بیٹی خاوند کے گھر میں آباد نہیں ہو رہی کسی کا بیٹا لاپتا ہو گیا ہے۔ کوئی بیمار پڑا ہوا ہے اور بے اولاد عورتوں کا تو ایسا تانتا بندھا رہتا تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا۔ اڑنگے شاہ بیچارہ دعائیں کرتے کرتے تھک جاتا۔

لیکن آخر میں جو مصیبت آئی اس کا تو اندازہ بھی کسی کو نہ تھا۔ علاقے میں گل گھوٹوں کی بیماری پڑی اور پہلے ہی حملے میں چودھری مکھن کی چار بھینسیں یوں زمین پر گریں جیسے شکاری کے ایک کارتوس سے چار مرغابیاں زمین پر آ رہی ہیں۔ مکھن دوڑا ہوا اڑنگے شاہ کے پاس آیا ”دعا کرو شاہ جی! میرے لیے دعا کرو، مال پر مصیبت آگئی ہے۔“

اگلے روز دوا اور ڈنگر مر گئے۔ اڑنگے شاہ نے گھبرا کر اپنے دھویں سے راکھ کی چٹکی اٹھائی۔ آسمان کی طرف منہ کر کے دعا مانگی اور راکھ چودھری مکھن کو دے دی ”جاؤ اللہ کا نام لے کر ڈنگر کو دے دو۔ وہ بھینس بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔“

دودھ لے کر جانے والے ریڑھے بیکار کھڑے تھے اور چودھری مکھن دیکھتے ہی دیکھتے امیر سے فقیر اور چودھری سے نما نا ہو گیا تھا۔ وہ کٹی پتنگ کی طرح گاؤں کی گلیوں میں پھرتا۔ گھر میں خاک اڑنے لگی تو وہ اڑنگے شاہ کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھی پھی آنکھوں سے اڑنگے شاہ کی طرف دیکھتا اور التجا آمیز لہجے میں کہتا:

”سائیں جی! میرے لیے دعا کرو۔“

یہ فقرہ اڑنگے شاہ کے سینے پر تیر کی طرح لگتا اور وہ اس تیر سے بچنے کے لیے مکھن سے نظری چرانے لگا۔ اڑنگے شاہ روز بروز اس ہوتا جا رہا تھا اس کے ڈیرے پر درویشوں کا جھگھٹ ختم ہو گیا۔ کھانا پینا تو ایک طرف بوٹی کی کمی بھی محسوس ہونے لگی مگر چودھری مکھن کی عقیدت اور خدمت گزاری میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک روز اڑنگے شاہ مجھ سے ملنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”سائیں بادشاہ!“ اس نے درد بھری آواز میں مجھ سے کہا ”بھلے لوک کا کچھ کرو۔“

وہ اجاب کو ان کے دنیاوی ناموں سے نہ پکارتا تھا۔ خود اڑنگے شاہ تھا، میں سائیں بادشاہ تھا اور چودھری مکھن بھلا لوک تھا۔

میں نے پوچھا:

”تم ہی بتاؤ اڑنگے شاہ! اب بھلے لوک کا کیا کریں!“

اڑنگے شاہ رو پڑا ”سائیں! وہ لاکھوں کا تھا اب راکھ ہو گیا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ اس کے گھر میں جو ان بیٹیاں بیٹھی ہیں، شادیاں کیسے ہوں، گھر میں تو کھانے کو کچھ نہیں رہا۔ بودی شاہ تو اب مدر سے بھی نہیں جاتا۔“

”بودی شاہ کون؟“ میں نے پوچھا

”مکھن کا بیٹا، سائیں! میرے کہنے پر اس کا نام بودی شاہ رکھا گیا تھا۔ کھانے کو روٹی نہیں، مدر سے کا خرچہ کون اٹھائے گا۔“

کچھ دنوں بعد مکھن مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے کہا: ”چودھری مکھن! ڈھور ڈنگر تو گیا اب کچھ اور کام شروع کرنا چاہیے۔ جب تک میں تمہارے لیے کسی کام کا بندوبست کروں تم دباڑی کرو، گھر کا خرچ تو چلتا رہے۔“
مکھن نے کہا: ”بادشاہ! میرے اوپر ایک مہربانی کر دو، صرف ایک مہربانی!“
”میں تمہاری ہر خدمت کرنے کو تیار ہوں مکھن! تم حکم کر دو۔“
”تو پھر اڑنگے شاہ سے کہو میرے حق میں دعا کر دے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے، سب کچھ ہے مگر وہ میرے لیے دعا نہیں کرتا۔“

”کیا باتیں کرتے ہو، میں نے تو اس کو گڑا گڑا کر تمہارے لیے دعائیں کرتے دیکھا ہے۔“
”نہیں بادشاہ! وہ دل سے دعا نہیں کرتا، ایک دفعہ دل سے دعا کر دے تو رحمت کے دروازے کھل جائیں۔“

”چودھری مکھن! کیا واقعی تمہیں اس بات کا یقین ہے؟“
”یقین کیسا، سائیں بادشاہ! میرا تو ایمان ہے اس نے تو کئی جن قابو کر رکھے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے جنوں کو اس کے پاس آتے جاتے۔“

”کیا باتیں کرتے ہو مکھن! بے چارے اڑنگے شاہ کے پاس کہاں سے آئے جن؟“
”نہ سائیں! اس خیال میں نہ رہنا، اس کا نام اڑنگے شاہ تو پڑا ہی اس لیے تھا۔“
”کس لیے؟ کس لیے پڑا تھا یہ نام؟“

”وہ بڑے سے بڑے جن کو اڑنگا دے کر اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔“
”دیکھو سائیں بادشاہ! تمہاری بات اڑنگے شاہ کبھی نہیں ٹال سکتا۔ خدا کے لیے اس سے کہو کہ میرے لیے دعا کرے۔“

میں نے صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مکھن سے کہا، چلو ابھی چلتے ہیں اس کے ڈیرے پر۔ ہم تینوں ایک مثلث تھے، اڑنگے شاہ، بھلا لوک اور سائیں بادشاہ۔ میں اس مثلث کا کمزور ترین زاویہ تھا کہ اڑنگے شاہ کی بے بسی اور بھلا لوک کا ایمان دونوں مجھ پر عیاں تھے اور صورت حال کی مجبوری میرا مقدر تھی۔ میں اور مکھن اڑنگے شاہ کے ڈیرے پر پہنچے۔ چاند کی ابتدائی تاریخ تھی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ ڈیرہ ویران پڑا تھا۔ کوٹھری میں ایک ٹٹا ہوا دیا جل رہا تھا نگر کوٹھری خالی تھی۔ اندھیرے میں میں نے سنا کہ قبر میں سے ہلک ہلک کر رونے کی آواز آرہی تھی۔ قبر کے اندھیرے میں اڑنگے شاہ سجدے میں پڑا ہوا تھا اور بچوں کی طرح ہلبلا ہلبلا کر رو رہا تھا۔ ہم کچھ عرصہ کھڑے یہ دل چھیدنے والا گریہ سننے رہے پشیر اس کے کہ ہم پر رقت طاری ہو جاتی، میں نے اسے آواز دی وہ باہر آگیا۔

”کیا کر رہے تھے اڑنگے شاہ؟“

”بھلے لوگ کے لیے دُعا مانگ رہا تھا سائیں!“

میں نے مکھن کی طرف دیکھا۔ مکھن نے آنکھ جُڑا کر نظریں جھکا لیں۔

یہ حالات تھے کہ مجھے پیرس کی ساربن یونیورسٹی سے بلاوا آگیا۔ وہاں دو سال کے لیے جنوبی ایشیا کے ثقافتی ورثے پر کام کرنے اور پڑھانے کے لیے ایک آسامی خالی تھی۔ خط ملا کہ تمہاری عرضی منظور ہو گئی ہے مہینے بھر میں پہنچ جاؤ۔ میں عرضی طور پر کام کاج سمیٹ کر بھاگا۔ بیوی نے کہا وہ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے یہیں رہے گی چھٹیوں میں سب لوگ پیرس آجائیں گے۔

میں پیرس چلا گیا۔ پیرس پہنچ کر پاکستان یادوں کے قریب اور نظروں سے بہت دُور ہو گیا۔ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ بیوی سے ٹیلیفون پر بات ہو جاتی سب کی خیریت معلوم کر لیتا۔ اس روز ٹیلی فون کی لائن ایسی صاف تھی جیسے ٹیلی کوم پر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بات ہو رہی ہو۔ بیوی نے کہا :

”اور ہاں سُنو تمہارے دوست کا انتقال ہو گیا۔“

میرا دل بیٹھ گیا۔ جلدی سے میں نے کہا : ”نام تو لو، کس دوست کا؟“

”اڑنگے شاہ کا۔“

”اتنا مُد، مگر کیسے، ٹی بی سے؟“

”نہیں، ویگن کے حادثے میں۔ وہ نہر کے کنارے سے بوٹی جمع کر کے لارہا تھا۔ قریب سے ایک ویگن گزری جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازہ اس کے سر پر لگا۔ وہیں گرا اور ختم ہو گیا ہے۔“

”یہ کب ہوا؟“

”پچھلے ہفتے، اور ہاں سُنو، مکھن تم سے ملنے آیا تھا اور کہتا تھا کہ پولیس والا اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی دے ویگی والے کے حق میں اور یہ کہہ کہ اڑنگے شاہ ویگن میں بیٹھنے لگا تھا کہ گر کر مر گیا۔“

”کیا مکھن وہاں موجود تھا؟“

”نہیں، بالکل نہیں، حادثے کے وقت اڑنگے شاہ اکیلا تھا۔“

”تو تمہیں کو میری طرف سے کہنا جھوٹی گواہی نہ دے اڑنگے شاہ کی رُوح کو تکلیف ہوگی۔“

پیرس میں ہر طرف برف پڑی ہوئی تھی۔ درختوں پر ایک پتہ نہ تھا۔ کھڑکی سے دور تک سوائے برف کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں اکیلا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ شام کی تنہائی پہلے ہی تکلیف دہ تھی۔ اب تو اُداسی دل تک اُتر گئی۔ میرا خیال تھا اس کی موت ٹی بی سے ہوگی مگر اڑنگے شاہ نے تو اپنی موت کا

انتظار ہی نہ کیا اور حادثے کی نذر ہو گیا۔

میں دو برس بعد پریس سے واپس آیا پہلی شام اڑنگے شاہ کے ڈیرے پر گیا۔ وہ اپنی قبر میں دفن ہو چکا تھا۔ جمہرات کی شام تھی۔ کچھ عورتیں دیے جلا جلا کر قبر کے چاروں طرف رکھ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت خوشی سے چھوٹی نہیں ساتی تھی اور نیاز کے چادل بچوں میں تقسیم کر رہی تھی برسوں کے بعد خدا نے اسے پوتے کی شکل دکھائی تھی۔ یہی طرف کچھ درویش دائرہ کیے بیٹھے تھے اور بوٹی گھوٹ رہے تھے۔ ان میں سے ایک جذبے میں اُکراٹھا اور حق حق کرتا ہوا قبر کے چاروں طرف دھمال ڈالنے لگا۔ قبر کی پائنتی ایک آدمی کالی پکڑی باندھے دوزانو بیٹھا تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ مکھن تھا۔ وہ اٹھ کر میرے گلے لگ گیا اور رونے لگا۔ میں نے کہا: ”مکھن! تم تو ایک دم بوڑھے ہو گئے یار!“

”بزرگ کی جدائی مار گئی سائیں! ایک دن مجھ سے کہا بھلے لوک! اب ہمارا وقت ختم ہونے والا ہے اور اگلے ہی روز پردہ کر لیا۔“

”مگر تمہارے حالات اب کیسے ہیں، گھر والوں کا کیا حال ہے؟“
”وہی ہوا سائیں! جو میں کہتا تھا۔ فقیر مرتے مرتے دعا دے گیا مگر مجھے نہیں، بودی شاہ کو۔ بودی شاہ پر اللہ کا فضل ہو گیا اب اس کا اپنا ڈیری فارم ہے اور اس کی بھینسوں کا دودھ ریٹھے پر نہیں پک اپ پر شہر جاتا ہے۔ لڑکیوں کی شادی کر دی ہے۔ باغ بہار ہو گئی سائیں، باغ بہار ہو گئی۔ سب فقیر کی کرامات ہے۔“
”اور مکھن! تم خود کیا کرتے ہو؟“

”میں تو یہیں ڈھیری کے پاؤں میں بیٹھا ہوں۔ کوٹھری میں رہتا ہوں۔ ڈیرے کی صفائی کرتا ہوں۔ دھواں کر دیا ہے۔ آٹے گئے درویشوں کی سیوا کرتا ہوں، روٹی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ مزار کی خدمت کرتا ہوں۔“
”گھر نہیں جاتے مکھن؟“

”کیسے جاؤں سائیں! مرشد نے پردہ کرنے سے پہلے جانے کا حکم جو نہیں دیا تھا۔ فقیر کی قبر زندہ ہے سائیں، اسے چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ اب تو جیاتی اسی ڈھیری کے قدموں میں گزرے گی۔“
پھر مکھن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”سائیں بادشاہ! بیٹھ جاؤ، تھوڑا سا تبرک تو چکھ لو۔“ اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اڑنگے شاہ کے مزار پر سائیں مکھن شاہ کے سامنے کھڑا ہوں۔

خدا خال

آغا بابا

انگنائی نہ آنگن۔ بڑا صحن کہئے یا صحن فراخ۔ بچھتے میں خوب پکی ہوئی چھوٹی چھوٹی بادام رنگ کی نانک شاہی اینٹوں سے بنا ہوا دھلا دھلا یا صاف ستھرا چوڑا پھیلا ہوا فرش صاف کرتے وقت یا پانی سے سونپتے بھنگن کی کمر ضرور دیکھنے لگتی ہوگی مگر وہ تو صرف ایک روپیہ مہینہ اور روز کی روٹی لیتی تھی۔

جب اس صحن میں سورج کا اُجالا پھیلنے لگتا تو بادام رنگ اینٹوں کا رنگ ایک دم گہرا دکھائی دیتا اور ان پر ایک اپنی قسم کی چمک آجاتی۔ اس صحن کے چاروں طرف دالان اور کوٹھڑیاں تھیں جن کے روشن دان باہر کو کھلتے تھے۔ دو کوٹھڑیوں میں اندھیرا رہتا کہ روشن دانوں کے آگے باہر کے رخ مکان کھڑے ہو گئے تھے۔ مگر یہ کوٹھڑیاں گرمیوں کی دوپہریوں میں بڑی ٹھنڈی رہتیں اور رمضان کے مہینے میں برف خانہ کا مزا دیتیں۔

اس حویلی میں افطاری کا اہتمام کس سلیقے سے ہوتا۔ فالسے کا شربت۔ لیموں کی تازہ سکنجبین جس کی بوتلیں بیویاں گھر میں بنالیتیں۔ پیتے وقت گاجنی کی صراحیوں اور کورے گھڑوں کا ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا۔ پیٹھے کا نرم گداز حلہ۔ سوچی کی چکور ٹکڑیاں، مونٹھ کی نمکین دال۔ کڑا ہی میں سے گرم گرم ٹھیکیاں نکلتیں۔ وہی میں کابل کا خوشبودار زیرہ۔ کسی کا رخ صحن میں سے گزرتے باورچی خانہ کی طرف کا اگر ہو جائے بھنے بھگار نے اور تلنے کی خوشبوؤں سے ساری نقابت روزہ دار کی دُور ہو جائے۔

صحن کے جنوب کی سمت سامنے کے رخ جو برآمدہ تھا اس میں ہمیشہ سے ایک تخت اور آبنوس کی دو آرام کرسیاں بچھی دکھائی دیتی تھیں۔ تخت پر اس کے برابر کا شیرازی غالیچہ بچھا ہوا اور اس پر بڑا پاندان رکھا دکھائی دیتا۔ اس برآمدے کے پیچھے کے بڑے دالان کے دونوں کوارٹوں پر پتیل کے نقش و نگار بنے تھے۔ پھر دونوں طرف کو ایک ایک کوٹھڑی تھی۔ دالان میں جو چھپر کھٹ تھی اس کے چاندی کے بنے ہوئے موٹے موٹے پائے تھے برآمدے کے رخ ایک اور جہازی پلنگ بچھا رہتا جس کے فیل پائے بھی چاندی کے تھے۔ اس حویلی میں داخل ہونے کے لیے تین قدیموں کے ایک چوترے پر سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ چوترے سے ہو کر گزرتے تو دائیں ہاتھ کنویں میں ڈول لٹکتا دکھائی دیتا۔ یہ کنواں اس حویلی سے منسلک تھا۔ جب یہ حویلی تعمیر ہوئی تھی تو اس کنویں سے مشکیں بھر بھر کر سقہ حویلی والوں کو پانی مہیا کرتا تھا۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی لمبے چوڑے صحن کی گرانبوار وسعت فوار کی آنکھوں میں کشادگی پیدا کر دیتی

اور ملازم اُسے سیدھے ہاتھ کے رُخ بٹیک میں جا بٹھاتا جو مردانہ تھا۔ اس مردانہ بٹیک کی دیواریں چُونَا گچ تھیں اور چھت پر کاشی کاری کے علاوہ چھوٹے چھوٹے آئینوں کے ٹکڑوں کی خوشنما جڑت کی گئی تھی۔ چُوڑی دار پانچا سے والی ملازم اپنے کندھے دوپٹے سے ڈھک کر ہاتھ میں خاصان لیے داخل ہوتی آداب کہہ کر گلو ریاں مہمان کے سامنے رکھ دیتی۔ وہ ملازم جو مہمان کو بٹیک میں بٹھا کر چلا گیا تھا پچوان لیے داخل ہوتا اور مہمان کے قریب رکھ دیتا۔

یہ جولی ۱۸۹۰ء میں میاں عطا محی الدین کے والد غلام محی الدین نے تعمیر کرائی تھی۔ میاں عطا محی الدین کے بھائی کلپناغ محی الدین ۱۹۲۱ء میں فوت ہو گئے۔ ان کا بیٹا شوق محی الدین رہا جس نے واللہ علم کس محل رنگیں کی تلاش میں شوق صحرا نوردی کو اپنا مقدر بنایا کہ کبھی دل کی بات لب پر نہ لایا۔ شباب سیر کو آیا تھا سو گوار گیا۔ اس جولی میں رہنے والے کتنے میٹھے لوگ تھے۔ قصہ دل کوئی کہنے کی چیز نہیں ہوتی اور درد دل چھپانا اچھا۔ دل میں لاکھ کاٹا چھپتا زبان سے مٹھاس نہ جاتی۔ نگاہ اٹھتی گھائل ہوتے۔ نگاہ زیادہ جھک جاتی۔ محبت کا طوفان جس حیرت سے اٹھتا یہ اُسی حیرت سے پی جاتے۔ یہ لوگ کتنے موصیے والے تھے۔ نہ غزل کہتے نہ سراپا لکھتے نہ قصیدہ۔ حُسن کلام کی دستاویز بند پڑی رہتی۔ کبھی کھل نہ پاتی۔ منے ٹکے اور مقررہ اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کو کبھی جی نہ چاہتا کہ زندگی کا چین انھیں کی بدولت سرسبز تھا۔

ایک طرف سے لمبے لمبے بانسوں کے سہارے دوسری طرف سے محرابوں کے کولوں کے ساتھ رستے کے ساتھ بندھا ہوا حویلی کے فراخ کشادہ صحن پر شامیاز نصب ہے جس کے نیچے نیچے شلے قدموں والیاں زندگی کی ہمہ سعی لیے ادھر سے ادھر پھر رہی ہیں۔ ہوا میں موتیا کی مہک ہے۔ شادی کی اس گھاگھی سے ساری فضا منور ہو رہی ہے۔ گہرے رنگ کی اینٹوں والا فرش حُسن سماعت کے لیے اپنے اوپر اونچی ایڑیوں کی گرگاہیوں سے پیدا ہونے والی آواز کو باہر کی طرف پھینک رہا ہے۔ لڑکیوں کے کٹ پھٹ چلنے کی یہ آوازیں کانوں کو بڑی اچھی لگ رہی ہیں۔ نوکرانیاں ادھر سے ادھر پھر رہی ہیں۔ مہرباں اُن کا راستہ کاٹ کر دوسری طرف کو جا رہی ہیں۔ کینز فاطمہ دالان کے آگے ہلکے رنگ کی بنا رسی ساڑی پہنے کھڑی کہہ رہی ہیں: ”آپا شہر بانو کو بلاؤ، جب تک وہ آکر بوٹیوں کو منظور نہیں کریں گی دیگوں میں نہیں ڈالی جائیں گی۔“

شہر بانو کینز فاطمہ کی نند ہے۔ کینز فاطمہ کے لہجہ میں جتنی مٹھاس ہے آواز میں اتنا ہی دہبہ ہے۔ اُس وقت کے فیشن کے مطابق اُس نے اپنے بال جیچھے کو کھینچ کر بنا رکھے ہیں۔ ہاتھ میں سونے کی چُوڑیاں چمچم کر رہی ہیں۔ بلاؤز پر پھول اور پتے بنے ہیں۔ حویلی میں گانے والی میرا سنوں کا طائفہ دعائیں دیتا داخل ہوا ہے اور کینز فاطمہ کو سوسو سلام آداب کرتا دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا ہے اور اُس کی شوکت اور شخصیت سے مسحور ہو کر اُس کے احکامات اور ہدایات کو سننے لگا ہے۔

شہر بانو کو تھکا سٹ پھنے گوٹ کا دوپٹہ لیے کمرے سے باہر نکلی ہے اور بوٹیوں سے بھری سینوں کو

پاس جو نوکر فرش پر رکھ چکے ہیں کھڑی ہو گئی ہے۔ سب لوگ اُس کی طرف متوجہ منظوری کا فیصلہ سُنے کے منتظر ہیں۔ وہ چند بوٹیوں کو دیکھ کر کہہ رہی ہے: قصائی سے کہو گوشت کی بوٹیاں چھوٹی ہیں۔ یہ بوٹیاں دیگر میں نہیں پڑیں گی۔ عامیوں کے لیے ٹھیک ہیں۔ کموڑی بوٹی بنائے اور دکھانے کو بھیجے۔ بوٹی نہ چھوٹی بنے نہ پارچہ: شہر بانو کی دلاویز شخصیت میں کتنا کڑو فر ہے۔

حویلی کی باوقار عورتوں کو قدرت نے تدبیر اور تمکنت کی نعمتوں سے کس قدر نواز رکھا تھا۔ حویلی کے مکینوں پر دولت عاشق تھی۔ غلام محبوب سبجانی بچپن میں غلیل لیے چڑیوں کے پیچھے پھرتے رہے۔ جوان ہوئے تو ہاتھی پر بیٹھ کر پوربیوں کا ہانکا ساتھ لے کر شکار کو نکلتے۔ میاں عطا محی الدین کا بیٹا نوابزادوں کے برابر رہا۔ چھ فٹ کا قد کسرتی گھٹیل بدن ستواں ناک کے نیچے چھوٹی چھوٹی مجھوری مجھوری نوکدار مونچھیں کھتا ہوا سُرخ گندمی رنگ جو لباس پہنتا زیب دیتا۔ جس پہنتے تو کسی ریاست کے خوبصورت راجا جیسے دکھائی دیتے۔ چہرے کے سنورے خود خال میں آنکھوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ کھنچی کھنچی آنکھوں کے بھاری بھاری پوٹوں میں شرارت اور مردانہ حُسن لڑتا جھگڑتا دکھائی دیتا۔ جب سنجیدہ باتیں کرنے لگتے تو شرارت غائب ہو جاتی۔ آواز میں گھبرتا آجائی اور مردانہ حُسن ساری فضا کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ دانا پور میرٹھ لکھنؤ فیض آباد مراد آباد جھانسی کی چھاؤنیوں میں جوان ہوئے ہزاروں لاکھوں کی رقم جیب میں لیے سفر کرتے رہے۔ جتنا دھن اُجڑتا اُس سے دگنا خد دیتا۔ ایک دفعہ جھانسی اور نیننی تال میں خدانے اتنے نوٹ بھیج دئے کہ بیوی جی اور کنیز فاطمہ سوچ میں پڑ گئیں کہ کہاں رکھے جائیں۔ غالیچوں کے نیچے بچا کرات کا ٹی گئی۔

جہاں گوراپلٹن جاتی بابو عطا محی الدین اپنی پلٹن کے ساتھ جاتے۔ نام کی نوکری سٹور کیسری کی تھی مگر ایڈجمنٹ بہادر کو جو بھی مشکل پڑتی بابو جی اُس کو حل کرنے کے لیے کافی تھے۔ ہاتھیوں کو کام کا جھوسہ اور کچے کما دے ٹانڈے نہیں مل رہے تو بند و بست کے لیے عطا محی الدین سے کہا جاتا۔ ٹھیکیداروں سے بات چیت کرنی ہوتی تو بابو عطا محی الدین کو بلایا جاتا یہاں تک کہ خچر کے پیر کو موج آجاتی تو بابو جی کی رائے لی جاتی۔ ڈبل روٹی کا غلے ورکیا ہے۔ بابو جی سے پوچھا جاتا۔ انگریز ایڈجمنٹ اور انگریز کوارٹر ماسٹر نہر شکل کے حل کے لیے اُن کی طرف رجوع کرتے۔ یہ اعتماد کی بات ہوتی ہے۔ وہ انگریز فوجی افسروں کے دل میں جگہ بنانے کا گُر خوب جانتے تھے۔ اُن پر شاگرد پیشہ لوگ الگ جان چھڑکتے۔ وہ شخص جو انگریز فوج کی مشکلوں کو رفع کر دیتا تھا اس کے لیے شاگرد پیشہ لوگوں کے جھگڑوں کا چکانا کیا مشکل تھا۔ ان شاگرد پیشہ لوگوں کے ہزار بکھڑے تھے۔ مگر بابو عطا محی الدین اُس خوبی سے فیصلہ کرتے کہ اپنی اپنی جگہ دونوں فریقِ مطمئن اور خوش ہو جاتے۔ رجمنٹ کو توال اکثر اوقات مشورہ کرنے کو اُن کے پاس آتا۔

اُن کی پلٹن جب بھی میرٹھ چھاؤنی میں پڑاؤ کرتی تو مہاجن خوشحال چند ہاتھ جوڑ کر کہتا: بابو جی! آپ کی

دیا سے پرہیز کرنے سب کچھ دے رکھا ہے پر ہاتھی کی آرزو ہے ایک ہاتھی دلوا دیں جو دام کہیں حاضر کروں۔
شہر میں ہاتھی پر سوار نکلے تو ہوا بندھ جائے۔
”کریں گے بندوبست“

”رام جانے کب کریں گے!“
ہاتھی دریا سے واپس آئے۔ ایک کم ہو گیا۔ بابو جی نے ایڈجسٹمنٹ سے کہا: ”صاحب بہادر!“
برا ہوا۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ نہاتے نہاتے ایک ہاتھی بہ گیا۔ بہت تلاش کیا۔ پیچھے آدمی بھیجے۔ نہیں ملا۔ ایک
رائٹ آف کرنا پڑے گا۔“

ایڈجسٹمنٹ سے ایک ہاتھی رائٹ آف کرا لیا۔
”تیسرے روز پلٹنے کو چ کیا۔ تیسرے مہینے لالہ خوشحال چند اپنی دکان پر ہاتھی پر بیٹھ کر آیا۔ سب
دوست احباب اشیر بادینے کو آئے اور لڈو بھرے ڈوہنے لے کر گئے۔
کئی لوگوں کا روزگار پلٹنے میں بابو جی کی وجہ سے لگا ہوا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں پر ان کے احسانات تھے۔
کئی لوگ یہ کہتے کہ گورے کالے میں ان کی اس قدر عزت انگیزوں اور دیسیوں میں ان کا یہ مقام ان کے نام
محی الدین کی برکت سے تھا۔ ان پر اللہ کا سایہ تھا۔ اللہ کی عطا تھی۔ تین چار سال بعد جب وطن آتے تو اس
سنی کے ہاتھوں حاجتمندوں کی ضرورتیں پوری ہوتیں۔ دادا کی بنائی ہوئی مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز
پڑھتے۔ ایک ایک کا حال احوال پوچھتے۔ پھر ایک دن دیگیں چڑھتیں۔ غریبوں میں بٹتیں۔ عطا محی الدین بستی کی
آبرو تھے۔

جوبلی میں لگے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ تھی۔ گلی میں دو کچے مکان تھے خرید کر ایک کو گرایا۔ پختہ اینٹ کا
بگھی خانہ بنوایا۔ ساتھ اس کے دو کمرے کھڑے کر دئے جہاں چھوٹا سا پوریا ڈیڑھ پلے کا سائیس رسیاؤں رسوئی
میں بھوجن تیار کرتا دکھائی دیتا۔ کبھی لگھی کو صاف کرتا چمکاتا نظر آتا۔ کبھی پیوں کو دھوتا گھوڑے کی مالش کرتا سانی
بنانا چم پیتا کبھی بیکار بیٹھا دکھائی نہ دیتا۔ جب میاں جی گھوڑے کی راسیں ہاتھ میں پکڑ لیتے تو بالشت بھر کا پوریا
اُچک کر اپنی جگہ پر لگھی کے پیچھے جا بیٹھا۔ ٹاپیں مارتا گھوڑا اگلی سے باہر نکل جاتا۔ اس آن بان سے جوبلی کا مالک
اپنی شہری جائداد دیکھنے نکلتا۔

انھوں نے بیٹوں کے نام محی الدین اور بیٹیوں کے فاطمہ کے متبرک نام سے رکھے۔ کینز فاطمہ، عزیز فاطمہ،
بنت الفاطمہ اور حبیب فاطمہ۔ بیٹوں کے ناموں میں شکرانہ ایزدی کی جھلک یعنی غلام محبوب سبحانی، محمد عبداللہ،
مہر محی الدین اور عبدالحی محی الدین۔ ان کی بیوی بھی دینے والے نے ایسی قانع بے نفس بے زبان دی کہ صالح
بیبیوں میں ایسی مثال کم ہوتی ہوگی۔ کسی کی غیبت نہ کسی کی بدگوئی۔ دادو دہش میں کتنا دے نکلتیں کہ جتنا بھی

کوئی کہہ لے۔

جب بڑی بی بی کینز فاطمہ کی شادی کا سوال اٹھا تو اپنی فرزندہ میں عطا محی الدین نے اپنے چچا کے بیٹے ڈاکٹر فرزند علی کو قبول کیا۔ کینز فاطمہ کے حسن سلیقہ سے سسرال آنا متاثر ہوا کہ اُس نے فرزند علی کے چھوٹے بھائی نور بی کے لیے عزیز فاطمہ کا رشتہ مانگ لیا۔ دونوں بیٹیاں دونوں بھائیوں سے بیاہ دی گئیں۔

کارخانہ قدرت بھی عجب چیز ہے۔ نور بی کی بیوی عزیز فاطمہ پانچ بچوں کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ان پانچ بچوں زبیدہ، یعقوب نبی نور، مسعود نبی نور، انیس فاطمہ اور آصف نبی نور کی پرورش تعلیم اور نگرانی کینز فاطمہ کے ہاتھوں جو خود بے اولاد تھیں ایسی عمدہ ہوئی کہ اصلی مائیں بھی نہ کر پائیں۔ ان بہن بھائیوں میں زبیدہ سب سے بڑی تھی۔ یعقوب نبی نور ہمارا ساتھی تھا۔ طبیعت باغ مزاج بہار۔ موتی آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے۔ ایسا پھول معلوم ہوتا جو شبنم کے ساتھ آسمان سے اترتا ہو۔ گیلی آنکھوں میں غمی رچی ہوئی اور پوٹوں کی اوٹ میں ایسی شرارت چھپی ہوتی جس کا سراغ نہ مل پاتا۔ اس کا بھی سراغ نہ مل پایا کہ اتنی جلدی وہ اس جہاں کو چھوڑ کر اگلے جہان کیوں چلا گیا۔ اُس کی خالہ آپا بوا یعنی بنت الفاطمہ کا بیٹا ضمیر بھی میرا ساتھی تھا بھائی عاشق کی شادی کی تقریب پر ہم تینوں نے چھپ چھپ کر سگرٹ پئے۔ یعقوب اور ضمیر اپنے وقتوں کے چین سموکر ہوئے اور میں عمر بھر کا نون سموکر۔ ایسا کیوں اور کیونکر ہوتا ہے اور یہ بریک کیوں لگتی ہے۔ آپ لگتی ہے یا قدرت لگاتی ہے۔ بس لگتی ہے۔

ضمیر احمد کے والد بھائی مجید کو جوانی میں تپ دق لگ گئی۔ اُن دنوں اس مُوڈی مرض کا علاج کہاں تھا! وہ عالم شباب میں سلمیٰ شمیم اور ضمیر تین بچوں کو تنہا چھوڑ ملکِ عدم کو سدھارے۔ آپا بوا بیوہ ہو کر باپ کے گھر آ بیٹھی۔

میں کوئی پرائمری کلاس میں ہوں گا۔ بھائی مجید ہماری بیٹیک کی الماری کھولے کتابیں دیکھ رہے تھے اور میں انہیں ایک موٹی سی کتاب میں سے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی تصویریں دکھا رہا تھا۔ وہ میری باتیں بھی سُنتے تصویریں بھی دیکھتے اور سرسری نگاہ سے دوسری کتابیں بھی دیکھتے جاتے تھے۔ صرف یہی ایک لمحہ گریزاں اُن کی یاد کا ذہن کے کسی کونے میں محفوظ رہ گیا ہے۔

عام دستور یہی ہے کہ گھر کا کوئی فرد اگر سرکارِ دربار کے ہاں کسی منصب پر جا لگے تو سبھوں کے لیے ایک طرح سے روزگار کا درگھل جاتا ہے۔ میاں عطا محی الدین اپنوں کے لیے پیکرِ شفقت و کرم بنے رہے۔ بلا بلا کر ملازمتیں دلوائیں۔ چونکہ فوجی افسروں کے دل میں اُن کا خاص احترام تھا اس لیے گورنر پلٹن میں سٹوڈنٹس کراڈینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ انگریز کے راج میں اتنی فیصد مسلمان پولیس کے محکمے میں ہوتے تھے۔ اس محکمہ میں ہندو نہ چمکتا۔ مسلمان خوب خوب رُعب دکھاتا۔ پولیس کا سا حاکمانہ عہدہ مل جائے تو پوچھنا ہی کیا۔ اُن کے پھوپھی کے بیٹے

مرید غوث کو سٹور کیسری پسند نہ آئی۔ میاں عطا محی الدین نے انھیں لکھنؤ میں بلا کر اودھ کی پولیس میں ملازمت دلوا دی۔ اپنے دامادوں کا چھوٹا بھائی سردار علی تلاش روزگار میں اُن کے پاس پہنچا۔ چند ہفتوں میں کم سرٹیت میں سٹور کیسری کرادیا۔ جہانسی کی چھاؤنی میں کھیرلی کے چھجے دار بنگلے میں رہتے تھے کہ پنجاب کے ایک گاؤں سے نور احمد ملازمت کی تلاش میں وہاں آ پہنچا۔

عطا محی الدین نے اپنی اہلیہ سے پوچھا، ”لوکا برا نہیں ہے۔ ہماری دُور پار کی رشتہ داری بھی نکلتی ہے۔ صاحب سے میں نے وعدہ لے لیا ہے۔ چند دنوں میں سٹور کیسری ہو جائے گا۔ ہمارے پاس تمہاری بڑی بہن کرامت بی بی یوگی کے دن گزار رہی ہے کیوں نہ نور احمد کا اُس سے نکاح پر حوا دیا جائے۔ ہم نے نوکری بھی دلوادی ہمزلف بھی بنا لیا۔ ساری عمر ہمارا احسان مند رہے گا۔“

بیوی جی نے پردے سے دیکھا۔ گورا چٹا نور احمد تھمد باندھے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ انھوں نے صا و کردی۔ نور احمد کرامت بی بی سے نکاح ہو گیا۔ میاں عطا محی الدین اور نور احمد ہمزلف ہو گئے۔

بھائی حمید کرامت بی بی کے پہلے خاوند کی اولاد تھے۔ انھوں نے میٹرک پاس کیا تو عطا محی الدین نے انہیں بھی فوج میں سٹور کیسری کرادیا اور پھر اپنی بیٹی بنت الفاطمہ سے شادی کر دی۔ بنت الفاطمہ کو گھر میں سب آپا بوا کہتے تھے اس شادی سے دو بیٹیاں سلی اور شمیمہ اور بیٹا ہمارا دوست ضمیر احمد تولد ہوئے آپ نے جانے زندگی میں کتنی صاحب جمال عورتیں دیکھی ہوں میں نے صرف آپا بوا دیکھیں۔ اللہ اللہ کیا حسن و جمال کا پیکر تھیں۔

قدرت کی تجو بہ کاری اور رضا نے ایند دی سیانوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ منشا نے خداوندی دیکھیے کہ یہ صاحب جمال خاتون خاوند کی جواناں مرگ کے بعد تین بچوں کو لے کر باپ کے گھر آ بیٹھیں۔ ہمارا دوست ضمیر نسیال کے گھر سکول کے درجے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ممبئی میں جا کر سمندری جہاز پر ملازم ہو گیا۔ پھمپھڑے یہ سخت کام برداشت نہ کر پائے۔ چند ہی سال میں تپ دق نے ایسا پکڑا کہ اس جوان رعنا کی جان لے کر چھوڑا۔ ضمیر کا پھیکا پھیکا گندمی رنگ سیدھی ناک سگرٹ پینے کے سبب جیلے جیلے ہونٹ شراروں کی طرح سُرخ آنکھیں اور ان میں تجو بھی شفقت پد ری کے لیے چھپا چھپا آزار جستجو میری یادداشت کے پٹارے میں ابھی تک جھللا رہا ہے۔

دوستوں کی ہزاروں باتیں کبوتروں کی طرح گھنٹوں کی غٹر خوں مگر یہ کمال کہ ان یاروں نے میری رسوائیاں سُنی کبھی کبھی یہ تک نہ پوچھا کہ اسے دوست تو بے شر و شعلہ کیسے جل اُٹھا اور یہ سوز و دروں ہیں کیوں ارزاں نہ ہوا۔ تقدیر نے محبت کے اُس جذب دروں سے انہیں سرشار و شناسا نہ کیا جو بعض اوقات شور حیات پر بھی غالب آجاتا ہے۔ ہر رُخ کزن چاروں اوٹ بنتِ عم مگر اُس دھاگے کا سرا ان جواں سالوں کے ہاتھ نہ آیا جو دلوں کو گنڈھاوٹ کے ساتھ پروتا چلا جاتا ہے اور اُس راہ آگئی و آشنائی کے مسافر محبت کی مالا بچنے لگتے ہیں۔ فضا کا ذرہ ذرہ متور ہو اور نور حاصل نہ کیا جائے شاید یہ اُن کی سرشت اور فہم میں نہ تھا۔

میری شادی پر ولیمہ کے روز مہیٹی سے مبارکباد کا تار آیا۔ ضمیر کا تھا۔ یہ ثبت مہر تھی کہ ہم محبت کی طاقت پر ایمان لے آئے۔ برسوں یہ تار میرے کاغذوں میں محفوظ پڑا رہا۔ ایک روز آپا تو مجھ سے ضمیر مرحوم کی باتیں کر رہی تھیں کہ میں نے یہ تار انہیں لاکر دے دیا کہ شاید ماں کے دل کو کوئی قرار آجائے۔

سکول میں ہم نے ایک کہانی پڑھی تھی کہ سبکتگین بادشاہ ایک روز شکار کھیلنے گیا مگر جنگل خالی ملا۔ ناکام واپس جا رہا تھا کہ کلیں بھرتا ہوا ہرن کا بچہ سامنے سے گزرا۔ سبکتگین نے تیر چلا کر اُسے شکار کیا۔ کچھ فاصلہ تک ہرن کی ماں چسپ چسپ کر بادشاہ کے پیچھے پیچھے چلتی رہی پھر جنگل میں غائب ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ پھر شکار کے لیے نکلا۔ ایک ہرنی کو شکار کیا۔ جب اُس کا پیٹ چاک کیا گیا تو وزیر نے کہا: ”بادشاہ سلامت! یہ ہرنی اُسی بچے کی ماں ہے جس کو ایک مرتبہ آپ نے شکار کیا تھا۔“

بادشاہ بولا: ”یہ کیونکر؟“

وزیر نے کہا:

”یہ دیکھتے ہرنی کے دل پر داغ ہے۔ یہ داغ مرنے والے بچے کے صدمے کا ہے۔“
آپا تو اُس کے دل پر بھی کلیں بھرنے والے بیٹے کا داغ ہو گا جو وہ عمر بھر کسی کو نہ دکھائیں۔“

۲

کرنل کرپ نور احمد کو سٹور کیپری کی ٹریننگ کے لیے چکراتہ چھاؤنی بھیجتے وقت بابو عطامحی الدین سے کہنے لگا: ”ہم آپ کے رشتہ دار لوگوں کو اس لیے سٹور کیپری دیتا ہے کہ ہماری پلٹن پر آپ کے بہت احسانات ہیں مگر اب ہم آپ کے کسی بیٹے کو سٹور کیپری دینا چاہتا ہے کہ آپ کو فائدہ ہو۔“

غلام محبوب سبحانی سے چھوٹے محمد عبداللہ تھے جنہیں کرنل کرپ نے سٹور کیپری دینے میں قطعاً تامل نہ کیا بلکہ وہ تو اپنی پلٹن کی ٹکری کے ساتھ درہ خیبر کے قریب انھیں رزمک چھاؤنی لے گیا اور جاتے ہی بلا کر حکم دیا کہ تم نے ہر روز لفافہ میں پچاس روپے کا نوٹ بند کر کے ڈاک کے ذریعے اپنے باپ عطامحی الدین کو بھیجنا ہے جس میں نامہ نہیں ہو گا۔

ایک روز کسی جگہ ملاقات ہو گئی، پوچھا: ”نوٹ ہر روز بھیج رہے ہو کہ نہیں؟“
”انھوں نے کہا: ”بھیج رہا ہوں۔“

اُس وقت کے پچاس روپے آج کل کے پانچ ہزار روپے کے برابر تھے۔ سات روپے سپاہی کی تنخواہ ہوتی تھی۔ اندازہ لگا ئیے سٹور کیپرنے کتنا کماتا ہو گا۔ سبزی گوشت ڈبل روٹی مکھن پھل میوہ مفت آتا۔ ایک طرح سے تنہا نڈاری تھی۔ اپنے کنبے میں یہ لوگ اتنے جڑے بندے تھے کہ پُوربوں کی طرح گھر مچر شادیاں کنبے کے اندر ہی کرتے ،

باہر کی ہمت نہ پڑتی۔ خلیرے، میرے، پھپھیرے، چھیرے کے چکروں میں ہی رہتے۔ عطا محی الدین کے کانوں میں کس نے ڈالی کہ تمہارے ہمنزل نور احمد کے بیٹے عزیز احمد کی شادی غلام اکبر خاں کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔ برات کے ساتھ تم بھی تو بٹالہ جا رہے ہو۔ عطا محی الدین بولے:

جہاں میری رشتہ داری کپور تھلے والوں سے بنتی ہے وہاں غلام اکبر خاں سے بھی ہے۔ وہ غلام محبوب سبحانی کی شادی میں شریک ہوا دیوان علی کے بیٹے کی شادی پر آیا۔ دونوں میں دُوری فاصلوں کی ہے دلوں کی نہیں۔ چنانچہ میری بڑی بہن امیر بانو عطا محی الدین کے بیٹے محمد عبداللہ سے بیاہی گئیں۔ بس خواب کی طرح دھندلا دھندلا۔ اتنا یاد ہے برات کے آگے آتش بازی چل رہی تھی۔ باریک کاغذ کے بڑے بڑے فانوس چھوڑے گئے تھے جن کے اندر مٹا سا دیا جل رہا تھا اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے بلندیوں میں اڑتے اڑتے تارے بننے چلے گئے۔ برات رات کو چھتوں پر سوئی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ مٹی کی صراحیوں میں پانی رکھا گیا سفید اُجلے اُجلے بستر بچے جو صبح کو تہہ کیے گئے۔

اُن دنوں عبداللہ صاحب کی پٹن نارتھ لینڈ فریڈلر دارچیلنگ چھاؤنی میں مقیم تھی جہاں وہ کم سرٹیسٹ میں سٹور کیے تھے۔ دارچیلنگ کی چھاؤنی کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے۔ وہ وقت برطانوی دورِ جلال کا شباب تھا۔ انگریز کی فوجِ عظیم کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس علاقہ کے پہاڑی لوگ گورکھے کے نام سے مشہور ہیں۔ سپانیہ کے وسیع و عریض دامن کوہ میں یہ نسل آباد ہے جو اپنی جنگجوئی اور بہادری کی وجہ سے برٹش انڈین آرمی میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔ چری چری آنکھوں والے گندمی رنگ کے نائے قد کے پہاڑی لوگ چلیٹی ناک اور گالوں کی ہڈیاں نمایاں چوڑے گھیر کا ہیٹ لگاتے جس کا نام گورکھا ہیٹ تھا۔ کمر پر سکھوں کی کرپان کی طرح خنجر رکھتے جسے اپنی زبان میں پوکھری کہتے۔ حکومتِ برطانیہ اب تک حکومتِ ہند کی اجازت سے پانچ سو گورکھوں کا ایک فوجی دستہ دکھاوے کے طور پر برطانوی فوج کے ساتھ منسلک رکھتی ہے۔ دارچیلنگ کے علاقہ کی خاص پیداوار وہاں کی چائے ہے جس کا ایک خاص ذائقہ اور فلفلہ در ہے۔ چنانچہ دارچیلنگ ٹی دنیا بھر میں مشہور ہے۔

میاں عطا محی الدین کی تہجد گزاری، تقویٰ، پابندیِ صوم و صلوٰۃ سب بیٹوں میں سے زیادہ محمد عبداللہ کے پیکر میں نمودیر ہوئی۔ جوانی کی راتیں بھی ورد و وظائف میں گزریں۔ علامہ اقبال کی طرح حقّے کا ساٹھ پین سے رہا۔ سگڑ کم پیا حقّہ زیادہ اور بڑے التزام کے ساتھ پیا۔

ہر چند میرے والد کے سامنے حقّے کو ہاتھ نہ لگایا مگر وہ جانتے تھے کہ داماد کو حقّے کا شوق اُن سے کم نہ تھا۔ فیض آباد سے اُنہوں نے کٹھل بھیجا والد صاحب نے جواب میں لکھا: ہمارا منہ تم نے کٹھل سے میٹھا کر لیا۔ تمہارا منہ کڑوا کرنے کے لیے ایک بوری نمبا کو بھیج رہا ہوں۔

حقّہ کے سلسلہ میں ایک واقعہ اور بھی ذکر کے قابل ہے۔ اپنی ٹریننگ کے دوران محمد عبداللہ کو چکراتہ چھاؤنی

جانا پڑا جہاں وہ اپنے خالو نور احمد کے ہاں مقیم ہوئے جن کا مکان ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ چونکہ رات کو سونے سے پہلے عبداللہ صاحب کو حقہ گڑا کر دینا تھا اس لیے انہوں نے اپنے قیام کے لیے مکان کا ایک الگ تھلک کمرہ منتخب کیا جس میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ بابو نور احمد نے کمرہ تبدیل کرنے پر اصرار کیا مگر وہ رضا مند نہ ہوئے۔ رات کو آنکھ کھل گئی ٹین کی چھت پر پتھر گر رہے تھے۔ انہوں نے سمجھا پہاڑی علاقہ ہے پہاڑی سے پتھر لڑھک لڑھک کر چھت پر گر رہے ہیں۔ سو گئے۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ کئی دفعہ سوئے کئی دفعہ جاگے۔ نیند کچھ ٹھیک سے نہ آئی۔ صبح خالو نے پوچھا: ”رات نیند ٹھیک آئی۔“

”جی خوب سویا۔“

اگلی رات آنکھ کھلی تو انسان کی شکل و صورت میں ایک لمبا سایہ چارپائی کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور چارپائی بل رہی تھی۔ کچھ ڈرے۔ کچھ سہمے۔ پسینہ آگیا۔ ساتھ اپنی عبادت گزاری پر بھروسہ۔ وہ سایہ اُن کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور کلا دبانے لگا۔ انہوں نے آیت پر آیت پڑھنی شروع کر دی جوں جوں پڑھتے جاتے اُس کی گرفت ڈھیل پڑتی جاتی۔ صبح اُن کی خالہ نے جنہیں بھابھو جی کہا جاتا تھا پوچھا: ”عبداللہ! تم اس کمرے میں سو جایا کرو اُس الگ تھلک کمرے میں نہ سویا کرو۔“

”بھابھو جی صبح نماز کے لیے اُٹھتا ہوں۔ رات کو عشا کی نماز پڑھتا ہوں پھر تسبیح کرتا ہوں۔ وہ کمرہ اچھا ہے الگ تھلک سا۔“

”مگر ہم نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ ہم سے جو لوگ پہلے رہتے تھے انہوں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اوپر تلے اُن کی دو بھینسیں وہاں مُردہ پائی گئیں۔ کہتے ہیں کمرہ اچھا نہیں۔ بابو جی نے بھی مجھے یہی کہا تھا کہ تم کوئی اور کمرہ لے لو۔“ دل نے کہا عبادت کے سامنے سب شیطانِ طاقتیں کمزور ہیں۔ اسی میں بیٹھارہ ”یہی ٹھیک ہے بھابھو جی!“ بھابھو جی چوکی پر پھسکا مارے چو لھے پر سے چائے کی کیتلی اتارتے ہوئے بولیں: ”تمھاری مرضی۔“

اگلے روز میاں عطا محی الدین کے نوعمر صاحبزادے نے عشا کی نماز کے بعد کچھ دیر حقہ گڑا کر دیا پھر تھوڑی سی نیند لے کر آدھی رات کو اُٹھ بیٹھے اور تسبیح پڑھنے لگے۔ تھک گئے تو بستر پر جا لیٹے مگر نیند نہ آئی۔ لائین کی بتی بھڑبھڑ کر کے بج گئی جیسے تیل ختم ہو گیا ہو۔ ایک کونے میں سے لمبا سا سایہ اُبھر آجس کا قد چھت تک جاتا تھا وہ آہستہ آہستہ چارپائی کی طرف آیا۔ لمحہ بھر کھڑا رہا پھر کونے کی طرف جا کر تحلیل ہو گیا۔ نوجوان نوعمر صاحبزادے بستر پر سے اُٹھے۔ لائین بجائی جو تیل سے بھری ہوئی تھی۔ خوف کا پسینہ پونچھ کر مصلے پر جا بیٹھے۔ آیتیں پڑھتے جاتے اور اُس کونے کی طرف چھونکتے جاتے کہ دن نکل آیا۔ مہینہ بھر رہے پھر کچھ دکھائی نہ دیا۔

چہرے پر سبزہ آیا مسیں بھگیں۔ مونچھ ڈاڑھی نمودار ہوئی۔ قینچی تک نہ چھوئی اور جب حجام سے پہلی مرتبہ اصلاح کرائی تو ڈاڑھی کچھ ہلکی ہلکی مونچھیں چہرے پر خوب بھگیں۔ پُر شباب چہرہ پاکیزگی سے دھل گیا۔ پھر

آنکھوں کے پٹوں میں شرارت کا خاص اسٹائل جھلکانے لگا۔ تبدیلی لب و لہجہ میں آئی۔ اب پر آسودہ قبسم نے جگہ پائی اور لہجہ میں شباب کی بشاشت در آئی۔ محمد عبداللہ نے شرافت اور انسانیت کی اونچی اقدار کی پاسبانی اپنے پرکھوں سے پائی تھی۔ ساری عمر ان اقدار کے وارث رہے۔

پنہ رد برس کی آپا امیر سسرال نہیں جو میکے سے بالکل مختلف یکسر جدا سرتاپا الگ۔ تھوڑی دیر بعد دارجیلنگ کی تیاری شروع ہوئی۔ بڑی سبکدوشی سے جیسے بڑی آپا کہا جاتا تھا زیور کا صندوق کھول کر بولیں: ”وہاں تمہیں کہاں پہننا ہو گا زیور اتنا چند چیریں لے جاؤ امیر بانو۔ بڑا یا ر ایک چوٹا۔ کنٹن کی جوڑی۔ آٹھ چوڑیاں۔ دو کڑے۔ دوکان پھول۔ چار بوندے۔ چھ انگوٹھیاں۔ گلے کے لیے چندن ہار بھی لے لو۔“ یہ اُس زیور میں سے جو دلہن کو جہیز اور بری میں ملا تھا بقول بڑی آپا چند چیریں تھیں جو وہ چھوٹی بھانج کو دے رہی تھیں جو شادی کے بعد میاں کے ساتھ دارجیلنگ جا رہی تھی۔

زمانہ انٹر کلاس میں امن اور سامنتھ کے مردانہ انٹر کلاس میں عبداللہ صاحب سفر کر رہے تھے۔ جب کوئی بڑا اسٹیشن آتا تو جا کر حال پوچھ آتے یا کوئی کھانے کی چیز دے آتے۔ ہوڑہ کا اسٹیشن آیا۔ قریب سے کوئی حجام گزرا ”بار بر صاحب بار بر!“

انھوں نے بلایا۔ ایک طرف جا کر ڈاڑھی منچ صاف کرادی۔ شیشہ دیکھا تو چہرہ اور اچھا لگا۔ زمانہ ڈبے کے قریب آکر دلہن کو گھورنے لگے جو برج میں سے دیکھ رہی ہے اور گھبرائے جا رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ میاں کدھر چلے گئے۔ ابھی یہاں تھے آجائیں تو اچھا ہے۔ اس بد معاش سے نجات ملے۔ جب گاڑی چلنے کا وقت آیا تو کھڑکی کے پاس آکر شرارت کے اپنے اسٹائل سے بولے۔

”امیر یہ میں ہوں۔“

ہوڑہ اسٹیشن کے بافیشن پہنچے ہوئے حجام نے سیدھے اُسترے سے ایسی شیو بنائی کہ اپنی پلٹن کی آفیسر شاپ سے جاتے ہی ویسا اُسترہ خریداد اور عمر بھر وکٹورین اسٹائل کے خطرناک اُسترے سے شیو بناتے رہے سیفٹی ریزر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دھار میں کمی آئی تو چپڑے کے اُس سٹریپ پر شراپ تیز کر لیا جو GREAT BRITAIN کی کسی فیکٹری کا ساختہ تھا۔

میری بڑی بہن آپا وزیر کے شوہر ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان گئے ہوئے تھے۔ محمد عبداللہ چھوٹے بہنوئی رخصت پر فیض آباد سے آئے ہوئے تھے۔ میری آٹھ اور چھوٹے بھائی الطاف کی عمر چھ برس کی ہوگی کہ چڑیا کی زبانی سنا دونوں کے ختنے ہو رہے ہیں اور حبس نائی کا ہاتھ ہلکا ہے اُسے بلایا جا رہا ہے۔ دونوں کو سہ پہر کے وقت برنی کی ایک ایک ڈلی کھلا دی گئی۔ گھر میں فصا کچھ ایسی تھی جو پہلے نہ دیکھی تھی۔ چڑیا کی زبانی یہ تک معلوم ہو گیا کہ کوئی نشہ آور چیز برنی کی ڈلی میں تھی جس سے درد محسوس نہ ہو پائے گا۔ نظام دین نائی دھاگے والی عینک

لگائے بغل میں بستہ پیٹے اُن نازل ہوا۔ ہماری ٹانگیں عبداللہ صاحب نے زبردست گرفت سے پکڑیں۔ نانی نے کٹ تھروٹ قسم کا سنترہ جو چاقو کی طرح بند تھا کھولا۔ دوسرے ہاتھ کی پتھیلی پر چٹ اور پٹ کیا۔ کوئی انگلی کے اشارے سے بولا: ”وہ چڑیا“ ہم نے فضا میں دیکھا ہی تھا کہ ہماری فاختہ اڑ گئی۔

ترکی میں ختمہ کرانے والے بچے کا ٹانگیں پکڑنے والے کے ساتھ ایک خاص دلی تعلق ہو جاتا ہے۔ وہاں بچے کی ٹانگیں عام طور پر باپ کا کوئی دوست پکڑتا ہے۔ جو ختمہ کے بعد بچے کا کاڈ فادر کہلاتا ہے۔ جب بھی باپ کے خلاف بچے کو کوئی شکایت ہو تو وہ اپنی شکایت اس کاڈ فادر (GOD FATHER) سے بیان کرتا ہے۔ سمجھو نہ کی صورت نکالتا ہے۔ اس رسم کے نانتے سے اُس شخص کو گھر میں بڑی اہمیت اور استحقاق حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لڑکے کی شادی پر جوڑا بنا کر لاتا ہے۔

۳

میراجانا بستی والوں کے ہاں لڑکپن میں بُرا تھا۔ صبح صبح چوکی پہ بیٹھا نہایت ہوشیار تھا کہ کوئی صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے گزرے۔ میں نے سلام کیا۔ بولے:

”بھئی! یہ برخوردار کون ہے؟ میں نے پہچانا نہیں۔“

کوئی بولا:

”بابر ہے چچا جان۔ بھابی امیر کا بھائی۔“

”اچھا امیر بانو کا بھائی ہے۔“

بعد میں مجھے معلوم ہوا آپ ڈاکٹر دیوان علی تھے جن کی بیٹی شریفی کی شادی اُن کے چھوٹے بھائی سردار علی کے بیٹے محمد انور سے ہو رہی تھی۔ محمد انور ایف سی کالج لاہور میں میرے بڑے بھائی خادم حسین کا کلاس فیلو تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں میں لال لال دورے، بھرے بھرے گال، گورا چٹا رنگ، لہجہ میں طراری اور اضطراب ایسا اور اس قدر کہ اُس کے ساتھ لپٹے ہوئے لفظ تیزی کے ساتھ دہن سے نکلتے ہوئے ادا ہوتے۔

ڈاکٹر دیوان علی فرزند علی سردار علی اور نورنبی کے مکان ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے بندھے تھے کہ ایک میں گھس تو چوتھے میں جانکو۔ چار پانچ بھائیوں میں ایک آدھ شوقین مزاج بھی ہونا چاہیے۔ پانچوں بھائی غلام دستگیر جن کا مکان شہر میں تھا چوٹی کے وکیل، مزاج کے شوقین اور صاحب اثر و رسوخ تھے۔ تپ محرم سے ایک آنکھ خراب ہو گئی تھی۔ رنگدار چشمہ لگاتے۔ دیکھنے میں بڑے خاموش دکھائی دیتے مگر عدالت میں اس

طرح گرجتے اور دُور دُور کی کوڑی لاتے کہ مخالفین دیکھتے رہ جاتے۔ دشمنوں کے نرغہ میں سے سنگی توار کی طرح نکل جاتے۔ شہر کے لشکے بد معاش دس نمبر بے سلام کیے بغیر سامنے سے نہ گزرتے۔ دُوم مراٹھی دعائیں دیتے۔ طوائفیں جھک کر آداب بجالاتیں۔ اپنے بھتیجے اور بھتیجی کی شادی پر انہوں نے اپنی چھٹی طوائف نذیر کو حجرے کے لیے بلا رکھا تھا۔ دیوان خانہ کے سامنے کھلے میں چاندنیاں بچہ رہی تھیں۔ تہ کیے پیٹے قالینوں کو کھولا جا رہا تھا۔ ملازم ڈالان میں سے اٹھا اٹھا کر گاؤں تک بے باہر لارہے تھے۔ فرش کے گرد کرسیوں کی قطاریں لگائی جا رہی تھیں۔ ڈوبروں اور رسوں سے شامیانے والے زرتار شامیانہ تان کر نیچے سے سرخ الوان سے ڈھکے بانسوں کا سہارا دے رہے تھے۔ ہم عمر لڑکے نیاز قلب ضیا محی الدین ضمیر فیاض یعقوب اور میں چاندنی پر عمر اکے غزالوں کی طرح ٹاپیں مار رہے تھے قلابازیاں کھا رہے تھے اور گاؤں تکوں کو مسل رہے تھے۔

مطلبین میں سے ایک شخص قنار نظر آتا رہا۔ پھرتی کے اس کو پر لگے تھے۔ سیاب بھرتا تھا کہ چھلاوہ تھا۔ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ ہونٹوں پر سکرا بسیں اور بانکی سی مونچیں۔ لہجہ میں اپنا نیت اور کالی سیاہ بھور آنکھوں میں سمندر۔ یہ تیکھا نوجوان میاں عطا محی الدین کے سالے کا بیٹا اور محمد عبداللہ کا میرا بھائی نواب زادہ عبدالصمد خاں تھا۔

اندر سے بلا دیا۔ ہم کپڑے بدل مردانے میں آئے تو دیوان خانہ بھاڑ فانوس سے سج چکا تھا۔ کرسیاں مہانوں سے بھر چکی تھیں۔ میاں عطا محی الدین اپنے دو بیٹوں غلام محبوب سبحانی اور محمد عبداللہ کی معیت میں سفید عمامہ اور سفید انگرکھا پہننے چاندی کی مٹھی والا عصا ہاتھ میں لیے دیوان خانہ میں تشریف لائے ان کی چھدری چھدری لمبی سفید ڈاڑھی تھی اور چہرہ پر عبادت گزاری کا نور۔ مہمانوں نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر تشریف لے گئے۔

پہلے اندھیرے میں ایک سایہ جھلایا پھر روشنی میں آیا جس کے آتے ہی ہم لڑکوں کو زندگی کا ایک اچانک پن محسوس ہوا۔ اپنے لشکے دو پٹے کو اُس نے کندھے پر ڈال کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور محفل میں آکر آداب کیا۔ پیچھے پیچھے آنے والے سازندہ کی ٹولی نے جھک کر غلام دستگیر اور اُن کے بھائیوں کو سلام کیا۔ ہم نے پہلی بار طوائف کو دیکھا کہ اُس نے کس طرح آتے ہی اپنی جلوہ نمائی سے محفل کو جاندار بنا دیا۔ یہ کیسے معلوم نہ تھا کہ یہ طوائف چچا دستگیر کی ہے۔ اس نے ایک چھپتی نگاہ سے محفل کا جائزہ لیا۔ پینترہ جما کر بڑے رچاؤ کے ساتھ سب سے پہلے انور کا سہرہ گایا پھر دو چار غزلیں گا کر گھنگھر و باندھے اور ہر شعر کو انداز دلبری کے ساتھ گانے لگی۔

چتوں کے جیسے بیٹھی مستورات بھی گانا سنتی رہیں اور دو ایک پان کی گلو ریاں خاصانوں میں قاعدے کے ساتھ محفل تک ملازموں کے ہاتھ پہنچاتی رہیں۔ ایسے موقعوں پر طوائف کہاں سے آجاتی ہے۔ اُس کو کیوں بلایا جاتا ہے۔ ہماری تہذیب کے ساتھ اُس کا وجود گنہگار بندھا کیوں رہا۔

وہ ہمیں زندگی کا احساس دلاتی ہے۔ وہ یہ احساس دلاتی ہے کہ ہم زندہ ہیں اور زندگی کی خوشیاں ہمارے لیے ہیں۔ کسی خوب صورت جسم کو دیکھ کر زندگی کا اعتبار بڑھتا ہے۔

اس شادی کی تقریب پر لڑکیاں جھما جھم کو نڈتی رہیں اور بشارت سے ہستی رہیں مگر نیاز قطب فیاض یعقوب اور ضمیر نے قطعاً فوس نہ لیا اور دلوں کو اور ہی قسم کی شرارتوں سے بہلایا۔ بڑوں سے چھپ چھپ کر سگریٹ پیتے رہے چرائی ہوئی الائچیاں سگریٹ پینے کے بعد چاب لیتے کہ بڑا کام کیا ہے۔ رکابی فرنی کی اڑا لاتے اور رل مل کر انگلیوں سے پاٹ جاتے۔ بہودہ قوم لڑکیوں کی پلٹن ہمارے پاس سے گزر جاتی گویا ہم کہیں ہیں ہی نہیں اور ہماری کوئی شناخت نہیں۔ اور ہم تھے بھی کہیں نہیں اور نہ ہماری شناخت تھی۔ جاڑے کی چاندنی کو وہ دیکھے جو گھر سے باہر نکلے۔ اور پھر چاندنی بھی اُس وقت چمکتی ہے جب اُس کی طرف دیکھا جائے۔ ہم سب اندر کے خول میں بند تھے۔ مگر یہ کیسا خول تھا کیسی سائیکی تھی۔ ہم عروں کا کیسا ذہنی اور نفسیاتی پس منظر تھا۔ ہم گھر سے باہر بہت ہوتے۔ ہندو لڑکیوں کو چھڑاتے انہیں ٹاپ ٹاپ کر کپڑے دھوتے اور نہاتے دیکھتے۔

کانچ کی گولیاں کھیلنے۔ زمین کی مٹی کو کھرچ کر سوراخ بناتے۔ اُس پر گولیاں پھینکتے۔ انگشت شہادت پر کانچ کی گولی کو رکھ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے خوب دباتے اور مخالفت کی گولی کا یوں نشانہ بناتے جیسے پیدائشی نشانہ باز تھے۔ غلام دستگیر کے مکان سے باہر ہم کھلے میں کھیل رہے تھے۔ یعقوب کے والد چچا نور نبی ہمارے پاس سے بھولپن سے کہہ رہا تھا، پل گولی دو گاڑھا، نیچے ووہٹی اُپر لاڑا۔ یعقوب کے والد چچا نور نبی ہمارے پاس سے مسکرا کر گزر گئے۔ جن آنکھوں میں ہمیشہ سہانا سا رعب اور ملائم سادہ بدبہ جھلکتا تھا اُن کی یہ زیر لب مسکراہٹ اور چمک میری سمجھ میں نہ آتی۔ کیا کیا ہم لڑکپن کے انجانے میں بجا کرتے تھے۔ اس کا کیا علم ہیں کہ جو کھیل کے بول ہیں اُس میں اک گونہ لچریت اور فحاشی ہے۔

اے میری گولی پل دوسری پر اس طرح کہ دونوں کو گاڑھ دے یوں جیسے دولہا دلہن کو گاڑھ دیوے۔ بویے حضرت یہ بول ہماری کوک تہذیب میں کیونکہ گھس آئے۔ ایک نہیں ایسے کئی بول ہماری FOLKLORE میں ملتے ہیں۔ عرب تہذیب میں زیادہ ہماری تہذیب میں کم مگر اس طرح کے بول ریزہ ریزہ ضرور بکھرے پڑے ہیں جو تہذیبی لحاظ سے مرد کی جنسی فعالیت بحال رکھنے کے لیے محرک کا کام کرتے ہیں۔

۴

اہل پنجاب میں کمال کی صلاحیت دیکھی فارسی بولے تو ایرانی۔ عربی بولے تو مصری۔ یہ لوگ زندگی کو اپنانے کی کمال صلاحیت رکھتے ہیں۔ پنجاب کے دریا رستلج بیاس کے درمیانی علاقہ دو آب کے یہ لوگ یوپی میں جا کر ایسے مدغم ہوئے اور یوپی آگئے کہ روزمرہ زبان لباس زیور نشست و برخاست سارے اطوار وہیں کے ہو رہے ریشم کی انگشتیاں گندے پڑی ہوئی دولائیاں جن میں دھنکی ہوئی دوچھٹانک رُوئی کی ہوائیاں ہوں انہیں کے ہاں دیکھیں۔ مرید غوث کی اہلیہ تو اپاری باکل یوپی کی تو اپاری معلوم ہوتی تھیں۔ ڈورے کا کرتہ، چھینٹ کا

بنک پاجامہ چھڑا دے کتے میں پان کی گھوری ہاتھ میں چھالیہ کا بٹوہ۔ اردو بہر طرف ایسی مصفا بولی جا رہی تھی کہ یہ جانندہ نہیں آگڑ ہے۔ ردلی ہے۔ لکھنؤ ہے۔ نجیب آباد ہے۔ گورکھ پور ہے۔ بوا پیاری کی ایک بڑی کلثوم فاطمہ غلام محبوب سبحانی کی بیوی ہوئیں۔ دوسری بیٹی عبدالقادر سے بیاہی گئی جو بعد میں پاکستان سٹیٹ بینک کے گورنر متعین ہوئے جن کے بیٹے لکھنؤ جہزیل سعید قادر کا بیٹہ میں وزیر رہے۔

عورتیں اس گھرانے کی خالی کہاں بیٹھتی تھیں۔ بیٹھتیں تو یا تھ میں سرائے کٹ کٹ چھالیہ کاٹا۔ پاندان سفری ہویا فرشی جب کھلتا منے سے پتے پر قدرے چونا کتھا لگتا۔ چھالیہ کے دوانے رکھے جاتے۔ گھوری بنتی۔ پیسہ دھیلا اور چابیوں کا پتھر رکھنے کے لیے گھر میں پاندان کی تھالی سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔ دن بھر اس پنجابی گھرانے میں پان یوں چبایا جاتا کہ دلی والوں کا گھرانہ ہو۔

انگریز سرکار کی ملازمت کا حاکم نہ رہا اور اب اپنی بگڑا ہوا اور نہایت اہم مگر ریاست کی نوکری کا بھی اپنا حسکا۔ جس کو جو تک جلتے۔ دونوں بھائی ریاستوں میں ملازم رہے۔ ڈاکٹر دیوان علی نواب بہاولپور کے ذاتی معالج

ڈاکٹر فرزند علی نواب خدوہ کے ذاتی معالج اور وزیر ہیمہ پور سے امرا افغانستان کے ذاتی معالج ہو کر قابل چلے گئے۔ جہاں شاہی خاندان کے افراد سے قریبی مراسم پیدا ہو گئے۔ دیوان علی کلین شیمور ہتے مگر ڈاکٹر فرزند علی کے کھلتے ہوئے گندمی رنگ پر شخصی ڈاکٹر بھی خوب سمجھتی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے وقت کے پانچ نوجوان انگلستان روانہ ہوئے۔ بستی کے گھرانے سے ڈاکٹر دیوان علی کے بیٹے غلام جیلانی، بابو عطاء علی الدین کے فرزند محمد علی الدین، جھانسی سے بابو نور احمد کے بیٹے عزیز احمد، بشالہ سے بابو مختار احمد بارائیٹ لا کے فرزند خورشید احمد اور بابو دین محمد کے فرزند عبدالرزاق۔ یہ لڑکے ایک ہی سمندری جہاز میں ممبئی سے روانہ ہوئے۔ اپنی اپنی درس گاہوں کی جانب رخصت ہونے سے پہلے لندن کے اعلیٰ سٹے ہوئے کپڑے پہن کر ایک یادگار فوٹو کھسوائی جو ہر ایک نے اپنے اپنے والدین کو بھیجی۔

عزیز احمد میرے بہنوئی تھے۔ انہوں نے تصویر اپنے والد کو بھیجی۔ جنہوں نے دیکھنے کے لیے میرے والد کو ارسال کی۔ میں چوٹا سا تھا مگر ابھی تک ذہن میں اس خوب روگروپ کی جھلک اپنی تمام حسن و رعنائی کے ساتھ محفوظ ہے۔ نوجوان کس قرینے سے بیٹھے ہیں۔ خوشبو کی ایک فضا اس تصویر کے خدوخال پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ تصویر نہ تھی مچھلوں کا گلہ ستہ تھا۔ جی چاہتا ان مجھ لورا کی طرف دیکھتے پتلا جاتیں جیسے بہار کا رواں دواں قافلہ لمحہ بھر کو ہمارے سامنے ڈک گیا ہو۔ ان راج دلاڑوں کی جوانی کے سنورے سنورے نقوش مستانی مستانی آنکھیں چہروں پر شباب کی شگفتگی لبوں پر ملائم مہم جو دیکھتا گھر میں وہی کتا۔ سب خوب صورت اور رعنا مگر خورشید احمد کے حسن کی تاب نہ نہیں لاتی جاتی۔ سب پر چھایا ہوا ہے۔ ہر ایک کے چہرے پر تابش شباب، آنکھوں میں زندگی کو جلانے کی چمک۔ اچھے مستقبل کی آرزو اور شوق کی رفعت مگر خورشید احمد کا حسن حسن یوسف تھا۔ یہ تصویر نہ تھی ایک مظلوم و رقی تھا۔ مگر اسے زمین لعین! آج ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں۔ سب خاک ہو گئے۔

ناموں کے ساتھ اگلے وقتوں میں سابقہ کے طور پر بابو کا لفظ استعمال کیا جایا کرتا تھا جو انگریزوں کی اختراع تھی۔ یہ لفظ جو عزت و تکریم کا نشان تھا انگریزوں کا عطا کردہ ہونے کے سبب بڑا قابل عزت سمجھا جاتا تھا ہندوستان کو بہت پسند آیا بہت قبول کیا اتنا کہ یہ لفظ ہماری تہذیب اور کلچر کا حصہ بن گیا۔ کئی مسلم گھرانے باپ کو ابا جی کہنے کی بجائے بابو جی کہنے لگے۔ ہندو گھرانوں میں پیتا جی کی بجائے بابو جی کہا گیا۔ یہ لفظ پنجاب کی بعض حدود میں باؤ جی بن گیا۔ ابھی تک سرکاری دفاتروں میں چھوٹے درجے کے کلرکوں کے لیے یہ لفظ خطاباً استعمال ہوتا ہے۔ انگریز کے وقتوں میں ایسی گماشتوں اور اہلکاروں کو فوج کے دفاتروں میں بھی بابو کے لقب سے بلایا جاتا تھا۔ چنانچہ حاجی عطاء محی الدین اور نور احمد کو بابو عطاء محی الدین اور بابو نور احمد کہا گیا۔ مختار احمد جو میری اہلیہ کے نانا تھے اور ان کے بڑے بھائی محمد عمر چند کہ یہ دونوں بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے پریسٹریٹ لاسٹے گمروں کو بٹالہ اور امرتسر میں عزت و تکریم کے طور پر بابو مختار احمد اور بابو محمد عمر کہا جاتا تھا۔ اُن کے ایک عزیز جلال الدین جو لاہور میں سیکرٹریٹ کے دفتر میں ملازم تھے عمر بھرا نہیں باؤ جلال الدین کہا گیا۔ سولی سیکرٹریٹ کو لاٹ صاحب کا دفتر کہا جاتا تھا کیونکہ لوگ باگ گورنر نہ کہہ سکتے تھے اس لیے گورنر کو عام زبان میں لاٹ صاحب کہتے تھے میں اپنی راہ سے اُتر کر الگ پگڈنڈی پر جا چڑھا ہوں جسے جگہ معترضہ کی پگڈنڈی کہتے ہیں۔ جب یہ چھوٹی سی پگڈنڈی راستہ کاٹتی ہے تو چلنا اس پر بھی ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اس پر سے بھی کبھی کبھی پھانسی ہو جاتی ہے۔ اس پگڈنڈی پر سے بابو مختار احمد مل گئے جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ ایک خوبصورت بیوی کے شوہر اور تین اولادوں کے باپ ہوتے ہوئے بابو نور احمد کی بیٹی محبوب کو بیاہنے جاتے ہیں بابو مختار احمد کی بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے جو ایک سچی کی ماں بھی ہے۔ مختار احمد کے بیٹے خورشید احمد کی عمر گیارہ برس کی ہے اُس کے سنے کپڑے سلتے ہیں کیونکہ وہ اپنے باپ کی برات کے ساتھ اپنی سوتیلی ماں کو بیاہنے جا رہا ہے کیسے نڈر اور عاشق صفت تھے ہمارے بزرگ !

جب اس پگڈنڈی نے راستہ کاٹا ڈک جالندھر کے اُس گھرانے کا ہو رہا تھا جس کے گھنٹو اور دہلی والوں کے اطوار تھے جہاں جہازی پاندان تخت پر موجود رہتا جس میں چھالیہ موجود ہوتے ہوئے بھی کینز فاطمہ سرائے سے دو دنے کاٹ کر گھوری میں رکھتیں۔ پاندان سے اپنا سیت رکھنے والوں کا یہ بھی ایک اسٹائل ہوتا ہے۔ کینز فاطمہ کا بولنے کا اپنا اسٹائل تھا۔ اُن کی گفتگو سے شیرینی اور فصاحت خاص تھی۔ جب وہ باتیں کرتیں تو فصاحت و شگوار گداز گداز محسوس ہونے لگتی۔ سننے والے کے کان میں زبان کی سلاست اور روانی رس گھولتی۔ یہ پہلا احساس تھا مجھے جو بچپن کی عمر میں ہوا کہ صحیح بولے گئے لفظ میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ احساس تھیںٹر سے مزید راسخ ہونا چلا گیا۔

بابو عطاء محی الدین کی اولاد میں کینز فاطمہ سب سے بڑی تھیں عقل و دانش اور تدبیر سے جو انھیں مقدر ہوا تھا وہ گھر اور گھر سے باہر ایک پرکشش اور محکم شخصیت بنتی چلی گئی تھیں۔ اُن کے چار دیواریوں علی سردار علی نورنی اور

غلام دستگیر سب اُن سے دبتے تھے۔ بھابی کے سامنے کسی کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔ اُن کے مشورہ اور دانست کا یہ اثر تھا کہ اُن کے بہنوئی فوزبی نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہ کی۔ شوکت اور شخصیت والی اس خاتون کے اطوار اور لہجہ میں ویسا ہی حاکمانہ وقار تھا۔ وقار تھا۔ لہجہ اُن کا اور شخصیت اُن کی مٹھاس سے معمور تھی۔ آپا بتا بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے جیسے ساون میں مبین مبین بزمیوں کی ٹھنڈی پھو بار برس رہی ہو۔ زندگی کا یہ کتنا بڑا حزن یہ ہوتا ہے کہ خاندان کے اُٹھ جانے کے بعد عورت کی شخصیت میں گر پڑ جاتے ہیں۔ زندگی کی تمام سرخوشی کا فور ہو جاتی ہے۔

بابو عطا محی الدین کے ہزلت نور احمد بٹالہ کے قریبی گاؤں فتوہ پور کے رہنے والے تھے۔ دستور کے مطابق جنہوں نے اپنے بڑے بیٹے رشید احمد کی شادی گاؤں میں اپنے عزیزوں کی لڑکی فاطمہ سے کر دی تھی جس سے ریاض احمد تولد ہوا۔ مگر رشید احمد نے بے چین اور غیہ مطنی خاندانوں کی طرح جو ہر دور میں موجود رہتے ہیں فاطمہ کو اپنے گھر آباد نہ کیا اور فاطمہ نے غیر آبادیوں کی طرح جو ہر دور میں موجود رہی ہیں گاؤں ہی میں اپنے والدین کے پاس رہائش رکھی جہاں ریاض احمد پلٹا رہا۔

ادھر ایک بہن کا بیٹا رشید احمد بے آباد۔ ادھر دوسری بہن کی بیٹی آپا بتا بیوہ۔ دونوں کا نکاح ہو گیا۔ شمیم اور ضمیر نھال میں رہے۔ بڑی بیٹی سلمیٰ کو بے اولاد خالہ امیر بی بی متبنی کر کے اپنے ہاں لے گئی۔ آپا بتا کے چلے جانے پر گھر کا انتظام چھوٹی بہن حبیب فاطمہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ مگر دایات و دستور کے مطابق کینز فاطمہ ہی کی طرف سے جاری ہوتی ہیں۔ اپنے ماں باپ کے گھر کے اُن کے صبح و شام کے دوپہر سے بندھے تھے۔ اس طرح سب سے چھوٹی بہن حبیب فاطمہ نے حسن خانہ کاری بڑی بہن سے سیکھ لیا۔

تین گھروں کی گاڑی تھل و دالش رکھنے والی اس خاتون کے دم سے چل رہی تھی۔ اپنے گھر کی دیکھ بھال خاوند کے آرام و آسائش کا خیال اپنے سے چھوٹی مرنہ بہن کی اولاد کی تعلیم و پرورش۔ پھر اپنے ماں باپ کے گھر کا انتظام و انصرام۔ حیرت ہوتی کینز فاطمہ کے کندھے کبھی بوجھ محسوس نہ کرتے۔

اُن کی خود اعتمادی تھی جس نے گھر اور باہر انھیں ایک محکمہ اور پرکشش شخصیت بنا دیا تھا۔ بیچار اور بے معنی رسمیں اُن کی مضبوط اور محکم شخصیت کے سامنے نہ ٹھہر سکیں۔ آدمی کے مرنے پر پہلی چار جمعراتوں کو کھانا پکتا تھا جو ہر عزیز کے گھر روانہ ہو کر بکھریا جاتا۔ چالیس دن تک صاف ماتم بھی رہتی۔ عورت ایک آتی ایک جاتی۔ بیچار گھست گھوٹوں کی جگالی ہوتی۔ کیسا امتحانہ رواج ہے اور ہم ان رواجوں میں کس طرح جکڑے گئے ہیں۔ دماغ نے سوچا۔ ارادے کی آنچ جلے۔ سوچ نے ایندھن فراہم کیا۔ کینز فاطمہ کے باپ کے چچا برخوردار خاں جنہیں گھر میں بابا برخوردار کہا جاتا تھا۔ جب ۱۹۲۴ میں بے اولاد فوت ہوئے تو کینز فاطمہ نے اعتماد سے کہا:

”جمعرات کو عزیزوں کے گھر کھانا نہیں جائے گا۔“

چھوٹے بڑوں نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی: ”یہ فضول رسم آج سے ختم سمجھو۔“

نقل ختم ہونے پر مستورات کے گوش گزار کرنے کو کینز فاطمہ نے میری بہن سے کہا: ”امیر بانو! نقل کی رسم ختم ہو چکی۔ اب قلوں کے بعد صفت نہیں کچھے گی۔ بیبیوں سے کہو اگر چارپائیوں پر بیٹھ جائیں۔“

بہت کھسکھسرتی ہوئی۔ پرمیگوٹیاں ہوتیں۔

”برخوردار لاولد مرا تھا اس لیے کینز فاطمہ نے ایسا کیا۔ اس کا کوئی اپنا ہوتا تو دیکھتے ہم کیسے صفت

اٹھوا دیتیں۔“

رسموں سے چھٹکارا دلوانے کی کینز فاطمہ کی دوسری کوشش اپنی ساس کے انتقال پر ہوئی۔ گھر میں موت ہو جائے تو اس کے بعد آنے والی عید نہیں منائی جاتی۔ اُن دنوں یہ باریک باریک مہین بنائی سویاں بازار میں نہ بکتی تھیں۔ گھروں میں آٹا میدہ گوندھا جاتا سویاں بنانے والی مشین میں مختلف سوراخوں والی چھلنی لگتی۔ ہتھی گھا کر آٹے کے پیٹے پر دباؤ ڈالا جاتا۔ سویوں کے لچھے چھلنی میں سے نکلنے لگتے۔ خاص انداز سے ہاتھ کی ہلکی عورت جھٹکا دے کر توڑتی سفید چادر پر رکھے سرکنڈوں پر سٹو کھنے کو ڈال دیتی۔ یوں عید کی پُرمسرت آمد پر زمانہ ناخدا نہ ایک اکسائٹ منٹ اور مصروفیت سے بھر جاتا۔

کینز فاطمہ کی ساس کا انتقال ہوا تو دوسرے مہینے عید پڑتی تھی۔ کینز فاطمہ نے کہا: ”مرنا جینا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ عید کی خوشی خدا کا فرض پورا کرنے کی خوشی ہے۔ سویاں بٹی جائیں گی۔“

میرہ سوجی منگایا گیا کسی نے کہا ساس مری ہے۔ ماں مرے گی تو دیکھیں گے۔

چھ مہینے بعد کینز فاطمہ کی والدہ بیوی جی کا انتقال ہوا۔

عید آئی تو گھر بار نے کینز فاطمہ کی طرف دیکھا۔ کینز فاطمہ نے میرہ سوجی لینے کو نوکر بازار بھیجا۔ کوٹھڑی سے مشی نکلے۔ سویاں بٹی گئیں۔ شاگرد پیشہ لوگ عید کا سلام کرنے کو آئے۔ سویاں لے کر گئے۔ نوکروں کو عید کے پیسے دئے گئے۔

لڑکے کی شادی کے موقع پر برات سے دو روز پہلے بجرے کی رسم ہوتی تھی۔ دس دس پندرہ پندرہ دیگیں پکتیں۔ طباخ میں انگ انگ زردہ اور پلاؤ بھرا جاتا جو رشتہ داروں میں فی کس فی طباخ جاتا۔ مہندی کی رات گھروں میں فی کس دس دس نان اور آلو گوشت بھیجا جاتا۔ مہندی کی رات جو آٹا پلاؤ زردہ کھا کر جاتا۔ یہ دونوں رسمیں کینز فاطمہ نے ہٹا کر ولیمہ کر دیا۔ لوگ کہتے رہے ہم نے اتنا کھلایا اب ہمیں یوں ٹر خایا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔

جس رات دامن اور دُولھا کے ہاتھ پر مہندی لگائی جاتی مراسیں ساری رات گاتیں۔ دُولھا کی ماں کی طرف

سے پہلی بیل پاؤنڈ کی دی جاتی۔ پاؤنڈ اشرفی کہلاتا تھا۔ اگر پاؤنڈ کی بیل نہ ہوتی تو زیور کی بیل دی جاتی تھی۔ کینز فاطمہ کہتی: یہ گانے والیوں کو ان کا حق ملتا ہے جو خوشی کی تقریب کو زیادہ بڑی بنا دیتی ہیں۔ سخی ان کرتا ہے غریب کا پیٹ بھرتا ہے۔ پھر یہ ایک طرح سے دوہا دلہن کا سر صدقہ ہے۔ دافع بلا ہے۔ جنہیں یہ دوم مرانی لوگ اتنی ساری دعائیں دیتے ہیں۔ انسان کا دعائیں بھی بہت بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ خوشی کے موقعوں کا انتظار کرتے ہیں۔ ان حاجتمندوں کی ایسے موقعوں پر پرورش ہوتی ہے۔ وہ ایک حدیث کا حوالہ دیتیں کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک شادی پر گئے۔ اُنہوں نے پوچھا وہ دن بچانے والا کہاں ہے اُسے بلاؤ کچھ گانا گائے۔ اُس کے آنے سے رونق ہو جاتی ہے۔

کینز فاطمہ اپنے میاں کے ہمراہ میری شادی پر بیالہ آئیں اور آنے سے چار روز پہلے مراسنوں کو بھجوا یا جھول نے طبلے اور ہار منیم پر اردو پنجابی کے علاوہ مولینا گرامی اور حافظ کا فارسی کلام بھی گایا۔ اباجی ذاتی طور پر گرامی سے واقف تھے۔ گرامی کی اس غزل پر انہوں نے بہت داد دی۔

آمادہ بہ قتل من آں شوخ ستمگارے

اِس طرف تماشا میں نا کردہ گنہگارے

(وہ شوخ ستمگر میرے قتل پر آمادہ ہو گیا یہ کیسا تماشا ہے اور طرف تماشا یہ کہ نا کردہ گنہگار کے قتل پر۔ اُس شوخ کی ستمگری کی یہ حد ہے)

چشم است سید مستے دل ہست سید کاے

دردے بہ جگر دارد بیمار ز بیمارے

(آنکھ اُس کی سید مست اور دل سیاہ کا رہے جو چشم بیمار چشم سیاہ دیکھتا ہے بیمار ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا درد ہے جو ایک بیمار سے دوسرے کو لگ جاتا ہے)

از عشق بگو با من باشیخ چہ می گوئی

بہر کارے و بہر مرد بہر مرے و بہر کاے

(قدرت نے مختلف کاموں کے لیے مختلف لوگ چنے ہیں۔ عشق کے لیے ہمیں چنا ہے اس لیے عشق و عاشقی کی بات ہم سے کرنا بدویشخ سے نہ کر۔ اُس کی سمجھ میں خاک نہیں آئے گا)

آہم بہ سر را ہے ماہم با سر باے

دیوار بہ امید بہ دیوارے

(میرا محبوب چاند کی طرح حسین و جمیل ہے جو سر بام دکھائی دے رہا ہے۔ میں اپنی راہ چلتا ہوں اور اُس کے لیے آہیں بھرتا ہوں۔ امید کی دیوار کھڑی ہے اور دیوار کو بھی امید ہے)

کہ کبھی تو یہ محبوب جو سرِ بام ہے نیچے اترے گا یا عاشق دیوار پر سے اُس تک پہنچے گا)
 ہاں جرمِ گرامی نیست جز کاہلی و پیری
 دیرینہ غلامے را مفروش بہ بازار سے
 (گرامی کی پری اور کاہلی اُس کا جرم نہیں ہے۔ اسے گرامی کا جرم نہ گردان۔ اُس کے دل میں
 تیری محبت ابھی تک ویسی ہے اس لیے اپنے اس دیرینہ غلام کو بازار میں فروخت نہ کر)
 اباجی نے ساری غزل کا لطف اٹھایا اور واہ وا کیا۔ رجب طبع انہوں نے دو رہ گنویا اور داد دی تو سخت
 پڑا ختم و دبانہ طریقے سے گو ماں میرا سن نے آداب کیا۔ اگلے روز شہر پکنز قاطع اباجی سے کہنے لگیں: چچا جان!
 بابر کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو نام منترہ رکھا جائے لڑکا کا ہو تو ہالیوں۔
 یہ سن کر میں شرمایا گیا۔
 لڑکی ہوئی۔ نام منترہ رکھا۔

۵

جدی حویلی سے باہر چوگان میں فرش پر دری کھچی۔ دری پر جاجم جاجم پر کوٹے کناری کے جوڑے سجے۔ کچھ دیوار پر
 تلکے جن پر مقیش کے ستارے اور گوکھڑو ٹم ٹم بھل کر تے بڑے اچھے لگتے۔
 والد مرحوم نے آپا وزیر کے جہیز میں دودھ دینے والی بھینس بھی دی جو جہیز کے قریب بندھی تھی۔ سجاوٹ کے لیے
 اُس کی پیٹھ پر پھولدار پھلکاری پڑی تھی۔ گردن طے پر گلے میں گھنٹی ٹن ٹن بجتی۔
 مس بزرگ کا انتظار تھا۔ لفظ مس بزرگ کانوں کو عجب سا لگتا۔ برف جیسے سفید بالوں کا جڑو، اوپر
 ہیٹ، سفید لمبا سایہ۔ یہ بوڑھی انگریز عورت عیسائی تبلیغی مشن کی سربراہ تھی جو اپنی بزرگی اور پاکیزہ صورت
 کی وجہ سے بٹالہ میں مس بزرگ کے نام سے مشہور تھی۔ جب ہم لوگ وطن آتے تو مس بزرگ ہماری والدہ سے ملنے
 آتی۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتی۔ دو غیر اہم بچے الطاف میرا چھوٹا بھائی اور میں دہک کر ایک کونے میں اس نور کے
 بُت کو اجمیت سے دیکھتے۔

مس بزرگ نے جہیز دیکھ کر کچھ اباجی سے کہا۔ وہ خوشی سے مسکرائے۔
 چوگان میں جہاں جہیز بچھا تھا اُس کے سامنے مضبوط اینٹ کی ایک چوڑے گچے حویلی موجود تھی۔ اُس
 وقت کون کہہ سکتا تھا کہ اس نادان بے سمجھ بچے کا دل اس حویلی سے ایک دن ایسا اٹکے گا کہ اس کو صد ہا
 بسا روں کی خوشبوئیں یہیں پنہاں ملیں گی۔

اُن دنوں برات کو بھی سجایا جاتا۔ آگے آگے سبز کاغذ سے بنے قد آدم سرودھوتے۔ جن کو سرورواں
 کہا جاتا۔ ملازموں نے ان کیوں سیدھا اٹھایا ہوتا جیسے سرو کا بوٹا بھی چمنستان سے نکل کر برات کے ساتھ

ہو لیا ہے۔ بری کے جوڑے ڈوم ڈومیوں نے سر پر اٹھائے ہوتے جو پتگیروں اور تھالوں میں سجے ہوتے۔ اس طرح سے بری اور جینز کی نمائش ہوتی۔ آگے آگے باجا ہوتا پیچھے ڈولھا سہرا باندھے گھوڑی پر سوار۔ ڈولھا کو سہرے کے پیچھے منہ کو رومال سے ڈھک کر رکھنے کی تاکید کی جاتی۔ اس میں بھی کئی مجید تھے۔ رنگ کا سیاہ ہو تو معلوم نہ ہو پاتے۔ منہ چڑا دانت بد نما ہوں تو دیکھنے والے کی نگاہ نہ پہنچے۔ صورت کا اچھا ہو تو نظر نہ لگے۔

ڈولھا کے پیچھے پیچھے دو آدمیوں نے کاغذ کا تخت اٹھایا ہوتا۔ یہ تخت رواں کھلتا۔ یعنی ڈولھا اپنا تخت ساتھ لے کر آیا ہے تخت ازبس باس کی لمبیوں سے بنا ہوتا مگر ہنرمندی کا ایک نمونہ ہوتا۔ جب برات لڑکی والوں کے ہاں پہنچتی تو لڑکی والوں کی طرف کے کچھ لڑکے بالے ٹوٹ مچاتے۔ برات والوں کے ہاتھوں سے سرو اور تخت رواں لے دوڑتے۔

ہماری آپا کی برات اسی دھوم سے آئی۔ تخت اور سرو رواں کی کھینچا تانی کی تصویر میرے ذہن کی جھال پر ابھی تک ٹمٹما رہی ہے۔ آپا کا ڈولھا عزیز احمد شادی سے بیس روز بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کو پانچ سال کے لیے انگلستان روانہ ہو گیا پانچ سال کا دورانِ وقت وقت نہ تھا۔ ایک طویل مدت تھی۔ ایک عرصہ بعید تھا۔ صرف بیس دن کی دلمن کے لیے جدائی کا نہ بیتنے والا ایک زمانہ تھا جس کو کوئی ادا اس پر ہن کس طرح بتاتے گی! اتنی ہمت کہاں سے آئے گی! اتنا حوصلہ کس کا ہوگا! سسرال جاتی تو اس طرح آبدیدہ ہو کر جاتی کہ ہم سب غلگیں ہو جاتے۔ اس کا خسر بابر احمد باباجی کا خلیا بھائی تھا اور اس کی ساس کرامت بی بی بابو عطا محی الدین کی سالی۔ سب اُسے مگر میں بھابھو جی کہتے۔ رشید، عزیز، ادیس اور منظر چار بیٹے تھے اور اس کی بیٹی محبوب مختار احمد سے بیاہی گئی جو بیوی بچوں والا تھا۔ مختار احمد باباجی کا ہم عمر تھا۔ اس ناتے سے ہم اُسے بھائی مختار احمد کہتے۔ ایک روز مختار احمد جالندھر اپنے سسرال گیا تو میری بہن انگنائی میں بیٹھی جھوٹے برتن مانج رہی تھی اُس نے اپنی ساس سے کہا:

”بھابھو جی! وزیر بیگم سے برتن نہ منجوا یا کرو۔“
”وہ تان، کیوں؟“

وہ بولا:

”یہ غلام اکبر کی بڑی لاڈ والی بیٹی ہے۔“
”ہوؤ۔“

”ہوؤ“ دو آہ کی بولی کا روزمرہ تھا، جس کا مطلب ہوتا ”پھر کیا ہوا، کوئی بات نہیں، So what۔“

اور ”وہ تان“ کا لفظ بچلے کو مضبوط بنانے کے لیے یاد دو جملوں میں پیوند لگانے کو بولا جاتا۔
 پہلی شادی نواب احمد کی گاؤں میں ہوئی، دوسری بھابھو جی سے۔ پہلی کا کیا دوسری کا تو فرمانبردار رہا پھر
 داماد مختار احمد، محبوب فاطمہ کو محبوب جی محبوب جی کتا پھرا۔
 معلوم نہیں ہوتا مگر کچھ یوں ہے دوسری کا دو باجو غلام بن کر رہتا ہے پہلی بیوی کا تو صرف خاوند، مگر دوسری کا
 کچھ عاشق بھی۔ ہماری فکشن کا یہ بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ اس کی تصویر خواہ تحریری بنے خواہ روایتی، یہاں وہاں
 اس میں رنگ مزے کے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

ماں باپ کی طرف سے شادیاں صغر سنی میں کر دی جاتیں۔ باہر کی آب و ہوا سے مرد کا ذہنی افق کشادہ ہوتا۔
 چو لھے چو کے کی مجذوب ذات عورت بچوں کے گڑھ موت میں لٹھڑی رہتی۔ یہ سارا عمل میکنیکل بنا رہتا۔ مرد کی
 گھراہٹ باہر کی طرف دوڑتی۔ چو کڑیاں بھرنے والا ہرن افق کی راہوں پر نکل بھاگتا۔ جہاں کہیں دلبری کا سایہ
 ملتا بیٹھ جاتا۔ کوئی پری جس کینچ میں ہوتی کوئی چٹریل جس ویرانے میں ملتی اُس کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا۔
 اسیر ہونے کی میٹھی میٹھی باتیں رسیلا رسیلا عمل جو بند دیوان خانے میں ہوتا اُس کی خبر زنان خانے میں
 نہ پہنچ پاتی۔ داشتہ سے اور اُس کے لٹی سے اولاد بھی۔ مگر اس راز کی خبر بیوی کو نہ ہو پاتی تھی۔ میاں کے منے
 پر بھید کھلتا ایک اور بھی تھی جس سے میاں کے لطفے نے اتنے پیدا کیے۔ مگر اس وقت کیلیں بھرنے والا ہرن
 تمام جھگڑوں سے بری الذمہ خوروں کے درمیان جنت میں بیٹھا شرابِ طہور اپنی رہا ہوتا۔

ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں کو باہر والی عورت سے محفوظ رکھنے کے لیے ایوب خاں کے عہدِ جلالت میں عائلی
 قانون نافذ کیا گیا جس میں بات اتنی سی تھی کہ دوسری شادی سے پہلے پہلی سے اتنا کھالو اجازت دی۔ اس کو
 اسلامی مسئلہ بنا لیا گیا۔ بعضوں نے اسے دخل در معقولات نفس سمجھا۔ پاؤں سے آگ لگی سر سے نکل گئی۔ چار بیویوں کا
 مسئلہ بنانے والے آزاد پنچھی نے سمجھا اُسے چڑیا گھر میں بند کیا جا رہا ہے۔ تعجب ہے انگریز کے دورِ حکومت میں
 ہندوستان میں ہندوؤں کی مذہبی رسم رستی کے خلاف قانون نافذ کیا گیا تو کوئی مخالفت نہ ہوئی۔ عورتوں کی
 جان بچ گئی۔ ورنہ ہندو عورت اپنے مردہ خاوند کے ساتھ چتا پر زندہ جل جاتی تھی۔ رستی کی یہ رسم ہندو دھرم کا
 ایک اہم جزو تھا۔ جلنے والی کا تمام گنا گنا، کپڑا لٹا برہمن کو ملتا تھا۔ ہر رستی پر پنڈت کے وارے نیا رے
 ہو جاتے تھے۔ تاریخ میں کہیں درج نہیں کہ انگریزوں کے خلاف جلسہ جلوس نکلا ہو۔

اگلے وقتوں میں ایک شخصیت ہوتی کہ دوگ باگ ہر قسم کا مشورہ لینے کو اس کی طرف رجوع کرتے۔ وہ جھگڑا فساد
 بھی نپاتا۔ شادی بیاہ کی صلاح بھی دیتا۔ منشی رکن دین بھی ایک ایسا ہی بزرگ تھا۔ ضرورت مندوں کا گنا پاتا رہیں
 رکھ لیتا۔ سود پر قرض بھی دے دیتا۔ اُس نے اپنے بیٹے محمد عمر کو بیرسٹری کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ واپس
 آکر امرت سر میں وکالت شروع کی جو خوب چمکی۔ یہ مشکل کہ مسلمانوں کے ذہن لڑکے مالی کمزوری کی وجہ سے اعلیٰ

تعلیم سے بہور نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس وقت کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ محمد عمر نے امرتسر میں مسلم ایجوکیشن کا نفرنس کی بنیاد ڈال کر اس مسئلہ کو حل کر دیا۔ جن قابل ذکر جوانوں کو اس کا نفرنس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفے دیا کئے اُن میں جسٹس منیر احمد اور کرنل سلامت اللہ کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔

اُس وقت ایک عجیب اندھیر تھا کہ تعلیم کے اُجالے کا دامن شام کے بجگے ہوئے اندھیرے کے ساتھ باندھ دیتے یہ سارا اعلیٰ بڑوں کے ہاتھوں سرزد ہوتا تھا۔ مرد کتنا بھی تعلیم یافتہ ہوتا دم نہ مار سکتا۔ اُس کے بعد جو ہوسو ہو۔ شادی بہر حال بخیر و خوبی انجام پائی۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی کا جملہ جو آج تک پڑھنے میں آتا ہے اور لکھا جاتا ہے انھیں وقتوں کی یاد ہے جب مرد کی خیر سے گزرتی نہ عورت کی خوبی سے۔ بڑوں کے ہاتھوں یہ مصنوعی مصنوعی اور طبعی ہوئی اور حینیاں اپنے اوپر نامانوس سی رہیں۔ محبت کی صداقت سے یہ نا آشنا دو گ بس زندگی کی سطح پر زندہ رہتے۔ ایک طرف داشتہ دوسری طرف بیوی دونوں مصنوعی بیویاں بنی رہیں۔ یہ تمام پروکسس خود کارانہ سادہ دلانہ سبنا رہا۔ اس قدر سادہ دلانہ کہ بار ایٹ لاجا مزید خوش پوش خوش شکل محمد عمر تاریک راہوں میں مارا گیا۔ اُس کی شادی متسی رکن دین نے ایسی عورت سے کی کہ میرے نام نہ سیاہ سے زیادہ اُس کے چہرے کا رنگ سیاہ تھا۔ دولڑکیاں لطیفہ اور سکینہ پیدا ہوئیں جو ساری باپ پر گئیں۔ ایک آفتاب، دوسری مہتاب۔ زندگی میں روشنی پیدا کرنے کے لیے اُس نے چاند نام کی داشتہ رکھ لی جو ہفتے میں ایک مرتبہ دیوان خانے میں رونق افروز ہوتی۔

اب شاید رکن دین نے کچھ سوچا کہ دوسرے بیٹے مختار احمد کے لیے صورت شکل کی لڑکی ڈھونڈی گئی۔ اس کا ارادہ زمینداری مختار احمد کے سپرد کر دینے کا تھا مگر قدرت کو جو منظور ہو۔ مختار احمد تین بچوں کا باپ تھا کہ اس کا ماموں برکت علی سندھ سے اپنی نو بیویاں بیوی لے کر بٹالہ آیا۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے جنگ کے صلاح کار رکن دین کو معلوم ہوا تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ مختار احمد کو بیرسٹری کے لیے لندن بھیج دیا گیا۔

برہن سندھ میں اُس کی جہاننی میں گھل گھل کر مر گئی۔ برکت علی کا دل ایسا ٹوٹا کہ اُس نے پھر ساری عمر شادی نہ کی۔ گھروں میں کیسے کیسے فسانے ہیں! کیسی کیسی داستانیں ہیں۔ ہجر وصال کی کیسی گھڑیاں جام بلوریں میں ذرہ ذرہ ہو کر گرتی رہتی ہیں۔

مختار احمد بیرسٹریٹ لاجب اپنی خوش شکل بیوی سے پوچھتا آج کون سا دن ہے تو زہرہ انگلیوں پر گنے لگتی اور کہتی: ہفتے کے بعد اتوار، اُس کے پیچھے پیر، پھر ہوا منگل، منگل کے بعد بدھ، بدھ بعد جمعرات۔ اتنے میں مختار احمد دیوڑھی سے باہر نکل چکا ہوتا اور جب زہرہ اپنے خوب صورت دھن سے کہتی: آج جمعہ کا دن ہے تو میاں فتن میں بیٹھ کر جا بھی چکا ہوتا۔

بٹالہ سے لاہور کی طرف سیس میل دور امرتسر اور پٹھانکوٹ کے رُخ بائیس میل پر گورداسپور۔ امرتسر میں

محمد عمر، گورداسپور میں مختار احمد۔ محمد عمر کی طرح مولوی غلام محمد اختر بھی امرتسر کے اکابرین میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اُس کی داشتہ کا نام دارو تھا جس سے بعد میں نکاح بڑھوا لیا گیا تھا۔

مختار احمد نے ایک روز دارو سے کہا: ”میری بیوی زہرہ میرے مقابلے میں ذہنی طور پر کم تر ہے۔ اُس سے اولاد تو ہو گئی ہے مگر دل نہیں مل رہا۔ تم میرے لیے کوئی رشتہ دیکھو۔ تمہارا اتنے لوگوں سے ملنا جلتا ہے۔“

دارو بولی: ”میرے ذہن میں بابو نور احمد کی بیٹی محبوب فاطمہ آرہی ہے۔ بابو نور احمد مولوی صاحب کا ملنے والا ہے۔ یہ لوگ ساری عمر آگرہ لکھنؤ کانپور میرٹھ کی طرف رہے ہیں۔ اردو بولتے ہیں۔ پان کھاتے ہیں۔ سارا رہن سہن اُدھر کا ہے۔ بیٹی اُن کی محبوب فاطمہ بری نہیں۔“

مختار احمد جیسا رشتہ نور احمد کے خواب و خیال میں نہ آیا ہوگا۔ بیٹی کی عمر بیت رہی تھی۔ یہ اگ بات کہ مختار احمد اُس وقت ایک نواسی کا نانا تھا۔

مختار احمد زہرہ کے مقابلے میں ایک فیشن ایبل بیوی بیاہ لایا۔ آگے آگے وہ بھتیجی جیجے پاندان۔ سرانتم سے کٹ کٹ چھالیہ کاٹتی۔ ہونٹوں پر لاکھا جمار ہٹا۔ پان کی کترن چباتی اردو بولتی۔ نئی بیوی کے آنے سے گھر کی فضا دھل کر نہی ہو گئی۔

گورداسپور والی کوٹھی میں مختار احمد کے پاس محبوب اور بٹالہ کی جدی حویلی میں اپنی اولاد کے پاس زہرہ رہنے لگی۔ محبوب سے جب کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس کا جلا پاسو کن کی اولاد سے بڑھنے لگا۔ ماں باپ کے گھر جالندھر جاتی۔ لوگوں سے ٹونے ٹوٹنے کی پوچھ گچھ کرتی۔ میرادل تپتا ہے تو سوکن کا بھی تپے۔ مختار احمد اُس کا دشمن ہو میرا غلام تیا بعدار ہو تو میرا اور کسی کا نہیں۔ پیروں فقیروں سے یہی کہتی پھرتی۔ جتنے تعویذ مختار احمد کو پلاتی وہ اُسا ہی اپنی اولاد سے ملنے جاتا۔ جتنے سوکن کے خلاف ٹونے ٹوٹنے کرتی اتنا ہی زہو کا ذکر اذکار ہوتا۔

ایک مجذوب جو ملا تو اُس کے پاس چلائی روئی کہ بہت تعویذ دبا تے بہت لٹکا تے بہت پلا تے مگر دراز قد لمبے چوڑے مختار احمد پر کوئی اثر نہیں۔ سب اُلٹے پڑتے رہے۔ زمینوں میں فصل زیادہ اُگی۔ جائداد اور غریبی۔ دکالت اور چمکی۔ اُسے کوئی پٹنا پڑے۔ اُس کے بچوں پر کوئی مصیبت نازل ہو، کوئی قیامت آئے، کوئی طوفان اُٹھے، کھرام چھے۔

کتنے ہیں کوئی عورت شاہ مقیم کی قبر پر عجیب اوت پتا نگ منت لے کر گئی جو پوری ہوئی۔ یہ گوردکھ دھندا بھی عجیب ہے۔ ساہیوال کے قریب ایک گاؤں شاہ مقیم ہے جہاں کوئی بزرگ دفن ہیں جس کا نام شاہ مقیم تھا۔ وہ سو سال پہلے کا واقعہ ہے ایک جاٹ عورت نے جا کر کہا اگر اس کا خاوند مر جائے تو ایک بکرے کی نیاز نذر کرے گی محلے کی کچھ بڑو سنیں بھی مری۔ جو رہ جائیں اُن کو زور کا بخار چڑھے۔ فقیر کی جھکی جہاں دیا جلتا رہتا ہے جل کر خاک ہو جاتے۔ فقیر کا کتا جو میرے محبوب کو بھونکتا ہے مر جائے۔ گلی ایسی ویران ہو جائے کہ میرا یا رکھلے بندوں

پھر سکے۔ پنجابی شاعر نے جاٹ عورت کی دُعا کو اپنی نظم میں یوں باندھا:۔
 مجھ سے شاہ معتمد نے اک جیٹی عرض کرے
 بکرا دیواں پر داجے گھر داسائیں مرے
 پنج سترن گوانڈھناں قیاقوں تاپ چرے
 لگتی مرے فیر دی جیہڑی پچوں چونٹ کرے
 تے جھگی ٹرے فیر دی جتھے راتیں دیوا جے
 سنجیاں ہوں گلیاں وچ مرزیاں پھرے
 کہتے ہیں جاٹ عورت کی یہ ساری مادیں پوری ہوتیں۔

محبوب نے بھی مجذوب سے داد فریاد کر کے سخت ٹوٹکا دینے کو کہا۔ ٹوٹنے تو عید کر چکی تھی اب ٹوٹنے کی ضرورت تھی۔ جالندھر میں مسلمان شہزادوں کے تہوار پر آتش بازی بہت چھوٹکتے تھے۔ آگ کا تماشا بھی بڑا دلچسپ تماشا ہوتا ہے۔ جگڑے بندھے منضبط بارود کا آتش بازی کی شکل میں پھٹنا آگ کا اُچھلنا کودنا ناچنا شہزادوں پر بڑا مزہ دیتا، خون میں گرمی پیدا کرتا۔ پٹاخے کئی قسم کے۔ پوٹ پٹاخہ، زمینی پٹاخہ، سخی پٹاخہ، پھلجڑی پٹاخہ، لڑی پٹاخہ، بھلی مڑی پٹاخہ۔ گھن گھن، ریٹھ، ہوائیاں، جلیبی، چپٹن، انار، چکوند، پھلجڑی، مہتابی، ششوندر، ریکلا۔ یہ نام سن کر ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی مگر جالندھر میں آتش بازی کی ایک خاص چیز بنتی تھی جس کو چلانے والا مضبوط بازو کا آدمی ہوتا۔ اس آتش بازی کو ٹوٹکا کہتے۔ آتش باز بھینے کی انٹرڈمی کی خاص جھلی کے اندر بڑی مہارت سے خاص بارود بھرتا۔ چلانے والا دائیں ہاتھ کی مضبوط گرفت میں ٹوٹکا پکڑتا۔ بازو کو یوں اکڑاتا کہ زمین کے متوازی ہوتا۔ دوسرا آدمی آگ دکھاتا، ٹوٹکا پھر پھر جھلتا شون شون کرتا دُور دور تک چنگاریاں پھینکتا۔ زوہ میں آتا تو جاندار کی طرح چلتا پھرتا۔ سارا بازو اُس وقت آدمی کا کانپنا۔ اگر ہاتھ سے نکل گیا تو سامنے والوں کی خیر نہ ہوتی۔ مجمع کو چتر تازھی کرتا چلتا آگ لگاتا جھلتا جھلتا نکل جاتا جالندھر میں ٹوٹکا چلانے والوں کی خاص ٹولیاں ہوتی تھیں جو آٹھ سائے کھڑی ہو کر مظاہرہ کرتیں اور دونوں طرف دیکھنے والوں کا ٹھٹھک جاتا۔

محبوب نے ہاتھ جوڑ کر فیر سے کچھ ایسا ٹوٹکا دینے کی منت کی جو زخمی کرتا آگ لگاتا نکل جائے۔
 کیا ناک نقشہ پایا تھا مختار احمد کے بیٹے خورشید احمد نے۔ کیا حسن تھا اُس پر۔ کیا خط و خال تھے اس کے
 کیا چلبلا ہٹ اور نہسی ٹھٹھول کا لہجہ تھا اُس کا۔ محبوب کو ایک نظر نہ بھاتا۔

سب سے بڑی بیٹی خورشید بیگم کچھ ماں کی طرح کھلتا ہوا رنگ کچھ باپ کی طرح باوقار نقشہ، نکلتا ہوا قد، بھرا بھرا بدن، عربی اردو سے مزین، متعقد میں کے اشعار ازبیر۔ محبوب کو مزید جلن ہوتی۔ خورشید بیگم کا شوہر محمد حسین مرنخ و سفید بھرے بھرے رخسار گورا چٹا سفید پتلون پہن کر کرکٹ کھیلنے کو نکلتا تو درگ دیکھتے رہ جاتے۔ یہ کون ہے۔ کس کا داماد ہے۔ کس کا بیٹا ہے۔ محبوب کی آنکھوں کا کاشنا تھا۔ خورشید بیگم سے چھوٹی حبیب پتلی دہلی سی نوخیز خوب صورت سی لڑکی جس کی آنکھوں کی پتلیوں میں باپ کی سی ذہانت، تدبیر اور دانش سر پر اور دھنی لے کر مغلائی سے قرآن مجید کا سبق لیتی تو محبوب کا جھوم جھوم کر پڑھنے والی کی اور دھنی کو آگ لگا دینے کو

جی چاہتا۔

یہ رسا بسا جما یا گھر بنستے کھیلے چہرے اسے قطعاً اچھے نہ لگتے۔ محبوب نے کس کس دہلیز کے نیچے تعویذ دفن کیے۔ کن کن درختوں کی ٹہنیوں سے باندھے۔ کیا کیا دہکتی آگ پر چھڑکا کہ سب کچھ اُس کی کوکھ کی طرح بنجر اور شور آلود ہو جائے۔

فتح را احمد کا داماد محمد حسین کسان ریلوے اسٹیشن پر اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر تھا اور حبس اتوارالحق کے والد اسٹیشن ماسٹر جو ذرا غصے والی طبیعت رکھتے تھے۔ اسٹیشن کے چھوٹے درجے کے ملازمین اُن سے تنگ تھے۔ فتح دین جو گاڑی کا کانا بدلتا تھا خود بڑا غیلا تھا۔ ایک دن اُس کے دل میں خیال آیا کہ اسٹیشن ماسٹر کا کیوں نہ کانا بدل دیا جائے۔ وہ محمد حسین کا بستر بچاتا بوٹ پالش کرتا، کھانا پکاتا، صراحی میں ٹھنڈا پانی بھرتا۔ سارے کام فتح دین کرتا۔ سارا دن حسین صاحب حسین صاحب کرتا پھرتا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ شام کو جب ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تو ریت ٹھنڈی ہو گئی۔ فتح دین نے محمد حسین کی چارپائی اندر سے باہر نکال کر اپنی مقررہ جگہ پر بچھا دی۔ بستر لگایا اور جا کر اپنی کوٹھڑی کے آگے سو گیا۔ رات کو کیا ہوا کہ اسٹیشن ماسٹر سے باتیں کرتے کرتے محمد حسین اپنی کمر سیدی کرنے کو اُن کے بستر پر چوڑا تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے نیند آگئی۔ غٹ سے وہیں سو گیا۔

اسٹیشن ماسٹر بولا: ”سویارہ، سویارہ، میں تیرے بستر پر سو جاتا ہوں۔“

وہ جا کر محمد حسین کے بستر پر سو گیا۔

ستارے چپ چاپ سنسان رات کی خاموشی میں ٹٹمانے لگے۔ محمد حسین نے اپنے اوپر چادر لے لی۔ جھاڑیوں میں بولنے والا جھینگہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا۔ تھور کے ناگ بوٹوں کا پھن ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس کے سخت کانٹے جھل کی نرم ٹھنڈی ہوا سے خشک ہو گئے۔ فتح دین نے چھوٹی اٹھائی اور گہری نیند سونے ہوئے اسٹیشن ماسٹر پر برسا دی۔

کھرام مچ گیا۔ جاگ ہو گئی۔ اسٹیشن ماسٹر اُٹھ کر اپنے بستر کی طرف بھاگا۔ اُس کے بستر پر محمد حسین لہلہاں پڑا تھا۔ اُس کا سینہ گردن اور چہرہ زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ اسٹیشن کا عملہ سینہ پیٹ رہا تھا۔ حسین قتل ہو گیا۔ یہ کیا ہوا، کس نے کیوں کیا، قتل کرنے والا کس طرف سے آیا۔

پوچھی کہ پولیس آن پہنچی۔

دس بجے والی ٹرین آئی جس کے نیچے آکر کانٹے والے فتح دین نے جس کے ناہنجار ہاتھوں نے بے گناہ بے تعصیر، نیک دل مالک کو قتل کر دیا تھا خود کشی کر لی۔

یہ بسا طقس طرح بھی۔ یہ مہرے کس طرح تبدیل ہوئے۔ کس طرف سے پراسرار طاقت در آئی۔ بے تعصیر

بے خطا کسی کی موت کیوں مارا گیا۔ کون یہ کاٹا بدلتا ہے۔
محمد حسین کی نعش جب بٹالہ آئی تو گھر والوں پر قیامت ٹوٹ گئی۔ اتنا وقت گزر جانے پر بھی خون ابھی
ایک ٹپ ٹپ نیچے گر رہا تھا۔

مختار احمد کی بائیس برس کی جوان بیٹی خورشید بیگم اپنے چار بچوں کو گود میں لیے خاوند کی نعش کو برتر برتر
تکے جا رہی تھی۔ زہرہ بچاڑیں کھا کر گر رہی تھی۔ غم سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ مرنے والے کی سات برس
کی بڑی بیٹی سہمی نبوتی چُپ چاپ کواڑ کے ساتھ لگی اپنے مُردہ باپ کی میت کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ مرنے
والے کا چھوٹا بھائی اسلم حیات جس کی آنکھیں سوچ گئی تھیں مُردہ بھائی کی چارپائی کا پایہ پکڑے عاجزی اور
بے بسی سے ہائے ہائے کر رہا تھا، باپ دھاڑیں مار مار کر حسین حسین پکارے جا رہا تھا۔ میدان لوگوں سے
بھرا تھا جو زار زار روئے جا رہے تھے۔

محبوب لوگوں کی یہ آہ و بکا دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے لرز گئی۔
اس سانحہ کے بعد جب وہ جاندہ لڑکی تو آپاؤزیر کو اعتماد میں لے کر بولی: ”آج شام میرے ساتھ چلنا،
مجھے اکیلے جاتے ڈر لگتا ہے۔“

چند اندھے ابال کر اُس نے کلفتی میں ڈالے۔ میری بہن کو ساتھ لیے فقیر کی طرف چل دی جو بوریا بچھائے
بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ کر دُور سے ہی پھلانے لگا،

”بو بو آئی، اندالائی۔ بو بو آئی اندالائی۔“

محبوب اُس کے گھٹنے پکڑ کر بولی:

”میں تو نہیں چاہتی تھی کہ حسین کو کچھ ہو، میں تو خورشید احمد کا چاہتی تھی۔“

وہ بولا،

”آگ لگ گئی۔ جل گئے۔ طوفان اُٹھا۔ ڈوب گئے۔ حلوہ انڈوں کا لائی ہو؟“

”نہیں اُبیلے ہوئے لائی ہوں۔“

محبوب نے کلفتی کھول کر اُس کے آگے رکھ دی۔ وہاں اُبیلے انڈوں کی بجائے انڈوں کا حلوہ تھا۔ میری
بہن خوف سے لرز گئی۔

کوئی بغل والی کہتا کوئی کچھالی، مگر کوئی ایک نکلتی۔ ہر مہینے بغل میں پھوڑا سا بنتا جو پکتا نہ بہتا اندر تحلیل
ہو جاتا۔ باجھیں پکیں، پھر پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ سٹخنے ٹکراتے۔ سجد میں نہ آتا۔ زندگی اچانک پن محسوس کرنے
لگی تھی۔

ہمارے گھر میں ایک خوبصورت بیوہ کا آنا جانا ہو گیا جس پر مجھ سے بڑے دونوں بھائی ایک دم سے

عاشق ہو گئے۔ ایک دن آموں کے ٹوکے لیے گھر کے سارے لوگ پک پک منانے علی والی چل دئے۔
چشمے کا شفاف پانی چھوٹے چھوٹے کنکروں اور سنگریزوں پر بے جا رہا تھا۔ شاہ بیگم نے اپنے گورے گورے
پاؤں پانی میں رکھ دئے۔

بہت دنوں بھائیوں کی زبان سے یہی سنا کیا، ”شاہ بیگم کے پاؤں کتنے خوب صورت تھے!“
بچہ کامن فیٹ فیٹس ہو گیا۔

یہ چھوٹے چھوٹے واقعات اگر رونما ایسے خطرناک وقت میں ہوں جب بچے کا شعور اُس عمر میں داخل
ہو رہا ہو جب باتیں سُوجھنے لگتی ہیں۔ خیال جاگتا ہے۔ دل جھوٹ بولنے کو چاہتا ہے تو وہ جو پوتروں کا گندہ ہوا اُس
کے خیالات کی پراگندگی کا کیا ٹھکانا ہو گا!

ماموں محمد دین بھی پوتروں کا گندہ، بچپن کا رنڈی باز، اڑتی چڑیا پچانتا تھا۔ والدہ سے ایک روز پوچھنے لگا
”بہن! مجھے یہ بتا شاہ بیگم ہمارے گھر کیسے آنے لگی؟“

والدہ نے جواب دیا: ”میرا شن آتی تھی کہ شاہ بیگم آپ کے ہاں آنا چاہتی ہے، میں نے کہا سود فقہ۔ وزیر
کا دل بھلے گا کیلی ہوتی ہے۔“

۶

ہمارے گھر میں ماما محمد دین اور بھائی ذوالقرنین دونوں بے اولاد تھے۔ اس خیال سے کہ لوہے کو لوہا
کاٹتا ہے۔ دونوں کی بیویاں بے کل ہونے لگیں کہ کہیں انہیں کے محلہ کی لڑکی اُن پر سوکن بن کر نہ آجائے۔ بھابی
نے تو نارووال جاتے ہی یہاں سے قرآن پر ہاتھ دھر کر کہلایا کہ وہ دوسری شادی نہیں کریں گے اور اس وعدے
کو پتہ رکھنے کے لیے بھابی تعویذ تا گے پر ایمان لے آتی۔ مامی نے یوں اطمینان کیا کہ اتنے بڑے صنعت کار
کی بیوہ پولیس کے حوالدار کے ساتھ شادی کرنے سے تو رہی۔ مگر ہمارا ماموں خوب صورت بڑا تھا۔

میری بہن نے خاوند کی جدائی کا عرصہ سسرال کی سختیاں اٹھا اٹھا کر گزارا۔ میکے آتی تو جب بھوپو والا
ہنر ماسٹر والٹس گراموفون فراق اور جدائی کا گانا گاتا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتیں۔ بالی اور داراں
جو ہماری دور کی رشتہ دار تھیں بڑی اُداسی سے ہماری آپا کی طرف دیکھنے لگتیں۔ یاد کی بھول بھلیوں میں آپا کا یہ نقشہ
میرے ذہن میں ابھی تک محفوظ پڑا ہے۔

اب سات سال کے بعد عزت ز احمد ڈاکٹری کی ڈگری لے کر انگلستان سے واپس آ رہا تھا۔ بیٹے کے استقبال
کے لیے نور احمد نے اپنے عزیزوں کو جانندہ ریلوایا۔ مختار احمد کا بڑا انتظار تھا۔ بھابھو جی شکل کی واجی ساٹولا رنگ
چھوٹا قد فربہ بدن تنگ پر بیٹھی احکامات دیتی۔ محبوب آپا، بوا اور آپا وزیر دن بھر کام میں مصروف دکھائی دیتیں۔
اس مکان کے ساتھ ایک اور مکان یوں جڑا ہوا تھا کہ اُس مکان کا دروازہ بالکل اس مکان کے بیچ میں

کہتا تھا۔ اُس ساتھ والے مکان میں بھابھو جی کی بہن امیر بی بی رہتی تھی جس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ اُس نے آپا بوا کی بیٹی سلمیٰ کو متبھی کر رکھا تھا۔ خالہ امیر بی بی کو بس دہلیز اُلا نگھو کر صبح صبح ادھر آ جانا پڑتا۔ سو کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔

کمرہ میں دریاں بچھاتی جا رہی تھیں۔ پلنگوں پر بستر بچھ رہے تھے۔ کھانا پکانے کے لیے ضروری چیزیں کونٹھڑی میں سے نکال کر محبوب دیتی جس کے چھلے میں بہت ساری چابیاں لٹکتی نظر آتیں۔ میرے بڑے بھائی کا سالہ خورشید جو میرا ہم عمر تھا اپنی ماں کے ساتھ جالندھر پہنچ گیا۔ ہمارا زیادہ وقت اُپ والے کمرے میں گزرتا۔ کون آیا، کون گیا، شاہ نشین پر بیٹھ کر نیچے دیکھتے رہے اور ہماری نگاہ میں سب لہ ساری سرگرمیاں رہتیں۔ ہم دیکھتے ساتھ والے مکان سے سلمیٰ اور خاتون آتی جاتی رہتیں ذرا دیر کو جاتیں تو پل بھر کے بعد بلایا جاتا۔

سلمیٰ کا چھوٹا بھائی ضمیر میرا بھولی تھا۔ کب بستی سے آتا ہے۔ ہم اُس کا انتظار کرنے۔ آتا تو تھوڑی دیر بٹھرتا۔ اُس کا رنگ جتنا گندمی تھا اتنا ہی اس کی ہنس سلمیٰ کا صاف۔ آپا بوا کی طرح روشنیوں کی جھلکاہٹ دکھانی دیتی تھی۔ ایک روز میں ضمیر اور خورشید باتیں کر رہے تھے کہ سلمیٰ اور خاتون نوکر سے درمی کی گھٹڑی اٹھوائے کمرے میں داخل ہوئیں۔ نوکر نے جھاڑ دیا۔ ہم سب نے مل کر درمی بچھاتی پھر سلوٹیں درست کرنے لگے۔ نوکر جھاڑنے سے دیوار گیر الماری صاف کرنے لگا۔

میرے پاؤں پر سلمیٰ کی نگاہ پڑی تو ضمیر سے کہنے لگی: ”دیکھنا ضمیر بابر کی انگلی۔ جس کی اچھکی اس طرح ہو سکتے ہیں وہ محبت میں ناکام رہتا ہے۔“

اُس نے یہ بات کہیں سے تو سنی ہوگی۔ پلک جھپکنے تک کو کچھ ہوا۔ ابک ہو کر سی دل میں اٹھی۔ مگر یہ چھوٹی سی بوند آنکھوں جماعت کے لڑکے کے کھیت کی مٹی میں کہیں جذب ہو گئی۔ دوپہر کی گاڑی سے مختار احمد بھی پہنچ گیا۔ کھانے کے لیے نیچے پہنچنے کا بلاوا آیا۔ کھانا کھا کر اوپر آئے تو معلوم ہوا عزیز احمد کے لیے الگ کمرے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ ریلوے اسٹیشن گئے کچھ گھر پر رہے۔ عزیز احمد گلے میں بھولوں کے بارڈالے داخل ہوا۔ وہی بھنے بھنے ہونٹ جن میں کچھ مسکراہٹ کچھ شرارت کچھ اکڑ کچھ اکڑ فوں۔

قریبی رشتہ دار مستورات اُس کے گلے مل رہی تھیں۔ بزرگ عورتیں اُس کی پیشانی چومتیں مگر وہ بزرگ و خرد میں تیز کیے بنا کسی کا گالی کسی کی پیشانی چوم رہا تھا۔ اپنے منہ پر بوسہ چپکتا محسوس کر کے عورتوں اور لڑکیوں کے چہرے شرم سے گلزار ہو رہے تھے۔

آپا وزیر بیس روز کی دھن ایک پلنگ پر عروسی کا جوڑا اپنے گھٹڑی بنی بیٹھی تھی۔ عورتیں پلنگ کے گرد

جمع تھیں۔ غلام نکوسات برس سے بھڑی دھن کے پاس لا کر بٹھایا گیا۔ میرا تنوں نے سہاگ کے گیت گانے شروع کئے۔ عزیز احمد نے آپا کی مٹھی کھولی جس میں مصری کی ڈلی تھی جو اُس نے منہ میں رکھ لی۔ پھر آپا کے گھونگٹ کے نیچے آئینہ رکھا گیا جس میں ایک دوسرے نے ایک دوسرے کا چہرہ سات برس کے بعد دیکھا۔ اس رسم میں کتنی مٹھاس اور ٹھنڈک تھی۔ ہمارے پرکھوں نے کتنی اکساٹمنٹ اس میں چھپا دی تھی۔ مشاہدے میں آنے والی یہ مٹھی مٹھی رونق اور دل کو اچھی لگنے والی یہ فضا میرے ساتھ بٹالہ نہ آئی، جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ اب عزیز احمد کے بٹالہ آنے کا انتظار تھا۔

وہ بٹالہ آیا تو اباجی نے ضیافت کا انتظام کیا۔ چھت پر چاندنی بکھی۔ گاؤں کی لکے۔ شاہ نشین پر دوہتی کے ہانڈے والے ولایتی لمپوں کی جھللاتی روشنی بہت اچھی لگی۔ ہاتھوں میں فرشی پنکھا لیے ملازم پنکھا جھلاکے۔ چلمی میں آفتاب سے ہاتھ دھوئے۔ دسترخوان بچیا۔

عزیز احمد کا ہنوتی مختار احمد آیا۔ پہلی دفعہ ڈاکٹر شریف کا نام سنا جنہیں میں اوپر کی چھت تک چھوڑ کر آیا۔ مقطع دار صحن قطع چہرہ جس پر مجھے زندگی کی سنجیدگی اور زندگی کے گزران کی قناعت کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔ مختار احمد کے خال و خد بڑے واضح تھے۔ دار صحن کے بغیر نیچے کو گری ہوئی لمبی لمبی مونچھیں جن کے سائے میں اوپر تلے کے ہونٹوں میں ایسی متبسم ظرافت کہ حرفِ سادہ کو لطفِ کلام دینے کی جھلی کھائے۔ چہرہ زمانہ شناسی کے تجربے سے دھلا ہوا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ دراز قد۔ ہاتھ میں چاندی کے مٹھے والی چھڑی۔

ایک اور صاحب منشی غلام قادر آئے جن کا تخلص متی تھا۔ خشنی دار صحن۔ سر پر صافہ۔ ملل کا گرتہ اور واسکٹ۔ چہرے پر ڈھیروں منشیانہ پن۔ نہایت متبہن اور سنجیدہ بزرگ دکھائی دئے۔ والد صاحب کی زبانی یہ کئی مرتبہ سن رکھا تھا کہ بے توفنی غلام قادر وثیقہ نویس مگر اپنی علم دوستی اور قابلیت کی بنا پر ہر طبقہ میں اُس کی عزت ہے۔ سب جج ہند ہو یا تحصیلدار۔ یہ نام ممکن کہ کچھری کے اس عرضی نویس کو دعوت پر نہ بلایا جائے بلکہ اُن لوگوں کو اُس کا انتظار رہتا۔ غلام قادر کو موسیقی اور شعر کا بھی ذوق ہے اور پھر تھوڑی سی پی لینے کے بعد اُس کی گفتگو میں لطافت و ظرافت کے سارے چمکنے لگتے ہیں۔

اسٹیشن ماسٹر شہر کا سرکاری ڈاکٹر تھانیدار پوسٹ ماسٹر۔ ان چار افراد کو اباجی کسی ضیافت پر فراہم نہ کرتے۔ اس دعوت پر بھی یہ چاروں آئے۔

دعوت کے لیے ذوالقرنین خان نارووال سے ایک سو بلیا، پچیس مرغیاں اور پچیس تیر لائے۔ ذوالقرنین خان ہمارے سب سے بڑے بھائی نارووال میں تھانیدار تھے۔

ایک دن اباجی نے کسی سے پوچھا، جیسے ہوشیار پور والے غلام قادر کا تخلص گرامی تھا۔ اسی طرح منشی غلام قادر کا تخلص متی ہے۔

ابا جی بولے : تخلص نہیں۔ نام کا حقہ ہے۔ ہوائیوں کہ شوق محمد کے بیٹے غلام محمد نے کابل جا کر گھوڑوں کے کاروبار میں بہت دولت کمائی۔ کسی نے دولت کی تعریف کی۔ اُس نے کسر نفی سے کہا : ما ایں قدر دولت ندارم۔ ما مانند متی ہستم۔ یعنی میں مٹی کے برابر ہوں۔ اور کہانی یوں بھی ہے کہ گھوڑے بیچنے کے سلسلہ میں ہمارا اجہ بخت سنگھ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ ہمارا راج کو اُس کی باتیں اچھی لگیں۔ جب بھی ہمارا راج کو گھوڑوں کے متعلق کوئی مشورہ لینا ہوتا تو کہتا اُس مت والے غلام محمد کو بلاؤ۔

”غلام محمد کیوں؟“

”سکھ غین نہیں بول سکتا۔ غین کی بجائے کاف بولتا ہے۔“

ابا جی کی ظرافت کی رگ پٹری کی توحقہ کی نئے منہ سے ہٹا کر کہنے لگے : نیرا نام اب فقیر احمد ہے مگر سب فقیرا قینی کہتے ہیں۔ تو یہیں بتاتا نہیں مگر کبھی تو پیر تو نے قینی جلاتی ہوگی۔ تیری نسل اگر اپنے نام کے ساتھ قینی لکھنا شروع کرے تو تم کیا بگاڑ لو گے۔ کوئی محمد بشارت قینی کوئی برکت اللہ قینی کوئی ریاض علی قینی۔ بس متی کا لفظ چل پڑا۔“

ابا جی نے تھتے کاکش لیا اور بولے : ”غلام محمد کے آگے چار بیٹے ہوئے۔ فیروز خاں، مراد علی، گور خاں، نور محمد۔ یہ باپ کی وجہ سے متی کہلائے۔“

”مختار احمد کس بیٹے کی اولاد۔“

”بھتی مراد علی کا پوتا۔ مگر میری بات یاد رکھنا غلام قادر اور مختار احمد کے بعد مت کا اللہ ہی حافظ ہے۔“ ان لوگوں کی شادیاں بھی بستی والوں ہی کی طرح گچر مچر آپس میں ہو جاتیں۔ ان کے مکان بھی انھیں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ مگر غلام محمد کے بیٹے مراد علی نے پکی اینٹ کی تین منزلہ حویلی بڑے دروازے میں جا بنوائی اور وہیں جا بسا۔ اپنے مکان کے سامنے چوڑے گچ مسجد تعمیر کرائی۔ بچپن میں ہم جب اس مسجد کے غسل خانہ میں نہانے کو جاتے دروازے پر نصب شدہ کتبہ پڑھتے صرف ایک مصرع سمجھ میں آتا : بنا کردند این مسجد مراد علی۔

میرا بہنوئی عزیز احمد جو مختار احمد کا سالا ہوا۔ جب دوبارہ بٹالہ آیا تو گھر میں بڑی جیل پھل رہی۔ پچھلے دالان میں جہاں چینی کے برتنوں سے بھری الماریاں لٹکائیں فرش محفل میں مٹیہ کر چلغوزے کھائے جاتے اور ٹپ لائی جاتی۔ کچہرہ عبد عزیز احمد کو برش اندین آرمی میں محسوس مل گیا۔ ٹریننگ کے بعد فروز پور چھاؤنی میں جب اُس کی تبدیلی ہوئی تو آہ زور وہاں چلی گئی۔

کمال یہ ہے کہ سب طرفیں زندگی کی ہر لمحہ صیقل ہوتی رہتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خیالات نشو و نما پاتے ہیں۔ لطیف جذبات کی شاخوں پر کونسلیں مٹھنے لگتی ہیں۔ ایک نظم خوشی محمد ناظر کی ”جوگی“ میرے نصاب

میں ہوتی تھی زبانی یاد ہو گئی۔ بھائی عاشق کے سائلے خورشید کو جسے اُس کے والدین پیار سے خوشی کہتے تھے جب میں یہ نظم زبانی سناتا تو وہ میرا منہ دیکھنے لگتا۔ میں اور وہ جب چھت پر کیڑی کاڑا کھیلنے تو کتنی مسرت ہوتی۔ پھر میں اور وہ بیٹھک میں میکانو (MACCANO) لے کر بیٹھ جاتے۔ بیچ اور کمانیوں کو جوڑ جوڑ کر چھکڑا بناتے۔ کرین اور پُل بناتے۔ جنگلے والے چھجے میں آ بیٹھتے اور نیچے بازار میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھتے رہتے۔ میں نے ایک چھوٹی سی لڑکی کو کئی بار دیکھا تھا۔ اُسے جب بھی دیکھتا معلوم ہوتا اُسے میرے ہی بیچ اور کمانیوں سے بنایا گیا ہے۔ مجھے اُس میں اپنی پہچان دکھائی دیتی۔ میری رُوح جیسے اُس کے وجود میں ہو اور اُس کی رُوح میرے وجود میں۔ وہ لڑکی بازار میں عطار کی دکان کی طرف جا رہی تھی۔ ایک جذبِ بے نام سے میں اُس کی طرف دیکھا کیا۔ وہ کیسا لمحہ تھا جذبِ دروں کی بے ساختگی کا کہ انا ملتی کھنے کو جی چاہا۔

”میں اُس لڑکی سے شادی کروں گا۔“

خوشی سننے سیرت سے مجھے دیکھا۔ ہم دونوں بہت چھوٹے تھے۔ بات بہت بڑی تھی۔

گولڈن گیٹ کی بلیاں

احمد سعید

سان جوزے میں جون کا مہینہ تھا لیکن وہاں سال بھر یقینہ بہار کا موسم رہنے کے باوجود فوارہ پاکستانی کمال کو سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی ایک اور وجہ اس کی بیماری تھی۔

بہتے کا دن تھا۔ اتوار ملا کر اس کے دوست حامد کو دو روز کی دفتری چٹی تھی۔ دوپہر کا ایک بجنا تھا جب کمال اس کی گاڑی کی طرف بڑھا جس میں حامد اسے اس کے میزبان بیٹے کے پارٹنٹ سے لینے آیا تھا، جہاں کمال اور اس کی بیگم مقیم تھے۔ پہلے سے کارڈر ایئر کرنے کے لیے اس میں بیٹھے حامد نے کمال کے ہاتھ سے کیمرے کو وینڈ سکریں کے پاس رکھا اور دروازہ کھولا کمال جب اسے بند کر کے بیٹ لگا کر بیٹھ گیا تو حامد بولا: ”چلیا ر گولڈن گیٹ برج، ایک بار پھر۔ بغول منہ رے ساؤتھ میڈنک کی دلہن!“

”گھاٹی چلاؤ۔ باتیں تو راتے میں ہوتی رہیں گی گائیڈ۔“

”YES JOHNNY“ — بلیاں پکڑنے جلدی جو پیچھا ہے، حامد نے معنی خیز انداز میں شکر اکر کہا۔ وہ گاڑی چلا کر چوک میں پہنچا اور وہاں سے اسے سان فرانسیسکو کی طرف موڑ دیا۔

”لوں، تو کہاں تک پہنچے؟“

”کچھ افسانہ، کچھ کہانی بن رہی ہے مشاہدہ کی پسند اور ہچانی پر مبنی“

”یہ تمہارا کام ہے۔ تو لگے ہاتھ ایک اور بات نوٹ کر لو کہ اب ہم گولڈن گیٹ برج سے چھٹنگ لگا کر، اخبار

کے مطابق، آٹھ نو سو لوگوں نے خود کو خودکشی کر لی ہے یا اس کی کوشش کی ہے۔“

”خودکشی۔ جنت کی تلاش کرنے کے تے جہنم میں پہنچنے کے لیے۔“ یاد میں کہیں اسی تو سے برس

پہلے ہی من چاندی لدے ڈوبے جہاز کا خزانہ تلاش کرنے؟ گولڈن گیٹ۔ ڈ۔

گیٹ، سنہری برج کا دروازہ کدھر کھتا ہے۔؟“

”کیا بک بک کرنے لگے۔ یا رالگے مینے تمہارا آپریشن ہے۔ کہیں اس خیال سے تو نہیں سوجھا؟“

”واہ وا۔ کمپیوٹر یار بن جانے، بن سوچے کتنے بے بات کر گیا!“

”لیکن تمہیں پس ہوتے۔“

”نان میس بھی نہیں۔ آپریشن ایک نہیں، دو۔ پیٹ ملے کے لیے دل کا بانی پاس کر دانا جو مقدمہ ٹھہرا۔ آدمی کے جگر

امبر، بلکہ اندر بھی کیسی بلائیں پیدا ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔ حج کا پتہ۔۔۔۔۔“

”پھر کہو گے میں فقط کمپیوٹر مفل۔ تیرا کمپیوٹر انجنیئر۔ تکنیک دیکھو، تمہارا سسٹم بھی تو ایک مشین ہے۔ اس کا ایک نہ ایک ٹرز تو کسی غراب ہونا ہے جس کی REPAIR بھی ہوتی ہے اور اگر سو کے فوری پلیسنٹ بھی۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔“

" THE END "

”وہ۔ وہ کس کا نہیں مائی ڈیئر۔۔۔۔۔ تمہارے شاعر نے وہ کیا کہا ہے، ع۔
اسے رد کر گزار دے یا ہنس کر گزار دے۔۔۔۔۔ التذہب پر بھروسہ رکھو، آپریشن کراؤ۔۔۔۔۔ اور اس سے
پیلے مصروف رہنے کے لیے بیاں پکڑو۔۔۔۔۔ پرومیتل جرنلزم کے علاوہ تمہاری۔۔۔۔۔ اسٹوری رائٹنگ۔۔۔۔۔
افسانہ نویسی کا پیرانا مشرق۔۔۔۔۔“

اس دوران کمال گرد و پیش کے مناظر دیکھتا جاتا تھا، کبھی ٹیلی فون ٹولیفین میں سے کبھی اس کے بغیر۔۔۔ وائس طرٹ
نفریاً گنتی پہاڑوں کا سلسلہ تھا جن پر کہیں کہیں نظر آتے درختوں کے ٹھنڈے برہمنوں کے سر۔۔۔ بوبو دیاسی دکھائی دیتے تھے
اور سنہری رنگ کی غمگی، مسد در پہاڑ ہاں عجب بس کمزور اور سنسنی خیز، دکش مناظر پیش کرتی تھیں۔

”ہاں افسانہ، یا کہانی، تم نے یہی کہا تھا نا؟ ہر فضا سے طرح طرح کی کہانی جنم لیتی ہے۔ درجہ ایک PLANET سے دوسرے پر ایک کم یا زیادہ، بھر مرلے کا اپرین کر دانا بے مزد ہو کر رہ جاتے۔ اسے کل یا خوش نصیبی کہہ لو۔“

”کل دل نہیں۔۔۔۔۔ تمہارے انجینیر ٹی نے بلایا ہے۔۔۔۔۔“

”انتخاب بر احسان . . . انتناکہ . . .“

”شٹ اپ۔ اس پر کافی بحث ہو چکی ہے تمہیں کیا معلوم کہ شاہد (کمال کا بیٹا) تمہارے بارے میں کتنا فکرمند ہے۔“ یہ کہتے ہوئے حامد نے اپنا دایاں ہاتھ میٹیل سے اٹھا کر (میٹیل بائیں طرف ہونے کے باعث) کمال کے مُتہ پر رکھ کر کھینچ لیا۔

”اپنی انیسویں پریشانی ضائع نہ کرو۔ آج تمہیں سان فرانسسکو لے جانے کا مقصد ’مرٹن‘ اس کا پتہ کرنا ہے۔ _____ سڑک والی کا!“

”کہانی کا بہت اہم کرکھڑ ہو گا میرے خیال میں۔“

[illegible]

”ہاں۔ سان فرانسسکو جیسی جگہ میں ضرور کام آئیں گے۔“

اب گاڑی ایک دادی سے دوسری میں داخل ہو رہی تھی۔ پہاڑیاں پہاڑی کر اُبھر رہی تھیں۔ اُن کی ڈھلانوں پر
نخون ٹھاکر، پرانی اور نئی آبادیاں پھیلی تھیں اور مرکز نظر آرہی تھیں جب کہ میدانِ علاقوں میں ٹاؤنز، ٹاؤن شپ یا قصبے، شہر
راہپن لورکسی، کسی "امریکن ڈریم" (A M E R I C A N D R E A M) کا اعلان بردار ہو، رنگ دکھائی دیتا جو بنیاداً بیوی

گھرا کر پرستش تھا۔ پھر اشتہاری کاؤ بوائے کی پسند گاہک راغب کرنے کی کسی بکاؤ چیز کی پیسٹی، کنٹوں کی دیکھ بھال اور مناسب غذا کے اشتہارات اور ————— ڈالر کی فصل اگانے کی چھوٹی ٹری سکیموں کے راستے میں گئے بورڈ مسافر کو متوجہ کرتے تھے کہ تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد سان فرانسسکو کے مضافات میں داخل ہوتے ہی دور سے سامنے دکھائی دیتی ایک بیس وعر لین چٹان پر جلی حروف میں یہ نام لکھا تھا جیسے کسی جتن نے کھجور یا ریڈ وود کے درخت کا ٹبرش بنا کر اس سے گھسیٹ سا دیا ہو۔ مضافات کی ایک طرف سان فرانسسکو پر بنا چڑانا آٹھ میل لمبا پل پہاڑی سلسلے کی جانب اور اُس کے برابر تقریباً ایک میل دور گولڈن گیٹ پرچ دکھائی دیتا تھا۔۔۔۔۔ اس وقت پہاڑوں کے پیچھے سے ٹری پائل جھانکنے لگے اور مضافات میں خنکی پیدا ہو گئی، کمال کو سردی محسوس ہوئی، اُس نے کیمبرہ گولڈن گیٹ پر زوم کیا، جس میں سے پہلے ہی پھر ایک لڑکی کی آنکھیں چپتے کی طرح گھورتی دکھائی دیں۔ — ایک میل لمبا، بے سنتوں، لوسے، سٹیل اور سینٹ کا بنا ٹرخی مائل شہری رنگ کا پل مگر چھ کی طرح منہ کھولے چلیج پر واقع ہے، جس کے ایک طرف چلیج کا عقب، آگے کھلا سفندِ خلا میں ختم دکھائی دیتا ہے۔ — کمال کو پہلی مرتبہ اس کی سالت سطح دیکھ کر ایک لحظہ دہشت محسوس ہوئی تھی، جب وہ اپنی بیوی، بیٹے اور گائیڈ ورت حامد کے ہمراہ پل کے آخر میں واقع ایک چڑھائی کے کنارے کھڑا تھا۔ — حامدان کا ایک گروپ اور ایک آدھ الفزادی فوڈز لے پایا تھا، جب کمال کے نیچے سے کیمٹم ایک پل کی آواز آئی تھی جو کمال کے پاؤں کے مرید اُدپر کو تک رہی تھی۔ سبز، پراسرار آنکھوں والی، چپتے کی طرح ٹھٹھکی باندھے، خاک کی اور سیاہ رنگ کی حامل پل کو دیکھ کر وہ سب حیران اور خوش ہوئے تھے۔۔۔۔۔ بسز کمال نے اُس کے سامنے ایک دو بسکٹ پھینکے تھے، لیکن شاید امریکن پل ہوتے ہوتے اُس نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔ — جب کمال نے ٹھیک کر اُسے پوچھا چاہا تھا، یہ چپک سے جھارپل کی طرف جاتی ہوئی ساملی چٹان کی پچھلڈی میں غائب ہو گئی تھی۔ — وہ پل آسامی تھی یہ ایرانی — جانے کس نسل کی تھی!

اس وقت چلیج کا پٹرول پیل کا پٹر اوپر سے گزرنے کی وجہ سے کمال کی توجہ منقطع ہو گئی تھی اور اُسے معاً گھاٹی پار، مچی کے قریب لگی دور بین میں سے چلیج کا نظارہ کرنا یاد آیا۔۔۔۔۔ بندر کشتی گاہ (MARINA) پر کھڑے جہاز، موٹر لائینس، بوٹ ریسٹورنٹ اور موٹل، بادبانی کشتیاں اور طرح طرح کی ٹیوبیں، جنہیں تیراک اٹھائے ہوئے تھے، ہوا کے زور سے پانی میں چل رہی تھیں، بھاگ رہی تھیں کشتی گاہ سے ہٹ کر، ایک جزیرے پر ALICUT عمر بھر قید کے مجرموں کی سابق جیل واقع ہے۔ — وہ GOLD FISH نامی دو منزلہ ٹورسٹ جہاز کے عرشے پر بیٹھے اس متروکہ گرتی ہوئی عمارت کے قریب سے گزرے تھے جس میں سے کسی مرد اور عورت نے جہاز کو ہاتھ پلائے تھے اس جیل کے ایک کونے کے ارد گرد اب بھی چرائی خارا زنا راور داغے پر عاید کردہ سخت سرکاری پابندی کی خلافت ورزی کرنے والے کو سزا دینے کے بارے میں نصب کردہ بورڈ دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ خوفناک جیل جس کے ۱۹۶۰ ع میں بند ہو جانے تک صرف پانچ قیدی اس سے فراہم ہو سکے تھے رکھیں جانے لگے کا کیا بنا تھا۔ — یہ تو خلیج کا پانی اور اس کی مچھلیاں ہی تباہ کنی تھیں تاہم

وہ جیسے سان فرانسسکو کی تاریخ اور معاشرتی روایت کا حصہ بن گئے تھے۔ کمال کو اس جیل کا ایک منظر PIER MARKET کے ایک برآمدے کے تختہ پر واقع "منٹ سٹوڈیو" میں نظر آیا۔ ایسا سٹوڈیو جو لاہور اور چھوٹے شہروں میں، بالخصوص پایا جاتا ہے اور جس میں کسی یا منظر لکھتے پردے کے سامنے سٹول پر بیٹھ کر کوئی گاؤں اپنی فوٹو اتر دیا کرتا ہے۔ مذکورہ نگرانی دیوار پر بھی اسی طرح ایک پردہ لٹکا رہا تھا۔ اس پر جیل خانے کی تصویر بنی ہوئی تھی جس کے آگے گتے کے ایک خاصے بڑے کٹ آؤٹ پر ایک لمبوس قیدی کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے سینے پر اس کا نمبر لکھا تھا۔ اس کا کوئی خیالی ملاقاتی اس کے پاس کھڑا ہو کر چند ڈالروں میں اپنی فوٹو اتر دیا کرتا تھا..... قیدی جیسے باہر، بیرونی آزاد دنیا کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہو۔ پھرے میں بند جیسے کسی جانور کی آنکھوں سے!۔

رنگارنگ کے نیم عریاں اور لمبوس، جوان اور بوڑھے، مرد، عورتیں چلتے چلتے ٹرک کر شہوانی جوش میں اگر ایک طرف
 کھڑے ہو کر بوس و کنار کرنے میں مصروف جڑواں کے پاس سے گزرتے ————— ساحلوں کے تھنے تھالے SCANDAL
 SHOES نامی دکان سے عورتوں کے جوتے خریدتے، اطالوی نان PIZZA اور بحری غذا، SEA
 Food جیسی چیزیں کھاتے، پینے والے شراب پیتے، فوڈ آؤٹ اور آؤٹوائے —————

سیاحوں کو بھیچے چور کر کمال اور اُس کا ساتھی دالپی کے لیے کار میں جا بیٹھے تھے اور فضا میں مٹرک کے کنارے بیٹھے ایک نوجوان حبشی فقیر کی خیرات کے لیے مسلسل نقارہ بجانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ————— حامد کو معایاد آیا کہ پچھلے ہفتے اُسے نمبرم کشی نگاہ کے قریب سے گزرتی مٹرک پر مرکنا پڑا تھا جب جیل پیری سی ایک لڑکی ایک گھاٹی سے انٹرکر مٹرک پاؤ کرنے لگی تھی۔ ————— کمال جو اس وقت بھی حامد کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا، نے لڑکی کو پہلے دیکھ کر روکنے کا اتنا رد کیا تھا کہ آلے رنگ کی بجنی (Bikini) پہنے مجتہ صورت، عجب حیرت انگیز گیواں رنگ کی لڑکی نے بڑی بے نیازی سے مٹرک پر قدم رکھا تھا اور فرماں فرماں چلتے اُسے راستہ دینے والی حامد کی کار کی سوار یوں کو، بقول کمال (Laser Beam) لیزر بمی، نظروں سے دیکھ کر مسکرا کر اگلے ٹکل گئی تھی۔ اُسے دیکھ کر منظر کمال نے نفرت آمیز نا پسندیدگی سے بے قابو ہو کر بے شرم ہنسا کہا تھا اور اس کے جواب میں کمال نے یہ برکتہ جواب دیا تھا "میڈم مختلف تہذیبوں میں ایک بنیادی فرق ہے، اس دوران کمال نے لڑکی کو بھیچے مٹرک کر اگلے چلتی گاڑی کی طرف یعنی خیزاندازیں ہاتھ ہلا کر جالتے دیکھا۔۔۔۔۔ جیسے وہ سان فرانسکو اور گوئلڈن گیٹ کی دیلی ہو۔۔۔۔۔ وہ جیل پیری ایک جیل سے دوسرے جیل کی طرف ————— (سان فرانسکو لے Bay) اور گوئلڈن گیٹ برج) ————— سرس کی کھلاڑی لڑکی کی مانند ایک پیٹنگ سے دوسری کی جانب مَجُور کر جاتی ہوئی دکھائی دی۔ ————— کمال کا تعقل بے قابو ہو گیا تھا، اس لیے اُس نے قدرے غصے سے سر جھٹکا اور لڑکی کے بارے میں نارمل انداز میں سوچا تو وہ اُسے اپنے زیر تکمیل افنانے کا اختتامی کردار محسوس ہوئی۔ ————— سبز آنکھوں والی اور نا اُمید، بے فوری نظروں والی جانی سے مربوط ایک متہ جس کے حل میں حامد، اس علاقے سے اچھی طرح واقف شخص مددے سکتا تھا، ————— کیا وہ لڑکی کوئی ایئر لیس تو نہیں تھی؟ ————— حامد سے بعد از اس بارے میں تجلیے میں استعفا رکھنے پر اُسے اس سوال کا یہ حصدا افزا جواب ملا تھا کہ مارکیٹ میں واقع "ہیلی وڈ سٹوڈیو" نامی دکان سے یہ عقدہ وا کیا جائے۔ ————— الگ ہفتے، دفتری چٹھی کے دن!۔

لہذا کمال اور حامد اب اکیلے دوبارہ سان فرانسسکو پہنچے اور انھوں نے مذکورہ دکان کا رخ کیا۔ — "ہالی وڈ سٹوڈیو" جہاں اس فلمی دنیا کے ہر یادگار دور کے منتخب فوٹو، اشتہارات، مساروں کی زندگی کے مطبوع حالات اور MASK وغیرہ نمک دیکھے اور خریدے جاسکتے تھے۔ چارلی چپلن، روڈ الف، الین کش، جان گلبیٹ، مے ویٹ اور کمارک گیبل۔ — "سرخوں" کے فوٹو، ہیریوز اور ہمدردوں کے فوٹو، ولنز اور سنٹ ایجنٹوں کے فوٹو۔ — پردہ پوشوں اور فلموں کے فوٹو۔ — دکان کا مالک حامد کا آستانہ پانچواں کمال کو ادھر لے گیا۔ اندرون مارکیٹ کے آخر میں نصب کردہ گھوڑ چکر "میری گوراؤنڈ"، (MERRY - GO - ROUND) کے قریب واقع وہ دکان تقریباً ہر سیاح اور غیر سیاح کے لیے بھی سنسنی خیز تجسس و کوشش کا ایک مخصوص مرکز بننے کے باعث خاصی پر رونق رہتی۔ حامد نے اس میں داخل ہو کر کاؤنٹر پر بکھڑے اس کے مالک سے باہمی سہولت کرنے کے بعد کماں کا تعارف کرایا۔ اس کے معنی اور سیاح ہونے کے پیش نظر دکان کا مالک انھیں عقب میں واقع اپنے دفتر میں لے گیا اور ان کی کافی سے خاطر تواضع کی۔ اس کے بعد حامد اور کمال بالخصوص متروخ الذکر نے گھاٹی سے اترنے والی ریل کی کے متعلق گفتگو شروع کی۔ — وہ ریل کی جو

بقلم امیر ایگزپٹس نقی

”ایجنٹس! گھاٹی! “ ماہک مکان نے لڑکی کے بارے میں فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں آنکھیں پھپھک کر قدرے اثبات میں سر ہلا کر میز کا ایک دروازہ کھول کر اس میں سے ایک البم میں گئے دو نیں فوٹو ٹکامیوں کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو نہیں کیا؟“

”بابکل۔ بابکل۔ وہی ہے۔ وہی ہے۔“

”ہاں ہاں!“

”لمیذا۔۔۔۔۔ نہیں یہ ایکٹریس نہیں۔۔۔۔۔ آفرز ہوئی ہیں، لیکن اُس نے ہر بار انکار کر دیا ہے۔“

”BAY اور BRIDGE اور باپ کو ————— بھڑنے کو تیار نہیں۔“

”کیوں؟ باب کیا کرتا ہے؟“

”لوگ اسے اس کی فطرت اور باپ کے باعث . . . مالک و کماندار نے راز دارانہ اور قدرے پُر خوف لہجے میں آگے بھجک کر کہا۔

”یار، تم گھبراؤ نہیں۔ تمھارا راز راز ہی رکھیں گے،“ حامد نے جواب دیا۔

”ہاں جناب۔۔۔۔۔ اپنا فقرہ مکمل کیجئے۔“ اس کی فطرت اور باپ؟

"یہاں اُسے WILD CAT " کہتے ہیں۔ اس کے پیچھے گا۔ وہ اکثر گالیتی

ہے۔ وہاں۔ باب کسی زمانے میں PIER پر کام کرتا تھا۔ اب ڈوس بٹ (HOUSEBOAT) رکھتا ہے اور ماں۔

نامیٹ کلب ————— ”مطلوبہ معلومات یہاں ختم کرتے ہوئے مالک دکان گھڑی میں مسلسل وقت دیکھ کر ایک لحفت اٹھ بیٹھا۔“
”بل کہاں سکتے ہیں؟“ حامد نے پوچھا۔

”MERRY-GO-ROUND“ پڑا بھی باہر دیکھ لو۔ آنے کا وقت ہو چلا ہے۔ ————— ”ورنہ تمھاری قیمت۔“
کمال کے لیے یہ کھیدی انکشافات تھے۔ اور ”ورنہ تمھاری قسمت“ بھی۔ ————— یہ یاد کر کے اس میں تحفہ جاسوس بیدار ہو گیا اور وہ حامد کو فوراً کچنی سے پکڑ کر دکان سے باہر نکلا۔

..... گھوڑ چڑکے قریب ہی آئے ”لیزر رہی“ آنکھوں والی لڑکی گاڑھے نیلے رنگ کی کچنی (BIKINI) پہنے ایک نوجوان کو، جو لجاجت آمیز لہجے میں اس کی ٹھوڑی دائیں ہاتھ سے چھو کر کچھ کہہ رہا تھا، ایک دم اُسے غصے سے پیچھے دھکیلتے دیکھا۔ جب موصوت اس کی طرف مجنونانہ انداز میں دیکھ کر جس کا ہاتھ پکڑنے لگا تو لڑکی نے اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس پر اس کا عاشق ننگا ننگا مخاطب زور سے چیخیں مارتا دہاں سے بھاگ نکلا اور لڑکی رکتے ہوئے تفریحی چڑکے ایک گھوڑے پر بیٹھ گئی جس پر یہ فوراً، جیسے اس کے ڈر کے مارے، چل پڑا: ————— اُس کے مالک نے اُسے دیکھ لیا تھا؟ کمال نے یہ تمام منظر قدرے محدود لیکن پر لطف اور تحسین انگیز یا باجب کہ حامد اس دوران میں کمال کی محویت کو غفلانہ سمجھتے ہوئے پائپ سلگا کر اُس کے لیے لمبے کش لگانے لگا۔ ————— اور داولڈ کیٹ (WILD CAT) گھوڑے پر بیٹھی تہمتہ لگاتی، اسے خیالی چاکب مارتی دوڑانے بھگاتے جا رہی تھی۔ ————— کمال اس دوران اس کا نظارہ کرتے ہوئے سوچنے لگا ”یہ کیا چیز ہے۔ اس سے کیسے بات کی جائے؟۔“ ————— کیا ردِ عمل ہو گا۔ کافی دلچسپ، ڈرامائی نوعیت کا کیریکچر ہے۔ ————— اس علاقے مان فرانسکو کی جان۔ ————— جان نہیں سہرٹ۔ ————— نہیں دیوی کہنا بہتر ہے۔ ————— ادھر وہیں اُس نے دیکھا، شاید پہچانا.....“ عین اس وقت ہی لڑکی نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ملایا اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ ”ابھی آئی“ کا اشارہ کر کے گئی ہے۔

”نہ۔ نہ۔ یہ کیس میری خوش فہمی تو نہیں؟“ کمال نے خود سے پوچھا۔ ————— لڑکی کے ہاتھ ملانے کے جواب میں نہ صرف کمال بلکہ حامد نے بھی ہاتھ ملایا۔ ————— پانچویں پچر پڑھ کر گئی۔ ————— کمال کی جانب دیکھتے ہوئے گھوڑے سے اُترتی اور جہنی سیدھی کھڑی ہوتی نیم سنجیدہ ہونے لگی۔ ————— حامد کمال کا تعارف کرانے کے لیے اپنی مخصوص خود اعتمادی سے آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوا، جب کہ کمال نے اُسے شائستگی سے سلام کرتے ہوئے اپنا کیمرا اُس کی طرف اٹھایا تاکہ اُس کا فوٹو اُتار سکے۔ وہ اس کا ایک فوٹو گھوڑے پر بیٹھے، پھلے کی طرح تہمتہ لگاتے اور داولہانہ انداز میں ہوا میں ہاتھ لہراتے آئین میں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس سے ملاقات کی یوں ابتدا کرنے کا سوچا ہی تھا، جب وہ دونوں اُس کے جب ردِ عمل پر چونک پڑے۔ کمال نے جب کیمرا اُس پر فوکس کر لیا تو اُس نے ہاتھ مکالمات کی طرف بڑھایا اور ہتھیلی کھولتے ہوئے کہا، ”سوڈا!۔“ کمال نے کھسکا ہوا کیمرا نیچے کرتے ہوئے پہلے حامد، پھر اُس کی طرف بغور دیکھا اور مسکرایا۔ —————

لڑکی نے وگ سپن رکھی تھی اور خاما گاڑھا میک اپ کیا ہوا تھا۔ قدرے بوٹھے قد اور خامے گھدرائے جسم کی حامل

ہوتے ہوئے اس پر دوسرے فقط اُنہیں میں برس احوال انہ اس کی عمر تقریباً تیس برس تھی آئی ہونے کا بھی گمان ہو جاتا۔ جیسے کمال کو گزشتہ ہفتے ہوا تھا۔

وہ ہتھیلی پھسلانے خاصہ مسکرائی لیکن کمال، نہ ہی حامد کا مقبت جواب پا کر وہ غصے سے یہ کہتے ہوئے انہیں راستے سے پرے ہٹا کر تیزی سے آگے نکل گئی۔ ”دس ڈالر کم دینے میں تو فرلو کے لیے ایک گھنٹہ بعد۔۔۔۔۔۔ (گھڑی دیکھ کر چار بجے گیٹ پر ملنا۔۔۔۔۔۔ گولڈن گیٹ پر!)“ اس کے جواب میں کمال نے جانے کیوں پھرتی سے اُس کی نشست کے ایک، دو سبب شاٹس لیے اور کیمیرے کا لینز ڈھانپ کر اسے کندھے سے لٹکاتے ہوئے عجب اطمینان سے حامد کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ لیکن حامد نے جانتے جانتے ٹرک کر کمال کو کندھے پر شاٹس بٹس بٹے ہوئے پوچھا:۔۔۔۔۔۔

”کیا خیال ہے؟ کیا اب برج پر جا کر محترمہ کا کلوز اپ نہ لیا جائے؟ اُس کے معقرہ و فتنہ تک آدھ لوٹن گھنٹہ کہیں کافی جیتے ہیں، کہیں؟“

”کہیں نہیں۔ راستے میں کھڑے کھڑے تمہیں کافی بھی یلاؤں گا، برگر بھی کھلاؤں گا۔ کمال نے خوش ہو کر جواب دیا۔ اور حامد کو ساتھ لے کر کافی مثال کی طرف مڑ گیا۔۔۔۔۔۔ جب حامد نے اُس سے چلتے چلتے پوچھا کہ آیا وہ تازہ دم ہونے کے بعد گیٹ پر جانا چاہتا ہے تو کمال نے حتمی طور پر جواب دیا: ”مٹھارا تردد اور میرا تجسس تقریباً ختم!“

”یعنی اب اس کا تعاقب نہیں کرنا اور نمٹاری کہانی دہائی کا ای، این، ڈی (END) ہو گیا!“

”فقط آخری ٹچ۔۔۔۔۔۔ کہتے کہتے اور بقول غالبؔ ”آنے ہی عنیب سے مضامین خیال میں“ کہتے ہوئے کمال نے کافی کا آخری گورنٹ پیتے ہوئے برگر کا باقی ماندہ ٹیڑا امنہ میں ڈال کر حامد کے ہمراہ گاڑی کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

اگلے روز صبح اس کہانی کا آخری ٹچ اخبار میں چھپی اس سنسنی خیز خبر نے فراہم کر دیا کہ گزشتہ رات ایک نوجوان نے گولڈن گیٹ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ پولیس کی ابتدائی معلومات کے مطابق یہ ناکام محبت کا نتیجہ تھی، کیونکہ لڑکے کو چار پانچ مرتبہ ایک لڑکی، جو مقامی بتائی جاتی تھی، کے ساتھ برج اور اس کے قریب ایک گھاٹی پر گھومتے پھرتے دیکھا گیا تھا۔ لڑکا کسی غیر ملکی ڈانس ٹرپے میں کام کرتا رہا تھا۔

..... دوپہر کو نہ صرف کمال بلکہ حامد کو بھی یقین کی حد تک شک تھا کہ مذکورہ لڑکا اور لڑکی کون تھے ایک

WILD CAT دوسرا اس کا عاشق جس کے منہ پر اُس نے گزشتہ دوپہر کمال اور حامد کے سامنے تھوکا تھا۔

ہالی وڈ سٹور کے مالک نے مقامی ریڈیو پر نشر شدہ مزید خبر کی بناء پر اس کی تصدیق کر دی۔ علاوہ ازیں WILD CAT

اور اسے بھی شامی نفیث کر لیا گیا تھا۔

”کمال۔ یاد تم نے تو صرف کمال ہی نہیں بہت کمال کر دیا تھا وہی لڑکی اور وہ لڑکا۔۔۔۔۔۔ آخری ٹچ!“

”ہاں کہانی کا آخری ٹچ یہ کمال نے فن بند کرتے ہوئے عجب اطمینان کا سانس لیا۔ (۱۵ اگست ۱۹۹۸ء، سان جونز، کیلیفورنیا)

ہسٹری شیٹرز

احمد شریف

ایک روز وقار کا ٹیلی فون آیا، کہنے لگا:
”ڈنر کا دعوت نامہ بھیج رہا ہوں، ضرور آنا۔“

میں نے پوچھا:
”کیسا ڈنر؟“

کہنے لگا:

”تیرے چیتے آتے ہوئے ہیں، چینی۔ ان کی دعوت ہے۔“

ان دنوں چین سے لکھنے والوں کا ایک وفد پاکستان کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ میں نے ہامی بھری۔
اسی شام ایک آدمی دعوت نامہ لے کر آیا تو پتا چلا کہ ڈنر کی نوعیت سراسر سرکاری تھی۔ میرا خیال تھا عام سی
دعوت ہوگی جہاں دونوں ملکوں کے لکھنے والے بیٹھ کر اپنے دکھ سکھ بانٹ لیں گے۔ ڈنر کا انتظام فارن آفس کی
بلڈنگ شہزاد میں کیا گیا تھا۔ وہاں سے رات گئے واپسی پر سواری کا ملنا دشوار تھا۔ پہلے تو جی میں آئی معذرت کر کے
جان پھڑالوں۔ پھر چینیوں سے مل بیٹھنے کا شوق غالب آ گیا اور میں چپ ہو رہا۔
ڈنر کا سارا دن تیاری کرتے گزر گیا۔ میں نے وقت سے پہلے پریس بند کر کے کاریگروں کو ٹھپٹی دے دی اور
دفتر میں آ بیٹھا۔

شام ہوئی تو بادل گھر کر آ گئے۔ بادلوں کے ساتھ ساتھ کرسٹی آوار د ہوئی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا
کہ ڈنر میں نہ جانے کے اسباب خود بخود پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ کرسٹی نے دروازے میں رک کر میری سچ دیکھی اور
چوکھٹ سے لگ کر پوچھنے لگی:

”کہاں جا رہے ہو؟“

میں نے کہا:

”اسلام آباد“

پوچھنے لگی:

”کیوں؟“

میں نے کہا :

”ڈنر کھانے۔“

وہ جلدی سے میری طرف بڑھی اور آدھی پونی مجھ پر ڈھیر ہوتے ہوئے اٹھلائی :

”میں بھی جاؤں گی۔“

میں نے حیرت سے کہا :

”تم !“

اس نے بغور میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی :

”تمہاری بیوی کو باہر سے واپس کر دیں گے ؟“

میں خاموش رہا۔ اس نے پرس سنبھالا اور ہلک کر اٹھتے ہوئے بولی :

”چلو۔“

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ بازار میں آئے تو میں نے گرد و پیش سے نظریں چرائیں۔ وجہ یہ تھی کہ کرسٹی کی ہمارا ہی میں لوگ کرسٹی کی بجائے اس کے ساتھ جانے والے کو زیادہ معنی خیز نظروں سے گھورا کرتے تھے۔ راستے میں آکر اس نے پوچھا :

”جائیں گے کیسے ؟“

میں نے کہا :

”ویگن سے۔“

اس نے سر ہلایا اور کہنے لگی :

”ٹھیک ہے اب پارے سے آگے سیر کرتے چلیں گے۔“

ویگن میں سوار ہوتے وقت وہ آگے ہی آگے لپک کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے اسے اور اس نے ڈرائیور کو بھرپور نظروں سے تولا۔ پھر وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ میں ابھی نئی صور حال کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سنٹرل ہسپتال کے پاس آکر اس نے ویگن رکوائی اور اترتے ہوئے بولی :

”میری سیٹی بیار ہے اسے تسلی دے آؤں۔“ پھر پوچھنے لگی : ”تم کب واپس آؤ گے ؟“

میں نے کہا :

”نوساڑے نو بج جائیں گے۔“

کہنے لگی :

”میں گیٹ پر انتظار کروں گی۔“

میں نے یوں ہی پوچھا :

”کب تک؟“

وہ مسکرا کر بولی :

”صبح تک۔“

اور پرس بھلاتی ہسپتال کی طرف چلی گئی۔

سارا راستہ بادل گرج گرج کر ملکان ہوتے رہے۔ بجلی چمکتی تو آنکھیں خیرہ سی ہو جاتیں۔ بارش سنگل پر رُکے نوجوان سکوتر سوار کی طرح پر تو لے کھڑی تھی۔

آب پارہ پیچھے تو بارش چھا چھم بہنے لگی۔ میں نے دُور ہی سے ٹیکسی والے کو آواز دی :

”شہر زاد!“

اس نے دروازہ کھول دیا۔ چلنے لگے تو میری نظر ایک غیر ملکی پر پڑی۔ وہ سٹینڈ پر ہولفتوں کی طرح کھڑا

بھیک رہا تھا۔ میں نے پوچھا :

”کہاں جاؤ گے؟“

کنے لگا :

”برٹش ایمبسی۔“

میں نے اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا :

”چلے آؤ۔“

وہ لپک کر میرے برابر آ بیٹھا۔ میرا خیال تھا وہ میرا شکریہ ادا کرے گا۔ میں اپنی فراخ دلی کا مظاہرہ کروں گا اور بات اس کے حسب نسب تک جا پہنچے گی۔ لیکن وہ گم صم بیٹھا ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ وہ سچ مچ روایتی انگریز تھا اسے اپنی جگہ کچھ جتانے کی فکر تھی۔ میں اپنی جگہ کچھ بچانے اور کچھ سمجھانے کی خاطر چپ بیٹھا رہا۔ راستے میں آکر اچانک اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ میری طرف بڑھایا اور کہنے لگا :

”میرا نام فریڈی ہے — مائیکل فریڈی۔“

میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا اور اپنی جگہ دیک کر بیٹھ گیا۔

بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔

شہر زاد پیچھے تو میں نے برٹش ایمبسی تک کا کرایہ ادا کر کے ٹیکسی والے سے کہا :

”اے برٹش ایمبسی چھوڑ دینا۔“

فریڈی نے مجھے روکا اور کہنے لگا :

”اپنا کرایہ ادا کر دو، آگے میں دے دوں گا۔“
میں نے چلتے چلتے اسے اپنا پتا بتایا اور کہا،
”اپنا کرایہ میرے نام منی آرڈر کر دینا۔“
وہ اپنی جگہ کھمسا کر رہ گیا۔ اسی اثنا میں ٹیکسی روانہ ہو گئی۔
کئی روز بعد کا ذکر ہے۔

ایک رات میں کلب پہنچا تو کرسٹی مجھے دیکھ کر لپکتی ہوئی میری طرف آئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے ساتھی
کی طرف اشارہ کر کے بولی،
”تو اسے قابو میں رکھ، میں ایک اور کوسٹی دے آؤں۔“
کرسٹی سب کوسٹیاں دیتی صدر کی سڑکوں پر گھوم پھر کر جوان ہوتی تھی۔ اس کا انداز ہر ایک سے
ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کا بزنس پارٹنر ہو۔ میں نے پوچھا،
”دوسرا کون ہے؟“

کہنے لگی،
”ہے ایک گرینڈ پا۔ شام سے ساٹے بوٹلی میں کروٹیں بدل رہا ہوگا۔“
وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے اس کے ساتھی کی طرف دیکھا وہ فریڈی تھا اور اپنی جگہ بیٹھا پہلو بدل
رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس پر بڑھا پاٹوٹ کر طاری ہو گیا تھا۔ کالوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ آنکھیں گھٹی
بھنوں کے نیچے مندی جا رہی تھیں۔ میں نے اسے مخاطب کیا،
”ہیلو۔“

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا،

”ہیلو!“

اور مجھے پہچان لیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی مسخیدگی سے پوچھا،

”منی آرڈر مل گیا تھا؟“

مجھے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ اس نے شہزاد سے برٹش ایمبسی تک کا کرایہ مجھے منی آرڈر
کیا ہوگا۔ مجھے کوئی منی آرڈر نہیں ملا تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا،

”مل گیا تھا۔“

اس نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دُور ہوتی کرسٹی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا،

”میں نے بھیجا ہی نہیں تھا۔“

اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ کرسٹی اپنے آس پاس قیامت سی جگاتی باہر نکل گئی۔ میں نے فریڈی کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا ”ٹیکسی والے نے بھیجا ہو گا۔“

ہم دونوں ہنس پڑے۔ اجنبیت کا حامل پردہ ہٹا جا رہا تھا۔ فریڈی بولا : ”تمہاری عورتیں بہت اچھی ہیں۔“

میں ہنسا اور ہنس کر کہا :

”ہماری کہاں، تمہاری ہیں، جن کو تم جاتے ہوئے ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے۔“

میں اس سے کیا کہتا۔ اپنی سچی تجو کے باوجود ہم آج تک اپنی عورتوں کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ میں نے پوچھا : ”سیر کے لیے آتے ہو؟“

کہنے لگا :

”ہاں سیر ہی سمجھو۔ میں استعفا دے کر آیا ہوں۔“

میں نے اس کے قریب ہو کر دلچسپی ظاہر کی :

”اچھا!“

وہ بولا :

”میں اپنی کا دنٹی کالج تھا۔ میرا بھتیجا بڑا حرامی ہے۔ ایک روز ریپ کے کیس میں پڑ گیا تھا۔ اسے میری عدالت

میں لایا جانا تھا۔ میں نے چپکے سے استعفا دے دیا۔“

اس کے بھتیجے کے حرامی ہونے اور اس کے استعفا دینے کی بات میری سمجھ میں آگئی لیکن راز نہ کھلا کہ وہ یہاں

کیا کر رہا تھا۔ میں نے داستان جاری رکھنے اور بات آگے بڑھانے کی خاطر ہنسکا رہا تھا :

”پھر؟“

وہ بولا :

”میری جگہ ایک اور جج کا تقرر ہو گیا۔ میں نے سوچا میرے اثر و رسوخ کی وجہ سے نئے جج کو میرے بھتیجے کا

کیس نمٹانے میں دشواری ہوگی۔ میں جہاز میں بیٹھا اور وقت گزارنے یہاں چلا آیا۔“

میں نے حیرت و استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔ فریڈی پتا نہیں کیا جج تھا!

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہماری عدالت میں ایک تاریخی مقدمہ سنا جا رہا تھا۔

بے تقنی کا غداہ

غلام الثقلین نقوی

وہ چھوٹی سی بستی ایک وادی میں واقع تھی اس کی مٹی بہت زرخیز تھی ذرا نرم ہوتی تو اس سے دودھ اور شہد کی نرہیں بہ نکلتیں اس کی ندیاں قریب کی ایک سرسبز پہاڑی سے آتی تھیں جگہ جگہ بیوٹے ہوئے صاف شفاف پشے ان ندیوں کو کبھی مردم آب نہ ہونے دیتے اس پہاڑی پر جھاڑیوں کے جھنڈ تھے کہ جن میں شہد کی مکھیاں بے شمار چھتے ڈالیتیں اور خود رو پودے تھے کہ جن کے پھولوں سے وہ رس، چوسیتیں۔ گلتا جیسے یہ پھول نہ ہوں بلکہ ننھی ننھی کنور باں ہوں کہ جن میں شہد بھرا ہوا ان لوگوں کی گامیں اتنا دودھ دیتیں کہ گھر کے سارے برتن دودھ سے بھر جاتے اور دھار نہ ٹوٹتی۔

جن لوگوں نے اس بستی کو آباد کیا تھا وہ اللہ کے بہت شکر گزار بندے تھے ٹھنڈا پانی پیتے تو ایک ایک گھونٹ میو سوبارا اللہ کا شکر ادا کرتے دودھ اور شہد کے ساتھ ساتھ کیہ بوں کی نرم نرم سفید روٹی کھاتے تو ان کی شکر گزاری کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنی ضروریات کو بہت محدود رکھا تھا نہ پتھروں سے ادبے ادینے بے مصرف عمل بناتے نہ ریشم و کم خواب کے لباس پہنتے۔ ان کی اگلی نسل نے کچھ اسراف و تبذیر سے کام لینا شروع کر دیا تھا وہ دودھ، شہد اور گیہوں پر فاعیت نہ کرنے اور دوسری بستیوں سے کچھ ایسی چیزیں بھی خریدنے لگے کہ جن کے بغیر بھی ان کے آباؤ اجداد بڑی آسائش کی زندگی گزار گئے تھے اور جن سے عیش و عشرت کی اہلیں کھلنے لگی تھیں چنانچہ ان کے مکانات میں دست پیدا ہوئی، فرش بکے ہوئے اور یکے فرشوں پر قالین بچھنے لگے جن مکانات میں کبھی لگی اور تیل کے دئے جلتے تھے، وہاں اب قندیلیں اور جھاڑ روشن ہونے لگے

اور ان کی اگلی نسل میں سامان تعیش کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے مسابقت شروع ہو گئی اور وہ اپنے مکانات کی دست اپنے خوبصورت ساز و سامان اور درو دیوار کی آئینہ بندی پر غرور و مباہات میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ ان میں جو بڑے تھے، اُنہوں نے پھولوں کا حق مارنا شروع کر دیا جو تا جبر تھے، وہ نفع اندوزی کا شکار ہو گئے اور جو حاکم تھے وہ رشوت لینے لگے۔

اس نسل کا ایک آدمی کہ جس کی عبادت و زہد کا چرچا تھا جو سال کے تین مہینے سرسبز پہاڑی کے ایک غار میں مصروف صوم و سلوٰۃ رہ کر گزارا کرتا تھا اور باقی نو مہینے اپنی بستی کی مجلسی اور مذہبی زندگی میں جوش و خروش سے حصہ لے کر بسر کرتا تھا اور ایک خوشحال گھرانے کا سربراہ ہونے کی وجہ سے جسے بستی میں عزت و احترام کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا اس صورت حال پر بہت کڑھتا تھا لیکن خاموش رہتا تھا کہ ابھی اُسے اپنے اندر سے اظہار کا آون نہیں ملا تھا۔

تب ایک دن جب وہ منبر پر بیٹھا اچانک اس کی زبان رواں ہو گئی اس نے بستی کے اپنی اصل سے انحرافی رویے کے خلاف فصاحت و بلاغت کے دریا بہاویے اس کے غفلوں میں آگ تھی کہ پتھروں بھی پچھل گئے لیکن وہ لوگ جو اس انحراف کے ذمہ دار

تھے، اس سے ناراض ہو گئے اور بازاروں میں اور چوراہوں پر اُسے برا بھلا کہنے لگے۔

وہ غار میں چلا گیا کہ غور و فکر اور مراقبے سے اپنے عزم کو راسخ بنائے اور اس کی عدم موجودگی میں بستی کے سب سے بڑے آدمی نے ایک دوسری بستی سے کہ جس کی عورتیں اپنے حسن و رعنائی میں مشہور تھیں، ایک عورت سے شادی کی اور اس نے مطالبہ کیا کہ گھر میں اس کے لئے عبادت گاہ بنائی جائے کہ جہاں وہ اپنی بستی کے دیوتاؤں اور دیویوں کے بت سجائے، ان میں کچھ بت عریاں تھے اور بت گردن لے دیوی دیوتاؤں کی محبت کو اس طرح کا جسمانی ملاپ دیا تھا کہ بستی کے نوجوان اُن پر فریفتہ ہو گئے۔

تب گھر گھر میں بت بننے لگے اور انہیں تہذیب و تمدن کا لازمہ قرار دے دیا گیا۔

اور جب وہ شخص غار سے لوٹا تو اُس نے دیکھا کہ اس کے گھر کے سب سے کشادہ کمرے کے آرائشی آتش دان کی کارنس پر دو بت رکھے ہوئے ہیں، وہ پہلے حیران ہوا پھر اس کا غضب آتش فشاں کی طرح پھٹا۔ اس نے ہتھوڑا اٹھایا اور بتوں کو پاش پاش کر دیا اس پر غصہ ٹھنڈا نہ ہوا، تو کھڑوں کو پاؤں تلے سسلنے لگا۔

اس کے پہلو نیچی کے بیٹے نے پوچھا ”بابا! تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں اپنے گھر کو بت کردہ بنیں بننے دوں گا۔“ اس نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”بستی کا کون سا گھر ہے جس میں یہ بنگدہ موجود نہیں؟ اُس کے بیٹے نے کہا اور اُس کے لمبے میں سر دھری کی برف تھی۔

اس کے غصے کی آگ اچانک بجھ گئی جیسے اس پر برقیلا پانی پڑ گیا ہو۔

”تب میں ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا۔“ اُس نے مایوسی کے لمبے میں کہا اور دروازہ گوش پر پھر سے پالان کئے لگا۔

اس نے ایک ایک بیٹے کے چہرے کو پڑھا، کسی چہرے پر اُسے وہ تحریر نظر نہ آئی جو دامن پکڑ لیتی ہے اس کی بیوی نے آنکھیں پیرالیں صرف اُس کی بیٹی نے جو ابھی ناکتہ تھی اور جس سے اُسے بہت محبت تھی، آنکھ میں آنسو بھر کر اس کا دامن پکڑنے کی کوشش کی اُس نے دل پر تہر کر کے دامن چھڑایا۔

اس لڑکی نے اُس کے خالی گوشہ دان کو کھانے سے بھر دیا۔

اُس نے سر سبز بہاری کے غار میں پناہ لے لی۔

اُسے بستی چھوڑنے کا افسوس ضرور تھا لیکن ابھی وہ بستی دانوں سے مایوس نہیں ہوا تھا کہ اس کے دل میں امید کی روشنی برقرار تھی

اور امید محبت کو زندہ رکھتی ہے

اسے اُن پر غصہ تھا کہ جو باشعور ہو کر بھی شعور کو چپکے تھے لیکن اُن سے بیار تھا جو ابھی شعور کی منزل پر پہنچے تھے اس زمرے میں

اُس کی بیٹی بھی داخل تھی اور انہیں وہ ہر صورت میں اللہ کے غضب سے بچانا چاہتا تھا کیونکہ ان میں اصلاح کی تابعداریت موجود تھی۔ چنانچہ وہ ان کے لئے خدائے لایزال سے استغفار کرتا رہا، اُس نے سخت مجاہدہ بھی کیا اور مجاہدے کا مقصد یہ تھا کہ اس کے اندر ایمان کی وہ قوت پیدا ہو جو شر سے ٹکرا کر اُسے پاش پاش کر دیتی ہے۔

”جب بھی میں نے محسوس کیا کہ یہ قوت میری روح میں جنم لے چکی ہے، میں بستی میں واپس چلا جاؤں گا۔“

پھر ایک دن اُسے اپنے اندر سے آواز آئی کہ اے شخص! تیرا مجاہدہ مکمل ہو گیا ہے وہ غار سے نکلا اس کا دراز گوش غار کے دہانے کے قریب سبزہ چر رہا تھا۔ اس نے اُس کی پشت پر پالان کسا اور خوش خوش اس چمڑی پر ہویا جو پہاڑ سے اتر کر وادی میں داخل ہو جاتی تھی۔

جب وہ بستی کے قریب پہنچا تو وہ سوچنے لگا کہ میں کہیں رستہ تو نہیں بھول گیا یہ کون سی بستی ہے، جہاں میں آ پہنچا ہوں۔ یہ تو شہر خوشاں ہے کہ جس کی گلیاں جامداروں سے نہانی ہیں اور دختوں پر کوئی پرندہ موجود نہیں۔ پوری بستی اپنی چیتوں پر ڈھے کر گری پڑی ہے اور ہر گھر کی دلیز پر کسی لاش کا ڈھانچا پڑا ہے۔ تب ایک خیال بلی کا کوندا بن کر پیکا۔

وہ بستی جس کے لئے اس نے غار میں مسلسل استغفار کیا تھا وہ عذاب الہی میں گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو چکی تھی یہ اس کی اپنی ہی بستی تھی جس کے ایک گھر میں اس کے بیوی بچے رہتے تھے اس کی بیوی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہوا۔ اس کے بیٹے صحن میں چلنے پھرنے لگے اور وہ بیٹی جو اُسے بہت عزیز تھی اور جس نے آنکھ میں آنسو بن کر اس کا دامن کھینچا تھا، بلبلی کی طرح چپکنے لگی، تو اس کا سینہ غم داندہ سے بھر گیا۔

”تم لوگ کہاں گئے؟“ اس نے چلا کر کہا۔

اس کی آواز بستی کے کھنڈروں میں گونج گونج کر شہر خوشاں میں غرق ہو گئی تو اس کا سینہ پتھر کا اور اس کا دل سیسے کا بن گیا وہ آنسو جو اس کے حلق سے گزر کر اس کی آنکھ تک پہنچا تھا ٹپک نہ سکا اور وہیں پتھر اکر رہ گیا۔ اُس نے اللہ سے کوئی شکایت نہ کی۔

ابستہ اس کے دل میں ایمان کا نور بجھ گیا اور آنکھوں میں بے یقینی کا اندھیرا چھا گیا۔

اس نے سوچا یہ بستی جسے بابل و نینوا کے ایک تاجر و جابر بندے تخت نصر نے تباہ و برباد کیا ہے، اب اللہ بھی چاہے تو ایسی دیرانی کے بعد اسے آباد نہیں کر سکتا۔

وہ دراز گوش پر سوار ہو کر غار میں لوٹ آیا۔

اُس نے پتھر کے تیکے پر سر دکھا ہی تھا کہ اُسے نیند آ گئی

جب وہ جاگا تو اُس نے اپنے آپ سے پوچھا میں ایک پورا دن سویا یا اُس سے کم؟ وہ آنکھیں ملتا ہوا غار سے باہر نکلا۔

غار کے دہانے پر اس نے اپنے دراز گوش کا ڈھانچا دیکھا کہ جس پر گوشت پوست نام کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے ہڈی کو ہاتھ لگایا تو وہ خاک بن کر بھر گئی۔

تب غیب سے آواز آئی۔ اے شخص! اپنے دراز گوش کو پکارو۔ اس نے دراز گوش کو آواز دی تو ہڈیوں کے ڈھانچے پر گوشت پوست چڑھنے لگا۔ چشم زدن میں دراز گوش اس کے پہلو میں کھڑا تھا اور اس پر پالان بھی کسا تھا۔ وہ اُس پر سوار ہو گیا۔

جو بنی پگڈنڈی بل کھا کر وادی میں اتری، اسے یوں لگا جیسے کوئی جادو کا شہر اچانک وجود میں آ گیا ہو ایک بہت ہی آباد شہر کہ جس کی عمارتیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں۔ پگڈنڈی اچانک ایک وسیع و عریض شاہراہ میں گم ہو گئی جو اس شہر کی طرف جاتی تھی اس پر عجیب و غریب سواریاں طوفانی ہوا سے بھی زیادہ تندہی و تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں کہ اس کا دراز گوش مسلسل کانپ رہا تھا اور یہ کپکپاہٹ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے منہ کو بھی مرتعش کر رہی تھی اور ایک عجیب سا خوف اس کی رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

سڑک کے کنارے اسے پہلا آدمی جو نظر آیا اسے روک کر اس نے پوچھا "بتا سکتے ہو کہ اس بستی کا نام کیا ہے؟" اُس کسے کسے چہرے دسے نے اُسے بوں دیکھا جیسے وہ اس کی زبان نہ جانتا ہو وہ سڑک کے کنارے کنارے جلتا رہا۔ کسی آدمی نے اُس کے سوال کا جواب نہ دیا۔

"یہ عجیب شہر ہے جو مسافروں کی میزبانی تو کیا رہنمائی بھی نہیں کرتا۔" دراز گوش تھک کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کی پیٹھ سے اتر کر اس کے ساتھ نیک لگا کر کھڑا ہو گیا

تب بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہو کر وہ فرش زمین پر بیٹھ گیا اور پاس سے گزرنے والے کسی انسان نے اُس کی دلداری نہ کی اس نے ہر گزرنے والے چہرے کو غور سے دیکھا۔

اُسے ہر چہرہ ایک جویرہ نظر آیا کہ جس میں کسی اور کو در آنے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی آنکھ میں اُسے کسی دوسرے چہرے کا عکس دکھائی نہ دیا جیسے وہ اپنی دنیا آپ ہو بے لگائی، غیریت، شک اور گمان کی بھر دینا۔

اعتماد اور یقین سے خالی تنہا تنہا چہرہ، اپنے ہی کرب کا شکار بے یقینی کے سلگتے ہوئے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا تھا اس نے کسی کسی چہرے کے ہوٹ پر ہنسی کی لیکر بھی دیکھی لیکن جب وہ ہونٹ سے آنکھ میں اترتی تو کرب و اذیت کی غریب بن جاتی۔ ہر چہرہ "بھانپتا تھا ہر آنکھ بے نور تھی

کیونکہ وہ جو نور کا سرچشمہ ہوتا ہے اور جسے دل کہتے ہیں اب یقین اور ایمان کی روشنی پیدا نہیں کر رہا تھا۔

اس نے ایک ایک آنکھ میں جھانک کر دیکھا ہر آنکھ میں اُسے خوف کا سانپ کندلی مارے بیٹھا نظر آیا۔

اس نے مقدس کتابوں میں پڑھا تھا کہ قیامت کے روز ایسا ہی خوف ہر آنکھ میں ہو گا اور اُس وقت کوئی کسی کا لگانہ نہیں ہو گا ہر کوئی نفسا نفسی کا شکار ہو گا۔

اس بستی پر یقیناً عذاب نازل ہونے والا ہے۔

وہی عذاب جو اس بستی پر آیا تھا جس کے کندھروں پر یہ بستی آباد ہوئی ہے۔

اس کے اپنے دل میں بھی خوف کا آتش فشاں سلگنے لگا تو وہ اچانک دراز گوش کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس کا منہ غار کی طرف موڑ کر اُسے ہمیز لگائی دراز گوش بگٹ بگٹ دوڑنے لگا کہ جانور کا اپنا خوف بھی اسے ایڑھی لگا رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ وہ پگڈنڈی جو پہاڑی پر چڑھ کر بل کھاتی ہوئی اس کے غار کی طرف جاتی تھی، اچانک غاب ہو گئی ہے۔

تب غیب سے ایک آواز آئی:-

اے شخص! تو میرے عذاب پر اتنا غضب ناک ہوا کہ تیرا آنسو تیری آنکھ میں آکر پھر بن گیا میری بے نیازی کو اس سے کچھ گلو نہ
 ہوا لیکن جب تو نے بے یقینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب اللہ چاہے بھی تو اس اجڑی بستی کو آباد نہیں کر سکتا میں نے تجھے موت دی
 اور پھر زندہ کیا تو نے اجڑی ہوئی بستی کے کھنڈروں پر نئی بستی آباد دیکھی..... اور اب تیری بے یقینی کی سنرا یہ ہے کہ تو اس بستی میں اکیلا رہے گا۔
 جو وہی آواز خاموشی کے سمندر میں ڈوبی اس کا دروازہ گوش زمین پر گرا اور گرتے ہی راکھ ہو گیا۔
 اس نے پہاڑی کی چوٹی کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا جہاں وہ غار تھا جس میں انسانوں سے بھاگ کر اسے عافیت ملا کرتی تھی لیکن
 اس تک جانے والی پگڈنڈی گم ہو چکی تھی
 اس نے مڑ کر خوف کی نٹھوں سے شہر کی طرف دیکھا کہ جس کی بلند و بالا عمارتیں آسمان کی خبر لارہی تھیں اور جہاں رات کو بھی
 ن کا سماں ہوتا تھا لیکن وہاں ہر آدمی "تنہا" تھا اور اُسے بے یقینی کے عذاب میں مبتلا کر دیا گیا تھا
 اور اب قیامت تک وہ ان کے عذاب میں شریک بھی تھا اور تنہا بھی۔ اس نے آسمان کی طرف ایک نظر دیکھا۔
 اور سر جھکا کر کہا۔ "مجھے تیرا یہ عذاب دل و جان سے قبول ہے"

پھاڑوں کی کہانیاں

جوگندر پال

(۱)

میں اپنی محبوبہ کو بھگا کر پہاڑوں میں لے آیا تھا اور یہاں ہمارے سارے راستے میں موڑ ہی موڑ تھے۔ ان موڑوں پر راستہ کبھی جھک جاتا تو ہم خوشی سے لپک کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے لیکن تھوڑے فاصلے پر ہی وہ اپنی پیٹھ پھر سیدھی کر لیتا اور ہم نیچے بہک کر پھر اپنے پیروں پر لڑکھڑانے لگتے۔ آخر اوپر اٹھتے ہوئے ایک اور موڑ پر ہماری سانس پھولنے لگی اور ہم وہیں بیٹھ گئے اور تھکن سے ہمیں ہوش بھی نہ رہا کہ ہمارا راستہ ہمیں وہیں چھوڑ کر اپنی دُھن میں بدستور مُڑ گیا ہے۔

”تھک گئے ہو؟“ ایک پہاڑی بوڑھا نہ جانے کہاں سے وارد ہو گیا۔

”ہاں بابا! اتنے موڑ ہیں کہ دم ٹوٹ گیا ہے۔“

بوڑھا مسکرانے لگا ”پہاڑوں میں یہی تو ہوتا ہے۔ ہنستے کھیلتے مڑتے جاؤ گے تو کسی موڑ پر ایک دم گھر کے سامنے جا کھڑے ہو گے۔“

(۲)

”پراچین کال میں رشی مہی اپنا وقت آتے ہی پریتوں کی اور کیوں ہو لیتے تھے؟“

”اس لیے کہ پریت آگے بڑھ کے جھٹ اُنھیں اپنی اوٹ میں لے لیتے تھے۔“

(۳)

جب ہم اپنی پہاڑی مہم پر روانہ ہوئے تو ہمارے ساتھ ڈھیروں سامان تھا۔ ایک خاص اونچائی تک تو ہم اپنا سارا سامان لے آئے مگر یہاں سے اوپر جانے کے لیے ہمیں نصف سامان ہمیں چھوڑنا پڑا۔ آگے جا کے ہم اپنا یہ نصف سامان اٹھانا بھی دُوبھر ہو گیا اور ہم نے اس میں ایک چوتھائی اور کم کر دیا۔ مزید آگے ہمیں اپنا سارا بقیہ سامان چھوڑ دینا پڑا اور اس طرح سبک ہو کر ہم اپنی مہم کی تکمیل میں جٹ گئے۔

پھر کافی اونچائی پر آکر ہمیں محسوس ہونے لگا گیا ہم میں سے ہر ایک ابھی تک بڑے بھاری سامان سے

لدا ہوا ہے۔

ہمارے لیڈر نے ہمیں یکجا کر کے مسکراتے ہوئے مانواپنے آپ کو بھی بتایا "اگر ہم اپنا سفر جاری رکھنا چاہتے ہیں تو یہاں سے اس بوجھ سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔"
"کون سا بوجھ؟" ہم نے حیرت سے پوچھا
"اپنے وجود کا اور کون سا؟" لیڈر کی مسکان کاڑھی ہونے لگی "بولو!"

(۴)

پہاڑوں میں ایک پگڈنڈی پر سے اترتے ہوئے وہ رک گیا اور سر جھکا کر دیکھنے لگا کہ اوپر کے مانند نیسے بھی پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور وہ اتر اتر کر دراصل چوٹیوں پر پہنچ رہا ہے۔

(۵)

میں اور وہ یہاں اس پہاڑ پر بیٹھے تھے اور ہماری آنکھوں میں ایک وسیع وادی بسی ہوئی تھی جس کے سینے پر چار سو سبز ہی سبز بچھا تھا۔
"آؤ رینو!" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "ہمارے ماں باپ نہیں مانتے تو کیا ہوا! آؤ ہم شادی کے بغیر ہی ایک دوسرے کو اپنالیں۔"
"نہیں، رام!" وہ کہنے لگی "پگڈنڈی کے بغیر وادی میں اترنا نہیں ہو پاتا۔"

(۶)

اُس پہاڑ کا گھر اپنے پہاڑ کی وسطی ڈھلان پر واقع تھا۔
میں نے ایک دن اُس سے پوچھا "تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"
پہلے تو وہ میری نظر بچا کر اپنے ذہن میں گھس گئی اور پھر میں ابھی اُس کا پیچھا کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اچانک سچ دیکھ کر اپنے دل و دماغ سے ہر آمد ہوئی اور بولی "میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے میرے گھر کے آگے ایک چھوٹا سا چپٹا آنگن ہو۔"

بس؟

ہاں، بس یہی۔ گھر کی چوکھٹ پر کھڑے مجھے کھٹکا سا لگا رہتا ہے کہ اینجانے میں کبھی میرا پاؤں نہ پھسل جائے

(۷)

وہ چوٹی دیکھ رہے ہو؟ — وہ — اُس چوٹی کے اوپر وہ! — اُسے بڑھوں کی چوٹی کہتے ہیں —
ہاں، اُس چوٹی پر بڑھوں کا ایک پورا شہر آباد تھا — ہاں، بتاتا ہوں — تھاؤں، کہ دراصل وہاں ایک ہی
بڑھا تھا اور وہ اپنے آپ سے اس طرح بل جُل کر رہتا تھا گویا وہ کئی ہزار ہو۔
بڑی عجیب بات ہے!

یہ تو ہوتی، اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ایک بڑھے کو بھی ہزاروں میں گنا جاسکتا تھا۔
مگر یہ ہزاروں لاکھوں بڑھے اتنی چھوٹی سی چوٹی پر رہے کیونکر پاتے تھے؟
یہی تو معجزہ ہے! بل جُل کر رہیں تو جیتنے بھی ہوں، کیا مجال! ایک سے زیادہ لگیں۔

(۸)

نہیں! اس پہاڑ پر سبزہ نہیں اُگتا — کیوں؟ — اس لیے کہ اسے نیند نہیں آتی — کیوں نہیں
آتی؟ — ارے بابا! جس مُورکھ نے پیٹ میں اتنے قیمتی پتھر جمع کر رکھے ہوں اُسے بے فکری کی نیند کیسے
آئے گی؟ — ذرا سا سو کر بھر بھرا ہو تو سینے پر سبزہ آئے۔

(۹)

اُدھر دیکھو، وہ پہاڑ اپنے اس خیال پر پانی پانی ہو رہا ہے کہ وہ چلنے پھرنے سے قاصر ہے، ورنہ اپنی
گود میں بسے ہوئے لوگوں کے دکھ کا مداوا کرتا — دیکھو، سوچ سوچ کر اُس کی چوٹی پر برف پگھلنے لگی ہے اور
نشیب پر جا بجا کٹی بھرنے بہ نکلے ہیں — ہاں، بھائی! پہاڑ اگر شرمندہ بھی ہوتے رہیں تو دھرتی سیراب ہو جاتی ہے۔

(۱۰)

میں جب بھی اس طرف سے گزرا، اُس بوڑھے کو ہمیشہ ویسے ہی چُپ چاپ بڑے چین سے اس پہاڑ پر
بیٹھا پایا۔ مجھے الجھن سی ہونے لگتی کہ وہ کیونکر اتنے چین سے مہینوں سالوں سے عین اُسی مقام پر جم کے بیٹھا ہوتا ہے؟
اور پھر ایک دن اُسے وہاں نہ پا کر مجھے لگا جیسے کوئی بڑی انوکھی بات ہو گئی ہے۔ میں تعجب سے اُس پاس دیکھنے
لگا۔ وہ مجھے نظر تو کہیں نہ آیا مگر وہ سارا مقام جوں کا توں اس کی موجودگی سے بسا بسا معلوم ہو رہا تھا — ارے
ہاں! — اور کیا؟ — وہ بوڑھا یہ پہاڑ ہی تو تھا! —

(۱۱)

”پہاڑوں کی گھور خاموشی میں محسوس ہوتا ہے جیسے دور — بہت دور سے کوئی آواز سنائی دے رہی ہو۔“
ہاں، اور اس پر کان دھرے ہم اپنا آپ بالکل جھولے ہوتے ہیں۔“
ہاں، اب تک آواز اس وقت تک سنائی نہیں دیتی جب تک ہم مٹی نہ ہو جائیں۔“

(۱۲)

سارا قصہ تو کئی بار سنا چکا ہوں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ میں نے اُس پہاڑ کی چوٹی سے گر کر خودکشی کرنا چاہی، مگر اُسی دم پہاڑ نے اچھل کر میرے پیر پکڑ لیے — نہیں، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا — میں نے پورا زور لگا کر اپنے پیروں کو چھڑانے کا جتن کیا اور ناکام ہونے پر ڈھیلا پڑ کر جب اُس سے وعدہ کیا کہ خودکشی نہیں کروں گا تو وہ میرے پیر چھوڑنے پر آمادہ ہوا۔

(۱۳)

وہ سامنے والا سب سے اونچا پرست دیکھ رہے ہو؟ بڑا سبچ پرست ہے۔ صدیوں سے اسی طرح خاموش کھڑا ہے — نہیں، میں نے اسے کبھی غصے کی حالت میں نہیں دیکھا — ہاں، کبھی نہ کبھی تو ہر کسی کو غصہ آتا ہے۔ آج سے صدیوں پہلے ایک باریہ پرست بھی غصے میں آ گیا تھا — ہاں، اتنے غصے میں، کہ بھٹ گیا تھا اور — اتنا اس میں لکھا ہے — جب یہ پھٹا تھا تو اس کے سینے سے رنگا رنگ ہیرے، جواہر بھوٹ پڑے تھے — نہیں، روز روز پھٹنے سے ہیرے جواہر تھوڑا ہی پھوٹتے ہیں — ہیرے جواہر تو کہیں صدیوں کی سبوتا سے ہی بننے میں آتے ہیں۔

(۱۴)

رات کو مجھے نیند نہیں آرہی تھی، اس لیے میں کمرے سے نکل کر گیسٹ ہاؤس کے باغ میں چلا آیا اور یہاں درے درے کو پورے چاند کی روشنی سے بھرا پا کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔
باغ کے کنارے ہی ایک بند رہیٹھا تھا، وہ مجھے دیکھ کر بولا ”آؤ، باہر آ کے دیکھو، پہاڑ کے سینے کا کواڑ چرپٹ کھلا ہے۔“ مجھے اپنی طرف بڑھتے پا کر وہ میرے آگے آگے ہو گیا ”جلدی آؤ، نہیں تو کواڑ بند ہو جائے گا۔“ اور اگر ہمارے اندر داخل ہوتے ہی بند ہو گیا تو — — — مگر میں سر جھٹک کر اپنے آپ کو تباہ نہ کیا

— تو کیا؟ اپنے بندر ساتھی کی رفاقت میں وہیں بس جاؤں گا۔

(۱۵)

اس جگہ جہاں بڑے پہاڑوں کے بیچ چھوٹے چھوٹے پہاڑ دکھتے ہیں، پہلے یہاں ایک چھوٹی سی وادی تھی۔ اس وادی میں کوئی منہ کھوتا تو اس کی آواز کسی بچی کی طرح اڑتے ہوئے وادی کے ہر باسی کے آگن میں چھپانے لگتی اور یوں سارے گھروں میں بھانت بھانت کے پتھری چھپا کر سبھوں کو ایک ہی کنبے میں پروئے رکھتے۔ پھر کیا ہوا کہ سبھوں کو ایک دوسرے پر شک گزرنے لگا اور ہر ایک نے خاموشی سا دھلی، اور جوں جوں ان کی خاموشی گہری ہوتی چلی گئی تو ان کے جسم بھرتے چلے گئے اور وادی کی چھاتی سے بھی مٹی ہی مٹی پھوٹنے لگی رہوتے ہوتے ان پہاڑوں میں یہ پہاڑ بھی کھڑے ہو گئے۔

(۱۶)

میرے ہاتھ پیر کیسے ٹوٹے؟ — نہیں، پہلے میرا کوئی گھر نہیں تھا — نہیں، ہمیشہ سے یہیں سی پہاڑ پر بود و باش ہے، پر جوانی میں کوئی گھر بار نہ تھا — نہیں مجھے اپنے ماں باپ کا کوئی اتا پتا نہیں۔ ا، نہ معلوم وہ کون تھے — پر تم تو یہ جانتا چاہتے ہو، میرے ہاتھ پیر کیسے ٹوٹے؟ — میری جوانی کے دنوں لی بات ہے کہ ایک بار اسی پہاڑ پر مجھے سوچ آئی کہ اب اپنے لیے ایک چار دیواری کھڑی کر لوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرا پاؤں پھسل گیا اور میں سیکڑوں فٹ نیچے جا گرا، پھر گھنٹوں بعد بے ہوشی سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ پہاڑ ایک چوپائے کا روپ دھار کر میرے اوپر سر جھکاٹے کھڑا ہے — کیا؟ — مجھے کیسے معلوم ہوا، وہ پہاڑ ہی چوپائے کا روپ دھارے ہوئے تھا؟ — ارے بھئی! پہاڑ پر سالم جاندار پہاڑ ہی ہوتا ہے — ہاں، اپنے ہاتھ پیر ٹوٹنے سے پہلے میں بھی پہاڑ ہی تھا — ہاں میں کیا بتا رہا تھا؟ — وہ چوپایہ — میرا مطلب ہے، پہاڑ میرے ٹوٹے پھوٹے وجود پر سر مکاٹے کھڑا تھا اور میرے کانوں میں بڑبڑا رہا تھا، جاؤ، اب اپنے لیے چار دیواری کھڑی کر لو۔

(۱۷)

آپ تعجب کریں گے مگر یہ واقعہ ہے۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں پر چڑھتے ہوئے میں گویا بدستور میدانوں میں اپنے سگے سہمنہ حیلوں سے باہر کر رہا ہوتا ہوں اور مشتق نہ ہونے کے باوجود ہنستے کھیلتے چوٹیوں پر آ پہنچتا ہوں۔

میری محبوبہ وجود کی ذرا بھاری ہے۔ اوپر چڑھتے ہوئے جھٹ ہی اُس کا دم پھول جاتا ہے اور وہ جہاں کی تہاں پاؤں پسار کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس دوران جب میں آنا فانا کئی ہزار فٹ کی اونچائی طے کر کے اُس کے دل کو آچھوتا ہوں تو وہ اتنی دُور اپنی محفوظ پست بھاری پر بیٹھی سہم کہ ہڑبڑا اٹھتی ہے۔ اپنے اسی خوف کے باعث اُس نے مجھے ابھی تک قبول نہیں کیا۔

(۱۸)

جب اُسے اپنی روانگی کے سگنل ملنے لگے تو آخر ایک دن اُس کے قدم آپ ہی آپ میدانوں سے پہاڑوں کی طرف اٹھنے لگے۔ ہم نے اُسے بہت آوازیں دیں مگر وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتا چلا گیا اور ہم بھی اُسے پیہم آوازیں دیتے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے پہاڑوں کے بچوں کیچ آن پہنچے۔ ایک نہایت سنان مقام پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ آگے کے سارے راستے مسدود ہیں۔ ہم خوش ہو کر رُک گئے کہ اب وہ پلٹ آئے گا، مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایسے اوجھل ہوا جیسے اپنا آپ ہونے کی بجائے ہمارا کوئی خیال ہو، اور ہم اپنا سامنہ لے کر واپس ہو لیے۔

(۱۹)

ایک گھنٹہ پہاڑی جنگل میں سے گزرتے ہوئے میں اچانک اپنے آگے آگے ایک نہایت مُسن آدمی کو پا کر ٹھٹک گیا۔ ابھی ابھی تو یہاں کوئی بھی نہ تھا! میرے تجسس کا یہ حال تھا کہ میں اپنی راہ بھول کر اُس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ بہت دیر چلتا رہا اور آخر ایک چھوٹے سے تنہا، نئے مکان میں گھس گیا اور میری طرف مُڑ کر دروازہ پھیلنے لگا، حالانکہ میں اُس کے عین سامنے کھڑا تھا، پھر بھی — مجھے لگا — میں اُسے دکھائی نہ دیا۔

میں وہاں سے پلٹ تو آیا مگر اُس شخص کے چہرے کی ٹیڑھی میڑھی جھریوں میں کھویا رہا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر میں نے سرائے کے رکھوالے سے اُس کے بارے میں پوچھنا چاہا۔ وہ ہنس کر بتانے لگا ”وہ بوڑھا آدمی ہمارا پیردادا ہو گا جناب! پیردادا کوئی دو ماہ پہلے گزر گیا تھا“

”گزر گیا تھا؟“

”ہاں، جناب! اُسے مرے دو ماہ ہو گئے ہیں۔ مرنے سے چند ہی روز پہلے وہ اپنے نئے مکان میں

منقل ہوا تھا اور آخری سانس لیتے ہوئے بڑا خوش تھا کہ چلو، عمر بھر اپنا مکان نصیب نہ ہوا تو کیا؟ اب تو بن گیا ہے۔ مر کے اب چین سے اس میں رہوں گا۔“

(۲۰)

گمشدوں کے موضوع پر اپنی تحقیق کے سلسلے میں میں پہاڑوں میں بھی آ نکلا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ پہاڑیوں کو یہ مسئلہ درپیش نہیں۔

”اس کا کیا سبب ہے؟“ میں نے ایک مقامی معتبر سے استفسار کیا
 ”سبب کیا ہونا ہے؟“ اُس نے مجھے بتایا ”یہاں پہاڑی زندگی میں ایک ہی راستہ تو ہے، اوپر نیچے کا راستہ۔ کوئی لاکھ گم ہونے کی کوشش کرے، جائے گا کہاں؟ یہاں نہیں تو اوپر، اور وہاں بھی نہیں، تو اُس سے بھی اوپر آسمان میں۔“

(۲۱)

میں ایک بوڑھے کا مہمان تھا جو ایک خاموش پہاڑ پر تنہا رہا تھا۔
 ”یہاں زندگی کتنی ٹھہری ٹھہری ہے!“ ایک دن میں نے اُس سے کہا
 ”قیام ہمارے پہاڑوں کا درس ہے بیٹے!“ اُس نے جواب دیا ”پہاڑ ہمیشہ ہماری جڑوں کو تھامے ہوئے ہیں تاکہ ہم گرنے سے بچ سکیں۔“
 ”کیا تم درخت ہو، یا انسان، بابا؟“
 میرے سوال کے جواب میں اُس پاس کے سارے درخت قہقہا اُٹھے اور — اور آپ شاید یقین نہ کریں گے کہ اُس ایک لمحے بوڑھے بابا کو اُس کے طبعزاد روپ میں دیکھ کر میں چونک پڑا۔

(۲۲)

”ابا! مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا لو۔“
 ”کیوں، بیٹا؟“
 ”میں اونچا بیٹھنا چاہتا ہوں۔“
 ”پہاڑی بچے ہو بیٹا! باپ کے کندھوں کی بجائے ہمیشہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر نظر رکھو۔“

(۲۳)

وہ بڑے مزے سے پہاڑ کی اس بلندی پر آ پہنچا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جب تک آدمی پہاڑ پر چڑھنا شروع نہیں کرتا، اس وقت تک وہ خواہ مخواہ پریشان ہوتا رہتا ہے۔ پہاڑ تو آپ ہی آپ راستہ دیتا چلا جاتا ہے۔ مگر اس بلندی پر پہاڑ اچانک منہ موڑ کر اُس کے سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب آگے کیونکر جائے۔

”تمہیں تو ابھی بہت اوپر جانا ہے۔“ پہاڑ نے اُسے مخاطب کیا ”آتے جاؤ۔“

”کیسے آؤں؟“

”کیوں، اتنا بھی نہیں جانتے؟“ پہاڑ ہنسنے لگا ”ٹانگیں بھول کر اب آنکھوں سے چلنا شروع کر دو۔“ وہ ویسے ہی کھڑے کھڑے ہنستا چلا گیا ”میری چوٹی پر پہنچ کر تمہاری آنکھیں بھی ٹانگوں کے مانند بیچارہ ہو جائیں گی۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہاں سے تم صرف اپنے گمان سے ہی چل پاؤ گے۔“

”اور جہاں سے گمان بھی کام نہ کر پاتے گا؟“

”وہاں سے آگے جانے کے لیے تمہیں اپنا گمان بھی دیں چھوڑ دینا ہو گا۔“

”مگر اپنے گمان کے بغیر مجھے اپنے آپ کا پتا کیسے چلنا رہے گا؟“

”تمہارا اپنا آپ ہی نہ ہو گا تو تمہیں اپنے اُتے پتے سے کیا غرض؟“

(۲۴)

میں اس خیال سے اُس کے ساتھ ہوا کہ چپکے سے اُسے پہاڑ کی چوٹی سے گرا کر واپس وادی کی طرف ہوں گا، شاید وہ بھی اسی خیال سے میرے ساتھ ہوا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اور اپنی پیار بھری مسکراہٹوں سے ایک دوسرے کو جُل دیتے ہوئے تیز تیز اور چڑھتے جا رہے تھے اور ابھی چوٹی پر پہنچ نہ پائے تھے کہ ایک باریک سی پگھلندی پر اچانک باد و باران کے طوفان میں گھر گئے۔

طوفان بڑھتا ہی چلو گیا۔ میں آگے کا راستہ بھجائی دے رہا تھا، نہ پیچھے کا۔ ہمارے پاؤں اُکھڑ رہے تھے اور ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا تھا کہ گر نہ جائیں۔

اسی دوران ہوا کے ایک نہایت تند جھکڑ نے ہم دونوں کو پہلو کے ایک شکاف میں دے مارا، جہاں

ہم بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے، مانو ایک کی جان دوسرے میں دھڑک رہی ہو۔

(۲۵)

ہم بھاری اُون پینے ہوئے تھے، اس کے باوجود سردی سے ہمارا ہر حال تھا۔
 بچہ بستہ ویران سڑک کے نیچے ایک کچے راستے پر آبادی کے آثار پاکر منصور نے تجویز کیا ”چلو، نیچے اتر کر
 کہیں سے گرم گرم چائے پیتے ہیں۔“
 یہاں نیچے کچے راستے کے دونوں کناروں پر ایک ایک کوٹھڑی کے مہیوں گھر بسے ہوئے تھے۔ رادھہ اُٹھ
 بھٹکنے پر ہمیں چائے کی کوئی دکان نظر نہ آئی تو ایک پہاڑیے کی دعوت پر ہم اُس کے دروازے پر آجے ہوئے۔
 پہاڑیے کے تین چار بچے اُس کی کوٹھڑی کے کچے فرش پر اس طرح کھیل رہے تھے جیسے کسی کھلی وادی میں۔
 اُس کی ماں اور بیوی سرعت سے ہمارے لیے چائے تیار کرنے میں جُٹ گئیں اور وہ آپ ہمارے سامنے چوکھٹ
 پر بیٹھ گیا۔

”تم اتنے لوگ ہو اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں کیسے گزر کرتے ہو؟ ہم میں سے کسی نے اُس سے پوچھ لیا۔
 ”ابھی تو دو کم ہو گئے ہیں بابو، مگر اُس وقت بھی ایسی ہی کھلی لگتی تھی۔ میرے بابا اوپر جا بسے ہیں اور
 بسن کی شادی ہو گئی ہے۔“

”رات کو سب لوگ سوتے کہاں ہو؟“

”یہیں، اور کہاں!“ اپنی بات کو اچھی طرح سمجھانے کے لیے وہ کھڑا ہو گیا ”رات کو ہم دروازہ بند
 کر لیتے ہیں تو ہماری سانسوں سے کوٹھڑی خوب گرم ہو جاتی ہے اور ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر فوراً
 سو جاتے ہیں۔ بس!“ وہ ہنسنے لگا ”اللہ بڑا مہربان ہے بابو۔ لیجئے، چائے آگئی ہے!“
 چائے کی چھو لدار پیالیوں سے دُھواں اُٹھتے دیکھ کر ہم سبھوں نے بھکاریوں کے مانند اُس طرف
 ہاتھ بڑھا دیے۔

جزیرے

رام لعل

ادھر کچھ دنوں سے باداجی کو یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے کوئی اُسے پکار رہا ہو۔ بار بار دروازے تک آتا ہو اور لوٹ جاتا ہو۔ گھر کے لوگ اُس کے لیے دروازہ کھولتے ہیں نہ اُسے اُن کے پاس لے کر آتے ہیں۔ باداجی خود ہلنے پھلنے سے بالکل معذور ہو چکے ہیں۔ ورنہ اُن کا جی تو چاہتا ہے کہ ذرا سی بھی آہٹ ہونے پر وہ لپک کر دروازے پر پہنچ جائیں اور آنے والے کا پہلے کی طرح دونوں ہاتھیں پھیلا کر سواگت کریں۔ کچھ عرصہ سے اُنہوں نے بالکل چُپ سا دھ رکھی ہے۔ اُن کے چہرے پر بچائی ہوئی خاموشی میں ریشیوں مٹیوں جیسی متانت یا شانتی نہیں ہے جو اُن کی بڑوں کی اُپاسنا کا پھل ہوتی ہے بلکہ اُس میں ایک بے چینی ہی ہوتی ہے۔ وہ منہ سے ذرا سی بھی آواز نہیں نکالتے۔ ادھر اُدھر ایک بے بسی سے تاکتے رہتے ہیں جس میں کبھی کبھی حیرانی بھی جھلک اُٹھتی ہے۔

اُن کے پلنگ کے ساتھ لگی ہوئی چھوٹی سی میز پر ایک چابی والی گھنٹی رکھ دی گئی ہے کہ اُنہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہاتھ بڑھا کر کسی کو بلا لیں۔ اکثر وہ گھنٹی نہیں بجاتے۔ اپنے آپ ہی کوئی نہ کوئی انداز جاتا ہے اور اُن سے اُن کی ضروریات کے بارے میں پوچھ جاتا ہے۔ بلکہ پوچھنے کے بجائے خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ اِس وقت باداجی کو کیا چاہیے۔ کھانا، پانی یا کوئی اور شے۔ کموڈیمک اُن کے پلنگ کے پاس رکھ دیا گیا ہے۔ اب انھیں چلا چلا کر کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارنا پڑتا ہے۔

بادا پر دھان سنگھ کے دو منتر لہ مکان میں اُن کی پتی کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی اور اس کا پتی اور ان کے تین بچے رہتے ہیں۔ اپنے خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کو وہ سب یہ تلقین کرنا کبھی نہیں بھولتے۔ ”وار جی، ہر سب سے بڑے نہ رہا کریں۔ تھوڑا بہت چل پھر بھی لیا کریں، چھڑی کے سہارے یا پلنگ کی ٹیک یا کرسی کو ہی پکڑ کے آس پاس گھوم لیا کریں“

کوئی نہ کوئی باداجی کو زبردستی اٹھا کر کھڑا کر دیتا ہے اور حکم دیتا ہے ”چلیے اب۔ حرکت کرتے رہنے سے ہی جوڑ کھلتے ہیں نہیں تو یہ آپ ہی پکے جڑ جائیں گے وار جی۔ قدرت کا قانون یہی ہے کہ انسان چلتا پھرتا رہے۔ اپنے شریہ کی رگ رگ میں خون کو دوڑتا ہوا رکھے۔ سمجھے!“

بادا پر دھان سنگھ کبھی لانگ ٹینس کے ایک بہترین کھلاڑی تھے۔ اُن کے رُوئیں رُوئیں میں جیسے پارہ بھرا رہتا تھا جو انھیں چل بھر کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جن لوگوں نے انھیں ٹینس کورٹ پر اچھل اچھل کر

کھیلے ہوئے دیکھا تھا وہ ان کی جسمانی چستی کی اب بھی گواہی دیتے ہیں۔ اُن کے اسی کمرے کی دیواروں پر کئی پرانے گرد آلود ریکٹ اب بھی ٹنگے ہوئے ہیں اور زردی آلود انگریزی اخبارات کے فریم شدہ تراشے بھی۔ دُھندلے شیشوں کے پیچھے وہ کئی فوٹوؤں میں ہمارا بچہ پٹیلہ اور کپور تھلہ کے شہزادوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کے ساتھ وہ دلی، بھوپال اور کلکتہ کے مقابلوں میں شریک ہوتے رہے تھے۔ انعام میں حاصل کی ہوئی تین رنگ آلود ٹرافیاں بھی ابھی تک اُس شوکیس میں موجود ہیں جس کے شیشے اب ٹوٹ چکے ہیں اور ٹرافیوں کے دائیں بائیں ان کی جگہ کی ہوئی کئی دیمک خوردہ کتابیں بھری پڑی ہیں۔ تاریخ فتوحات ہمارا بچہ رنجیت سنگھ، پنجاب کی سرکردہ شخصیات، ہسٹری آف دی ورلڈ (پانچ حصے) ہندوستان غدر پارٹی از سوہن سنگھ جوش (THE GREAT DIVIDE) خوش

خوشنونت سنگھ کی تالیف سکھ ہسٹری (دو حصے) وغیرہ۔ باواجی اپنی آنکھوں پر ٹٹکتے ہوئے سفید پردوں کے گچھوں اور بھاری پوٹوں کے غلاف اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے ہیں تو اُن کی دُھندلی آنکھوں میں ذرا دیر کے لیے چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ سوچ کر انھیں افسوس ہونے لگتا ہے کہ اُن کی کھیل کود کی صلاحیتوں کا عشرِ عشرت تک اُن کی اولاد کو منتقل نہیں ہو سکا۔ اُن کی اولاد میں کسی نے عشق کیا اور اسکیمنڈل کھڑے کر لیے، نشیلی دواؤں کی لت ڈال لی اور حوالات کی سیر کی، تجارت اور سمندر پار کی ملازمت اور جدید کھیتی باڑی میں اتنی زیادہ دلچسپی کھائی کہ اپنے ماں باپ تک کو بھلا دیا۔ ہاں، اُنھوں نے یہ ضرور کیا کہ وہ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے رنگین فوٹو ضرور بچواتے رہے جن میں سے کچھ فوٹو چمکتے ہوئے نکل پلینٹ فریموں میں محفوظ پڑے ہیں۔

مہربان سنگھ دہلی میں موٹر پارٹس کا دھندہ کرتا ہے۔ سردول سنگھ کناڈا میں بجلی مکینک ہے۔ اُس نے ایک فرانسیسی نژاد کینیڈین عورت سے شادی کرنے کے لیے اپنے کیسوں اور وارڈروبی کو بچھڑا کر دیا۔

بلدیہ سنگھ عرف بلی چندی گڑھ کے نواح میں کھیتی باڑی کرتا ہے۔ پتی چھ سال تک ممبئی کے فلمی نگار خانوں میں وائٹن بجاتے رہنے کے ساتھ ساتھ گانچہ چرس بھی پیتا رہا۔ اُس کی کامیابی کی صرف ایک نشانی ہیامالئی کے ساتھ کچھواتی ہوئی فوٹو ہے۔ اب وہ گھر واپس آ چکا ہے لیکن کوئی کام کاج نہیں کرتا ہے۔ باواجی نے بہت کوشش کی کہ وہ بڑے گورو دوارے کے راگی جتھے میں ہی شامل ہو جائے لیکن وہاں بھی وہ ٹھہر نہیں سکا۔

باوا پردھان سنگھ نے ملٹری سے ریٹائر ہو جانے اور ادھیڑ عمر کی منزل میں قدم رکھتے ہی خود کو روٹری کلب اور بڑے گورو دوارے کی پرہیزگار کمیٹی کے علاوہ کئی سماجی و تعلیمی اداروں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ اُنھوں نے ہر ادارے کی خدمت ایک حیرت ناک لگن کے ساتھ کی ہے۔ جیسے یہ بھی ان کے لیے کھیل کود کے میدان ہوں۔ انھیں یہاں بھی اپنی خدا داد صلاحیتوں کا کمال دکھانے کی کھلی چھوٹ مل گئی ہو۔ لیکن جیسے اچانک

کوئی بھاگتا دوڑتا ہوا ٹرک کسی بڑی اندرونی خرابی کی وجہ سے سڑک کے عین بیچ میں رک جاتا ہے۔ اُس کے بعد ہزار کوشش کے باوجود حرکت میں نہیں آتا۔ ناچار اُسے دھکیل کر سڑک کے کنارے کر دیا جاتا ہے جہاں وہ بے مدت کھڑا رہتا ہے۔ بارش، دھوپ اور تیز ہوائیں اس کی اصلی شایانہ رنگت اڑا لے جاتی ہیں اور اس کے کل پرزوں کو رنگ چاٹنا شروع کر دیتا ہے اور اس کے بھاری ٹائر ٹیوب بھی گلے سڑنے لگتے ہیں۔ باواجی کا سارا وجود اُسی ٹرک جیسا ہو گیا ہے۔

اچانک دروازے پر پڑا ہوا پردہ ہلتا ہے اور ان کی بیٹی کلونت اندر آتی ہے۔ چونکہ وہ کچھ اونچا سُسنے لگے ہیں اس لیے وہ ان کے پٹنگ کے پاس آکر زور زور سے بتاتی ہے ”چنڈی گڈھ سے فون آیا ہے، سبلی نے کہا ہے اُسے فلائیٹ مل گئی تو کل شام تک ضرور آجائے گا۔ اُسے آپ کی صحت کے بارے میں بڑی چنتا لگی ہوئی ہے۔ لیکن وہ پریشان بھی بہت ہے۔ کہتا ہے، کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور نہیں ملتے۔ ہماری لیبر نے اب ادھر آنا چھوڑ دیا ہے“

باواجی لیٹے لیٹے اپنی بیٹی کی طرف خاموش نظروں سے تاکتے رہتے ہیں جس کے سر پر ترشے اور سٹ کرائے ہوئے اور مہندی سے سُرخ کیے ہوئے خوب صورت گھنے بالوں کا ایک جھگل سا ہے۔ وہ یونیورسٹی میں انٹرویو لوجی کی ریڈر ہے۔ جس زمانے میں وہ ریسرچ کر رہی تھی اُس نے اپنے برہنہ گائیڈ کے ساتھ ’نو میرج‘ کر لی تھی۔ اُن کے خاندان میں یہ پہلی بغاوت تھی جسے وہ روک نہیں سکے تھے۔

وہ جاتے جاتے یہ خبر بھی سُنا جاتی ہے ”پتی کو پولس نے پھر بلایا ہے پوچھ گچھ کے لیے۔ پر اُس کا تو اسپتال میں علاج چل رہا ہے۔ پولس والے کہتے ہیں، اس نے ہاسپٹل کے بیڈ سے کسی کے ہاتھ ایک پڑیا بیچی ہے۔ اُس کی ضمانت کا پہلے سے انتظام رکھنا ہوگا۔“

اُس کے جانے کے بعد اُن کا چھ برس کا نواسہ اپنی تین بہنوں والی سائیکل دوڑاتا ہوا اُسی کمرے میں آجاتا ہے اور فرنیچر کے آس پاس چکر لگانے لگتا ہے۔ بہنوں کی کمرخت ’چیں چیں‘ ہر طرف گونج اُٹھتی ہے۔ وہ اسے ہاتھوں سے بار بار نکل جانے کا اشارہ کرتے ہیں لیکن سچے اُن کی ایک نہیں سُنتا۔ چکر لگاتے لگاتے اپنی سائیکل کبھی پٹنگ کے ساتھ ٹکرا دیتا ہے، کبھی میز کسی کے ساتھ۔ باواجی بالکل زچ ہو کر اپنا ہاتھ گھنٹی پر رکھ دیتے ہیں۔ گھنٹی زور زور سے بجنے لگتی ہے تو بچہ خوش ہو کر گھنٹی اٹھا لیتا ہے اور اسے اپنی سائیکل پر لٹے بچانے لگتا ہے۔

باد پر دھان سنگھ کے اندر اچانک بے شمار آوازیں بھر جاتی ہیں۔

پتی کو پولس نے پھر بلایا ہے۔

اُس کی ضمانت کا پہلے سے انتظام رکھنا ہوگا۔

سلی بار بار فون کرتا ہے لیکن وہ یہاں آتا نہیں ہے کبھی !
گھنٹی مسلسل بج رہی ہے ۔

یچہ بار بار اس میں چابی بھر رہا ہے ۔

سائیکل اور تیز تیز دوڑ رہی ہے

اور بار بار پلنگ اور کرسیوں کے ساتھ ٹکرا رہی ہے ۔

ٹھک ٹھک ، ٹھک ٹھک !!

وہ اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے چلا اٹھتے ہیں ”کوئی ہے ؟ اسے روکو ، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا“

اُن کی بوڑھی بیوی اپنے اُونچے بھاری بدن کا بوجھ اٹھائے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے
نافی کو دیکھتے ہی یچہ باہر کھسک جاتا ہے ۔ جاتے جاتے گھنٹی پھینک جاتا ہے ۔ برٹھیا فرش پر جھک کر گھنٹی کو اٹھاتی ہے
اور اس میں مزید چابی بھر کر میز پر رکھ دیتی ہے اور کرسی پر بیٹھ کر بے ترتیب پڑے ہوئے اخبار اور میگزین اکٹھے
کرنے لگتی ہے جن میں سے کئی ایک کے ریپرڈ کو باواجی نے کھولا ٹک نہیں ہے ۔ اپنے شوہر کی طرف وہ ایک عجیب
سے ترس کے ساتھ دیکھنے لگتی ہے ۔ باواجی کے منتشر حواس پھر سے مجتمع ہونے لگتے ہیں ۔ وہ بھی اپنی برسوں کی
ساتھی کی جانب ایک ٹک دیکھنے لگتے ہیں ۔ دونوں نے پچھلے کئی برسوں میں ایک دوسرے کی طرف ایسی ہی نظروں سے
بار بار دیکھا ہے اور اپنے اپنے طور پر بہت کچھ سوچا ہے بالکل اس طرح جس طرح دو بوڑھے پتی دپتی کو سوچنا چاہئے ۔
دونوں کی آنکھوں سے پہلی سی شوخی اور جذبات کی شدت بہت عرصہ سے غنقا ہو چکی ہے ۔ باواجی کرسی کے اندر
اپنی بیوی کے لبالب بھرے ہوئے بوڑھے شریں میں سے کوشش کرتے پر بھی ایک چرٹھی کمان کے تیر جیسا بدن نہیں
تلاش کر پاتے جو کبھی لہراتا ہوا اُن کی گود میں بے اختیار آگرتا تھا ۔ وہ اُس کی طرف اس طرح مُندی مُندی آنکھوں سے
دیکھتے ہیں جیسے کوئی چمکتی ہوئی ننھی متی سوئی گھاس ٹھوس کے اُونچے دھیر میں گم ہو چکی ہو ۔

بڑھیا اُن سے اُن کے اچانک پریشان ہو کر چلا اٹھنے کا سبب نہیں پوچھتی ۔ وہ ہاتھ میں اٹھائے ہوئے
اخباروں کو میز کے نچلے حصے میں رکھتی ہوئی کہتی ہے ”سردار جی ! پتی کی ضمانت کے لیے جگت سنگھ کو فون
کر کے بلاؤں ؟ اور تو کوئی نظر نہیں آتا جو اتنی ہمدردی دکھائے !“

باواجی جانتے ہیں ، ان کی بیوی نے انڈیا ٹریکیڈز والے جگت سنگھ کا لڑا کا نام کیوں لیا ہے ؟ آزادی
کے بعد وسطی ہند کے اس شہر میں آکر بسنے والا وہ پنڈی کا پہلا ریفریوجی تھا جسے انھوں نے دوبارہ بسنے میں
پوری پوری مدد دی تھی ۔ پچھلے چالیس برسوں میں اُس کے خاندان کے ساتھ اُن کے سمبند بہت گہرے ہو گئے ہیں
بُری طرح سے اُجڑا پُجڑا کر آنے کے بعد جگت سنگھ نہ صرف پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس کا خاندان

بھی پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس کے بچے، اس کے بھائی اور بھائیوں کے بچے۔ ٹریڈروں کے علاوہ انہوں نے گیس، کوئلہ اور ٹرکوں کا بھی کاروبار پھیلا دیا تھا۔ باوا جی کے ہی مشورے سے جگت سنگھ کا منگریس میں شامل ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ پارٹی کے ضلع پر دھان کے عہدے سے آگے کبھی نہ بڑھ سکا اور میونسپل کارپوریشن کی رکنیت کے لیے بھی ایک ہی بار انتخاب لڑا تھا جس میں وہ جن سنگھ کے امیدوار سے ہار گیا تھا۔ باوا جی نے اسے بہت معمولی سود پر ستر اسی ہزار کا جو قرض دیا تھا وہ اس نے ابھی تک واپس نہیں کیا ہے۔ گزشتہ کچھ برس کے سیاسی حالات نے جگت سنگھ کا سارا کاروبار چوڑھ کڑیا ہے۔ مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد اس شہر میں جو فساد ہوا تھا اس میں اس کی دوکان کو بھی آگ لگا دی گئی تھی اگرچہ دوکان پھر سے بنائی گئی ہے لیکن وہاں سامان خریدنے بہت کم لوگ آتے ہیں۔ پوری مارکیٹ میں وہ یکہ و تنہا رہ گیا ہے جیسے کسی جزیرے پر جانے والی کشتیوں نے اچانک اپنے راستے بدل لیے ہوں۔ لیکن باوا جی کی خدمت میں اکثر حاضر ہو کر اپنا یہ وعدہ دیتا ہے کہ حالات کے معمول پر آتے ہی وہ اُن کی پائی پائی واپس کر دے گا۔ جگت سنگھ اُن کے اس احسان کا بھی اعتراف کرتا رہتا ہے کہ انہوں نے اُس کا ضمانتی بن کر بینک سے ایک بڑا قرضہ بھی دلانے میں مدد دی تھی۔

باوا جی کی بیوی نے کہا، ”بنک والوں نے ایک کاغذ پھر بھجوایا ہے۔ ہمارے بیٹے آپ جی سے اس لئے ناراض ہیں کہ آپ نے جگت سنگھ کی ضمانت کے لیے اپنی لاکھوں کی جائیداد استعمال کی۔ اگر وہ بینک کا قرضہ واپس نہ کر سکا تو بینک والے تو ہماری ہی جائیداد نیلام کر دیں گے ناں!“

یہ سن کر باوا پر دھان سنگھ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ دیر تک پڑے پڑے وچارتا رہتا ہے۔ پھر اُسی طرح آنکھیں بند کئے کئے ہونٹوں کے اندر ہی اندر بیداتا ہے: ”ٹھیک ہے۔ جگت سنگھ سے کہنا، میسے بیٹے کی ایک ضمانت اور کرائے، اُس کا بڑا احسان مانوں گا۔“

زندگی کی بندگی

سائرہ ہاشمی

نہاں کے موسم کی اہدائی ہوا میں گلبرگ کے مین بولہوار کی کسادہ ٹرے میں سرخوں پر لوگن بیل کے جھاڑوں میں گھوم رہی ہیں۔ بڑی بڑی کڑیاں تیزی سے میلوں اور رنگوں کا ادراک کیے بغیر سب سے پاس سے گزر رہی ہیں۔ لوگن بیل کی رنگین پتوں نے گھاس کے قطعوں کو بڑا جادو بنظر اور جاندار بنا دیا ہے، لیکن گھاس اور پھولوں کی ملی جلی خوشبوؤں میں مجھے ایک اور خوشبو کی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے۔ خوشبو جو میری مادیوں کے دیرانے سے ہولے ہولے میرے حواسوں پر چھا رہی ہے۔ کریٹون سگریٹ کی خوشبو!

زندگی کے سفر کے کئی پڑاؤ ہیں مصنوعات کی ترقی کی کئی منزلیں ہیں۔ دولت کی نئے پر قصہ ریتے لوگوں کی تال بدل چکی ہے۔ پھیلاؤ کے دائرے چکر در چکر سوچوں کے پانال میں معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور میں جو تمام عمر دنوں سے دنوں کی طرف محو سفر رہا ہوں یادوں کے ایک لمحہ میں ساکت ہو گیا ہوں۔ یاد جو کریٹون کے دو سگریٹوں سے بندھی آج تک میری یادوں کی دیوار پر آویزاں ہے۔ گرد آلود بوسیدہ، لیکن پھر بھی موجود میں برسوں اس کی موجودگی سے غافل بہت سی دوسری خوشبوؤں کے تعاقب میں نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا ہوں۔ میری زندگی اعلیٰ لیلوی داستانوں کی طرح تدرتہ تدرتہ، پرت در پرت ایک بڑا انبار ہے۔ اس انبار سے چہروں کو شناخت کرنا اور انہیں کوئی نام دینا بہت ہی مشکل ہے۔ لیکن یہ خوشبو

کاٹی زدہ یادوں کے اس چھوٹے سے تالاب کے کنارے میرے قدم رک گئے ہیں۔ میں اُن سے کسی سفید یا زرد کنول کے پھول کی کھوج نہیں کروں گا۔ یہاں صرف کاٹی سی اُگتی ہے۔ کاٹی جو چھپنے پر ہاتھوں سے چپک جاتی ہے جس سے سارے جسم میں جھنجھناہٹ سی پیدا ہوتی ہے۔ گل جاناں بھی ایسی ہی جھنجھناہٹ ہے۔

کئی مہینوں بعد جب میں میڈم کے کوٹھی خانے میں ملنے کے لیے گیا، تو چند لوگ ایک جنازے کے گرد ملا تعلق سے کھڑے اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر چہرے سے سفید کپڑا اٹھایا، تو وہ گل جاناں تھی۔

گل جاناں جو زندگی کے جنگل میں محرومیوں اور ناکام خواہشوں کے خارزار سے گزرتی آخر کار آخری پڑاؤ تک پہنچ ہی گئی تھی کیا میں رو سکتا ہوں۔ کیا میری آنکھوں میں اس کے جلنے پر دوپٹے آنسو ٹپک سکتے ہیں... میری آنکھیں خشک تھیں... لیکن یادوں کی چپن مجھے بے چین کر رہی تھی۔ گل جاناں اور کریٹون کے دو سگریٹ۔

گل جاناں اور برسوں پر محیط ایک بے ضرر کہانی۔

میں کافہ کو میز پر رکھے اس کی کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں... کردار... واقعات... سچ بولنا اتنا مشکل ہے۔ واقعات

کے آئینہ میں مجھے اپنا عکس بار بار نظر آرہا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس سے نظریں نہ ملاؤں، لیکن وہ عکس میری نظروں میں دراز نہ گھسا چلا آ رہا ہے اور میں اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔
گل جاناں نہیں رہی اور میں اس کو الفاظ کا جادو جگا کر منانہیں سکتا۔ شاید میں ہار گیا ہوں۔ یہ فیصلہ ہمیشہ کی طرح تصفیہ طلب ہے۔

ایک بے عرصہ بعد میں اُسے میڈم کے کوٹھی خانے میں ملا تھا۔ میں اور رحمان زندگی کی لذتوں کی تلاش میں ہمیشہ کی طرح سرگرداں جب اس کمرے میں داخل ہوئے، تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کے لب موم بوم مسکراہٹ سے پھیلے اور پھر سکڑ گئے۔
تومسٹر ظہیر یہ آپ ہیں۔۔۔ اس کا انگریزی لہجہ بہتر بن تھا۔ اور میں تو اس کی زندگی کے بدلتے روپ کا خود گواہ تھا۔۔۔
زوپہ جادو کی چھتری کی طرح اُسے کسی بھی رنگ میں رنگ سکتا تھا۔
گل جاناں شعلہ جوالا نظر آرہی تھی۔ لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں کے کناروں پر زندگی کی برنی ہوئی مسختیاں باریک لائنوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ اس کا جسم بھرپور تاثر دے رہا تھا۔ وہ پہلے والی گل جاناں نہیں تھی۔ وقت نے اسے نراشنے میں خاصی کارگیری دکھائی تھی۔

کچھ دیر پہلے میں اور رحمان فرخزاد انگریزی بولتی ماکہ سے بھاؤٹے کرنے کی گنگ و دوکر رہے تھے۔ میں نے کہا میڈم خوبصورت ہیں ہمارا بھی حق ہے۔ ہم امیر نہیں ہیں۔ ہمیں مسٹر زاہد شفیق نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔
وہ زور سے ہنسی۔ بولی۔ دیکھیے۔ میں سبزی نہیں بیچتی۔ میں تو بس کمیشن لیتی ہوں۔ سوسائٹی میں میرا ایک مقام ہے۔
میری کوٹھی کے ریٹ مقرر ہیں۔۔۔ وہ بڑے خوبصورت دھوئیں کے دائرے بناتی ہوئی ہمیں تباہی تھی۔ وہاں بیٹھے مجھے اپنا آپ بڑا حقیقہ لگ رہا تھا۔ وہ مذہب سوسائٹی کی عزت و اعرورت تھی، کیونکہ دولت بہت سے عیوب کی پردہ پوش ہے۔
رحمان دوسرے شہر سے آیا تھا۔ اس کی بیوی چھوٹے سے قد کی خوبصورت عورت تھی جس نے چار بیٹوں کو جنم دیا تھا اُسے اپنے شہر سے عشق تھا۔ لیکن ہم مرد۔۔۔ ہماری بھوک کے کتنے انداز ہوتے ہیں۔ رحمان جب بھی لاہور آتا مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا۔

ہمارا سودا چمک گیا۔ اور اس کمرے میں گل جاناں تھی۔
میں نے کہا گل جاناں یہ تم ہو۔ میں نے اکیٹنگ کرتے ہوئے آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملا مجھے ہر قسم کی عورت کو بھانے کے گڑ آتے ہیں۔

وہ زور سے ہنسی۔۔۔ مسٹر ظہیر آپ، آہ مجھے امید نہیں تھی کہ میں دوبارہ کبھی آپ سے مل سکوں گی۔
میں حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ میں جوازی تلاش میں تھا۔ لیکن وہ فطری طوائف نہیں تھی۔۔۔ اسے تو باتیں کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ شاید وقت نے اُسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اس کا کمرہ سجا ہوا تھا۔
ہم دونوں آسنے سلنے کھڑے تھے۔ اور برسوں کے لمبے سائیں سائیں کتے میرے ذہن کی سکین پر گردش کر رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں لرزاں تھیں۔ کیا میں آنکھیں جھپکالوں۔ کیا مجھے شرمندہ ہونا چاہیے۔ لیکن میں خاموش رہا۔
 ”مسٹر ظہیر وہ میری سچائی تھی۔ اور یہ میری ضرورت۔ انسان کب تک سچائیوں کا تعاقب جاری رکھے۔ اس نے سگریٹ کا
 دھواں مرغولوں کی صورت میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس کے لیے میں ساٹھ پن تھا۔
 میں کیا کہتا۔ جذباتی تعلق کی ڈور کو واقعات کے ڈھیر سے ڈھونڈ کر پھر سے باندھنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔ اور میرے پاس
 وقت نہیں تھا۔

میں اکثر آپ کو یاد کیا کرتی تھی۔ اس وقت جب دوسروں کے لیے جان الفاظ مجھے بر کرتے تھے۔ اس وقت جب میں جھوٹ پر یقین
 کرتے ہوئے تلخوں سے چٹکارا پلانے کی خواہش کرتی تھی۔ اس وقت جب میرے اندر کی مری ہوئی عورت کلبڈا کر زندہ ہونا چاہتی، اور
 اس وقت بھی جب میں خوبصورت جھوٹ سننے کے لیے تڑپ اٹھتی تھی۔ اور شاید اس وقت بھی جب ایک چھوٹا سا گھر اور اس میں رہتا
 ایک بچہ میرے تصورات میں مجھے اپنی طرف بلاتا۔

لیکن گل جاناں ان ساری سوچوں کا محور میں کیونکر تھا۔ میں جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔
 ”مسٹر ظہیر وقت گزر گیا۔ میرے جسم پر سے بھی۔ آپ کی یادوں پر سے بھی۔ لیکن میں وہیں کھڑی ہوں۔“ اور آپ
 آگے بڑھ چکے ہیں۔ میری آواز آپ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس نے دھواں پھر میری طرف پھینکتے ہوئے کہا:
 اے بون اور اظہار کرنا آگیا تھا۔ گولڈ فلیک کا دھواں میرے نکتوں میں گھس رہا تھا۔ خوشبو کا ان دیکھا ہاتھ
 میرے دل کو سہلا رہا تھا، لیکن یہ دھواں تو کروٹوں سگریٹ کا تھا۔

میں نے کہا گل جاناں تم آج سے پندرہ برس پہلے میرے لیے دو کروٹوں کے سگریٹ چھوڑ کر غائب ہو گئی تھیں۔
 ”ہاں۔ مجھے یاد ہے میں ان دو سگریٹوں کے لیے بہت سے دن تھارے انتظار میں رہی۔ میں ان کو اپنی محبت کی نشانی
 کے طور پر دینا چاہتی تھی۔ لیکن پھر میرا باپ مجھے گاؤں واپس لے گیا۔ میں رونا چاہتی تھی، لیکن تب تک مجھے بولنے کا حق نہیں تھا۔
 ”اور آج۔“ میں نے پوچھا۔

”اور آج کسی کو بولنے کا حق نہیں۔ میں اپنی مالک خود ہوں۔ جو پسند نہیں ہوتا۔ وہ میری دلیر کے اندر نہیں آ سکتا۔ اور
 جو پسند ہو۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ بند کرے میں اس کا ہتھکڑہ گونجنے لگا۔ جیسے آواز پاکی دھمک ہو۔ جیسے وہ قہقہہ
 کسی ڈبے میں بند دکھوں سکھوں کی کہانی کہہ رہا ہو۔ ملفوف آواز تہ در تہ جذبوں کا اظہار کیے بغیر ڈوبتی جا رہی ہو۔
 اس کی اور میری ملاقات کا محدّد وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بستر پر سفید چادری تھی اور سسے رضائی زیادہ زندہ لگ
 رہی تھی۔ لیکن میں نہ جانے یادوں کی ڈور کو کیوں پھینٹنے لگا۔ میں اس کی ابتدا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ حالانکہ کوئی بھی یاد کچھ بدل
 نہیں سکتی تھی۔

اُن دفوں میں ایک اخبار میں رپورٹر بن کر کوٹھ کے شہر میں رہتا تھا۔ غیر مانوس زبان اور پھر انہوں سے دُور جی

مجھے بڑا اُداس اور معطل بنا ڈالا تھا۔ میں جو مردانہ فتوحات کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اپنے آپ کو اجنبی ماحول اور غیر مانوس زبان میں گھرا دیکھ کر اپنے ہی اندر ممدود ہو گیا تھا میرے لئے زندگی ایک خلا میں ڈھل گئی تھی جس میں میرے پاؤں تلے کوئی زمین محسوس نہیں ہو رہی تھی راتوں کی طویل تنہائی اور پہاڑوں پر پڑی سفید برفِ دل کی دیرانی میں اضافہ کر دیتی، اگر ماجد خاں میرے دفتر میں نہ ہوتا تو شاید میں نوکری چھوڑ کر واپس لاہور آ جاتا۔ لیکن ماجد کی وفات میں ماحول کچھ بدل گیا تھا کوئی تو تھا جو میری بات سن لیتا تھا۔

اس روز میں اور ماجد راستہ بدل کر اخبار کے دفتر جا رہے تھے کہ اچانک راستہ ایک بند گلی پر رک گیا تھا۔ میں شاہراہ کے دونوں طرف گلیوں میں نیم وا۔ نیم تاریک۔ پختہ گھروں کی قطاریں تھیں ساری بستی دیران اور خاموش تھی۔ لیکن نیم وا دروازوں کی اوٹ سے چہرے جھانک رہے تھے، آنکھیں ہمارا تائب کر رہی تھیں۔ مجھے عجیب خوف کا احساس ہو رہا تھا ہم دونوں واپس جانے کے لئے مڑے.... وہ آخری دروازے کے پیٹ سے لگی ہنس رہی تھی۔ روشن چہرے پر مصحوبیت اور بھول پن تھا۔ گھیسوار لباس اُس کے جسم کو ڈھانپنے ہوئے تھا۔ وہ پشتوں میں کچھ کہہ رہی تھی۔

ماجد خاں نے کچھ جواب دیا اور ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے اس بند گلی سے نکل آئے۔ لیکن وہ چہرہ میری یاد میں کھد سا گیا تھا۔ ماجد خاں نے بتایا کہ وہ ہمارا انداق اُڑا رہی تھی اس کے چہرے کی یاد میرے دل میں ہوئے ہوئے ہلکے رہی تھی۔ کوئٹہ ایکدم آباد سا لگنے لگا تھا.... جیسے میرے دل کے دیرانے میں پھول اُگ آئے ہوں میں جانتا ہوں مرد کی ہر مایوسی کا علاج عورت کا وجود ہے لیکن کوئٹہ میں عورت کا وجود دیواروں کے اندر بند تھا اس کی آوازوں کا جلتے رنگ اور وجود کی رنجش کے نہ ہونے سے بازار سنسان تھے لیکن اب ان میں ایک ہنسی کی آواز آباد ہو گئی تھی یا میرے نا پختہ ذہن نے ایک بت تراش لیا تھا جو میری پوجا کے لئے کافی تھا۔ میرے تصورات نے اسے خود ہی حجم دے ڈالا تھا۔

اخباری خبریں لکھتے مردانہ آوازوں میں گھرے مجھے وہ آواز سنانی دیتی۔ پیٹ سے لگا ہولہ بڑھ کر میرے جسم سے لگ جاتا خوشبو کا انوکھا احساس حملوں پر بھیا جاتا۔ میں شاید شور اور خواہش کے ایک خاص نقطہ پر آن رکا تھا جہاں انسانی جسم دوسرے جسم کو پیکار نے لگتا ہے جہاں محبت کرنے اور کئے جانے کی خواہش ایک عورت کے تصوراتی ہیولے میں ڈھل جاتی ہے۔ یادہ صرف جسمانی آگہی کا عذاب تھا جو مجھ پر وارد ہونے والا تھا۔

میں اور ماجد خاں اب ہر روز اس گلی کے آخری کونے تک جاتے اور پھر پیٹ آتے۔ ان نیم وا دروازوں کے اندر ایک دنیا آباد تھی۔ خوبصورت بد صورت۔ خربہ بھرے۔ خوبصورت، دکش جسموں اور چہروں کی دنیا۔ جسم جو نیچے اور خریدے جاتے تھے میرے لئے یہ دنیا ایکدم نئی اور انوکھی تھی۔ لیکن ہم دونوں بعض تماہشیں تھے۔ ہمیں خریدنے کا شور نہیں تھا.... میں تو صرف اُس ایک چہرے کی جھانک دیکھنے کے لئے آتا تھا وہ چہرہ جو کبھی بھر لوہا انداز سے دوبارہ ہنستے ہوئے نہ ملا۔ اب اس دروازے کے باہر ایک بوڑھی عورت بیٹھی نظر آتی اور وہ دروازے کے اس پار نیم تاریک روشنی میں کٹری بڑی ملورائی لگتی۔ میں عورت کے اس روپ کو پہلی بار دیکھ رہا تھا میں نے تو صرف سن رکھا تھا۔

بوڑھی عورت منتظر نظروں سے ہمیں دیکھتی۔ دروازے کا پیٹ تھوڑا سا کھول دیتی اور خاموش بیٹھ جاتی۔ لیکن ہم تیز تیز

قدموں سے چلتے واپس آ جاتے۔

اس روز چھٹی تھی لیکن میں اور ماجد ایک دوسرے کو کچھ کہے بغیر اس بندگلی کی نکر تک آئے اور مڑنے ہی والے تھے کہ وہ بوڑھی عورت اُٹھ کر ہمارے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بولی۔

”تم روز واپس کیوں جاتے دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ بڑا خوبصورت ہے۔ گل جاناں اور روشنا۔ اندر آؤ۔ اور وہ ہم دونوں کے ہاتھ پکڑ کر برستی کھینچنے لگی۔ میرا خون رگوں میں دھکنے لگا۔ میرے اندر کا خوبصورت تصوراتی ہیولہ۔ اس میں خریدنے کا تو کوئی جذبہ نہیں تھا۔ محبت تو کی جاتی ہے خریدی تو نہیں جاتی۔۔۔ اور پھر ہماری غواہوں کے محدود روپے۔ جس سے آدھے مجھے گھر بھیجنے پڑتے تھے اور باقی کے زندگی کی ضروریات کے لئے ناکافی تھے۔

اس نے ہمیں اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بھیڑ دیا اس کی آنکھوں کی ضرورت نے مجھے باندھ دیا تھا چند روپے اور ایک جسم میرا وجود سنسنا رہا تھا وہ دونوں پیڑھیوں پر خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ماجد اور میں خاموش کھڑے تھے ان کے چہرے نیم روشن تھے۔ کچھ لمحے بعد ایک خاموشی سے اٹھی اور ماجد کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی وہاں ایک ہی کمرہ تھا جس میں چارپائی پر گندہ سا بستر بچھا تھا اور تاک میں سرسوں کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔

دوسری خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اُپر اٹھا کر مجھے دیکھا۔۔۔ میرا نام گل جاناں ہے۔۔۔ تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ ”بیٹھو۔“ اس نے خالی پیڑھی کی طرف اشارہ کیا اس کی آنکھوں میں گہری اُداسی تیر رہی تھی۔ قدرتی سرخ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ جیسے وہ کسی ناگوار جذبے کو مشکل سے دبا رہی ہو اس کے لباس میں مکے گولی گولی آئینے کبھی کبھار جھلکانے لگتے۔ تم روز آتا۔ واپس چلا جاتا۔۔۔ تمہارا نام کیا۔“ شاید اس نے مجھے اردو ملی پشتو زبان میں یہی پوچھا ہو گا۔ میں مسکراتا چاہتا تھا لیکن میری کئی دنوں کی تصوراتی محبت میرے سینے پر بوجھ کی مانند اتر آئی تھی۔ اور میں اسے خریدنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید چھونے پر اس کے انگ میری پوروں پر نہ اترے تو مجھے مایوس ہونا پڑے۔ اور میں مایوس ہونا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ میں تو اس رنگ میں رنگ جانا چاہتا تھا اور وہ بے حد معمولی قیمت میں مجھے ملنے والی تھی آنسو میری آنکھوں میں بھر گئے۔ میں جذباتی ہو رہا تھا۔

گل جاناں۔ تمہارا نام بڑا خوبصورت ہے۔ تم بھی خوبصورت ہو لیکن میں اب جاؤں گا۔۔۔ پھر آؤں گا۔۔۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ اس کے سفید خوبصورت ہاتھ شاندار لڑ رہے تھے دیکھو میرا جسم خوبصورت ہے اس نے سر سے چادر کو اتار دیا۔

اس کا جسم ابھی بھی اس کے گھیردار لباس میں چھپا ہوا تھا۔ اور آنکھوں میں خوف تھا۔ میرا باپ ناراض ہو گا۔ وہ روز مجھے ملتا ہے۔۔۔ مت جاؤ۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھمایا اور باہر نکل آیا۔ بوڑھی عورت میرے پیچھے آنے لگی تو اندر سے گل جاناں کی آواز آئی۔ اور وہ واپس چلی گئی۔

ماجد کے کہنے کے باوجود میں کئی دن اس گلی سے نہ گذرا مجھے اس کی آنسوؤں بھری آنکھیں یاد آتی ہیں اور میں اتوں

کو دیر تک جاگتا اس کے تصور کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتا، ہنسنا تا۔ سنوڑتا اور پھر دس روپوں کا نوٹ چھین سے اس بت پر رکھ کر اسے چکنا چور کر دیتا۔ جس کی کرچیں میرے دل میں چبھ جاتیں۔

نہیں میں ایک ٹکے ٹکے پر کینے والا، ٹھیکائی سے محبت نہیں کر سکتا میں بار بار اس جملے کو دہراتا لیکن وہ میرے لئے ابھی بھی ایک محبوبہ تھی جس کی ہنسی کی ڈور مجھے باندھے ہوئے تھی۔۔۔۔۔ میں نے اجد سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ میں اس کے تجربے کی عمریانی سے اپنی سوجھ کو داغدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ مجھے زبردستی پکڑ کر اس بند لگی کی ٹوکریاں لے گیا۔ بوڑھی عورت کے چہرے پر غربت اور بھریوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھوک تھی جو اس کے جسم کے لاغر پن سے جھانک رہی تھی۔ گل جاناں خاموشی سے اٹھی۔ اس کے ساکت چہرے پر ہنسی نہیں تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ گردش کے ایک لمحہ میں مقید کر دی گئی ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

میں اس کو ٹھہری کے روازے کے سامنے کھڑا تھا اور اگلا لمحہ اُسے مجھ سے نہ جانے جدا کرنے والا تھا یا باندھنے والا۔ مجھے یکایک احساس ہوا کہ اس بازار میں سُراور آواز کی تال کہیں سے بھی ابھر نہیں رہی تھی وہاں وہ بڑی ڈیرہ دارنیاں نہیں تھیں جو آواز کی مملکت پر حکومت کرتی تھیں۔ یہ تو جسم کا متعین جوہر تھا جس میں صرف کافی اگتی ہے اور بسا اذکے بھبھکے اٹھتے ہیں۔ مسرتوں کی دلدل میں پھنسی رد میں۔ جو چہینا بھی نہیں جانتی تھیں۔

گل جاناں کی خاموش آنکھیں مجھے گھیر رہی تھیں، شاید میری محبت کا انجام بھی جسم کی دلدل کو جانے والی راہ کی طرف ہی مجھے دھکیل رہا ہو۔ شاید میں جو مردانگی کے دروازے پر کھڑا اپنا آپ منوانا چاہتا تھا۔ صرف اسی راہ پر چل کر اپنے ہونے کا ادراک کرنا چاہتا تھا۔ میرا ذہن گڈ گڈ سوچوں سے ابھرا ہوا تھا۔ میں ایک بار پھر اُس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ پکڑا کر بھاگ آیا تھا عورت کا جسم جو بیپا جاسکتا تھا۔ خرید جاسکتا تھا۔ گل جاناں کا جسم بھی نہ جانے کتنی بار خرید جاتا ہو۔ نہ جانے کتنے ہاتھ اسے چھوتے ہوں گے۔ اس سوچ نے میرے اندر پھیل چا دی۔ میں غصے اور حسد سے دھکنے لگا میرے اندر پیدا جذبہ تو بڑا لطیف اور غیر مرئی تھا۔ ایسا جذبہ جہاں میں گل جاناں کو چھونا بھی نہیں چاہتا تھا میں محبت کے لانا فی تقدس کی کھوج میں تھا لیکن قسمت مجھے اس دلدل کی طرف دھکیل رہی تھی میں گل جاناں کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن مجبور تھا مجھے یاد ہی نہ رہتا کہ وہ شریف عورت نہیں تھی۔ وہ تو برقی اور چمچڑی ہونی پڑی تھی۔ سارا جادو گل جاناں کی آنکھوں میں تھا جو معصوم اور بے بس لگتیں۔ دوسروں میں سمٹ آنے کی خواہش سے بندھی گل جاناں کی کو ٹھہری کا دروازہ مجھ سے فاصلے پر چلا جاتا۔ میرے وجود پر بند ہو جاتا۔

یہ آنکھ مجھ کو چولی میرے اندر پھیل چا رہی تھی آہستہ آہستہ مجھے خاکستر کر رہی تھی۔ اب میں اور ماجد الگ الگ اس بند لگی کے موڑ ٹھک جاتے میرا راز میرے اندر بند تھا اور میں اس کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔

اس روز ماجد خاں نے آکر کہا تھا۔ ظہیر گل جاناں تو بڑی ہی خوبصورت اور معصوم ہے۔ تم اس کے پاس کیوں نہیں جلتے یا آجکل بازار تماش بینوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اس کی کو ٹھہری کا دروازہ اکثر بند ہوتا ہے لیکن وہ نہیں یاد کر رہی تھی۔

تمہاری شکایت کر رہی تھی۔ میں آج اس کے پاس گیا تھا۔
میں نے اس سے کچھ بھی نہ کہا۔ اسی شام میں نے اپنا سامان ایک اور کمرے میں منتقل کر دیا۔ مابعد خاں میرا دوست تھا لیکن اس نے سرے جذبات پر غماخ مارا تھا اس نے میرا لحاظ نہیں کیا تھا۔ اس رات میں گل جاناں کے پاس گیا۔
دس روپے دیتے ہوئے میں نے اپنی تصوراتی مجبور کو ڈال دیا۔ جیسے اپنے ساتھ کی گئی ساری زیادتیوں کا حساب چکا رہا ہوں جیسے مابعد خاں کے چہرے پر تھوک رہا ہوں۔ گل جاناں حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ خوش تھی۔ اپنے آپ کو سچ دینے والی کیفیت تھی۔
”ظہیر خاناں... تم بہت اچھا ہو... تم ہمیں بہت اچھا لگتا ہو“ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

اس روز پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بہت خوبصورت باتیں کر سکتا ہوں۔ اُسے غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا ہوں اور میں نے اپنے دل کو اس ساری واردات سے الگ کر کے گل جاناں کو وہ ساری خوبصورت باتیں کہہ دیں میں نے اپنی تصوراتی مجبور کو بھینٹ چڑھا دیا۔
میں اپنے اندر سے اداس اور خالی تھا لیکن گل جاناں کے چہرے کی ہنسی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔
تب ہی تو کچھ دنوں بعد اس نے کہا تھا۔

”ظہیر خاناں مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ۔ اپنی بیوی بناؤ۔ میرا باپ بڑا ظالم ہے۔ وہ مجھے ساری عمر بیتا رہے گا۔ وہ محبت کی وجہ سے مجھے ظہیر خاناں کہتی تھی اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا لیکن اب شاید میں اس سے اتنی شدید محبت نہیں کرتا تھا وہ میری محبوبہ نہیں رہی تھی وہ تو محض ایک جسم تھی جس کو میں خریدتا تھا اور اس سے وعدہ نبھانا ضروری نہیں تھا۔
اس رات میں سوچتا رہا۔۔۔ اپنے آپ کو جانچتا رہا۔۔۔ چند دنوں میں ہی میں انارٹی سے کھلاڑی بن چکا تھا۔ شاید پہلے تصورات بھی ان ساری رومانوی داستانوں کا اثر تھا جو ایف سیلو کی قصوں کہانیوں نے میرے اندر پیدا کر دیے تھے۔ میں خود دھوکا کھا رہا تھا۔۔۔ لیکن اب اسے دھوکا دے رہا تھا۔

گل جاناں نے مجھے اپنے دو جوڑے اور چاندی کے کپڑے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ظہیر خاناں تمہارے گھر میں جب یہ پہن کر بھڑوں گی۔ تو بہت خوبصورت لگوں گی اپنی آنکھوں میں کجرا نگاؤں کی تو میری آنکھیں زیادہ خوبصورت لگیں گی۔ میرے گاہک میری آنکھوں کی بڑی تعریف کرتے ہیں... خوبصورت ہیں نامیری آنکھیں۔ اور وہ آنکھیں کھول کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔
لیکن میں اسے اپنی دامن نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کے جسم سے مجھے یکا یک پسند آنے لگی تھی اس کی خوبصورت آنکھیں میرے پرے ہٹنے پر سکڑ گئیں۔ ظہیر خاناں مجھے ساتھ لے جاؤ۔ وہ رونے لگی۔ میں باتوں سے اسے بہلاتا رہا۔ اس کے آنسو بونچھتا رہا اور اپنی کشش پر خوش ہوتا رہا۔ ہم دونوں کے اندر رنج نہیں تھا۔ یا شاید رنج مجھے سچ کی مزدورت نہیں تھی۔
اس کے بعد میں کتنے ہی دن اس کے گھر نہ گیا میری محبوبہ کا تصوراتی ہیولہ ہولے ہوئے میری طرف بڑھتا اور پھلتا رہا لیکن اس کا چہرہ نہیں تھا۔

وہ کوئٹہ میں میری پہلی عید تھی۔

وہ گل جاناں کے پسندیدہ سگریٹ تھے جنہیں پیٹے ہوئے وہ بڑی مسرور دکھائی دیتی تھی۔ مجھے دگا جیسے میری ہتھیلی کرب اور اذیت سے اٹیٹھ گئی ہو۔ میں گل جاناں کو یوں اپنے دل کے اس قدر قریب نہیں سمجھتا تھا۔ میں دھاریں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔ لیکن آنسو کہیں میرے اندر ہی اندر گرنے لگے۔

ظہیر خاناں رونا نہیں... دیکھو گھر کی دیرانی دیکھو... وہ دونوں تھاؤں تھا اب کوئی اور باپ۔ کوئی بھائی۔ کوئی شوہر کسی بیٹی بہن یا بیوی کو بیچنے کے لئے لائے گا۔ مجھے کرایہ دے گا۔ چوکیداری کا کسے گا۔ گاہک کو لانے کا کہے گا.... اس طرح میری روزی لگے گا... میرا خالی پیٹ بھرے گا۔

اس نے آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں اور پشتو لوک گیت کا پٹہ گانے لگی.... مجھے الفاظ کے مطلب نہیں آتے تھے شاید اس میں جانے والے محبوب کے فراق کا ذکر ہو گا اس کے حسن کا بیان ہو گا یا وہ اپنی گزری جوانی کا نوحہ کہہ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے اس میں صرف اس کے پیٹ کی بھوک کا ذکر ہو۔

میں نے دونوں سگریٹوں کو وہیں پھینک دینا چاہا۔ لیکن گل جاناں کی دوری نے میرے اندر محرومی کا دکھ بھر دیا تھا۔ میں نے ٹھٹھی کو زور سے بند کر لیا جیسے گل جاناں میرے قبضہ میں آگئی ہو اور آسمان پر سیاہی میں تارے چمک رہے تھے۔ بازار دیران ہو چکا تھا میں نے کہا کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں سے آئی تھی... کدھر چلی گئی۔ وہ خاموشی سے مجھے گھورنے لگی پھر بولی۔

دیکھو ظہیر خاناں۔ طوائف اور سگریٹ دونوں ایک جیسا ہوتا۔ سگریٹ کو پی کر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اور طوائف کے پاس آکر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا جاؤ اپنے آپ کو آزاد کرو۔ اس کی یاد کی زنجیر سے خود کو موت باندھو۔ اس بازار سے بھاگ جاؤ... اس گندگی سے بھاگ جاؤ... نہیں تو میرے مانند بوڑھا اور بیکار ہو جائے گا بھاگ جاؤ... بھاگ جاؤ... بھاگ جاؤ... بھاگ جاؤ... اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں... اس کے لبوں پر کسی ادھر سے گیت کے بول تھے۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی چوڑھٹ کو پکڑ لیا۔

ظہیر خاناں ہم ڈھونڈنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ سگریٹ کی خوشبو میرے ناصوں میں گھس رہی تھی۔ میرے دماغ میں گھس رہی تھی۔ میری آنکھوں کی نمی میں ڈھل رہی تھی۔

آنے والے دن ایک کربناک تمنائی میں ڈھل گئے بیتا اور برتا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے یاد آنے لگتا۔ لمحے جو میری ہتھیلی سے گر کر کلم ہو گئے۔ گل جاناں۔ گل جاناں کا روشن چہرہ... اس کے روشن اور چمکیلے جسم کا۔ فانوس میری یاد کے اندھیروں میں چمکنے لگتا اب میرا دل کوٹھ سے اچاٹ ہو گیا تھا کوٹھ بے گیاہ پتھر ملی پٹانوں میں ڈھل گیا تھا۔ ایسا ہو گا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔ انسانی دل کی تخلیق کن عناصر سے ہوئی ہو گی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میرے اندر تو بہت سا جھوٹ بھرا ہوا ہے جسے میں الفاظ کے پیمانوں میں پیاس سے خشک یوں کے اندر انڈلیتا رہتا ہوں... میں اب ایک شاعر کھلاڑی ہوں میں نے واقعات اور حالات کو ہمیشہ اپنے حق میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی انا کو خود پسندی کی دھند میں لپٹا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن

وہ سچائی کا ایسا لمحہ تھا۔ جو میرے دل کی دیوار توڑ کر داخل ہونا چاہتا تھا۔ ایک چہرہ زندہ ہو کر میری سوچ میں سمٹا ہوا تھا۔۔۔ میں روز اس گلی تک جاتا بوڑھی عورت ہمیشہ کی طرح غلام میں گھور رہی ہوتی وہ کمتی۔ دیکھو ظہیر خانان میری زندگی اس چند گز زمین سے بندھی ہوئی ہے۔ لیکن اس بند گلی کو دیکھو۔ راستہ یہاں آکر رک جاتا کہیں نہیں جاتا۔ اسی طرح یہاں آیا عورت بھی اپنے اندر بند ہو جاتا۔ وہ کھلے بھی تو کس کے لئے۔ سب کچھ اس کے اندر دم توڑ دیتا۔ یہاں کچھ نہیں رہتا۔

اس نے اپنے دل کی طرف اشارہ کیا اس کی آنکھوں میں دکھ بھری کمانی بھری ہوئی تھی شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ یہاں تو رنگ ہی رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ دوسروں کے جذباتوں کے ساتھ اس رچائی جاسکتی ہے۔ جھوٹ بولا جاسکتا ہے۔

آج میں دل ہی دل میں مسکرا سکتا ہوں میں رومی خریدنے والے کی طرح رو کی ہوئی عورتوں کا سودا الفاظ کے سکوں سے کرتا ہوں کھنکھناتے سکے جن پر چابست کی چکیلی پتی چڑھی ہوئی ہوتی ہے فتح و نقصان کا حساب تب ہوتا ہے جب ہاتھ میں ہوتے وصول کے کچھ باقی نہیں بچتا۔ تب تک بہت کچھ حاصل ہو چکا ہوتا ہے لیکن اُن دنوں میں زندگی کے ابتدائی سبق ہی سیکھ رہا تھا۔ میں نے کوشش کی نوکری چھوڑ دی اور لاہور کے اخبار میں کام کرنے لگا

وہ لاہور کا سب سے بڑا ثقافتی میلہ تھا، میلے کا میدان اجنبی چہروں، قد آور گھوڑوں۔۔۔ بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں اور خیموں کی تسنی طنابوں سے بھر گیا۔ مختلف اصناف کے طلحے رنگین ریشمی لباسوں میں لوگ رقص کی تیاریاں کرتے ڈھول بجیرے نعنا کوشور سے بھر دینے زمینداروں کے کارندے انعام کے لئے گھوڑوں کے مشک، جسموں کو تیل سے چمکاتے اور ہمیشہ کی طرح باہر کی طوائفوں نے مختلف علاقوں میں ڈیرے ڈال دیے۔ زندگی اپنی ساری خوبصورتیوں اور بد صورتیوں کے ساتھ لاہور کی صبحوں شاہوں میں گھلی رہتی اور میں کمرہ گلے میں ڈالے اپنے اخبار کے لئے خبروں اور تصویروں کے تعاقب میں شہر کی خاک چھاننا رہتا۔

تب میں لے اے ایک تنگ گلی کے چھوٹے سے گھر کی چوکھٹ پر کھڑے دیکھا۔ وہ گل جاناں ہی تھی مجھے لگا جیسے کریون سگریٹ کی خوشبو اچانک میرے چاروں طرف اُڑنے لگی ہو۔ گزرے برسوں کا بوجھ اس کے چہرے پر تھا۔ جیسے وہ مسلسل کسی انتظار کے کرب سے گذرتی رہی ہو۔ وہ میرا انتظار نہیں تھا اس کے دل کی دلیہ رنگ نہ جانے کتنے لوگ آکر دستک دیتے رہے تھے اس پر نہ جانے کتنے قاتلوں کے نشانات تھے وہ ہمیشہ کی طرح دبی دبی مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں لمبی مسافت کی تھکاوٹ تھی۔ اس نے رنگین شلواریں پہن رکھی تھی وہ یقیناً آج بھی میلے کی رونق بڑھانے کے لئے لائی گئی تھی۔

میں اس کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا۔ جذباتوں کے اظہار کے لئے خاموشی سب سے بڑی زبان ہے۔

”اندر آؤ۔“ میرا شوہر اندر ہے۔۔۔ اس کی آواز میں جذباتوں یا تعلق کی خوشی نہیں تھی۔

ہم دونوں کپڑے کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر اندر چلے گئے چھوٹے سے گھر میں برآمدے کے پیچھے دو کمرے تھے جو بجلی سے روشن تھے۔۔۔۔۔ اگلے بستروں پر خوبصورت پلنگ پوش تھے اور دیواریں نئی نئی لکی کروائی گئی تھیں دو درجوان لڑکیاں اپنے گھیر دار لباس میں بھی ہوئی برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔۔۔ سخت چہرے اور سیاہ لمبی مونچھوں والا دروازہ درمیان میں اندر جانے پر اٹھ کھڑا ہوا

گل جاناں کرسی لاؤ۔ بیٹھو صاب، بیٹھو۔ وہ جلدی ہے بولا میں کروں سگریٹ کی خوشبو کو آہستہ آہستہ یاد کی رتہ سے اُبھرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر وہ خوشبو آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی، مرد اور مرد کا دل۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا وہ مرد بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر میرے کندھے سے لگ کر رونے لگی تعلق کی باریک ڈور شائد ابھی تک موجود تھی۔

میں نے کہا: گل جاناں ملنے میں بڑی دیر کر دی۔ میں جانتا تھا مجھے وہ بہت کم یاد آتی تھی۔ لیکن میں اس کے آنسوؤں کی قیمت ڈالنا چاہتا تھا اُسے خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں سینہ دکھ کا کردار بارہ داخل ہونا چاہتا تھا وہ زندگی کے جبر سے گیدی ہوئی عورت تھی اور یہ جذبہ اس کی نظروں میں مکھیا ہوا تھا اس کا شوہر باہر سے چائے کا ٹرے پڑے اندر آیا۔۔۔ میں نے چند روپے ٹرے میں رکھے چائے پی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ اس کا شوہر پھر چلا گیا۔

”ظہیر باؤ“ میں اکثر آپ کو یاد کیا کرتی تھی۔ میں نے آپ کا انتظار کیا تھا۔۔۔ اگر آپ آجاتے تو شاید آج میں یہاں نہ ہوتی شاید میرا کوئی اپنا گھر ہوتا۔۔۔۔۔ اپنے بچے ہوتے۔۔۔۔۔ میرا شوہر مجھے بیچتا ہے مارتا ہے اور سارے روپے چھین لیتا ہے شاید تب ایسا نہ ہوتا۔ وہ پھر رو رہی تھی۔ جیسے بیتے دکھ کی لہر بار بار اس کے دل سے ٹکرا رہی ہو۔۔۔۔۔ وہ ڈوب رہی ہو۔۔۔۔۔ میں اس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا میں آگے بڑھ کر رک گیا۔۔۔ میں اس کے شوہر کی موجودگی سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا گل جاناں میں پھر آؤں گا وہ زور سے ہنسی۔ ظہیر باؤ میرے شوہر سے ڈر رہے ہو۔۔۔ میں کوئی شریف زادی تو نہیں ہوں میرا شوہر گاہک کو دیکھ کر ناراض نہیں ہوتا اس نے مجھے منگنے والوں خریدا تھا اور وہ ساری رقم سود کے ساتھ بار بار وصول کرے گا۔۔۔۔۔ اس نے ڈبیر سے سگریٹ کو نکالا اور پیسنے لگی۔

”کون سا برانڈ ہے گل جاناں“۔۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔

”ظہیر باؤ کریٹون نہیں۔۔۔۔۔ اب کریٹون نہیں ملتا۔۔۔۔۔ وہ سگریٹ تو میرے ایک یار نے دئے تھے۔۔۔۔۔ لیکن اب میں خود خریدتی ہوں۔۔۔۔۔ مانگے کے مختلف برانڈ کے سگریٹ پیسنے سے مزہ نہیں آتا“ اس نے آنکھوں کو پلو سے خشک کیا اور تیز تیز کش کھینچنے لگی۔ وہ اب بھی بائیس چوبیس برس سے زیادہ عمر کی نہیں تھی۔۔۔۔۔ اس کے جسم کے خطوط بھر کر خوبصورت ہو گئے تھے اس میں کچھ پن کی بے ترتیبی نہیں تھی وہ اگر خوبصورت لباس پہنتی تو خوبصورت ترین عورت لگتی۔۔۔۔۔ میں نے کیمرے سے اُس کی ایک تصویر بنائی اور باہر نکل آیا۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا یہ تعلق کی پہلے والی ڈور تھی یا میں جو زندگی کے ہر لمحہ سے لطف لینا سیکھ گیا تھا۔ اسے بھی ایسا ہی لمحہ سمجھ رہا تھا اس کے جسم کے دلکش خطوط بار بار میری نظروں میں گھوم رہے تھے اسے باتیں کرنا آ گیا تھا وہ اردو بھی اچھی طرح بول سکتی تھی اسے سگریٹ کے ادھورے دائرے بنانے بھی آ گئے تھے۔ اور اس کے لبوں کی بناوٹی مسکراہٹ بڑی کاروباری ہو گئی تھی۔

میں جو ٹوٹے دلوں اور رگیدے گئے جذبات کی ردی کو گوندھ کر مجبواؤں کو تخلیق کرنے کا فن سیکھ گیا تھا۔ ایک اور مجبوعہ کو تخلیق کرنا چاہتا تھا۔

میرے دوست کہتے ہیں کہ میں پھینکے ہوئے کنکڑے اور پھٹی پٹنگیس اکٹھی کرتا رہتا ہوں خود کو جو بڑا لیڈی کلر اور سیرو سمجھتا ہوں معنی ایک خوشامد پسند عاشق ہوں میں ان کا الزام سن کر برا نہیں مانتا۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ ان پٹنگوں کو مرمت کر کے جب میں نغماؤں میں بلند کرتا ہوں تو ان کا کوئی دعوے دار نہیں ہوتا وہ صرف اور صرف میری ملکیت ہوتی ہیں۔ اور گلی جاناں بھی اپنوں کے ہاتھوں پامال کی جا رہی تھی۔ اس کے گاہک محبتوں کے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ وہ اُسے گوشت کا ایک ٹکڑا سمجھتے ہیں میری باتیں اس کے اندر محبت کرنے والی عورت کو جگا رہی تھیں اور وہ بت کی طرح سیدھا بت تراش کی آنکھوں کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھ سکتی اور میں اس کا بت تراش تھا۔

اس کے اندر کی عورت کو جگانے اور پھر اسے اپنی گرفت میں لینے کی شدید خواہش میں میرا سکوتر بار بار اس کے گھر کے سامنے رک جاتا۔ شہر کے سارے راستے اس کی دہلیز پر رک جاتے وہ گلی بند نہیں تھی لیکن میرے لئے وہ اب بھی بند گلی ہی تھی۔ میں نے اسے الفاظ کے نائوس میں تید کر لیا تھا میں جو عورتوں کو کم ہی نظر آتا تھا الفاظ کا نشہ بی کر سوائے میرے کہیں اور نہیں دیکھ سکتی۔ تھیں، میں یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں آئینہ میرے تصورات کا ساتھ نہیں دیتا۔ اور میں اُسے بار بار بھٹاتا ہوں میں خوبصورت مرد نہیں ہوں لیکن بھر بھی لڑکیاں محبت بھرے خطوط لکھتی ہیں جنہیں پڑھ کر میرے اندر نیا اعتماد پیدا ہوتا ہے اور میں آئینے کے سامنے کھڑے مرد کا مذاق اڑانے لگتا ہوں۔

دیکھا۔۔۔ یہ میں ہوں۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم کبھی مجھے مات نہیں دے سکتا۔ میں مسکراتا ہوں۔ اور آئینہ والا آدمی غائب ہو جاتا ہے۔ میرے پاس سوائے الفاظ کے خود اپنے کے اور کوئی خزانہ نہیں اور میں اپنے الفاظ کو بڑی محنت سے تراشتا۔ سنوارتا اور سجاتا ہوں۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا میں اکثر اپنی محبوباؤں کو مکھی بنا کر خود پسندی کی دیوار سے چپکا دیتا ہوں۔۔۔ اور میری انا کا دیو اسے ہڑپ کر جاتا ہے۔

گلی جاناں بھی ایسی ہی مکھی تھی لیکن اس کے شوہر کا چہرہ بار بار میری راہ روک لیتا۔ اس روز میں بازار سے دو خوبصورت کرتے لے کر اس کے پاس گیا اُسے بجا رہا تھا۔ مازج کی سردیاں سورج کی جادو اور ڈھے سڑکوں پر اونٹن رہی تھیں وہ گھر میں اکیلی تھی۔ شاید اس کا شوہر دوسری لڑکیوں کو کسی میلے میں لے کر گیا ہوا تھا۔ وہ نڈھال لیٹی ہوئی تھی۔ کہنے لگی ”بھیر باؤ۔۔۔ آؤ۔ کہیں بھاگ جائیں۔۔۔ میں اچھی عورت ہوں۔۔۔ میرا دل تمہاری بیوی کہلانے کو چاہتا ہے۔۔۔ میرا شوہر کہیں گیا ہوا ہے۔۔۔ وہ ہمیں ڈھونڈ نہیں سکے گا۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے تم ہی تو یہی کہتے ہو۔“

اس نے اٹھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اس کے ہاتھ دھک رہے تھے۔ بجا رہے اس کا خوبصورت چہرہ گہرا گلانی ہو رہا تھا۔۔۔ وہ اونچی آواز میں رو رہی تھی۔

میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح اُسے کہیں بھی لے کر نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے کہا ”گل جاناں بجا اتر جائے گا تو سوچیں گے۔“

ابھی آرام کرو۔۔۔
 شاید آج آرام کے بعد تم آؤ ہی نہیں میرے پاس صرف آج ہی کا وقت ہے۔ میں تمہیں دوبارہ کھونا نہیں چاہتی۔۔۔
 اس کے بازو میرے گرد پٹ گئے۔۔۔ آؤ چلیں۔۔۔ آؤ چلیں۔۔۔ آؤ چلیں۔۔۔ شاید بخار کی تیزی میں وہ ہنسیاں بک رہی تھیں۔۔۔
 تم ہی نے تو مجھے عورت ہونے کا احساس دلایا ہے۔۔۔ آؤ چلیں۔۔۔ اس کے شوہر نے اندر آکر اسے مجھ سے جدا کیا۔۔۔ اس کے چہرے پر غصہ سی غصہ تھا۔۔۔ لیکن گل جاناں کی آوازیں سچائی ہی سچائی تھی۔
 ”باؤ جی۔ آج آپ چلے جائیں جب وہ تندرست ہوگی تو پھر آجائے گا۔۔۔ میں نے اس کے ہاتھ میں کچھ روپے تھماتے ہوئے خدا حافظ کہا اور باہر چلا گیا۔

میں بہت دن اس کے پاس نہ گیا میلے کی بساط اٹھ چکی تھی میرے روپے ختم ہو چکے تھے۔ اور مجھے بہت سے ادھورے کام پیشانے تھے۔
 بہت دنوں بعد جب میں اس کے گھر گیا تو وہاں گل جاناں نہیں تھی۔ دونوں لڑکیاں بنی سنوئی برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

”ظہیر باؤ آپ بڑی دیر کر کے آئے۔ باجی تو اب یہاں نہیں ہوتی۔ اس کے شوہر نے اسے ایک بڑی ناگہ کے پاس بڑے مہنگے داموں بیچ دیا ہے۔“
 مجھے لگا جیسے میری ہاتھ سے کوئی مہنگی چیز چھین سے گر کر ٹوٹ گئی ہو۔

”کسیوں“ میں مشکل سے پوچھ پایا۔
 وہ بخاریں بار بار آپ کا نام لیتی تھی۔ اٹھ اٹھ کر آپ کو پکارتی ہوئی باہر بھاگتی تھی اس کا شوہر اسے لڑتا۔ گایاں دیتا تھا۔ اسے ڈرتا وہ آپ کے ساتھ بھاگ نہ جائے۔
 میرے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی، میں اس کی سچائی کا حقدار نہیں تھا۔ لیکن میری انا کا غبارہ پھول کر بہت بڑا ہو گیا تھا۔ میں بہت بلند اڑنے لگا۔ ایک عورت ایسی تھی جو میرے لئے گایاں کھاتی اور مار سہتی رہی ایک طوائف جس کے اندر کی عورت پر میرا قبضہ تھا۔۔۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔

ظہیر باؤ پنجن پاک کی قسم۔ میں سچ کہتی ہوں اس نے مجھ سے پہلے آپ کا لایا ہوا کرتا پہنا تھا۔ وہ کہتی تھی وہ ساری عمر اپنے تن سے نہیں اتارے گی۔۔۔ وہ اسے اپنا کفن بنائے گی۔۔۔ ظہیر باؤ۔ کسی تو پیار کرنا جانتی ہی نہیں وہ کبھی یوں پیار کا اظہار نہیں کرتی۔ آپ تو بڑے نصیبوں والے ہیں۔ وہ آپ کا نام لیتے لیتے موٹر میں بیٹھی تھی۔۔۔ اُسے اس کرتے سے آپ کے ہاتھوں کی خوشبو آرہی تھی۔ آپ چلی جائیں نہیں تو وہ آکر آپ سے لڑے گا وہ دونوں بھی خوفزدہ مگ رہی تھیں۔ گل جاناں ایک بار پھر مجھے وقتی انتظار اور کرب میں مبتلا کر گئی تھی۔ میں جانتا تھا اس کی یاد محض وقتی دکھ دے گی اور پھر بہت سی یادوں کی چھاؤں میں چھپ جائے گی۔ میں نے اپنی ذرات کے انق پر بہت ساری محبتوں کی دھنک سجا رکھی تھی اور

کسی بھی واردات میں میری پوری رات شامل بنی ہوئی تھی۔ میں نے گل جاناں کا پتا معلوم کرنا چاہا تو وہ نور سے منہس دی۔
 طیسر باؤ۔ بکاؤ مان کا کیا ٹھکانہ۔ نہ جانے آگے کتنے ہاتھوں میں یکے کی کون سے کوٹھے پر بسیرا کرے گی۔ سارا شہر ہی بکاؤ
 لگتا ہے سارا شہر ہی غمیدار لگتا ہے کاج بیل گل کوئی اور شہر۔ گل جاناں بھی ہمارے جیسی ہی بد نصیب ہے۔
 گندگی کے ڈھیر۔ آوارہ کتے۔ خوبصورت چہروں والی لڑکیاں جو کاغذ کے ڈھیروں سے بے کاری میں اکٹھی کر رہی تھیں اور
 مہٹائی کے تھانوں پر بھینچناقی مکھیاں دربار پر اس کی جھولی پھیلانے ضرورت مند زائرین۔ عورت کا دل۔ عورت کا جسم جو بکاؤ
 مال ہے داپن آتے ہوئے میں نے پوری دیانت داری سے اس کی کمی محسوس کرنے کی کوشش کی، لیکن میری یادوں کے ڈھیر میں وہ
 صرف ایک چہرہ تھی.... صرف ایک چہرہ۔

میں جانتا ہوں اس کا چہرہ میرے دل کے کنیوس پر بار بار آنکھ چولی کھیلے گا۔ اپنی فتوحات کی داستان سمجھتے ہوئے میں اس کے
 ذکر پر مسکرایا کروں گا میرا دل نہ جانے کیوں مسافرت میں تھا میرے دل کا سناں کسی بھی وجود سے بھرنا پاتا۔
 شاید میرے اندر شکل و عورت سے محرومی نے تقاضا کر رکھا تھا اور میں دلوں کو تنہا نہیں کر کے محرومی کے جذبے کو تسکین دینا چاہتا
 تھا سب پر پوری دسترس چاہتا تھا جب وہ میرے ہاتھوں میں تڑپتے ہیں تو مجھے غیر شعوری طور پر بے حد تسکین ملتی ہے ایسی ہی تسکین
 جیسی میری سوتیلی ماں کو میرے وجود کو و افکار کر کے ملتی تھی۔ ایسی تسکین جو میرا سکا باپ میری ہر بات کا مذاق اڑا کر حاصل کیا کرتا تھا میں
 عورت کے اندر آگ دہکتا ہوں۔ اسے اپنے ستون پر ایسا دھرتا ہوں اور پھر اس ستون کو ہلانے لگتا ہوں۔ وہ عورت مدد کے
 لئے میری طرف بڑھتی ہے اور میرے جسم کی بھی ایسا ہو جاتی ہے اسے میرا چہرہ نظر نہیں آتا وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتی ہی کب
 وہ تو میرے انصاف کے تعاقب میں چلنے لگتی ہے جلدی ہی جاتی ہے۔ خواب دیکھنے ہوئے.... اور میں ان کی
 آنکھوں میں بے خوابوں کی تبسیر میں جاتا ہوں.... کبھی جاگنے پر میں انہیں جاگنے ہی
 کب دیتا ہوں.... انصاف کے نشے کی عادی ان کی دیران اور دھتکاری روحیں میرا تعاقب کرنے لگتی ہیں.... یہاں تک کہ وہ پوری
 طرح جاگ نہ جائیں یا میں راستہ نہ بدل لوں شہر تو گنجان ہے اور کسی کو ڈھونڈنا آسان نہیں ہوتا۔ اور خواب محض سراب ہی سراب ہیں

گلبرگ کے نئے کوٹھی خانوں میں میڈم شائستہ کا کوٹھی خانہ سب سے زیادہ مشہور اور مہنگا تھا خوبصورتیوں کے نئے طریقوں
 نے چہروں کو خد و خال سمیت بدل کر رکھ دیا ہے رنگوں کے پیچھے سے کسی کو پہچاننا آسان نہیں اور گل رخ اس کوٹھی خانے کی سب
 سے مہنگی کال گرل تھی جو بہترین لباس میں گاڑی کو فرائٹ سے بھگاتی تو جوان شیڈیں بجانے لگتے.... اور میڈم کا فون بہت ہی
 مصروف ہو جاتا۔ یہ سارا کاروبار زیر زمین تھا بنظر وہ میڈم شائستہ کی بڑی بیٹی تھی.... امیرزادی۔ بگڑی ہوئی فیشن ایبل سودا
 خنہ طے ہوتا.... بڈل مین روپیہ وصول کرتا اور پھر کسی ہوٹل کے خوبصورت کمرے میں دقت کو رنگین کیا جاتا۔ مہنگی چہریں ہمیشہ پرکشش
 ہوتی ہیں.... لیکن میں آج بھی اپنی جیب میں پڑے روپوں سے غافل نہیں ہو سکتا تھا.... میں جس زندگی کے پیچھے دوڑتا رہا تھا
 وہ میری دسترس سے ہمیشہ دور رہتی.... میرے پاس اپنا گھر۔ اپنی گاڑی اور اپنی بیوی نہ تھی لیکن گل جاناں پھر بھی میرے لئے
 آنکھوں میں خواب سجائی تھی شاید عورت کا دل پرانے خوابوں سے رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہتا۔ یا وہ ایک پرانے طے والے کو اپنے لئے

وجہ افتخار سمجھتی تھی اپنی کشش کے لئے ایک کسوٹی۔ یا اسے اب بھی مجھ سے ان باتوں کی توقع تھی جو اسے دنیا کی انتہائی خوبصورت عورت بنا دیتیں۔ اُس کے ذہن سے طوائف ہونے کی گندگی دھو کر باعصمت ہونے کی پاکیزگی دے دیتیں۔ میں اب باتوں کے فن میں اور بھی ماہر ہو چکا تھا ایسا عاشق جو سرتاپا اس کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا جو اس سے بے لوث محبت کرتا تھا۔۔۔ میں جانتا تھا میری گانٹھیں الفاظ کے سکوں کے سوائے کچھ بھی کیا۔ اور مجھے قیمت تو بہر حال چکانی تھی۔

وہ کہتی مٹر ٹیسر تم نے میرے خواب چھین لئے۔۔۔ اور اب میرے خواب زیادہ مہنگے ہو گئے ہیں۔۔۔ لیکن پھر بھی کہیں ناکہیں اس خواب کے گھر میں تمہاری ہنسی موجود ہوتی ہے تمہاری باتیں میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہیں، میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔۔۔ مسکراتے لگتی ہوں، میرا سانس کھنسی کی وجہ پوچھتا ہے تو میں تمہارا ذکر کرتی ہوں تمہاری باتوں کی خوبصورتی کا تذکرہ اسے چونکا کر دیتا ہے وہ بھی مجھے وقتی طور پر باتیں کر کے بھانا چاہتا ہے لیکن اس کی باتیں میرے دل میں نہیں اترتیں۔۔۔ تب میرا دل دیران ہو جاتا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرے پاس رقابت کی گنجائش نہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں اس کے دل کے ایک کونے میں ہمیشہ موجود رہوں گا۔ میرے پاس اس سے زیادہ کی طاقت نہیں۔

مرد اور طوائف کی زندگی میں ہزاروں بار کی دہرائی کہانی ہمیشہ دہرائی جاتی رہے گی اس کے دل اور وجود کا ایک کونہ ہمیشہ شوہر اور گھر کی آس میں دھڑکتا رہے گا کسی آہٹ کا منتظر رہے گا۔

وہ شاید اسی امید میں میری بھی آنکھوں میں جھانکتی ہے اور میں اس خواہش کو وجود میں ڈھالنے کے لئے سراپا خالق بن جاتا ہوں رات کے پچھلے پہر جب کبھی کبھار اس کا فون آتا تو وہ کبھی ٹیسر خاناں تم بہت یاد آرہے ہو۔۔۔ میں تھک گئی ہوں۔ بگاری چلاتے جم چلائے میرا پڑاؤ کہاں ہوگا۔۔۔ کون مجھے سہارا دے گا۔۔۔ میں ہنس کر کہتا۔ عزیز ازجان خاتون۔۔۔ میں جو ہوں۔۔۔ وہ ہنس پڑتی۔۔۔ ٹیسر خاناں اگر یہ آج سے برسوں پہلے دالی گل جاناں ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن اب۔۔۔

اس وقت مجھے معلوم ہونا کہ وہ عورت پن کے خارزار میں ابھی کوئی راستہ ڈھونڈ رہی ہے لیکن راستے کس کو ملتے ہیں اور میں باتوں کے رنگوں سے اسے بہلا لیتا۔۔۔ وہ ہنسنی مسکراتی اور پھر دن کی ملگلی روشنی میرے کرایہ کے چھوٹے سے گھر پر طلوع ہوتی، جس میں میں نے بڑی تنگ و دو کے بعد فون گویا تھا۔۔۔ آخر حسینوں سے ملاقات کا اس سے بہتر ذریعہ بھی تو کوئی نہیں میں کہتا گل جاناں۔ تمہارے ٹیکٹ کے کتے اور چوکیدار بڑے خوشخوار ہیں، اس کی ہنسی تاروں میں ارتعاش بن جاتی۔ ہم باتوں میں مصروف رہتے۔۔۔ گزری محبتیں۔۔۔ بے وقوف گاہکوں کے قصے راستوں کی ٹھوکریں۔ مردوں کا دھوکا آنے والے دنوں کا انتظار۔ گذرے دنوں کی طوالت۔ وہ باتیں کرتی رہتی اور میں بڑا اچھا سامع تھا۔

پھر ایک دن میں نے اس کے بڑے بڑے پوسٹر شہر کی دیواروں سے چپاں دیکھے۔۔۔ وہ ایک بدنام فلم ساز ادارے کے بڑے عیاش پروڈیوسر کی فلم میں میری روئے آرہی تھی اب اس کے فون بھی نہ آتے وہ مصروف تھی اور میں اخبار کے فلمی صفحے کے لئے اس کی تصویریں لینے کے لئے سٹوڈیوز کے چکر لگاتا۔ اس کی رنگین تصویریں کھینچتا۔۔۔ وہ مجھ سے بہت کم بات کرتی۔۔۔ سارا وقت سٹوڈیوز کے اندر فلم کے سیٹ پر رہتی لیکن کبھی کبھار جب ہماری آنکھیں ملیں تو وہ بڑی اپناہٹ

سے مسکرا دیتی تب مجھے برسوں پہلے والی گل جاناں بند گلی کے آخری دروازے کی چوکھٹ سے لگی یاد آنے لگتی لیکن اب وہ گل رخ تھی۔ پری چہرہ گل رخ اور میں دوستوں کو بتاتا کہ نئی فلم ایکٹریس میری دوست تھی تو وہ یقین نہ کرتے۔ لیکن وہ فلم بری طرح غلط ہو گئی۔ میری مدد رائیگاں گئی۔ میری اخبار کی بڑی بڑی رنگین تصویریں اس کو ایکٹریس نہ بنا سکیں اور پھر میں نے سنا کہ وہ اس پروڈیوسر کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی ہم مشرقیوں کے خوابوں کی سرزمین آسٹریلیا کا جزیرہ۔ محرومیوں کا ملاو

میدم شائستہ نے یقیناً اسے بڑے منگے داموں بیچا ہو گا اس نے مجھے جانے کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ میرے اندر کوئی جذبہ بری طرح مجروح ہو گیا کیا میں اسے دھوکا دیتا رہا تھا یا وہ مجھے دھوکا دیتی رہی تھی۔ شائد وہ پروڈیوسر جھوٹ بولنے میں مجھ سے زیادہ شاق تھا۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہوا۔ گل جاناں تو بڑی عملی عورت نکلی خواب تو میں بتا رہا تھا میں ہمیشہ اپنے آپ کو ایسا ہیرو تصور کرتا رہا تھا جس کے گرد بیرونی چکر کاٹتی اور گانے گاتی ہے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے میں نے ہمیشہ آنکھیں بند رکھیں، اپنی محرومیوں کو اپنے آپ سے چھپایا۔ میری خود پسندی کا ٹانا بانا بکھر کر رہ گیا کیا میں اس سے محبت کرتا تھا۔ میں تو ہمیشہ دوسری کی ذات کے بندھنوں کو مسمار کرتا جھکاتا آیا تھا اور مجھے اپنی خوبی پر ناز تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک عام گھریلو عورت نہیں جو اپنے ٹوٹے دل مجروح انا اور آنے والے تنہا دنوں کے خوف میں مبتلا آنسوؤں میں ڈوبی جب زندگی کی شاہراہ پر نکلتی ہے تو میں کیس نہ کہیں اسے ضرور ڈھونڈ لیتا ہوں۔ اور پھر اپنے کمرے کی تنہائی میں بیٹھے الفاظ کے رنگوں سے اس کے گرد نبا کو یا بننے لگتا ہوں وہ جو دل کے تلاطم بغیر سمٹ کے رواں دواں ہوتی ہیں میرے دل اور میرے کمرے کو اپنا وقتی پڑاؤ بنا لیتی ہیں راتیں سیاہ اور لمبی ہوتی ہیں لیکن میری باتیں ان کی آنکھوں میں سنسی اور دلوں میں امید جگا دیتی ہیں

لیکن گل جاناں اور ان میں بنیادی فرق تھا عورت کو زندگی برتی ہے اور طوائف زندگی کو۔ میں دوستوں کی باتوں کی پروا نہیں کرتا کہ میں ہمیشہ کئی پینلگس اور روکے ہوئے کنکڑے اکٹھے کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کسی نہ کسی روز گل جاناں کو بھی برت کر پھینک دیا جائے گا تب اسے میری ضرورت ہوگی۔ اور میں کسی کو بھی مایوس نہیں کرتا میرے خوبصورت جھوٹ مرہم بن کر ان کی مجروح انا کا ملاو کرتے ہیں۔ اور میں اپنی زندگی کی محرومیوں کو بھول جاتا ہوں۔

اور انہی محرومیوں کی کسک نے مجھے شاعر کے طور پر مشہور کر دیا تھا خوبصورت محبوباؤں کی ادائیں۔ ان کے سراپے انگ بن کر میری شاعری کو مشہور کر رہے تھے عورت سے محبت کے بغیر شاعری میں رنگ نہیں بھرے جاسکتے میرے وسیع تجربات نے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

ان دنوں لندن کے ایک اردو مشاعرہ میں مجھے دوسرے شاعروں کے ساتھ مدعو کیا گیا۔ گل جاناں مجھے ایک سٹوری کا ڈرامہ لکھنے کے لیے کھڑی نظر آئی۔ وہاں جہاں ہر عورت ایک کہانی بن جاتی ہے گل جاناں بھی ایک کہانی ہی تھی اس کا چہرہ بدلا اور بہت کچھ جھپٹا ہوا لگتا تھا۔

ہم دونوں ہاتھ کھڑے کھڑے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھللا رہی تھیں۔۔۔ کہنے لگی۔۔۔ میں جانتی تھی، تم زندگی کے کسی موڑ پر مجھے ضرور ملو گے آخر وہ موڑ آ رہی گیا۔

میں اسے خاموش دیکھ رہا تھا میرے دل میں اس کے لئے محبت نہیں تھی، میں اس وقت اپنی بہترین پرفورمنس دینا چاہتا تھا میں جانتا تھا اپنے ٹوٹے بت کی کرچیاں پٹتے چٹتے اس کی انگلیاں نگار ہوں گی۔ اس کا دل بوجھل ہو گا۔ جذباتی رشتوں کی ڈور کا سرا اس کے ہاتھوں سے پھسل چکا ہے۔

شام کو ڈیوٹی کے بعد ہم دونوں برسوں کے بعد ہاتھ پکڑے ایک پارک کی روش پر چل رہے تھے بہار کی ہوائیں ہمارے گرد رقصاں تھیں۔ بادل آسمان پر مجھ پر داز تھے اور پھولوں کی باس ہمارے وجودوں سے لپٹ رہی تھی۔

گل جاناں کچھ تو بولو کوئی داستان کوئی آپ بیتی۔ بہت برس گزرے ہیں نے تہیں چاہا۔ پوری سچائی کے ساتھ تم پرندا ہوا۔ اور آج بھی تم ہی تم میرے دل کے نہاں خانہ میں بس رہی ہو۔ میں اس کو روش پر دک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ زور سے سننے لگی لیکن اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں ظہیر خاناں تمہارا جھوٹ بڑا ہی دل بھانے والا ہوتا ہے کوئی بھی غمزدہ عورت نہارے جال میں پھنس سکتی ہے کیونکہ تم دل کے نقشہ سحے کو الفاظ کی پھوار سے میرا ب کرنے کا گڑھ جلتے ہو۔ ٹوٹی سہتی کی دراریں وقتی طور پر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ تم ایک معمولی ایکسٹرا کو ایکسٹرا بنا دیتے ہو۔ میں تمہاری مشکور ہوں میں بہت دنوں بعد پورے دل سے سن رہی ہوں۔

تم مجھ پر زیادتی کر رہی ہو گل جاناں۔ میں سن رہی ہوں۔

”نہیں ظہیر۔ میں زیادتی صرف اپنی ذات پر کرتی رہی ہوں۔ ہر بار ایک ہی خواہش کا تعاقب کرنے لگتی ہوں۔ سوچتی ہوں وقت نہ نکل جائے۔ میں بھی دلیا ہی گھر چاہتی تھی۔ اپنی ماں کے گھر جیسا۔ جس کی دیواریں کچی تھیں جس کا فرش کچا تھا لیکن اس میں میری ماں کا پیار تھا کاش میں بڑی نہ ہوتی کاش ماں نہ مرتی کاش میرا باپ بہت سارا دلوایے کر مجھے کسی بوڑھے خان کے ساتھ ہی بیاہ دیتا۔ لیکن اس نے مجھے سونے کا انڈا دینے والی مرغی بنا ڈالا۔ لیکن یہاں سونے کا انڈا دینا بڑا مشکل ہے دیکھو میری زندگی میں کتنے کاش اکٹھے ہو گئے ہیں جب میرے خواب ٹوٹتے ہیں اور کوئی سہارا دینے والا نہیں ہوتا تو تم مجھے بہت یاد آتے تھے وہ رو رہی تھی۔ وہ طوائف ہونے پر اکتفا کیوں نہیں کرتی اس کے اندر کسی کھوج تھی جو اسے بے چین رکھے ہوئے تھی۔ یقیناً اس نے اپنی زندگی میں آنیوالے بہت سے مردوں سے اس نگائی ہوگی۔ بہت سی آنکھوں میں جھانکا ہوگا۔ لیکن سب صرف اس کے جسم کے گاہک نکلے۔ اور میں۔۔۔ میں تو سب سے بڑا فرد تھا جو اس کے جسم اور دل پر پورا قبضہ چاہتا تھا۔ شروع زندگی کا محبت کا تصور نہ جانے کہاں اور کیونکر دم توڑ گیا میں ایک عورت کو محبت کرنے یا اس سے محبت کروانے سے مطمئن، نہیں ہوتا تھا میرے لئے تو ہر راہ میں آئی عورت میری محبوبہ تھی اور میں چاہتا تھا کہ اس کا محبوب صرف میں ہی ہوں۔ لیکن وہاں کھڑا میں اس کے آنسوؤں کی سچائی کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا۔

میں نے اس فلم پر ڈیوٹی سر کے بارے میں پوچھا۔۔۔ وہ میرا سب سے امیر گاہک تھا۔ اس نے میرے لئے بہت نقصان اٹھایا تھا اور وہ اپنا نقصان مجھ سے وصول کرنے کے لئے یہاں لے آیا۔ جب اس کا نقصان پورا ہو گیا تو وہ واپس چلا گیا میں وہاں

جا کر کیا کرتی۔ لیکن یہاں دھندا کرتی ہر ملک کی عورتوں کی کمی نہیں... یہاں تو لہو توں کی تلاش میں سرگرداں عورتیں مردوں کے پیچھے بھاگتی ہیں اور میں قیمت لیتی تھی، میری قیمت کون دیتا

اور اب تم.... تم اب بھی خوبصورت ہو۔ میں اس کو ہمیشہ کی طرح خوش کرنا چاہتا تھا تم کسی مہترقی مرد سے شادی کر سکتی تھیں۔ لیکن یہاں مردوں کو شادی کی ضرورت نہیں وہ جنس کے حوالے سے محبت کا کھیل کھیلے ہیں.... یہ سارا ملک جسم کی منڈی بنا ہوا ہے میں نے قم کھالی ہے مجھے اپنے جسم سے تعفن کی بو آتی ہے۔ مردوں کی باہوں کی گرتی بھی میری روح کی سردی کو نہیں مٹا سکتی تھی۔ اور اب ایک سیلر گرل ہوں۔ میں نے دھندا چھوڑ دیا ہے یہاں کی عورتوں نے ہم جیسی عورتوں کو برا دیا ہے وہ بکا یک شہنے لگی۔ اپنے آپ پر۔ پھر بولی۔ دیکھو۔ میں کتنی باتیں کر سکتی ہوں مجھے باقی کرنے کا ڈھنگ آ گیا ہے لیکن باتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ اس کا پہرہ تیزی کے ساتھ اداسی کی زردی میں ڈوب گیا۔ وہ ہولے ہولے ہانپ رہی تھی۔ جیسے اس کی اندرونی طاقت ختم ہو گئی ہو۔ ہم ٹھڈے سنج پر بیٹھ گئے۔ اس کے ہاتھ سنج ہو رہے تھے اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا میں نے اپنے بازو اس کے گرد دائرہ کر دیے لیکن وہ ابھی بھی ہانپ رہی تھی شاید اندرونی سردی سے۔

مجھے گھر لے جاؤ۔ آہستہ سے بولی۔ اس کا ٹیٹ ٹھنڈا اور اندھرا تھا اس نے گیس میٹر میں سکے ڈالے کمرہ آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا مدقوق بلب کی روشنی میں وہ اور بھی زرد و نظر آ رہی تھی تیز کافی مینے پر اس کے بے رنگ رخسار۔ آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے پاس پاس بیٹھے تھے ہمارے جسم چھو رہے تھے۔ میرے اندر ایک خواہش جاگ رہی تھی میں عورت اور مرد کے بنیادی فرق کو جانتا ہوں مرد کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی اور ایک خاص عمر کے بعد عورت بغیر خواہش کے بھگانا نہیں چاہتی۔

لیکن میرے لاشور میں اس کا تصور ایک طوائف ہی کا تھا۔ حالانکہ زندگی کے جذباتی ثبوتوں میں نے اس سے چھوٹے چھوٹے دفعوں کے لئے محبت کی تھی۔ اسے اپنی شدید محبت کا یقین دلایا تھا میں ہمیشہ اپنی ہمدردیوں کا معاد شدہ وصول کرتا تھا میرا اپنا طریقہ تھا... اور پھر میں اس کا محبوب رہا تھا میرے ہاتھ کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت ہو گئی۔

دیکھو.... میں نے قم کھالی ہے بہت دنوں سے۔ بہت مہینوں سے.... وہ بے بسی سے بتا رہی تھی۔ لیکن باہر موسم کی پہلی برف باری ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اکیلے پن کا کوب اثر رہا تھا۔ یادوں کا غذاب مجھے اکیلے رہ جانے کا دکھ، بہت کچھ کھو دینے کا غم... اور میں خوبصورت محبت بھرے الفاظ کا نشہ اس کے کانوں میں اڈیل رہا تھا... اس کی محبت کا اعتراف کر رہا تھا۔ رات کی ملجھی روشنی پارک کے درختوں کی پھینٹکوں سے جھانکتی رہی... ہوا آوارہ جیسی کی طرح قم گھاس پر لوٹ لگاتی رہی اور ہم دو چاہنے والوں کی ایک دوسرے کی موجودگی کو سنت سے محسوس کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بیٹھ رہے۔

ظہیر خاناں۔۔۔ خدا نے مجھے عورت بابا عورت جس سے محبت کی جاتی ہے لیکن میرے باپ نے مجھے مجھے دالی بنا دیا وہ جو میرا شوہر بنا۔ اسے مجھ سے زیادہ پیوں سے محبت تھی۔ اور وہ ظم پروڈیوسر۔ میرا سب سے امیر چاہنے والا... اسے عورت سے زیادہ طوائف بھاتی تھی میرے اندر کی عورت کی کسی کو ضرورت نہیں تھی... اور تم... تمہارا میرا رشتہ ابھی تک طے نہیں ہوا... معلوم نہیں تم مجھے طوائف سمجھتے ہو یا عورت....

میں اسے کیا جواب دیتا مجھے تو خود معلوم نہیں تھا کہ میں عورت کے اندر عورت کی تلاش میں تھا یا میں نے ہر عورت کو ایک طوائف سمجھا ہی عورت جو میری انا کو بھائے میں جانتا ہوں میرے اندر ایک حصہ ہمیشہ تکمیل کی تلاش میں سرگرداں

لقتول — اسی لئے ہی شاید میں دوسروں کے ٹوٹے پندار کو الفاظ کی مرہم سے مندل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اور میں اس کے پندار کو بھی الفاظ کی گوند سے جوڑنا چاہتا تھا۔

وہ سنس پڑی... ظہیر... میں اب بہت آسانی سے تمہاری ذات کا تجزیہ کر سکتی ہوں... تم ایک بڑے فراڈ ہو۔ بڑے دھوکا باز... لیکن فراخ دل... میں خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے آئینے سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے... وہ کہیں سے ایک سمپٹین کی بوتل نکال لائی۔ اور شفاف ستہری سمپٹین میری اور اس کی رگوں میں دوڑ کر خرو میوں کے دھندلکے کو گلابی جانفرا روشنی میں بدل رہی تھی جھلملا سٹوں کے پردے تان رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر دیوار میں لگے بڑے سے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی... اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی اسے گھور رہی تھیں۔ دیکھو میں ایک عورت ہوں... لیکن تمہاری آنکھیں... تمہاری آنکھیں میرے اندر صرف ایک جسم فردش طوائف کو دیکھ رہی ہیں طوائف جس کی تمہیں ضرورت ہے جس کی ہر مرد کو ضرورت ہے تمہارے الفاظ ایک دھوکا ہیں۔ تم ایک جگھر ہو۔ جو لفظوں کے بدلے اپنے آپ کو بیچتے رہے ہو۔ اور اس وقت بھی تم اپنی قیمت ادا کر رہے ہو۔ الفاظ کے جھوٹے سکوں سے تمہاری قیمت کیا ہے لذتوں کی ایک ساعت۔ میں بھی ایک طوائف ہوں۔ اور میں تمہاری نوازشوں کا معاوضہ ایک ہی صورت میں چکا سکتی ہوں۔

آؤ... ظہیر... مسٹر ظہیر... میں تمہیں ظہیر خان نام نہیں کہوں گی۔ کیونکہ اس وقت تم سے مجھے اپنے محبوب کے جسم کی پونہیں آ رہی صرف بدبو آ رہی ہے جسم بیچنے والے جگھر کی طرح۔ لیکن پھر بھی میں تمہیں باہر دھکیل کر نہیں نکالوں گی صبح جب تم میرے ہاتھ کی بناٹی ہوئی کافی۔ میرے ٹوسٹر میں سینکے ہوئے ٹوسٹ جام اور مکھن لگا کر کھاؤ گے نو دل ہی دل میں میری معصومیت پر ہنسو گے اور کہو گے حرازہ سمجھتی تھی میرے جال سے آسانی سے نکل جائے گی... لیکن تم مجھ سے بھی بڑے حرازہ ہو۔ دلوں کو جگاتے ہو۔ تماشا دیکھتے ہو اور پھر چلے جاتے ہو۔ تعاقب کرتے ہو اور پھر ادبھل ہو جاتے ہو یہ ساری دنیا بھی ایک دھوکا ہے تمہاری طرح۔

وہ آتشزدان کی مدہم ہوتی روشنی کے سامنے جھک گئی۔ اس کی آنکھوں کے آنسو گالوں کو جھگوتے سامنے قالین پر گر رہے تھے۔ اس نے میرے کردار کے بادے کو کھینچ کر اتار دیا۔ میں برہنہ کھڑا تھا۔ لیکن پھر بھی میرا ذہن کچھ بھی سوچ نہیں رہا تھا۔ وہ کون تھی... میں کون تھا۔ یہ جگہ کہاں تھی... نشہ میرے حواسوں کو کس کر رہا تھا وہ صرف ایک عورت تھی اور میں مرد۔ مسٹر ظہیر آپ کی تمام نوازشوں کا شکریہ ادا کرنا تو واجب تھا۔ اس نے مجھے صبح کی میٹالی روشنی میں خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

سرد خاموش گلیوں میں اندھیرا تنا ہوا تھا فلیٹوں کی بند کھڑکیوں سے اندرونی روشنی کی لکیریں کہیں کہیں سیاہی کو قطع کر رہی تھیں۔

چلتے چلتے مجھے لگا جیسے میں ایک سردسل ہوں جو اپنی ہی ٹھوکروں سے لڑکھڑاکر باتال میں گرتا جا رہا ہوں۔ میرے دل میں غلا ہی غلا تھا۔ زندگی بھر کی جاہتوں کے رنگ ایک قدم میٹھے پڑ چکے تھے... گل جاناں نے ٹھیک کہا تھا... میں تو ایک جگھر تھا۔ ایک مرد طوائف۔

کئی دن تک میں گل جاناں کے سٹور میں نہ گیا لیکن اب جب بھی میں جاتا... وہ دُور سے مسکراتی... اور پھر کام میں معروف ہو جاتی اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہو رہے تھے... اس کا سفید گلابی رنگ زرد نظر آتا۔

اور پھر اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا... سٹور کیسپر نے بتایا تھا کہ ایک دن وہ کام کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی تھی۔
ہسپتال کے سفید بستری۔ بیٹی ہوئی وہ بے حد کمزور لگ رہی تھی میں نے پھولوں کا گلہستہ اس کے سر پر لٹکا دیا مجھے اس سے بات کر کے سنے کر دیا گیا تھا۔ اس نے آنکھوں کی جنبش سے میرا شکربہ ادا کیا جلد ہی میری ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن شاید اب وقت نہیں تھا

”خدا حافظ ظہیر خاناں“... اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا
اور مجھے لگا جیسے میری ہستی کے خلا میں ظہیر خاناں کا لفظ شور مچا کر تار گردش کر رہا ہو۔ اسے بھر رہا ہو، میں واپس پاکستان آنا تھا لیکن ہسپتال کی انتظامیہ نے ملنے نہ دیا۔ البتہ پھولوں کا گلہستہ اس تک پہنچ گیا ہو گا۔۔۔ وہ کیسی ہو گی... اس کی خوبصورت بھوری آنکھوں میں کس یاد کا عکس لرزاں ہو گا۔.. میں ظہیر خاناں۔ میں جو اس کا خوب بننے کا حقدار نہیں تھا شاید وہ اپنے دل کے خلا کو بھرنا چاہتی تھی۔.. یادہ سارا بیچ تھا جو عورت کے دل میں بھرا ہوتا ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہتی ہے... لیکن وقت کے تیز قدم اس کی گونج کو مجھ سے پرے دھکیل رہے تھے۔ شاید میں ابھی بھی نمود بند تھا... لیکن میں محبت کی چند سچی ساعتوں کے ساتھ اس کے اوجھڑے خوابوں کی تکمیل کر چاہتا تھا۔ لیکن اب اس سے کوئی بھی مل نہیں سکتا تھا۔ اُسے ایڈز تھا
پاکستان آکر میں اسے خوبصورت محبت بھرے خط لکھنا رہا میں جانتا تھا وہ جواب نہیں لکھ سکتی۔۔۔ کیا اس نے تمام زندگی مجھے اس جذبے سے نہیں نوازا جس کا میں حقدار نہیں تھا۔ عورتوں سے ملنے۔ مجسوں کا سوا لنگ رہ جاتے۔۔۔ فون پر دلوں کا سودا کرتے ایک لفظ میرے کانوں میں رہے دل میں گونجتا رہتا۔ ظہیر خاناں... اور مجھے لگتا... جیسے گل جاناں بند گلی کے پاس بٹ سے لگی۔ مجھے دیکھ کر ہنسی جا رہی ہو... اور میں نہ جانے کیونکر اس لفظ کی تکرار میں قید ہو رہا تھا جیسے یہ لفظ بھی بند گلی ہو جس سے آگے کوئی راستہ نہ جاتا ہو جس سے بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہ ہو اور میں نہ جانے کب سے اس لفظ کی بند گلی سے ٹیک لگائے ساکت کھڑا ہوں....

بکری، شیر اور گھاٹ

مشابہ

آپ نے دریا پار کرنے کے سلسلے کا وہ متمایا پہلی ضروری مرحلہ مٹنی ہوگی، جس میں ایک شخص کے پاس ایک شیر، ایک بکری اور گھاس کا ایک گٹھا ہوتا ہے اور اسے دریا پار کرنا ہوتا ہے۔ مگر کنا سے پرکھ چھٹی کی کشتی ہے جس میں صرف اتنی گنجائش ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک چیز ہمراہ لے کر دریا عبور کر سکتا ہے۔ وہ شیر اور بکری یا بکری اور گھاس کو بھی ایک طرف نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ مقام بہت پرانا ہے اور معلوم ہوتا ہے اگلے وقتوں میں شیر اور بکری مالک کے بہت وفادار ہوتے تھے، وہ باندھ کر نہیں رکھتا تھا پھر بھی ان کے بھاگ جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا اور وہ کم از کم اس کی موجودگی میں ایک گھاٹ پر پانی پی لیتے تھے۔ شیر بکری کو کھانا ضرور چاہتا تھا مگر گھتا ہے ان دونوں شیر کی آنکھ میں جیا تھی کہ وہ مالک کے سامنے بکری کو چیز بنا پھاڑتا نہیں تھا اور بکری بھی اتنی فرماں بردار اور صابر ہوتی تھی کہ اسے مجھوک لگی ہوتی مگر مالک منع کر دیتا تو منع ہو جاتی اور کم از کم اس کی نظروں کے سامنے منہ نہیں مارتی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ اس پہلی یا متھے کو حل کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے بکری کو اپنے ساتھ لے جائے اور دوسرے کنارے پر چھوڑ آئے بشرطیکہ وہاں کوئی دوسرا شیر، چیتا یا بھیر یا چیلے سے گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ اس طرح پہلے کنارے پر شیر اور گھاس کا گٹھا رہ جاتیں گے۔ ظاہر ہے شیر خواہ کتنا ہی مجھوکا کیوں نہ ہو گھاس نہیں کھا سکتا۔ گھاس بُری چیز نہیں ہے ہم میں سے زیادہ تر لوگ گھاس کھانے سے نفرت کرتے ہیں مگر آپ جانتے ہیں کہ شیر الیا نہیں کر سکتا۔ اسے معلوم ہے کہ جس روز اس نے گھاس کھالی وہ دھاڑنا بھول جائے گا اور صرف ہنہٹا کر رہ جائے گا۔ بہر حال جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ متھا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ البتہ اس میں شیر، بکری اور گھاس کو حفاظت سے دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے سات مرتبہ دریا پار کرنا پڑتا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ سات چکر کچھ زیادہ ہوتے ہیں، اصل مسئلہ تو حفاظت سے پار اترنے کا ہوتا ہے۔ سو یعقوب علی عرف تو بابا بھی حفاظت سے دریا پار کرنا چاہتا ہے مگر پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔

تو بے کام مسئلہ شیر، بکری اور گھاس والے متھے سے ذرا مختلف بھی ہے اس کے پاس گھاس بہت ہے مگر اسے یہ گھاس کس کس لیے جانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی بکریاں گھاس کھا سکتی ہیں۔ اس کے پاس دو بکریاں ہیں اور شیر اس نے چڑیا گھر میں دیکھا ہے۔ لیکن اسے ایک اُن دیکھے شیر کا خوف ضرور پریشان کرتا رہتا ہے جو اس کے خیال میں پہلی والے پالتو شیر جیسا اخیل نہیں ہے۔ کہیں اس پاس گھلا پھرتا ہے یا گھات لگائے بیٹھا ہے کہ ادھر اس کی آنکھ

لگے اور ادھر وہ کسی ایک بکری پر چھپے۔ صرف ایک بجری پر اس لیے کہ شیر خواہ کتنا ہی خونخوار اور وحشی ہو ایک وقت میں دو بکریوں کو قابو نہیں کر سکتا۔ دونوں پہیلیوں میں ایک فرق یہ ہے کہ تو تیرے کی بکریوں کو جن کے نام شہیداں اور مہراں ہیں۔ ایک دوسری ہے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں، جیسا شیر، بجری اور گھاس والے شخص کو درپیش تھا کہ گھاس لے کر جاتا ہے تو پیچھے شیر بکری کو کھا جاتا ہے اور شیر کو ہمراہ لے جاتا ہے تو بکری گھاس چٹ کر جاتی ہے۔ بلکہ تو تیرے کی بکریاں تو ایک دوسرے کی رکھوالی کرتی رہتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات کی شکایت اس تک پہنچاتی ہیں اور یوں ان دونوں کی نگرانی خود بخود ہو رہی ہے۔ وہ انھیں ایک دوسری کے حوالے کر کے سارا دن مزدوری کرتے چلا جاتا ہے اور اسے کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی۔

یوں نظامِ قربے کو کوئی دریا بھی پانہ نہیں کرنا ہے۔ سوائے زندگی کے اس دریا کے جو ہر زندہ شخص کو خواہ وہ کسی بھی وجہ سے دنیا میں آگیا ہو درپیش ہوتا ہے اور جسے بعض لوگ تو موٹر بوٹ یا سٹیمر میں بیٹھ کر عبور کر لیتے ہیں مگر بعض چپو چلا چلا کر بلکان ہوتے رہتے ہیں بعض لوگوں کو یہ دریا مشکیزوں اور گھڑوں کے ذریعے پار کرنا پڑتا ہے۔ ہاں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں تیرے گھڑے بھی میسر نہیں آتے۔ مگر ان کا پار جانا ضروری ہو تو وہ کچھ گھڑوں پر بھی بٹھل پڑتے ہیں ظاہر ہے یہ کچھ گھڑے دریا میں تھوڑی دُور جا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ نام ان کے جہلوں کی صداقت اور دنا کبھی نہیں کھرتی اور زیادہ بچتے ہو جاتی ہے۔ خوشبوؤں کو دُور دُور تک پھیل جاتی ہے۔ صدیوں پر محیط ہو جاتی ہے۔ دریا تو کیا۔۔۔ تو تیرے کو تو وہ گندنا لہجہ پار کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی، جس کے کنارے وہ کسی برسوں سے رہ رہا ہے اور اگر کبھی اسے یہ نال پار کرنا پڑ جائے تو اسے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس نالے پر کئی جگہ سینٹ ککریٹ کی سڑوں کے فٹ برج سے بنے ہوئے ہیں اور پھر عام دونوں میں وہ زیادہ چوڑا اور گہرا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی رفتار تیز ہوتی ہے، وہ شہر کے ایک نہائی حصے کی گندگی اور بعض سمیٹے چُپ چاپ اپنے پختہ کناروں کے اندر نظر نہ آنے والی رفتار سے بہتا رہتا ہے۔ صرف برسات کے دنوں میں اس میں طغیانی آتی ہے اور وہ اس بہانے قریبی گلیوں اور مکانات میں جھانک آتا ہے۔

عام دنوں میں اس کے دونوں کناروں پر بھینسیں بندھی رہتی ہیں، کچھ اور گوبر کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ اطراف کی دیواریں اُپلے سے اُٹی رہتی ہیں، کھیتیں اور گھروں کی بھرا رہتی ہے اور بدبو کے بھبھوکے اُٹھتے رہتے ہیں مگر یہ گندنا لہجہ شروع سے گندنا لہجہ نہیں تھا۔ گندگی اور غلاظت تو اس میں بعد میں پھینکی جانے لگی۔ اور اسے گندنا لہجہ دیا گیا۔ اس میں سیوریج کے پائپ اور گندی موبیاں ملا دی گئیں۔ اور چھتوں سے گندگی لے کر اُن کے دلے پر نالے اس میں ڈال دیے گئے اور اگر کچا جائے تو گندی تالیاں اور پر نالے بھی خود گندے کہاں ہوتے ہیں انھیں گندنا لہجہ دیا جاتا ہے۔ جب پہلے پہل نالی بنائی، پائپ بچھایا اور پر نالے کو پورٹ لینڈ سینٹ اور دریا کی ریت سے پلستر کر کے گرما لہجہ لگایا جاتا ہے تو وہ کتنا پاک صاف اور شفاف ہوتا ہے۔ گندگی تو ان سب پر اُدھر سے تھوپی جاتی ہے۔ سو یہ گندنا لہجہ کبھی اچھا نالہ رہا ہوگا، پہاڑوں، جنگلوں اور کھیتوں سے برساتی پانی لے کر بڑے نالے میں پہنچتا ہوگا۔ مگر اب یہ ان گنت مکانات، نالیوں اور گھروں کی غلاظت سمیٹے زیرِ زمین

رہتا ہے اور اس کے اوپر چلنے پھرنے والوں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کے پاؤں کے نیچے کیسی کیسی خوفناک مخلوق اور کیا غلاطیں بہتی چلی جا رہی ہیں۔ پھر اس جگہ سے جہاں تو با اس کے کنارے ایک تنگ سی گلی میں رہتا ہے۔ یہ نالہ اچانک پُل کے نیچے سے نمودار ہو جاتا ہے اور ایک پختہ اوپن ڈرین کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ تو با ایک عرصے سے گندے نالے کے کنارے رہتا ہے۔ مگر وہ گندگی اور بدبو سے ابھی تک مروت نہیں کر پایا۔ وہ نالے کی طرف بہت کم جاتا ہے اور جب بھی اس کا ادھر سے گزر جاتا ہے اُسے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ سے پانی میں کوئی پتھر نہ پھینک دے۔ اگر کبھی کوئی پھینکا اس پر آن پڑے تو ناپاک کا احساس اس کے ذہن سے کئی روز تک رہتا ہے۔ وہ عموماً سڑک کی طرف سے آتا اور اسی طرف سے کام پر جاتا ہے۔ اس کی گلی پُل سے کچھ فاصلے پر پچی سڑک سے مل جاتی ہے پھر مل کھاتی ہوئی جلد ہی نالے میں اتر جاتی ہے جہاں لوگوں نے کوڑا پھینک پھینک کر دھولان سی بنا دی ہے۔ رنے والوں کے لیے سیڑھی کا کام دیتی ہے۔ نالے کے آس پاس رہنے والوں کے لیے یہ گلی ایک شارٹ کٹ کا کام دیتی ہے۔ اور اگرچہ یہ نہایت ہی تنگ سی گلی ہے اور اس میں گنتی کے چند ایک دروازے بھی کھلتے ہیں، مگر اس کے عین وسط ایک موڑ سا ہے جہاں تھوڑی سی کشادہ جگہ ہے۔ اور اس طرح وہاں ایک جھونپڑی کی گنجائش نکل آتی ہے۔ مگر چونکہ نے والوں کے لیے تین چار فٹ چوڑا راستہ چھوڑنا ضروری ہے اس لیے جھونپڑی دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ طرف دو چار پائیوں کے برابر شلٹ نما ٹکڑے اور دوسری طرف ایک چار پائی کی جھڑ شلٹ مناسحتے پر کر ٹیوں کی پٹھٹیوں، تین کی چادرول لکھا اس پھونس کی مدد سے چھت ڈال دی گئی ہے مگر گلی کے اس پار ایک چار پائی والے حصے کی چھت کا کام قریبی مکان تجا دیتا ہے۔ تین سے زیادہ چار پائیوں کی نہ وہاں گنجائش ہے اور نہ ہی چوتھی چار پائی کی انھیں ضرورت ہے۔ یہ تین پائیاں بھی گرمیوں میں صرف رات کو بچھائی جاتی ہیں اور شاید رات کو بھی وہ چار پائیاں کبھی نہ بچھاتے، اگر نالہ اقد رگند اور قریب نہ ہوتا۔ اب وہاں رات کو اکثر سانپ سرسرتے زچھو رگیتے، مینڈک مچھدکتے، چوہے دوڑتے بھومدیں چیختی پھرتی ہیں سانپ کے بارے میں انھیں بھی خوش فہمی ہے کہ اُسے چار پائی پر چڑھنے اور ڈسنے کی اجازت ہے۔ مگر چلے بعض سانپ نامہرمان بھی ہو سکتے ہیں مگر خوش فہمیاں بعض اوقات زندگی کو کتنا آسان بنا دیتی ہیں۔

وہ تین ہی ہیں۔ ایک تو با اور دو اُس کی بکریاں۔ شیداں اور مہسراں۔ وہ شیداں کو اپنے قریب سلانا چاہتا ہے۔ ہراں کو فاصلے پر۔ ہاں سردیوں میں سانپ پتھر کا ڈر کم ہو جاتا ہے تو وہ تینوں شلٹ مناسحتے میں صف بچھا کر اور گندے، کر زمین پر سو جاتے ہیں۔ درمیان میں شیداں سوتی ہے۔ پھر بھی اُسے خوف رہتا ہے۔ کہیں سوتے میں اس کا ہاتھ ال کی بجائے مہراں سے نہ چھو جائے۔

مہراں اس سے آٹھ برس چھوٹی ہے اور پچھلے آٹھ دس برسوں سے جوان چلی آتی ہے۔ اس کے بڑھتا ہے نہ وہ ی ہو چکی ہے۔ سویا اور مرا ہوا آدمی ایک برابر ہوتا ہے۔ اُسے ہر صبح جاگ کر دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے لحاف سے یا نہیں کیٹی بارشیداں منہ اندھیرے درمیان میں سے اُٹھ کر رفع حاجت کے لیے نالے کی طرف چلی جاتی ہے تو

مہراں سونے میں کر دھڑیل کر شیداں کے لبتز پرا جاتی ہے۔ دو ایک بار وہ اسے شیداں سمجھ کر چھو بیٹھا تھا۔ اس کے بعد وہ شیداں سے بھی بدکنے لگ گیا ہے۔ اور جب کبھی کھلے موسم میں مہراں اپنی چار پائی پر علیحدہ سو رہی ہوتی ہے اس وقت بھی وہ شیداں سے پوچھ لینا ضروری سمجھتا ہے۔

”تم شیداں ہی ہونا؟“

کچھ عرصہ سے اسے مہراں کے بارے میں الٹی سیدھی رپورٹیں مل رہی ہیں وہ خود بھی محسوس کرتا ہے کہ وہ ٹھکی ٹھکی، اکٹائی اکٹائی اور پھری پھری سی نظر آتی ہے۔ پہلے وہ شیداں سے ڈرتی تھی اور اس کے سامنے تو دم نہیں لاتی تھی مگر اب بہت سی باتیں سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی روز بیٹھے بٹھائے قہقہے لگانے لگے گی۔ پھر کپڑے پھاڑ کر دوڑتی ہوئی گندے نالے کی ڈھولان اتر جائے گی۔ گھر کے اندر سے طرح طرح کے لوگ گزرتے ہیں۔ وہ ہر راہگیر کو یوں دیکھتی ہے جیسے مدت بعد کسی آدم زاد کی صورت دیکھ رہی ہو۔ بعض اوقات اسے ڈر لگتا ہے۔ وہ لگی میں سے گزرنے والے کسی کمزور یا اکاڑا آدمی پر حملہ نہ کر دے۔

شیداں اس کے استفسار پر ہوں ہاں کرتی ہے تو بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ دوبارہ پوچھتا ہے تو وہ کبھی حل کر اور کبھی ہنس کر سرگوشیوں میں جواب دیتی ہے۔

”ہاں میں شیداں ہی ہوں تیری زنانی“

اس کے باوجود اسے بلاوجہ بُرے بُرے خیالات سنا تے رہتے ہیں جن دنوں وہ بچے پر کام کرتا تھا۔ دوپہر کو منشی اللہ جی ایوان سب کو کتاب سے پڑھ کر نڈت کوٹاکا کے کارنامے اور نازیوں کے چلن سنایا کرتا تھا۔ جن کو سن کر اس کا دماغ اٹل گیا تھا۔ اگلے روز وہ پلستر کے لیے سالہ بناتے یا گوٹیک اینٹیں اٹھا کر لے جاتے ہوئے پریشان ہو کر سوچتا رہتا ہے کہ کیا کچ بچ وہ شیداں ہی تھی؟

گرمیوں میں وہ درمیان والی چار پائی پر سوتا ہے۔ مہراں کی چار پائی ایک چار پائی کے برابر راستہ چھوڑ کر کچھی ہوتی ہے مگر اسے یہ فاصلہ دریا کے پاٹ کے برابر لگتا ہے اور جب آدمی خود ایک کنارے پر ہوتا ہے کیا پتہ چلتا ہے کہ دوسرے کنارے پر کبھی کس حال میں ہے۔ وہ رات بھر جاگتا اور بدک بدک کر اٹھ بیٹھتا ہے اور چار پائی کے برابر چھوڑی ہوئی جگہ کو ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی چوتھی چار پائی تو آپ ہی آپ وہاں نہیں بچھ گئی۔ جو نہی کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے اسے لگتا ہے ابھی کوئی آدم خور حملہ کر دے گا اور اس کے منہ سے گرتے گرتے اور ہتھیار سنبھالتے سنبھالتے بکری کو بھینٹ کر جنگل کی راہ لے گا۔

مہراں کا رنگ گندی اور شکل و صورت نہایت معمولی ہے مگر اس کا میلا کھپلا اور بڈبڈاں لباس بھی اس کے منہ زور بدلنے کی خوشبو کو نہیں چھپا سکتا۔ وہ دن بھر اپنے محتاطی، نالیاں صاف کرتی اور کچھڑ میں لت پت رہتی ہے اور اس کے پاس سے بسا نہی آتی ہے۔ بشرطیکہ آدمی گندے نالے کی طرف ہرگز نہ آیا ہو یا وہاں کا رہنے والا نہ ہو۔ پھر بھی وہ سوچتا

ہے کہ جس معاشرے میں جوان لڑکیوں کی لیے حرمتی کا اُن کے مرنے کے بعد بھی خطرہ ہو وہاں بدبو کا حصار کہاں تک محفوظ فرما سکتا ہے۔ خصوصاً جب ایک جوان عیاشی شدہ اور بولائی مہوئی عورت میں گلی کے اندر بے سدھ ہو کر سوتی ہو اور جہاں سے طرح طرح کے بھیڑیے آدمیوں کا گزر ہوتا ہو۔ بھیڑیاں شکار کو ہارپ نہ بھی کر سکے اسے زخمی اور لہو لہان تو کر سکتا ہے۔ پیچھا کر نہ ملنے والے نیل اور داغ تو ڈال سکتا ہے۔ پھر اس آبادی کے اکثر اوباش لڑکوں کے ہاتھ ان کے قابو میں نہیں ہیں۔

وہ بے حد تھکا ماندہ ہوتا ہے، اسے سخت نیند آرہی ہوتی ہے مگر کسی کے تیز یا آہستہ قدموں کی چاپ اس کی نیند اڑا دیتی ہے۔ راگبیر عموماً دونوں جانب بھی چار پائیوں سے بچنے کے لیے رفتار آہستہ کر لیتے یا لمحہ بھر کے لیے رُک جاتے ہیں تو اس کی بندھتی آنکھیں چوہٹ کھل جاتی ہیں۔ پھر تہستی سے دو ایک سینا ہاؤس قریب ہی واقع ہیں اور اس آبادی کے لفظوں کو آخری شودھ کھینے کی عادت اور شوق ہے چنانچہ رات بھر آہٹیں آتی جاتی رہتی ہیں اور وہ رات کے پھیلے ہوئے دریا میں ہاتھ پاؤں مار مار کر ٹھہرتا ہے۔

ایک بار شہیداں کو پتہ نہیں کیا سوچی۔ اس نے گلی کے مثلث نما حصے اور گلی کے درمیان ایک موٹا سا پردہ لٹکا دیا، پہلے تو اسے عجیب راحت آمیز تخیل کا احساس ہوا مگر جب مٹی کے تیل کا دیا بجھا اور رات کا اندھیرا پھیلا تو اسے لگا مہراں اوڑھ کر جا پڑی ہے۔ جیسے اس کے اور مہراں کے درمیان گھنٹا تاریک جنگل اُگ آیا ہو، اگر شیر، چیتا یا بھیڑیا حملہ کر دے۔ کوئی نافرمان سانپ چار پائی پر چڑھ آئے تو اس کی کراہ تک سُناؤ نہ دے۔ اس نے شہیداں کو پردہ اور موٹا اور گہرا سو جائے پختہ دیوار میں تبدیل ہو جائے! اس نے کئی بار سوچا ہے کہ ان دونوں کو ایک طرف چھڑ کر خود گلی کے ایک چار پائی والے حصے میں سونا شروع کر دے مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا، گزرنے والوں کے لیے گلی کے اس یا اس پار ایک جتنا فاصلہ ہے۔ ہاں اگر مہراں مثلث حصے کی دیوار کے ساتھ سونا شروع کر دے تو دوسری بات ہے مگر اس طرح شہیداں کو درمیان والی چار پائی پر سونا پڑے گا اور وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر شہیداں کے بدن سے ہوا کا بھرنکا بھی چھو جائے تو وہ بھرجاتا ہے۔

شہیداں کی رحمت اگر چہ کالی ہے مگر اس کے چہرے کے خدو خال دککش اور اس کا جسم نہایت بھرا بھرا، گداز اور متناسب ہے اس نے جب اسے اس کی ماں کی گلیاں میں پہلی بار دیکھا تھا وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ وہ دن بھر سڑکوں اور بازاروں میں اُجلی، گوری اور گلابی عورتوں کو دیکھتا تھا، مگر اس نے اتنی کالی حسین عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اور کسی پہلی توں سے بچا کر رکھے ہوئے دو پڑے یوں تھرک رہے تھے جیسے پاسے میں گندھے ہوئے ہوں۔ اس کی آنکھیں چمک دار اور سیاہ تھیں۔ بنانے والے کو تو پتہ ہی تھا کہ اسے کابل میٹر نہیں ہوگا۔ شاید اسی خیال سے اس نے ہمیشہ چمکتے رہنے والا قدرتی کابل اس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا۔

اسے یہ سوچ کر اکثر ہول آتا ہے کہ اگر کسی نے آتے جاتے اندھیرے یا اُجالے میں دل لگی یا شرارت کے خیال سے اُسے چھو لیا تو۔ یقیناً وہ اس صدمے سے جانبر نہیں ہو سکے گا۔

ایک بار شیداں نے ایک نہایت مفید مشورہ دیا کہ مہراں کو کسی کو مٹی میں نوکر کرادیا جائے جہاں وہ مزے سے پتے سروٹ کو اڑیں رہے گی، اچھا کھائے اور پینے گی، مگر ہر غریب آدمی کی طرح قوتے کی حمیت کی رگ بھی بہت پھڑکتی ہے۔ اس نے اس قیمتی مشورہ پر عمل نہ کیا ورنہ اُسے آتے دن چار پائیں کی ترتیب بدل بدل کر اپنی الجھن کا حل تلاش نہ کرنا پڑتا۔ اب کبھی شیداں درمیان والی چار پائی پر سوتی ہے کبھی مہراں اور کبھی وہ خود۔ مگر مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پچھلے دنوں انھوں نے شیداں کے ایک اور مشورے پر عمل کرنا چاہا جس کے مطابق چار پائیوں کو رخ بدل کر بچھایا جاسکتا تھا مگر اس سے ایک نئے پانچتیں مغرب کی طرف ہو جاتی تھیں دوسرے ہسراں نظروں سے مزید اوجھل ہو جاتی تھیں۔

سرتوبا بڑی شکل میں ہے۔ یوں سمجھتے اس کے پاس دو بکریاں ہیں اور ایک ان دیکھے شیر کا خوف۔ جو کھلا پھرتا ہے اور جس کی آنکھ میں حیا نام کو نہیں ہے۔ قوتابا دریا پار کرنا چاہتا ہے مگر حفاظت کے ساتھ۔ کہ اسے ہر زندہ شخص کی طرح اس کا سامنا ہے۔ وہ کشتی میں صرف ایک بکری کو سوار کر سکتا ہے اور اب تو آپ اس بکری کے نام سے بھی واقف ہو چکے ہیں۔ وہ دوسری بکری کو دوسرے کنارے پر اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا کہ اُس کے شیر کے نقد ترین جانے کا خدشہ ہے۔ قوتابا پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے، اس لیے اُس نے یہ معاملہ کرنے کے لیے ہم سب سے مدد مانگی ہے میں بھی خود کرتا ہوں، آپ بھی سوچیں اور اگر کوئی مناسب حل ذہن میں آجائے تو قوتابے کو براہ راست خط کے ذریعے کسی بھی شہر کے گندے نلے کی مفت بھیج دیں۔ اسے خط مل جائے گا۔

صراطِ مستقیم

عرفان علی شاد

روشنی جو کچھ کر رہی تھی، ضرورت کے تحت کر رہی تھی اور چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، اس لیے اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے اس نے بہت سی محبتیں ایجاد کر لی تھیں۔ یہ کام اُس جیسی جوان اور خوبصورت لڑکی کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شروع شروع اُسے کچھ مشکلات ضرور ہوئیں، مگر رفتہ رفتہ وہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھ گئی اور سارے داؤ پیچ سیکھ گئی۔ اب وہ ایک کمزور مشق کار لڑکی کی طرح محبتیں تراشتی تھی لہذا اب وہ اگے آگے تھی اور پیچھے پیچھے اس کی محبتیں پالتو جانوروں کی طرح دُم ہلاتی چل رہی تھیں۔ سب محبتوں کی ناک میں نکیل تھی۔ سب اس کی غلام تھیں اور سب کی دوری ایک ہی ہاتھ میں تھی۔ اس کے اپنے ہاتھ میں۔ یہ ہاتھ جتنے مضبوط آج تھے اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ وہ مڑا کر ان محبتوں کی طرف دیکھتی توفتحِ مندی کے احساس سے سرشار ہو جاتی۔ اسے بوں لگتا جیسے وہ ایک تالی بجائے گی کہ ساری کی ساری محبتیں ہاتھ باندھے اس کے سامنے آن کھڑی ہوں گی۔ پھر وہ کسی ملکہ کی طرح حکم چلائے گی اور جس محبت کو جس انجام تک پہنچانا چاہے گی، پہنچائے گی۔ چاہے وہ پاتال کی آخری گہرائی ہی کیوں نہ ہو!

دفتر میں اس کی میز بالکل کھڑکی کے برابر تھی۔ ٹائپ کرتے کرتے جب اس کی انگلیاں تھک جاتیں تو وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگا لیتی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ آٹھویں فلور سے جب وہ نیچے سڑک پر چلتی ہوئی ٹریفک کو دیکھتی تو یہ سارے کا سارا ہجوم اسے کیڑے مکوڑوں کی طرح دکھائی دیتا۔ وہ سوچتی خدا تو بہت اُپر ہے، ساتویں آسمان پر، وہ جب اتنی بلندی سے اُس دھرتی کو دیکھتا ہوگا تو اُسے ہم کیا نظر آتے ہوں گے؟ محض رینگتے ہوئے کیڑے۔ اپنا اپنا رزق تلاش کرتے ہوئے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے، بوکھلائے اور گھبراتے ہوئے کیڑے جو اپنی اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے طرح طرح کی ایجادات کے تعاقب میں ہیں اور ضرورتیں ہیں کہ اس ہو شر یا منگانی میں پورا ہونے نہیں دیتیں۔ سب کی چادر چھوٹی ہے۔ سر ڈھانپتے ہیں تو پاؤں باہر نکل جاتے ہیں اور پاؤں ڈھانپتے ہیں تو سر ننگا ہو جاتا ہے۔ کیسی تنگی ضرورتیں ہیں آج کے انسان کی! کسی طرح دارطوائف کی طرح کہ جو گرفت میں نہیں آتی، ہاتھ میں آ کر کھپسل جاتی ہے اور پھر دور کھسٹی مسکراتی ہے۔

تین سال پہلے جب وہ اس شہر میں آئی تھی تو بالکل گڑبگڑ، سیدھی سادی، ہر کوٹ کپٹ سے پاک۔

اسی لیے جب وہ اس بڑے شہر کے طور طریقے دیکھتی، لوگوں کے رویے دیکھتی، ملتے کی ہوئی کاروباری مسکراہٹوں اور جھوٹی خوشامدوں کو دیکھتی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جاتیں۔ کتنی باتیں تھیں، کتنے چہرے تھے — مگر ان میں کوئی چہرہ بھی ایسا نہیں تھا جس کا اعتبار کیا جاسکے، جسے اپنا کہا جاسکے، جس کے سامنے اپنے دل کے سارے دکھ سکھ کھے جاسکیں اور جسے دل میں بٹھایا جاسکے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس راز کو پا گئی کہ بڑے شہروں میں ایسے چہرے بہت کم ہوتے ہیں، اور ہوتے بھی ہیں تو گم نام ہوتے ہیں، کوئی کھدروں میں منہ چھپائے پڑے رہتے ہیں اور اتفاق سے اگر وہ سامنے آجائیں تو پبلک ڈنڈے لے کر ان کے پیچھے دوڑ پڑتی ہے اور وہ سر پیٹ بھاگتے لگتے ہیں۔ آج کی دنیا میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے — اس لیے اسے چھوٹے سے قصبے کی نادان لڑکی روشی! تجھے جینا ہے تو اپنی سوچ کے ڈھنگ بدلنے ہوں گے، تو ذرا ساقولی ہے تو کیا ہے تیرے نقش تو تیکھے ہیں۔

تجھے اس سیدھی سادی لمبی چٹائی کو کٹوا کر اپنی زلفوں کو شانوں پر پھیلا کر ہوگا۔ بلاؤ ڈکو اونچا اونچست کرنا پڑے گا۔ بھنڈوں کی تھریڈنگ کروا کر ان کے گھٹاؤ کو خیر کی دھار کی طرح تیکھا اور تیز کرنا پڑے گا، پلکوں کو یوں جھکانا ہوگا، مسکراہٹ کو کمرشل بنانا ہوگا، زندگی سے ہر لطیف جذبے کو نکال کر باہر پھینکنا ہوگا اور بات حق میں صرف ایک ترازو پکڑنا ہوگی اور جب جب موقع ملے گا، ڈنڈی مارنی ہوگی تاکہ تو ایک کامیاب تاجر بن سکے، کیونکہ دنیا انہی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو تجارت کرنا جانتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اسے جینے کے انداز آتے گئے۔ اور آج وہ اس شہر کی ایک کامیاب تاجر تھی، آج وہ کبھی چھوٹے سے قصبے کی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی نہیں تھی جس کے لیے یہ جینا جنگھاڑتا شہر کبھی اجنبی تھا، خطرات سے پُر تھا اور جہاں وہ ہر رات اکیلے میں ڈر کر تی تھی۔ پرانی روشی کیس کھو گئی تھی اب نئی روشی تھی، نئی زندگی تھی، وہ اس شہر کا ایک پُر زہ تھی اور شہر کی مشین میں بڑی کامیابی سے چل رہی تھی!

دفتر کا وقت بہت دیر پہلے ختم ہو چکا تھا۔ چند ایک کے سوا سب ہی لوگ جا چکے تھے۔ روشی نے خالی میزوں کو دیکھا تو اسے سناٹے کا احساس ہوا، اسے ایسا لگا جیسے وہ بھی انہی خالی میزوں کی طرح اکیلی ہے، دیران ہے۔ بہت دیر تک وہ کھڑکی میں کھڑی نیچے دیکھتی رہی اور سگریٹ کے کش لیتی رہی، کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا کر دھواں اوپر اٹھتا رہا — سورج غروب ہو چکا تھا، اندھیرا دھیرے دھیرے روشنی کو نکل رہا تھا۔

سڑک پر دو دھیا ٹوب لائٹس روشن ہو چکی تھیں اور ٹریفک اسی طرح رواں دواں تھی۔ سگریٹ کو ایش ٹرے میں بچھا کر اس نے کھڑکی دیکھی۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب اسے چلنا چاہیے۔ باتھ روم جا کر اس نے منہ دھویا، بال ٹیک کر کئے اور کندھے پر پرس لٹکائے وہ لفٹ سے نیچے اتر کر دفتر سے باہر نکل آئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے پرس سے ڈائری نکالی اور آج کی APPOINTMENTS کو دیکھنے لگی۔ ڈائریور نے میٹر ڈاؤن کر کے گاڑی کو گیٹر میں ڈالتے ہوئے پوچھا:

”کدھر جانے کا ہے میم صاحب؟“

”پارلے ہوٹل!“

اس نے ڈائری بند کر کے پرس میں ڈال دی۔

سگریٹ شلکاتے ہوئے اُس نے سوچا آج پھر بورڈرے کا کم بخت! — چلو بھگت لوں گی۔ کم از کم آج تو بھگتا ہی پڑے گا کیونکہ کل ہی اس نے میرے بینک اکاؤنٹ میں موٹی رقم جمع کروائی ہے۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر گاڑی کی سیٹ سے ٹیک دیا۔ شیشے کھلے تھے، ٹھنڈی ہواؤں کے بھیجے بھیجے جھونکے اس کے چہرے پر تھکیاں دینے لگیں اور سگریٹ اس کی نازک انگلیوں میں شلکتا ہی رہ گیا!

پارلے ہوٹل کی مہم روشنیوں میں نامدار کونے کی میز پر خالی جام کی طرح بیٹھا تھا۔ روشنی شیشے کا دروازہ کھول کر تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ نامدار نے اُسے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، بالکل ایسا لگا جیسے یسوع کی ٹھوکر سے کوئی مردہ جی اٹھا ہو۔

روشنی نے کہا، ”ہیلو!“

نامدار نے کچھ نہیں کہا۔ چہرہ اٹھا کر روشنی کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ اس نے کہیں غلط نشانہ تو نہیں لگایا۔ چڑیا پھنسے گی یا دانہ کھا کر پھر سے اڑ جائے گی؟

روشنی بولی — ”کیا سوچ رہے ہو؟“

”تم بہت بورڈرے ہو، ایک گھنٹے سے اکیلا بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”ساری ڈارنگ! دراصل آفس میں کام بہت ہے۔“

حالانکہ کوئی کام نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی، اور اس طرح بول رہی تھی کہ وہ بالکل سچ لگ رہا تھا

— نامدار کو بھی اور خود اُسے بھی! —

اور یہی جھوٹ اب اس کی زندگی کا سب سے بڑا سچ بن چکا تھا۔ ضرورت پڑنے پر تو لوگ گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں، اُس نے تو صرف جھوٹ کو سچ بنایا تھا۔ اس میں کون سا پاپ ہے۔ دنیا کا کاروبار اسی طرح چلتا ہے۔ چارپنگ پینے کے بعد اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ آسمان میں اڑ رہی ہو۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی، ایک آگ سی اس کے پورے جسم میں رینگ رہی تھی، سر ہلکا رہا تھا لیکن نامدار کو دیکھ دیکھ کر وہ پھر بھی مسکرا رہی تھی۔ نامدار سمجھا شراب اثر کر گئی۔ اُس نے روشنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا، ”روشنی! آج رات تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“ لیکن وہ بھی اناڑی تو تھی نہیں، پکلی کھلاڑی تھی۔ اس لیے بڑی خوب صورتی سے طرح دے گئی اور کچھ ایسی باتیں کیں کہ نامدار نے ایک ہزار کے نوٹ زبردستی اس کے پرس میں ڈال دئے — اونچی ایٹری کے سینڈل کے ساتھ وہ ہوٹل کے چکنے

فرش پر مشکل سے چل رہی تھی لیکن ایک بار بھی اس کا پاؤں نہیں پھسلا۔ نامدار نے سوچا کبھی نہ کبھی تو اس کا پاؤں ضرور پھسلے گا اور یہ خود بخود میری بانہوں میں آجائے گی۔ ہر شکاری شکار کھیلے ہوئے یہی سوچتا ہے کہ شکار ضرور چھنے گا لیکن کبھی کبھی شکار اتنا ہوشیار اور چوکنا ہوتا ہے کہ دانہ و دام پڑے رہ جاتے ہیں اور شکار صاف نکل جاتا ہے۔ نامدار کو ابھی تک ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ روشی کے معاملے میں بھی بہت پُر امید تھا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر اس نے روشی کو ٹیکسی میں بٹھادیا، ٹیکسی چلی گئی تو اس نے سگریٹ سُلگایا اور پھر کار میں بیٹھ کر شہر کی سڑکوں میں گم ہو گیا۔

روشنی نے سبجانی سے کہا: ”میں چار پیگ پہلے ہی پی چکی ہوں۔ اب پیوں گی تو چڑھ جائے گی۔ اس لیے تم پیو اور میں تمہیں دیکھتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے پرس سے آئینہ نکالا اور اپنی لبِ شکر ٹھیک کرنے لگی۔ سبجانی اُسے دیکھ کر مُسکرایا، وہ بھی مُسکراتی اور سبجانی نے اپنی انگلیوں میں بلوریں پیالے کو پچاتے ہوئے کہا: ”آج کی شام اس اکیلے جام کے نام!“

”کبھی کبھی جام کو اکیلے بھی چلنا چاہیے۔“

”تم تو فلا سفر ہوتی جا رہی ہو۔“

”فلا سفر کوئی آسمان سے تو نہیں اُترتے، ہر شخص جو زندگی اور اس کے تقاضوں کو سمجھتا ہے فلا سفر ہے۔“ روشنی نے ہونٹوں میں دبے سگریٹ کو سلگاتے ہوئے کہا

”تو پھر تم میرے تقاضوں کو کب سمجھو گی؟“

”جب وقت آئے گا تو تمہارا تقاضا بھی پورا کر دوں گی ڈارلنگ!“

”لیکن کب — کب؟“ سبجانی چیخ پڑا

”بہت جلد!“

سبجانی بولا: ”ہمیشہ یہی کہتی ہو، ایک مدت گزر گئی ہے اسی طرح، روز ملتی ہو پھر بھی لگتا ہے جیسے

کبھی نہیں ملتی ہو، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم رہتی کہاں ہو!“

روشنی نے زور سے ہنستے ہوئے کہا: ”بڑی جلدی دل چھوٹا کر لیتے ہو، سب باتوں کا پتا ایک دم

نہیں چلتا، اس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے!“

”مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، ایک رات ہی تو مانگی ہے تم سے، دے دو نا!“ سبجانی بچوں

کی طرح ضد کرنے لگا۔

”لگتا ہے تمہیں چڑھ رہی ہے۔“

سبحانی روشنی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، ”ابھی میں نے پی ہی کہاں ہے جو چڑھ جائے گی۔“
ایسے موقعوں کے لیے شرم و حیا کی جو دلربا قاتل ادا روشنی کی اداؤں میں ماسٹر پیس تھی، وہی ادا
اس نے آزمائی تو سبحانی بالکل فلیٹ ہو گیا۔ دوسرا جام بھرتے ہوئے اس نے کہا،
”تمہاری اداؤں کے نام!“

جام پر جام بھرتے رہے۔ تلی ہوئی مچھلی اور آلو کے چپس چلتے رہے اور سبحانی کی آنکھیں سُرخ ہوتی
چلی گئیں۔ پھر اسے ہچکیاں آنے لگیں۔ اگلا جام بھرنے کے لیے جب اُس نے اپنا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھایا تو
روشنی اُسے سہارا دے کر ہٹل سے باہر لاتی مگر چند قدموں کے اس فاصلے میں سبحانی نے اس کے گلے میں
ایک قیمتی لاکٹ پہنا ہی دیا۔ روشنی نے لاکٹ چھو کر اس کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا، ”دل تو ڈنا میرا شیوہ
نہیں ہے، اس لیے رکھ لیتی ہوں، جب چاہو واپس لے لینا۔“
سبحانی بولا، ”میں ایک بیوپاری ہوں قیمت وصول کرنا جانتا ہوں۔“
روشنی نے کہا، ”پھر شرارت پر اتر آئے؟“

سبحانی نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ”ابھی تو شرارت شروع بھی نہیں ہوئی!“
”اور اس کی نوبت بھی کبھی نہیں آئے گی بے وقوف گدھے!“ روشنی نے دل ہی دل میں کہا اور اسے
الوداع کہہ کر فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی بھیڑ میں کھو گئی۔

پکچر شروع ہو چکی تھی اور گلزار بیقراری سے روشنی کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ گلزار نے جھلا کر فلم
کے ٹکٹ پھاڑ دئے اور پاؤں پٹختا ہوا سینما سے باہر نکل آیا۔

روشنی سڑک پر اتر کر جب اپنی گلی میں مڑی تو اُس نے سوچا گلزار انتظار کرتے کرتے ضرور چلا گیا ہوگا۔ اس نے
محببتوں کو بالکل پالتو جانوروں کی طرح پالا تھا۔ کبھی جانور کو پچکارو، اسے پیار کرو، اور کبھی کبھی اسے دھتکار بھی دو تاکہ
وہ تڑپے، ترسے، غصے میں بیچ و تاب کھائے اور اسے مالک کی اہمیت کا علم ہو جائے، پھر کچھ روز لالچ رہو
اور تھوڑا وقت دینے کے بعد اسے پھر چپکار لو۔ اب وہ زیادہ گرم جوشی کے ساتھ دم ہلاتا آئے گا۔ یہ بھی محبت کا
ایک حربہ ہے جو عورت کے ہاتھ میں ہو تو وہ ہر محبت میں کامیاب ہوتی ہے۔ روشنی نے کہا گلزار جا اور دارو پی کر
غم غلط کر لے، پھر گھر چلا جا اور اپنی بیوی کے پہلو میں سو جا، مجھے یاد کر اور بیوی سے پیار جتا۔ پھر ایک دن
جب میں تجھے آواز دوں گی، تو دوڑا چلا آئے گا، جا اب چلا جا۔

اب وہ اپنی گلی میں چل رہی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔
وہ اس گلی کے لوگوں سے بہت ڈرتی تھی کیونکہ ان کی نظریں وہ ایک آوارہ اور بدچلن لڑکی تھی۔ صبح آفس جانے کے لیے
جب وہ گھر سے نکلتی تو بہت سی بھوک کی نکاہیں اس کے تعاقب میں ہوتیں۔ کچھ منچلے اسے دیکھ کر سیٹیاں بجاتے،

کچھ آواز سے کہتے، کسی کو بلاوجہ کھانسی آنے لگتی اور کوئی دل پر ہاتھ رکھ کے کہتا — ”ہائے جانی!“۔ وہ سب خاموشی سے سہہ رہی تھی اور خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کتنی ٹینشن ہے آج کی زندگی میں۔ ہر چیز کا روبرو اور کھوکھلی ہے۔ ہر نیا دن آدمی کی ذات سے کچھ نہ کچھ ضرور چرائیتا ہے۔ لیکن اس سرعام چوری کے خلاف کسی تھانے میں رپٹ درج نہیں کروائی جاسکتی، کوئی عدالت ایسی نہیں جو ذات کے اس چور کو پکڑ سکے اور چوری کا مال برآمد کر سکے!

روشنی ہر رات کچھ ایسا ہی محسوس کرتی تھی جیسے اس کی ذات کا کوئی نہ کوئی حصہ کم ہو گیا ہو۔ شہر کی بھیڑ میں کہیں کھو گیا ہو۔ وہ لاسٹ بجاکر جب اپنے بستر پر لیٹی تو خیالات کا ایک ہجوم اُسے گھیر لیتا۔ وہ بے چینی سے کمر و پیش بدلتی رہتی لیکن نیند نہیں آتی تھی۔ اُن دنوں وہ شراب نہیں پیتی تھی اس لیے جب اس کی بے چینی حد سے بڑھ جاتی تو وہ نیند کی گولی لینے پر مجبور ہو جاتا اور آخر کار سو جاتی۔ مگر اب وہ باہر ہی سے پی آتی تھی اس لیے بستر پر گرتے ہی اسے ہوش نہیں رہتا تھا، صبح ہی آنکھ کھلتی تھی — لیکن وہ راتیں اس پر بہت بھاری ہو جاتی تھیں جب وہ شام کی ساری رنگینیوں کو چھوڑ کر دفتر سے سیدھی گھر آ جاتی۔ ان راتوں میں اسے نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کبھی رسالے پڑھتی تو کبھی میوزک سنتی، کبھی ماں کو خط لکھتی، کبھی پرائی الیم دیکھتی لیکن نیند کسی صورت سے نہیں آتی تھی۔ پھر وہ بار کر الماری سے بوتل نکالتی اور وہسکی کے کڑوے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگتی۔ وہسکی پیتے ہوئے اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے تھے۔ ماں کا خیال آتا تھا جو فالج کی ماری ایک دور دراز شہر کے ہسپتال میں زیر علاج تھی۔ چھوٹا بھائی یاد آ جاتا جو میڈیکل کے تیسرے سال میں پڑھ رہا تھا۔ ایک بیوہ بہن تھی جس کے دو بچے تھے اور جو ٹریفک کے ایک حادثے میں اپنی ایک ٹانگ کھو بیٹھی تھی اور اب اسکول میں معمولی نوکری کر کے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ وہ سوچتی اگر آج میرا باپ زندہ ہوتا تو مجھے یہ پاڑ کیوں بیٹنے پڑتے۔ ان لمحوں میں وہ بہت ادا اس ہو جاتی اور اس کی آنکھیں جھرا آتیں، لیکن زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے، اور وہ بڑی بہادری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر رہی تھی اگرچہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئی تھی لیکن اس کے باوجود اپنے گھر والوں کے لیے وہ کسی دیوی سے کم نہیں تھی۔

کتنی زندگیاں اُس سے وابستہ تھیں، کتنے لوگ صرف اسی کے سہارے چل رہے تھے۔ اخراجات بہت زیادہ تھے اور دفتر سے جو تنخواہ اُسے ملتی تھی، وہ اتنی کم تھی کہ اس سے وہ اپنا خرچ بھی ٹھیک سے پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے وہ سیدھی راہ سے تھوڑا سا ہٹ گئی تھی — اس راہ سے ہٹ کر جہاں اس نے کچھ پایا تھا وہاں بہت کچھ کھو بھی دیا تھا۔ اسی لیے ہر رات اُسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر سے اُس کی ذات کا کوئی حصہ کم ہو گیا ہو! لیکن کچھ دن سے ایک خوشبو اُس کے آس پاس لہرا رہی تھی۔ ایک چہرہ اس کے دل پر پھوار بن کر برس رہا تھا۔ اسے لگتا جیسے وہ چہرہ اس کی ذات کے ساتھ یوں جڑ گیا ہو جیسے قلم سے سیاہی جڑی ہوتی ہے۔ راتوں کے

گھنے اندھیروں میں وہی چہرہ اس کے لیے روشنی کی ایک کرن بن گیا تھا جسے اُس نے اپنے دل کے ویران طاق میں دیے کی طرح سجایا تھا ————— وہ ایک غریب کہانی کا رہتا۔ کبھی کبھی اس کے دفتر بھی چلا آتا تھا۔ یونہی، بس باہر کی گرمی سے ذرا بچنے کے لیے، تھوڑی سی دبر اسے سی میں بیٹھنے کے لیے، پل بھر کو دم لینے کے لیے، گرتا پاتا جامہ پہننے، کندھے پر تھیلہ لٹکائے وہ پسینہ پونچھتا ہوا آتا اور سستانے کی خاطر روشنی کے پاس بیٹھ جاتا۔ کبھی اپنی کوئی تازہ کہانی بھی اسے سنا دیتا، کبھی کوئی رسالہ بھی اسے دے دیتا۔ روشنی اس سے روایتی انداز میں ملتی تھی، چائے پلا دیتی تھی، حال چال پوچھ لیتی تھی اور اس درمیان دفتر کا کام بھی نشتا کی جاتی تھی مگر اس کے جانے کے بعد نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ شرمیلا سا کہانی کا راس کی رُوح کو اپنے ساتھ ہی لے گیا ہو جبکہ وہ اس سے کچھ نہیں مانگتا تھا لیکن اس کی جھکی جھکی خاموش خاموش نگاہوں میں روشنی کے لیے جو پسندیدگی تھی وہ روشنی پر بھی ظاہر ہو چکی تھی۔ اُس کے دل میں جو چنگاری سلگ رہی تھی اس کی حرارت روشنی کے دامن سے یوں لپٹ جاتی تھی کہ اُسے اپنا پورا وجود دکھاتا ہوا محسوس ہوتا تھا ————— اسی ادھیڑ بھن میں دن گزرتے چلے گئے، راتیں آتی رہیں، جاتی رہیں ————— !

کئی مہینے گزر چکے تھے اور اب روشنی کی زندگی اس مقام پر آگئی تھی کہ اُسے شہر سے اپنا تبادلہ کروالینا چاہیے۔ ورنہ وہ نام نہاد عاشق جو اس سے راتوں کے اندھیروں میں ملتا تھا اور پھر اندھیرے ہی کا حصہ بن کر غائب ہو جاتا تھا، کسی نہ کسی دن اپنی قیمت سودیمیت وصول کر لیں گے۔ اس ڈر سے اس نے تبادلے کے لیے کوشش شروع کر دی اور کافی انتظار کے بعد ایک روز ہیڈ آفس سے اس کے تبادلے کے آرڈر آ ہی گئے۔ اس نے سوچا اب نیا شہر ہوگا، نئی زندگی ہوگی اور نئے عاشق ہوں گے۔ اس کھیل میں وہ ایک شاطر چاباز بن چکی تھی لہذا اس کی کامیابی یقینی تھی۔ انہی دنوں جب ایک روز وہ آفس پہنچی تو اس کی سہیلی نے بتایا کہ وہ تیرا رائٹر کیا تھا۔ تجھے پوچھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ تیرا تبادلہ ہو گیا ہے اور تو دو چار دن میں یہاں سے جانے والی ہے تو اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بہت دیر تک اپنے ناخن کاٹتا رہا، بار بار پسینہ پونچھتا رہا۔ میں نے چائے دی تو پیالی لیتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے ————— سچ روشنی! مجھے بڑا ترس آیا اس پر۔

روشنی نے پوچھا، ”کچھ کہہ رہا تھا؟“ ”ہاں!“ کہہ رہا تھا، ”میں تو ایک معمولی لکھنے والا ہوں، آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی میں نے روشنی جیسی امیر لڑکی کو اپنے من میں بسا لیا، مجھے اتنا اونچا خواب نہیں دیکھنا چاہئے تھا۔“

اس روز رات کو جب روشنی اپنے بستر پر لیٹی تو اُسے احساس ہوا جیسے اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو، جیسے اس نے اس کہانی کا رکی زندگی ہمیشہ کے لیے برباد کر دی ہو۔ پھر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ چوٹ چوٹ کر رونے لگی ————— ارے پگلے! تو نے مجھے امیر کیسے سمجھ لیا؟ میں تو تیری ہی طرح ایک غریب لڑکی ہوں، حالات کی ماری ہوئی، زندگی سے لڑتی ہوئی، تھکی ماری، میں تو خود طوفانوں میں ہوں پگلے! ————— تو نے طوفانوں کا خواب کیوں دیکھ لیا؟ تو نے یہ کیا کیا؟ تو نے یہ کیا کیا؟

روشنی کو رات دس بجے والی ایک سپر ٹرین پکڑنا تھی، وہ جب پلیٹ فارم پر پہنچی، اُس نے دیکھا، وہ ایک ستون کے سہارے کندھے پر تھلا لٹکا تے، غم میں ڈوبا کھڑا تھا، سر جھکا تے، بالکل غم صدم، بالکل خاموش، پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کا شیوہ بڑھا ہوا تھا، بال اُلجھے ہوئے تھے، آنکھیں بے خواب تھیں، گزرتے پاجامہ بالکل میلا ہو چکا تھا اور واسکٹ بھی ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر روشنی کو محسوس ہوا جیسے اس وقت وہ اپنے خوابوں کی چٹائیں آگے لگانے آیا ہو۔ اور شمسان میں اکیلا کھڑا ہو۔ بالکل اکیلا، بے بس، بے یار و مددگار!

اُسے یوں دیکھ کر روشنی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور اسے گلے سے لٹکا لے، اُسے سب کچھ بتا دے اور پھر اس کے کندھے سے لگ کر اتار دے کہ اس کے دل کا بوجھ ہمیشہ کے لیے اُنہوں میں بہ جائے اور پھر ایک نئی زندگی مسکرا کر اسے اپنے آغوش میں لے لے، اس کے تصور میں ایک چھوٹا سا گھر یوں پھیلنے لگا جیسے بھیگی آنکھوں میں کاجل پھیلتا ہے، اس کا اپنا گھر، اپنا شوہر، اپنی زندگی۔ یہ کمزور لکھے اس کی زندگی میں بالکل اس طرح آئے جیسے ساحل پر سمندر کی کوئی لہر جھاگ اڑاتی آتی ہے اور چٹانوں سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔ اُس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو فوراً پونچھ لیا، اپنے دل کو سمجھا لیا اور اپنے سب سے خوبتر خواب کے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اندھیری وادی میں لڑھکادیا۔ کیونکہ ابھی اس کا سفر بہت لمبا تھا، بڑا کٹھن تھا اور منزل کہیں دُھند میں گم تھی۔ وہ اس سے اسی روایتی انداز میں ملی جیسے ہمیشہ ملتی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

گاڑی کی روانگی کا وقت آیا تو اسے الوداع کہہ کر اپنے ڈبے کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں ٹرین میں سوار ہونے کے لیے جب اس نے اپنا پاؤں پائیدان پر رکھا تو جیسے اچانک اس کی منزل بدل گئی اور اُسے محسوس ہوا جیسے یہ پاؤں اس کا اپنا پاؤں نہیں ہے، بلکہ کوئی اجنبی پاؤں ہے جو صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتا ہے۔

و حیدر رضا بھٹے

ابھی کچھ ہی دیر پہلے سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ آج نواز اور اصغری کے سب سے چھوٹے اور آخری بیٹے کا ولیمہ تھا۔ بیاہ بجز بیت انجام پا گیا تھا، اس سے پہلے وہ دو بیٹے اور دو بیٹیوں کے بیاہ رہ چکے تھے۔ یہ آخری لڑکا، حامد میر دن ملک تعلیم حاصل کرنے گیا ہوا تھا اور پچھلے عرصے ہی کو مرنے لگا تھا۔ چنانچہ آج اس کے والدین اس آخری فرض یعنی حامد کی شادی خانہ آبادی سے بھی سکبدش ہو گئے تھے۔ اور اپنے آپ کو یوں ہلکا چمکا محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے سروں پر سے بھاری گھڑیاں اتار لی گئی ہوں۔ لیکن نواز کے تئیں مکمل فراغت تب ہی میسر ہونا تھی جب وہ اور اصغری فریضہ حج سے بھی سرخرو ہو جائیں گے۔ اپنی سوچوں میں گم وہ صحن میں آن کر بیٹھ گیا۔ بہت سے مہمان اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے تھے بقیہ کو کچھ کرنے کی تیاریوں میں تھے۔ اندر کمروں میں ان کے ٹرنکوں کے گھسیٹے جانے، کھلنے اور بند ہونے کی بیزار کُن آوازیں صحن میں پہنچ رہی تھیں۔ نواز نے شامیانہ کھولنے کے لیے کہہ دیا تھا اور کلابہ پُر آئی ہوئی کرکری اور دیگر سامان وغیرہ اٹھوانے کے لیے آدمی بھی دوڑا دیا تھا تا کہ خواہ مخواہ اس شام کا کرایہ بھی ادا نہ کرنا پڑ جائے۔ صحن میں اب اکا دکا لیے نکرے لوگ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مقامی تھے یا ہمسائیگی میں رہتے تھے اور جنہیں گھر جانے کی چنداں جلدی نہ تھی۔ پھر بھی ان میں سے چند ایک حضرات کو ان کی بیویوں نے، ماؤں نے دوسرے اہل خانہ نے دو چار بار اُدپر تلے بلا دیا تھا۔

نواز نے ایک اچھٹی لگا ہجی پر ڈالی تو دور ریکہ بکھڑا میں اصغری کو ایک ادھیر عمر شخص کے ساتھ کھڑے سہس سہس کر باتیں کرتے دیکھا۔ اس شخص کو اُس نے پہلے کبھی اپنے کسی بھی لڑکے یا لڑکی کی کسی تقریب پر نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کون ہے؟ خیر اُسے کیا وہ اٹھ کر دیگوں کی طرف چلا گیا اور حساب لگانے لگا کہ کتنی دیگوں کا سامان بچ رہا تھا۔ دو دیگیں پلاؤ کی، ایک زردے کی، اور آدمی تو رہے کن بچ رہی تھی۔ ان کے علاوہ دو دیگوں کا خشک سامان الگ بچ رہا تھا جسے حفظ مالتقدم کے طور پر الگ رکھا ہوا تھا لیکن جسے پکانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ شادی کی تقریب میں متوقع آمد میں کمی کی وجہ مہنگائی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچ پانے کے لیے جھاڑے کے علاوہ دولہا، دلہن کو سلامی کی رقم یا کچھ نہ کچھ تحفے کی صورت میں دینے کے لیے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر سہرہ منہاؤ

رونائی جیسی رسموں پر بھی کچ نہ کچ گرد سے نکالتا ہی پڑتا ہے۔ آج کل لوگوں کی روزمرہ گزراؤات ہی بشکل ہو رہی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ کوئی نہ کوئی مہانہ کر کے پنڈ پٹھا لیتے ہیں کسی کے مقدمے کی تاریخ ٹھیک اسی روز آن پڑتی ہے، کسی کے لڑکے یا لڑکی کا امتحان سر پر آن پہنچتا ہے، بکھڑا ہنی دلوں میں جاری ہوتا ہے یا بکھر کسی نے باپ کو ہسپتال میں داخل کرایا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام صورتوں میں ان کا اپنے شہر میں ٹھہرے رہنا از حد ضروری ہوتا ہے۔ نواز کو اگر پہلے سے یہ بتیک پڑ جاتی تو وہ غور و نوٹس کے اتنے سامان کا تردد ہی نہ کرتا۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ محلے کے وہ گھر جنہیں شادی پر مدعو کرنا یاد نہ رہا تھا یا مدعو کرنا مناسب نہ سمجھا گیا تھا، ان کے ہاں ایک ایک تھال چادروں کا بھیج دینا مناسب رہے گا۔ اس طرح رزق کی بے حتمی بھی نہیں ہوگی اور رب الگ بیٹھ جائے گا۔ اسی صبح میں گم نواز دیگوں سے ہٹ کر واپس کرسی پر آ بیٹھا تو خواہ مخواہ اس کی نظر بھرا صغریٰ کی جانب اٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ اصغریٰ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کھڑچ رہی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ گلنار ہو رہا تھا۔ برسوں پہلے جب نواز صغریٰ کو بیاہ کر اس گھر میں لایا تھا تو اس وقت وہ ایک چھوٹی موٹی سی لڑکی تھی اور بات بات پر شرما جایا کرتی تھی اور خیر نواز اسے تنگ کرنے کے لیے آبا تال کی موجودگی میں ان کی نظریں اور کان بچا کر اصغریٰ سے بے وقت کسی ایسی ویسی بات کا مطالبہ کر بیٹھتا تو وہ ”اَوئی اللہ! شرم نہیں آتی“ کہہ کر نیچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اور گول گول آنکھیں نکال کر ایک بار تو نواز کی جان ہی نکال لیتی۔ لیکن اپنے اس عمل پر فوراً ہی شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتی اور پھر دیکھ کر دانتوں میں پانی کے انگوٹھے سے زمین کو کھڑچتی رہتی۔ نواز کو وہ سماں یاد آیا تو ایک لمحے کے لیے تو اس کی آنکھیں نمٹے سے ہماری ہو کر منہ دھسی گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے اچانک اس کو کرنٹ سا لگا۔ یہ ابھی ابھی اصغریٰ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کیل کھڑچ رہی تھی؟ یہ سفید کنیٹیول والا شخص کون ہے؟ نواز سوچے سمجھے منہ بے کے تحت آہٹنگی کے ساتھ کرسی پر سے اٹھا اور بظاہر ٹہلنا ہوا اس ٹکڑی جانب آبہستہ آہستہ اس طرح چلتے لگا گویا بلامقصد مسٹر گشت کر رہا ہو۔ جوں جوں وہ ٹکڑی کی جانب بڑھ رہا تھا اس کی رفتار جیسی پڑتی جا رہی تھی، لیکن اس کی ساری حیثیت کا لڑ میں سمٹ آئی تھیں خراماں خراماں ٹہلنا وہ عین دونوں کے سروں پر پہنچ گیا، لیکن وہ سر جھکائے باتوں میں اس قدر مگن تھے کہ مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔ مدھر بھری آواز میں جس سے اس سے پہلے نواز کے کان قطعاً نا آشنا تھے، اصغریٰ کہہ رہی تھی: ”وہ تو ابھی تک میں نے سینے سے لگا کر رکھی ہوئی ہے۔ اسی کو دیکھ دیکھ کر، اسی کے سہارے تو پہاڑ جیسی زندگی کا ٹ پائی ہوں۔۔۔“

نواز کو چکر آگیا۔ اس میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی۔ اتنا بڑا دھڑکا، اتنی لمبی پال تیری جگہ بیت گئے، کئی نشیب و فراز آئے کھٹکھٹائییں آئیں اور کسی نہ کسی طور کٹ گئیں۔ نیچے ہوئے، ان کو پالا پوسا جوان کیا، جیٹا کہ بیاہ ڈالا، لیکن اس ماں کی جانی، دم گھسیٹنے ایک بار بھی تو اپنے من کا بھید نہ دیا۔ مجھے صرف ایک بار سرسری بتا دیتی، ہلکا سا اشارہ ہی کر دیتی۔ خدا کی قسم اگر کبھی جتا جاتا تو اپنے باپ کی اولاد نہ ہوتا۔ آخر انسان خطا کا پٹلا ہی تو ہے۔ لیکن اس مکتار خرافہ نے مجھ پر اعتبار ہی نہ کیا۔ تیس برس اعتبار نہ کیا، مجھے دھوکا ہی دیتی رہی، اٹھارہ کر رہی رہی۔ تمام عمارت کاری ہی میں پتا دی۔ چنناں کہیں کی۔ سانپ کی اولاد۔ حرام زادی! نواز کی آواز یک لخت اونچی ہوتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں غن اُتر آیا، منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ وہ بھاگتا ہوا دیگوں کی

جانب گیا اور چلتی ہوئی کھڑی گھسیٹ کر اصغری کی طرف لپکا لیکن اُنچی آواز میں نہ بیان بچنے اور بھاگ دوڑ سے مہمان چرکتے ہو چکے تھے انہوں نے نواز کو راستے ہی میں جا لیا۔ اصغری حیران پریشان کھڑی نواز کا منہ تک رہی تھی، جو اُسے عمر بھر میں پہلی بار سنی گالیاں دے رہا تھا۔ ان کے تین بیٹے، دو بیٹیاں، تین بہنیں اور دونوں داماد بچے کچھ مہانوں کے ہمراہ کھڑے معاملے کو سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس بھیڑ بھاڑ کا فائدہ اُٹھا کر وہ سفید کنپٹیوں والا شخص نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔

اپنا اپنا قرض

خودشید عالم

کل ساری رات مجھے نیند نہیں آتی۔ پل بھر کے لیے بھی سکون نہیں ملا ہے۔ وقت ہمیشہ آگے ہی نہیں چلتا کبھی یہ پیچھے بھی چلنے لگتا ہے۔ جیسے چلتے ہوئے ہاتھ سے کوئی چیز گر پڑی ہو اور بڑی دُور نکل جانے کے بعد پھر اس چیز کی یاد آتی ہو اور کوئی پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے چل پڑا ہو۔ کل سے میں نے ایک بار بھی بیوی کی طرف نہیں دیکھا ہے اور اپنے ہی بچے کو پیار کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ حالانکہ رات روز آتی ہے، جوگی کے پھیرے کی طرح۔ سپنوں کی بھیک مانگتی ہے۔ کوئی دے دے تو واہ وا نہ دے تو کھڑی نہیں رہتی، چلی جاتی ہے۔ اب تک میں کئی بار کپڑے بدل چکا ہوں، لیکن ہر ایک سے وہی بُو آتی ہے جس کے لیے میں کروانا کو کو سا کرتا تھا۔ عجیب کیفیت ہے کہ سردیوں میں بھی کپڑے بدن سے چپکنے لگتے ہیں جیسے کو تار کی سڑک پر تیز دھوپ لگی ہو۔ کروانے اپنے ایک خط میں لکھا تھا ”ہمارے یہاں شادیاں ناکام کیوں ہوتی ہیں، اسے مجھ سے بہتر تم جانتے ہو گے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ان شادیوں کی بنیاد جسم پر ہوتی ہے اس لیے بے معنی ثابت ہو جاتی ہیں، اور محبت اپنی تمازت اور مقناطیسیت اس لیے کھودیتی ہے کہ جسم کے آس پاس یا سبب منڈلانے لگتی ہے۔ یہ جسم بڑی عجیب چیز ہے۔ اس سے گزرے بغیر عشق کامیاب نہیں ہوتا اور اس پر ٹھہر جانے سے محبت ختم ہونے لگتی ہے۔ میرے پچھلے خط سے جو حقیقت تم تک پہنچی، اُسے جاننے کے بعد تمہارے اندر جو کچھ ہوا اُسے تم ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں دکھ نہیں پہنچا، ٹھیس لگی ہے اور ٹھیس تمہیں اس لیے لگی ہے کہ حقیقت کو تم نے نیم اندھیرے اور نیم روشنی میں دیکھا ہو گا۔ تمہیں لگا ہو گا کہ میں دو کے درمیان تقسیم عورت ہوں۔ پوری روشنی کا یہ ہے کسی کو محبت کے بغیر جسم سونپنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ مطلب تو تب ہوتا ہے جب اس کے پس منظر میں کوئی مجبوری نہ ہو۔ مجبوری اسی دنیا کا سچ ہے جس میں ہم جی رہے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد بھی کہ تم رما کے شوہر ہو۔ میں خود کو ذرا بھی قصور وار نہیں سمجھ رہی ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ تم سے محبت کر کے رما سے اس کا حق چھین رہی ہوں۔ اگر رما کا حصہ اسے نہیں مل پاتا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر کیوں؟ وہ تمہیں اتنا کیوں نہیں دے پاتی ہیں کہ تمہاری چاہت ان پر مرکوز ہو جائے۔ ٹھیک یہی حالت میرے لیے بھی ہے۔“

یہ ایک عجیب سا خط تھا جسے پڑھ کر لگا کہ میں جگہ جگہ سے زخمی ہو گیا ہوں۔ میں شروع سے ہی شاید

ایمانج رہا ہوں۔ بغیر سہارے کے نہ کھڑا ہو پاتا ہوں اور نہ ٹھیک ڈھنگ سے سوچ سمجھ پاتا ہوں۔ ایک بیساکھی پانے کی چاہ میرے اندر میرے جنم کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھی شاید۔ کرونا سے پہلے میں نے یہ بیساکھی رما میں تلاش کی تھی۔ اپنے خطوط میں اس نے ایسا احساس بھی کرا دیا تھا کہ وہ میری بیساکھی بن سکتی ہے اور میں اس کے سہارے پر بت پار کر سکتا ہوں۔ آسانی سے دشواری کرنے کے ناتے اور جب ہم ایک ہو گئے تو میں پورے کاپورا ایک چیخ میں بدل گیا تھا۔ رما صرف لینا جانتی ہے، محبت میں دینا بھی ہوتا ہے، کھونا بھی ہوتا ہے۔ اس بات کا اے احساس ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی تپتی تھی جس کا انتخاب بیشک میں نے کیا تھا، لیکن نکلی وہ ایک عام بیوی جیسی۔ جس نے مجھے خطوط لکھے اور جس نے مجھ سے شادی کی یہ دو رما میں تھیں۔ اتنا بنیادی فرق کہاں سے آیا؟ میں سوچتا اور الجھ جاتا۔ خطوط والی رما اور بیوی بن کر آئی رما کے درمیان جو پھبتیں کا رشتہ تھا اس نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

اور یہ کرونا تھی جو مجھ سے ملنے شہر آئی تھی۔ ایک شادی شدہ عورت ایک شادی شدہ مرد سے ملنے آئی تھی۔

”کیا ہمیں اتنی دُور جانے کا حق ہے جہاں سے لوٹنا ممکن نہ ہو؟“ کرونا کے اندر کی عورت نے اپنا چہرہ دکھایا۔

”حق؟“ مجھے یہ لفظ چھب گیا ”ہمیں کتنی دُور جانا ہے، اس کے لیے کسی کی اجازت نہیں ہوگی؟“

”ہاں۔!“ کرونا نے کہا تو میرا ماتھا تپنے لگا۔

”کس سے، تمہارے شوہر سے؟“

”نہیں، رما سے!“ کرونا شانت تھی

”اس لیے کہ وہ میری بیوی ہے؟“

”نہیں! اس لیے کہ وہ بھی تمہیں اتنا ہی پیار کرتی ہے جتنا کہ میں۔ میں حق کو تو بظرافت انداز کر سکتی ہوں، لیکن

محبت کو نہیں“

”لیکن رما مجھ سے محبت کرتی ہے، یہ تمہیں کس نے بتایا؟“

”رما نے!“

”رما نے؟“ میں کانپ گیا ”وہ تمہیں کہاں ملی؟“

”ملي نہیں، اس کے خطوط ہیں میرے پاس!“

”رما کے خطوط؟“ میں لڑکھڑا گیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کرونا سے رما کے لکھے گئے خطوط کی عبارت

جاننا خود کو چھوٹا اور کمتر ثابت کرنا ہو گا۔ میں رک نہیں سکا اور پوچھ ہی بیٹھا ”اس نے کیا لکھا تھا؟“

”ایسا کچھ نہیں جو تمہیں مجروح کرے۔“
مجھے لگا کہ یہ جواب دے کر کروانا نے مجھے چھوٹا کر دیا ہے۔
”لیکن اسے تمہارا پیتا کہاں سے ملا؟“
”تمہاری ڈائری سے!“

”ڈائری بھی پڑھی اس نے!“ میں حیرت زدہ تھا ”یہ تو دغا بازی ہے۔ بہت چھوٹی نکلی وہ۔“
”نہ یہ دغا بازی ہے اور نہ ہی وہ چھوٹی ہے۔“ کروانا جیسے رما کی لڑائی لڑ رہی تھی۔ ”اس نے مجھے لکھا تھا کہ میں تمہارا جسم لے لوں لیکن دل اسی کے لیے رہنے دوں۔ چھوٹی عورت ایسی خواہش نہیں کر سکتی۔ رمانا سمجھ ضرور ہے لیکن چھوٹی نہیں ہے۔“

”لو، اب تم کیا کہتی ہو؟“
”میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ میں ایک کمزور عورت ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی کبھی ٹوٹی بکھرتی ہوں۔ ساری پریشانیوں کو میں ہی کیوں حل کروں؟ تم مرد ہو کر بھی نہیں لڑ سکتے تو مجھ سے یہ امید کیوں کرتے ہو کہ میں اپنی بھی لڑائی لڑوں اور تمہاری بھی!“ کروانا کی آنکھیں ڈبڈبا لگیں
”کیا ہے جو تمہیں سونے نہیں دے رہا ہے!“ یہ رمانا تھی جو بغل کے بستر پر پڑی میرے ساتھ ساتھ جاگ رہی تھی شاید۔

”کروانا کا ماضی! میں نے جواب دیا اور اندھیرے میں رمانا کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔
”کون کروانا؟“ رمانا نے حیرت کا مظاہرہ کیا
”اب بنومت!“ میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ ”اُس نے شکایت نہیں کی، تمہاری تعریف کی ہے۔“ میں نے

چوڑھ کر کہا

”وہ بڑی عورت ہیں!“ رمانا شانت تھی
”ہاں، وہ بڑی عورت ہے۔ ہر کوئی تمہاری طرح چھوٹا نہیں ہوتا۔“ میں اُکھڑ گیا
”لیکن چھوٹا آدمی بڑا بن تو سکتا ہے!“ رمانا ابھی تک شانت تھی
”اب دیر ہو چکی ہے رمانا!“ میں نے ایک سرد آہ بھری
”نہیں! بالکل دیر نہیں ہوتی ہے۔“ اور اس جواب کے ساتھ ہی کھٹ کر کے بجلی جل گئی۔ اسی درمیان
”میرے بستر پر چلی آئی تھی۔“
”سنو! مجھے کروانا سے کوئی تکلیف نہیں ہے!“ رمانا نے کہا ”اگر وہ تمہارے ساتھ آکر رہنا چاہیں تو میں خاموشی سے تمہاری زندگی سے دُور چلی جاؤں گی۔“

رما کی خود سپردگی سے مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن میں گہرے دکھ سے بھرا ہوا تھا۔ یہ محبت ہے یا رحم کا جذبہ؟ میں نے سوچا اور رما کی آنکھوں میں جھانکا جو بہت دُور تک خالی تھیں۔

”کہاں چلی جاؤں گی؟“ میں نے پوچھا

”دنیا بہت بدلی ہے!“ رما کے اندر اچانک ایک مضبوط عورت نے جہنم لے لیا ”کیا مجھے ایک بھی آدمی ایسا نہیں پاتا جو مجھے میرے رائل کے ساتھ اپنا سکے؟“

”آدمی؟ رائل؟“ میرے منہ سے نکلا اور فوراً ہی مجھے پتا چل گیا کہ کتنے کمزور اور غلط الفاظ میرے منہ سے نکلے ہیں۔

رمانے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ رما کے چلے جانے کا مطلب ہے رائل کا بھی چلے جانا۔ رائل جو کہ میرا اور رما کا بیٹا ہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ایسا گوتم ہوں جسے ابھی ”نروان“ نہیں ملا ہے۔

”میں اب سونا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنی بے بسی ظاہر کی

”اب تم کبھی سونہیں پاؤ گے!“ رمانے بے دردی سے کہا۔ کم از کم میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔ رما بجلی بند کر کے واپس اپنے بستر پر چلی گئی تھی، رائل کے بغل میں اور میں اپنے بستر پر تنہا رہ گیا تھا۔ رما، رائل اور کرونا کے باوجود۔

میں علی بابا نہیں تھا، شاید قاسم تھا جو غار میں کسی طرح داخل تو ہو گیا تھا اور وہاں موجود تمام اسباب ٹھیلوں میں بھر چکا تھا۔ لیکن جب لوٹنے کا وقت ہوا تو بھول گیا کہ کیا کتنے سے غار کا دہانہ کھلتا ہے۔ میں نے کرونا کو پالیا تھا لیکن اس پانے کے ساتھ ہی خود کو اندھنک خالی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس پانے کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا کیونکہ جو کچھ میں نے پایا تھا وہ میرے ساتھ جانے والا نہیں تھا یہ ایسی دولت تھی جو تب تک بے معنی تھی جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس پر میرا اور صرف میرا حق ہے۔ وقت ہو چکا تھا اور میں بھول چکا تھا کہ کیا کتنے سے دروازہ کھلتا ہے؟ تھوڑی ہی دیر بعد میں چار ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا جاؤں گا اور غار کے چار گوشوں میں لٹکا دیا جاؤں گا۔

یہ تھا میرا انجام۔ کوئی بھی اس نتیجے تک پہنچنا نہیں چاہتا۔ میں نے بھی نہیں چاہا تھا۔ لیکن صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟

”مجھ سے شادی کرو گے؟“ یہ سیدھا سوال کرونا نے کیا تھا میرے اس سوال کے جواب میں کہ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم واپس نہ جاؤ؟“

”شادی؟“ میری اُبلتی ہوئی خواہشوں پہ جیسے ٹھنڈے پانی کا پھینکا مار دیا گیا ہو۔

”لیکن رما کا کیا ہوگا؟“
 ”اُسے چھوڑ دینا!“ کرونا نے جس لاپرواہی سے کہا تھا اُس سے میں کانپ گیا تھا۔
 ”چھوڑ دوں؟“
 ”ہاں!“ کرونا کی لاپرواہی برقرار تھی ”آخر میں بھی تو اپنے پتی کو چھوڑ کر ہی یہاں رہ سکتی ہوں۔“
 ”لیکن تمہارے پتی اور رما میں فرق ہے۔“ میں نے ایک جھوٹی دلیل کا سہارا لیا۔ ”انہیں کوئی دوسری عورت مل جائے گی لیکن رما کو دوسرا آدمی نہیں ملے گا!“
 ”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“
 ”مجھے معلوم ہے!“
 ”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم یہ برداشت ہی نہ کر پا رہے ہو کہ رما کسی دوسرے آدمی کی آنکھیں گرم کرے!“
 ”ہو سکتا ہے!“ میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔
 ”تو کیا تم نے مجھے کھیل سمجھ رکھا ہے؟“ کرونا غصے سے کانپ رہی تھی۔
 ”کرونا!“ میرے منہ سے چیخ نکل گئی
 ”شاید یہی وہ لمحہ تھا جب میرا رُواں رُواں کہہ اٹھا تھا ”کُھل جا سم سم۔“ اور غار کا دہانہ کُھل گیا تھا!!“

”فاختہ“

انیق احمد

ہمارے گھر کے سامنے سے وہ چوتراصاف دکھائی دیتا ہے جس پر قربان صاحب نے انیٹا گاڑ رکھا ہے۔ اس انیٹے پر ایک بھورے رنگ کی چھوٹی سی فاختہ دھوپ سیکنے آیا کرتی تھی۔ اس کے پھوٹے اور آنکھیں شرتی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کسی خوف کے تحت کچھ کہہ نہیں پاتی۔

میرا نام ارسلان ہے۔ میری عمر اٹھارہ برس ہے اور میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتا ہوں۔ میرے پاس دو نیلی جینز اور ایک چوکور ڈبی دار لال رنگ کی قمیض ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں جینز ایک ہی رنگ کی ہیں۔ اور دونوں بائیں ٹکھنے سے ذرا اوپر تھوڑی سی پھٹی ہوئی ہیں۔ جب کبھی میں جینز اپنی بہن کو دھونے کے لیے دیتا ہوں تو وہ ایک بار ضرور کہتی ہے :

”ابھی یہ کل ہی تو دھوئی تھی۔“

میرا گھرا لاہور کے اندرون شہر میں ایک دو منزلہ عمارت میں ہے۔ اس عمارت کو مالک مکان رحمت بلڈنگ کہتا ہے لیکن اس کے زینے دیواریں رنگ و روغن سے کسی طرح بھی مالک مکان کی رحمت ظاہر نہیں ہوتی۔ میری کھڑکی سے پھلا احاطہ نظر آتا ہے۔ اس چھوٹے سے کنویں نما احاطے میں پرانے کھوکھے، کوڑا کرکٹ، خارش زدہ گتے اور حریص بلیاں وقت بے وقت رطبی نظر آتی ہیں۔ برساتوں میں ادھر سے آنے والی ہواؤں میں میوہ منڈی کے گلے سڑے پھلوں کی خوشبو بھی آتی رہتی ہے۔

ہم جس مکان میں رہتے ہیں وہ صرف دو کمروں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور ناٹھنا غسل خانہ بھی ہے۔ جو غسل خانہ کم ہے اور باکس روم زیادہ ہے۔ بڑا کمرہ ہمارا ڈرائینگ روم ہے جسے ہر وقت میری بہن نقلی پھولوں سے سجاتی رہتی ہے۔ اور دوسرا کمرہ ہمارے سونے کا کمرہ ہے۔ یہ دونوں کمرے اوپر کی اختتامی منزل پر ہیں اور ان دونوں کے درمیان دس فٹ کا فاصلہ ہے۔ یہ خلیج مالک مکان نے کچھ ایسی بے دلی سے رکھی ہے کہ اس پرندہ الاان کا شبہ ہوتا ہے نہ گیلری کا۔ ہم سارا دن ان ہی دو کمروں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر بھی یہ فاصلہ کبھی طے نہیں ہو پاتا۔ الگ تھلگ رہتا ہے جیسے کمروں کے مابین کوئی سڑک چل رہی ہو۔ دو پیٹ فارموں کے درمیان ریلوے لائن بھی ہو۔ غالباً یہ فاصلہ اس خیال سے رکھا گیا ہے کہ یہاں پر ایک اور کمرہ بنایا جائے اور یہ منفرد کمرے ایک ہو جائیں اور ہمیں رہنے میں آسانی ہو اور ہمارے کمرے میں بھی اضافہ ہو جائے۔ پچھلے کئی

سالوں سے ایسا سُفنے میں آتا ہے کہ اوپر لگی منزل میں ہماری طرف تیسرا کمرہ مکمل ہونے والا ہے مگر ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا۔ دراصل میری ماں بھی نہیں چاہتی کہ کمرہ مکمل ہو جائے۔ اسے خوف ہے کہ پھر مالک مکان کرایہ بڑھا دے گا اور ہم لوگ وہ اضافی کرایہ کیسے ادا کریں گے۔ پتا نہیں ماں جو کچھ چاہتی رہتی ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ لیکن جو چھوٹی چھوٹی گزشتات اس کے دل سے گزرتی ہیں وہ عام طور پر پوری ہو جاتی ہیں۔

میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میرا نام ارسلان ہے سالانہ نام بتائے بغیر بھی میں آپ کو اس فاختہ کے متعلق بتا سکتا تھا جو قربان صاحب کے انٹینے پر دھوپ سینکھنے آیا کرتی تھی۔ یہ نام میرے دادا نے رکھا تھا۔ دادا کا خیال تھا کہ چونکہ اس کی ساری عمر ڈرتے گزری اس لیے اس کے گھر میں کوئی شیر ضرور ہونا چاہیے۔ میری ماں بتاتی ہے کہ میرے پیدا ہونے سے بہت پہلے دادا نے یہ نام تجویز کر لیا تھا۔ وہ بیسیا کھیوں کا سہارا لے کر کہتا: ”ہو! تم فکر نہ کرو بیٹا ہی ہو گا اور ہم اس کا نام ارسلان رکھیں گے جانتی ہو ارسلان کے معنی ہوتے ہیں شیر۔“

دادا کا خیال تھا کہ ناموں کا شخصیتوں پر گہرا اثر ہوتا ہے اس لیے میرا دل و ماغ ذہن سب شیر سے مشابہ ہو گا۔ اسی لیے میرا نام ارسلان رکھا گیا۔ بھلا اس کے علاوہ اور کیا نام رکھا جاسکتا تھا؟

میرے دو کمروں پر مشتمل گھر میں میرے ساتھ ایک ماں اور ایک بہن رہتی ہے۔ میرے والد صاحب کے انتقال کو اب چھ سال گزر گئے ہیں۔ میری ماں جو بڑی سپاٹ اور بے رنگ زندگی گزارتی ہے اس نے میرے والد کی تصویر کو گھر کے بڑے کمرے میں کارنس کے اوپر سجا رکھا ہے۔ اس تصویر پر ایک گوٹے والا ہار بھی لٹک رہا ہے، جس نے وقت کے ساتھ نہ صرف والد صاحب کی تصویر پر اپنا عکس مرتب کر لیا ہے بلکہ کسی حد تک والد صاحب کی شبیہ بھی اس کے پیچھے چھپی رہتی ہے۔ مجھے بڑا اطمینان ہے کہ میرے والد صاحب اس ہار کی وجہ سے ہم سب سے بہت خوش ہیں۔ اور مجھے یہ بھی احساس رہتا ہے کہ اس ہار ڈالنے کی وجہ سے انھیں اب آمان سے کوئی شکایت نہیں رہی۔

ہمارے ان دو کمروں کے سامنے جس طرف سے سورج نکلتا ہے اور جدھر جاپان کا صبح خیز ملک ہے ادھر تین کمرے ہیں۔ یہاں قربان صاحب رہتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ ایک ناتواں کمانے دو بیٹا گیا ہے اور دوسرا ہمارے کالج میں ہی فورٹہ ایئر کا طالب علم ہے۔

کالج والا لاکا انٹینے پر بیٹھنے والی فاختہ کی طرح خاموش اور گم صم رہتا ہے۔ قربان صاحب ہم سے زیادہ کرایہ دیتے ہیں اور ان کا حصہ ہمارے گھر سے زیادہ صاف ستھرا اور ماڈرن ہے۔ پہلے ان کا گھر بھی ہمارے جیسا ہوتا تھا پھٹی رضائیاں، ڈھیلی چارپائیاں، ادھ کھلے بکسوں سے جھانکتے بے نور کپڑے، کہیں لوٹا کہیں گرسی، مگر جب سے قربان صاحب کا بڑا بیٹا کاروں کا کینک ہو کر دو بیٹا گیا ہے۔ اس نے

قربان صاحب کو خوب آرام پہنچایا ہے۔ دو کروں کا بے معنی گنڈا سا گھر چکنے لگا ہے۔ نہ صرف جلد ہی قربان صاحب کے ہاں تیسرے کمرے کا اضافہ ہوا بلکہ سارے گھر کی مرمتیں بھی ایک ساتھ ہو گئیں۔ اب سیڑھیوں میں قربان صاحب نے سواٹ کا بلب بھی لگا دیا ہے اور کسی سے بجلی کے بل میں اضافے کی بات آج تک نہیں کی۔

ماں اور میری بہن ایک سی ہیں، صرف ایک کی شکل بیس سال پرانی ہے اور دوسری کی چالیس سال بوسیدہ۔ دونوں کے جسموں میں خون کی کمی ہے۔ دونوں کی رنگت پھپکی جیسی سبزی مائل زرد ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے دونوں کی ہڈیوں سے آوازیں سنکتی ہیں۔ میلی میلی، اُن دھوئی، بجھی بجھی رُو حیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اپنی ماں مجھے اچھی لگتی ہے میرا جی چاہتا ہے کہ کبھی وہ زور سے ہنسنے، کبھی وہ کوئی چیز کھانے پر اصرار کرے، کبھی وہ میرا انتظار کرنے سے پہلے سو جائے۔ لیکن مجھے اپنی بہن سے بڑی سخت چڑ ہے وہ مجھ سے دو سال چھوٹی ہے اور اس نے پچھلے مہینے دسویں کا امتحان دیا ہے۔ قریباً ایک مہینے سے وہ فارغ ہے اور کچھ زیادہ کھاتی بھی نہیں۔ اس کا باہر جانا بھی دشوار ہے اسی لیے وہ دونوں کمروں کے درمیان لیٹے ہوئے فاصلے کو الگ کرتی رہتی ہے اور چڑھتی نظر آتی ہے حالانکہ کم آمیزی کی وجہ سے اس نے کبھی اکتا ہٹ اور ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔

میں نے اپنی بہن کو جاننے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ باقی تمام حالات کی طرح ساتھ ہے۔ میں نے کبھی اپنی بہن سے اظہارِ جنگ کیا ہے نہ تشہیرِ محبت۔ میرے اور اس کے درمیان جیسے کچھ ہے ہی نہیں، نہ ٹھنڈا نہ گرم۔ نہ ملیٹھا نہ کڑوا۔ بس ایک پھیکا پن ہے۔ میری ماں مجھے روزیہ کہتی ہے کہ مجھے اپنی بہن کا احساس ہونا چاہیے مجھے اس کے لیے زندہ رہنا چاہیے اور اسی کے لیے جان دینے پر تیار ہونا چاہیے۔ مجھے ماں کی باتیں بے معنی اور مہمل سی لگتی ہیں حالانکہ جس وقت ماں یہ باتیں کرتی ہے مجھے نہ ماں مہمل لگتی ہے نہ بے معنی۔

پچھلے دنوں قربان صاحب کا بیٹا دوبئی سے آیا۔ وہ نہ صرف اپنے گھر والوں کے لیے تحفے لایا بلکہ میری ماں کے لیے بھی ایک اونی ولایتی چادر لے آیا۔ قربان صاحب کے گھر سے بڑی خوش کن آوازیں آتی ہیں۔ اور فوراً تھوڑے ایئر کا کم گولڑ کا خاکی لفافوں میں مٹھائیاں پھل لاتا نظر آتا ہے اس گھر کی خوشیاں آئینے سے منعکس ہونے والی روشنی کی طرح ہمارے گھر میں جھلکتی رہتی ہیں۔ قربان صاحب کا یہ بیٹا کم پڑھا لکھا ہے اس کی بول چال سادہ اور نظریئے روایتی ہیں۔ وہ چھوٹی موچھوں اور تنگ قمیضوں کی وجہ سے بیوقوف نظر آتا ہے۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو دوبئی کی جگہ امریکہ جاتا انجینئر ہوتا۔ پھر بیس سال بعد پاکستان آتا میری ماں کے لیے کیا اپنے گھر والوں کے لیے بھی کچھ نہ لاتا اور رشتہ داروں میں بیٹھ کر بار بار پوچھتا،

”ڈیڈ! وقت پر ڈالروں کا ڈرافٹ مل جاتا ہے نا!“

پر قربان صاحب کا دوبئی پلٹ بیٹا ایسا نہیں ہے وہ سادہ دل اور شریف انسان ہے۔ وہ اپنے

ماں باپ کو سب کچھ سمجھتا ہے اور بھائی کی تعلیم کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ وہ پاکستان صرف اس لیے آیا ہے کہ ماں باپ اپنی پسند کی شادی کہیں کر دیں۔ قربان صاحب اور ان کی بیوی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دو بچی پلٹ کے پاس صرف پندرہ دن ہیں۔ لیکن انھیں لڑکی ڈھونڈنے کی کوئی جلدی نہیں۔ لڑکے کے دل میں کسک ہے کہ کاش اس بار وہ کوئی ساتھی لے کر واپس جائے تاکہ اکیلے میں بیوی تنہائی کم کر سکے۔ اور وہ ماں باپ کی خدمت تو کرتا رہے لیکن تنہائی کے ان لمبے وقفوں سے بچ جائے جو دو بچی میں اسے پیش آتے رہتے ہیں۔

کچھ دن ہوئے بیگم قربان ہمارے گھر آئی تھیں۔ وہ میری ماں کو مختلف لڑکیوں کے بارے میں بتا رہی تھیں اور میری بہن ہر لڑکی کے ذکر پر چونک کر ان کی طرف دیکھتی تھی۔ بیگم قربان ہر لڑکی کا ذکر ایسے کرتی جیسے بات بچی ہو چکی ہو۔ پھر تھوڑی دیر بعد جب وہ لڑکی کو برطرف کرتی تو میری ماں کا چہرہ اس طرح ادا اس ہو جاتا جیسے کسی نے اس کی بیٹی کو ناپسند کر دیا ہے۔

لیکن میری بہن کہتی ہے کہ قربان صاحب کے بیٹے کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اس کا خیال ہے کہ اگر شادی ہو گئی تو قربان صاحب اور بیگم قربان اپنے بیٹے کی کمائی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور فوراً میٹر میں تعلیم پانے والا لڑکا کبھی امریکہ نہ جاسکے گا۔ میری بہن کہتی ہے کہ ظاہر ہے جب ہو آجائے گی تو اپنے خاوند کے پیسوں کی مالک ہوگی۔ جیسے چاہے گی استعمال کرے گی، جس کو چاہے گی دے گی۔ ایسے جملے بولتے ہوئے میری بہن کی درد گالوں کا رنگ سرخی مائل ہو جاتا ہے ایسے لگتا ہے جیسے وہ قربان صاحب کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ شادی وہ اس لیے نہیں کرنا چاہتی کہ اس کا خیال ہے کہ قربان صاحب اپنے بیٹے کی ناجائز آمدنی کھا رہے ہیں۔ پتا نہیں کیوں میری بہن کا خیال ہے کہ اب ان لوگوں کا دو بچی پلٹ کی کمائی پر حق نہیں بنتا۔ غالباً اس کا غصہ جائز ہے کیونکہ اس نے کبھی نانویں کی پیننگ پر بیٹھ کر نہیں دیکھا اور قربان صاحب ایک عرصے سے اس کے جھونٹے لے رہے ہیں۔

یہ جمعرات ساری رحمت بلڈنگ کے لیے اہم رہی۔ قربان صاحب کے بیٹے کی مہندی تھی۔ لڑکی کا چناؤ، شادی کا انتظام، رسومات کا عمل آنا فانا ہو گیا۔ مجھے مہندی کی رسم سے بھی بڑی چڑ ہے، حالانکہ سبھی کہتے ہیں کہ مہندی کی رسم میں رنگ و بو کا سیلاب آ جاتا ہے۔ لڑکیاں جب موتیے کے بار بالوں میں لٹکائے پرانے کپڑوں سے پسینے کی خوشبو کے بھپارے دیتی گھٹے سے گھٹا لاکم سُروں میں گیت گاتی ہیں تو مجھے عجیب فحاشی کا احساس ہوتا ہے۔ اس منظر کو بخش سمجھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن جس طرح میں اپنی بہن سے چڑتا ہوں ایسے ہی مجھے مہندی کی رسم اچھی نہیں لگتی۔

پتا نہیں کیوں قربان صاحب کا دوسرا بیٹا اس دھوم دھڑکتے سے خوفزدہ ہو کر اپنے ایک ساتھی کے پاس ہوسٹل چلا گیا۔ اس کا بہانہ بھی معقول تھا کہ امتحان سر پر ہیں اور کورس مکمل نہیں ہو سکا۔ ناچار تمام انتظام میں

قربان صاحب کا ساتھ دینا میری قسمت میں لکھا گیا اور میری گردن ہی پھری تلے آئی۔
 مہندی اور ڈھونک کی رسم بھی قربان صاحب کے گھر ہی رکھی گئی۔ لڑکی والے بھی اپنی صلاحیتوں کو منوانے
 یہیں آئے اور بے تال بے مڑتالیاں بجا کر ہار کر چلے گئے۔ میں جب بھی تیسرے کمرے میں بے تالی اور باسی
 پسینوں والی پریوں کے پاس سے گزرتا۔ آنکھیں بند کر لیتا تاکہ کوئی روشنی، کوئی بو، کوئی تازہ ہوا میرے اندر
 نہ گھس جائے۔

۱۸ اکتوبر کا دن میرے لیے بہت اہم ہے کیونکہ میں نے اس روز زندگی کا ایک اہم سبق سیکھا۔ میرا
 نام ارسلان ہے اور دادا کا خیال ہے کہ جس کا نام شیر ہو وہ کبھی بڑول نہیں ہو کرتا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جمعرات
 کی رات جب اکتوبر کی اٹھارہ تاریخ تھی، میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ کبھی بھی انسان کے نام کا اس کی طبیعت پر
 اثر نہیں ہو پاتا۔

میں کھانا کھلانے پر مامور تھا۔ تین گھنٹے سے بے سری کم تالی لڑکیاں ہلڑ مچاتی رہیں۔ میری بہن جو سبزی مائل زرد
 رنگ کی مدقوق سی لڑکی ہے رنگ لیڈر بنی ہر طرف دندناتی پھرتی ہے۔ لڑکی والیاں مہندی کے تھال لیے سو پاؤں
 کے بلب میں اوپر جا رہی ہیں۔ ان کے ہتھکڑے اونچے اور لباس شوخ ہیں۔

وہ ان ہی سب میں چھوٹا سا تھال اٹھائے آتی ہے۔ اس کے گونے جڑے تھال کی تمام موم بتیاں ہلے نکلے
 میں بچ گئی ہیں۔ صرف اس کا چہرہ پور نمائی کے چاند کی طرح روشن ہے۔ وہ ابھی ابھی اوپر آئی ہے میں نے ایسی
 لڑکی نہیں دیکھی۔ نارنجی، سرخ آتش کی گلابی کپڑوں کے سیلاب میں اس کے کپڑے فاختہ رنگے ہیں۔ اس کے بال
 کھلے، گھنے اور گولہوں تک لمبے ہیں۔ شنیل کے سیاہ کپڑے کی طرح چمکیلے۔ میرا دل اسے دیکھ کر دھک سے بند ہو گیا
 اور فرنی کی ٹھوٹھی میرے ہاتھ سے گرتی گرتی بچی۔ یک دم مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو صرف دو چیز ہیں جن کا
 رنگ بھی بد قسمتی سے ایک سا ہے۔

وہ مجھ سے سیس گز دو ریت بنی بیٹھی رہی۔ اب کمرے سے نہ بواٹھ رہی ہے نہ لڑکیاں بے تال تالی
 بجا رہی ہیں۔ رنگ و بو کے مالے میں وہ سب سے خوب صورت لگ رہی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سب
 آنکھوں کا وہی مرکز ہے۔ میں بار بار سوچتا رہا کہ اس سے کیا بات کروں! کاشس ہم علیحدہ مل سکیں وہ قربان صاحب
 کے آئینے کے پاس آ سکے۔

پھر وہ اگلے دن آہستہ آہستہ آئی۔ جیسے خواب میں ہو۔ اس قاتلا نے آکر کہا ”دُھن کا کھانا
 دے دیں جی!“

دُھن کا کھانا اٹھا کر مجھے ساتھ چلنا ہے۔ کل تین کمروں کا فاصلہ — وہ ساتھ ہے اور آہستہ چلتی ہے۔
 نکاح ہو چکا ہے مہندی کی رات جیسی ہر لونگ نہیں۔ اٹھارہ اکتوبر گزر چکی ہے میں شیر سے گیدڑ بن چکا ہوں۔

وہ کھانے کا ٹرے دروازے میں مجھ سے پکڑتے ہوئے پوچھتی ہے،

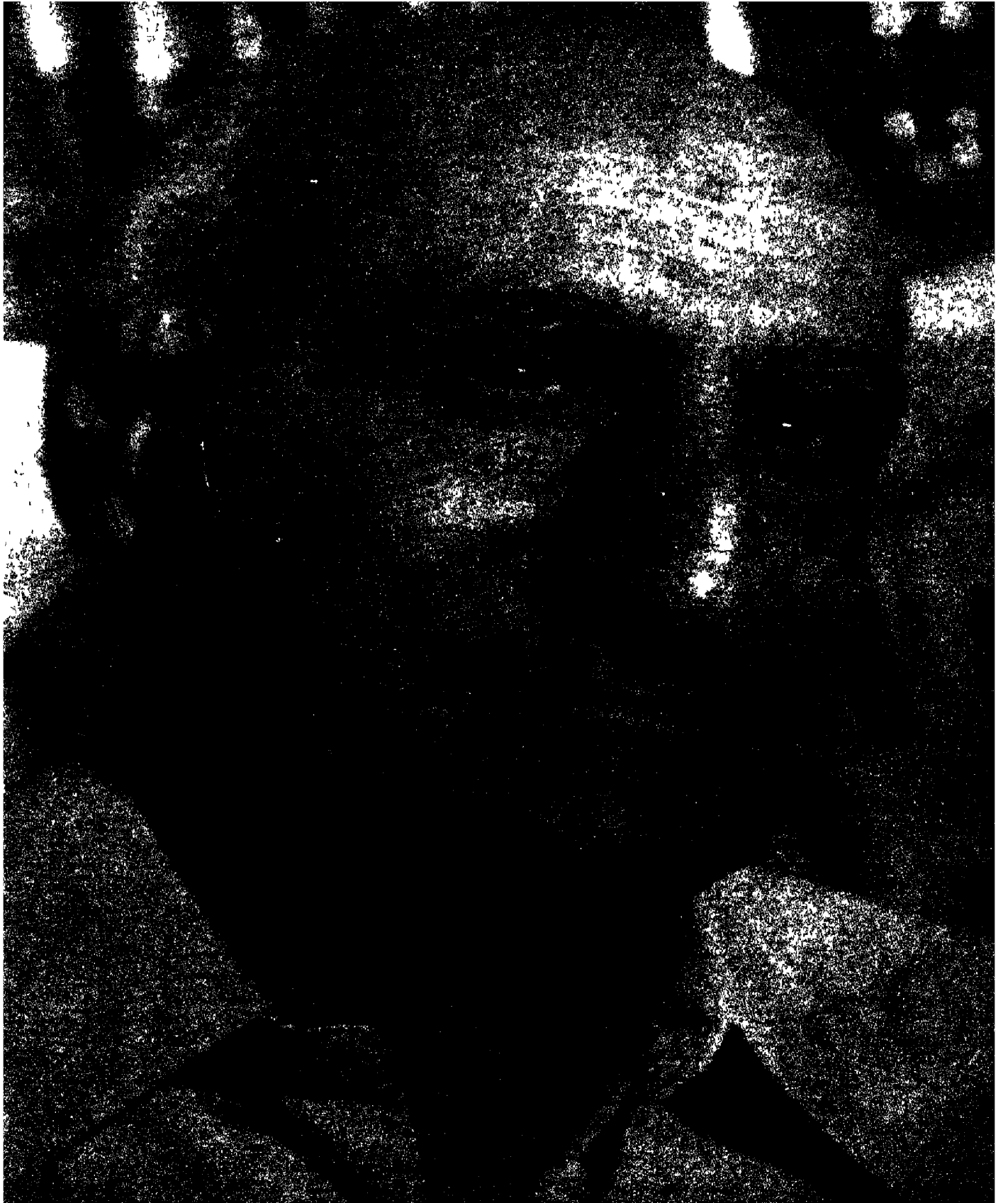
”کیا آپ کے پاس ایک ہی جینز ہے جی؟“

وہ مجھ سے ٹرے لے کر کہنی سے دروازہ بند کرتی ہے میں اپنی جینز دیکھتا ہوں حالانکہ یہ وہی پتلون نہیں ہے جو مہندی کی رات میں نے پہنی تھی۔ لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ دونوں جینز کا ایک ہی رنگ ہے اور بائیں گھٹے سے ذرا اوپر تھوڑی تھوڑی پھٹی ہوئی ہیں۔

میں اور میری بہن ہر روز قربان صاحب کے گھر جاتے ہیں۔ میں کسی سے کہہ نہیں سکتا کہ مجھے اس فاختہ کی تلاش ہے۔ میری بہن کے دل میں ایک تجسس ہے کہ کیا اب بھی قربان صاحب کو ان کا بیٹا دوہی سے پیسے بھیجتا ہے کہ نہیں! — — — میں نے اپنی خواہش کا کبھی اظہار کیا ہے نہ میری بہن نے اپنے اندر اٹھنے والا سوال کسی سے پوچھا ہے۔

لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ فاختہ جو قربان صاحب کے انیسٹینے پر بیٹھا کرتی تھی اسے کسی طرح ہم دونوں کے دل کا راز معلوم ہو گیا ہے — — — اسی لیے تو وہ شادی والے دن کے بعد کبھی آئی ہی نہیں۔





لالو پتر

تھرکا وہ حصہ کم و بیش نصف میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور اپنی آبادی کے لحاظ سے واضح طور پر ایک تضاد کی نشان دہی کر رہا تھا۔ یہ تضاد اس بنا پر تھا کہ اس کے مشرقی حصے میں تو شاندار نیچے تھے، وسیع لالوں والی کوٹھیاں تھیں اور اونچے اونچے مکانات تھے اور اس حصے کے سامنے مغرب کی طرف سینکڑوں چھوٹے چھوٹے گھر آباد تھے۔ یہ گھر زور سے دیکھنے پر مٹی کے تودوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیتے تھے جو زمین کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل گیا ہو۔

پندرہ بیس برس پہلے دونوں حصوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، یہاں ایک جیسے مکان کھڑے تھے۔ ان کے بیشتر مکینوں کی حالت بھی قریب قریب ایک جیسی تھی پھر ہوا کہ خلیجی ریاستوں کو ایسے ہنرمندوں کی ضرورت پیش آئی کہ جو ان کے شہروں کی تعمیری اُمکوں اور خوابوں کو مادی صورت دے سکیں۔ اتفاق سے مشرقی حصے میں مختلف قسم کے ہنرمند دور دراز ایک جاکر محنت مزدوری کر کے قوتِ لائبرٹ بڑی مشکل سے حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے جب سنا کہ ان ملکوں میں ہنرمندوں کی شدید ضرورت ہے تو انہوں نے موقع کو غنیمت جانا۔ چند دنوں کے اندر اندر ریاستوں میں داخل ہونے کے اجازت نامے مل گئے اور یہ ہنرمند جوق درجوق دہاں روانہ ہو گئے۔ یہ ہنرمند رات دن محنت کر کے دولت اکٹھی کرنے لگے اور اس دولت کا زیادہ حصہ اپنے اپنے گھروں کو بھیجنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے غربت خوشحالی میں بدلنے لگی۔ کچے پتے مکان ٹنگوں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ اور یہ حصہ وہ کچن بن گیا جو دولت کی فراوانی بنانے پر قادر ہے۔

یہ دو الگ الگ دنیا تھیں۔ ایک تو خوشحال لوگوں کی دنیا تھی اور دوسرے پسماندہ لوگوں کی۔ ہر دنیا اپنے اپنے حال میں رہتی تھی۔ ان کے درمیان بظاہر کوئی رابطہ یا تعلق نہیں تھا۔ ہر ایک کے اپنے اپنے مسائل تھے اور اپنے اپنے طور پر ان مسائل کو حل کرتے تھے۔ پسماندہ آبادی میں ایک بوڑھا آدمی بابا نیو بھی رہتا تھا۔ ماں باپ نے پنیٹھ برس پہلے جب یہ دنیا میں آیا تھا، اس کا نام نعمت اللہ رکھا تھا جو ہوتے ہوئے نیمرہ گیا اور جب بوڑھا چلے کی دہلیز پار کرنے لگا تو بابا نیو بن گیا اور اس کے جاننے والے اُسے احتراماً بابا ہی کہتے تھے۔

بابا کو ردی فروشی کا پیشہ اپنے باپ سے ملا تھا۔ باپ نے اس کی تعلیم کی بجائے یہ پسند کیا کہ اُس کا بیٹا اس کا ساتھ دے کہ آمدنی میں اضافہ کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ردی فروش کا بیٹا ردی فروش ہی رہا۔

’نیو‘ نے اپنے باپ کے برعکس اپنے دونوں بیٹوں کو تعلیم دلوائی۔ بیٹے جو ان ہوتے تو انہوں نے یہ پسند نہ کیا کہ ان کا باپ ایسا فضول پیشہ برقرار رکھے۔ انہوں نے کہا:

بابا اس بات پر خوش تھا کہ اُس کے بیٹے نے کسی میم کی بجائے ایک سداں لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس لیے وہ اس کی بات رُو نہ کر سکا۔ بظاہر چپ رہا مگر اُس کے دل میں یہ سوال اُٹھ چکا تھا کہ اس کا بیٹا اور بہو اپنے بیٹے کو یہاں کیوں چھوڑے جا رہے ہیں۔ ابا ہیج ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو ان کی اولاد نا۔

بابا کی خاموشی کو ان دونوں نے رضامندی پر محمول کیا اور بار بار شکریہ ادا کیا۔
’آبا جی! میں ہر ماہ باقاعدگی سے پیسے بھیجتا رہوں گا۔ چودھری ذکا اللہ کو آپ جانتے ہیں نا‘
بابا چودھری صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ خوشحال دنیا کے ایک دولت مند آدمی تھے۔
’جانتا ہوں‘ بابا نے جواب دیا۔

’پیسے آپ دہاں سے لیا کریں گے‘
وہاں چلے گئے اور ابا ہیج بچہ بابا کے گھر میں رہ گیا۔

بیٹے، بہو اور اُن کے باقی بچوں کے جانے کے بعد بابا نے پہلی مرتبہ اپنے ابا ہیج پوتے چرگمری نظر ڈالی۔ وہ چار پائی پر چپ چاپ بیٹھا اُوپر چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

’اللہ مجھے تو اس بڑھاپے میں ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ یہ میرا کیا سہارا بنے گا، مجھے اس کا سہارا بننا پڑے گا‘ اس نے بچے کو غور سے دیکھتے ہوئے سہجا۔

’میں نے اسے اپنے یہاں رکھنے پر کیوں ہامی بھری۔ اسکا رکو دینا چاہیے تھا۔ یہ میں نے کیا کیا ہے۔ ایک حمال پالنا پڑے گا‘
وہ سوچتا رہا لیکن اس وقت سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا، تیر تو کھان سے نکل چکا تھا۔

’لاو‘ بابا کے منہ سے بے اختیار لال دین کی بجائے لالو نکل گیا۔

لالو نے اس کی آواز سنی نہیں تھی۔ وہ بدستور چھت کو گھور رہا تھا۔ بابا اپنی چار پائی سے اُٹھ کر اُس کے پاس چلا گیا۔ اُس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔ ’لاو‘

لالو نے چھت سے نظریں ہٹا کر اپنے دادا کی طرف دیکھا۔ اس کے گالوں پر آنسو بہ رہے تھے۔

نہ جانے وہ کونسا جذبہ تھا جو ایک گرم رُو کی طرح اُس کی نُس نُس میں سرایت کر گیا تھا۔ بابا رہ نہ سکا۔ اُس نے جھک کر بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

’لاو کیا بات ہے پُتر‘

لالو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’بولو نا۔ آبا اتنی یاد آگئے ہیں؟‘

لالو نے نہ منہ سے کچھ کہا، اور نہ سر کے اشارے سے اثبات یا نفی میں جواب دیا۔ البتہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور

آنسوؤں سے اُس کی پلکیں بوجھل ہو گئیں۔

بابا کو اس کا خاموش رہنا اور خاموشی سے آنسو بہانا عجیب سا لگا، مگر اس سے وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ سوال جو چند لمحے اُس کے دل میں سر اٹھا کر اُسے پریشان کر چکا تھا، اب نہ جانے کہاں دب گیا تھا۔ بابا کے بازو اچانک نیچے کی طرف بڑھنے لگے اور دوسرے ہی لمحے میں وہ اُس کی گود میں تھا۔

بچہ لک لک اُسے دیکھ رہا تھا اور نہ جانے دل میں کیا سوچ رہا تھا، تاہم اُس کے ماتھے کی سونٹوں میں ایک ایسا سوال ابھر رہا تھا جس کا معنی یہ تھا کہ میرے ماں باپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہیں، اب آپ کیسے ہیں؟ میں کب آپ کے ساتھ جاؤں گا؟ بابا نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ ”سے تو میرا تو تانا“ اچانک ہے تو کیا ہوا؟

لاڈلا شام تک خاموش رہا۔ اُس نے اپنے دادا سے کچھ بھی نہ کہا۔ دادا بار بار پوچھتا مھوڑ لگی ہے، دودھ پیو گے؟ وہ کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔

رات ہونے کو آئی تو بابا نے گلاس میں دودھ ڈال کر گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”پی لو لالو پیٹر۔ پی لو“

کئی لمحے اُس کے ہونٹ آپس میں جڑے رہے، پھر اُس نے چند گھونٹ پی لیے۔ بابا نے رات اُسے اپنے پہلو میں ملایا۔ گلتا گلتا کچے کو سخت تھکاوٹ ہو چکی ہے۔ پہلے تو وہ پندرہ بیس منٹ بے قرار رہا، اس کے بعد اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ گہری نیند سو گیا۔

اُس کے سوتے ہی بابا چارپائی سے اُٹھ کر گھر کی واحد کرسی میں بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہیں لالو کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں وہ چہرہ زرد تھا، زندگی کی توانائیوں سے محروم محسوس ہوتا تھا۔ وقفے وقفے بعد اس پر سیاہی سی چھا جاتی تھی اور خود ہی غائب ہو جاتی تھی کبھی کبھی وہ کانپنے لگتا تھا۔ بابا بے چین ہو کر اس کی طرف اپنی بائیں بڑھاتا تھا مگر اُس سے پہلے کہ اس کے بدن کو چھوئے وہ یہ سوچ کر ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا کہ کہیں اس کی نیند اُچاٹ نہ ہو جائے اور وہ رونے نہ لگ جائے۔

”شاید یہ اندر ہی اندر رو رہا ہے“ بابا نے سوچا ”آخر اس کے ماں باپ اسے چھوڑ گئے ہیں، ضرور وہ محسوس کرتا ہو گا۔“

کرسی پر بیٹھے بیٹھے بابا نے پہلی مرتبہ اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔

اس کی بائیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ یہی حال بائیں گونگ کا تھا۔ چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے تھے ناک کچی ہوئی۔

”میں اسے کیسے سنبھال سکوں گا؟“

بابا نے خود سے سوال کیا۔

”میں اُسے لکھ دوں گا کہ اپنی سوغات لے جاؤ۔“

یہ فقرہ اُس نے غصے سے کہا، مگر اُس کے غصے کا جذبہ جلد ہی پانی کی سطح پر سیلی ہوئی صابن کی جھاگ کی طرح تحلیل ہو گیا۔ وہ خود سے کہہ رہا تھا۔ مجھے تو اس کا پتا ہی معلوم نہیں ہے۔ خط لکھو اگر کیسے بھیجوں گا۔

وہ بے تابی کے زیر اثر کرسی سے اُٹھ بیٹھا۔

میں کتنا بے وقوف آدمی ہوں۔ پتا تو چھاپی نہیں۔ اسے کچھ سو گیا تو کیا ہو گا؟“
 اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اس کے پوتے نے حیج ماری ہے۔ اس کا بدن کانپنے لگا۔
 ”کیوں لالو۔ میرے بچے کیا ہوا؟“
 لالو نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔
 ”کیا ہوا“

”اچ“، لالو کے ہونٹوں سے ہلکی سی آواز نکلی۔
 غبرنے اُسے گود میں اٹھالیا۔
 ”وہ آجائیں گے لالو“
 لالو نے لگا۔

”نہ رو پیتر! نہ رو، لالو پیتر! نہ رو“
 نیمواس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
 ”اچی، اچی“

وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ بابا اسے گود میں لیے کمرے میں چلتا رہا اور جب دیکھا کہ بچے کی سسکیاں ہلکی پڑ گئی ہیں تو اُسے
 آہستگی سے بستر پر لٹا دیا، اور خود بھی اس کے پاس لیٹ گیا۔

دن چڑھا۔ بابا کی آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے پوتے کے چہرے پر نظر ڈالی، وہ ابھی سو رہا تھا۔ اُس کے گالوں پر جا بجا
 دھبے پڑے ہوئے تھے۔ یہ اُس کے آنسوؤں کے نشان تھے۔ بابا کو یہ محسوس کر کے دکھ ہوا کہ بچہ اس کی بے خبری میں چپ چاپ
 آنسو بہا رہا ہے۔

چند لمحے لالو کو مسلسل دیکھنے کے بعد اُس نے کوٹھڑی میں جا کر کُرتے کی جیب میں سے ایک ٹمچنی نکالی، دائیں دلیار کی
 چھوٹی سی الماری کو کھولا، برتنوں کے پیچھے چھپے ہوئے خیلے کو اٹھایا، اس میں سے کچھ نوٹ نکال کر کُرتے کی جیب میں ڈال لیے اور
 کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔
 لالو گہری نیند سو رہا تھا۔

”کیا اسے تنہا چھوڑ کر بازار چلا جاؤں؟“ اُس کے دل میں یہ سوال اُٹھا۔ اصل میں اُسے ڈر تھا کہ اگر لالو اس کی غیر موجودگی
 میں جاگ پڑا تو اپنے پاس اُسے نہ پا کر پریشان ہو جائے گا اور رونا شروع کر دے گا، مگر اُس کے لیے ناشتے کا انتظام بھی ضرور تھا۔
 اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ جلدی جلدی قدم اٹھا کر گلی سے نکل کر بازار میں آ گیا۔ پوریاباں خریدتے وقت
 اُسے خیال آیا کہ دودھ کے لیے وہ برتن تو لایا ہی نہیں، پوریاباں لے کر پوری قیمت سے کام لیتے ہوئے تیز رفتاری سے گھر آیا۔
 وہ اُسی طرح سو رہا تھا۔

بابا نے پوریاں چنگیریں لکھ دیں، گلاس اٹھایا اور دوبارہ بازار چلا گیا۔ دودھ لے کر لوٹا تو اُس نے دیکھا کہ لالو بستر پر بیٹھا ہوا حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔
”لالو بیتر!“

لالو نے کوئی جواب نہ دیا۔ بدستور چاروں طرف دیکھتا رہا۔
”پوریاں کھاؤ گے؟“

لالو نے اُسے اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اُس کی بات سمجھ ہی نہیں سکا۔ اُس کی نظروں میں ایک سوال اُلجھا ہوا تھا۔
”پوریاں پیتر“ اور یہ کہہ کر وہ چنگیر اٹھا لایا،
”یہ دیکھو۔ کھاؤ گے نا؟“
لالو خاموش رہا۔

”میں ابھی چائے بنا رہا ہوں، مزے سے کھائیں گے۔ پہلے ٹھیک ٹھاک سو جاؤ نا۔“
وہ اُسے گود میں اٹھا کر دروازے کے باہر نالی کے پاس لے گیا۔ اُس کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک ماں اپنے شیرخوار بچے کے لیے کرتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر اُس کا منہ دھلایا اور پھر اُسے چارپائی پر لٹا کر چولہا جلا کر چائے بنانے لگا۔
یکام کرتے ہوئے اُسے ایک مبہم سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا، مگر اس نئے تجربے میں اپنی ایک لذت بھی تھی۔

لالو آہستہ آہستہ اپنی نئی زندگی کے معمولات سے مانوس ہونے لگا۔ وہ کچھ باتیں بھی کرنے لگا، اپنی ضرورتوں کا اظہار بھی کرنے لگا۔ چارپائی سے نیچے اس کا دادا اُسے بٹھا دیتا تھا۔ وہ اپنی چوٹی چوٹی بانہوں کے سہارے، اپنی بے جان، کمزور ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پہنچ جاتا تھا۔

اُسے اس طرح گھسے ہوئے دیکھ کر بابا کے دل میں بے اختیار یہ آرزو پیدا ہو جاتی تھی کہ کاش اس کا پوتا عام بچوں کی طرح ہوتا۔ وہ اُوپر بھیت کی طرف دیکھنے لگتا اور اس کی بوڑھی آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے جھلک اُٹھتیں۔
ایک مہینہ بیت گیا۔ بابا کو اخراجات کے لیے کسی قسم کی دقت پیش نہ آئی۔ بیوی کے مرنے اور لڑکوں کے باہر چلے جانے کے بعد اس کا رولہرو کا خرچ بہت کم رہ گیا تھا۔ دونوں دقت قریبی تندور پر جا کر پیٹ بھر لیتا تھا۔ کپڑوں کے چار جوڑے کٹھن میں موجود تھے جن میں ڈھانچے کے لیے اُسے پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا۔

لالو کے آنے سے پیشتر اُس کی مصروفیت صرف یہ تھی کہ تنور سے روٹی کھا کر اپنی پرانی سائیکل کے اوپر ترازو اور بٹے رکھ کر ردی والا آیا، کہتے ہوئے گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ پرانے اخبارات، بے کار کاغذ، گھی کے خالی ڈبے وغیرہ سستے داموں حاصل کر کے بازار کے کونے پر واقع ردی کی ایک بڑی دکان پر اپنا سارا مال کیسی منڈوڑے اور کیسی اچھے خاصے نفع پر بیچ کر لوٹا گھر آ جاتا تھا۔ یہی تھا اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ۔ روزانہ خرچ آٹھ دس آنے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ باقی جتنی رقم بچتی

تھی دو کوٹھڑی کی الماری کے تنبیہ میں ڈال دیتا تھا اور یوں پھیلے میں سوتوں اور لوٹوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو چکی تھی۔
 دوسرا مہینہ بھی ختم ہو گیا۔ لالو کا چہرہ جو ماں باپ کی خدائی کی وجہ سے بچھا بچھا سا رہتا تھا، اب اس پر کچھ رونق آگئی تھی، جب اس کا دادا اپنا کام بٹکا کر اس کے لیے مٹھائی، لکٹ کھٹی مٹھی گولیاں لے کر آتا تھا تو وہ خوش ہو جاتا تھا۔ دادا یہ ساری چیزیں تھال میں ڈال کر اُس کے سامنے رکھ دیتا تھا تو وہ اُنہیں رغبت اور شوق سے کھانے لگتا تھا۔
 دادا جب صبح سویرے اسے ناشتا کر دیا تو اپنی سائیکل باہر نکالنا تھا، اُس پر تراندا اور بٹے رکھنے لگتا تھا تو وہ اپنی باریک آوازیں کہتا تھا۔

”بابا!“

”جی میرے پُتر“

”نیچے آتا ر دو“

بابا اُسے گود میں لے کر رُدی پر بٹھا دیتا۔ بابا نے گھر میں جتنی چادریں اور دریاں تھیں، ان سب کو زمین کے اوپر پھلایا تھا تاکہ اُس کے پوتے کو کوئی چیز نہ چھبے اور وہ آسانی سے کمرے کے اندر گھسٹتا پھرے۔
 اُدھر بابا گلیوں میں گھومتا رہتا تھا۔ رُدی دالا آیا ہے، کی آواز مٹھنی انداز میں اُس کے گلے سے نکلتی رہتی مگر اس کا دل لالو ہی کے گمرد چکر لگا رہتا اور جب وہ محسوس کرتا کہ دھوپ میں تیزی آگئی ہے اور اُس کی جیب میں چند سکے محفوظ ہو گئے ہیں تو وہ اپنی سائیکل کا رخ گھر کی طرف پھیر لیتا۔ لالو سائیکل کی گھنٹی کی آواز سن کر دروازے پر آ جاتا ”بابا“ کہہ کر اپنے دادا کا خیر مقدم کرتا۔
 دوسرے پہر بابا کا دل چاہتا تو دو تین گھنٹے گلیوں میں گھوم پھر لیتا۔ دل نہ چاہتا تو پوتے ہی سے کھینچا رہتا، باتیں کرتا رہتا اور شام آتی تو اُسے گود میں اُٹھا کر یا گاڑی میں بٹھا کر گھنٹہ پون گھنٹہ بازاروں کی سیر کرتا رہتا۔ گھر واپس آتا تو تھک چکا ہوتا، مگر جیسے ہی لالو کو جا پڑتی پڑھتا کہ اس کا مسرور چہرہ دیکھتا تو اُس کی ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے اندر نئی زندگی آگئی ہے۔
 اس کے ارد گرد روشنیاں ہی روشنیاں پھیل گئی ہیں۔ وہ اب ایک نئے، توانا جذبے سے جی رہا ہے۔

تیسرے مہینے کے چھ دن گزرے تھے کہ چودھری ذکا اللہ کے نوکر نے ایک صبح اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

وہ لالو کو ناشتا کر دیا کہ چند منٹ پہلے فارغ ہوا تھا اور اپنا سائیکل ایک میلے کپڑے لے صاف کر رہا تھا۔

دروازہ کھولا تو چودھری صاحب کے نوکر کو پہچان لیا۔

”چودھری صاحب کہتے ہیں۔ پیسے لیے کیوں نہیں آئے؟“

بابا کو یاد آگیا کہ اس کے بیٹے نے کہا تھا۔ ”میں ہر مہینے چودھری ذکا اللہ کو رقم بھیجتا رہوں گا۔ وہاں سے وصول کرتے

رہتا۔“

”یہ بود و بید کی رقم“ نوکر نے ایک لٹاؤ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”دیکھو“ نوکر نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ شکریہ“
 نوکر جانے لگا۔ دو قدم چل کر رُک گیا اور بولا۔
 ”بابا! چودھری صاحب نے پوچھا ہے۔ برخوردار کا جی لگ گیا ہے؟“

بابا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
 ”روتا ووتا تو نہیں ہے؟“

”او دیکھ لو۔ کیسا لگتا ہے“

بابا اُسے اندر لے گیا۔ لالہ ابھی چارپائی کے اوپر ہی دیوار سے پیٹ لگا کر بیٹھا تھا۔
 ”بابا تم کس طرح اس کی پرورش کر رہے ہو؟“

بابا کا سینہ بلفظ کہتے ہوئے پھول گیا۔

”پوتا ہے میرا۔ کوئی غیر تو نہیں ہے۔“

نوکر کے جانے کے بعد بابا نے وہ لفاظی لالہ کے آگے رکھ دیا۔

تمہارے باپ نے روپے بھیجے ہیں ”تمہارے لیے۔“

لالہ، لگتا تھا، یہ لفظ سُسن کر خوش نہیں ہوا۔ اُس نے لفافے کی طرف ہاتھ بھی نہ بڑھایا۔

سورج ہر روز طلوع ہوتا تھا اور اُس کی پہلی شعاعیں دیکھتی تھیں کہ بابا نیو اپنی چارپائی سے اٹھتا ہے۔ پنہاں لٹ پڑھ کر اپنے سوئے ہوئے پوتے کے منہ پر پھونک مارتا ہے، اس کی خیریت کی دعا کرتا ہے، پھر دروازے کے باہر سے گنڈی لگا کر بازار چلا جاتا ہے۔ نامزدہ دودھ، کھن، بندلے کرٹوٹ آتا ہے۔ لالہ جاگ اٹھتا ہے تو اُسے بڑی نرمی سے اٹھا کر باہر نالی کے اوپر لے جاتا ہے۔ والپس لاکر اُس کا منہ دھلاتا ہے۔ تو بے پروا گرم کچے اس پر کھن لگاتا ہے اور بڑے پیار سے اُسے ناشتا کرواتا ہے۔ سورج کی شعاعیں یہ منظر ہر صبح دیکھتی تھیں اور وقت بہت رہتا تھا۔

بابا کو اپنے ان کاموں سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ وہ سمجھنے لگا تھا اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اُس کی زندگی ادھوری رہ جائے گی۔

اُس دوپہر کو بابا اپنی پہلی ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد چارپائی پر ذرا آرام کر رہا تھا اور لالہ کو کسی رسالے کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ یہ تصویریں والہ رسالہ بابا کو رومی میں ملتا تھا۔

اور وہ اُسے بیچنے کی بجائے پوتے کے دل بہلاوے کے لیے گھر لے آیا تھا۔

”بابا! لالہ نے داد کو پکارا۔“

نیو فوراً اُٹھ بیٹھا۔

”کیوں پتہ کیا بات ہے؟“

”باہر کوئی ہے“ لالو نے اُسے مطلع کیا۔
 نیمو باہر آیا۔ اُس کے سامنے چودھری دکا۔ الٹ کھڑے تھے۔
 ”چودھری جی! کیوں تکلیف کی ہے، مجھے حکم دیتے۔ حاضر ہو جانا۔“
 لالو کی بات نہیں بابا! لالو کر دے۔ اپنے پوتے کو اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔“
 یہ لفظ سن کر نیمو حیران رہ گیا۔ چودھری کو ناکیا چاہتا ہے۔ میں اپنے پوتے کو اٹھا کر کیوں اُس کے ساتھ چلوں معا ملہ کیا ہے؟

چودھری صاحب نے بابا کو شش و پنج کی کیفیت میں دیکھا تو بولے۔
 ”گھبراؤ نہیں بابا! اچھے کام کے لیے کہہ رہا ہوں۔“
 ”اتھا جی“

نیمو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر گیا۔ لالو دروازے کی طرف ٹھٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔
 ”کون ہے بابا!“

”وہ اپنے چودھری صاحب ہیں۔“
 یہ کہہ کر بابا نے پوتے کو جلدی سے ٹالباکس پہنایا۔ اس دوران ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔
 بابا لالو کو دیکھ کر باہر آ گیا۔
 لالو کے باہر چودھری صاحب کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے پھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ بابا اور لالو بیٹھ گئے چودھری صاحب اگلی سیٹ پر چلے گئے۔

لالو کے لیے گاڑی میں بیٹھنا کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ امریکا میں اُسے بار بار گاڑی میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ البتہ بابا کے لیے یہ ایک نیا واقعہ تھا۔ مگر وہ اس تجربے سے کوئی لطف نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے باطن میں ایک کمبلی سی جی تھی۔ بار بار اُس کے ذہن میں یہ سوال اُٹھتا تھا ”آخر ہمیں لے جایا کہاں جا رہا ہے اور کیوں لے جایا جا رہا ہے۔“
 گاڑی ایک شاندار جگہ کے پورچ میں ڈک گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی سے نکل کر کال پیل پر آٹھنگی رکھی اور کسی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد دروازے پر ایک عورت آئی، ڈرائیور نے اُسے کچھ کہا۔

نیمو بیٹنڈر اپنی اُلجھن میں گرفتار تھا اور لالو کی حالت بھی اپنے دادا کی کیفیت سے کچھ مختلف نہیں تھی۔
 ایک بھاری بھر کم، اعلیٰ قسم کے سوٹ میں ملبوس آدمی آ گیا۔ چودھری صاحب جو گاڑی سے باہر آ چکے تھے، فوراً اس کی طرف لپکے اور مصافحہ کرتے ہوئے انھوں نے کچھ کہا۔ اُس کے جواب میں آنے والے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ بابا، لالو، چودھری صاحب اور وہ صاحب ایک بہت شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔
 اور وہی عورت جس نے دروازہ کھولا تھا، چائے کی ٹرالی لا رہی تھی۔

ایک دوسرے کی حیرت دریافت کرنے کے بعد چودھری صاحب نے میزبان کے چہرے سے جھگاہیں ہٹا کر بابا کو مخاطب کیا۔
 ”بابا یہ ہیں سیٹھ حاکم علی صاحب۔ ہمارے ملک کے بڑے نیک آدمی ہیں۔ بھلائی کے کام کرتے رہتے ہیں، سارا ملک ان کی
 عزت کرتا ہے۔ انہوں نے ایک دارہ قائم کر رکھا ہے۔ ساتھ والی کوٹھی میں۔ اس میں وہ بچے پرورش پاتے ہیں جو لا لوبے ہیں میرا
 مطلب سمجھ گئے ہونا“

بابا نے سرخم کر کے خاموشی سے جواب دے دیا۔
 ”اس ادارے میں کوئی پندرہ بچے ہیں۔“

”پندرہ نہیں بائیس“ سیٹھ صاحب نے چودھری صاحب کے فقرے کی تصحیح کی۔

”اچھا“ چودھری صاحب کے لہجے میں تحسینی پہلو غالب تھا ”پچھلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو پندرہ تھے۔ اللہ کے فضل
 سے آپ کی بچی کا کام بڑھنا جا رہا ہے۔“

”بس اس کا کرم ہے“ سیٹھ صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی اُپر اٹھاتے ہوئے کہا۔
 چودھری صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”مدیر بچے بڑے اچھے ماحول میں رہتے ہیں“ نوکر چاکر ہر وقت ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کا علاج معالجہ بھی ہوتا رہتا
 ہے۔ بابا! ننھا دے لیے لا لو کی پرورش شکل ہوگی، میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس بچے کو یہاں داخل کر دو۔“
 بابا کے ذہن میں کیسی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے پوتے کو کہیں چھوڑ کر گھر چلا جائے گا۔ وہ فوری طور پر اپنے ذہنی
 رد عمل کا اظہار نہ کر سکا۔

”میری مانو بابا! اس میں تمہارے لیے اور لا لو کے لیے ہر طرح بہتری ہے۔“
 آدھ گھنٹہ باتوں میں گزر گیا۔ آخر میں بابا اپنے پوتے کو سیٹھ صاحب کے ادارے کے سپرد کرنے پر نیم رضامند ہو چکا تھا۔
 وہ جب تنہا دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں آیا تو چارپائی پر لا لوبہ پا کر اس کا دل ٹوڑنے لگا۔
 اُس روز وہ شام تک چارپائی پر لیٹا رہا اور رات آئی تو کچھ کھائے بغیر سو گیا۔

صبح طلوع ہوئی۔ اُس کی اولین شعاہں نے غیر مرمی ہاتھوں سے اُس کے دروازے پر دستک دی، مگر وہ نہ اٹھا۔
 لیٹا ہی رہا۔

تین بار سورج طلوع ہوا، اور غروب ہوا۔ بابا کا دل کسی کام میں بھی نہیں لگتا تھا۔ روٹی کھاتے ہوئے، سائیکل کو کوٹھڑی
 میں سے باہر نکالتے ہوئے، گلیوں میں سے گزرتے ہوئے، لمبے لمبے وقفے رُخ والی آواز نکالتے ہوئے لا لوبہ صورت بار بار
 اُس کی آنکھوں سے آ جاتی تھی، اور وہ دل سوس کر رہ جاتا تھا۔

ان تین دنوں میں اُس نے محسوس کیا کہ اس کا جیون اُدھورا ہو گیا ہے۔ وہ کوئی ایسی شے کھو چکا ہے کہ اس کی زندگی میں ایک
 لمحہ بہ لمحہ وسیع ہوتا ہوا خلا پیدا ہو گیا ہے۔

چوتھے روز وہ قمبرے پر سیٹھ صاحب کے دروازے پر تھا اور ان سے جب کہہ رہا تھا۔
 ”سیٹھ صاحب! میرا لودے دیں“ اس کی ساری روح اس ایک فقرے میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔
 ملے جاؤ مگر بابا! یہ اچھا نہیں کرو گے۔ بخاری مرضی، بخاری امانت ہے۔ میں روکوں گا نہیں۔“
 بابا اپنے لالو کو واپس لے آیا۔

بابا کے فرائض کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا۔ وہ نئی آمگوں کے ساتھ پوتے کے لیے ہر وہ ذمہ داری نبھانے لگا جو پہلے نبھایا کرتا تھا۔ اس کے لیے اچھی اچھی کھانے پینے کی چیزیں لانے لگا، نئے نئے لباس خریدنے لگا۔ ہر شام اسے بچہ گاڑی میں بٹھا کر سیر کھرانے لگا مگر وہ نہ جانے کیوں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا پوتا پہلے جیسا خوش نہیں ہے۔
 ”لالو پتر!“

”بابا!“

”یار! بات کیا ہے، تو — پت — ر، بتانا“
 لالو خاموش رہا۔

”بتانا — میرے پتر“

لالو کی خاموشی قائم رہی۔

آخر بابا نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

”وہاں جانا چاہتے ہو؟“ بابا کی مراد سیٹھ صاحب کے ادارے سے تھی۔

لالو خاموش رہا، مگر یہ خاموشی پہلی خاموشی سے مختلف تھی۔

وہ رات بابا نے کروٹیں بدل بدل کر گزار دی۔

سورج طلوع ہوا، اور اس کی شعاعیں بکھرنے لگیں تو بابا پوتے کے لیے ناشتا لایا جسے پوتے نے اس انداز سے کھایا جیسے مجبوری

کے عالم میں گتے حلق سے اتار رہا ہے۔ اس کے ایک گھنٹے بعد وہ لالو کے ساتھ سیٹھ کے ڈرائنگ روم میں تھا۔

”سیٹھ جی! یہ — یہاں — رہے گا۔“

”میں نے تو پہلے ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ اسے واپس لے جا کر اچھا نہیں کرے۔ یہاں بچوں میں ہر بچے کا دل بہل جاتا ہے۔“

بابا نے جیسے ایک لفاظی نکالا اور سیٹھ صاحب کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ رقم اس کے باپ نے بھیجی تھی — اب یہ پیسے آپ کو ملے رہیں گے۔“

”کیوں بابا؟“

بابا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لالو کو گھر سے لگا کر اسے بار بار چوما اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

اس کی پلکیں سنوؤں سے بوجھل ہو گئی تھیں — اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا گویا ایک ایسا جسم ہے جسکی روح اس میں سے نکل گئی ہے

اور وہ بغیر روح کے چلا جا رہا ہے۔

گریٹ مین

میرزا ادیب

آدھی رات سے کچھ وقت گزرا ہو گا کہ نور اُمٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس تاریکی میں کسی ایسی کون کی تلاش میں تھی جو اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جائے۔

یہ پہلی رات نہیں تھی جب وہ اس درجہ بے تاب ہو گئی تھی کہ آدھی رات سے زیادہ لیٹ ہی نہیں سکی تھی۔ ایسی کئی راتیں آئی تھیں اور ان راتوں میں یا تو وہ سارا وقت کروٹیں بدلتی رہی تھی یا اُٹھ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی، اور پھر ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکی تھی۔

وہ ایک غریب بیوہ تھی، دنیا میں اس کا کوئی بھی سہارا نہیں تھا۔ گھر کا خرچ چلانے کی خاطر وہ محلے کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور تھی۔ اس کا اُسے دکھ ضرور تھا مگر یہ کوئی ایسا دکھ نہیں تھا کہ وہ ویری ویری رات آنکھوں میں گزاریں اس کے دکھ کی اصل وجہ اس کا بیٹا تھا جسے سال کا نواب جو اندر کمرے میں سو رہا تھا۔

نواب سے اُسے یہ شکایت نہیں تھی کہ وہ کچھ پڑھ لکھ نہیں سکا تھا کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا۔ گھر کی ذمہ داریوں میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا، ایسی باتوں کا کچھ تو اسے اس وقت ہوتا جب نواب ایک نارمل انسان ہوتا اور وہ نارمل انسان تھا ہی نہیں۔

ماں نے جب اس کا نام نواب رکھا تھا تو وہ غیر شعوری طور پر چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کہ دولت مند بنے۔ آپ کھائے ماں کو کھلائے اور وہ نواب تو بنا مگر خیالی دنیا کا، اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک ہیٹ بڑا آدمی ہے اور سب کے سب اس کی عزت کرنے ہیں اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں وہ خود کو گریٹ مین تصور کرتا تھا اور یہ اس بنا پر کہ چراغ دین ٹھیکیدار کا بڑا لڑکا جو کسی کالج میں پڑھتا تھا اس نے نواب کو بتایا تھا کہ تم گریٹ مین ہو۔ یہ لفظ سن کر نواب ہونٹوں کی طرح اسے دیکھنے لگا تھا۔

”ارے میاں تم گریٹ مین ہو۔ گریٹ مین کا مطلب ہے بڑا آدمی، تم بڑے آدمی ہو یعنی گریٹ مین ہو۔ سمجھے؟“

نواب نے یہ لفظ یاد کر لیے تھے تو راتیں بلا عمل اور بلا ضرورت اپنے ہونٹوں پر لے آتا تھا۔ محلے میں اکثر لوگ نہ اٹھتے گریٹ مین کہہ کر ہی پکارتے تھے اور اس طرح پکارے جانے پر وہ پھولا نہیں سماتا تھا چلے پہل ماں نے سوچا تھا۔ ابھی چھوٹا ہے۔ یہ نہیں سوچ سکتا کہ لوگ گریٹ مین کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں جب بڑا ہو جائے گا تو اصل حقیقت سمجھ لے گا مگر اس کی یہ اُمید خاک میں مل گئی کیونکہ نواب دوسروں کے مذاق کو مذاق سمجھ ہی نہ سکا وہ خیال کرتا تھا کہ محلے کے چھوٹے بڑے جو مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر اس کو سلام کرتے ہیں اور گریٹ مین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو یہ سب کے سب واقعی اس کا احترام کرتے ہیں اور

حقیقتاً اسے گریٹ میں ہی تصور کرتے ہیں اور کچھ زیادہ سے زیادہ اہل چلنا چلا گیا۔
 نوران صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بے شک ایک چھوٹی کوڑی بھی کھا کر گھر میں نہ لائے، دن بھر گھر میں بے کار بیٹھا
 رہے مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کام کرنے کے لیے جس گھر میں بھی جائے، گھر کے لوگ ہنس ہنس کر اس سے پوچھیں۔
 ”نوران! کیا حال ہے تیرے نواب کا یہ تیرا گریٹ میں کیا کر رہا ہے؟“

وہ اس طنز کو خوب سمجھتی تھی اور یہی احساس اس کے لیے اس قدر اذیت ناک ہو گیا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کاش
 اس کا بدبخت بیٹا مر جائے تاکہ ہر روز اسے زہر کے گھونٹ تو نہ پینے پڑیں۔

محلے کے لڑکے آئے دن اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واردات کر دیتے تھے۔ اسکی محفل میں صدر بنایا جاتا تھا، اور جب وہ
 بیٹھنے لگتا تھا تو کرسی کھسکا کر اسے گرا دیا جاتا تھا اور پھر معافی مانگ لی جاتی تھی۔ اُسے ایسی مٹھائی کھلائی جاتی تھی جس میں نمک بھرا
 ہوتا تھا۔ اس کی شان میں ایسے قصیدے پڑھے جاتے تھے کہ جن میں اس کا جی بھر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ لیکن وہ تھا کہ اس سارے
 مذاق کو اپنی شان میں اظہارِ عقیدت ہی سمجھتا تھا۔

اگلے دن اس کے گلے میں ایک بڑا سا ہار ڈالا گیا تھا جس میں پھولوں کے ساتھ کپڑے میں لپی ہوئی کوئی شے بھی تھی۔ نواب
 یہ بارہیں کر بڑی آن بان شان سے گھر کی طرف جا رہا تھا اور محلے کے بچے اس کے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے جب وہ گھر کی دہلیز پر پہنچا
 تو اس نے اس کا ہار فوج لیا اور کپڑے میں لپٹا پڑا تو جتنا نکال کر اُسے تالیاں بجانے والے بچوں پر دے مارا اور کم از کم آدھ
 گھنٹہ تک اُنہیں بددعاؤں دیتی رہی۔

اس کا بیٹا کتنا احمق ہو گیا ہے کہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ لوگ اُسے ذلیل کر رہے ہیں، یہ بات اس کے لیے سو ہانہ دوح
 بن گئی تھی اور وہ اپنی ذلت کے احساس سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مگر اس کا بے حیا بیٹا تھا کہ ماں سے لڑ رہا تھا۔

”ماں تو پاگل ہو گئی ہے یہ میری عزت کرتے ہیں۔“

”عزت کرتے ہیں، عزت کرنے کے لیے گلے میں جوتے ڈالے جاتے ہیں؟“ اور اس نے بیٹے پر اس زور سے
 دھنڑ مارا کہ وہ بلبلا اُٹھا۔

نوران کے گھر میں جب بھی ایسا ہنگامہ برپا ہوتا تھا تو عموماً ماں بسائی بھاگتی ہوئی آ جاتی تھی اور وہ وہی فقرہ کہتی تھی جو وہ
 کئی بار کہہ چکی تھی۔

”نوران وہ تو پگھلا ہے، تو بھی پاگل ہو گئی ہے۔“

اور نوران اُس کے جواب میں اپنے کُرتے کا دامن پھیلا کر اوپر دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہتی۔

”اللہ اسے کسی کی آئی آ جائے یا مجھے اُٹھالے۔“

اس دن بھی اس نے یہی دُعا کی تھی اور نواب یہ کہہ کر دروازے میں سے نکل گیا تھا۔

”اب میں اس گھر میں کیسی نہیں آؤں گا۔“

مگر حسب معمول وہ شام کو گھر آگیا تھا اور اس وقت اندر کمرے میں سو رہا تھا۔
نوراں کے ذہن میں تلخی بھر گئی۔ اُس نے چار پائی سے نیچے اُتر کر گھرے میں سے ٹھنڈے پانی سے مٹی کا وہ پیالہ بھرا جس سے
گھرے کو ڈھانپا گیا تھا۔ سرد پانی جب اس کے حلق سے نیچے اُترا، اُسے ذرا سا سکون مل گیا۔ مگر یہ سکون عارضی تھا، کیونکہ اُسے پھر
ایک بات یاد آگئی تھی جس نے اُسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

میاں نور محمد کے ہاں جو عورت برتن مانجھا کرتی تھی وہ بیمار ہو کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی اور میاں صاحب کی بیوی نے نوراں
کو کہلوا بھیجا تھا کہ وہ اس کے ہاں کام کیا کرے۔ نوراں کو تو کام کرنا تھا۔ کہیں بھی ہو۔ وہ میاں صاحب کے ہاں چلی گئی۔
جس لمحے وہ دالان سے گزر کر کمرے میں پہنچی میاں صاحب اپنی کچھڑی داڑھی میں کنگھی پھیر رہے تھے۔

نوراں نے سلام کیا۔
”وصلیکم السلام۔ نوراں بہن! کیا حال چال ہے؟“ میاں صاحب نے کنگھی میز پر رکھ کر سرسردانی اٹھائی اور آنکھوں میں سرمہ
ڈالتے ہوئے یہ سوال کیا۔

”اللہ کا شکر ہے میاں جی!“

”ہاں شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ پر بندہ بڑا ناشکرا ہے۔“

”جی میاں جی“

”کیا کام ہے نوراں بی بی؟“

”وہ جی آپ کی بیگم نے بلایا ہے۔ فاطمہ بیمار ہو کر چلی گئی ہے نا۔“

میاں صاحب نے نوراں کو ذرا غور سے دیکھا۔

”تو تم فاطمہ کی جگہ کام کرو گی؟“

نوراں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”پر نوراں بہن! تیرا بیٹا تو گریٹ مین ہے۔ گریٹ مین کی مائیں دوسروں کے برتن نہیں مانجھا کرتیں۔“

نوراں کے ذہن میں جیسے شعلہ سا بھڑک اُٹھا اور اس شعلے کی حرارت اس کے سارے بدن میں سرایت کر گئی۔

میاں صاحب مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے، یہ مسکراہٹ اسے زہر لگی اور وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ ٹھہر سکی۔ اس وقت

وہ خاموش رہی تھی۔ مگر اب جو اُسے یہ بات یاد آگئی تو وہ میاں صاحب کو بددعاؤں دینے لگی۔

میاں تیرا جنازہ اُٹھے، تجھے سانپ ڈس جائے۔

وہ بددعاؤں دے رہی تھی اور اس کے اپنے الفاظ اس کے کانوں میں اس طرح اُتر رہے تھے، جسے ان میں گرم گرم تپیل ڈالا

جا رہا ہے ایک مرتبہ اور اُس نے بھرا ہوا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور تین چار لمبے لمبے گھونٹ بھرے۔ آدھا پانی ٹھوڈی پر سے گزر کر

گردن کو چھوتا ہوا اگر بیان تک جا پہنچا اور وہ پیالہ ہاتھ میں لیے یونہی سامنے دیوار کو گھورتی رہی۔

آسمان میں ستارے چمکی چمکی روشنی دے رہے تھے اور ہر طرف ستانا چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں جب میاں نور محمد کے کونٹے سے مٹرنے کی لگڑوں کوں کہتے ہوئے آواز بلند ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔
مُرخا بانگ پر بانگ دے رہا تھا اور نواں کا جی چاہتا تھا کہ وہ اگر اس کے قریب ہوئی تو اس کی گردن ہی مروڑ ڈالتی اس نے میاں صاحب کی بیوی کو دل ہی دل میں گالیاں دیں جس نے اسے پال پوس کر اتنا طاقت ور بنا دیا تھا کہ اُس کی آواز محلے میں دُور دُور تک گونج اٹھتی تھی۔

نوراں کو معلوم تھا کہ جب مرنا بانگ دیتا تھا تو اس سے تھوڑی دیر بعد مسجد سے اذان کی آواز بھی آنے لگتی، مگر اس صبح صرت مُرخا ہی ساری فضا پر چھایا ہوا تھا۔ اذان کی آواز سنیں آئی تھی۔ شاید مؤذن سو گیا تھا یا مٹرنے نے وقت سے پہلے ہی لوگوں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔

نوراں گٹرے کے پاس کھڑی رہی۔ پیلا ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔
اس نے پیلا اوندھا کر کے گٹرے کے منہ پر رکھ دیا اور پھر برآمدے کا دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کمرہ ذابکا ڈرائنگ روم بھی تھا۔ کامن روم بھی اور خواب گاہ بھی، دیواروں پر پُرانے کیلنڈر، انگریزی اور دلیبی ایگزیٹسوں کی تصویریں اور وہ ہلکے ہلکے تھے جو ذابکا کے بزمِ خلیش عقیدت مندوں نے خاص خاص موقعوں پر اس کے گلے میں ڈالے تھے۔ ان کے پھول مرہا کر ذروں کی صورت میں نیچے گرے ہوئے تھے۔

نوراں نے اندر قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر چارپائی کے نیچے فوجی بوٹ پر پڑی۔
یہ بھاری بھر کم بوٹ غلام احمد قریشی صراف کے بیٹے نے نواب کو دیئے تھے اور یہ کہہ کر دیئے تھے کہ گریٹ مین ایسے بوٹ ہی پہنا کرتے ہیں۔

ذاب کو بھلا ایسے بوٹ پہننے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اُس نے بڑی شان سے بوٹ لیے شدید گرمی کی وجہ سے اُس کو محسوس ہوا، جیسے اس کے پیروں کو گرم گرم شکنجے میں کس دیا گیا ہے لیکن گریٹ مین کو تو سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔
اس کے پاس یہ خوفناک بوٹ دیکھ کر نوراں کے اندر مزید اسی کی لہر دوڑ گئی۔

”تو بزمیرے اللہ! اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس وقت اس کی نظر بیٹے کے چہرے پر پڑی۔ اس کا چہرہ پیلا پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ اور اُس پر جا بجا پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

نوراں کو محسوس ہوا کہ اس کے ہونٹ حرکت کر رہے ہیں، وہ کیا کہہ رہا تھا۔ نوراں کو سنائی نہیں دے رہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ سوتے میں بھی کئی ڈھنگ کی بات نہیں کرتا، ایک دو بار جب وہ ڈالان میں سویا ہوا تھا، اس نے بیٹے کو بڑبڑاتے ہوئے پایا تھا اور جب اپنے کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے گئی تھی۔ تو اس نے سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اماں! میں گریٹ مین ہوں۔ اماں! تم نہیں سمجھتیں کہ میں کیا ہوں۔ گریٹ مین، گریٹ مین، اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر سے ٹھٹھکی ہانڈھ کر دیکھ رہی تھی۔

نواب کا ماتھا سُجا ہوا تھا۔ اور پھر اس کے چہرے پر اُڑ رہے تھے۔
نوراں نے قرار سہجائی اور اس کے ماتھے پر اختیار کی گئی کی طرف بڑھنے لگی اُس نے زور زور سے اُس کے
کندھوں کو ہلایا۔ نواب نے پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

”کیا ہے اماں“

”مردار منہ پر چھڑکھیاں اُڑ رہی ہیں۔“

نواب نے زہرناک نظروں سے ماں کو دیکھا۔

”اماں! تجھے ہزار بار کہا ہے، ذرا ادب سے بات کیا کرو۔“

”کیوں مے ادب سے بات کیوں کروں۔ تو میرا جنا ہے یا تو نے مجھے جنا ہے۔“

”اماں“ نواب نے ماتھے سے پھروں کو ہٹاتے ہوئے کہا: ”تو جانتی نہیں، میں گریٹ مین ہوں۔“

نوراں نے زور سے زمین پر تھوکا۔

”کھم لعنت تیری گریٹ مینی پر۔ سب تجھے مکھول کرتے ہیں۔ تو نے میرے گھر کی خاک اُڑادی ہے۔“

نواب اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی انگلیاں ماتھے پر پھیر رہا تھا۔

اماں ”تو نہیں مانتی میں گریٹ مین ہوں۔ گریٹ مین۔ بڑا آدمی۔ لوگ میری عزت کرتے ہیں، مجھے دیکھتے ہیں تو فوراً کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ سنا تو نے۔ لوگ مجھے اتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسی وقت اُٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ میں گریٹ مین ہوں۔ ایسی

عزت گریٹ مین ہی کی جاتی ہے۔ نواب کا چہرہ بخشش بیان سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اس کے نتھنے متحرک تھے اور وقت بڑا مکھن

دکھائی دے رہا تھا پھر نہ جانے کیوں ماں کی ممتا باگ اٹھی۔ اُسے اپنے بیٹے کا وہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا جو برسوں پہلے اس کی چھاتی

سے دودھ پیتے پیتے چھاتی پر دانت مار دیتا تھا اور وہ درد سے بے قرار ہو جاتی تھی۔ چھاتی اس کے منہ سے نکال لیتی تھی لیکن جب

وہ رونے لگتا تھا تو اسے سینے سے چٹا کر پھر چھاتی اس کے منہ میں ڈال دیتی تھی۔

اس نے اپنا ماتھا بڑھا کر اس کے سر کے سخت بالوں پر پھیرا اور یہ احساس کر کے کہ ان بالوں میں تیل نہیں لگا یا گیا اس

کا دل اور دکھی ہو گیا۔

”منہ نہ پتہ نہ“

نواب کچھ سمجھنے بغیر اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

”تو سمجھتا کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔ اللہ ان کو سانپ کاٹے۔ ان کے جنازے نکلیں۔“

نواب جانتا تھا کہ اس کی ماں کی لوگوں کو بددعا تیں دے رہی ہے۔

”نہیں اماں۔ وہ میری عزت کرتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”نہیں کرتے، تیرا مکھول اُڑاتے ہیں۔“

نوراں نے اپنا ہاتھ بیٹے کے سر سے ہٹالیا تھا۔
 ”اماں! وہ آج میرا جلوس نکالیں گے۔ میرے گلے میں۔۔۔۔۔۔“
 ”جو تیوں کے ہار ڈالیں گے، منہ پر تنوکیں گے، زور زور سے ہنسیں گے خفقہ لگائیں گے۔ بے شرم۔ بے حیا۔۔۔۔۔۔“
 دو ہتھ مارنے کے لیے اس کے ہاتھ آدھراٹھ اور پھر واپس آگئے۔
 ”اماں تو پاگل ہو گئی ہے۔“

نوراں کے ہونٹ تھر تھرانے لگے۔
 ”دے میں پاگل ہوں کہ تو پاگل ہے تیرا دماغ سہر گیا ہے عزت بے عزتی میں فرق ہی نہیں کرتا اللہ کھے تجھے کسی کی آنے تجھے ہیبت ہو جائے۔“
 بیٹے سے بحث کے اختتام پر وہ اسی قسم کے فخر کے کہتی تھی اور بار بار مانتے پر ہاتھ مار کر قسمت کو کوستی تھی۔
 وہ دروازے کی طرف مڑی فوراً پلٹ آئی۔

”میں کہتی ہوں تو آج گھر سے نہیں نکلے گا، اُس نے حکم دے دیا۔“
 نواب سر ہلانے لگا گویا کہہ رہا ہے۔ ”جو دل میں آئے کہہ دے ہو گا وہی جو میں پسند کرتا ہوں۔“
 ”میں کہتی ہوں تو گھر سے نہیں نکلے گا۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔“
 ”میرا جنازہ نکلے گا۔“ نکلنے دو اماں! جہانہ ہی نکلنے دو۔“

وہ برداشت نہ کر سکی نواب پر پل پڑی۔ اُسے دھکا دے کر چارپائی پر گرا دیا اور اس کے ہاتھ اس کے چہرے، سینے اور پیٹ پر برتنے رہے۔ تنھک ہار کر دروازے سے باہر نکلی، کٹدی لگائی اور لٹی لانے کے لیے میاں نور محمد کے گھر جانے لگی۔
 اس روز وہ دو پہر تک گھروں میں کام کرتی رہی اور یہ عجول ہی گئی کہ وہ نواب کو کمرے میں بند کر آئی ہے۔ دو بجے کے لگ بھگ وہ ٹوٹی۔ شیخ اللہ دانا کے گھر سے وہ تنخواہ نہیں لیتی تھی، اپنا اور بیٹے کا کھانا لیتی تھی۔ اور اس روز وہ چار روٹیاں اور ایک برتن میں ساگ لیے وہ گھر میں آئی۔ روٹیاں اور سالن کا برتن اُس نے چوڑے کے پاس رکھ دیا۔ بند دروازہ دیکھ کر ”ہائے دے میرے بھائی اس کے منہ سے نکلا۔ اور جلدی سے اس نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ نواب چارپائی پر آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔“
 ”نواب دے نواب“ اس نے بیٹے کو پکارا۔

نواب نے کوئی حرکت نہ کی۔

”کیا مزے سے سو رہا ہے۔“

نواب پر اس فقرے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

نوراں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یک لخت اُسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے پر ہاتھ نہیں چولے پر رکھا

ہوا تو اچھڑ لیا ہے۔

وہ ڈر گئی۔

”نواب پتر نواب“

نواب نے آنکھیں کھل دیں۔

”جس مالے آگئے ہیں“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی لمحے لڑکھڑا کر گر پڑا۔

تین دن گزر گئے اور اس کا جنازہ اُترا۔ چوتھے روز وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کے ٹھیک ساتویں روز بعد وہ چارپائی کے اوپر بے حس و حرکت، نحیف و نزار جسم کی صورت میں پڑا تھا۔

نواب مر گیا۔ نواب مر گیا۔

ہر شخص دوسرے سے کہتا تھا، دراصل وہ دوسرے کو خبر نہ رہا تھا کہ محلے کی تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ ختم ہو گیا ہے۔
نوراں خاموش تھی اس کے سامنے اس کے بیٹے کو ہٹایا گیا، کھٹایا گیا، اس نے نوراں سے ایک لفظ کہا اور نہ آنکھ سے ایک آنسو تک بہایا۔
محلے کی عورتیں منہ جوڑ کر کہتی تھیں۔

”ہلے کیسی ظالم ماں ہے نہ روتی ہے نہ بین کرتی ہے“

اور نوراں بالکل نہ روتی۔ محلے کی عورتیں اپنے مرے ہوئے عزیز یا دکر کے روتی رہیں۔

چار مردوں نے جنازہ کندھوں پر اٹھایا اور قبرستان کی طرف چلے گئے، جنازے کے ہمراہ صرف سات آدمی تھے۔

اور ان میں چار جنازہ اٹھانے والے بھی شامل تھے۔ آٹھویں نوراں تھی جو اس طرح چل رہی تھی جیسے خواب میں قدم اٹھا رہی ہے۔

جنازے کے ساتھ جانے سے اُسے کسی نے بھی نہیں روکا تھا، دراصل اُس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی تھی۔

جنازہ گلی سے باہر نکل آیا۔

امجد علی ٹھیکیدار کی حویلی میں کوئی تعریف تھی۔ حویلی کے باہر دس بارہ آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے، انہوں نے جنازے کو کتے

دیکھا تو سب کے سب احترازا کھڑے ہو گئے، نوراں نے انہیں کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا اور ایک لمخت اُس کے قدم رک گئے۔

اس نے زور سے اپنے سینے پر دو ہتھ مارا اور تڑپاٹے دے لوگو! میرا گریٹ میں مر گیا، ہائے دے میرا گریٹ میں مر گیا! اور

یہ الفاظ کہتے ہوئے تیرا کر زمیں کے اوپر گر پڑی۔

دو بہنیں (ایک تئیں ریڈیو تکنیک میں)

کردار حسب ترتیب سے آتے ہیں -

راجیل _____ شاہینہ کا کلاس فیلو - عمر چوبیس برس
 شاہینہ _____ ایک خوب رو، وفار شعار لڑکی - راجیل سے محبت کرنے والی
 عمر اکیس سال
 نگہت _____ شاہینہ کی عزیز ترین ہم عمر سہیلی
 ناجیہ _____ شاہینہ کی چھوٹی بہن
 سرور جان _____ شاہینہ اور ناجیہ کی ماں
 طلعت _____ راجیل کی ماں
 ریشماں _____ رشتے کرانے والی اماں

ایک خاتون

منظر :-

ایک مخلوط تعلیم کا کالج

پوسٹ گزٹ بجرائٹ کلاس کا آخری دن

طلبہ اور طالبات کالج کے برآمدوں اور گراؤنڈ میں ایک دوسرے سے ملاقاتوں میں منہمک ہیں
 شاہینہ کتابوں کا ایک بڈل اٹھائے گراؤنڈ کے ایک گوشے میں کھڑی ہے -

راجیل، جو شاہینہ کا کلاس فیلو ہے، وہاں آتا ہے -

راجیل : بھئی کمال ہے سارے کالج میں ڈھونڈ مارا ہے تمہیں اور محترمہ بیباں مزے سے کھڑی ہیں -

شاہینہ : راجیل تمہیں خبر تو ہے میں یا تو لا تمبر بری میں ہوتی ہوں یا کالج گراؤنڈ میں -

راجیل : تو یہاں ہو کیا رہا ہے ؟

شاہینہ : انتظار -

راجیل : مجھے افسوس ہے تمہیں انتظار کرنا پڑا -

وہ کم بخت ریاض ہے نا - اُس نے روک لیا تھا، نوٹس کی ضرورت تھی اُسے - ساری شاہینہ - !

شاہینہ : اچھا معاف کر دیا۔ اب تمہیں میرا انتظار کرنا پڑے گا۔

راحیل : وہ کیوں ؟

شاہینہ : دیکھ نہیں رہے کتابوں کا بوجھ اٹھائے کھڑی ہوں۔

راحیل : لائبریری کی ہیں۔

شاہینہ : جی اور آج دانسی کا آخری دن ہے۔ کیونکہ آج کالج میں آخری دن ہے۔ کچھ دوستوں سے بھی ملنا ہوگا۔ بعد

میں نہ جانے کب ان سے ملاقات ہو۔

راحیل : یہ سب کچھ ہو جائے گا، فی الحال میرے ساتھ چلو۔

شاہینہ : کیوں ؟

راحیل : بہت ضروری معاملہ ہے۔

شاہینہ : بہت ضروری معاملہ کیا مطلب ؟

راحیل : بہت ضروری معاملے کا مطلب نہیں سمجھتیں، کچھ کہنا سنا ہے۔

شاہینہ : یہ تو یہاں بھی ہو سکتا ہے کہیں جانے کی ضرورت کیا ہے ؟

راحیل : یہاں نہیں ہو سکتا میں شاہینہ اکبر، یہاں ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔

شاہینہ : (منہ کر گھرے ہوئے ہیں، یعنی ان لڑکوں اور لڑکیوں نے ہمارا محاصرہ کر رکھا ہے۔

راحیل : یہی سمجھ لو۔ آدھ پلن گھنٹے کے لیے ان سے الگ تھلگ رہ کر گفتگو کر لیں تو کیا حرج ہے۔

شاہینہ : حرج کیا ہوگا۔

راحیل : (جلدی سے) کالج ابھی چار گھنٹے کھلا رہے گا، بہتیرا وقت ہے لوٹ آئیں گے۔ !!

شاہینہ : راحیل تمہاری بڑی بُری عادت ہے۔ اپنی بات منوالیتے ہو۔ دیکھو نا، اب میں رضیہ۔ ساجدہ۔ نیشاد کوکب کا

کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے نہیں پائیں گی تو پریشان ہو جائیں گی۔

راحیل : کہا جو ہے جلد لوٹ آئیں گے۔ وہ بالکل پریشان نہیں ہوں گی۔

شاہینہ : اچھا بابا۔

راحیل : شکریہ۔

ذرا سا وقفہ جس میں موٹر سائیکل سٹارٹ کی جاتی ہے۔

بازار کی گھما گھمی۔

یہ گھما گھمی ایک آبشار پرندوں کے چہچہوں میں منتقل ہو جاتی ہے۔

کار کے رکنے کی آواز اس کے دروازہ بند ہونے کی آواز۔

شاہینہ : کہو اب کیا معاملہ ہے
 راحیل : شاہینہ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں نے امریکا کی ایک یونیورسٹی کے سکالرشپ کے لیے Apply کر دیا تھا۔ بالکل توقع نہیں تھی کہ یہ سکالرشپ مل جائے گا۔
 شاہینہ : تو مل گیا ہے مبارک ہو۔
 راحیل : تم سے مشورہ کرنا ہے۔
 شاہینہ : مجھ سے مشورہ۔ قبول کر لو گے میرا مشورہ؟
 راحیل : بالکل۔
 شاہینہ : میں ذاتی طور پر مخالفت نہیں کروں گی۔ ایک گولڈن چانس مل رہا ہے تمہیں کیوں ضائع کیا جائے؟
 راحیل : مگر میں اپنے ذہن میں تذبذب محسوس کر رہا ہوں۔
 شاہینہ : وجہ؟
 راحیل : شاہینہ! مجھے پچھ ہی ہو وجہ کیا تم نہیں جانتیں، تم سے دور ہونا میرے لیے کتنی تکلیف دہ اور ذہنی ناک بات ہے۔
 شاہینہ : ٹھیک ہے۔ مگر
 راحیل : جاؤں یا رہ جاؤں، ساری رات سوچتا رہا ہوں اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔
 شاہینہ : جانا چاہتے ہو تو ضرور بالفرض جاؤ تمہاری ترقی کا سوال ہے، شاید اکر کیریئر کا مسئلہ ہے۔ میں کیسے مخالفت کر سکتی ہوں۔
 راحیل : تو مجھے جانا چاہیے۔؟
 شاہینہ : کہہ تو چکی ہوں۔
 راحیل : لیکن میرے جانے کا انحصار تم پر ہے۔
 شاہینہ : اگر مجھ پر ہے تو میں ہی اپنی رائے بتا چکی ہوں۔
 راحیل : صرف یہ کافی نہیں ہے۔
 شاہینہ : تو کافی کیا ہے۔
 راحیل : ایک وعدہ کرنا ہوگا تمہیں۔
 شاہینہ : وعدہ؟ کیا وعدہ؟
 راحیل : تم میرا انتظار کرو گی۔
 شاہینہ : جو کچھ کہتا چاہتے ہو واضح طور پر کہو۔

راجیل : ہم ہی ایک دوسرے کے شریکِ حیات بنیں گے اور یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب تک میں امریکا سے
نُٹ نہ آؤں تم میرا انتظار کرو گی۔

شاہینہ : یہ کیسے ممکن ہے ۔

راجیل : دلچسپی گھبراہٹ کیسا کتنا چاہتی ہو تم ۔

شاہینہ : راجیل ! اگر میں زندہ ہی نہ رہی تو ۔ کون انتظار کرے گا تمہارا ۔

راجیل : خدا کے لیے ایسا مت کہو ، مت کہو شاہینہ ۔

شاہینہ : زندگی اور موت پر کسی کو اختیار ہے راجیل ۔

راجیل : بہر حال تم مجھے یقین دلاؤ ۔

شاہینہ : کیسے ؟

راجیل : وعدہ کرے ، اس بات کا وعدہ کہ میرا انتظار کرو گی ۔

شاہینہ : اگر میں وعدہ کرتی ہوں تو تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہو گا ۔

راجیل : میں سمجھ گیا ہوں تم کیسا کتنا چاہتی ہو ۔

شاہینہ : سمجھ گئے ہو تو — میں کوئی وصاحت نہیں کروں گی ۔

راجیل : میں جلد سے جلد نُٹ کر آ جاؤں گا ۔

شاہینہ : وعدہ ؟

راجیل : ہاں مکمل وعدہ ، اور تمہاری طرف سے ،

شاہینہ : وعدہ ۔ مکمل وعدہ ۔

راجیل : خدا کا شکر ہے ۔ میری پریشانی دُور ہو گئی ہے ۔

شاہینہ : تو چلیں اب ۔

راجیل : ہاں چلتے ہیں ۔

کارٹا رٹ ہوتی ہے ۔

کار کے ٹارٹ ہونے کا تاثر ،

ایئر پورٹ : یہ آواز ہوائی جہاز کے نچھوں کے شور میں گم ہو جاتی ہے ۔

راجیل : خدا حافظ شاہینہ !

شاہینہ : خدا حافظ ! اللہ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے ۔

نچھوں کا تیز شور جہاز کی گڑگڑاہٹ جو آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے ، ہلکی ہلکی موسیقی سے فیڈ ان ۔

منظر : ————— شاہینہ کا گھر
 ایک کمرہ ، شاہینہ اور اس کی عزیز سہیلی نگہت مصروف گفتگو ہیں ،
 نگہت : آج کتنے دن ہو گئے ہیں اُسے گئے ہوئے ۔
 شاہینہ : چوبیس روز ،
 نگہت : ان چوبیس دنوں میں خط آسانی سے پہنچ سکتا تھا ۔
 شاہینہ : راجیل نے کہا تو تھا کہ جاتے ہی خط لکھے گا ۔ بہت مصروف ہو گیا ہے ۔
 نگہت : مصروفیت اپنی جگہ مگر اپنی خیریت کی اطلاع تو دے دیتا ، ویسے BY THE WAY تمہارا کیا
 خیال ہے ؟
 شاہینہ : میرا کیا خیال ہو گا نگہت ! سمجھتی ہوں نیا ملک ہے ۔ سو کام ہوں گے وہاں SETTLE ہونے
 کے لیے ۔ فرصت ملے گی تو ضرور لکھے گا ۔
 نگہت : گھر خط بھیجا ہے ۔
 شاہینہ : صبح فون کیا تھا ۔ ایک روز پہلے خط مل گیا تھا خالہ جان کو ۔
 نگہت : گھر خط لکھ دیا اور ادھر لکھنا بھول گیا ۔
 شاہینہ : بے وقوفی کی بات کر رہی ہو ۔ کہا ہے نا پرانے لمبے میں بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے خط
 آج یا کل مل جائے ۔
 (شاہینہ کی چھوٹی بہن ناجیہ آتی ہے)
 ناجیہ : (دروازے پر سے) باجی ! ایک قیمتی چیز ،
 شاہینہ : کیا ہے ناجیہ
 ناجیہ : بوجھ لیں یہ وہ چیز ہے جس کا انتظار کرتی رہتی ہیں آپ ۔
 نگہت : انتظار تو یہ راجیل کے خط کا کرتی رہتی ہے ، خط ہے نا ؟
 ناجیہ : یہی ہے وہ چیز (ناجیہ خط دکھاتی ہے)
 شاہینہ : دو مجھے ،
 ناجیہ : انعام ،
 شاہینہ : مل جاتے گا انعام بھی
 ناجیہ : کیا ؟
 شاہینہ : جو کہہ گی ۔

نگہت : بابل اس وقت توجہ مانگوگی مل جائے گا مانگ کر تو دیکھو۔

شاہینہ : اب دے بھی دو۔

ناجیہ : کوئی شاندار فوٹو بن لے دیں گی؟

شاہینہ : اگلے مہینے تنخواہ ملے گی تو ضرور لے دوں گی۔

ناجیہ : اچھا یہ لیجئے۔

[وقفہ جس میں شاہینہ خط پڑھتی ہے]

نگہت : کیا لکھا ہے؟

شاہینہ : تاخیر سے خط لکھنے پر معذرت چاہی ہے۔ اپنے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے دل بہت اُداس رہتا ہے

زلزلہ کی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہے، اتنی کو بہت بہت سلام لکھا ہے۔ مختصر ہے۔

نگہت : اب وہ بات تو تم نے بتائی ہی نہیں۔

شاہینہ : کونسی بات؟

نگہت : وہ بات کہ تم بہت یاد آتی ہو۔

(دو دلفن ہنس پڑتی ہیں)

شاہینہ : ناجیہ نے اتنی کو خط کی اطلاع دے دی ہوگی۔ آ رہی ہوں گی ادھر۔ میں جاتی ہوں چائے بنا کر

لائی ہوں۔

نگہت : چائے کی ضرورت نہیں شاہینہ۔ ارے سُنو تو۔

(شاہینہ کی اتنی سرور جان آتی ہیں)

نگہت : سلام علیکم جمی جان!

سرور جان : وعلیکم السلام، جیتی رہو شاہینہ کہاں ہے؟ سنا ہے خط آیا ہے راجیل کا۔

نگہت : جی آیا ہے،

سرور جان : ذرا دیر سے آیا ہے مگر آیا تو ہے، خیر خیر بہت لکھی ہوگی۔؟

نگہت : جی جمی جان!

سرور جان : یہ سکا لڑیپکتنی مدت کا ہوتا ہے؟

نگہت : مدت کا انحصار اپنے اُد پر بھی ہوتا ہے۔ دو تین سال تو لگ ہی جاتے ہیں۔

سرور جان : تین سال؟

نگہت : وہ چاہے تو جلدی بھی آسکتا ہے۔

سرور جان : میری بیٹی گھبرانے والی یا کم حوصلہ نہیں ہے، مصروفیت کے لیے اس نے ایک ٹیوشن سنٹر میں ملازمت کر لی ہے۔ وقت گزر رہی جائے گا۔ !

نگہت : چچی جان ! ایک بات کہوں !

سرور جان : میری اجازت کی کیا ضرورت ہے بیٹی ؟

نگہت : بہتر یہ تھا کہ جانے سے پہلے شادی ہو جاتی اور شاہینہ ساتھ جاتی۔

سرور جان : میں نے یہی سوچا تھا مگر تمہاری سہیلی مانی نہیں۔

نگہت : خیر ٹھیک ہے، اللہ بہتر ہی کرے گا۔

سرور جان : (نگہت کے لفظ دہراتے ہوئے) اللہ بہتر ہی کرے گا۔

(شاہینہ اور ناجیہ آتی ہیں)

ناجیہ : اتنی جان ! باجی مجھے بڑا شاذ اپن لے کر دیں گی۔

سرور جان : بس تمہیں تو اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔

سرور جان : شاہینہ بیٹی ! کیا کھانا ہے راحیل نے۔

شاہینہ : کھانا ہے ! سچہ گیا ہوں، کلاس میں ADMISSION مل گئی ہے۔ ہوشل بھی جان کر رہا ہے۔

سرور جان : دیر سے خط کیوں لکھا ؟

شاہینہ : کام بہت تھے، فرصت نہیں ملی۔

سرور جان : جواب دو تو میری طرف سے ضرور لکھنا کہ خیر خیریت کا خط جلدی لکھا کرے۔

شاہینہ : اچھا اتنی، ناجیہ ! تم اُدھر کیا کر رہی ہو، چائے بنا کر دو۔

(بزنزوں کی کھٹکھٹاہٹ)

منظر :- طلعت کا گھر۔

[طلعت راحیل کی ماں ہے شاہینہ کی ماں سرور جان کی ماں ہے]

طلعت : سرور بہن ! یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے کہ آپ پریشان ہو جائیں۔

سرور جان : آپ کے لیے پریشان کُن نہیں ہے، مگر میرے لیے تو ہے۔ باپ سرور ہے نہیں، برخوردار راحیل کو گئے

ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ دوسری بیٹی بھی اب بچتی نہیں رہی۔

طلعت : تو سو کیا ہے کئی لڑکیوں کے باپ مر جاتے ہیں ان کی مائیں ہی سارے کام سنبھال لیتی ہیں۔

سرور جان : تین ماہ سے اس کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔

طلعت : وہ تو ہمیں بھی نہیں آیا۔ یہ کوئی حرج یا پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بہت زیادہ مصروف ہو گیا ہوگا۔

سرور جان : ہم نے دو خط لکھے ہیں کسی کا بھی جواب نہیں ملا۔

طلعت : نہیں ملا تو بل جائے گا۔

سرور جان : کب ؟

طلعت : میں نے کہا نا ان دنوں بڑا مصروف ہے ، رات دن محنت کر رہا ہے۔

سرور جان : وہ تو خیر ٹھیک ہے ، مگر خط لکھنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔

طلعت : وقت کا سوال نہیں ہے سرور بہن ! موڈ نہیں بنتا ہوگا۔ آج کل تو میں پڑھائی کا موڈ ہے۔

سرور جان : ایسا موڈ بھی کیا جس سے دو سروسز کو تکلیف ہو۔ سنا ہے کہ دو سال میں کورس مکمل ہو جاتا ہے۔

طلعت : تین سال بھی لگ سکتے ہیں اور تین سال کی مدت — کوئی بڑی مدت نہیں ہے ، آپ بالکل پریشان نہ ہوں ہیں

آج ہی راحیل کو خط لکھتی ہوں۔ ہو سکا تو فون پر بھی گفتگو کر لوں گی۔

سرور جان : شکریہ ادا کروں آپ نے میری پریشانی سمجھ لی ہے۔

طلعت : سمجھوں گی کیوں نہیں۔ آپ ماں ہیں — میں بھی ماں ہوں — مگر جاکیوں رہی ہیں — چائے

سرور جان : پھر سہی ، میں آپ کے فون کی منتظر رہوں گی۔

منظر :- [شاہینہ کا گھر۔ شاہینہ اور اس کی ماں سرور جان گفتگو کریں گی]

سرور جان : شاہینہ !

شاہینہ : جی امی !

سرور جان : کیا بات ہے ، آج سکول نہیں جاؤ گی۔

شاہینہ : جاؤں گی کیوں نہیں امی ! دس بارہ منٹ تک تیار ہو جاؤں گی۔

سرور جان : طبیعت ناساز ہے ! تو مت جاؤ نگہت آرہی ہے لے جائے گی تمہاری عرصی۔

شاہینہ : امی ! میں ٹھیک ہوں۔

سرور جان : تو کہتی ہے تو ٹھیک ہی کہتی ہے مگر میں کہتی ہوں تو ویسی نہیں ہے جیسا کہ ایک صحت مند آدمی ہونا ہے۔

تو پہلی جیسی نہیں ہے۔

شاہینہ : نہیں امی ! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اندر ناجیہ اپنے شوٹ پر استری کر رہی ہے۔ فارغ ہوتی ہے تو میں بھی یہ کام

کرتوں گی۔

(ناجیہ کی اندر سے آواز)

ناجیہ : باجی !

شاہینہ : فارغ ہو گئی ہے۔ جاتی ہوں (ناجیہ باہر آتی ہے)

سردرجان : تو نے تو ابھی ناشتا بھی نہیں کیا ؟
شاہینہ : کروں گی ، ذرا کپڑوں سے منٹ لوں ۔
ناجیہ : استری کر دی ہے باجی ۔

شاہینہ : شکریہ !
ناجیہ : ارے ————— باجی ! چوٹی بہن کا شکریہ !
شاہینہ : کیوں چوٹی بہن کا شکریہ کیوں نہیں ادا کیا جاتا ؟
سردرجان : شاہینہ ! ناشتا کر جا کر — میز پر پڑا ہے ۔
ناجیہ : تو بھی جا بیٹی ! ناشتا تجھے بھی کرنا ہے ۔ (نگہت آتی ہے)

نگہت : اسلام علیکم چچی جان !
سردرجان : دعلیکم السلام ۔ تم تیار ہو کر آگئی ہو ، اسے بھی تیار ہونا ہے ۔
نگہت : کوئی بات نہیں ، سکول گئے میں سات آٹھ منٹ باقی ہیں ۔
نگہت : اُدھر سے کوئی ٹیلیفون (ذرا سی خاموشی)
سردرجان : پرسوں آیا تھا ۔

نگہت : راحیل کی امتی نے کیا تھا ۔!

سردرجان : ہاں !

نگہت : کہا کچھ ؟

سردرجان : دوسری ————— وصلہ رکھو ۔ اب خط کی بجائے خود ہی آجائے گا ۔

نگہت : خود آنا ہوتا تو خط لکھ کر اطلاع نہ دیتا ۔ کورس تو کب کا ختم ہو چکا ہو گا ۔ آپ نے کیا سوچا ہے چچی جان !
سردرجان : میں کیا سوچوں گی ، دیکھ رہی ہوں ، میری بیٹی اندر سے ٹوٹ ٹھوٹ رہی ہے ۔ غضب خدا کا پورے تین سال بیت گئے ہیں ۔ پچھلے سال خط آئے ، پھر خاموشی ، یہ بھی تو معلوم نہیں کر کر کیا رہا ہے ۔ کیا ارادے ہیں اُس کے کیوں احمد حیرے میں رکھ رہا ہے یہیں ؟

نگہت : چھوٹا منہ بڑی بات کرنے والی ہوں ————— مُعاف کر دیں چچی جان !

سردرجان : کہو بیٹی ! جیسی شاہینہ ویسی تو ۔

نگہت : ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں ۔ لڑکے باہر جاتے ہیں تو بہت کچھ محمول جلاتے ہیں ۔ راحیل سے ایسی اُمید تو

نہیں ہے ، لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ اُس نے کچھ خیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے ۔

(ذرا سی سرگوشی کے انداز میں) چچی جان ! میں فکر مند ہوں شاہینہ کی طرف سے ۔

سرور جان : مجھے یہ نکر مارے دے رہی ہے، سونہاں روح بنی ہوئی ہے۔ میری شاہینہ اس کے رویے کو بُری طرح محسوس کر رہی ہے۔ زبان سے کچھ کہتی نہیں مگر میں جانتی ہوں اس پر کیا بیت رہی ہے۔

نگہت : مجھے اور نکر ہے۔

سرور جان : کیا؟

نگہت : ہمارے معاشرے میں لڑکی کی عمر بڑھ جاتے تو ماں باپ کے لیے اس کی شادی کا مسئلہ بہت بڑا مسئلہ بن جاتا ہے؛ سرور جان : (جیسے گہری سوچ میں ڈوب کر) ہاں ————— یہ تو سہی بیٹی۔

نگہت : آپ ذرا اس کے اندر جھانک کر دیکھیں۔

سرور جان : کام میں نہیں غم کر سکتی ہو۔

نگہت : تو آج سکول میں کروں گی۔

(موسیقی جو سکول کی گھنٹی میں ڈوب جاتی ہے۔)

نگہت : شاہینہ آؤ ذرا میرے ساتھ۔

شاہینہ : یہ لڑکیاں مجھے چھوڑیں تو جاؤں کہیں،

نگہت : میں اُن سے کچھ دیتی ہوں — دیکھو جی تم کھیلو گورو، یہ آدھی چھٹی کا وقت ہے، تمہاری اُستانی ابھی آجاتی ہیں۔

(لڑکیوں کا شور آہستہ آہستہ ختم جاتا ہے)

شاہینہ : قصہ کیا ہے۔

نگہت : شاہینہ! میں کچھ سنجیدگی سے کہنا چاہتی ہوں۔

شاہینہ : تو کون منع کرتا ہے تمہیں۔

نگہت : تم بھی سنجیدگی سے سُنو۔

شاہینہ : اچھا۔

نگہت : راجیل کو گئے ہوتے کتنے سال ہو گئے ہیں۔

شاہینہ : اوہ، گھر میں بھی یہی بات، باہر بھی یہی گفتگو۔ دنیا میں اور کوئی موضوع نہیں ہے۔

نگہت : فی الحال یہی ایک موضوع ہے۔

شاہینہ : کوئی اور بات کرو۔

نگہت : نہیں شاہینہ!۔

شاہینہ : خدا کے لیے خاموش رہو یلے۔

جگہت (جلدی سے) شاہینہ! میں تو خاموش رہوں مگر یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا مسئلہ بھی ہے کہ تم میری عزیز ترین سہیلی ہو۔ یہ تمہاری اتنی کامیابی ہے کہ تمہارے ابو کے انتقال کے بعد تمہاری ہر ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ یہ تمہاری چھوٹی بہن ناجیہ کا مسئلہ بھی ہے۔ چھوٹی بہن کو اپنی بڑی بہن کی شادی کا بڑا شوق ہوتا ہے، اب بتاؤ کیا میں خاموش رہوں؟

شاہینہ: کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس مسئلے میں تم سب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔
جگہت: اور تم بھی انتظار کرتی رہو اور وقت چپ چاپ گزرتا چلا جائے تین سال بیت چکے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے تم نے اس کے انتظار کا وعدہ کر رکھا ہے مگر اس میں یہ بات تو شامل نہیں تھی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتائے گا ہی نہیں اور تم انتظار کیسے جاؤ گی سُن رہی ہو۔

شاہینہ: سُن رہی ہوں۔

جگہت: یہ ایک طرف انتظار مجھے بالکل پسند نہیں۔

شاہینہ: ایک طرف انتظار کا کیا مطلب؟

جگہت: مطلب نہیں سمجھتیں تم انتظار کیسے جاؤ اور وہ —

شاہینہ: اور وہ —!

جگہت: کیا بتاؤ کیا کر رہا ہے۔ بالکل اندھیرے میں رکھا ہوا ہوں۔

(شاہینہ خاموش رہتی ہے)

جگہت: بولتی کیوں نہیں ہو۔ خاموش کیوں ہو گئی ہو!

(شاہینہ اب کے بھی خاموش رہتی ہے۔)

جگہت: شاہینہ!

شاہینہ: ہوں۔

جگہت: کیا کہہ رہی ہوں میں۔

شاہینہ: کیا کہنا چاہتی ہو تم۔

جگہت: شاہینہ! معاف کرنا، صاف صاف کہوں گی۔ مجھے اس کی یہ طویل خاموشی مجرمانہ لگتی ہے۔ تم اسی معاشرے

میں رہتی ہو، جس میں یہی رہتی ہوں۔ ارد گرد کیا ہو رہا ہے، میری طرح تم بھی جانتی ہو۔ نہیں کچھ بتانے کی کیا ضرورت

ہے، وہاں۔ اس دنیا میں جس میں وہ تین سال سے ہے۔ ایسا بہت کچھ ہے۔ جو انسان کو سحر کر لیتا ہے،

جو انسان کو اپنا وعدہ نبھلا دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسی کئی مثالیں پیش کر سکتی ہوں، اگر وہ اپنا وعدہ نبھول

چکا ہے تو تم بھی انسان ہو فرشتہ نہیں ہو۔ تمہارا وعدہ پتھر کی کبیر کیوں بن جائے۔

شاہینہ : (ذرا غصے سے) نگہت !
 نگہت : بڑی لگی ہے میری بات۔ سچی بات بڑی ہی گنتی ہے۔
 شاہینہ : خدا را اس موضوع کو یہیں ختم کر دو۔
 نگہت : میرے ختم کرنے سے کیا یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا تعلق صرف تمہاری ذات سے نہیں ہے جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں، اس کا تعلق چچی جان کی ذات سے بھی ہے، ناجیہ کی ذات سے بھی ہے۔
 شاہینہ : خدا را خاموش ہو جاؤ۔ (گھنٹی بجتی ہے)
 نگہت : چند منٹ اور ٹک جاؤ۔
 شاہینہ : لڑکیاں کلاس میں پہنچ رہی ہیں۔ مجھے نہ پا کر خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔
 منظر ۱۔ شاہینہ کا گھر۔ سردرجان اور نگہت مصروف گفتگو ہیں۔
 نگہت : چچی جان۔ شاہینہ میری سب سے پرانی سہیلی ہے۔ بڑی خوبیاں ہیں اس میں مگر کبھی کبھی اس کا رویہ بے لچک ہو جاتا ہے۔
 سردرجان : تمہارا تو بڑا REGARD کرتی ہے۔
 نگہت : کرتی ہے مگر اس معاملے میں نہیں۔
 سردرجان : معلوم تو کرنا چاہیے وہ کیا کر رہا ہے امریکا میں۔
 نگہت : میری ایک سہیلی جو شاہینہ کی سہیلی بھی ہے کچھ مدت سے امریکا میں ہے وہ راجیل سے بھی واقف ہے۔
 سردرجان : اُس سے پتہ لگ سکتا ہے۔
 نگہت : فون کروں گی اُسے۔
 سردرجان : مہربانی ہو گی بیٹی۔
 نگہت : چچی جان! آپ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے شرمندہ کر دیتی ہیں۔
 سردرجان : بیٹی کون کسی کی پریشانی باٹتا ہے تم بانٹ رہی ہو۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔ سدا سُکھی رہو۔
 نگہت : یہ تو میرا فرض ہے چچی جان۔
 سردرجان : شاہینہ ابھی تک سکول سے آئی کیوں نہیں۔
 نگہت : پارے دیکھ رہی ہے کہتی تھی ایک گھنٹے تک آجاؤں گی اتنی سے کہہ دینا۔ چچی جان!
 سردرجان : کہہ نگہت بیٹی۔
 نگہت : مجھے یقین ہے مان جائے گی۔
 سردرجان : مان جائے تو میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر جائے گا۔

منجھت : اُتر جائے گا چچی جان ! میرا مشورہ یہ ہے کہ اس TOPIC پر آپ اس سے کچھ مدت گفتگو نہ کریں۔ خواہ مخواہ چڑ جائے گی۔ میں مانی رہنمائی کو آپ کے ہاں بھیج دوں گی۔ سمجھ مار عورت ہے۔ اُسی نے میرا رشتہ کر دیا تھا۔ آپ کے کام بھی آئے گی اِنْ شَا اللہ !

سرور جان: اچھا جو خدا کو منظور۔

نگہت : اب میں چلتی ہوں۔ تمکھن ہے آج شام ہی وہ آپ کے پاس آجائے۔

سورجان : بہتر،

دوسرے دن، وہی منظر۔۔۔۔۔ ریشماں اور سرور جان باتیں کر رہی ہیں۔

سرور جان : نگہت نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔

ریشیاں : بتا دیا ہے، بی بی شاہینہ کو تو میں نے کئی بار نگہت بی بی کے ہاں دیکھا۔ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔

سرو جان : یہ بھی اچھا ہوائے دیکھ چکی ہو۔

رشتیاں : رشتے تو میرے پاس بہت ہیں ، آپ -

سرزمین : (جلدی سے ریشماں کی بات سمجھ کر) نیک ہو، اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہو، تعلیم یافتہ ہو،

گھر کا فرج چلا سکتا ہو، یہ خود بھی پڑھاتی ہے۔

ریشماں : جانتی ہوں۔ نغمت کے سکول میں پڑھاتی ہے۔

مہر و جان : بس اور کچھ نہیں چاہیے۔

ریشماں : ٹھیک ہے دو تین لڑکے ہیں میری نظر میں، پہلے بات کر لوں۔ پھر معاملہ طے ہوگا۔

سورجان : اب کب آؤگی۔

رشتیاں : اللہ نے چاہا تو جلد آجاؤں گی ۔

منتظر :- چند روز بعد : شاهینہ ہی کا گھر ۔

ریشمان : معاف کرنا۔ ایک بات پوچھ رہی ہوں۔

مسرحیان : لوچپور ۔

ریشیاں : دیکھنا بڑی بی بی ! اُنکا زمانہ آگیا ہے۔ پہلے جس لڑکے کے گھر میں جاتی تھی وہاں پوچھتے تھے ، لڑکی

گھر گرستن ہے کہتی، پڑھی لکھی ہے، خاندان کیسا ہے، بات کرنے کا کیسا ڈھنگ ہے، اپراپ

پہلے ہی پوچھتے ہیں لڑکی کی عمر کتنی ہے۔

سورجیان : لڑکی کی عمر پوچھتے ہیں۔

ریشیاں : جی ،

سرور جان : میری بیٹی معمولی پڑھی لکھی نہیں ہے ، دو ایم اے کر چکی ہے ، کئی ٹرانیاں بھی جیت چکی ہے۔
ریشیاں : یہ سب کچھ ٹھیک ہے پر — عمر بتا دیں ۔

سرور جان : اکتیس

ریشیاں : اکتیس ؟

سرور جان : اس میں حیرت کی کیا بات ہے ۔

ریشیاں : کوئی بات نہیں ہے جی ۔ کئی برس پہلے دیکھا تھا مانسا رائڈ ۔ اچھا جاتی ہوں ۔

منتظر : — شاہینہ اپنے کمرے میں اپنی چھوٹی بہن ناجیہ سے باتیں کر رہی ہے ۔

ناجیہ : باجی !

شاہینہ : ہوں ۔

ناجیہ : اب تو وہ چلی گئی ہے ۔

شاہینہ : کون چلی گئی ہے ۔

ناجیہ : وہ ۔ جس کی وجہ سے آپ کمرے میں بند تھیں ۔

شاہینہ : میں کسی کی وجہ سے کمرے میں بند نہیں تھی ، مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ کون تھی ۔

ناجیہ : تو میں بتاتی ہوں ۔ جناب وہ اماں ریشیاں تھی ۔

شاہینہ : کون اماں ریشیاں ۔

ناجیہ : جس نے آپا نگہت کا رشتہ کر دیا تھا ۔

شاہینہ : تو یہاں کیا کرنے آئی تھی ۔

ناجیہ : رشتہ کر دلنے والی کسی کے گھر کیوں جاتی ہے ؟

شاہینہ : تو یہاں ۔ اچھا اچھا سمجھ گئی ہوں ۔

ناجیہ : غلط سمجھی ہیں آپ ، وہ آپ کے لیے آئی تھی ۔

شاہینہ : میرے لیے ؟

ناجیہ : اور کس کے لیے بھلا ۔

(سرور جان آتی ہے)

سرور جان : کہاں گم ہو گئی تھیں تم ۔ یہ چپ چاپ کمرے میں بند رہنا ٹھیک نہیں ہے بیٹی !

شاہینہ : اتنی ! میں پوچھتی ہوں یہ اماں ریشیاں کیوں آئی تھی ۔

سرور جان : اس کی ضرورت تھی ۔

شامینہ : کیا ضرورت تھی ؟
 سرورجان : آؤ میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ۔
 شامینہ : اُمّی ! میں صاف صاف کہہ دیتی ہوں کہ اگر یہ میرے معاملے کے لیے آتی ہے تو۔ یہ اچھا نہیں۔
 سرورجان : کیوں اچھا نہیں بیٹی۔
 شامینہ : فضول ہے۔ بے کار ہے اُمّی۔
 سرورجان : کیا کہہ رہی ہے تُو۔ بیٹیاں ماں باپ کے گھروں میں بیٹھی نہیں رہیں۔ تمہاری ساری کی ساری سہیلیاں اپنے اپنے گھر میں آباد ہیں۔ بیٹی ! تمہیں بھی اپنا گھر بسانا ہے۔
 شامینہ : (لہجہ میں ذرا تلخی) اُمّی ! میں آپ سے کہہ چکی ہوں، میرے متعلق مت سوچئے۔
 (شامینہ اُٹھ کر جانے لگتی ہے)
 سرورجان : سنو تُو۔۔۔۔۔ شامینہ۔۔۔۔۔ شامینہ بیٹی۔
 منظر :۔۔۔۔۔ نگہت کا گھر
 (شامینہ کی اُمّی سرورجان آتی ہے)
 نگہت : چچی جان ! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی ہے ؟
 سرورجان : تم سکول میں نہیں آ رہی۔ پتا چلاتا تھا تمہارا چھوٹا بیٹا بیمار ہے۔
 نگہت : جی چچی جان۔ خاصا پریشان کیلئے اُس نے۔
 سرورجان : اب کیسا ہے۔
 نگہت : ٹھیک ہے اب تو۔ کوئی نئی بات۔
 سرورجان : ہفتہ ہوا راجیل کی ماں آئی تھی بھل کر تو بات نہیں کی اُس نے مگر لگتا تھا دل میں شرمندہ ہے۔ راجیل نے گھر بھی مدت سے کوئی خط نہیں لکھا۔
 نگہت : مطلب یہ کہ اس کا مزید انتظار نہ کرو۔
 سرورجان : کہنا تو یہی چاہتی تھی۔
 نگہت : چچی جان ! مجھے اپنی سہیلی کے ذریعے جو مازہ اطلاع ملی ہے وہ یہ ہے کہ راجیل امریکہ میں نہیں ہے۔
 سرورجان : امریکہ میں نہیں ہے ؟
 نگہت : میں نے بتایا تھا کہ میری سہیلی اُس سے واقف ہے۔ اس کا شوہر بھی اُسے جانتا ہے۔
 (ذرا سی خاموشی)
 سرورجان : ساڑھے پانچ برس ہو گئے ہیں۔

نگہت : ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ سچی جان، یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔

سرورِ جہان : میری بیٹی کی دنیا تو اُجڑ گئی نا۔

محبت : یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔ عورت کی فطرت میں وفاداری ہے اور یہ وفاداری بھی کبھی اُسے کہیں کا بھی نہیں چھوڑتی۔

سرور جان : میں نے تو اس مسئلے پر اُسے کچھ کہنا سنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

ننگہت : اور کیا کیا جاسکتا ہے، چچی جان۔

سرور جان : میں نے آپ سے اجازت لیے بغیر اماں ریشماں کو ناجیہ کے لیے کہہ دیا ہے ۔

تجربہ : اچھا کیا ہے کتنی ہفتوں سے آئی نہیں۔ شاہینہ کے رویے سے مایوس ہو گئی ہوگی۔
 سروجان : گناہی ہے۔

(کمال بیل)

نگہت : ایک منٹ ۔ (ریشیاں آتی ہے)

ریشیاں : سلام علیکم۔ بڑی بی بی! گھروں کیا تھا، کسی نے اُٹھایا ہی نہیں تھا۔

نگہت : اُٹھایا نہیں تھا۔ دونوں کہاں چلی گئی تھیں؟

سرور جان : شاہیت تو اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہوگی۔ ناجیکہ کسی سہیل کے گھر لگی تھی مگر گھر میں سونو و بی ٹیلیفون سنتی ہے۔

منجھت : کیوں اماں ! بات ہی؟

ریشیاں : بنی ہے تو فون کیا تھا نا۔

منجھت : کون ہیں وہ لوگ ۔

ریشمیں : یہ کاغذ پڑھ لو۔

(نہایت کاغذی کرپڑتی ہے)

منگھت : نام طغر علی نقیہ ایم، اے، ایس ڈی او محکمہ انہار۔ جدی جاویدا بھی ہے۔ والد صاحب اکیسپورٹ امپورٹ کاربزن کرتے ہیں، ذاتی جنگلہ ہے۔

کابزنس کرتے ہیں، ذاتی شے ہے۔

الشیماں : میں دیکھ چکی ہوں لڑکا۔ واہ وا پیاری شکل والا ہے۔

نعمت : رہائش کہاں ہے۔

ریشیاں ، شادمان کالونی میں۔

نجات : کچھ ملنے لانے کے بارے میں کہا اُنھوں نے ؟

ریشیاں : ہاں جی۔ لڑکے کی ماں نے پوچھا ہے کہ کس روز آتے۔

نگہت : چچی جان تباہیے۔

سرورجان : کسی روز بھی آجائے۔

نگہت : کوئی دن تبادیں۔

سرورجان : آج ہے جمعرات۔ اتوار شام چار بجے۔

نگہت : مناسب ہے۔ اماں ریشیاں کہہ دینا اُن سے۔

ریشیاں : آج ہی کہہ دوں گی نگہت بی بی۔

منظر :- شاہینہ ہی کا گھر۔ پہلے منظر کو کئی روز گزر چکے ہیں۔

شاہینہ : ناجیہ !

ناجیہ : جی باجی۔

شاہینہ : کر کیا رہی ہو تم۔

ناجیہ : کتاب دیکھ رہی تھیں باجی۔

شاہینہ : یہ کتاب دیکھنے کا وقت ہے۔ یہاں آنے ہی والے ہیں۔ اتنی باورچی خانے میں ہیں۔ مجھے بھی ان کا ہاتھ بٹانا ہے۔

ناجیہ : جاتی ہوں۔

شاہینہ : تمہیں کہیں نہیں جانا۔ تیار رہنا ہے۔ وقت کم ہے ناجیہ۔

(ناجیہ خاموش رہتی ہے)

شاہینہ : ناجیہ۔

ناجیہ : جی

شاہینہ : تیار ہو جاؤ۔ میں نے تمہارا سوٹ الماری سے نکال دیا ہے۔ جی چاہو تو پہن لو، ورنہ الماری میں سے

اپنی پسند کا نکال لو۔ جاؤ نا۔

ناجیہ : آپ۔ باجی ! مجھے اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔

شاہینہ : ناجیہ ! جو تم کہنا چاہتی ہو وہ میں جانتی ہوں۔ میرا معاملہ میرا معاملہ ہے، اس کی ذمہ داری میں خود ہوں۔

تم نہیں ہو۔ اب جاؤ ادھر۔

ناجیہ : آپ کا معاملہ میرا بھی تو معاملہ ہے۔ ایک گھر میں دو بہنیں۔ آپ بڑی، میں چھوٹی۔

شاہینہ : اوہو۔ تم بھی عام لوگوں کی طرح سوچنے لگیں۔ توں مت سوچو ناجیہ۔

(باہر سے سرورجان کی آواز)

سرورجان : شاہینہ۔

شاہینہ : جی اتی ! (مدھم لہجے میں) دیکھو اتی پریشان ہوں گی۔ جلدی جاؤ اپنے کمرے میں (بلند آواز میں) ٹھیک ہے اتی۔

ناجیہ : آپ میری الجھن نہیں سمجھ سکیں۔

شاہینہ : ارے الجھن کیسی۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میں باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔
منظر :- (کمرے میں سرورجان، نگہت، ایک خاتون، اماں (لشیاں)
خاتون : آپ نے بتایا ہے ایم لے۔ کچھ سل کیا ہے۔

سرورجان : جی ہاں۔

نگہت : فسط کلاس میں پوری یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر آئی ہے۔

خاتون : ماشاء اللہ۔ دو بہنیں ہیں، بھائی نہیں ہے۔

سرورجان : بھائی کوئی نہیں۔

خاتون : آج کل گھر کے کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹاتی ہوگی۔

سرورجان : دونوں نے گھر کا سارا کام سنبھال رکھا ہے۔ پھر بڑھاتی بھی ہیں۔

خاتون : ملازمت کرتی ہیں۔

نگہت : گھر کے کاموں سے کافی وقت بچ جاتا ہے۔

سرورجان : یہ سسرال کی مرضی پر سوتا ہے کہ لڑکی ملازمت کرے یا چھوڑ دے۔

خاتون : بہن! بہت کچھ پوچھ لیا ہے۔ بوالیس لڑکی کو۔

سرورجان : ادھر آجائیے۔ چائے۔

خاتون : یہ کیا تکلیف کی آپ نے۔

شاہینہ اور ناجیہ : (بیک وقت) سلام علیکم (ذرا سا وقفہ)

خاتون : وعلیکم السلام، یہ بڑی بہن ہے، شادی نہیں ہوئی۔

سرورجان : جی — وہ

خاتون : (ٹالنے کے لیے) خیر۔

(بزنسوں کی کھٹکھٹاہٹ)

خاتون : یہ بھی ادھر ہی رہتی ہیں۔

سرورجان : (جیسے متذبذب ہوں) جی

نگہت : میں نے آپ کو بتایا تھا نامیری (COLLEAGUE) ہے۔

خاتون : اچھا اچھا۔ کیا نام ہے بیٹی تمہارا۔
 ناجیہ : ناجیہ۔
 خاتون : ماشاء اللہ خوبصورت نام ہے کیا پڑھاتی ہو؟
 ناجیہ : سائنس
 خاتون : تو ایم ایس سی کی ہے۔
 ناجیہ : جی ہاں۔
 خاتون : دونوں بہنیں ایک ہی اسکول میں ہوں گی؟
 ناجیہ : جی نہیں، میں الگ اسکول میں ہوں۔
 نگہت : اگلے سال کالج میں چلی جائے گی۔
 خاتون : ماشاء اللہ۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔
 سرورجان : آپ نے بڑا تکلف کیا ہے کچھ کھایا نہیں۔
 ریشماں : اللہ نے چاہا تو کھانے پینے کے موقع ملتے رہیں گے۔
 (خاتون اس کا کوئی جواب نہیں دیتی)۔

خاتون : خدا حافظ۔

سرورجان : خدا حافظ۔

(وقفہ)

نگہت : یہ شاہینہ اور ناجیہ انتظار کر رہی تھیں کہ وہ جائے اور یہ بھاگیں یہاں سے۔
 سرورجان : (لہجے میں فکرمندی) اس کے روتے سے کچھ ظاہر نہیں ہوا۔
 نگہت : ریشماں ساتھ گئی ہے، اپنا عندیہ یہ بتا دے گی اسے۔ آپ مایوس کیوں ہیں چچا جان!
 سرورجان : ریشماں نے کہا اب کھانے پینے کے موقع ملتے ہی رہیں گے تو مودہ بالکل خاموش رہی۔
 نگہت : یہ تو ہوتا ہی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے چچا جان کہ جو بھی آئے پسند کر کے ہی جاتے۔ ہماری لڑکی میں سو
 خوابیں ہیں، کوئی بد نصیب ہی اسے نہ کرے گا۔ آپ دل میں اچھی امیدیں رکھیں، ان شاء اللہ بہتری ہوگی۔
 سرورجان : اسی امید پر تو زندہ ہوں۔
 نگہت : آپ کہاں چلیں چچی جان۔
 سرورجان : ان دونوں نے کچھ کھایا بھی نہیں۔
 نگہت : بلائیے انہیں۔

سرورجان : اسی لیے نوجا رہی ہوں -
(سرورجان دروازے پر پہنچ کر آواز دیتی ہیں)
(شاہینہ اور ناجیہ آجاتی ہیں)

سرورجان : اولاد کیو !
سرورجان : چلی کیوں گئی تھیں دونوں -
ناجیہ : امی ! میں تو اس خالوں کی باتوں سے پریشان ہو گئی تھی -
شاہینہ : پریشان میں بھی ہو گئی تھی -
نگہت : تم سے تو ایک آدھ سوال پوچھا تھا -
شاہینہ : مگر میری طرف بار بار گھور کر دیکھنے لگتی تھیں -
سرورجان : کیوں ؟

منظر :- تین روز بعد۔۔۔۔۔ نگہت کا گھر -
(نگہت مائی ریشماں سے باتیں کر رہی ہے گفتگو کا ابھی آغاز ہوا ہے -)

نگہت : اماں ! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی -

ریشماں : کونسی بات بی بی ؟

نگہت : تم ناجیہ کے لیے کئی رشتے لے کر گئی - مگر نتیجہ نہیں بتایا کسی کا -

ریشماں : نتیجہ بی بی -!

نگہت : یہ تو بتانا چاہیے ناکہ رشتے کے لیے جو آتا ہے وہ لڑکی کے گھر آکر اور اس سے مل کر کہتا کیا ہے -

ریشماں : کیا کہوں بی بی ! بات بنتی تو کہتی نا -

نگہت : کیا نقص نظر آئے ہیں اُنھیں ہماری لڑکی میں -

ریشماں : بی بی ! جو مہنت ڈیڑھ مہنت ہوا دو عورتیں آئی تھیں اُن سے پوچھا تو بولیں - سوچ کر بتائیں گے -

نگہت : یہ سوچ ہی رہی ہیں اور اُن سے پہلے جو آئی تھیں -

ریشماں : اُنھیں لڑکی میں کوئی نقص نظر نہیں آیا پر -

نگہت : پر کیا ؟

ریشماں : اُنھوں نے مجھ سے تو صاف صاف نہیں کہا پر اُس کی باتوں سے پتا لگتا تھا کہ اُنھیں بڑی بہن کی

شادی نہ ہونے پر اعتراض ہے -

نگہت : اُنھیں اس سے کیا کہ بڑی بہن کی شادی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی -

ریشیاں : بی بی ! پتا نہیں کیسا زمانہ آگیا ہے۔ لوگ اس طرح سوچتے ہیں کہ بڑی بہن کی شادی جو نہیں ہوئی، کیا پتا کیا نقص ہے اس میں۔ چھوٹی بہن میں بھی یہ نقص جو سکتا ہے۔ کیا کہوں کیسا بڑا زمانہ آگیا ہے۔
 نگہت : بڑی بہن نے تو خود شادی نہیں کی۔

ریشیاں : یہ تو تم جانتی ہو، اور بھی کچھ لوگ جانتے ہوں گے مگر رشتے کے لیے جو آتے ہیں وہ نہ جانے دلوں میں کیسے کیسے شک شبہ پالتے پھرتے ہیں۔ کہا نہ بی بی ! بڑا بڑا زمانہ آگیا ہے۔
 نگہت : خدا کی پناہ۔

ریشیاں : الٹھی رحم کرے۔ دس کم چالیس برس سے یہ دھندہ کر رہی ہوں۔ آج کل تو سمجھ میں نہیں آتا، کہ آجکل کے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔

نگہت : چچی جان، بار بار فون کر چکی ہیں، اب کیا کہوں ان سے۔
 ریشیاں : سچی بات کہوں گی۔ ان کی لڑکی لاکھوں میں ایک ہے۔
 نگہت : اس لیے اس کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔

ریشیاں : میں کیا کہوں نگہت بی بی !

(ریشیاں کو ایک دم کچھ یاد آ جاتا ہے)

ریشیاں : ہاں بی بی ! یاد آگیا۔ بس سمجھ تو تمھاری چچی کی شکل آسان ہو گئی۔
 نگہت : کیسے !

ریشیاں : کل اس گھر گئی تھی۔ وہ ناجیہ کو جاننے والی نکل آئی۔

نگہت : کون ناجیہ کو جاننے والی نکل آئی ؟

ریشیاں : لڑکے کی بہن کسی زمانے میں اس کے ساتھ پڑھی ہوگی۔ لڑکے کی ماں تو بے تاب ہو گئی۔ کہنے لگی،
 عیدی تباؤ۔ بی بی، اللہ نے چاہا تو یہ رشتہ ہو کر رہے گا۔

نگہت : اچھی خبر ہے۔

ریشیاں : لڑکے کی ماں نے خود عید ملنے کی خواہش کی ہے۔

نگہت : شام شاہینہ کے گھر جا رہی ہوں، کہہ دوں گی چچی جان سے۔

منظر :- شاہینہ کا گھر

(سرورجان اور نگہت باتیں کر رہی ہیں)

سرورجان : ناجیہ تو باہر آتی ہی نہیں تھی، بڑی مشکل سے اُسے باہر لائی۔

نگہت : خدا کا شکر ہے وہ ناجیہ سے مل کر بڑی خوش ہوئی تھی۔ اس کی بیٹی ناجیہ کے ساتھ پڑھ چکی ہے نا،

سرور جان : مگر چار دن ہو گئے — کچھ کہا نہیں اُس نے ۔
 نگہت : خالہ جان ! مجھے پورا پورا یقین ہے ہماری ناجیہ ضرور دلہن بنے گی ۔
 سرور جان : اللہ تیری زبان مبارک کرے ۔
 نگہت : سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ میں نے ریشماں کو پیغام بھیجا ہے کہ جلدی آکر اطلاع دے ۔

(کال بیل)
 نگہت : لگتا ہے ریشماں ہوگی ۔
 سرور جان : اللہ کرے (بلند آواز سے) ناجیہ ! دیکھنا کون ہے !
 (ذرا سا وقفہ)

نگہت : آؤ اماں ! بڑی دیر سے آئی ہو — ہاں کہو ۔
 ریشماں : اُمّیں لڑکی بہت پسند آئی ہے ۔
 سرور جان : شکریہ اللہ تیرا ۔

ریشماں : پر — — —
 نگہت : پر — — — یہ پر کیا !
 ریشماں : وہ — — — لڑکے کی ماں نے کہا ہے — — — ناجیہ کی عمر — — — میرے بیٹے سے زیادہ ہے ۔

اس لیے — — —
 سرور جان : او میرے اللہ ۔
 نگہت : سخت گھبراہٹ کے عالم میں (خالہ جان ! — خالہ جان ۔
 (شاہینہ اور ناجیہ بھاگ کر آتی ہیں)
 شاہینہ اور ناجیہ (بیک آواز) اہی !
 (شاہینہ اور ناجیہ کی چیخیں)



لہو اور تالین

افراد :

بابا ————— ذکر
تجمل ————— ایک سرمایہ دار
اختر ————— مصطور

منظر :

رؤف ————— تجمل کا پراپیٹیٹ سیکرٹری

”سردار تجمل حسین کی کوٹھی“ النشاط، کا ایک وسیع کمرہ، یہ کمرہ اختر سٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا ہے، نہایت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ، فرش پر تالین، دیواروں پر مشہور مصطوروں کے شاہکار، ایک طرف ریڈیو سیٹ، کچھ فاصلے پر صوفہ اور کرسیاں، شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی دونوں الماریوں میں مجلہ کتا ہیں، کارٹریس اور تپائیوں کے اوپر نرنگے پھولوں سے مزین گلدان، دروازے اور کھڑکیوں پر پریشی پردے، وسط میں ایزل، ایزل پر کینوس جرابھی تک سادہ اور صاف ہے۔ قریب ایک تپائی پر رنگوں کے ڈبے، چینی کی چھوٹی چھوٹی بیالیاں، طرح طرح کے قلم اور مصتوری کا دوسرا سامان، گرمیوں کے ابتدائی زمانے کی ایک صبح روشندانوں میں سے دھوپ اندر آ رہی ہے، جب پردہ اٹھتا ہے تو بابا بھاڑن سے کمرے کی چیریں صاف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دو چار لمحوں کے بعد تجمل آتا ہے، تجمل کی عمر ۴۵ اور ۴۵ کے درمیان ہوگی بھت اچھی جسم پختی ٹوٹ۔

تجمل : یہ اختر کہاں ہے بابا ؟

بابا : ادھر باغ میں ہی سرکار !

تجمل : ابھی تک باغ میں۔ وہاں کیا کر رہے ہیں ؟

بابا : ٹہل رہے ہیں۔ میں نے کہا بھی سرکارنا سشتا تیار ہے اندر آجائیں، مگر انہوں نے تو مجھے جھٹک دیا۔ ابھی تک دھوپ میں

ٹہل رہے ہیں۔ رات سرکار (خاموش ہو جاتا ہے)

تجمل : رات کیا ؟

بابا : میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ ہوا یہ سرکار کہ میری اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ باغ میں کوئی شخص گھوم رہا ہے۔ سمجھا چور ہے۔ شور مچانے ہی والا تھا کہ اخترمیاں کے ہاتھ میں ان کی چھڑی نظر گئی۔
تعل : اس قسم کے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے، ہر طرف کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں، الگ تھکے ہونا چاہتے ہیں۔
بابا : سرکار! میں تو نہ خود یہاں آتا ہوں اور نہ کسی کو یہاں آنے دیتا ہوں۔ ذرا صفائی کے لیے پانچ دس منٹ کے لیے آجاتا ہوں۔ میں نے کہا سرکار!

تعل : کیا ہے؟

بابا : شاید کچھ ایسے ویسے ہیں چند روز سے۔

تعل : پھر وہی بات ایک بار کہہ جو دیا، تم فن کاروں کو نہیں سمجھ سکتے، یہ ہر وقت یونہی پریشانی رہتے ہیں۔

بابا : (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) اچھا سرکار!

تعل : بلاؤ انھیں، جلدی کرو۔

بابا : بہنر۔!

(بابا کمرے سے نکل جاتا ہے، تعل آگے بڑھ کر کینوس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اختر آتا ہے۔

ادھیڑ عمر کا شخص، سر کے بال پھیرے ہوئے۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سرخ لباس پاجامہ اور قمیص، آستینیں چڑھی ہوئی، آنکھوں کے گرد حلقے زیادہ نمایاں)

اختر : (تعل کی طرف دیکھ کر بغیر) کیسے!

تعل : بڑی دیر تک ٹھپتے رہے ہو آج۔

اختر : جی ہاں۔

تعل : ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے آیا ہوں تمہیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست نے فون کیا ہے۔ جوں نے تمہاری تصویر کو اول انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ میں نے تفصیل معلوم کرنے کے لیے روٹ کو بھیج دیا ہے۔ ابھی آجائے گا۔

اختر : مجھے اخبار سے معلوم ہو چکا ہے۔

تعل : اختر کی بے نیازی پر تعجب، تمہیں اس کا علم تھا اور۔

اختر : اخبار صبح سویرے مل جاتا ہے۔

تعل : تمہیں یہ خبر سن کر اتنی خوشی نہیں ہونے جتنی ہونی چاہیے تھی، میرا خیال ہے، یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

(اختر خاموش ہے)

تم نے ملک کے نام مستوروں کے مقابلے میں یہ انعام جیتا ہے، یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ میں نے اس خوشی پر آج شام چائے کا انتہام کیا ہے۔ تمہیں مبارکباد دینے شہر کے معززین آ رہے ہیں۔ منام نے۔

راختر خاموش ہے)

کیا کہا؟

اختر: کچھ نہیں۔

تجمل: کچھ نہیں (راختر کے چہرے کو غور سے دیکھ کر) شاید بابا نے غلط منیں کہا تھا معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟

اختر: جی نہیں،

تجمل: اس نے کہا تھا (مسکرا کر) ہمارے مصور کے ساتھ کچھ گڑ بڑ ہے۔ ان دنوں تمہارا کیا خیال ہے اپنا۔؟

اختر: صبح کہا تھا اس نے!

تجمل: یعنی کہ

اختر: یہی کہ یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

تجمل: کیا کہا؟ (لے جیو حیرت) رخصت ہونے کی ضرورت؟

اختر: میرا دل چاہتا ہے۔

تجمل: کوئی شکایت؟ کوئی تکلیف؟

اختر: کوئی شکایت نہیں۔

تجمل: پھر بات کیا ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہے تو صاف کہیں نہیں کہہ دیتے۔ تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ اور کیا کچھ

نہیں کیا جائے گا۔؟

اختر: میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں، پھر بھی۔

تجمل: پھر بھی کا کیا مطلب؟

اختر: مجھے جانا ہی چاہیے۔

تجمل: بے وقوف نہ بنو اختر۔ یہ بیٹھے بیٹھے آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

اختر: اس کا جواب دے چکا ہوں۔

تجمل: اگر تمہیں کچھ نہیں ہوا تو اس بے وقوفی کی وجہ؟ ذرا سوچو تو۔ یہاں اگر تم نے کتنے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں،

کتنی زبردست قدم و منزلت حاصل کی ہے۔ اس سے بڑی عزت کیا ہوگی کہ آج تم ملک کے بہترین مصور سمجھے جاتے

ہو، اور کیا چاہیے تمہیں؟

اختر: اس لیے میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تجمل: مجھے شکریے کی ضرورت نہیں صاف صاف بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے، کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے، اور

کیا چاہیے تمہیں؟

اختر: مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ رخصت ہونے کی اجازت دیجئے۔

تجمل: اس پاگل پن کی اجازت کیوں کر دے سکتا ہوں؟

اختر: آخر کیوں؟

تجمل: اس کی وجہ تم نہیں جانتے کیا؟

(اختر خاموش رہتا ہے)

سنا ہے آرٹسٹوں پر کبھی کبھی دورے بھی پڑتے ہیں۔ شاید اختر کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ اختر کا چہرہ بدستور بخیدہ ہے) کچھ اس قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔

اختر: مجھے مجبور نہ کیجئے۔

تجمل: کیا حماقت ہے، ایک شخص کو دلدل سے نکالا جاتا ہے اور جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اسی دلدل میں پھلانگ لگانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

اختر: میرے فن کی بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں۔

تجمل: فن کی بات کرتے ہو، یہاں آنے سے پہلے بھی تمہارے پاس فن تھا، اور ————— آج بھی ہے۔

مگر دونوں میں کتنا فرق ہے؟ تم خود نہیں جانتے یہ فرق؟

اختر: کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کا شکر گزار نہیں ہوں!

تجمل: اختر

اختر: فرمائیے۔

تجمل: اگر تم سنجیدگی سے بات کر رہے ہو تو سن لو۔ میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ میری توہین ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟

اختر: لوگوں کو میرے اور آپ کے ذاتی معاملے سے کیا واسطہ۔

تجمل: تم دنیا سے الگ تھلک رہ کر مصوری کرتے رہتے ہو تمہیں معلوم نہیں لوگ اس قسم کے واقعات پر کیا کچھ کہتے ہیں سب کہیں گے ایک غریب اور تلاش مستور کو جو نیپٹری میں سے نکال کر لایا دکھا دے کے لیے اور پھر اسے واپس بھیج دیا،

کیا یہ میری توہین نہیں ہے؟

اختر: (بھونچکا ہو کر) توہین کیسی؟

تجمل: اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟

اختر: صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے اور اب میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔

تجمل: یہ بات نہیں ہے اختر (طاعت سے) غور تو کرو۔ کتنی عجیب حالت ہوگی میری۔ میں نے فرداً فرداً کئی دوستوں کو چائے کی

دعوت دے دی ہے۔ وہ مزدور شام کو آئیں گے۔

اختر: میرے جانے یا نہ جانے سے اس دعوت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟
تجمل: میں سمجھتا ہوں نافرقت پڑتا ہے۔ اب اس پاگل پن کو چھوڑو اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔

اختر: آپ مجھے اس طرح روک نہیں سکتے۔

تجمل: روک نہیں سکتے۔ خوب جس شخص کو میں اپنا سمجھ رہا ہوں اس پر مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ اسے کسی پاگل پن سے روک سکوں؟ آج تم اتنی بلندوں پر پہنچ گئے ہو۔ اس لیے جانا چاہتے ہو۔ تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ تمہیں ان بلندوں تک پہنچانے میں میں نے بھی کچھ حصہ لیا ہے۔

اختر: آپ اصرار کرتے ہیں تو سنئے۔ جس اختر کو آپ ایک تنگ و تاریک کوٹھری سے نکال کر اپنے محل میں لائے تھے وہ حضور اختر مرچکا ہے اور جو شخص آپ کے سامنے کھڑا ہے اور جس کے لیے یہ شاندار سٹوڈیو بنایا گیا ہے۔ وہ اس کی چلتی پھرتی لاش ہے۔
تجمل: معلوم ہوتا ہے دورہ بہت شدید ہے مجھے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہیے۔

(تجمل جانے لگتا ہے۔ اختر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔)

اختر: (لہجے میں کسی قدر تکلم) ٹھہریے اور سب کچھ سنئے جائیے۔ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بیان کر دی ہے۔

تجمل: یہ سب سے بڑی حقیقت ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ ڈاکٹر کو کرنا چاہیے۔

اختر: آپ ابھی تک اسے ایک مذاق سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ میں بالکل نارمل ہوں۔

آپ تصویر کا ایک ہی مڑخ دیکھ رہے ہیں، اور اب اس کا دوسرا رخ دیکھئے جو اتنا خوفناک ہے کہ آپ کے تصورات کا شیش محل ابھی زمین بوس ہو جائے گا۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں متبنی تصویریں میرے نام کے ساتھ اس شاندار محل سے باہر لگئی ہیں، ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔

تجمل: (اختر کو گھورتے ہوئے) معاملہ اتنی دُور تک جا پہنچے گا مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا، اختر میرا مشورہ یہ ہے کہ اس وقت آرام کرو۔ تمہیں مکمل آرام کی سخت ضرورت ہے۔

اختر: ذرا تجمل سے کام لیجئے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے کہنے دیجئے۔

تجمل: تم پاگلوں کی سی باتیں کر رہے ہو تجمل سے کام خاک لوں۔

اختر: جب آپ کو پوری حقیقت معلوم ہو جائے گی اس وقت فیصلہ کیجئے کہ یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور۔

تجمل: یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے آخر گزشتہ دو سال سے تم میرے یہاں ہو۔ اس دوران میں تم نے کئی تصویریں بنائی

ہیں جو شہر کے معزز لوگوں کی کوٹھیوں میں آویزاں ہیں۔ ان میں سے اکثر میں نے تحفہ اپنے دوستوں کو دی ہیں۔ یہ سب کی

سب تمہاری ہیں۔ تمہاری اپنی تخلیق ہیں لیکن آج تم کہہ رہے ہو ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔ کوئی اور سنئے گا

تو کیا کہے گا۔؟

اختر: مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی مجھے کا تو کیا کہے گا۔ میرے لیے ریکش مکس ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ اس غلطی نے مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ یہ فریب اب زندہ نہیں رہ سکتا۔

تجمل: فریب؟ آج تھیں کیا ہو گیا ہے اختر کا سنس میں کچھ سمجھ سکتا کہ تمہاری اس پریشانی کی وجہ کیا ہے، ڈاکٹر کو تم بلانے نہیں دیتے ہیں کیا سمجھوں آخر؟

اختر: آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے، یہ کوئی معائنہ نہیں ہے۔ نیچے جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آج سے دو سال پہلے میں ایک تنگ و تنار ایک مہل کے ایک خنڈ اور بد نما مکان میں رہتا تھا۔ بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے، انھیں میرے متعلق صرف یہی معلوم تھا کہ میں ایک مفلس، تلاش اور گناہم مصروف ہوں، میں نے بے شمار تصویریں بنائی تھیں، مگر وہ تمام کی تمام کبابیوں یا نیلا گھڑوں میں بیچ کر کوڑیوں کے بجائے کچھ تھیں، زندگی اسی حالت میں گزر چکی تھی کہ آٹھ آٹھ تصویروں کی ایک نمائش گاہ میں میری آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے میری تصویروں میں دلچسپی لی اور مجھے اسی شام کو اپنے ہاں چائے پر بلایا میں اپنے ہزاروں ہمیشہ بھائیوں کی طرح غربت کی چکی میں پس رہا تھا، یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ آپ نے میری حالت کا اندازہ لگایا اور اس بات پر اصرار کیا کہ میں اپنے غربت کدے سے نکلی کر آپ کے ہاں آ جاؤں تاکہ اطمینان کے ساتھ فی کی خدمت کر سکوں۔ آپ نے میرے لیے یہ کمرہ وقف کر دیا اور مجھے زندگی کی ضروریات سے بے نیاز کر دیا۔

تجمل: ان باتوں کے ذکر کیا ضرورت ہے؟

اختر: میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے سلوک نے مجھ پر کیا اثر ڈالا ہے سمجھنے لگا، آپ نہایت اُدنیچے درجے کے انسان ہیں۔ دولت مند ہونے کے باوجود آپ کے پہلو میں ایک ایسا دل دھڑک رہا ہے جو انسانیت نواز ہے جس میں ساری دنیا کا درد سما یا ہوا ہے، آپ نے اپنے دوستوں کو بلا کر انہیں میری تصویریں دکھائیں۔ آپ نے بڑے بڑے اداروں کے دفاتروں میں میری تصویریں آویزاں کرائیں۔ آپ نے میری شہرت کے لیے میری تخلیقات رسائل و جرائد میں چھپوائیں۔ سچ بولیں اس وقت آپ میری نظروں میں ایک دیوتا تھے، ایک فرشتہ تھے، ایک ایسی ہستی تھی جس کی تعریف ہمارے قصوں اور کہانیوں میں کی گئی ہے۔

تجمل: میں نہیں سمجھ سکتا، اس ذکر سے تمہارا کیا مقصد ہے؟

اختر: مگر توڑے عرصے بعد ہی ایک بھیاں تک خیال اپنا محسوس سایہ میرے ذہن میں ڈالنے لگا۔ محسوس ہونے لگا کہ میں نے آپ کی ذات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے وہ محض میری خوش فہمی ہے حقیقت کچھ اور ہے۔

تجمل: کیا مطلب؟

اختر: مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آپ کی سرپرستی تو محض ایک اشتہار ہے آپ کی معذور نوا شخصیت کا اور اس کی سرپرستی میں آپ کا ایک خاص مقصد چھپا ہوا ہے۔

تجمل: کیا کہہ رہے ہو تم؟

اختر: آپ مجھے نواز رہے تھے مگر ایک خاص مقصد کی خاطر اور وہ مقصد یہ تھا کہ آپ سراسی کو بتانا چاہتے تھے۔ "دیجھو

کٹنا اچھا ہوں، میں نے ایک عزیز اور مفلس مصور کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ اب یہ جو کچھ بنا رہا ہے۔ محض میری سرپرستی کا نتیجہ ہے، میں نے اس کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا ہے ورنہ بیک کی ختم ہو چکی ہوتی جس طرح بڑی بڑی دکانوں کے دواڑوں پر انسانی پیکروں کو نہایت خوبصورت اور شفاف لباس پہنا کر انھیں الما دیوں کے اندر سجایا جاتا ہے تاکہ لوگ ان حسین و جمیل مجسموں کو دیکھ کر دکانداروں کے اعلیٰ ذوق اور ان کی شان و شوکت سے مرعوب ہو جائیں۔ اسی طرح آپ بھی اپنی امانت اور اپنی شخصیت کی نمائش کے لیے میری ذات اور میرے فن کو استعمال کر رہے تھے۔

تجمل: (غصے سے) یہ ٹھوٹ ہے۔ سراسر ٹھوٹ ہے۔

اختر: اور آپ کہہ بھی کیا سکتے ہیں مگر بلند آواز سے حقیقت نہیں بدل سکتی، آپ کے یہاں میری بھی حیثیت تھی۔ اور جس وقت مجھے اس کا احساس ہوا مجھے محسوس ہوا، جیسے میری اہلیتوں پر برکت کی تہہ جم گئی ہے۔ میرے سینے میں ایک بھی شرارہ باقی نہیں رہا، یہ احساس میرے لیے سو دن روح ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے جھوٹے خون دے دے کر میں نے فن کی شمع کو ایک روشن رکھا ہے۔ اس کا مقصد آپ کی شاندار کوٹھی اور آپ کی شخصیت کو جھگکانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، ایک فنکار کی کمی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا فن اپنا اعلیٰ پوم رکھ کر کسی کے لیے محض ایک ذریعہ فخر بن کر رہ جائے۔ انہی دنوں مجھے ایک ہم پیشہ دوست مل گیا۔ جو بدستور غربت کی چکی میں پس رہا تھا میں نے اسے اپنی ذہنی کیفیت بتائی اور التجا کی کہ وہ مجھے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دے دے۔ یہ سن کر اُس نے کہا۔ دیکھو اگر تم آج کل تصویریں نہیں بنا سکتے تو کوئی حرج کی بات نہیں، تمھارے لیے میں تصویریں بناتا رہوں گا۔ تم مجھے اتنے پیسے دے دیا کرو کہ میں اور میرا خاندان عورت و آبرو کے ساتھ زندہ رہ سکے۔ یہ تجویز میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی مگر اس کا اصرار کم نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ کھیل شروع ہو گیا جو دنیا کا سب سے گندہ اور ذلیل کھیل ہے۔ مجھے یہاں روپے حاصل کرنے میں کوئی وقت پیش نہیں آتی تھی۔ یہ روپے میں اُسے دے دیتا تھا اور وہ مجھے اپنی تصویریں۔

تجمل: ان تصویروں کو تم۔

اختر: اپنی تخلیق بنا کر پیش کر دیتا تھا۔

(تجمل اس انداز سے اختر کو دیکھتا ہے جیسے ان الفاظ سے اسے دھچکا سا لگا ہو)

تجمل: تم مجھے دھوکہ دیتے رہے اب تک۔

اختر: دھوکہ یا کچھ اور۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ نیازی کو وقتاً فوقتاً سکتے ملتے رہے، مجھے بنی بنائی تصویریں اور آپ کو فن

کی قدر افزائی اور مصور نوازی کے لیے سوسائٹی میں عزت و احترام۔

تجمل: میں کبھی حرج بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی لپٹ سطح پر اتر چکے ہو۔

اختر: میں نے خود کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن اس لپٹ سطح پر اترنے کے لیے مجبور تھا۔ شب آزی نے مجھے کئی تصویریں

دی ہیں۔ یہ تصویریں آج آپ جیسے معزز لوگوں کے ڈرائنگ روموں کی زینت ہیں۔ وہ پہلے کی طرح مفلس نہیں ہے وہ

اپنی بہن کی شادی کر چکا ہے۔ اسے روٹی اور کپڑے کی بھی تکلیف نہیں۔ اب مالک مکان بھی اسے پریشان نہیں کرنا۔ مگر میں جانتا ہوں اس کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اپنی اولاد کو چند سکون کے عوض دوسروں کو سوئپ دنیا ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ ہے، جس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے آج جب اس نے سنا ہوگا کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر، براؤل انعام کی مستحق قرار پائی ہے تو اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی، وہ کیا سوچے گا، اسے کتنا دکھ ہوگا۔ میں اس تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں۔

تجمل: ثواب تکم نام نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ اپنی نالائقی چھپاتے رہے۔ میں نے اتنی آسائشیں بے کار رہتیا کی تھیں۔

اختر: آپ ان کی قیمت وصول کر چکے ہیں ہمیشہ کی طرح اس سودے میں آپ ہی کو فائدہ ہوا ہے۔

تجمل: اس قدر فریب دینے کے بعد اپنے محسن کو جلی کٹی سناٹے ہوئے تھیں شرم نہیں آتی؟

اختر: مجھے شرم کیوں آئے گی۔ شرم تو آپ لوگوں کو آنی چاہیے جو بندوں پر پہنچنے کے لیے ہزاروں انسانوں کو اپنی سیڑھی بنا لیتے ہیں۔ جو ایک فن کار کی سرسستی بھی کرتے ہیں تو اپنے مطلب کے لیے۔

تجمل: اے مریاں میں منہ ڈال کر دیکھ کر تم کیا ہو، احسان فراموش، چور، مجرم۔

اختر: میں سب کچھ ہوں مگر تم۔ تم کیا ہو۔ یہ بھی تو کہو؟

تجمل: میں؟

اختر: ہاں تم — بناؤ، خاموش کیوں ہو، بتاتے کیوں نہیں۔ دوسروں کے جرم دیکھ لیتے ہو۔ دوسروں کو مجرم کہتے ہو، مگر اپنے منقلب کچھ نہیں کہتے۔ بناؤں کون ہو تم؟

(رؤف آتا ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)

رؤف: وہ خبر بالکل درست ہے جناب۔ پہلا انعام اختر صاحب ہی کو ملا ہے۔ یہ رہا اخبار (بغل سے اخبار نکالتا ہے) آپ.....

..... دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے)

تجمل: تم جاؤ اس وقت۔

رؤف: بہتر جناب (رؤف دروازے کی طرف جانے لگتا ہے، پھر ٹھہر جاتا ہے۔ ادھر یاد آگیا۔ میٹر اختر آپ کا کوئی واقف کار راستے میں ملا تھا۔ اس نے ایک پیغام دیا ہے، آپ کے نام۔ آپ کا کوئی مقصود دوست تھا۔ نیازی ہے۔)

اختر: ہاں کیا ہوا اسے، جلدی بناؤ؟

رؤف: افسوس آج صبح اُس نے خودکشی کر لی۔

اختر: خودکشی؟

رؤف: جی ہاں۔ ہسپتال جانے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اختر: (تجمل سے) سنا تم نے ابھی پوچھ رہے تھے۔ میں کیا ہوں۔ اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم کیا ہو، تم قاتل ہو۔

یہ قتل تم نے کیا ہے۔

تجمل : (دھتے سے گرج کر) بھراس بند کرو۔

اختر : قانون تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ مگر انسانیت کی نظروں میں تم قاتل ہو۔ تم نے دو قتل کئے ہیں۔ ایک مصدور کے فن کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے اور دوسرے مصدور کی جان لے لی ہے۔ یہ قتل نہیں تو اور کیا ہے۔ اور قتل کیا ہوتا ہے؟

تجمل : نکل جاؤ یہاں سے کیئے پاجی، احسان فراموش!

اختر : میری زبان ٹوک نہیں سکتی۔ میں چیخ چیخ کر کہوں گا، دیکھو لوگو! یہ قاتل ہے، اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ سوسائٹی کا خوفناک مجرم ہے یہ۔

تجمل : کھڑے کیوں ہو۔ اس پاجی کو دھتکے دے کر نکال دو۔ لے جاؤ اسے پاگل خانے میں۔ پولیس کو ٹیلیفون کرو۔ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ خطرناک پاگل ہے۔

درود اختر کو دھتکے مار کر باہر نکالنے لگتا ہے۔ اختر ہچکچہ

چیخ کر کہہ رہا ہے۔ "تم قاتل ہو۔ تم نے قتل کیا ہے۔ میں خاموش

نہیں رہوں گا۔" یہ آواز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگتی ہے۔ تجمل

دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہے۔

پردہ گرتا ہے)

ابن بطوطہ

کبھ کر کے نام سے ہندوستان میں جو میلہ لگتا ہے اس میں بہت ورس کے ان گنت باشی شریک ہوتے ہیں، کیا جہان کیا ہے، کیا مرد کیا عورتیں۔ ملک کے چتے چتے سے لوگ کھینچے چلے آتے ہیں۔ پر اب کے جو میلہ لگا وہ پچھلے کئی برسوں کے میلوں سے بازی لے گیا، اس کا ایک کارن تو یہ کہ لوگ بہت زیادہ آئے۔ پھر ایک اور بات بھی مٹی گئی۔ کہا گیا کہ اس سال ایک ایسا مہا پُرش آیا ہے جس نے برسوں ہالیہ کی کسی چوٹی پر بیٹھ کر دن رات تپسیا کی ہے۔ یہ مہا پُرش جدھر سے گزرتا تھا سب یا تری سر جھکا کر اس کا سواگت کرتے تھے۔ رکھنے والے کہتے تھے کہ اس مہا پُرش کا روپ سروپ شری کرشن کے روپ سروپ سے ملتا ہے۔

میلے میں ایک پُرنے پہر کے نیچے دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے اپنا منہ دوسرے کے کان سے لگانے ہوئے کہا،
”دوہ دیکھو مہا پُرش“

دوسرے آدمی نے ایک طرف دیکھا۔ جدھر دیکھا اُدھر ایک منش چلا آ رہا تھا۔ گہرا دھوتی پہنے ہوئے، پاؤں میں کھڑاکیا اور دھوتی کے اوپر سارے تن پر بھہرت لی ہوئی لکیک ہاتھ میں سسکھ اور دوسرے میں ایک گڑدی۔

جب یہ مہا پُرش ان دونوں کے قریب آیا تو دونوں نے سیس لڑائی۔

مہا پُرش ذرا رکا۔ گڑدی میں اُنکلیاں ڈالیں اور ان پر چھینٹے مار کر آگے چلا گیا۔

وہ جدھر سے بھی گزرتا تھا اسی طرح چھینٹے مارتا تھا جس پر ایک چھینٹا بھی پڑ جاتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ پوتر ہو گیا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ مہا پُرش سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کوئی کہتا تھا واپس ہالیہ کی چوٹی پر تپسیا کے لیے چلا گیا ہے، کسی کا خیال تھا کہ لنگا مائی کی گود میں سما گیا ہے اور کوئی

یہ بھی کہتا تھا کہ وہ یہیں کہیں ہے پر دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ اسے دیکھ سکتا ہے جو آپ مہا دووان ہو۔

وہ دونوں آدمی اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اس سے اشیر باد لینا چاہتے تھے۔ پروہ کہیں بھی نہیں مل رہا تھا، کہیں بھی دکھائی

نہیں دے رہا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا وہ مہا پُرش۔ اسے ہزاروں اکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ پروہ کہیں نظر ہی نہ آتا تھا۔

اگر کچھ دن بعد یہ آدمی پاکستان میں آجائے، پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں پہنچ جاتے اور بازاروں، سڑکوں پر سے ہوتے

ہوئے بند روڈ کے خینو سرفیکل ہل کی سیڑھیاں طے کر کے دائیں جانب ایک ایسے کمرے میں پہنچ جاتے جہاں چاروں طرف کتنا ہی ہی

کناہیں ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں تو وہ میز کے ایک سرے پر اس مہا پُرش کو پالیتے! اگر

یہ گہر بہت اہمیت رکھتا ہے وہ اس لیے کہ یہاں وہ مہا پُرش بالکل اور ہی رنگ میں نظر آتا ہے۔

بہت شاندار موٹ پہنے ہوئے۔ یہ موٹ اس نے پچھلے دنوں جب یورپ گیا تھا تو لندن کے ایک بازار سے خریدا تھا۔ وہ دو آدمی تو اپنے مہاتپسوی کو اس رنگ ڈھنگ میں دیکھ کر فوراً بیہوش ہو جاتے اور پھر شاید گنگا جمن کے سنگم کے پانی سے چھینٹ مارنے پر بھی ہرٹس میں نہ آتے، مگر ہمارا یہ حال نہیں ہو سکتا، کیونکہ ابن النشا کو کبھی وہ سمجھا ہی نہیں جو کبھ کر کے میلے کے یا تری اسے سمجھتے تھے۔ تو یہ ابن النشا تھے جو مہاتپسوی بن کر کبھ کے میلے میں چلے گئے تھے۔

جی ہاں !

اخباروں میں یہ خبر چھپتی تیرہ اسی سال کی غالباً سب سے بڑی سنسنی خیز خبر بھی جاتی۔ ابن النشا کا مہاتپسوی کے روپ میں کبھ کے میلے میں چلا جانا ان ہر نی بات ہے۔

بہنیا ان ہر نی بات ہے اور میں بھی اُسے شاید ان ہر نی ہی کہتا، لیکن ایک دو باتیں ہیں ایسی کہ میں ان ہر نی کو ہر نی ہی کہہ سکتا ہوں یا سمجھ سکتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ ابن النشا اس زمانے کا غالباً سب سے بڑا سیاح ہے جو نگری نگری بھر چکا ہے، مگر گھر کا راستہ کبھی نہیں بھولا۔

ساری دنیا میں گھوم کر وہ ثابت کر چکا ہے کہ دنیا چھٹی نہیں گول ہے۔

وہ چین میں بھی جا چکا ہے اور یہ نعرہ بھی لگا چکا ہے کہ چلے تہ تو چین کو چلے۔

اس نے بہت آوارہ گردی کی ہے۔ اس کی ڈائری بھی مکھ دی ہے کہ سندر ہے، اور اپنے اور دوسروں کے کام آئے۔

یہی نہیں وہ آنجنابی ابن بطوطہ کا بھی تعاقب کرتا رہا ہے اور اس تعاقب میں خدا جانے کیسے کیسے ہفت خانوں سے گزرا ہے۔

ایسے شخص کے لیے ایک ہمایہ ملک میں چلے جانا کیا کوئی مشکل کام ہے؟

دوسری بات یہ کہ جب ابن النشا کا ذہنی مرشد، رچرڈ برٹن آف اٹلنٹیلہ فیم ایک عرب بن کر چل کر سکتا ہے۔ اور ہزاروں حاجیوں کے ساتھ اس طرح گھل مل سکتا ہے کہ کوئی اسے پہچان ہی نہ سکے تو اس کے شاگرد میں یہ خوبی نہیں ہو سکتی کہ وہ ذرا بھی بدل کر کبھ کے میلے میں چلا جائے؟ اس میں آخر مشکل کیا ہے۔ جیسا استاد دلیا شاگرد۔

مجھے تو اس میں کوئی ناٹکی چیز نظر نہیں آتی۔

رچرڈ برٹن الحاج رچرڈ برٹن ہو سکتا ہے تو ابن النشا کبھ کے میلے کا مہاتپسوی کیوں نہیں ہو سکتا۔ جب کہ اس کے چہرے کا تدرقی رنگ کرشن مہاراج کے رنگ سے بہت ملتا ہے۔ میں مسئلہ تنازع کا قائل نہیں ولیے بھی ابن النشا نہ تو منڈکا بالو گویا ناتھ ہے اور نہ اُسے گوپن قسم کی چیز سے کبھی تعقیب خاطر رہا ہے اور پھر وہ کمسن بھی نہیں چڑا نا۔

آپ کہیں گے ایسا نہیں ہوا، اور میں بھی کہتا ہوں ایسا نہیں ہوا، مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہو تو سکتا ہے نا!

دلیہ ابن انشاکس ناممکن کو ممکن نہیں بنا سکتے؟ سوچنے والی بات ہے! شاعر کر سکتے ہیں، مزاحیہ اور طنزیہ کالم لکھ سکتے ہیں۔ ساری دنیا کی سیر و سیاحت کر سکتے ہیں اور چاند سے عشق بھی فرما سکتے ہیں۔

چاند کے عشق سے یاد آیا کہ ”اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا“ اس نے بھی چاند سے عشق کیا تھا مگر تھا بیچارہ بد قسمت۔ پاگل ہو گیا، لیکن ابن انشا ظہرے خوش قسمت۔ اُنھوں نے چاند سے عشق کیا تو روز بروز نکھرتے چلے گئے۔ زیادہ سے زیادہ عقل مند ہوتے چلے گئے۔

اپنی اپنی قسمت ہے!

ابن انشا نے مرد۔ چاند ہی کے لیے اپنا دل اپنا جگر وقف نہیں کیا ان کا دل، بچہ وسیع ہے، اتنا وسیع کہ اس کی وسعتوں میں جو بھی آتا ہے سما جاتا ہے۔ پیار ان کا دین اور محبت ان کا ایمان ہے اور یہ پیار، یہ محبت ہر ایک کے لیے ہے۔ اینوں کے لیے ہیں اور بیگانوں کے لیے بھی۔

لاہوری آنے ہیں تو اسے سب چاہنے والوں کو سلام محبت دینے لگتے ہیں۔ ہاتھ میں ان کے ایک ٹیوٹی سی کا پی ہوتی ہے اور سامنے نیشنل بک کونسل کا ٹیلیفون دھرا ہوتا ہے۔

”نائبش صاحب سلام کریں گے تو وہ اپنے خیالوں میں اتنے ڈوبے ہوئے ہیں کہ سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔

”ہیو۔ میں ہوں۔ بھلا بھلا تو کون ہوں۔ جی جی۔ اچھا ہوں۔ بھئی آپ سے اکبٹ نکایت ہے۔ الفلاح میں بیٹھی ہوئی ایک صاحبہ فلاح دارین پاتی رہتی ہے اور ایک ہم ہی آوارہ گرد، سبلانی۔ لاہور اور لاہور والوں کو سلام عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ سلام کر کے چلے جائیں گے۔ سب مشاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاڈیلے گا بنجارہ۔ ہی ہی ہی ہی ہی ہی۔ ضرور ہوگی۔ آج شام حاضر ہر جاؤں گا دفتر میں یا“

ہیو!

اس دفتر میں ہمارے ایک پُرانے جاننے والے ہوتے ہیں نام ان کا انتظار حسین۔ وہی جو آج کل کہانیاں لکھ لکھ کر طلسم ہوش رہا کا طلسم باندھ رہے ہیں۔

ارے آپ ہی جگ جگ جیو! صاحب! ہم نے کیا خطا کی ہے کہ آپ پوچھتے نہیں۔ سر آنکھوں پر آئیے! منتظر ہوں۔ انتظار حسین کا!

”ہیو وہ جو اپنے اشفاق احمد ہیں۔ ذرا کیجیے۔ کراچی سے ان کا ایک چاہنے والا آیا ہے۔

کیا نہیں ہیں۔ اوہو۔ یہ کجست کبھی دفتر میں نہیں ہوتا۔

اشفاق احمد نہیں ملے تو مؤذرا بگڑ گیا ہے اور انھیں یک لخت یاد آ جاتا ہے کہ جب وہ دفتر میں آتے تھے اور اپنی

جیب سے ذاتی ٹیلیفون ڈائریکٹری نکال دے تھے تو نائبش صاحب کے ہونٹ ہلے تھے۔

”کیا کہتا تھا نائبش صاحب!“

”کچھ نہیں سرا“
 ”کچھ کہا تھا جب میں آیا تھا۔ آپ کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی تھی۔ میں نے یہ حرکت دیکھ لی تھی۔“
 ”سرورہ تو میں نے سلام کیا تھا۔“
 ”وعلیکم السلام! یا رمعات کرنا۔ جواب دے ہی نہ سکا۔“
 ”میں جانتا ہوں سر۔“

دو الفقار احمد تالیش کا مسکراتا ہوا، شگفتہ چہرہ انشاجی کا موڑ بجالا کر دیتا ہے اور ”ہیلو ہیلو“ شروع ہو جاتا ہے۔
 ادھر سے بنانے کیا جواب ملتا ہے۔

”آواز پہچان لی آپ نے۔ خوب۔“ انشاجی کا چہرہ مسکرا ہٹوں میں ڈوب جاتا ہے۔ سائلے چہرے پر مسکراہٹوں کا چھٹنا
 ہوا اعتبار ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ آج ہی آیا ہوں، ملاقات ہوئی ضروری ہے۔ جب کہیں بہاں کہیں بندہ بشر حاضر ہو جائے گا،
 بندے کس کے ہیں جنور۔“

اب کے لہجہ کافی مڑا ہوا ہے۔ کیونکہ انشاجی اس وقت کسی بے تکلف دوست سے نہیں، مولانا حامد علی خان سے
 مخاطب ہیں۔

گفتگو ختم کر کے وہ ریسور رکھ دیتے ہیں۔ چند سیکنڈ کے بعد دوبارہ اٹھانے ہیں مگر کسی کو مخاطب نہیں کرتے۔ اب کے ریسور
 کچھ لمبی سے اپنے جائے قیام کی طرف جاتا ہے۔ ٹھک، کی آواز پر انشاجی ذرا چونکتے ہیں۔ میز پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور
 پیپر ویٹ ایک خاص انداز سے اٹھا لیتے ہیں، پھر ایک لمحہ توقف کیے بغیر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی پیشانی کو ذرا غور سے
 دیکھتے ہیں۔ مرکز نظر کسمسا کر غیر ارادہ اپنا ہتھ پیشانی پر رکھ دیتا ہے۔ انشا۔ اس منظر سے ٹپٹ اندوز ہو کر پیپر ویٹ ٹیلیفون کے
 پیلو میں اس آہستگی سے رکھیں گے، جیسے ماں اپنے سوتے ہوئے بچے کو بڑی احتیاط سے چارپائی پر ٹھا دیتی ہے۔ خطرے کے بہتس نظر پیشانی
 پر ہاتھ رکھنے والا شخص ذرا شرمندہ ہو کر مسکراتے گھٹا ہے اور انشاجی تو پہلے ہی مسکرا رہے ہیں۔

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں اور انشاجی کے ہاں بھی سکون کا ڈیٹکن نہیں۔ ان کے ارد گرد کچھ لوگ بیٹھے ہیں جو
 معنی خیز نظروں سے انھیں دیکھ رہے ہیں۔

”تو صاحب آپ کا کیا حال ہے!“ انشاجی ایک صاحب سے غالباً قیصری بار دریا منت حال کرتے ہیں، مگر اس سے پہلے
 کہ ان کا مخاطب کوئی روایتی فقرہ کہے ان کا چہرہ تالیش صاحب کی طرف مڑ جاتا ہے۔

”فاسمی صاحب سے بات کر لی تھی۔“

”کر لی تھی وہ۔“

”آجائیں گے وہ۔“

”انھوں نے فرمایا ہے آج کرا۔“

انشاجی جلدی جلدی اپنا برایت کبیں کھولیں گے، ایک لفافہ نکالیں گے اور اس میں سے پی آئی اے کا ٹکٹ نکال کر اس کا جائزہ لیں گے۔

”تالیش صاحب“ انشاجی ٹکٹ تالیش صاحب کے حوالے کر دیتے ہیں۔

”آپ ۴ روپے نہیں جا رہے۔“ تالیش صاحب ہنس کر پوچھتے ہیں۔

”ہاں بھئیے۔“ ٹیکٹنگ کینسل کر دیں اور،

”۴ روپے صبح کی فلائٹ۔؟“

”ٹھیک ہے“

تالیش صاحب جلدی سے کاپی نکال کر پی آئی اے کا نمبر دیکھتے ہیں اور ڈائل گھمانے لگتے ہیں۔

”ذرا ٹھہر جائیے،“ انشاجی کاغذ کے اتارے سے تالیش صاحب کو روک دیتے ہیں۔

ڈائل کرتا ہوا ہاتھ ٹوک جاتا ہے۔

”قاسمی صاحب نے کیا کہا تھا؟“

انہوں نے کہا تھا کہ میٹنگ میں چار کے بجائے پانچ بچے آ سکتے ہیں،

”اس کا مطلب ہے کہ میں کل ہی جا سکتا ہوں۔“

”آپ کی یہ مرضی ہے، مگر کیا کہا جا سکتا ہے۔“

”نہیں تاریخ بدلوا دیں۔ ٹرائی کیجئے کہتے کیا ہیں،“ انشاجی کچھ سوچ کر تیسرے دن ہی جانے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔

تالیش صاحب ٹرائی کرتے ہیں۔ پی آئی اے والے مان جاتے ہیں۔ تالیش صاحب ستار صاحب کو بلاتے ہیں اور ٹکٹ ان کے حوالے کر کے صورت حال واضح کر دیتے ہیں۔

ستار ٹکٹ لے کر واپس نکل جاتے ہیں۔ ”مریٹنگ پانچ بجے ہوگی۔“

تالیش صاحب کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا، کیونکہ انشاجی اپنے پروگرام پر غور کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں دو ٹکٹیں بڑی اہم ہیں۔ ٹکٹِ سخن اور ٹکٹِ پروگرام، ٹکٹِ سخن کرتے وقت ان کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے اور ٹکٹِ پروگرام کے وقت پی آئی اے کا ٹکٹ۔

”اشفاق صاحب آگے ہوں گے مگر!“

”کون ٹکٹ لے کر گیا ہے؟“ انشاجی نے پروگرام پر غور کر لیا ہے۔

”ستار“

”مرصان کو کہیے کہ ستار کو واپس لے آئے۔“

”تو سر۔“

گھنٹی بجتی ہے۔ مرصان کو بولایا جاتا ہے اور ستار کے تعاقب میں اُسے روانہ کر دیا جاتا ہے۔

انشا جی مطمئن ہیں، مگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ایسے عالم میں ان کے چہرے پر پریشانی کے باقیات واضح طور پر نظر آجائیں گے۔

”فن کر دیں۔ AS IT IS“

سید سجاد حسید بریلدرم ہی کے زمانے میں ایک اور رومانی ادیب تھے تخلیقی دہلی، ان کی شگفتہ تحریروں کے مجموعے کا نام ہے۔ ’ادلبان‘ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے۔

”اس سے پہلے کہ میں سفر پر سوار ہوں، سفر مجھ پر سوار ہو جاتا ہے۔“ کچھ ایسا ہی فقرہ ہے۔ انشا جی کا بھی یہی حال ہوتا ہے، لیکن وہ سفر کا بارگراں ہر وقت اپنے کندھوں پر رہنے نہیں دیتے۔ کھسکاتے رہتے ہیں اور یہ بارگراں ان کے عملے کے کندھوں کی زینت بنا رہتا ہے۔

میرے لیے یہ مسئلہ اُلجھن پیدا کرتا رہتا تھا کہ انشا جی پر تو ہر وقت سفر سوار رہتا ہے وہ شاعری کیونکہ کرتے اور اپنے پُر لطف کالم کیونکہ لکھ پاتے ہیں۔
یہ سوال اُن سے پوچھا۔

”شاعری ختم ہو گئی۔ اور کالم۔ بس کالم ہوتے ہیں۔“

ایک بار کراچی میں ان کے ہاں پہنچا دفتر میں تو اس سوال کا جواب مل گیا۔

انشا جی اپنی کرسی پر براجمان تھے۔ ارد گرد تین چار دوست بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں ان کے پین تھا اور سر جھکا ہوا تھا ایک

کاغذ پر۔ چہرے پر حسب معمول مسکراہٹ تھی۔
ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

رہسپور آٹھا گیا۔ ”بس جی۔ پانچ منٹ میں مکمل ہو جائے گا۔ آدمی بھیج دیجئے۔ بہت اچھا۔“

معلوم ہوا کہ کالم لکھا جا رہا ہے اور کس طرح لکھا جا رہا ہے؟ احباب سے منہی مذاق کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ بار بار پتلون کی کریم بھی درست کی جا رہی ہے، صلیب کے شیشے بھی صاف کیے جا رہے ہیں اور تلم بھی کاغذ سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے، کوئی مزے دار فقرہ لکھتے ہیں تو یار دوستوں کو سننا کر فرما کشی داد بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ فرمائشی داد حاصل کرنے میں شاعروں ————— کی طرح انشا جی بھی بڑے ماہر ہیں۔ اگر داد نہ دی جائے تو انشا جی اسے اپنے حق میں پیدا سمجھتے ہیں۔

انشا جی نے اپنے حالات کبھی نہیں بتائے۔ سنا گیا ہے کہ جن زمانے میں مشرقی پنجاب کے مشہور شہر ملوہیا نے زیر تعلیم تھے تو ان کے ہم سب تھے۔ ساحر ملوہیا لوی اور حمید اختر۔

تینوں نے ہی ادب اور صحافت میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔

انشا جی نے شاعری کر کے، دنیا کی سیاحت کر کے، سفر نامے لکھ کر نیشنل بک کونسل کے ناظم بن کر اور مزاحیہ، طنزیہ کالم

کلمہ کر، ساحر لہیا لوی لے شاعری کر کے ترقی پسند تحریک میں بھرپور حصہ لے کر اور بہتی جا کر۔
حمید اختر نے ادب میں نام پیدا نہیں کیا مگر وہ ہیں بڑی خوب چیز۔ ان کی شہرت کے کئی مرتبے ہیں۔ مثلاً وہ بڑے پیارے دوست ہیں۔ ایک اخبار کے ساتھ بھی ایک طویل مدت سے وابستہ ہیں۔ سینٹ کا کاروبار بھی کرتے ہیں اور ایک اور بات یہی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ علم اسٹاروں سے ان کے تعلقات بڑے گہرے ہیں۔ ان کے پاس اپنی کار بھی ہے۔ کاروبار بھی ہیں اور صاحب کار بھی۔ مرنے پر سہاگہ اسی کو کہتے ہیں۔

ان نینوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو ایرانِ قدیم کے بھی تین دوست یاد آ جاتے ہیں۔
یہ تین دوست، حکیم عمر خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک طوسی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ان تینوں نے آپس میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کر رکھا تھا، چنانچہ روایت ہے کہ نظام الملک نے عمر خیام کو ایک نہایت خوبصورت باغ بنوا دیا تھا جس میں وہ ایسی کارروائی کرتا تھا جو عمر خیام کے مصغور اڈیلین میں چھینے چلاتے رنگوں کے ذریعے بتائی گئی ہے۔

ابن النشا، ساحر لہیا لوی اور حمید اختر نے آپس میں کوئی معاہدہ یا وعدہ نہیں کیا تھا، اس لیے ان کی دوستی ابھی تک سلامت ہے۔

میں نے ایک مد زپوچھا شیر محمد قیصر صاحب!

ان کا سانولہ چہرہ محرابِ سُرخ بن گیا۔

چلے آپ شیر محمد قیصر میں یا ابن النشا میں۔ مگر آپ اُردو ادب میں غالباً دوسرے شیر محمد ہیں۔ پہلے شیر محمد اختر ہیں۔

”شیر محمد اختر“ میرے بزرگ اور دوست ہیں، ارشاد ہوا۔

”وہ اختر کہوں اور آپ قیصر کہوں۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟“

”اس کی ایک وجہ ہے۔“

”کیا وجہ!“

”وہ شیر محمد اختر اس وجہ سے ہیں کہ وہ شیر محمد اختر ہیں۔“

”اور آپ شیر محمد قیصر اس بنا پر ہیں کہ آپ شیر محمد قیصر ہیں۔“

شیر محمد کے سانولے چہرے پر مسکراہٹوں کا نور بکھر گیا۔

یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شیر محمد اختر کو اختر کی نسبت سے آسمانی مخلوق کے ساتھ تعلق ہونا چاہیے تھا، مگر اختر شناسی سے انھیں دُور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ وہ بلندیوں پر چمکتے ہوئے ستاروں سے آگاہی حاصل کرنے کے بجائے انسانی ذہن کی گہرائیوں میں جھانکتے رہتے تھے۔ اوریوں نامِ نفسیات کہلاتے تھے۔ شیر محمد قیصر کے جدِ امجد نے قبیلہ ہندو ملک و کوٹریہ کے دربار میں سوائی حاصل کی تھی اور قبیلہ مردم سے انھیں کسی قسم کی نسبت برقرار رکھنے کا موقع ملا تھا۔ علاوہ ازیں ان کا خاندان کبھی کسی قصریں ہی ہاتھ نہ

نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ فیصلہ کر لیا کہ صاحب بن گئے کیا کیا جائے۔ بننے والے کچھ نہ کچھ بن ہی جاتے ہیں۔ شیر عمدہ قبضہ زندہ ابن انشا کی بات کرتے ہیں تو کہیے وہ اد کیا کچھ نہیں گے۔ یہی دیکھتے۔ خود کہتے ہیں۔

کبھی میر فقیر کے بیتوں سے کہیں غزلوں سے انشا صاحب کی

ان بربا کی بے کل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں فن کی

دیے تو انشا جی میر کے بڑے معتقد بنتے ہیں، مگر یہاں خود کو میر صاحب کے پہلو میں کھڑا کر لیا ہے۔ گویا ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں۔ فرق ہے صاحب۔ فرق کیوں نہیں۔ میر بے چارے فقیر اور یہ انشا صاحب۔ سبحان اللہ! عقیدت ہو تو ایسی ہر!

میں ابن انشا کا نام استعمال کرتا رہا ہوں مگر جانے کس سطر سے انشا جی شروع کر دیا ہے۔ اصل میں کچھ تصور میرا بھی نہیں انشا جی اپنے کلام میں ہر مقام پر بالعموم انشا جی ہی نظر آتے ہیں ملاحظہ ہو۔

انشا جی پھرتے سویرے صبر کا دامن چھوڑ رہے ہو

بکھل رات کا درد ابھی سینے سے مٹنے نہیں پایا

اور تو اور اپنے مجھ میں پوری ایک غزل لکھ دی ہے۔ جس کی ردیف ہے انشانے ”یہاں جی، کیوں مجھول گئے میر خیال ہے یہاں شاید انھیں کچھ حیا آگئی اس غزل میں دوسرا شعر لکھ رہا ہے،

قیس کی سنت سجد و نما میں پھر اس شخص نے زندہ کی

ہم کو بھی پہلے قیسیں نہیں آیا انشانے ہاں انشانے

جو شخص قیسی ثانی بننے کا دعویٰ کر رہا ہو اسے ”جی“ کہلانے کی بھلا کیا حاجت رہتی ہے۔؟ پھر ملاحظہ فرمائیے اپنے نام پر کتنا زور دیا ہے۔

”انشانے، ہاں انشانے“ گویا بھولے مت قیسی کی سنت سجد و نما میں انشانے اور صرف انشانے زندہ کی ہے۔ شدتِ جوش میں وہ یہ بھی مجھول گئے کہ وہ خود انشا نہیں ہیں۔ ابن انشا ہیں۔ دل میں جوشِ فراہاں ہو تو انسان کیا کچھ نہیں کہہ جاتا؟ انشا جی یہ سطر میں پڑھیں گے تو مسکرا کر کہیں گے۔ آخر میر نے بھی تو اپنے نام کے ساتھ صاحب لگا دیا ہے۔ میں نے لگا لیا ہے تو حرج کیا ہو گیا ہے اور وہ بطور سند کے کہیں گے۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے

دونوں ہاتھوں سے تھامے مٹتا

کتنی معقول توجیہ ہے، مگر ان کی خدمت میں یہ بھی تو عرض کیا جاسکتا ہے کہ میر صاحب کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان کے سر پر دستار دہتی تھی آپ کے سر پر کیا ہے؟

اپنا اور میر صاحب کا مقابلہ کرتے وقت انھوں نے مددِ رحم انکساری سے بھی کام لیا ہے۔

اک بات کہیں گے انشاجی تمہیں ریختہ کہتے عمر بھٹی
تم ایک جہاں کا علم پڑھے کوئی میر سا شعر کہا تم نے
خیر یہاں وہ جانیں یا میر صاحب جانیں، مگر انشاجی نے یہ بات بالکل درست کہی ہے۔ ”تم ایک جہاں کا علم پڑھے۔“
انشاجی واقعی بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ میں تو ادب کے موضوعات پر بات کرتے ہوئے اُن کے سامنے ہیبت زدہ رہتا
ہوں۔ اُردو کے سارے کلاسیکی لٹریچر کے مفت خواں طے کر چکے ہیں۔ فارسی اور عربی خوب جانتے ہیں۔ ہندی میں سند کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ گورکھی میں بھی دسترس حاصل ہے۔ انگریزی زبان و ادب پر انہیں ایسی قدرت حاصل ہے کہ امریکی مصنف ایڈورڈ
لورڈ کی کہانیاں انہوں نے صرف چند روز میں ترجمہ کر دی تھیں اور یہ کہانیاں اُردو میں ”اندھا کنواں“ کے نام سے چھپی تھیں۔ بڑے عالم
ناضی آدمی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انشاجی ہیں بڑی خبریوں کے مالک آدمی۔ ان کی بے شمار خوبیوں میں ایک ایسی خوبی بھی ہے جو دنیا بھر
ادب میں صرف اس کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ دنیا کے شاید کسی شاعر نے بھی اپنے کلام میں اپنی عمر کا اعلان نہیں کیا۔
یا کیا ہے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے مگر انشاجی نے کیا ہے اور پورے زور سے کیا ہے۔
انشاجی چھبیس برس کے ہو چکے یہ باتیں کرتے ہو۔
انشاجی! اس عمر کے لوگ تو بڑے سیانے ہوتے ہیں۔

تباہی یہ خوبی کسی اور شاعر میں نظر آتی ہے۔ دلیہ عرض یہ ہے کہ اُنہوں نے بڑی انکساری سے کام لیا ہے۔ اس عمر میں ہی
نہیں، اس عمر سے پہلے بھی وہ بڑے سیانے تھے۔ تو یہ شعر انہوں نے چھبیس برس کی عمر میں کہا تھا۔ اس کی ضرورت انہیں کیوں پیش آئی۔
شاید وہ کسی کو تباہا چاہتے تھے کہ میں چھبیس برس کا ہو چکا ہوں اس کے بعد ستائیس برس کا ہوں گا۔ پھر اٹھائیس برس کا۔ زندگی کی گاڑی
آگے آگے بڑھتی جائے گی۔ اس لیے اے وہ ہستی کہ تو میری عمر سے ناواقف ہے جان لے کہ میں چھبیس برس کا ہو چکا ہوں۔ اس لیے
’آٹا ہے اگر تو آج او ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم‘

لیکن یوں بھی تو سوچا جاسکتا ہے کہ انشاجی نے آنے والے ادبی مورخ کو بتایا ہے کہ فلاں سن میں میری عمر چھبیس برس کی
ہو گئی تھی۔ اب حساب لگا لو کہ اسی نوے برس بعد میری عمر کیا ہوگی۔ خدا نخواستہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشاجی اسی نوے برس
اور جنیں گے۔ توبہ۔ توبہ۔
میری تو دلی دعا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہاں ایک اور پہلو بھی میرے سامنے آ جاتا ہے۔ انشاجی تمہیں سے اپنا مقابلہ کرتے ہیں۔ مقابلہ نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں
تمہیں کی سنت زندہ رکھی ہے، مگر تمہیں کے بارے میں تو سنا جاتا ہے سمجھا جاتا ہے۔ مانا جاتا ہے کہ اس نے ساری عمر میں صرف

ایک بار ہی عشق کیا اور انشا جی نے اس چھپیں برس کی عمر میں نہ جانے کتنے عشق کر لیے ۔

انشا نے پھر عشق کیا انشا صاحب دیوانے

اپنے بھی وہ دوست ہوئے ہم بھی چلیں گے سمجھانے

یہ حادثہ ”قرب قریب اس عمر کی منزل پر گردنا ہوا تھا، کیونکہ یہ نظم جس میں انشا جی نے اپنے بار بار کے عشق کا اعلان کیا ہے، اسی مجموعے میں شامل ہے جس میں انہوں نے اپنی عمر بتائی ہے۔ دو تین سال کی کمی بیشی ممکن ہے۔

صاحب کسی شخص کا اپنی عمر کے بارے میں صحیح معلومات کا اظہار کرنا بڑا مشکل ہے۔ عورتیں بدنام ہیں کہ صحیح عمر نہیں بتاتیں، مگر مرد کب بتاتے ہیں۔ بالخصوص خدا کی وہ مخلوق جسے شاعر کہتے ہیں کب صحیح عمر بتاتی ہے۔؟ شاعروں سے ان کی عمر پوچھتے تو بات نہ چنچہ سب کے سب شرما جاتے ہیں۔

شاعر جب اپنی تصویروں کے ذریعے اپنی عمر بتاتے یا بتانے کو شش کرتے ہیں تو کیسے کیسے معجزے، وقوع پذیر ہوجاتے ہیں۔ میں کسی اور شاعر کا نام نہ لوں گا۔ مجھ میں جھگڑا کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ اپنے پیارے ”دربارِ دولت بخاری کی مثال دینا ہر گز گناہ ہے پندرہ بیس برس کی عمر میں انہوں نے درجنوں کے حساب سے اپنے فوٹو تیار کروا لیے تھے اور پھر فوٹو کھینچوانے کی زحمت سے عمر بھر کے لیے فراغت پالی تھی۔ اس کے بعد چالیس، پچاس برسوں میں جس مدیر رسالہ نے بھی فوٹو مانگا۔ انہوں نے اپنی المیہ نکالی، اس میں سے ایک فوٹو کا انتخاب کیا، فوٹو کی پشت پر لکھا فارغ بخاری اور ایڈیٹر صاحب کو بھیج دیا۔ اس کو کہتے ہیں ہینگ لے نہ پٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔

اب وہ لوگ جو ان سے ملتے رہتے ہیں، ان کا فوٹو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کیجئے

ناطفہ سر بگریاں کہ اسے کیا کیجئے

خامہ اور ناطفہ جو چاہے کھتا پھرے، کہتا پھرے کہ خامہ بخاری تو یہی ہیں۔ بالکل یہی ہیں جو اس سے تیس پتیس برس

پہلے تھے۔!

لاہور ایک بہت پرانا شہر ہے۔ بہت پر رونق شہر ہے۔ اس کے مختلف مقامات ہیں اور ان مختلف مقامات کی مختلف روایات ہیں۔ میں ان مقامات کا ذکر نہیں کروں گا۔ اس تذکرے کی ضرورت بھی نہیں۔ لاہور کی تاریخ تو سنیں مکھڑا، مگر ایک مقام کا ذکر ناگزیر ہے اور اس وجہ سے ناگزیر ہے کہ یہاں ایک پیگڈا ہے اور اس پیگڈا کو یہ فخر حاصل ہے کہ لدھیانے سے یہاں وارد ہونے کے بعد انشا جی نے سب سے پہلے اس پیگڈا کو، اپنا مامن قرار دیا تھا۔

نیام پاکستان سے پیشتر یہ مقام لاہور کی ایک مشہور و معروف سڑک میکلوڈ روڈ کے ایک جانب واقع ہے۔ چوپاٹی، کہلاتا تھا۔ چوپاٹی بمبئی میں ہے اور اس بنا پر برصغیر میں شہرت رکھتا تھا کہ یہاں علمی شخصیتیں گھومتی پھرتی رہتی ہیں اور لاہور کا یہ چوپاٹی بھی علمی لوگوں ہی کا آماجگا بن رہا تھا۔ پاکستان دجو وپڑیہ ہر اتو لاہور کے باسی چوپاٹی کا لفظ قبول گئے مگر یہ اس

مقام کی خوبی ہے کہ اس نے اپنی روایت کو بدستور زندہ رکھا ہے یعنی یہاں آج بھی وہ لوگ جن کی پرچائیں ہم پر دمکریں ”پر دیکھتے ہیں، بغیر میک آپ کے ادھر ادھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے یا باتیں کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈتے ہوئے دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ جیسے جیسے شام قریب آتی جاتی ہے، اس مقام کی رونق میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس علاقہ میں نشاط سینما کے سامنے وہ عمارت کھڑی ہے جیسے یار لوگ پیگوڈو لکھتے تھے اور ممکن ہے کہ لوگ آج بھی اس پیگوڈو اسی کہتے ہوں۔

۱۹۷۷ء کے قرب و جوار میں جب انشاجی لاہور پہنچے تو لاہور کی سڑکیں اور بازاروں میں سے گزرتے ہوئے شاندار عمارتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے یہاں پہنچے اور ایک لمحہ تامل کیے بغیر اس پیگوڈو کے اندر داخل ہو گئے جیسے خراب میں کسی بزرگ نے انہیں اس عمارت کی بشارت دی تھی اور کہا تھا ”جا بیٹا! داخل ہو جا اس مکان میں مہاگ لگ جائیں گے“ انشاجی نے بزرگ کے بتائے ہوئے مکان کا نقشہ اپنے ذہن میں جا لیا تھا۔ وہ بغیر کسی کو بتائے اس کی تلاش کرتے رہے اور جیسے ہی یہ مکان ان کے سامنے آگیا تو وہ ایک لمحہ تامل کیے بغیر بس لٹک کر چلے گئے اس کے اندر۔

دیکھنے والے حیران تھے کہ انشاجی نے لاہور کے گلی کوچوں میں رتے نفسی مکان چھوڑ کر ایک پیگوڈے میں رہنا کیوں پسند کیا۔ وہ چاہتے تو لاہور کے کسی محلے میں بھی کسی بھی عالیشان مکان کا قفل توڑ کر اس کے ”الٹی“ بن سکتے تھے۔ آخر انہیں یہ کیا سوچا۔ میں نے بزرگ کی بشارت والا قصہ کیوں بتایا ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ایک شام جب میں نے اس پیگوڈو میں انشاجی کے چھوٹے بھائی سردار محسود کی لائی ہوئی چند کجریں کھا کر اوپر سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا تھا تو انشاجی سے پوچھا تھا ”آپ کو یہ پیگوڈو، کیوں پسند آیا ہے؟“

میرا یہ سوال سن کر ان کے چہرے پر ایک عجیب و غریب مسکراہٹ آگئی، ایسی مسکراہٹ جو کرشن کھنیا کے سانولے چہرے پر اس وقت پھیلی ہوگی جب انہوں نے غالباً پہلی مرتبہ رادھا کی نگہریاں مکھن چڑا یا ہوگا۔ انشاجی کی مسکراہٹ میں کچھ تقدس بھی تھا، کچھ شرات بھی اور کچھ ایسی کیفیت بھی جیسے بزبان خاموشی کہہ رہے ہوں ”یہ راز کی باتیں ہیں۔ ہر ایک کو نہیں بتائی جاسکتیں“ اور واقعی انہوں نے مجھے کچھ نہ بتایا۔ یہ میرا وجدان کہتا ہے کہ انہیں کسی بزرگ نے بشارت دی ہوگی۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ لاہور میں آنے سے پیشتر وہ جس جگہ رہتے تھے وہ بڑی بے رونق تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہا ہے۔

آج تو اپنی ایک ڈگر ہے اپنے سمجھی یاروں سے جدا

اپنا جہاں اپنا جہاں ہے یا جادو کا گنگ محل!

تو انشاجی کسی گنگ محل میں رہتے تھے۔ لاہور میں آئے تو انہوں نے سوچا کہ اب وہ کسی گنگ محل میں نہیں رہیں گے۔ ایسی جگہ رہیں گے جہاں ہر وقت شور و جھگڑا ہو اور انہوں نے یہ مکان پسند کر لیا جس کے ارد گرد سیناؤں کی ایک دنیا آباد ہے جس سے پھر دُور بھی لوگ عام انسانوں کی طرح ہنستے بولتے ہیں۔ یہ مکان پاکر وہ بہت غرض ہوتے اگر کوئی رادھا دودھا اور مکھن سے

بھری ہوئی پاٹی بھی انہیں دے دیتی تو وہ اس قدر خوش نہ ہوتے۔
 پیچوڑا انشا جی کی رہائش گاہ بن گیا تو ان کے دوستوں کے مزے ہو گئے۔ وہ یوں کہ ان کے احباب دن کے کسی وقت بھی
 اور رات کے کسی لمحے میں بھی بغیر کسی تکلف کے وہاں چلے جاتے تھے اور انشا جی ہر گز نہ دے لے کا بڑی خندہ جہدنی سے استقبال کرتے تھے،
 ان کے چہرے پر کبھی ملال نہیں آتا تھا۔ اپنے آرام کا ذرہ برابر خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کے پیچوڑا کا دروانہ ہر ایک کے لیے
 ہر وقت کھلا رہتا تھا۔

ان آنے والوں میں غایاں نام یہ تھے۔ احمد راہی، ابراہیم جلیس، حمید اختر، شیر محمد اختر اور منیر نیازی، ان میں احمد راہی اور
 ابراہیم جلیس انشا جی سے بہت بے تکلف تھے۔ باقی لوگ بہت حد تک ادب آداب ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ ان اپنا نام لکھنا تو قبول
 ہی کیا مگر میں ٹھٹھا خاموش طبع آدمی، میری موجودگی اور عدم موجودگی قریب قریب برابر ہوتی تھی۔

میں جب بھی انشا جی کو دیکھتا تھا یا دونوں کی محفل ہی میں دیکھتا تھا۔ خواہش تھی کہ انہیں کسی دن تنہا دیکھوں اور یہ معلوم
 کرنے کی کوشش کروں اور ایک دن میری یہ آرزو پوری ہو گئی۔ انشا جی جھنگکا چار پائی پر اکیلے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں ان کے پنل مٹی، لو
 ایک ضخیم سی کتاب پر ایک کاغذ بھی نظر آ رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں سے ایک مدھم سی آواز نکل رہی تھی۔ پہلے خیال آیا وہ رہے
 ہیں، پھر سوچا نہیں گارہے ہیں۔ بہر حال کچھ ایسی ہی حرکت کر رہے تھے۔ میں ایک طرف کھڑا رہا۔ چند منٹ بعد انہوں نے
 کاغذ تہ کیا اور اس سے کمرے کے ایک سوراخ میں رکھ دیا۔ اس سے فارغ ہو کر نیچے کو مٹایا، گنڈیریاں نکالیں اور مزے
 سے چونے لگے۔

گنڈیریاں سے یاد آیا کہ انشا جی عام لوگوں کی خاطر تواضع عام طور پر دو چیزوں سے کرتے تھے۔ گنڈیریاں سے یا
 کھجوروں سے۔ گنڈیریاں وہ خود بازار سے خرید کر لاتے تھے اور کھجوریں ان کے چوٹے بھائی سردار محمود۔
 احمد راہی کہتے "انشا۔ اچھے کھلاویار" انشا جی کے تیجے سے کچھ نہ نکلتا تو وہ سردار محمود سے کہتے "سردار! یہ بیچارہ
 ٹھوکا ہے لاؤ کچھ" اور جب سردار محمود ٹھوکے کے لیے کچھ لاتا تو ہمیں معلوم ہوتا کہ لٹا فٹے کے اندر کیا ہے۔ سردار محمد نے ہمیں
 کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ کھجوریں لے کو ہی آیا تھا۔

ایک روز احمد راہی نے کہا "یار خدا کے لیے آج تو کچھ اور لا"، انشا جی تاکیداً بولے "بازاریں بہت سا پھل ہے۔ وہ
 لے کر آ" اور سردار محمود چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔
 "کیا لائے" احمد راہی نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"کیے"

"اور!" ابراہیم جلیس نے سوال کیا۔

"گنڈیریاں"

"اور"

”کجوری“

اصل میں انشا جی بڑے سادا ہیں، لیکن ان کی سادگی میر تقی کی سی سادگی نہیں ہے۔ میر تقی کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ جس کی خاطر بیمار ہوئے تھے اسی عطار کے نوٹس سے دوا لیتے تھے۔ انشا جی کی سادگی اپنے رنگ کی سادگی ہوتی تھی۔ اس سادگی میں انتہائی خلوص ہوتا تھا وہ جو ہمیں گنڈیریاں کھلاتے تھے وہ ان کے خلوص ہی کی طرح میٹھی ہوتی تھیں۔ ان کے خلوص اور سادگی کا ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا ہے۔

مجھے جب ادب لطیف کے سالنامے کے لیے مضامین فراہم کرنے کی خاطر پہلی مرتبہ کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں انشا جی بحیثیت سرکاری ملازم ایک سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ اسمبلی میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ میں انشا جی کے علاوہ اور کہاں جا سکتا تھا۔

انشا جی نے سر آنکھوں پر جگہ دی، اتنا نوازا مجھے کہ ان دنوں کی یاد آج بھی میرے لیے نسیم سحر کا ہی ایک مہربان بن کر آتی ہے۔ وقت صرف کر کے ایک ایک ادیب کے ہاں لے کر گئے اور ذاتی دلچسپی لے کر مضامین کی فراہمی کا کام کیا۔ ایک دن انشا جی کے گھر پر کھانے سے فارغ ہوا تو بولے۔

”سوئیٹ ڈس لاؤ“

چند منٹ بعد انشا جی کا چھوٹا بھائی ریاض محمد ایک پلیٹ میں بہت سارے بیر لے کر آگیا۔ یہ میر سہاری اپنی میری کے ہیں، سونق فرمائیے۔“

بعد میں انشا جی نے کراچی کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں مجھے کھانے کی دعوت دی، مگر وہ بیر ان کی تو بات اور ہے!

انشا جی نے لاہور آنے ہی کسب حلال کے لیے تنگ و دو شروع کر دی تھی اور اسی تنگ و دو کا نتیجہ تھا کہ وہ لاہور ریڈیو کے نیوز کے شعبے میں بہ حیثیت مترجم کے کام کرنے لگے تھے۔ میں بھی ریڈیو سے وابستہ تھا اور ایک مدت سے وابستہ تھا۔ انشا جی لاہور ریڈیو کی پڑانی عمارت میں اسٹوڈیو کا درمیانی راستہ طے کرنے کے بعد بائیں رو کے آخری کمرے میں بیٹھتے تھے، ان کی ڈیوٹی ایک بجے شروع ہوتی تھی۔ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں فارغ ہو جاتے تھے۔ میں اس عمارت کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھ کر اپنی مخصوص ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ میرے ذمے دو کام تھے۔ ایک کام یہ کہ گانے والوں اور گانے والیوں کو ان کی مطلوبہ غزلیں اور نظمیں متیا کروں اور دوسری ذمے داری تھی ان لوگوں کا تلفظ درست کرنا، کام بڑی آسانی سے ہو جاتا تھا، کیونکہ ریڈیو میں نقل و لیس کا ایک مکمل محکمہ موجود تھا۔ ان سے غزلوں اور گیتوں کی نقلیں لے لیتا تھا۔ اور فن کاروں کے حوالے کر دیتا تھا، مگر دوسری ذمے داری بہت مشکل تھی۔ فن کار ہر روز تلفظ کے معاملے میں نئے نئے گل کھلاتے رہتے تھے اور مجھے کم و بیش روزانہ دفتر آتے ہی متعلقہ افسر کے سامنے جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ لاکھ کوشش کرتا کہ ذہنیت یکدم کدو کدو نہ کہے، مگر اس مرحوم مغنیہ کو تو نہ جانے کدو کہنے میں کیا مزہ ملتا تھا۔ ایک بار ایک نامور مغنیہ نے جو بڑی

خوش لہجہ بھی تھیں اور خوش شکل بھی اور اس وجہ سے ببل کہلاتی تھیں انہوں نے اقبال کے اس شعر میں :-

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا سے
کل تک گردش میں جس بات کے پیمانے سے

مینا کو مینا کہہ دیا، افسر نے لکھ کر جواب طلبی کی۔ میں ہر روز جواب طلبی سے تنگ آچکا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے لکھا۔
”جناب یہ گانے والی ببل کہلاتی ہے اور ببل کو مینا سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں ہم صغیر ہیں۔ اس لیے انہوں نے مینا کو مینا
کہہ دیا۔“ توقع تھی افسر اعلیٰ کی جس ظرافت ضرورتاً ضرورت ہوگی اور مجھے کمرے میں بلا کر داد دی جائے گی۔ غرض غرض بیٹھا تھا کہ چڑھا
نے جواب طلبی کا کاغذ میرے سامنے رکھ دیا۔ آدھے صفحے پر لکھا تھا WHAT -

وہ توخیر ہوئی کہ اس افسر کے بھی بڑے افسر کراچی سے آکر ان کے کمرے میں رونق افروز ہو گئے۔ اور معاملہ دب گیا ورنہ اس
WHAT کا کیا جواب دے سکتا تھا۔؟

اس قسم کی تلخیاں زندگی میں آتی ہی رہتی ہیں اور ایسے موقع پر انشا جی کا دم بہت غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ میں بڑی بے صبری
سے ایک بجے کا انتظار کرتا اور ادھر گھڑی ایک بجے کا اعلان کرتی میں بیڑھیوں سے نیچا ترنے لگتا۔

انشا جی یلڈو کمرے میں داخل ہر رہے ہوتے یا داخل ہو کر جیب سے قلم نکال کر اس انگریزی تحریر کو بخور دیکھ رہے ہوتے
جسے وہ اُردو میں منتقل کرنے والے تھے، مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مسکراتے اور حسب معمول پوچھتے ”کیا حال ہے؟“ اس کے
بعد گفتگو بھی ہوتی رہتی اور وہ ترجمہ بھی کرتے رہتے۔ یہاں شکل یہ تھی کہ انشا جی ہر روز نہیں آتے تھے ہفتے میں غالباً چار دن آتے
تھے۔ باقی دنوں میں مختار صدیقی یا خلیل احمد ترجمے کا کام کرتے تھے۔ ایک دن میں دیر سے نیچے پہنچا۔ انشا جی اکیلے بیٹھے تھے ظاہر ہے
کام ختم کر چکے تھے اور نیوز ریڈر ریز کا ترجمہ لے کر اسٹوڈیو میں جا چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے بہت سے کاغذ کے چھوٹے
بڑے چمڑے پر پڑے ہیں اور وہ پڑوں کے اس ڈھیر سے ایک ایک پرزہ اٹھاتے ہیں اور غور سے دیکھ کر دوبارہ وہیں رکھ دیتے
ہیں۔ انہیں ایسے پڑوں سے کیا تعلق ہے۔ اور مجھے یک لخت یاد آ گیا کہ ایک بار انہوں نے تنہائی کے لمحوں میں ایک کاغذ کا پرزہ
کمرے کی دیوار میں بھی محفوظ کر دیا تھا۔ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہو سکتا جسے وہ تنہائی میں دل بہلانے کے لیے کھیلتے ہوں۔ یہ تو ان کا کوئی
رانہ ہے۔ میں نے دل میں سوچا اور اس واقعہ کو کئی روز گزر گئے اور یہ راز اس وقت کھلا جب ایک شام ان کی زبانی اس بات کا علم
ہوا کہ وہ اپنی نظم کاغذ کے پورے صفحے پر نہیں لکھتے وہ کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھتے ہیں اور یہ ٹکڑے وہ جمع کرتے جاتے ہیں۔ آخری مصرع یا
شعریا بند آخری ٹکڑے یا چمڑے پر ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا۔

”آپ نے ابتدا کی رات سات برسوں میں لکھی ہے؟“

”ہاں لکھی ہے!“

”تو کیا سات برس تک آپ یہ چمڑے جمع کرتے رہے؟“

”نہیں پُرانے پُرزے پھاڑتا رہا اور ان کے بجاتے نئے پُرزے داخل کرتا رہا“
 ”داخل کہاں کرتے رہے؟“
 ”جہاں پُرانے پُرزے ہوتے تھے“
 ”یعنی کمرے کی دیواروں میں“

”ہاں، دیواروں میں، جیبوں میں، صندوقوں میں، بجکوں میں“
 حیرت ہے انشا جی کو کیسے یاد رہتا ہے کہ فلاں پُرزہ اُنھوں نے فلاں جگہ محفوظ کیا ہے۔
 اب تو وہ شاعری سے بہت دور چلے گئے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھی ہیرا پھیری کر لیتے ہیں، مگر اب کالم نگاری کی وجہ سے
 ان کی پُرزہ بازی کی عادت میں پہلی سنی بات اعلیٰ باقی نہیں رہی۔
 پُرزہ بازی ہی کا ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد ہے۔

اوپر لطیف کے سانس کے لیے مضامین کی فراہمی کے سلسلے میں جب پہلی مرتبہ کراچی گیا تھا تو انشا جی نے اس
 معاملے میں میری بہت مدد کی، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ میرا سارا کام اُنھوں نے ہی کیا تھا۔ آخری دن جب میں لاہور آنے کی
 تیاری کر رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ میرے معزز میزبان نے لوگوں سے مضامین تو لے دیئے ہیں خود کچھ نہیں دیا تو پوچھا۔

”انشا جی آپ کی نظم!“

”مال گئے۔ کیا ضرورت ہے۔ کافی تعداد میں بہت اچھی چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔“

”تاہم آپ کی چیز تو لازماً ہونی چاہیے۔“

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر اُٹھے۔ جانے کہاں سے ایک سیاہ رنگ کا بیگ لے آئے اسے کھولا۔ ایک رومال نکالا، رومال
 کھولا اور میرے اور ان کے درمیان کاغذ کے پُرزوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔
 ”رات نقل کروں گا صبح مل جائے گی“

”بہت اچھا“

صبح ناشتے کی میز پر اُنھوں نے میرے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندہ تھا دیا۔ ان میں پوری نظم درج تھی اور یہ وہی نظم
 تھی جو ”چاند نگر میں مصافحات“ کے عنوان سے شامل کی گئی ہے۔

حالی نے مرزا غالب کو ”حیرانِ ظریف“ کہا تھا۔ یہی رائے انشا جی کے بارے میں بھی دی جاسکتی ہے۔ مزاحیہ کالم تو وہ
 کچھ برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ اکثر و بیشتر خود کو حیرانِ ظریف کہلانے کے حق بجانب تھے۔

مثلاً ایرونی مدریں مغربی پاکستان کے اہلِ قلم مشرقی پاکستان کے عوام سے روابطِ محبت قائم کرنے کی خاطر ڈھاکہ گئے تھے تو
 انشا جی نے دو معرکے کی باتیں کہی تھیں جو اسی وقت مشہورِ خاص و عام ہو گئی تھیں۔

مغربی پاکستان کے تمام اہلِ قلم کو ایک ایسی عمارت میں مٹھرایا گیا تھا جس میں سپاس کمرے تھے اور کچھ مدت پہلے یہاں

ارکانِ اسمبلی رہتے تھے۔

ہر کمرے میں دو دو ادیبوں کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔

ایک روز انشا جی نے بتایا: ”جس کمرے میں مجھے قیام کرنا تھا وہ مقفل تھا۔ چوکیا رکو بکایا گیا کہ تالا کھول دے۔ وہ فوراً سپاس چاہیوں کا گھالے کر آ گیا۔

پہلی چابی لگائی گئی۔ بے کار ثابت ہوئی۔ دوسری چابی کو آزمایا۔ وہی نتیجہ نکلا۔ تیسری چابی بھی اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ یہاں تک کہ انچاس چابیاں تالے کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ آخر جب سچا سوہن چابی لگائی گئی تو تالا کھل گیا۔

”تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتے رہے؟ کسی نے پوچھا۔

”مزے کا تماشا تھا دیکھنا رہا۔“

یہ بات یار دوستوں نے مزے لے لے کر ایک دوسرے کو سنائی۔

ناصر کاظمی مرحوم اور پروغیسر شہرت بخاری میں گاڑھی چھینتی تھی۔ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے اور ایک ہی کمرے میں فروکش تھے۔ ایک دن کسی نے ان کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”اس میں کون لوگ رہتے ہیں؟“

انشا جی نے جواب دیا۔

”یہاں اردو ادب کے نزاکت علی سلامت علی رہتے ہیں۔“

انشا جی اپنے ذاتی معاملات میں بڑے موٹے موٹے پردے ڈالے رکھتے ہیں۔ کیا مجال جو یہ پردے معاملات کے کسی ایک گوشے سے بھی ہلک جائیں۔ اگر کوئی بے تکلف دوست انہیں مٹانے کی ذرہ برابر بھی کوشش کرتا ہے تو ایک لمحہ تامل کیے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔

ایک دن یارانِ سربل میں ان باتوں کا ذکر ہوا تھا جو شیخ سعدی نے گلستان کے بابِ پنجم میں لکھی ہیں۔

”انشا جی کچھ آپ بھی؟ کسی نے کہا۔

”کیا کروں!“

”زلفت کی، رخسار کی باتیں کریں۔“

انشا جی جھینپ گئے، مگر کافی مدت بعد ہم رائٹر گلیڈ کی دعوت پر کراچی کے حبیس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ابھی ابھی ڈائننگ ہال میں کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ انشا جی کے اندر کوئی پٹرا سلا رجنڈہ ایکالہی جاگ اُٹھا، اور وہ کہنے لگے۔

اس مکان میں مرن ہم دو آدمی رہتے تھے میں اور محمد حسین — میں تعلیم کے لیے وہاں مقیم تھا اور محمد حسین بظاہر نوکر تھا، مگر اصل میں بے تکلف دوست تھا۔ اور بے تکلفی کے باوجود بڑی محبت سے میری خدمت کرتا تھا۔ مجھے کسی قسم کی

تکلیف بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ کچھ دنوں سے وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی دالہ و شیدا ہو گیا ہے۔ ایک رات چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ میں نہ سو سکا۔ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ نہ جانے مجھے یہ خیال کیوں ستانے لگا کہ آج اس مکان میں دو کے بجائے تین آدمی موجود ہیں۔ یہ عیسوی ہستی کون ہے یہ سوال میرے ذہن میں بے قرار تھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سیڑھیوں پر چاندنی کچھ پڑا سرار سے اشارے کر رہی تھی۔ میں اوپر چلا گیا۔ اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جو بالعموم بند رہتا تھا۔ محمد حسین نے گھر کا بے کار سامان اس میں ڈال رکھا تھا اور چونکہ اس سامان کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی، اس لیے اس کا دروازہ ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں قفل نہیں تھا حیرت ہوئی آج یہ قفل کے بغیر کیوں ہے؟ اچانک میرے قدم دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ دروازہ کھولا اور اندر دیکھا، ایک ٹوٹے ہوئے ٹرنک کے اوپر ایک لڑکی گھور گھور کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، مگر ایک اجنبی کو دیکھ کر ان میں حیرت اور خوف کی کوئی کیفیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ محمد حسین ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑا ہے۔ انشا جی نے بات یہیں تک سنائی تھی، اور مسکرا کر قصۂ ختم کر دیا تھا۔ اُن کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ ”دوستو! تم جو چاہو سوچو، مگر ہماری ترداد میں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”دامن چوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں“

اور میں فرشتوں کو وضو کرتے ہوئے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا، مگر وہ رہ کر خیال آ رہا تھا انشا جی نے ضرور کوئی کرتب دکھایا ہے۔

یہ لڑکی جس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں، آئی کہاں سے تھی کیا عجیب اتفاق ہے۔ مثنوی سحرالبیان کا ہیرو بے نظیر لکڑی کے گھوڑے پر اڑتا اڑتا بدترین کے مکان میں داخل ہو گیا تھا۔ یہاں یہ بڑی بڑی آنکھوں والی حسینہ نہ جانے کس طریقے سے کس ذریعے سے انشا جی کے گھریں آ گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ انشا جی نہ ہیک کے بجائے واقعے کی جزئیات کا خیال کرتے مثلاً کہتے،

برس پندرہ ایک سائنس و سال

مہابت حسین اور صاحب جمال

مگر انھوں نے تو مکان کی صورت نگاری اور محمد حسین کی سیرت نگاری پر سارا زور بیان صرف کر دیا اور اصل واقعہ چند منٹ میں مساکر زبان حال اعلان کر دیا تھا۔

”ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے“

اس معاملے میں انشا جی سے بہت کچھ سننے کی تمنا تھی، مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، انھیں بہر صورت ان فرشتوں کی نیاؤں ٹھوکتی ہے جو وضو کرنے کے لیے ہر وقت ان کے دامن کو دیکھتے رہتے ہیں۔

انشا جی نے اپنی ذات پر بڑے دبیز قسم کے پردے چڑھا رکھے ہیں اور جی ان پردوں کو ہٹانے کی کبھی ضرورت ہی

پیش نہیں آئی، کیونکہ وہ ان کے پردوں کے باہر ہی ظری خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کر لیتے ہیں۔ ہم مجھول جلتے ہیں کہ پردوں کے پیچھے کیا ہے۔ آخر معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

مجھے انشارجی سے ایک شکایت ہے اور اس کا اظہار میں نے ان سے کبھی نہیں کیا۔ وہ بہت اچھے مزاحیہ کالم لکھتے ہیں اور آج کل اسٹی کالموں کی وجہ سے ہر جگہ ان کی آواز جھگت ہوتی ہے۔ ہر جگہ سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔ یاروں کو توقع ہوتی ہے کہ انشارجی کبھی ان کا ذکر بھی اپنے کسی کالم میں کر دیں گے۔ یہ سب کچھ ہے، مگر وہ شاعر ابن انشاء کم ہو گیا ہے جس نے بغداد کی ایک رات، ”جیسی لازوال نظم لکھی تھی۔ اور جس نے یہ بھی کہا تھا۔

کل چڑھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا

کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرہ لڑا

اور یہ شعر بھی تو اسی ابن انشاء نے کہے تھے۔

دل نے ہمارے بیٹھے بیٹھے کیسے کیسے روگ لگائے

تم نے کسی کا نام لیا اور آنکھوں میں اپنے آنسو آتے

جتنی زبانیں اتنے فتنے اپنی آدمی کے کارن کے

لیکن لوگ ابھی تک یہ سادہ سی پہلی بوجھ نہ پاتے

اور میں بھی تو یہ سادہ سی پہلی بوجھ نہیں پایا کہ شاعر ابن انشاء مکمل طور پر مزاح نگار انشاکویں بن گیا ہے۔ کیسے ستم ظریف آدمی ہیں۔ بیٹھے بٹھائے ابن بطوطہ کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں، مگر اس نسبت بوطیقا کا ذرہ برابر خیال نہیں کرتے جو مسلسل ان کا تعاقب کر رہی ہے۔

انشارجی کو ان کی شاعری کی طرح میں نے جڑا خوبصورت آدمی پایا ہے۔ نہایت خلیق، نہایت مہر واد اور مر سجاں مرغ آدمی۔ ایک خاص خوبی جو میں نے ان میں دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ کسی پر احسان کرتے ہیں تو ہلکے سے اشارے سے بھی اس کا ذکر نہیں کرتے۔ کسی پر احسان کر کے وہ اسے بالکل مجھول جاتے ہیں یہ خوبی اس وسعت کے ساتھ میں نے اور کسی شخص میں نہیں دیکھی۔

خلوص اور محبت ان کا شیوہ ہے۔ گھر میں کسی کو نہیں بلانے۔ مگر اپنے دفتر میں ہر آنے والے کو کشادہ پیشانی سے ملتے ہیں اور اس انداز سے اس کی پذیرائی کرتے ہیں جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔

انشارجی کے بارے میں یہ بات وثوق اور اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور وہ یورپ کے کسی چشمے پر نہیں پہنچے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے دادی کو نہیں مجھولے۔ دادی کے پانی کی خصوصیت بھرپور خلوص ہے اور یہ پانی ان کی رگوں میں آج بھی حالص کا حالص ہے۔ یورپ کے چشموں کا آب زلال انھیں اپنے اندر جذب نہیں کر سکا، اور نہ کبھی کر سکے گا۔

(یہ مضمون ابن انشاء کی زندگی میں لکھا گیا)

ایک خوبصورت انسان

محمد طفیل مدیت نقوشے

پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً گلاب کا پھول، اس ایک پھول کے سورتگ ہیں۔ یہی حال شخصیتوں کا ہے، انسان ایک ہے مگر اس کے رُوپ سو، کہاں کہاں انسان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بس اسی نازک سے فرق کے اظہار کے لیے میں بھی کبھی کبھی قلم اٹھا لیتا ہوں۔

میں عموماً اپنے خاکوں کے عنوان متعین نہیں کرتا کیونکہ عنوان تجویز کر لینے کا مطلب یہ ہر اک آپ نے شخصیت کو جان لیا پہچان لیا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا اس کے باوجود میرا دل چاہتا ہے کہ آج کی زیر بحث شخصیت کو ایک عنوان کے تحت کہوں۔ اگر یوں سوچوں تو میرے اس مضمون کا عنوان ہو گا: ایک خوبصورت انسان!

اگر خوبصورت کا معیار چہرہ بہرہ ٹھہرے تو پھر میرزا صاحب خوبصورت انسانوں میں شامل نہ ہو سکیں گے۔ اگر معیار ہلکی اوصاف ہوں تو پھر کسی کو میرزا صاحب کے برعکس قرار دے دیتے۔ مقابلہ محسن خوب ہو گا۔

میرزا ادیب کے ڈراموں کے ایک نمونے کا نام ہے خاک نشین۔ خاک نشین اس کتاب کا ایک ڈرامہ ہے جو کہ ایک مدرس کے گرد گھومتا ہے۔ جو قربانیں کا مجتہد ہے جو انسانیت کی معراج ہے۔

جب میں نیا زعلی کو دار کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے وہ نیا زعلی نہ ہو، ولاد زعلی ہو جسے زیادہ تر لوگ میرزا ادیب کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ ڈرامہ نگار جس کی اپنی زندگی میں کوئی ڈرامہ نہیں جو دھیرے دھیرے زندگی گزارنے کا چلن جانتا ہے۔ جو خاموش رہاؤ کچھ نہ کہو کی عبادت میں مصروف نظر آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مخوڑی دیر اس کے پاس بیٹھیں کچھ اپنی کہیں کچھ اُن کی سنیں۔

رسالے کے مدیر کا کام، دوسروں کے مضمین حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جب کوئی مجھ سے مضمون مانگتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اب کے لام مسجد کے اپنے گھر میں مولود شریف ہو گا کیونکہ مولوی حضرات دوسروں کے گھروں ہی میں مولود شریف پڑھنے کو ڈاب کا کام جانتے ہیں۔ اداست کو بھی میں ایک بے ڈھنگا ساشل گردانتا ہوں یعنی طعنے پہنچے دو اور طعنے پہنچے لو۔ مگر اس کے ساتھ اوٹ پٹانگ سی حرکت یہ کرتا ہوں کہ خاکے لکھتا ہوں۔ جس کا خاکہ لکھا یہ جان کر لکھا کہ درست ہے مگر عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب خاکہ حاضر کرتا ہوں تو تعلقات غائب ہو جاتے ہیں۔

خدا گواہ ہے میں خاکے لکھتا نہیں جانتا۔ تنہا میں اگر توڑے سے خاکے ضرور لکھوں۔ اس کے بعد جو مجھ سے خاکہ لکھواتی ہوئی ہے وہ میرے لیے پریشانیوں کا باعث ہوئی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دوست اصرار کرتے ہیں کہ خاکہ لکھو میں ان سے کہتا ہوں: بھئی نہ

لکھواؤ۔ دوستی کو کیا ب چیز جانو، مگر کوئی ماننا ہی نہیں، کہتے ہیں جو چاہو لکھو۔ مگر میں چاہتا ہوں۔ وہ نہیں لکھتا تو کبھی دوست ناراض ہو جاتے ہیں۔ کیا کروں؟ مجھ سمیت آج تک ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا۔ جسے آئینہ دیکھنے کا سلیقہ ہو۔

میں نے آج تک جتنے دوستوں کے خاکے لکھے ان کے ساتھ خاصی رعایت برتی۔ مثلاً دوستی کے صدقے میں جو بیکور ہوتے ہیں انہیں پروفیسر بنا دیتا ہوں۔ جو پروفیسر ہوتے ہیں انہیں پرنسپل بنا دیتا ہوں۔ خود ہی بتائیں، اس سے بھی زیادہ لفظی ترقیاں کیسے دوں۔؟

خاکہ نویسی بڑا مشکل فن ہے یعنی خدائی حدود میں قدم رکھنے کو خاکہ نویسی کہتے ہیں۔ مثلاً جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہے عین میں اس کے اظہار کو خاکہ نویسی جانتے۔ ایک طرف یہ تلقاض، دوسری طرف مراسم کا چھندا، کوئی کیا کرے کیا نہ کرے۔!

ان حالات میں اگر میں میرزا ادیب صاحب کی شخصیت پر مضمون لکھوں گا تو بے شک میرزا ادیب صاحب مجھے قطعاً قلعہ نکریں گے۔ مگر ان کی خاموش گفتگو، پر سے پر سے سہنے والی قربت، میری زندگی کو اجین بنا سکتی ہے۔

میں نے ایک مضمون منٹ پر لکھا تھا وہ مجھے اچھا لگا کیونکہ منٹ کی زندگی دھوپ ہی تھی۔ دھوپ چھاؤں ہی چھاؤں۔ اس کا دل مومن تھا، دماغ کافر، وہ وضو کا اخلاقاً قائل تھا۔ اسٹن کا عادتاً، وہ تیرنے کا قائل نہ تھا۔ ڈوب جانا ان کے مزاج کا خاصا تھا۔ وہ شریعت آدمی بھی تھا۔ وہ ممد بھائی بھی تھا۔

اب اپنے میرزا ادیب کی سنیے۔ یہ اول تا آخر شریف آدمی ہیں شرافت کی بھی آخری حد پر جہاں شریف کم نیک زیادہ ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ خود میرزا ادیب صاحب کو بھی اپنی شرافت کا حدود ادب معلوم نہیں، اگر معلوم ہوتا تو ادب لیاٹی کا دعویٰ کر چکے ہوتے۔ پنجابی میں ایک محاورہ ہے ”مبولے بادشاہ“ کا، میں نے صرف محاورہ سنا تھا مگر بھولے بادشاہ کو دیکھا نہ تھا۔ اپنے محلے میں ڈھونڈا، اپنے سکول میں ڈھونڈا، اپنے بازار میں ڈھونڈا، مگر مجھے بھولا بادشاہ نہ ملا۔

جب میں نے ادب کی وادی میں قدم رکھا تو مجھے بھولا بادشاہ مل گیا۔ وہ کون؟ وہ اپنے میرزا ادیب اور کون؟ میں ادبوں اور شاعروں میں ”بھولے بادشاہ“ کم دیکھتا ہوں۔ مگر دیکھے مزدور ہی! نام کو لانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ میں مضمون میرزا ادیب پر لکھ رہا ہوں! بہر حال میں نے میرزا ادیب صاحب کا قلمی زائچہ بنایا ہے۔ دیکھیں گے کہ لفظی ستارے کیا کہتے ہیں۔

میرزا ادیب نے شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا سکول کے زمانے میں شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ پہلے عاصی تخلص لکھا پھر ادیب۔ اسی کے بعد میرزا ادیب بن گئے۔ بہر حال اس وقت مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ یہ شاعر تھے۔ نائب ہو کر ادیب بنے۔ اسکول کے زمانے میں جو انہوں نے پہلی نظم لکھی اس کے ایک دو شعر آپ بھی سن لیں۔ طبع آزمائی کی تھی بکری پر، ایک شریف ابلج قسم کا جادو! بہر حال شعر سنیں،

میں نے دیکھی ہے آج ایک بکری دودھ دیتی ہے گھاس کھاتی ہے

پیارے میرے پاس آتی ہے جب پکڑتا ہوں بھاگ جاتی ہے

میرزا صاحب نے بکری پر نظم کیا لکھی کہ اپنی ساری زندگی اس نیک مرشد مخلوق کی طرز پر گزار دی۔ ذبح کر ڈالے ذبح ہر

جائیں گے۔ نام دلا دے مگر دلا دی سے کوئی رشتہ نا طہ نہیں۔

چشیت ادیب ان کا مرتبہ خاصا اُونچا ہے۔ ہزاروں لکھنے والے ان کے قلم کی سحر آفرینیوں سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ اِنڈانہ
 ملاحظہ ہو۔ صرف ایک پیرا جو انھوں نے اپنی آپ بیتی حسرتِ تعمیر میں لکھا ہے۔
 ”ماضی تو ہمارے لیے ایک الٹا تودہِ برت ہے جس کا صرف ایک حصہ سمندر کی سطح کے اوپر دکھائی دیتا ہے اور باقی اس کا سارا
 وجود نیچے گہری اور منجمد تاریکیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھ کر یہ تودہِ برت ہے جو ہر آن غیر محسوس طور پر اپنا آپ پانیوں
 میں گم کرنا رہتا ہے۔ وقت کے سمندر میں ماضی کا بڑے سے بڑا سپاٹ بھی چپ چاپ نیچے ہی نیچے ڈوبنا رہتا ہے۔“
 یہاں ایک سوال یہ ذہن میں آجھرتا ہے کہ آخر انھوں نے اپنی آپ کا نام حسرتِ تعمیر ہی کیوں تجویز کیا۔ وہی بات کہ ہر بات
 میں قنوطیت، قنوطیت بُری چیز ہوگی مگر یہ وصف ہر شریف آدمی کا مقدر کیوں؟

ادب میں دو تین میرزا پہلے بھی گزرے ہیں۔ ایک میرزا غالب دوسرے میرزا بیگانہ، اور بھی میرزا ہوئے ہوں گے مگر ہمارا کام
 دو تین میرزاؤں کے حوالے سے بھی پل جانے گا۔ میرزا غالب جو تھے وہ ہر چیز کا روشن پہلو ہی سامنے رکھتے تھے۔ قنوطیت نام کی چیز
 نہ تو ان کے کلام میں ملتی ہے۔ اور نہ ان کے افعال میں وہ تو ایک دبدبے کے آدمی تھے۔ چومکھی لڑتے تھے اور سی نہ کرتے تھے۔ میرزا
 بیگانہ جو تھے وہ چنگیزی تھے۔ وہ بھی اپنے جلال اور تند غمی کی بنا۔ پر خاصے بدنام تھے۔ بلکہ نیک نام تھے۔ ہر وقت انگارے ان کی
 زبان پر رہتے۔ بھڑا دوسرا دُنیا سے وہ تیار۔ مگر یہ اپنے میرزا صاحب کیسے میرزا ہیں؟ پہلے میرزاؤں کی بھی اپنی نرم روی، اپنی
 صلح جوئی کی بنا۔ ہر ناک کٹا کے رکھ دی۔!

منا ہے میرزا صاحب اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں، جب یہ بات پھیلی اور میرزا صاحب کی بیگم نے ذرا نیوروں کے ساتھ
 میرزا صاحب سے باز پرس کر ڈالی کہ یہ کیا تم میرے خلاف پراپیگنڈہ کرنے رہے ہو؟ ”تو میرزا صاحب کا مذہبیانہ جواب یہ تھا۔ ”عج
 کی ماں! میں کوئی آپ سے ڈرتا ہوں، جو لوگوں سے کہوں گا کہ ڈرتا ہوں۔“

میرزا صاحب اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں یا نہیں، اللہ جانے یا میرزا جانے مگر انھیں بیگم سے محبت ہے بے پناہ۔
 جب وہ ایک بار بیمار ہوئیں۔ شدید بیمار تو بیگم سے زیادہ یہ خود بیمار نظر آنے لگے۔ چوبیس گھنٹوں کی بجائے پچیس گھنٹے
 بیمار داری کی۔ چوبیس گھنٹے سب کے سامنے۔ ایک گھنٹے عالم خیال میں دعائیں مانگ مانگ کر بیگم کو عالم بالا سے واپس لے ہی آئے قدرت
 کو ان کی پیسا پر پیار آ گیا۔

ایڈیٹروں کے مَدِمان بڑے شہر ہیں۔ کچے سچے کچے بھوٹے۔ بہر حال یہ برادری اس میدان میں نیک نام ضرور ہے! اپنے میرزا صاحب
 کو بھی ادبِ لطیف کی ایڈیٹری کے پہلے ہی دن عشقِ قسم کی چیز لاحق ہو گئی تھی۔ واقعہ انہی کی زبانی سنئے :
 جب تک آدمی جاگتا رہتا ہے دن بھر کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں اور میرے ذہن میں بھی مناظر آتے
 تھے اور چلے جاتے تھے۔ اسی اشار میں دفتر کا خیال آ گیا اور اس خیال کے آتے ہی وہ دیوانہ لاجپور آنکھوں تلے پھر گیا۔ چند لمحے ہی تو
 اُسے دیکھا۔ چند لمحوں میں کوئی کسی کو کیا دے سکتا تھا۔ مگر یہ چہرہ میرے سامنے آیا تو میں اُسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی گوجی تھی۔ جہاں کے کئی افسانوں کا کردار بنی۔ قصہ یہ ہے کہ ان کے عشق کے ساتھ کئی نہ کئی ٹریڈی

مزدور ترقی رہتا ہے۔ یہ میرا گمان ہے، یہ میرا مشاہدہ نہیں۔

میں نے لغوش، اکا کوئی خاص مہذب چھاپا۔ بڑے غرض سے میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ رسالے کی ورق گردانی کرتے رہے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب انہیں مندرجات وغیرہ سے رسالے کے معیار کا اندازہ ہو گیا ہو گا تو میں نے دریافت کیا کیسا رہا پرچہ؟ ان کا جواب یہ تھا۔ ”ٹائٹل اچھا ہے۔“

میں اس تبصرے پر تھلا کے رہ گیا۔ کچھ کہنے میں سکتا تھا۔ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ جو نیر اور سمیٹر کا معاملہ تھا۔ کرنا خدا کا یہ محو اک کچھ حصہ کے بعد یہ ادب لطیف کا سالنامہ لے کے آگئے۔ مٹا میرے ذہن میں ان کا وہ فقرہ آن دھمکا۔ دل نے کہا کاش میرزا صاحب بھی مجھ سے پوچھ لیں کہ پرچہ کیسا ہے؟ چنانچہ انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ ”پرچہ کیسا ہے؟“ میں نے اپنے ذہن کا بوجھ ملکا کر ڈالا۔ ”اس کا ٹائٹل بھی اچھا نہیں“ ایسی چیلیں اپنی جگہ، مگر جب میں اسکول میں پڑھتا تھا، ان دنوں دو رسالوں کی بڑی دھرم مٹی۔ ایک رسالہ نیرنگ خیال، دوسرا ”ادب لطیف“ یوں تو رسالے اور بھی بہت سے تھے۔ سہاریں، شامکار، ادبی دنیا، عالمگیر یہ سب رسالے اپنی جگہ قدر قیمت رکھتے تھے۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں کہ مجھے ان سب رسالوں میں نیرنگ خیال اور عالمگیر اور ادب لطیف سے دلچسپی تھی، یا ادھر نیراز فچتری کے ”نگار“ سے۔

نگار کیوں پسند تھا؟ وہ اس لیے کہ نیا زنتہا ایسا شخص تھا چوکھی اور سستا تھا۔ پھر اس کے قلم میں جادو تھا۔ نیرنگ خیال مجھے اس لیے پسند تھا کہ اس کی پالیسی میں وہ اعتدال تھا جو سب کے لیے قابل قبول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے اہل قلم کی شاہکار رنخیریوں اس میں چھپیں۔

’ادب لطیف‘ کا گردیدہ اس لیے تھا کہ وہ نقیب تھا مستقبل کا۔ جنم دانا تھا اس تحریک کا۔ ادب لطیف نے ذہنوں کو شعور بخشا تھا ادب لطیف نے حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ ادب لطیف نے ادب کو گل و بلبل کے پیکر سے نکال کر دار و سن تک کی ضرورت کا احساس دلا دیا تھا۔

پہلے پہل وہ راستہ میرزا ادیب نے ہی دکھایا تھا خود راہیں کاٹی تھیں۔ خود لہو لہاں ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں آنے والے اس راستے پر ذرا نہ چلے مگر ابتداء میں ادیب ہی نے اپنی خون سے سنبھلی تھی۔

یہ ضروری نہیں کہ جو لہو اگھائے وہ اس کا پھل بھی کھائے۔ بے شک کچھ کاریگر لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پودا ہی اس نیت سے لگاتے ہیں کہ پھل بھی خود کھائیں گے۔ ان میں ایسی ہوشمندی ہے ہی نہیں۔ یہ تو دوسروں کی ہوشمندیوں کا نشانہ بنتے آئے ہیں۔ یہ شخص تا اس لیے کھاتا ہے کہ دوسرے اپنی فتح مندلیں کے جھنڈے گاڑ سکیں۔ یہ شخص پیچھے اس لیے ہنستا ہے تاکہ دوسرے آگے بڑھ سکیں۔ یہ سرخسان مرغی قسم کا شخص جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے اردو ادب کا دیوتا ہے اور مجھ ایسے کئی اس کے بچپاری۔!

میرزا صاحب ٹوڈ کے آدمی ہیں۔ مگر ٹوڈ ہمیشہ مائل شپ ٹرسنگ ہی ہوتا ہے۔ وہ مواقع کم آتے ہیں کہ جیسے مژدہ بولے نے کفن ای مچاڑے کہتے ہیں۔ مگر بات یہ بھی نہیں کہ صرف درگزر کے پیغمبر ہوں۔ ٹوڈ بڑھری بات کہتے ہیں اور دھڑلے سے کہتے ہیں۔ خواہ مگر کچھ لیتے لیٹھیاں ہی جھولی میں کیوں نہ پڑھائیں۔

ایک شاعر نے ایسے ہی موقع پر ایک شعر کے بارے میں کہہ دیا کہ ان کی ترقی کا راز عورتیں ہیں کہ جنہیں زینہ بنا کر باہر شہرت تک پہنچے۔

اس وقت میرزا صاحب کا مفہوم نہ جانے کیا تھا۔ کوئی مبالغہ ہی ہو گا اس لیے کہ میرزا صاحب بشر پند انسان نہیں۔ غالباً ان کا مفہوم یہ ہو گا کہ مشہور گانے والوں نے ان کی غزلیں گائیں اور وہ بامِ شہرت تک پہنچے۔ یہ فقرہ ان کی زبان سے ادا ہونا تھا کہ زندگی بھر کے لیے ٹھن گئی وہ خفا یہ میراں !

مندرجہ بالا حوالہ تو ایک دوسری ہستی سے متعلق ہے۔ ایک واقعہ اس فندی سے متعلق بھی ہے کئیے تو وہ بھی سنا دوں؟ دوسروں ہی کی بات کیوں؟ اپنی کیوں نہیں؟

تفصیل یہ ہے کہ میرزا صاحب کے ذہن میں کوئی بات بیٹھ جائے تو پھر آپ کی نہیں سنیں گے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ان کے ذہن میں یہ بیٹھا دے کہ خدا نہیں ہے تو پھر انھیں خدا بھی قائل نہ کر سکے گا۔ سچے اور سچے ہیں، بس خدا نہیں ہے تو نہیں ہے۔ ایک میٹنگ میں مختلف مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی اور وہ گفتگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔ اُس دن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرزا صاحب زندگی بھر کی باتیں مجھ سے آج ہی کہیں گے۔ میں چپ، میں حیراں !

پھر وہ معاملہ ایجنڈے میں بھی نہ تھا۔ بھلا ایک خاتون کا معاملہ ایجنڈے میں کیسے آسکتا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک خاتون لاہور نسیم کی شے نے ان کے کان بھر دیئے چنانچہ یہ مناظرے کے لیے تیار! میرزا صاحب کی ایک ادا یہ بھی ہے کہ یہ صنفِ لطیف کو جھوٹا سمجھ ہی نہیں سکتے۔

اپنا ایمان دارانہ خیال یہ ہے کہ اس صنف کی نو ساری شان ہی لگائی بچھائی میں ہے۔ اس وصف کو نظر انداز کر دیجئے گا، یا چہلوں کا مارچ نہ دیجئے گا تو پھر عورت، عورت نہ رہے گی مرد بن جائے گی۔

میں کہتا تھا ”میرزا صاحب معاملہ تو ہیں“

میرزا صاحب کہتے تھے ”بھلا خاتون جھوٹ بول سکتی ہے“

بہر حال! میں نے یہ کہا تھا۔ خاتون یہ کہتی تھی۔ اس بحثا بہشی میں کافی وقت گزر گیا میں نے تنگ کر، بطور قصہ کوناہ یہ کہا ”میرزا صاحب! اس عورت سے میرا نکاح ہو سکتا ہے اور نہ آپ کا، پھر یہ بخوار کیسی؟ اس پر میرزا صاحب لجا کر مسکرا دیئے اور بہت سا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

میرزا صاحب عموماً چائے پینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر اصرار کیا جائے تو ایسی لجاجت سے منتیں کرتے ہیں۔ جیسے ان سے چائے کے لیے نہیں بلکہ شراب کے لیے کہا جا رہا ہو۔

ایک دن تشریف لائے۔ میں نے کسی سے چائے لانے کے لیے کہا۔ انھوں نے پھر منت آ میرزا انداز میں انکار کر دیا۔ میں نے کہا ”آج تو چائے پلا کے چھوڑ دوں گا“

میرزا صاحب نے مضاحبت کی ”میں صبح سے تین کپ پی چکا ہوں“

میرا جواب یہ تھا ”آپ کو چوتھا کپ بھی پینا پڑے گا“

اگر نیور خطرناک ہوں تو پھر میرزا صاحب میدان میں نہیں ٹیکھے۔ مطلب یہ کہ چوتھا کپ پینا پڑتا ہے۔

میرزا صاحب فطرتاً قزطی ہیں، اعلیٰ پائے کے قزطی، طور اور غنہ بہ وقت مسلط۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے کے چکر میں، مگر کبھی کبھی اپنے اوپر خوش دلی کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں۔ پھر اتنے قہقہے لگاتے ہیں کہ مجلس میں سب سے اُدکے قہقہے اس صحرانورد کے ہوتے ہیں۔

”موتوں میں تو یہ بھی کہتے ہیں۔ اُمٹو میسیٰ! آج تھیں عیش کراؤں“

”عیش؟“

”ہاں عیش!“

چنانچہ کسی ہٹل میں لے جائیں گے۔ بیرے سے کہیں گے ”سوسے لاؤ“

بیرا پچھے گا ”کتنے؟“

میرزا صاحب کا جواب یہ ہوگا کہ ”ایک تو میں کھاؤں گا (پھر مخاطب سے) آپ کتنے؟“

ایسے ہی ایک موقع پر ایک چہلی دوست نے کہہ دیا۔ ”ہیں!“

”اگتھ بیس؟“ یہ صحیح ہے کہ مجھے ریڈیو اسٹیشن سے ۲۵ روپے کا چیک ملا ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اگتھ بیس

سوسے کھا جاؤ“

میرزا صاحب کے لیے وعدہ الیغائی زندگی کا ایک چلن ہے جس کی تکمیل ضروری چاہتے ہیں کہ جو وعدہ کیا جائے اُسے پورا کیا جائے خواہ اس کے لیے زحمت ہی کیوں نہ اُٹھانی پڑے۔ وہ اس راہ میں ہر قدم پر نہایت قدم!

مجھ سے انھوں نے ایک بار وعدہ کیا کہ ایک ہفتہ تک مضمون پہنچا دوں گا۔ جب وہ دن آیا تو اس دن لاہور میں کرنیو اور مارشل لاہ دونوں ہی تشریف فرما تھے۔ بقول غالب جرنیلی بندوبست تھا۔ خوف و ہراس کی اس فضا میں چند گھنٹوں کے لیے کرنیو میں ترمی برقی جاتی تھی تاکہ جس کا کوئی مرگیا ہے وہ اُسے دفنا دے یا جسے زندہ رہنے کے لیے کوئی ضروری چیز خریدنا ہو تو وہ خرید سکے۔

دیکھا کہ میرزا صاحب موجود، بڑی خوشی سے ہنسیکھ رہے۔ کہا وعدہ کر رکھا تھا۔ کرنیو کی پابندی نرم ہوئی تو مضمون لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔

میں نے کہا کہ ”بھائی! مضمون پھر آ جاتا۔“

کہا ”وعدہ کر رکھا تھا“

اس دور میں ایسے لوگ کیا ہی ہیں۔ جو اپنی ذات میں اتنے گڈ وہوں۔ گڈ وہا لفظ میں نے گڈ کے خاندان کا ایک رشتہ دار جان کر لکھا تھا۔ ویسے یہ پیار میں گڈ وہ اپنے ترا سے کو کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں عمر کے اتنے فرق کے باوجود دونوں میں لمبا چوڑا فرق نہ ہوگا، دونوں کی خواہشیں چھٹی چھٹی، دونوں کی آرزوئیں معصوم معصوم!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرزا صاحب کرنیو اور مارشل لاہ میں بھی مضمون لے کر آگئے۔ ظاہر ہے کہ اس مومن پر گفتگو بھی

ہونا تھی سو ہوئی!

ہم لوگ جو ادیب ہوتے ہیں عجیب ہوتے ہیں ”ہم میں سوائے ہم کے باقی خیر ہی خیر ہے ہم آتے ہیں تو فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔
مرستید احمد خان اتنے بڑے آدمی تھے کہ شاید بائبل، پاک و مہند کی تاریخ میں مسلمانوں کے جیسے دو چار ہی تو پائے آئے۔ ان میں ایک
مرستید احمد خان !

قوم نے ان پر لاکھوں روپے بچا کر کیے پائی پائی انھوں نے بھی قوم کی بہبود پر صرف کر دی جب انتقال ہوا تو کفن کے لیے کوڑی
تک نہ تھی۔ نواب محسن الملک نے مرستید احمد خان کو آخری پسندہ ”کہہ کر پچاس روپے دیئے تاکہ کفن و دفن کا انتظام ہو سکے۔
ان تو صاحب، ملک کی موجودہ فضا پر بات ہوئی۔ بیچ میں قصہ اور نکل آیا ایک وہ مند ادیب کا اس لیے کہ ادیب ماحول
سے بے نیاز ہو کر نہ ادبی طور پر زندہ رہ سکتا ہے اور نہ جسمانی طور پر وہ بُرے حالات میں گھٹتا ہے اور گھٹتا ہی رہتا ہے۔
”یار مسجد میں گھس کر مسلمانوں کو مارا گیا یہ نقد دو گھر گئے۔“

”بھائی ! وہ واقعہ بھی سنا کہ میکلوڈ روڈ پر ایک دفتر کو آگ لگا دی گئی کئی لوگ جھرم جھرم ہو گئے۔“

ہم بغیر دروغایت اور بغیر کسی پارٹی کی طرف داری کے ”انسان پارٹی“ کے طرفدار تھے۔

جو کئی مرد ہاتھ وہ کسی کا باپ تھا، بیٹا تھا، بھائی تھا۔ اور ان سب سے ملدا رشتہ تھا۔

یہ سب ہنگامہ کیوں؟ مارشل لا کیوں؟ ہر ایہ کہ ملک میں انتخابات ہوئے، ایک پارٹی نے کہا ”ہم نے الیکشن جیت لیا“ دوسری
نے کہا دھاندلی ہوئی۔ ”نینجہ بینکاکر لوگ مٹر کوں پر نکل آئے۔ گولیاں کھانے لگے۔“

ایک طرف حکومت ہے دوسری طرف حزب اختلاف کرسی پر نظر دوڑوں کی ہے۔ مگر انسان کے خون پر نظر کسی کی بھی نہیں مسلمان کا
خون ہمیشہ سے ستارا ہے اس دور میں بے حد ستا ہے۔ سنا ہے خون کا سب سے بڑا بیوہ پارسی امریکہ ہے۔

خون سے یاد آیا اور ایک قصاب نے بتایا کہ وہ قصابی جو منڈی میں روز بکرے ذبح کرتا ہے وہ چار پانچ برس کے بعد اندھا
ہو جاتا ہے، پھر دوسرا قصابی آتا ہے وہ بھی چار پانچ برس کے بعد اندھا ہو جاتا ہے۔

میں نے پوچھا ”بھئی کیوں؟“

”خون دیکھ دیکھ کر!“

پھر اُس نے یہ بھی بتایا کہ ہر قصابی کی آخری عمر بڑی کمپرسی میں گزرتی ہے۔ چار پائی پرائیڈیاں رگڑ رگڑا کر گزرتی ہے، مگر
اُس کی جان نہیں نکلتی۔

میں نے مزید معلومات کی خاطر پوچھا۔ بھائی! سارے قصابیوں کا تو یہ حال نہ ہوتا ہوگا؟

اس نے بتایا کہ جو سارے قصابیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ مرنا چاہتے ہیں مگر مر نہیں سکتے۔ وہ قصابی اس حال سے نہیں گزرتا
وہ لوگوں کی نصرتوں کا نشانہ نہ بنتا ہے۔ اور خاندان کا ایک ایک فرد اُس سے نفرت کرتا ہے۔ انجام بہر حال یہ خیر نہیں ہوتا۔

انہو! میں تو مسنون کہہ رہا تھا میرزا ادیب پر جو اتنا زقیق القلب ہے کہ ایک چوڑی کے گلے پر بھی چھری نہیں پھیر سکتا، مگر ذکر
ان نکلا خون کا، قصابی کا، آپس میں کیا مناسبت؟ کیا تنگ، دیکھا جائے تو دنیا میں کسی بات کی تنگ ہے، جو یہاں تک کہ پریشانی ہی

مثلاً ہوا جائے۔ اس دور میں ہر شخص کے ہاتھ میں پھری ہے۔ چاہے وہ کوئی ہو، دکاندار ہو، دفتر کا باجوہ ہو، کارخانہ دار ہو، مزدور ہو، گدی نشین ہو، کرکشی نشین ہو۔!

یہ تو مجھ کا ماضی بڑا شاندار تھا آج کل ایک بہت بڑی کٹھالی میں پڑی ہے۔ گمزن بننے سے پہلے مجھ سے ہونا پڑتا ہے حکیم بدین کیا ہم مجھ سے ہونے کے عمل سے گزر رہے ہیں؟

جس طرح بڑے لوگوں سے اچانک کی اُمید نہیں ہوتی، اُسی طرح اچھے دوستوں سے بُرائیوں کی توقع نہیں ہوتی۔ بہر حال میرزا ادیب ایسے دوست ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان سے بُرائی کی توقع رکھنا ایسے ہی ہے، جیسے پانی کو آگ لگانا۔ صرف اسمبلیوں کے الیکشن نہیں ہوتے۔ رائٹرز گِلڈ کے بھی الیکشن ہوتے ہیں بالکل اسی بنیادوں پر جن بنیادوں پر اسمبلیوں کے الیکشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے بھی الیکشن لڑا تھا۔ میں نے ”مرکزی اسمبلی“ کا، میرزا صاحب نے ”صوبائی اسمبلی“ کا۔

حریت عجیب نکلے، یعنی ہر حرکت ردا، ہر حرکت ایمان، چونکہ وقت گزر چکا ہے اس لیے میں گڑے مردوں کو نہ کہوں گا کہ اُنٹھو اور بیان دو چونکہ الیکشن کے ایک واقعہ سے میرزا صاحب کے کردار کا واسطہ ہے اس لیے بیچ بچا کے عرض کروں گا۔

ہمارے الیکشن کے دنوں میں مخالف فریق نے ایک نیک حرکت یہ کی کہ میرزا صاحب کی طرف سے اخباروں میں ایک بیان نکلا دیا کہ میں یعنی میرزا ادیب رائٹرز گِلڈ کی مجلس عاملہ سے مستعفی ہونا ہوں اس لیے کہ وہ اندلیاں ہو رہی ہیں۔

یہ خبر اخباروں میں چھپی چونکہ میں سیکرٹری جنرل کا اُمیدوار تھا اور میرزا ادیب ایسے غمخس ارکان نے مجھے اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ انتخاب لڑوں اس لیے یہ خبر بڑی حیرت سے پڑھی گئی جس نے پڑھا اُس نے مجھ سے ہم دردی کی اور میرزا صاحب سے شکایت۔

سب سے کہنا۔ ”یہ خبر مخالف فریق کی طرف سے چھپائی گئی ہوگی، چونکہ میرزا صاحب کی ذات پر اعتماد تھا، اس لیے میں قدرے مطمئن تھا اور میرے سامنے سارے پریشان! چنانچہ ملے پایا کہ اُنٹھو اور میرزا صاحب سے چل پوچھیں۔

جب ہم میرزا صاحب کے ہاں پہنچے تو وہ بے شک پریشان تھے، اُنھوں نے کہا کہ ”مجھے اس بات سے بھی دکھ ہوا کہ میرزا صاحب سے ایک غلط خبر چھاپی گئی اور اس وقت مجھے اس بات کا بھی دکھ ہوا کہ دوستوں کو میرے خلوص پر شبہ ہوا۔“

میرزا صاحب بہت پیدل چلتے ہیں۔ یہ عادت اُن کی صحت کا باعث بھی ہے اور روپے پیسے کی بچت کا بھی۔ یہ ایک آدھ میل پیدل نہیں چلتے، بلکہ میلوں میل اور چل سوجھ!۔

عمر ما یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس مارچ میں ان کا کوئی ساتھی بھی ہو۔ جو لوگ جانتے ہیں کہ میرزا صاحب چلا کے بلکان کر دیتے ہیں وہ سیر کے نام پر بھی کتنی کاٹ جاتے ہیں۔

ایک دن ایک نیا شخص پھنسا، اتفاق سے وہ میرا دوست بھی تھا اس کی حالت کافی غیر متحی، میں نے پوچھا ”خیریت؟“

کہنے لگے۔ ”میرزا صاحب نے سیر کرا دی“ میں معاملہ بھانپ گیا۔ پھر بھی خوشامی کے لیے پوچھا۔ ”آخر کینے لگے۔“ میرزا صاحب بھائی گیٹ کے چوک میں مل گئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی زور کا نعرہ لگا یا۔ ”اُخا۔ اُخوب ملے۔“ مجھے آپسے ایک ضروری کام تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا کام؟“

کہنے لگے: میرے ساتھ چیتے بتانا ہوں، میں ان کے ساتھ ہریا۔ جب ہسپتال کے پاس پہنچ گیا تو میں نے عرض کیا: "خیریت آپ نے پوچھ لی۔ مالی حالت کے بارے میں آپ نے استفسار کر لیا، کھٹے کھانے کے متعلق آپ نے دریافت فرمالیا۔ اب، تو بتا دیجئے، آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟"

ابھی بتاتا ہوں، ابھی بتاتا ہوں۔ کہتے ہوئے پھر ساتھ لے لیا، جب میں میکروڈروٹ کے پاس جا کر ٹک گیا تو میں نے کہا، پہلے کام بتا دیجئے پھر آگے چلوں گا۔ تو میرزا صاحب نے مجھے گھسیٹتے ہوئے کہا بس ابھی بتانا ہوں۔ ساتھ ہی نکتہ یہ بھی سمجھا یا کہ آپ کا یوں رکنا اور میرا اس طرح گھسیٹنا بہت سی غلط فہمیاں کا باعث بن سکتا ہے۔ چنانچہ میں میرزا صاحب کی باتوں میں پھر آگیا اور چلتا چلا گیا۔ چلتے چلتے جب ریڈیو سٹیشن قریب آگیا تو میرزا صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملا دیا۔

میں نے ہنسا لگا ہوا ہرک پوچھا: کیا مطلب؟

میرزا صاحب کا جواب یہ تھا: بس مجھے یہیں تک پہنچنا تھا۔

میرزا ادیب صحیح معنی میں ادیب ہیں۔ اس ملک میں کوئی شاعر ہے اور کوئی افسانہ نویس اور مضمون نگار مگر ادیب برائے نام ہیں، میں ادیب اُسے سمجھتا ہوں جو نگارش کی، عمدہ اصناف پر حاوی ہو۔ جیسے غلام رحیل، مہربا، نیاز فتح پوری۔ میں یہاں مرتبوں کی بات نہیں کر رہا، جہتوں کی بات کر رہا ہوں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرزا ادیب مکمل ادیب نہیں ہیں۔ اس لیے کہ شاعر نہیں ہیں میرزا ادیب یہ ہے کہ میرزا ادیب شعر کہہ سکتے ہیں، مگر نہیں کہتے بالکل اسی طرح جس طرح بعض شاعر شعر نہیں کہہ سکتے مگر کہتے ہیں۔

میرزا ادیب کیا ہیں اور ان کا ادبی مقام کیا ہے؟ اس کا اندازہ اچھے سمجھنے والے یا جاسکا۔ ابھی تو اندازہ انہی ادیبوں کا لگایا جا سکتا ہے جو سرکار و دربار میں صاف رکھتے ہیں۔ یہ دوران کا ہے یہ دور میرزا ادیب کا نہیں۔ کیونکہ سچے ادیب کا المیہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کا تعین، ان کی موت کے بعد ہوتا ہے۔

میرزا صاحب کو زمانے بھرے شکایتیں ہیں شکایتوں کا ایشا رہ ملکا نہیں ہو رہا، بلکہ بھاری ہی ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی کچھ کہے، میں تو ان کو شکایتوں میں حق بجانب ہی پاتا ہوں اس لیے کہ زمانے نے ان کو یاد کیا ہے۔ یہ اس دور میں غلط نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ زمانہ کسی کو بھی اس کا حق نہیں دیتا۔ یہ دور تو اپنا حق بزور منولنے کا ہے۔ یہ دور مانگنے کا نہیں، چھین لینے کا ہے۔ یہ دور انکاری کا نہیں، ملنے کا ہے۔ جو یہ کچھ نہیں کہہ سکتا وہ میرزا ادیب ہی جاتا ہے۔

ویسے میرزا صاحب بھی عجیب آدمی ہیں انھیں اکثر عجائب گھر میں جاتے دکھایا گیا ہے۔ یاروں نے ٹوہ لگائی آخر یہ عجائب گھر جا کر کیا کرتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ اس ہال میں پہنچ جاتے ہیں جہاں مہاتما جی کے مجھے پڑے ہیں۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ رحمت کے سامنے بت بنے بیٹھے ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آخر آپ یہاں اتنا زیادہ کیوں آتے ہیں؟ تو ان کا جواب تھا کہ "مجھے یہاں سکون ملتا ہے" آخر ایک دن مہاتما جی کا مجھ سے بول ہی پڑا۔ ہرکے تو میرے رحمت کو اٹھاؤ اور مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں مجھے بھی سکون مل سکے۔

حباب آسا

ڈاکٹر انور سدید

مجھے جب کبھی میرزا ادیب کے پیر کو نفلوں میں مقصور کرنے کا خیال آتا ہے تو وہ مجھے ہمیشہ ایک مسموم بچے کی صورت میں ہی نظر آتا ہے۔ یہ مسموم صورت بچہ صابن کی جھاگ سے بیلے بنا کر مسلسل ہوا میں اڑا رہا ہے۔ جلد فضا کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے تو اس پر مسرت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے وہ زور زور سے تاباں ہوتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق بہت اونچا پرواز کر رہی ہے اور اس کے ہمسرا کی رفتوں پر انکشت بندناں میں لیکن جو نہی کوئی بلبلہ ہوا کا اندرونی دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور جھاگ کے پایلے میں ہی مسموم ہو جاتا ہے تو اس پر ایسی اور شرمندگی کی اتنی ہی شدید کیفیت طاری ہو جاتی ہے پھر وہ دوتا ہے سبوتا ہے، اپنی تخلیق کی ناکامی پر ہنسنے لگتا ہے اور اپنے معاصرین کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا، رعبن اوقات بودہ جھاگ سے بلبایاے کو بھی توڑ ڈالتا ہے۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ میرزا ادیب کے بارے میں یہ تاثر کیوں کر پیدا ہوا اور اس کے پس پشت کون سے محرکات پوشیدہ تھے تاہم اس تاثر کو اتنا دوام حاصل ہے کہ اب اس کے بغیر میرے ذہن میں میرزا ادیب کی تصویر مکمل نہیں ہوتی اور یہ تصویر سے یکسر مختلف ہے جسے میں نے اپنے لڑکپن میں مرتب کیا تھا اور جس کا اجمالی تذکرہ آگے آئے گا۔

میرزا ادیب کو جب میں نے پہلی دفعہ پڑھا تو میں دسویں جماعت کا اسمان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا یہ میری زندگی کا وہ روحانی دور تھا جب خواب زندگی کی دہلیز سے آگے کا منظر دکھاتے ہیں لیکن حقیقت دہلیز سے آگے جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں اس وقت طلسم ہر شربا داستان امیر حمزہ، قصہ چہار دردیش اور گل بکاؤلی وغیرہ کا مکمل کر چکا تھا۔ زندگی کا کوہِ نداجھے اپنی طرف ہل رہا تھا اور میں اس سے آنکھیں چرا کر ٹوٹے ہوئے تارے اور طلسم خیال کی سحر انگیز حدِ حایت میں پناہ تلاش کر رہا تھا۔ اس منزل پر میری ملاقات میرزا ادیب کے لازوال کردار معرا نور سے ہوئی تو گویا پائیل کے صحرائے مجھے ایک چشمہ صافی مل گیا۔ قدیم داستانوں کے افوق الفطرت ماحول سے نکل کر میں ایک ایسے نخلستان میں آ گیا تھا جہاں خواب بنتے اور بکھر جاتے، بیلے ہوا میں پرواز کرتے اور ٹوٹ جاتے، تپنگیں اڑتیں اور پہنائیوں میں گم ہو جاتیں۔ سچی بات یہ ہے کہ معرا نور کے خطوط میں آندھوں کے بننے اور بگڑنے کی جو جھلک کیفیت ہے اس نے مجھے ایک عجیب سی ذہنی آسودگی عطا کی تھی چنانچہ میں نے ادب لطیف کے وہ سب پرچے ڈھونڈ نکالے جن میں یہ خطوط شائع ہوئے تھے اور پھر انہیں بار بار پڑھایا، اعترافِ حقیقت پر مبنی ہے کہ قدیم داستانوں کے گنم مضیفین کے بالمقابل میرزا ادیب وہ آدیں زندہ مصنف تھا جس نے میرے نگر و خیال پر سب سے پہلے شب خون مارا اور پھر ایک طویل عرصے تک اپنے صحرائے امیر رکھا۔

اس دور میں میرزا ادیب کی ایک خیالی تصویر میرے ذہن کی سطح پر خود بخود نقش ہونا شروع ہو گئی، اب جبکہ میں میرزا ادیب کو متعدد مرتبہ مل چکا ہوں اور اس کے خد و خال اپنی اصلی صورت کے ساتھ مجھے یاد ہو گئے ہیں تو میں اس قدیم تصویر کو دوبارہ زندہ نہیں کر

سکتا۔ لیکن اس اظہار میں مجھے تامل نہیں کہ جب انڈس ہوٹل میں ڈاکٹر وزیر آغا کے کمرے میں میری ملاقات پہلی دفعہ میرزا ادیب سے ہوئی تو میں ایک عجیب قسم کے احساس شکست سے دوچار ہوا۔ اس وقت جس میرزا ادیب سے میں مل رہا تھا وہ ملاشبہ صحرائورد کے خطوط کا خالق تھا لیکن میں نے جو تصویر صحرائورد کے خطوط کو پڑھ کر مرتب کی تھی وہ حقیقی اور گوشت پوست کے میرزا ادیب سے بالکل مختلف تھی۔ وہ خیالی نقش جو میں نے اپنے ذہن میں مرتب کر رکھا تھا بے حد خوبصورت تھا لیکن جو میرزا ادیب اب میرے سامنے انکسارِ لجاجت اور محبت کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا وہ تو خود مجھ سے مرعوب نظر آتا تھا اور اس خیالی تصویر کے پائے بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں جس مایوسی سے دوچار ہوا اسے شاید میرزا ادیب بھی کبھی سمجھ نہ پائے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا ہوگا کہ صحرائورد کے خطوط کا مصنف کس طرح اپنے قاری کو ایسے کرچکا تھا۔ اور اسی تاثر نے مجھے مختلف اوقات میں اس کی طرف بڑھنے کا موقعہ دیا۔

اب یہاں اس واقعے کا تذکرہ میر ضروری معلوم نہیں ہوتا جسے پڑھ کر آپ پہلے بھی ٹھوڑا سا مسکرائیں گے اور پھر میرزا ادیب کی طرف اسی حیرت سے دیکھیں گے۔ جیسے آج کل کچھ ادا و ادبہر جاوید کی طرف دیکھتے ہیں تاہم اس واقعے سے مجھے میرزا ادیب سے اپنی قربت اور موانست کا تذکرہ کرنا ہے اس لئے میں اس کے اظہار کے لئے پیشگی مندرت پیش کرتا ہوں کہ مقصود اس سے ترک محبت ہرگز نہیں ہے ہوا یوں کہ میرے ایک دستِ شیخ اعراف اختر کو بھی میری ہی طرح ادب کا پیکا لگا ہوا تھا لیکن اس کی دلچسپی کی جہت قدرے مختلف تھی شیخ اعراف اختر ادب سے زیادہ ادبوں سے تسکینات بنانے اور ان سے خط و کتابت کرنے پر دلچسپی رکھتا تھا چنانچہ وہ ہر دوسرے جو مجھے کسی مشہور و معروف ادیب کو عاجزا رہا خط لکھتا، ہمیشہ انتظار کرتا اور جب کسی جانب سے بھی جواب نہ آتا تو مایوس ہو جاتا۔ اعراف اختر کے سوا خط میں نسوانی رنگ موجود تھا اس لئے میں نے اسے مشورہ دیا کہ لڑکیوں کو خط لکھو پھر دیکھو محبت کا جواب کتنی جلدی آتا ہے۔ اعراف اسے یہ تجویز اچھی لگی اور اس نے نجم العالیہ راز کا نقاب اڑھ کر میرے محبوب مصنف میرزا ادیب کو بھی ایک خط لکھ ڈالا جو تھے روز میرزا ادیب کا جواب آ گیا اس خط میں التفات اور شفقت کی ایک خاص نہایت موجود تھی جس سے ہم دونوں متاثر ہوئے اور اس کا بغف اٹھاتے رہے۔ اس حوصلے پر نجم العالیہ راز نے یکے بعد دیگرے کئی خطوط میرزا ادیب کو لکھے اور سلوک کی کئی منزلیں سیٹھم زدوں میں طے کر ڈالیں آج شیخ اعراف اختر زندگی کی دوڑ میں خدا جانے کہاں سرپٹ دوڑ رہا ہوگا لیکن نجم العالیہ راز کے خطوط اب بھی محفوظ ہیں اور ان ادیبوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جنہوں نے مریم زبانی بیگم اور طاہرہ دیوہی شہزادی جیسی خواتین سے اظہارِ بے تکلفی کر کے اس خیالی خواتین کو بھی ادب میں حیات و دام دے دی تھی میں بلا تامل عرض کرتا ہوں کہ میرزا ادیب سے پہلی ملاقات ہوئی تو نجم العالیہ راز کا خیالی پیکر بھی میرے سامنے موجود تھا مجھے میرزا ادیب اس پیکر کے سامنے بالکل اجنبی اور بے جوڑ نظر آیا تاہم میں نے سوچا کہ میرزا ادیب اگر اس اجنبی خاتون کو خطوط نہ لکھتا تو مصوئیت کا یہ پیکر میرے سامنے کیونکہ مجسم صورت اختیار کرتا جو حسن کی ایک ازلی اور ابدی جھلک دیکھنے اور صرف ایک روشن کرن پکڑنے کے لئے بھڑکی بھڑکی صحرا صحرا بھٹک رہا تھا حسن کا جو یا تو میرزا ادیب کے داخل میں موجود تھا اور یقیناً خوبصورت ہوگا۔

میرزا ادیب کو روحانی تحریک کی آخری آواز قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے روحانی تعمیل آفرینی کو داستان کے فنی قرینے سے پیش کرنے کی کوشش کی، اردو ادب میں داستان کو مانوق الغطرت عناصر کا مرتع کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جب خواص کے لئے تفریح کا اور کوئی سامان نہیں تھا تو داستان گوئی سے فنی عیاشی کا کام لیا جاتا تھا۔ میرزا ادیب کی داستانوں میں بھی صحرائیگری اور تخیل کو تو پورا عمل و عمل

حاصل ہے تاہم اس نے چونکہ داستان کہنے کا فریضہ بیسویں صدی میں سرانجام دیا ہے اس لئے وہ اس دور کے حقیقی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکا میرزا ادیب کی داستان زندگی کی موجودہ حقیقتوں کے اثبات کا اظہار میں اور غیر دشر کی ازلی وابدی آویزش، پابند اور مجبور انسانوں کی جبر و اور آزادی کے لئے مربانی وغیرہ اس کے اساسی موضوعات ہیں، بلاشبہ میرزا ادیب نے فن کے جمالیاتی اظہار کے لئے روح کی بے کراں دستوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی، تاہم اس نے صحرانورد کا کردار جو اس کی سپراگلو کا منظر ہے اس عمدگی سے تخلیق کیا کہ اب اس کردار کی روح زنان وکان کی دستوں پر حاوی نظر آتی ہے۔ اس سب کے ساتھ میرزا ادیب کے تخیل نے غربت اور امارت، ملوکیت اور غلامی کی توحیت کو ابہت دی اور اس کے تضادات کو ابھارنے کے لئے ایک ایسی دنیا تخلیق کی جو بے حد پراسرار ہے اور جس میں بیا ہونے والے واقعات و حادثات قاری کو روحانی سُر سے سہکنا کر دیتے ہیں، بیسویں صدی کے عشرہ چہارم میں، میں اسے میرزا ادیب کی بہت بڑی کامیابی تصور کرتا ہوں۔

پروفیسر عرش صدیقی نے لکھا ہے کہ میرزا ادیب نے ایک مغرب گھرانے میں آنکھ کھولی اور جب زندگی کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے قابل ہوا تو اس نے اپنے حیاروں جانب دکھوں اور مصیبتوں کا ایک سمندر پایا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ میرزا ادیب کی روحانیت و حقیقت اس کی غربت اور ازلی محرومی ہی کا رد عمل ہے اس کے ہاں حین خوابوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے، آفتوں کو پالنے، ہم آرائی کرنے اور تخیل کی دنیا میں کھولے رہنے کا رجحان غالب ہے۔ اس کی دو کتابیں صحرانورد کے خطوط اور صحرانورد کے زمان میرزا کے اسی اساسی رد عمل کا منظر ہیں صحرانورد جو بقول وزیر آغا حرکت و عمل کی علامت ہے، شاید میرزا ادیب کی اپنی شخصیت کا خیالی عکس ہے عرش صدیقی نے اسے میرزا ادیب کے تخیل کی خارجی اور مادی صورت قرار دیا ہے۔ فطرت کے اصول تلافی کے تحت کردار میرزا ادیب کی بہت سی محرومیوں کا ازالہ کرتا ہے اور اسے ان محاربات تخیل میں کامرانی حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو اس کی نئی زندگی میں کبھی نہیں آئے اور کبھی آئے ہیں تو میرزا ادیب نے ان کا مقابلہ ڈٹ کر کھلے میدان میں کبھی نہیں کیا اس ضمن میں یہ واقعہ حیرت انگیز نہیں ہو گا کہ ایک دفعہ میرزا ادیب نے ایک ادبی مجلس میں قلیل شغلی پر قدرے سچا خاکہ پڑھا اب حقیقت تو یہ ہے کہ میرزا ادیب ہزار کوشش سے بھی تلخ معنوں لکھیں تو اس میں ملاٹ اور شیرینی کی آمیزش ضرور موجود ہوتی ہے لیکن قلیل شغلی کو اس کا یہ صادق انداز بھی پسند آیا اور کچھ اس انداز میں لکھا کہ میرزا ادیب نے فوری منذرت میں ہی عافیت سمجھی چنانچہ میرزا ادیب کا یہ سچا خاکہ آج تک شائع نہیں ہوا خدا جانے نقصان و وزعی کا ہوا ہے یا عصمت چغتائی کا میرزا ادیب رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری کی حیثیت میں سالانہ انتخابات کا اہتمام کر رہے تھے۔ تو میں نے مبینہ و حاندیوں کے پیش نظر بعض انتظامات پر اعتراض کیا۔ میرزا ادیب کو میرا خط ملا تو وہ پریشان ہو گئے اور مجھے جواب لکھا کہ میں اس خط کو پڑھ کر ساری رات سو نہیں سکا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے فی الفور لاہور آنے اور بالمشافہ گفتگو کا مشورہ دیا سہاؤ نقوی صاحب نے ایک دفعہ ترقی پسند تحریک سے میرزا ادیب کی ملیحدگی کا تذکرہ "ادراق" میں لکھا تو میرزا ادیب نے ترقی پسندوں کے سیاسی کردار کی وضاحت کی اور یہ بھی لکھا کہ ترقی پسند ادبا پاکستان کے جھنڈے کو سلام کرنے سے سگریزاں تھے اسی وجہ سے میرزا نے اس تحریک سے ملیحدگی اختیار کر لی میرزا ادیب کا یہ بیان اتنا اہم تھا کہ اسے ادراق میں چھاپنا ضروری سمجھا گیا۔ لیکن خطا چونکہ مجھی تھا اس لئے سہاؤ نقوی نے اس کی اجازت طلب کی تو میرزا ادیب گھبرا گیا اور لکھا کہ اس سے خوف فساد خلق پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ میرزا ادیب کا یہ خط "ادراق" کے دفتر میں ابھی تک محفوظ ہے اور اسے زلزلے کی ہوا نہیں لگ سکی ان واقعات سے میرزا اس بیان کی توثیق پوری طرح جو جاتی ہے کہ میرزا ادیب خواب تو خوش اسلوبی سے بنیتے ہیں لیکن حقیقت کا سامنا نہیں کر پاتے یہ انسانی کمزوری ہے لیکن میں اسے میرزا ادیب کی

شرانیت سے منسوب کرتا ہوں۔ میرزا ادیب کی روحانیت میں فاصلے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ تصور کو قریب سے دیکھنے کے بجائے اسے دور سے دیکھتا ہے اور پھر موجود اور ناموجود کے درمیان دقت کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے وہ موحود کی غربت اور نہرِ ناکی کو اجاگر کرنے کے لئے ماضی کے شاندار محلات استوار کرتا ہے اور ان کے گرد روشنیوں اور سایوں کا جال سا بن جاتا ہے۔ اس لحول میں میرزا ادیب نے جن کرداروں سے زندگی کی لہر پیدا کی ہے ان کے نام بھی رومانی ہیں اور یہ حجاب امتیاز علی کے کرداروں کی طرح نامانوس ہیں۔ چنانچہ سمیرا، پاشا، بابا جزی، سمارٹ، جوشی اور مہری وغیرہ ایسے کردار ہیں جنہیں میرزا ادیب کے تخیل نے جنم دیا ہے تاہم فاری ان کے اعمال و حرکات میں گہری دلچسپی ضرور محسوس کرتا ہے اور میں اسے میرزا ادیب کا کمال سمجھتا ہوں کہ اس نے تخیل کے جادے حقیقت سے ملادینے میں

میرزا ادیب کی داستانوں کی محرک قوت محنت ہے محنت پوری داندہ خیالی سے حسن کو حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے اور عقل کو بلا لٹے طاق رکھ کر کند انگنی پر اتارتا ہے یہ بھی ملحوظ رہے کہ میرزا ادیب کی داستان نگاری میں "صحرا" خود بھی ایک روحانی کردار ہے اس میں بہت اور عظمت ہے اس کی خاموشی محیر العقول اور اس کی گویائی تھیر آفریں ہے یہ موت اور زندگی کے ساتھ مسلسل آنکھ پھولی کھیل رہا ہے اور تاری پر نہ صرف رعب جلال قائم کرتا ہے بلکہ اسے اکثر اوقات خوفزدہ بھی کر دیتا ہے۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ فاصلہ جب تک قائم رہے یہ خوف اور تھیر بھی قائم رہتا ہے لیکن جوہنی فاصلہ مٹ جاتا ہے تو تھیر حتم ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات خود مصنف پر نفرت اور خوف طاری نظر آنے لگتا ہے۔ یہ رویہ خالصتاً رومانی ہے، چنانچہ میرزا ادیب زیادہ تر انہیں دو نہایتوں پر سفر کرتے ہیں، کبھی شدید محبت اور کبھی شدید ترین خوف اور نفرت۔

میرزا ادیب کے ماں دو مندی کا احساس نمایاں ہے بالخصوص داستان کے مظلوم کرداروں کی عکاسی میں میرزا ادیب کا قلم قاری کے جذبات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے جس دور میں میرزا ادیب نے یہ داستانیں لکھیں وہ ہر طبقے کے محبوب مصنف شمار ہوتے تھے، اور بعض لوگوں نے تو آزادی کے احساس کو بیدار کرنے میں میرزا ادیب کے افسانوں اور داستانوں کو بھی بالواسطہ طور پر محرک قوت شمار کیا ہے اس دور میں میرزا ادیب اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ ان کی پہچان ہی صحرا اور د کے خطوط سے ہونے لگی، عرش صدیقی نے دہشت لکھا ہے کہ اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگوں میں جب میرزا ادیب کے بعض اعلیٰ افسانوں کا ذکر کیا تو اکثر لوگوں نے ان سے واقفیت ظاہر نہیں کی لیکن جوہنی انہوں نے صحرا اور د کا نام لیا تو ان کی زبان سے فوراً میرزا کا نام اور کلمہ "اے تحسین ادا ہونے لگے۔ میرزا ادیب کی اس رومانی مقبولیت سے انکار ممکن نہیں، ادب میں یہ مراج بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ میرزا ادیب کی رو ماریت اکتسابی نہیں بلکہ خود اس کی فطرت سے چوٹی ہے، تحسین فراقی صاحب نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ میرزا ادیب کا خاندان پرانی رسوں کا بڑی طرح ایسے تھا اس کا باپ کبھی مدرسے نہیں گیا والدہ پڑھی لکھی نہیں تھی باپ جتنا سخت گیر تھا ماں اتنی ہی نرم دل اور نیک خو تھی۔ یہ دونوں تضاد دھارے میرزا ادیب کی ذات میں جمع ہو گئے تو باپ کے خلاف ایک مضبوط قسم کی رو مانی بنادت پرورش پانے لگی لیکن جب بھی اس بنادت کے اظہار کی صورت پیدا ہوتی تو ماں کی فطری صلاحیت اس پر شکنم بکھر دیتی۔ میرزا ادیب کے فن پر یہ دونوں زاویے پوری طرح جلوہ مکن ہیں، اس کی ذاتی زندگی بھی ان دو کناروں میں پابند آب جو کی طرح بہ رہی ہے اس کی پوری دراشت اسے آگے بڑھنے اور فتح یاب ہونے پر آمادہ کرتی ہے چنانچہ وہ آرزوؤں کی صدا پر بے اختیار پیکتا

چلا جاتا ہے لیکن جب حوادث سامنا کرتے ہیں تو شفقت مادی اسے پیپائی پر مجبور کر دیتی ہے اور وہ راستہ بدل کر دوسری گلی میں داخل ہو جاتا ہے چنانچہ دیکھئے کہ میرزا ادیب کے ہاں مسلسل سلگنے اور دھواں پھیلانے کی کیفیت نمایاں ہے وہ شعلہ کبھی نہیں بنا بلکہ ہر وقت دھوئیں سے ہی نبرد آزما ہے کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر۔ طویل داستان سے مختصر افسانے کی طرف اور پھر مختصر افسانے سے ڈرامے کی طرف میرزا ادیب کا فنی سفر اس کے اسی مزاج کی نشان دہی کرتا ہے۔

مصرانور کی تخلیق نے بلاشبہ اسے حیاتِ دوام عطا کر دی ہے، رومانی ادب میں میرزا ادیب کا ایک مستقل مقام ہے طویل داستانوں سے میرزا ادیب مختصر افسانے کی طرف آیا تو اس نے سارٹ کا قیدی، میل جول، اور دردِ تیرگی جیسے افسانے لکھے اور رمانی چھٹان جیسا سرور تخلیق کیا پھر جذباتی موج اسے ڈرامے کی صنف کی طرف لے گیا، غامض شری ذرات کے بعد یہ میدان قریباً خالی پڑا تھا۔ لے دے کے حوالے کے طور پر امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انارکلی" پیش کیا جاتا تھا میرزا ادیب نے اردو ڈرامے کی کمی کو اپنے لئے چیلنج تصور کیا اور افسانے کو خیر باد کہہ کر ڈرامے سے لو لگائی اور پھر اس فنِ دوامی ہر تقد و قامت کے اتنے ڈرامے لکھے کہ پھر اہل ادب کو ڈرامے کی کمی کی شکایت نہ رہی اگرچہ پاکستانی اسٹیج نے میرزا ادیب پر کچھ زیادہ التفات بکھار نہیں کیا اور یہ بحث بھی ابھی تک فیصلہ طلب ہے کہ کھیل جانے والا ڈرامہ پڑھے جانے والے ڈرامے سے افضل کیوں ہے؟ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو ڈرامے کے تذکرے سے میرزا ادیب کا ذکر خارج کر دیا جائے تو ڈرامے کی پوری تاریخ نولی لنگڑی نظر آنے لگے گی پنجاب پبلک لائبریری میں اردو ڈرامے کی ذیل میں سب سے زیادہ میرزا ادیب کی کتابیں دستیاب ہیں، ٹیلی ویژن پر ایک ایکٹور کو میرزا ادیب کے ڈرامے "مشر مرغ" سے حیاتِ دوام حاصل ہو گئی تھی اور اب یہ کردار فی دی پر اب بھی خاصا مقبول ہے ان کی نسل سے فریدہ میرزا کی صورت میں اردو ادب کو ایک ہونہار افسانہ نگار ملی ہے۔

میرزا ادیب اس لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت ادیب ہے کہ اب تک اس کی جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر پرائلٹرز گلڈیا نیشنل بک سنٹر کا انعام مل چکا ہے، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر عرش صدیقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ستار طاہر اور تحقین فراقی جیسے معنیفین نے میرزا ادیب کے فن پر مستقل نوعیت کے مضامین لکھے ہیں۔ ادبِ لطیف کی ادارت میرزا ادیب کی زندگی کا ایک عہدِ آفریں کا نام رہا ہے۔ ادبِ لطیف کو جس عروج پر میرزا ادیب نے پہنچایا تھا یہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے لیکن ایسا عروج ادبِ لطیف کو "پھر حاصل نہیں ہو سکا۔ بچوں کے ادب میں میرزا ادیب نے مستبدہ اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اس بچے کی طرح کہانیاں تخلیق کی ہیں جو جھاگ کے بلبلے اڑا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے، اسماعیل میرٹھی کا نام اب بہت سے بچے نہیں جانتے لیکن میرزا ادیب کا نام نئے دور کے بیشتر بچوں کی زبان پر فوراً آجاتا ہے یہ اس کامیابی کو حیرت اور رشک سے دیکھتا ہوں۔

اس سب کے باوجود اکثر اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا ادیب زمانے کی عطا پر کچھ زیادہ مطمئن نہیں۔ اسے شکوہ ہے کہ ناشر اس کی کتابیں نہیں چھاپتے آج کا نقاد اس کے فن سے اغماض برت رہا ہے ریڈیو نے اس ڈرامے کا بائیکاٹ کر رکھا ہے ٹی وی اس کا نام سننے کا روادار نہیں۔ بڑے بڑے ادبی رسالے اس کی تخلیقات کے بغیر شائع ہو جاتے ہیں۔ ڈرامے کے نباض ڈرامے کی تاریخ سے اس کا نام خارج کر رہے ہیں عظیم ترین میرزا ادیب کی کتابیں جب چھپتی ہیں تو تبصرے سے محروم رہتی ہیں اور اب ایک عرصے سے اردو ادب کا یہ شہرہ آفاق مصنف کالم نگاری کر کے گویا ادبی دنیا میں اپنی حاضری گنوار رہا ہے۔ آج اس کا ہر بن مواجہاج کر رہا ہے وہ اپنے آپ کو

تنہا محسوس کرتا ہے اور اس کا ايقان ہے کہ پبلک ريلٹنگ کرنے والے کمتر ادبا اس پر سبقت لئے جا رہے ہيں مجھے ياد ہے کہ ايک دفعہ جب ميرزا اديب ايک شاعر کی ساٹھويں سالگرہ کے جشن ميں مضمون پڑھ کر واپس آ رہا تھا تو وہ اسی قسم کی روانی بالويسے دو چار خند مجھے علم تھا کہ ميرزا اديب کبھی کا ساٹھواں عبور کر چکا ہے۔ ادب ميں اس کی خدمات کسی دوسرے اديب سے کم نہيں ليکن کسی نے کبھی اس کا جشن سالگرہ نہيں منايا کسی رسالے نے اس پر خاص نمبر شائع نہيں کیا۔ درد کی ايک لہر ميرزا اديب کے دل سے ميرے دل کی طرف مسلسل دوڑ رہی تھی ليکن ہم دونوں خاموشي سے الفلاح سے دائی ایم سي اے کی طرف آہستہ آہستہ چل رہے تھے يں نے ہمت کی ليکن انصاف ميرزا ساتھ نہ دے سکے کہ اس سے دریافت کروں بڑے اديب اور مقبول اديب ميں کیا فرق ہوتا ہے " ميں یہ سوال آج بھی ميرزا اديب سے کرنا چاہتا ہوں ليکن ميری ہمت آج بھی مجھے جواب دے رہی ہے ايک مسموم بچہ ميرے سامنے موجود ہے، وہ جھاگ سے بلبے اڑا رہا ہے يہ بلبے کبھی ہرامیں اونچا اڑ رہے تھے اور آج جھاگ کی يالی ميں ہی دم توڑ رہے ہيں اس مسموم بچے کو چھيرے يا چڑانے کے بجائے بھلانے ميں طمانيت محسوس کر رہا ہوں اور بے اعتياد کہہ رہا ہوں پانی کا یہ ببلہ کتنا عظيم ہے۔



فتحِ مبین

منظور اللہی

مصلحتِ دروین عیساءِ خارِ کوہ
مصلحتِ دروینِ ماجنگ و شکوہ (رُوحی)

جزیرہ نما عرب کے پتے ہوتے ریگستان اور سنگلاخ وادوں میں کھجور اور پانی میسر آنا ایک نعمت تصور ہوتا تھا، عرب کا ایک تہائی حصہ ریگستان تھا، کوئی ندی ایسی نہیں تھی جو سال بھر رواں رہتی ہو، البتہ چند روز کی مسافت پر عراق کے دریائی علاقے تھے اور درختوں کے ٹھنڈے ڈھکی ہوئی لبنان کی پہاڑیوں پر گندم کی فصل سر اٹھائے کھڑی تھی، جزیرہ نما پر چلنے، خود رو پھولوں کی کثرت ہوتی، ہوا کی تازگی حیاتِ نو کا پیام لاتی اور محمود فضاؤں میں گھٹا بھومتی۔

بازنطینی اور ایرانی سلطنتیں ایک عرصے سے برسرِ پیکار رہی تھیں، دو قہنیوں کے درمیان ایک بے آب و گیاہ چٹیل میدان تھا یا لامتناہی ریگستان جس کے محافظ عرب تھے، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو اسلام کی دعوت دے کر اتحاد اور مسابقت کا سبق دیا اور نئے مذہب کے جوش سے سرشار نوزند جری عرب ایک حیران کن سلسلہ فتوحات پر نکل کھڑے ہوئے، کون کہہ سکتا تھا کہ پسماندہ عرب قیصر و کسریٰ کا تختہ الٹ دیں گے اور سربس کے اندر یہ انا پسند، خود آگاہ لوگ ایک وسیع علاقے پر قابض ہوں گے۔ جو سپانیہ سے سمرفند اور سندھ تک پھیلا ہوگا۔

شامِ بازنطینی سلطنت کا حصہ تھا، معرکہ یرموک میں نصرۃِ بکیر لگاتے ہوئے بدو بچوں میں سے تیر کی طرح نکلے اور مہوت بازنطینیوں پر غالب آگئے، عراق ایران کے زیرِ نگیں تھا، ایک سال نہیں گزرا تھا کہ یہ صحرائی لوگ ریگِ رواں سے نودار ہوئے اور قادیسیہ کے مقام پر ایرانی فوج کو شکست دی جو مشرق کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی، گرد آلود سیاہ خیموں میں رہنے والے عرب راتوں رات حلب ایسے قدیم شہروں کے مالک بن گئے، معرکہ نہادند میں ایرانیوں نے پھر مرنے کی کھائی اور ایک ہزار برس قدیم سلطنت کا غرور خاک میں مل گیا، عربوں کی یہ فتح فردوسی کو ایک آنکھ نہ بھائی، قومی عصیت گزشتہ چند صدیوں کی بات نہیں۔

چو بختِ عرب بر عجم چیرہ شد،
ہاں زشت شد خوب زشت
ہمی بختِ ساسانیان تیرہ شد
دشمن تر خوردن و سوسمار
شدہ راہِ دوزخ پدید از بہشت
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیان را کند آسرد
تغویا و چہ سرخ گردون تغو

ساتویں صدی میں عرب ایکسپل کی مانند عرب سے نکلے اور مشرق وسطیٰ کو زیرِ کر کے دو سمتوں میں بڑھے، مشرق و مغرب

نے وسطی ایشیا اور شمالی ہند کی طرف پیش قدمی کی اور چین کی حد تک جا پہنچے، مغرب میں مصر فتح کیا اور اپنی سلطنت کو شمالی افریقہ کے آخری سرے تک وسعت دی، حتیٰ کہ بحر اوقیانوس کے آن کے قدم روک لیے۔ شمالی افریقہ کے پہاڑی، میدانی اور نیم صحرائی علاقے میں بسنے والے بربر جاکش اور جنگجو لوگ تھے جنہیں رومی پورے طور پر مطیع نہیں کر سکتے تھے، شروع میں انہوں نے عربوں کے خلاف مزاحمت کی تھی، لگے لگے بناوین بھی ہوئیں، مگر بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور برصنا و رغبت نیل مذہب قبول کر لیا اور جوق در جوق اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

شام کو فتح کرنے کے بعد بازنطینی حملوں کی روک تھام کے لیے مصر کی تسخیر ناگزیر تھی۔ حضرت عثمان کے عہد میں مصر فتح ہوا تھا۔ بیس برس بعد مصر کی حفاظت سرفہرست تھی۔ سہ سالار عقبہ بن نافع نے شمالی افریقہ اموی خلافت میں شامل کر لیا تھا۔ افریقہ کے ساحل پر آج کے دور کا شاداب تینس مسلم فتوحات کی آخری حد تھی۔ عقبہ بن نافع شمالی افریقہ کی مغربی حد تک فتح کا نفاذ رہ بجاتا ہوا بحر اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ گیا اور گھوڑے کو مہینہ لگا کر دندنا تا ہوا سمندر میں گھس گیا۔ جب پانی گھوڑے کے پیٹ سے آگیا تو اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر شکوہ کیا :

مدائے اللہ! نیزی زمین ختم ہو گئی ہے، راستے میں سمندر حائل نہ ہوتا تو تیرے نام پر میں مغرب کی انجانی ملکیتیں فتح کرنا جو تیرے سوا دوسرے خداؤں کی پرستش کرتی ہیں۔“

اقبال کا مصرع

بحر غلات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے
مبالغے سے پاک ہے۔ عقبہ بن نافع، طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر ایسے پاک نفوس ہی ان اشعار کے حقدار ہو سکتے تھے :

الہی یہ تیرے پُر اسرار بندے	جنہیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خُدائی
دو نیم اس کی ٹوکھ سے صحرا دور یا،	سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبتِ رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو	عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن	نہ مالِ غنیمت نہ کشورِ گشتائی

اقبالؒ

شمالی افریقہ میں عرب مقبوضات کی دیکھ بھال کے لیے سہ سالار عقبہ رضی اللہ عنہ کے جذب میں قیرواں کے مقام پر ایک فوجی اڈے کی بنا ڈالی جو عالم اسلام کا ایک اہم شہر بنا۔ مصر سے بحر اوقیانوس تک کا علاقہ عربوں نے فتح کر لیا تھا اور یوں مشرقی اور مغربی بحیرہ روم پر ان کا پھر براہِ راجہ تھا، اب دوسری راستے تھے، جنوب میں اندرون افریقہ پیش قدمی کی جائے یا

آبنائے عبور کے شمال میں ہسپانیہ پر حملہ کیا جائے، جس کی دھند سے ٹوٹی ہوئی وادیاں شمالی افریقہ کے حکمرانوں کو دعوت تسخیر دے رہی تھیں، اس لحاظ سے ہسپانیہ پر حملہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا، بلکہ طبری حد تک یہ اقدام ناگزیر تھا، سلاطین میں ہسپانیہ کی فتح جو امتیہ کا آخری کارنامہ تھا۔

”لے اُندلس والو! سبحان اللہ کیا بات ہے تمہاری! پانی ہے، سایہ ہے، نہریں ہیں اور درخت ہیں، جنت الخلد اگر کہیں ہے تو تمہارے ملک میں ہے۔“

ابو اسحاق بن خناتجہ (لفظ الطیب)

آٹھویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک عرب اور بربر ہسپانیہ اور پرتگال کے بیشتر حصے پر حکمران رہے، یہ خطہ مغرب میں سیراموریا اور اونیائوس سے لے کر مشرق میں بحیرہ روم تک ہسپانیہ کا جنوبی حصہ ہے جو اُندلس کہلایا جریالی کے درمیان وادی اکبیر ایسی زرخیز وادیاں ہیں، جنوب میں اونچے پہاڑ ہیں، سیرانوادا کی چوٹی ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ گودامن کوہ میں نیشکر کی کاشت ہوتی ہے۔ ثقافت نیل نام آسمان، نیلگوں سمندر، پھلوں سے لدے ہوئے اشجار اور خوبڑ عورتیں، بجا طور پر یہ ملک جنت نظیر مشہور تھا، بحیرہ روم پر آباد دوسرے ملکوں کی طرح یہاں مختلف اقوام اور ثقافتیں شرف سکر ہوئیں۔ دسویں صدی قبل مسیح غنیمتوں نے نوآبادیاں قائم کیں۔ یونانیوں نے جزیرہ نمنا کو آئی بیری کا نام دیا۔ گوان کی آبادیاں جنوب مشرق اور مشرقی ساحل تک محدود تھیں اور اندرون ملک کے ساتھ رابطہ برائے نام تھا، پہلی صدی قبل مسیح میں ہسپانیہ روم کا صوبہ بنا اور وہاں لاطینی زبان اور رومی قانون اور رسم و رواج رائج ہوئے۔ عسکری مدافعت ختم ہونے کے بعد ہسپانیہ میں رومی اثرات کا نفوذ سرعت کے ساتھ ہوا۔ روم کے سپاہی اور انتظامیہ کے اراکین رومی اثرات پھیلانے میں مدد ہوئے۔ اسیٹی تعمیر اور پبلک عمارات کے کھنڈر رومی فن تعمیر کے شاہد ہیں، سی گودیا کا آب رساں آج بھی زیر استعمال ہے۔ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی یہ واحد قدیم تعمیر ہے جو صحیح حالت میں ہے، روم کے ٹریجن اور ہارڈیاں ایسے عظیم شہنشاہ اور سنیکا ایسا فلاسفہ ہسپانوی نژاد تھے، عربوں کی آمد سے پہلے نسلی اور معاشرتی لحاظ سے رومانے گہرے نقوش چھوڑے رومی اقتدار روم زوال ہوا تو ملک وینڈال اور گائٹھ ایسے قبیلوں کے رحم و کرم پر تھا۔

مغربی توحشیں کو اقرار ہے کہ جزیرہ نما ہسپانیہ میں اسلام نجات دہندہ کے روم میں آیا، صدیوں سے یہ ملک ظالم تاجین اور وحشی قبائل کی آماجگاہ تھا، چھ سو برس تک ہسپانیہ سلطنت روم کا حصہ رہا، اپنی استعمار طلب حکمت علی کے تحت اس صوبے کی ٹوٹ کسٹوٹ رومی سرداروں کے لیے سامانِ تقیش مہیا کرتی رہی، ایک طرف ٹبرے بڑے جاگیردار اور اُمراء تھے، اور دوسری طرف پلے ہوئے عوام اور غلام کسی کو انگلی اٹھانے کا یا رازہ تھا، متقدم مراعات سے بہرہ مند امیر اور طاقتور طبقہ ٹیکس سے مستثنیٰ تھا، مختصر متوسط طبقہ ٹیکس کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، صوفی طبقہ ٹیکس ادا کرتا تھا، باقی غلام تھے یا مزارع، مزارعوں کی حالت غلاموں سے نذر سے بہتر تھی مگر ان کی قیمت زیر کاشت زمین سے وابستہ تھی، جسے وہ چھوڑ نہیں سکتے تھے،

زمین کا مالک زرعی زمین کے ساتھ مزارعوں کو بھی بیچ ڈالتا تھا۔ امراء اپنے محلوں میں ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ فارس اور آرمی منشقش پر سے، خدمت کے لیے غلام، مینافتن روزقہ کا معمول تھا، لذیذ کھانے، شراب کہنے کے رطل گراں، زرعی مسندوں پر ٹیک لگائے ہوئے مہان مطرب کے نغموں سے نطفت اندوز ہوتے۔ رقص گناں مہ و شبیں دلوں کو گنجائیں، بیچت بگاہ او وہ فردوس گوش!

پانچویں صدی میں مغربی سلطنت روم کے نوال پر اُپر تلے وحشی قبائل کی دوجہل نے ہسپانیہ کو روندنا، خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا مگر اخلاق باختہ رومی سپت و صلہ ہو چکے تھے، مقابلہ کرنے کی بجائے وہ ہمت ہار بیٹھے، توخ ڈونی رقمطراز ہے:-
”وحشی قبائل شہروں میں داخل ہو رہے تھے اور بدست امراء رقص و سرود کی محفلیں گرم کیے ہوئے تھے، اُن کے لرزاں ہونٹ خوب وکیزوں کے عریاں شانوں پر بوسے ثبت کر رہے تھے۔“

ہ یک دست جام بادہ و یک دست رُلف یار
رقص چنیں میاۃ میدانم اسر زوست
رودی

دفاع کے لیے ایک شہر بھی قلعہ بند نہ ہوا، تلوار نیام میں ہی رہی، ہرجا وحشیوں کے لیے دروازے کھول دیے گئے، محض خون آشام حسرت کی تسکین کے لیے بے مقصد خونریزی کا وہ بازار گرم ہوا کہ الاماں والحفیظ، وحشی قبائل نے بے ستھارہ ٹوٹ کر کی اور عمارتوں کو دیاسلائی دکھلا دی۔

اہل ہسپانیہ کے لیے وینڈال کی آمد قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی، ملک کی تاریخ میں شاید یہ تاریک ترین باب تھا، ہسپانیہ کی ہزار سالہ محکومی کا دور ابتلاء ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چچیز خاں کی خون آشام سپاہ ان وحشیوں کے مقابلے میں رحمتی شہرہ آفاق کتاب ”سلطنت روم کا انحطاط و زوال“ میں گہن ہسپانوی باشندوں کی حالت زار پر خون کے آنسو رو یا قیصران روم کی شنگاری کسی ضابطہ کے تحت تھی مگر وینڈال کا اندھا و ہندسل راستے میں تباہی مچاتا ہوا گزرا تھا، شہر اور دیہات یکساں طور پر آس کی لپیٹ میں آئے تھے۔ ورثے کے طور پر انھوں نے لغت میں ایک ناقابلِ رشک لفظ کا اضافہ کیا۔
”وینڈلیزم“ بمعنی بے مقصد تباہی و بربادی، اُن کی نسبت سے ممکن ”اینڈیلیوسیا“ کہلایا جو عربی میں الاندلس ہوا، ہسپانوی آج بھی اس وسیع جزی خطے کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔

لے معروف رومی مصنف کاؤنٹ ٹالسٹائی لکھتا ہے ”ہمارے حلقہ احباب میں غلام مزارعین کی آزادی کا کبھی ذکر نہیں ہوا بلکہ غلام مزارعوں کا وراثت میں منتقل ہونے کا معمول تھا“ ۱۸۴۹ء میں ٹالسٹائی جوئے میں ایک بھاری رتم ہار گیا، اُس نے اپنے بھائی کو لکھا کہ اس کی زرعی جائیداد میں سے ایک موضع فوراً بیچ ڈالو جو بے مزارعین کے بیچ دیا گیا۔!

وہی گاتھ ایک لمانوی قبیلہ تھا، اُن کی آمد وسیع پیمانے پر لوگوں کی ہجرت نہیں تھی، بلکہ یہ محض ایک حکمران طبقہ تھا۔ اُس وقت فرانس اور ہسپانیہ مغربی سلطنت رُوما کے تباہ حال صوبے تھے جن پر وہی گاتھ قابض ہو گئے، بربریت میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اُن کے ظلم و ستم کی وجہ سے بغاوتیں ہوتیں جو سختی سے کچل دی گئیں۔ لوگوں کو اُمید تھی کہ وہی گاتھ بادشاہت کے طفیل وحشی قبائل سے نجات ملے گی مگر اُس دور میں بھی ایذا رسانی اور سفاکانہ قتل و غارت روزمرہ کا معمول تھا، اُن کی حکومت رومی ظلم و تعدی اور فحاشی چھپقلش کا مرکب تھی۔

چھٹی صدی کے اواخر میں حکمران طبقے نے کیتھولک عقیدہ قبول کر لیا، ملک کو متحد کرنے میں کلیسا نے اہم کردار ادا کیا۔ حکمت عملی طے کرنے کے لیے مجلس مشاورت کے اجلاس میں بادشاہ کے علاوہ وہی گاتھ اُمراء اور اہل کلیسا شریک ہوتے، اُمراء اور اہل کلیسا بڑی بڑی جاگیروں پر قابض تھے۔ عملی زندگی میں اُن کے اختیارات پر کوئی قذغ نہیں تھی، ملک بڑا تھا اور ذرائع آمد و رفت محدود، اصلاحات بے موثر ثابت ہوتیں، مزارعین مزدور و غلام محرومی کا شکار تھے، ہر طور سے ان کا استحصال جائز تھا، امیر اور غریب طبقات کی تقسیم منہج ہو کے رہ گئی تھی، محروم طبقے کے لیے اپنی حالت سدھارنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مزارعین اور غلاموں کی حالت سدھرنے کی بجائے بدتر ہوتی گئی، ظالمانہ طور طریقوں کو قانونی حیثیت دے دی گئی، رومی قانون کے تحت بیوی کو خاوند سے اور بچوں کو ماں باپ سے علیحدہ کرنے کی ممانعت تھی مگر وہی گاتھ دور میں کوئی آقا کی اجازت کے بغیر شادی کر لیتا تو میاں بیوی کو جبراً علیحدہ کر دیا جاتا اور بچے آقا کی ملکیت ہوتے، وہی گاتھ نے مسیحیت قبول کی تو ارباب کلیسا کا رویہ سلطنت میں دخل ہر گئے۔ اہل کلیسا نے وعدہ کیا تھا کہ حصول اقتدار کے بعد وہ مزارعین اور غلاموں کی بہبود کے لیے کوشاں ہوں گے مگر سہرے اصول دھرم کے دھرمے وہ گئے۔ ستم یہ تھا، کہ نیا دیتیاں کلیسا کی شہ پر ہتھیں یا کلیسا چشم پوشی کرتا۔ ہر کلیسا کے ساتھ وسیع زرعی جائیداد منسلک تھی جہاں مزارعین کی کثیر تعداد کام کرتی تھی، بڑے عہدوں پر مامور پادری شان و شوکت کے ساتھ غلاموں سے معور محلات میں رہتے تھے۔

فطرت کی ستم ظریفی تھی یا نیرنگی زمانہ کہ ارباب کلیسا کے جو رستم نے پُرانے عہد کی یاد بھلا دی، کسی پادری کی عکالت بھی غلام کی نظر بدیا جاؤسے منسوب کی جاتی، ایذا رسانی کے رت نئے طریقے اسجاد کئے گئے، لاٹ پادری کو انتباہ کہنا پڑا کہ جنونی کیفیت میں ارباب کلیسا آپے سے باہر نہ ہوں اور غلاموں کے عصو کاٹنے سے احتراز کریں۔!

یہودیوں کو ستانے میں وہی گاتھ بادشاہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے، انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا، وہ رومی دور میں آکر آباد ہوتے تھے، کاہنہ بار اور تجارت میں اُن کا ایک مقام تھا، ایک بادشاہ نے حکم دیا کہ یہودیوں کو بالآخر بپتسم پہنایا جائے، نہ مائیں تو جلاوطن کر دیئے جائیں اور اُن کی جائیداد ضبط کر لی جائے، دوسرے نے انہیں بندرگاہ پر جانے اور سخاوت کرنے سے منع کر دیا۔ طویل اندھیری رات صبح صادق کی نوید لے کر نہیں آئی بلکہ ایک لالچنا ہی تاریکی چھا گئی، گھٹا لپ اندھیرا جس سے کوئی مغر نہ ہو، طورج کے لیے طویل جاں گسل انتظار باقی تھا، حکومت سے ملاں رعایا حالت بدلنے کی خواہاں تھی، کچے جڑ تھی کہ یہ تبدیلی افریقہ کی طرف سے آئے گی، ہسپانیہ میں اسلام کا دہواؤ اور اُس کے

دیر پا اثرات اس تناظر میں دیکھنے چاہئیں۔

وہی گانٹھ بادشاہت میں خاندانی وراثت کا قانون رائج نہیں تھا، بادشاہ کے مرنے پر اُمراء اپنے حلقے سے ایک ایسا شخص چُن لیتے جسے کلیسا کی اعانت بھی حاصل ہو، یوں جانشینی کا مسئلہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا اور اس سے ریشہ دوانیاں اور سازشیں جنم لیتیں۔ بسا اوقات بادشاہ رُوسا کے رحم و کرم پر ہوتا، تاریخ کا گلیہ ہے کہ بالآخر حکومت کرنے کے لیے حکمران طبقے کا متحد ہونا ضروری ہے مگر دوسری کی حکمرانی کے بعد وہی گانٹھ حکومت نفاق کا شکار تھی۔ جانشینی کا مسئلہ ٹیڑھی کھیر تھا۔ ایسے موقع پر فساد برپا ہوتا، سابق بادشاہ کے مرنے پر اُمراء کی جماعت نے راڈرک کے حق میں فیصلہ دیا تھا، اُس کی رگوں میں شاہی خون نہیں تھا مگر نامور جنرل راڈرک دس سالے کا سپہ سالار تھا، وہ عسکری مہارت اور سیاست میں سوجھ بوجھ کی وجہ سے معزز تھا مگر ایک اہم گروہ نے اس چٹاؤ کی مخالفت کی تھی۔

فتح آندلس اس لحاظ سے اہم تھی کہ عام لوگ جنگ کے قبیلے اثرات سے محفوظ رہے۔ وہ خوزیری اور بربادی مفقود تھی جو عسکری حملوں سے مترب ہوتی ہے، ملک کو نہیں نہیں کیا گیا نہ ہی رعایا کا قتل عام کیا گیا، کلیساؤں کی بے حرمتی نہیں کی گئی۔ معاشیات کو تروبالا نہیں کیا گیا، عورتوں کی آبرو محفوظ رہی، امن و آسشتی کا دور دورہ ہوا، نظم و ضبط بحال کر کے خوشحالی کی بنا ڈالی گئی اور معاشرے کی تطہیر کی گئی، ہسپانیہ کی تاریخ نے ایک نیا ورق اُٹھا، پہلی بار ایک تائبندہ دور کا آغاز ہوا، صدیوں سے اس خوبصورت اور زرخیز ملک کا استحصال دارکھا گیا تھا، وہ ایک نئے مذہب کے علمبرداروں کا منتظر تھا۔

آہ وہ مردان حق ! وہ عربی شہسوار
حامل "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقین
جن کی حکومت ہے فاشس یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہل دل فقر ہے شاہی نہیں

اقبال

گانٹھ مملکت میں دستور تھا کہ درباری آداب سیکھنے کے لیے اُمراء اپنے بچوں کو شاہی دربار میں بھیج دیتے تھے، ان کی رہائش بھی محل میں ہوتی تھی، اسی مقصد کے لیے کاؤنٹ جولیاں نے اپنی بیٹی طلیطلہ بھیجی تھی۔ شمالی افریقہ میں سببہ کا گورنر کاؤنٹ جولیاں گانٹھ مملکت کا نمائندہ اور اعیانِ سلطنت میں سے تھا، ایک روایت کے مطابق حاکم وقت راڈرک نے جولیاں کی فوج اور حسین بیٹی کو دریائے تاجہ میں مہلتے ہوئے دیکھ لیا اور اس کی خوبصورتی پر مرعہ کھڑا۔ سفلی مذہبات سے مغلوب ہو کر وہ امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا۔ جب کاؤنٹ جولیاں کو اس فعلِ شنیع کی خبر ملی تو غصے کے مارے وہ آگ بجولا ہو گیا اور بادشاہ کو اس کی کرکٹ کا مزہ چکھانے کی ٹھان لی، جولیاں نے کہا :

”اس وحشی گاتھنکی یہ مجال کہ وہ ایک شہزادی کی عزت کے ساتھ کھیلے، لیویح میٹج کی قسم! میں اس کا تخت کھوکھلا کر دوں گا اور اُس کی سلطنت برباد کر کے دم لوں گا۔“

کچھ عرصے بعد جولیاں کی بازیابی ہوئی تو راکھ کو گمان تک نہ تھا کہ وہ اس راز سے باخبر ہے، راکھ کو شکار کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ وہ فرماش کر چکا تھا کہ جولیاں افریقہ سے باز ہجوائے۔ آخری ملاقات کے دوران جولیاں نے کہا: ”عالی تہ! اگلی مرتبہ میں اتنے باز لے کر آؤں گا کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔“ یہ ہزاروں برسوں کے لیے ایک استعارہ تھا جولیاں کی ہمراہی میں سرزمینِ آندلس پر اترنے والے تھے۔

مغربی مصر کے نخلستانوں سے لے کر اوقیانوس تک بربر آباد تھے۔ ان کا تعلق ایک قبیلے سے نہیں تھا بلکہ وہ قبائل و شعوب میں بٹے ہوئے تھے، تو مند و جیبہ، مرد مضبوط اور خوبصورت عورتیں، یہ جنگجو لوگ آداب رزم سے آگاہ تھے، انھیں اپنے قبیلے پر فخر تھا اور وہ سردار کا حکم بے چون و چرا بجالاتے، وہ دوستوں کے دوست تھے اور دشمن کو ناقابلِ عفو سمجھتے تھے، بربر صحرائی اور کوہستانی مردانِ حُر کی خوبیوں سے متصف تھے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مردِ کوہستانی

ساتویں صدی میں عربوں نے شمالی افریقہ فتح کیا اور یارِ نطفینی حکمرانوں کو نکال باہر کیا، موسیٰ بن نصیر نے قیرواں کو مرکز بنایا کر برسوں کے خلاف خوزیر جنگیں لڑیں اور ہوشمندی سے کام لے کر انھیں تابع کیا۔ تاریخ کی شیخ پر پہلی بار انھیں اپنی خوابیدہ صلاحیتیں دکھانے کا موقع مل رہا تھا، اسلام کے نام پر انھوں نے ہسپانیہ جیسا ملک فتح کیا، بعد میں دو بربر بخاندانِ ہسپانیہ پر حکمران ہوئے۔

مشرقی مراکو اور مغربی الجیریا پر مشتمل رومی صوبے کا نام ماریطینیا تھا، رومی یہاں کے باشندوں کو اہلِ مغرب یا دی کہتے تھے، لاطینی زبان کا یہ لفظ یورپ کی زبانوں میں مستعمل ہوا جو بعد میں شمالی افریقہ کے برسوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ بلکہ عرب اور ہسپانیہ کے نو مسلم بھی ”مورو“ اور ”موریکو“ کہلاتے۔

جولیاں نے شمالی افریقہ کے والی موسیٰ بن نصیر کو ان الفاظ میں ہسپانیہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔

”ہسپانیہ کی خوبصورت اور زرخیز سرزمین پیداوار کے لحاظ سے منفرد ہے، وہاں پھل دار اشجار اور آبِ مصفا کی فراوانی ہے، ہسپانیہ کے باشندے عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں اور باہمی نفاق سے کمزور ہو چکے ہیں۔“ اس نے یقین دلایا کہ آجائے عبور کرنے کے لیے وہ مسلمانوں کی رہنمائی کرے گا اور اس مقصد کے لیے چار چھوٹے جہاز فراہم کرے گا۔

اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کی اجازت سے موسیٰ بن نصیر نے ہسپانیہ فتح کرنے کا ارادہ کیا اور سن ۷۱۱ء میں اپنے موالی طریف کی سرکردگی میں سو سو اور چار سو پیادہ کا دستہ روانہ کیا۔ طریف، ہسپانیہ کے جزیری ساحل پر اتر آ، وہ مقام اس کی نسبت سے طریف کہلایا۔ کسی مزاحمت کے بغیر وہ جزیرہ نما کے جنوب میں ایک جھٹے پر قایم رہا، حالات کا

جائزہ لیا اور خاصا مال غنیمت لے کے لوٹا، استطلاعی مہم کی کامیابی نے موسیٰ بن نصیر کی ہمت بندھائی اور اس نے طارق کو حملہ کرنے کا حکم دیا،

سرور گرم زمانہ چشیدہ موسیٰ ایک تجربہ کار جرنیل تھا، اُس کی نظر میں اس مہم کی نوعیت اولین پنجہ آزمائی کی تھی، ہزار سپاہیوں پر مشتمل پیادہ فوج میں گنتی کے گھڑ سوار تھے، چند عربوں کے سوا سبھی بربر تھے۔ یہ تعداد ایک ملک کو فتح کرنے کے لیے قطعاً ناکافی تھی، موسیٰ ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا۔ اُس کے پاس عرب سپاہ بھی تھی مگر فی الحال وہ گاتھ مملکت کے خلاف فیصلہ کن جنگ کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس طارق ایک نڈر جرنیل تھا جس کے جوہر میدان جنگ میں کھٹکتے تھے۔ وہ ہر دم نبرد آزما ہونے کے لیے تیار تھا۔ ایک مردِ مومن جس کے لیے طبل جنگ شہادت کی نوید تھا، مہم جو، گرم دم جستجو، میدان جنگ میں سرخرو ہونے کا منتی، اسلام کی سر بلندی کے لیے کوشاں، اُس کی حرمت پر نثار، غذا اور، جنگ کی جھڑپ میں ڈھکا ہوا مضبوط جسم، کھٹکتا ہوا رنگ اور سرخ بال، اُس کی پیشانی سے غیر معمولی ذہانت ٹپکتی تھی طارق بن زیاد موسیٰ کا مالی تھا، آزاد کردہ غلام مگر غلام ابنِ غلام نہیں، وہ معتز زلفِ غزہ قبیلے کا چشم و چراغ تھا اور اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک جنگ میں مالِ غنیمت کے طور پر موسیٰ کے ہاتھ آیا تھا، انصائے مغرب کو زیر کرنے کی مہمات میں طارق بے جگری سے لڑا تھا، اُس نے طنجہ فتح کیا، بھر اطلس کے پہاڑوں سے گزر کر موجودہ مراکو پر تعلق کیا، اب وہ برس سے وہ طنجہ اور ملحقہ علاقے کا والی اور عسکری سرور تھا۔

طارق کی بربر سپاہ بیشتر نو مسلم تھی۔ راسخ الاعتقاد اور دھن کے پچے بربر جنگ کی مشقتوں سے آشنا تھے، مجاہدوں کے سینے پیش آنے والی جنگ کے تصور سے فروزاں تھے۔

اگ بجیر کی سینیوں میں دبی رکھتے ہیں

زندگی مثلِ بلال حبشی رہتے ہیں

اقبال

موسم بہار کی ایک خوبصورت صبح کو یہ مبارک سفر شروع ہوا، ساحلِ افریقہ کی کئی پھٹی پہاڑیوں کو یورپ سے علیحدہ کرنے والی کھاڑی پر سورج چمک رہا تھا، اُس پار ایک عظیم سنگین چٹان سمندر سے سر نکالے کھڑی تھی، عہدِ قدیم میں لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سرکولس کا ایک ستون ہے، انجانی دنیا کی جانب پہلا قدم، اس کے اُس پار جانا خداوندوں کی ناراضگی مول لینا ہے، ہسپانیہ کے ساحل پر پہاڑیوں کی سُرئی لکیر واضح تھی، کشنیں کے بادبان باد نسیم کے جھونکوں سے ہلکورے لے رہے تھے، سب سے اگلے جہازیں طارق ایک ایسی مہم کی سربراہی کر رہا تھا جس نے صدیوں تک مغرب کی تاریخ بدل کے رکھ دی۔ اپریل ۷۱۱ء کی پہلی تاریخ تھی جب طارق نے آندلس کی سرزمین پر قدم رکھا۔ سال کے اس حصے میں موسم بہار اور خزاں کی رعنائیاں یکجا ہو جاتی ہیں، دشت و دمن شگوفوں سے پٹ جاتے ہیں۔ یہ منظر دمشق کی یاد دلاتا تھا جو عربوں کے نزدیک نذیری کا مقبرہ ہے، طارق نے اُس مقام پر قدم رکھا جو جبل الطارق کے نام سے موسوم ہوا۔ طارق نے ہی اس چٹان پر پہلا قلعہ اور محل تعمیر کیا جس کے آثار جبرالطرس شہر سے نظر آتے ہیں۔ رت جلیل کی روانے دھمت میں وہ لمحہ کتنا عظیم ہو گا جب غازیانِ دین

کا پہلا دستہ ساحلِ آندلس پر ٹنگرا ناز ہوا، فتحِ مندی کی اولین موج کے جلو میں ٹٹاٹھیں مارتا ہوا دریا تھا جسے ہسپانیہ کے کوہِ وڈن سے گزر کر زیریںِ فرانس تک جا پہنچنا تھا یہ درودِ مسعود سات سو برس کے تغلب کا نقطہ آغاز تھا، بلکہ کچھ بعید نہ تھا کہ عرب اور بربر مغربی یورپ پر قابض ہو جاتے اور کلیساؤں سے گھنٹیلوں کی بجائے مساجد سے موزن کی صدا بلند ہوتی۔

طارق کی درخواست پر موسیٰ نے بعد میں پانچ ہزار بربر بطور کمک بھجوائے، طارق فتحِ یاب ہونے با شہادت پانے کا عزم کیے ہوئے تھا، ہسپانیہ کے ساحل پر ٹنگرا ناز ہوتے ہی اُس نے کشتیاں جلا دیں کا حکم دیا، حصولِ مقصد کے لیے اپنا سب کچھ تھکے بھجھوٹی سے متوجہ ہونے کے لیے کشتیاں جلا دینا

مستعمل ہوا، بے باک جرات کے لیے ایک استعارہ، جب انسان ماضی کو پسِ پشت ڈال دے۔ فراد کے امکاناتِ تلفت کر کے غنیم کے سامنے سبز سپر ہو جائے اور نصبِ العین کے حصول کے لیے جان کی بازی لگا دے، دنیائے ادب میں اقبال کے اشعار نے یہ واقعہ زندہ جاوید کر دیا :

طارق چو بکارِ آندلس سفینہ سوخت گفتند کارِ توبہ نگاہِ خرد خطاست
دویم از سوادِ وطن باز چوں رسمیم؟ ترکِ سبب ز رفتے تزلزلین کجا روست
خندید و دستِ خویش پیشِ تیر برد و گفت ہر ملک ملک است کہ ملک خدائے است

کنارا آندلس سفینہ سوختی، ایک رمز، ایک کنایہ، طارق کا یہ اقدام تیرہ سو برس سے تاریخ کے اوراق میں مٹ کر رہا ہے، اُس نے پامردی، خود سپردگی اور اتیار کی ایسی مثال قائم کی جو ہر دور کے جانبازوں کے لیے منارہ نور ہو، میدانِ کارزار میں جہاں دستِ بدست لڑائی میں جبالے ایک دوسرے کو لٹکارتے ہیں طارق کا دلولہ انجیر کا زمار دلوں کو گرما تا رہے گا۔

لے فتحِ آندلس کے آٹھ سو برس بعد فاتحِ میکسیکو ہسپانوی کورٹیز وسطی امریکہ کے ساحل پر اتر آ، اُس نے طارق کی روایت بانڈازِ دگترانہ کی، بحری بیڑا غرقاب کرنے سے پہلے مشہور کر دیا کہ جہاز سفر کے قابل نہیں رہے اور یوں راہِ فرار منہ کر دی، دو معتز ضیق کو دار پر کھینچ دیا اور منہ دشر پسندوں کو کوڑے لگوائے، اس طور متوقع بغاوت کا سدباب کیا۔ رسولائے زمانہ کورٹیز کی وعدہ شکنی، سفاکی اور سازش کی داستان طویل ہے، ایزٹیک قوم کے بادشاہ موکتیڈوما نے ہسپانوی سردار کوٹوس ہونے کی طشتراں، ملائی جانور، بیش قیمت زیورات اور زنجین ملبوسات بطور ستائش بھجوائے تھے ا، مہمان نوازی کا حق ادا کیا تھا مگر کورٹیز نے جیلے سے بادشاہ کو حراست میں لے لیا اور اس کے دار الحکومت پر قبضہ کر لیا، دار الحکومت جسے دیکھ کر ہسپانوی سپاہی ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ بیداری ہے یا عالمِ خواب؟ ایک جگہ گاہ جھیل کے وسط میں چار مربج میل پر پھیلا ہوا شہر جس کے بلند و بالا دیوکتے ہوئے معبد، آبی شاہراہیں اور پُردرونی بازار ایک تہذیب کی شہادت دیتے تھے۔ کورٹیز نے ایزٹیک تمدنِ عارت کو یا معبد و ہادیے اور ایک "غلط فہمی" کی بنا پر تین ہزار ہجرا لوریا خاک و خون میں منہلا دیا۔ اگر میکسیکو کے باشندوں نے اُس کا بُت نصب کرنے کی اجازت نہیں دی تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

اُس وقت راڈرک شمالی پہاڑوں میں باسق قبیلے کی لینا دست فرو کر رہا تھا
نصرانی ہسپانیہ کے ایک قابل جرنیل نے جبل طارق کے قریب طارق کی پیشقدمی رکے کی کوشش کی مگر پیچھے دھکیل دیا گیا،
مدمیر نے ان الفاظ میں راڈرک کو مسلمانوں کی آمد کی اطلاع دی : خدا معلوم یہ لوگ آسمان سے گرے ہیں یا یہ زمین سے
اُبھرے ہیں ؟

محلے کی خبر سن کر راڈرک بعجلت طلبیلہ لوٹا اور ایک بھکر جڑار کے ساتھ مقابلے کے لیے بڑھا، اُس کے چند ملیغوں کی
وفاداری مٹھوگ تھی، سابق بادشاہ وٹا کے بیٹے اپنی جگہ پر شناکی تھے، وہ سمجھتے تھے کہ تخت پر اُن کا حق فائق تھا، نیز
راڈرک نے اُن کی ذرخیز جاگیریں ضبط کر کے شہزادوں کی دشمنی مول لی تھی، سابق بادشاہ کا بھائی ادپاس طلبیلہ اور ایشیلیہ
کالاٹ پادری تھا، وہ بھی شہزادوں کا ہم خیال تھا،

دفاع کے لیے پہاڑی علاقہ موزوں تھا مگر سمندر اور پہاڑیوں کا قدرتی حصار چھوڑ کر طارق کھلے میدان میں خیمہ زن ہوا۔
اُس کے لیے جان کی حفاظت مقدم نہیں تھی، اسلام کے لیے ہسپانیہ فتح کرنا مقصدِ اولین تھا۔

سہ خباں میں ہے منتظر لاکھ کب سے

چنا چاہیے اس کو خونِ عرب سے اقبال

طارق کی پیادہ فوج کے مقابلے میں چالس نہار کی گاتھ فوج بیشتر گھڑ سوار تھی اور زرہ بختریچے ہوئے بہترین سپاہیوں
پر مشتمل دستہ فوج کے آگے آگے تھا، ان کے ہاتھوں میں بھاری بھر کم المانوی تبر تھے، جن کی زد سے غنیم کا بچ ٹکھنا محال تھا۔
گاتھ سردار اطلس و دیبا میں لمبوس تھے۔ لباس اور ہتھیاروں میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ رُچنے کے لحاظ سے سرداروں
کی انگوٹھیاں چاندی کی تھیں۔ راڈرک کے سر پر موتوں کا تاج تھا اور شانوں پر ارغوانی چادر جس کا طلائی حاشیہ موتیوں سے
مترن تھا، روپہلی چپل میں بھی یافتہ جڑے تھے، بھاری ہتھیاروں سے لیس ہسپانوی فوج دو ہیکل گھوڑوں پر سوار تھی۔ طلبیلہ اور
ایشیلیہ کالاٹ پادری ادپاس اور سابق بادشاہ وٹا کے بیٹے میسی دیسار کے نگران تھے۔

قطار در قطار منظم بر بہ ایک دیوار کی مانند آگے بڑھ رہے تھے۔ پیادہ فوج کے ساتھ بہت کم گھوڑے تھے، یوں
بھی ہسپانوی فوج کے مقابلے میں ایک اور تین کی نسبت تھی، طارق کی عقابنی نگاہ نے جنگ کے لیے ایک ایسا مقام چنا
تھا جو پیادہ فوج کے لیے موزوں تھا اور جہاں گھڑ سواروں کے لیے چابکدستی سے مرنا مشکل تھا،

صبح کے وقت جنگ شروع ہوئی سپہ ہونے تک موسم گرم ہو گیا۔ میدان کا رزار ایک ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔
لوہے سے لوہا ٹکرایا، شمشیر و سنان اور تیغ و تبر تلے ٹکھنوں کے گشتے لگ گئے، بھاری بھر کم گھوڑوں کے ٹکھنوں نے زمین کا رسیذ
دہل رہا تھا، میدان کا رزار کا شور تھا اور بانگِ دُہل، کان چری آوازِ سنانی نہ دیتی تھی، دوسرے روز بھی جنگ اسی شدت
سے جاری رہی، تیسرے روز عسکر اسلام میں ٹکھن کے آثار نمایاں تھے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی، طارق نے سوچا اگلے روز
نصرانی تازہ دم ہو کر ٹوٹیں گے، میدانِ جنگ میں حشر کا سماں ہوگا، مسلمان مدافعت پر مجبور ہوں گے مگر جنگ میں دفاعی وضع

اپنا نابرب فطرت کے خلاف تھا، سپاہیوں کی بہادری میں کلام نہیں تھا مگر ان کے اعصاب مضبوط ہو رہے تھے، طارق نے اپنی سپاہ سے خطاب کرنے کا فیصلہ کیا، وہ گھوڑے پر سوار ہوا، اور رکاب میں کھڑے ہو کر ایک دلولہ انگیز خطبہ دیا:

”اے لوگو! سمندر ہمارے پیچھے ہے اور دشمن سامنے، خدا کی قسم ایمان اور سچی پیہم کے سوا تمہارا کوئی سہارا نہیں، اور یہ ناقابلِ تسخیر ہیں، تعداد میں کمی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی، اس جزیرے میں تمہاری موجودگی ایک بنِ بلائے قیم کی سی ہے، دشمن ہتھیاروں سے لیس ہے، اس کے ذخائر وافر ہیں اور تمہارے پاس تلوار کے سوا کچھ نہیں، تم نے کچھ نہ کر دکھایا تو تمہارا بھروسہ کھل جائے گا۔ دلوں سے خوف نکال دو، میں تمہیں جس چیز کی دعوت دے رہا ہوں اُس کی طرف سب سے پہلے میرا قدم اٹھے گا، جہاں جہان کا خطرہ ہو وہاں سب سے پہلے میں خود موجود ہوں گا، جیسے ہی دونوں فرجوں میں بڑھ بیٹھیں گے، میں خود ان لوگوں کے مشکبہ سرغنہ پر حملہ آور ہوں گا، اگر میں راڈرک تک پہنچنے سے پہلے مر جاؤں تو میری جگہ اس منصوبہ کو تم اپنا لینا اور خود اُس پر حملہ کرنا۔“

طارق نے حور شمائلِ حسیناؤں کے متعلق چند الفاظ کہے۔

”اِس ملک میں چشمِ غزال رکھنے والی روشن جبینِ حسینا ہیں جنہیں عقد میں لا کر تم ہسپانوی شہزادوں کے داماد اور رہنوی بنو گے، ساتھ ہی اللہ کی راہ میں جہاد کر کے ایک اجنبی سرزمین میں اُس کے نام کا بول بالا کرو گے، اور یوں اُس کی رضا اور خوشنودی کے سزاوار ہو گے۔“

طارق کے الفاظ میں بجلی بھری تھی، زخموں سے چرغا زنی تازہ دم ہو گئے، سب کا ایک جواب تھا، ”ہم تمہارے ساتھ ہیں، جنگ میں ہم ہمیشہ پیش ہوں گے۔“

کیا تو نے صحرائِ شینوں کو بخت

اقبال

خبر میں، نظر میں، اذانِ حسریں

فضا میں فتح کی نوید تھی،

سابق بادشاہ وٹی زا کے بیٹوں کے ساتھ طارق نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ راڈرک کا ساتھ نہ دیں تو اُن کی ضبط شدہ جاگیریں بحال کر دی جائیں گی، ایک نازک موقع پر میمہ اور میسرہ پر مغین شہزادے اپنے دوستوں کے ساتھ میدان چھوڑ گئے۔ دایاں او بائیں بازو بے آسرا رہ گیا، اگلے روز مسلمانوں کے حملے میں شہید آگئی، سیکڑوں کا تھانہ اُن کی آہنی ضربوں تلخ لقمہ اجل بنے مگر مرکزِ جم کر بربروں کی پیرش روکنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا یورج کی کرلوں میں ابھرتے ڈوبتے برسوں کی چمک خیرہ کی تھی، غوغائے رزم اور جنگ کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا، لاشوں کے انبار لگ گئے۔ آخری ہلے میں مبین دلیار اور مرکز سے مسلمان پوری قوت سے حملہ آور ہوئے، بالآخر کا تھانہ فوج کا زور ٹوٹنے لگا۔ طارق سفید عامر اور زرد بخت پہنچے ہوئے تھا، وہ اور اُس کے ساتھی محافظ ہتوں کو تہ و بالا کرتے ہوئے راڈرک تک جا پہنچے جو حیرت پر مملع والی شاہی رتھ میں تخت نشین تھا، اس کے ساتھ ہی مرکز کی قوتِ مدافعت ختم ہو گئی اور میدانِ جنگ سے پسپائی شروع ہوئی۔ نصرانی فوج نے منتشر ہو کر راہ فرار اختیار کی اور مسلمانوں نے

اُس کا تعاقب کیا، دریا سے بریط کی جنگ یوں ختم ہوئی، اس جنگ کے اندہ پانچ سو برس کے لیے اہل ہسپانیہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔
دریا سے بریط کے کنارے لاؤرک کا گھوڑا "اولیا" ملا، گھوڑے کے پاس کیمپ میں لت پت بادشاہ کا ایک چل تھا جس میں موتی
اور یاقوت جڑے تھے، پھر اُس کا نام و نشان نہ ملا، اغلب ہے کہ میدان جنگ سے بھاگ کر اس نے دریا کی لہروں میں پناہ
لے لی ہو اور زرہ بخت کے بوجھ تلے ڈوب گیا ہو۔

رے نام اللہ کا،

ایک خونریز جنگ میں مسلمانوں کو فتحِ مثبتین حاصل ہوئی، لشکرِ اسلام نے تعداد میں تین گنا غنیم کو شکست فاش دی،
ہسپانیہ کی عسکری قوت پر ضرب کاری لگی اور مغرور گاتھ کا تختہ خاکی میں مل گیا، تاریخِ ملین یہ ایک فیصلہ کن جنگ تھی، جزیرہ
میں اور لڑائیاں بھی ہوئی مگر ایسی کوئی جنگ نہیں تھی جس کے مصفرات اتنے دور رس ہوں، ایک اندازے کے مطابق غنیم
کی ایک چوتھائی فوج میدان میں کیمپ رہی، دس ہزار جنگی قبیلے غلام بنائے گئے، اسلام قبول کرنے والے آزاد کر دیئے
گئے، برباط کا میدان شکستہ نواروں، ریرہ ریزہ نیزوں اور کٹے بجھے اجسام سے یٹا پڑا تھا، مسلم شہداء کی تعداد
تیس ہزار تھی۔

نقشب ہے کہ ایک حد تک شکست کا موجب کیونکر ہوا اور سیرونی حملہ آوروں کی اقلیت کیسے پوری قوم پر غالب آکے رہی؟
وہی گاتھ سپاہ تربست یا تہ تھی، وہ جنگی مشقوں سے واقف اور آلاتِ حرب سے آتینا تھی، ببادہ فوج کے علاوہ گھڑ سوار
کے دافروستے تھے، مزاحمت کا مچھتا ارادہ ہوتا تو وسائل کی کمی نہیں تھی، جزیرہ نما کے جنوبی کنارے پر طارقی کی گرفت ایسی
معنوب نہیں تھی، وہ ایک چھوٹے سے حصے پر بمشکل قدم جما پایا تھا، عسکری لحاظ سے وہی گاتھ ایک طاقتور مملکت تھی، غنیم
کی اخلاقی اور عسکری ریزی اُس کی شکست کا موجب ہوئی، بربروں نے اسلام کا جھنڈا سرزمینِ آندلس میں گاڑ دیا جو کم و بیش
پانچ سو برس وہاں غر سے لہرا رہا۔

جنگ میں کامرانی کا سہرا طارقی کے سر ہے جس کی عسکری قابلیت اور بے خوف قیادت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا
اُس کی ولولہ انگیز قیادت اللہ کے دین کے لیے وقف تھی، گو تکمل موسیٰ بن نصیر کے ہاتھوں ہوئی مگر فاتح ہسپانیہ کا لقب طارقی کو زیب
دیتا ہے، طارقی — جس کی مبارزت میں بجلی کی چمک اور بادل کی گرج تھی — راہِ شوق کا سفیر، بادِ مخالفت میں ہلکے گرم پرواز
دوتوں کے حق میں صادق الولا، دشمن کے مقابل تیغِ عربہ جو، تاریخِ اسلام کا رومانوی ہیرو، بے مثال جرأت و شہامت میں خالد بن ولید
اور عقبیٰ ابنِ نافع کا ہم پلہ، اُس کی جانبازی نے شام کی جانب خالد کے پرخطر سفر کی یاوتا زہ کی، جب اُس کا رہوار قی و دق صحرا کا سینہ
چرتا چلا گیا تھا، ممتاز عسکری اکابرین کی کتابِ طارقی میں طارقی کا نام جنگِ جگمگ کر رہا ہے۔

ماخذ : 1. THE MUSLIM CONQUEST OF SPAIN. BY LIEUT GENERAL

A. I. AKRAM.

2 ANDALUS : SPAIN UNDER THE MUSLIMS
BY EDWYN HOLE

رشتی کی لکیر

ڈاکٹر آغا سہیل

جیسے ہی اندھیری رات اُترتی ہے۔ میری آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھ جاتی ہے۔ کمرے کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیئے جاتے ہیں اور چونکہ اندر بیک آؤٹ ہوتا ہے، لہذا اندھیرا لایا ہوتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا، بس پھر میں بھی چادر اوڑھ کر بیٹ جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ کائنات سے میرا وہ رشتہ ٹوٹ گیا جس کا تعلق بصارت سے ہے اور اسی مقام سے میری سوچ اور فکر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سوچ پر کوئی قدغن نہیں اس لیے میں کچھ سوچتا ہوں جو بیان نہیں کر سکتا۔ اور جو بیان کرتا ہوں وہ، وہ نہیں ہوتا یا عین میں وہ نہیں ہوتا جو میں سوچتا ہوں، ابھی تک میری سوچ بھگانہ اور طفلانہ ہے یا میری خواہش طفلانہ ہیں میری سوچ سب سے پہلے پردوں میں رہنے والی خوبصورت عورت کے کمرے میں نقب لگا کر پہنچتی ہے۔ پھر میری خواہشوں کا تانا بانا اس کے دہکے ڈکڑے حال بنتا ہے اور اپنے حسبِ مرضی اسے جس طرح اور جس ڈھب پر چاہتا ہوں اٹھا بٹھاتا اور اس کی پرستش کرتا ہوں۔ اور اس کے ایک ایک عضو بدن پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہوں اور ایک ایک موئے بدن پر خدا ہوتا ہوں۔ معاً میری سوچ زندگی بھر کے دوسرے پردوں میں پھیلا لنگ جاتی ہے۔ جہاں ایک طوائف خضیہ طور پر روزانہ دو تین گاہکوں کو نطاشی ہے اور اپنے ناتواں اور کمزور شوہر کے نئے پانی کا بندوبست کرتی ہے۔ اور جب ایک بار پورے ایک ہفتے تک کوئی گاہک میسر نہ آسکا تھا تو وہ رات کے اندھیرے میں میرے پاس آئی تھی کہ کچھ روپے اسے اس کے جسم کے عوض دے دوں۔ اور جب میں نے جسم کے بجائے دیے ہی اسے روپے دینے چاہے تو وہ مجھے ایک غلیظ سی گالی دے کر اور روپے میرے منہ پر مار کر چلی گئی تھی۔ اس کے بعد سے آج تک اس نے میرے گھر کا رخ نہ کیا۔ یہاں سے ہمارے روابط کا خاتمہ ہوا، لیکن میری سوچ کا لامتناہی سفر کہاں ختم ہوا وہ تو اب بھی جاری ہے۔

لیکن میرے علاوہ کے یہاں خانوں میں دیے پاؤں میری سوچ کب چکے سے اُترتی ہے۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوتی اور لا شعور کے کباڑ خانے سے کیسی کیسی یادیں برآمد ہوتی ہیں کہ جن کا پہلے سے سان و گمان بھی نہیں ہوتا اور جب میں لا شعور کے ہاتھوں بڑی طرح تھک جاتا ہوں تو شعور کی سطح پر جو چیز سب سے پہلے ابھرتی ہے، بند کھڑکی کی جھری سے اندر داخل ہو کر دیوار پر پڑنے والی روشنی کی ایک باریک لکیر ہے۔ نہایت نمِغنی اور کمزور سی لکیر جو پہلے تو ایک جگہ پر قائم نظر آتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ اس میں تھر تھراہٹ اور کپکپاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یوں جیسے پانی کی سطح پر روشنی مرعش نظر آتی ہے۔ لیکن دراصل یہ لہروں کا ارتعاش ہوتا ہے، اسی طرح یہ دراصل جاری سوچ کی کرشمش اور ارتکا زنگ نظر کی لکپکپاہٹ ہوتی ہے، یہی وہ وقت ہوتا ہے جب مجھے خبر ہو جاتی ہے کہ سامنے والے مکان میں مالک مکان آچکا ہے اور اب وہ اپنے کمرے میں بتی جلا کر اپنے کاموں میں مہمک ہو چکا ہے اور یہ اس روشنی کی باریک سی لکیر ہے جو میرے کمرے میں در آتی ہے۔

مجھے اس پُر اسرار شخصیت سے دلچسپی بھی ہے اور میں اس سے خائف بھی ہوں۔ پُر اسرار اس لیے کہ آج تک یہ نہ کھل سکا کہ وہ کون ہے اور کہاں غائب رہتا ہے اور یوں رات گئے آتا ہے اور رات غائب ہو جاتا ہے۔ دن کو دیکھو تو ایک جتید سانپا لادرواڑے کے گڈے میں پڑا رہتا ہے کیسی کجیاں اگر کوئی تعطیل ہوتی تو میں دن بھر اس ٹوہ میں لگا رہتا کہ دن کی روشنی میں شاید وہ نظر آجائے کہ میں اس کا حلیہ رنگ رڈپ ناک نقشہ دیکھ سکوں اور قریب سے نہ سہی تو دور ہی سے کوئی شناسائی حاصل کروں، مگر تو بے سمجھے یہ ایس خیال است محال است و خون کے مصداق، مطلقاً ایسی کوئی صورت نہ نکلی۔ میں نے بھی سوچا کہ جو تجسس مجھے اس کے بارے میں ہے کیا، دوسرے پڑوسیوں کو بھی ہے۔ مثلاً بتیج جی سے شطرنج کھیلے۔ ہوتے ہیں نے کئی بار پوچھا، ذرا اپنے پڑوسی کا حال چال بھی تو بتائیے، فرمانے لگے ”کوئی ذی روح ہوتا اس کا ذکر کیجئے بھلا کسی چھلا دے حق بھوت سائے کو کسی نے دیکھا ہے؟“ اسی طرح ایک روز راہ چلتے چودھری صاحب سے عرض کی ”نند چودھری صاحب کچھ ہمارے پڑوسی کے کردار پر روشنی ڈالے۔“ ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے میرے کان کے پاس منہ لگا کر بولے ”بس اس کا جیر چرنے کیجئے گا، بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ کوئی شہید مرد ہے۔“ میں نے کہا ”نہیں جناب اس زمانے میں بھلا یہ کہیں یقین کرنے والی باتیں ہیں۔“ بولے ”آپ نئی روشنی کے آدمی ہیں ہم نو فرآن و حدیث کو صرف حرف صحیح مانتے ہیں۔“ میں نے کہا ”یہ کیوں یقین ہو کہ وہ عورت ہے کہ مرد؟“ بولے ”مرد سو بیسویں مرد۔“ عرض کی ”یہ کیسے علم ہوا؟“ فرمایا ”اس کا سایہ دیکھا ہے جو بہر حال ایک مرد کا سایہ ہے۔“ سر پر بڑی صاف نظر آتی ہے۔ میں نے چودھری صاحب سے ازراہ مزاح المومنین کہا ”نند، بھابی صاحبہ جب غسل فرما کر سر سے تولیہ لپیٹ کر میکسی پہن کر گھر سے برآمد ہوتی ہیں تو کیا ان کا حلیہ عین میں یہی نہیں ہوتا چودھری صاحب بُرا مان گئے۔“ سلام علیکم کہہ کر غراپ سے اپنے گھر میں اور دھڑاک سے دروازہ بند کر کے اعتکاف میں بیٹھ گئے، چار و ناچار ایمان لانا پڑا، کہ بھئی ہو گا چلو مردی ہو گا، مگر یہ کیسا مرد کا بچہ ہے کہ نہ گھر میں عورت دات نہ اس پاس کی تو بے شک حسین عورتوں کی تاک بھانکے ایک روز مجھ سے ضبط نہ ہوا تو قریب کے مکان میں جو ایک ریٹائرڈ ایس پی رہا کرتے تھے اُن کے پاس کسی بہانے سے پہنچ گیا اور باتوں باتوں میں کہا کہ ”میاں جی اس ذاتِ شریف کے بارے میں کچھ علم ہو تو فرمائیے کہ کوئی سمگلر ہے ڈاکو ہے چور ہے کیا ہے کیا؟ کیوں کسی خیر نی کار و بار میں ملوث تو نہیں؟“ موصوف نے پہلے تو ایک زوردار فقہیادشا فرمایا، پھر اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاناؤ دیا اور میرے کندھے پر اس زور کا دھماکا رسید کیا کہ میری ٹہری پسلی ہل کر رہ گئی بولے ”برخوردار شاہین کی نگاہ سے میری، تیس سال پولیس کی نوکری کی ہے بھاڑ نہیں جھونکا، سارے خفیہ ریکارڈ چھان مارے، سب صاف ہے، میرا خیال ہے کہ یہ کوئی پاگل داگل ہے جو انی میں عشق و شوق ہوا ہو گا، ناکام ہو گیا، بس معشوقہ مرکھپ گئی ہوگی۔ اسی کی قبر دیر پر مجاوری کرتا ہو گا، رات آکر میاں پڑ رہتا ہے، بس جی کسی دن خود بھی مرکھپ جائے گا، چلو معاملہ صاف ہے۔“ میں نے کہا ”میاں جی کھانا، کپڑا، نااقی دھوبی، مکان، پانی، بجلی، اٹروس پڑوس، آخر معاشرہ ہے، سماج ہے یا معاشرے میں رہتے ہوئے بھی حضرت رو بہن شُن کر دوسو بن کر رہے ہیں؟“ ایس پی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے فلسفیانہ انداز میں کہا ”پتہ یہ زندہ آدمی نہیں ہے۔“ یہ زندہ مردہ ہے اور مردہ زندہ ”میاں جی کا یہ فلسفہ مطلقاً میرے پلے نہیں پڑا، لیکن مزید فلسفہ بگھارنے کا میں نے اُنہیں

موقع نہیں دیا اور اتنی ہی معلومات پر قناعت کر کے بیٹھ رہا اور سوچا کہ ہرچہ بادا باد، اب از خود جو کچھ معلوم ہوگا، ہوگا ورنہ بہشتی ہم نہ مغربی کی کریں گے اور نہ بھیجا کھپاتیں گے۔ ہاں ایک آدھ بار یہ ضرور ہوا کہ مشکوک جال چلے والی عورت اور اس پُر اسرار آدمی کے مابین رشتے کی کھوج لگائی مگر نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں اپنی اپنی منزل کے راہی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے مطلقاً بے نیاز ہیں؛ حسین اور خوبصورت عورت اپنے مائلی خواہشیں میں اس درجہ متغیر تھی کہ اس باب میں سوچنا ہی فضول تھا۔

ایک لڑکی نے خبر سنا کہ سڑک پر شدید ہنگامے کے سبب آنکھ کھل گئی۔ دروازے اور کھڑکیوں سے بار بار جھانک کر دیکھا تو سمجھ میں یہ آیا کہ مشکوک جال چلے کی عورت چیخ چنگھاڑ رہی ہے۔ بہت سے لوگ منہ پر ڈھانٹے بازو ہاتھوں میں رانٹیں لیے کھڑے ہیں اور گاہے گاہے ہوائی فائر کرتے ہیں، عورت کو زور دے رہے ہیں اور بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ باہر سڑک کی کڑور رستی میں بس انسا ہی دکھائی دیا۔ عورت جب بھی چیختی چلاتی مدد کے لیے ہم میں سے ہر ایک کا باری باری نام لیتی ہوئی ہمارے دروازوں کی طرف بھاگتی دوڑتی تو غصے اُسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے کیسی وہ میرا نام لیتی کیسی میاں صاحب کو پکارتی، کیسی چودھری صاحب کو اور کبھی سنجھی کو، مگر ہم میں سے کسی کو باہر نکلنے اور غصہ اُسے اُسے بچانے کی توفیق نہ ہوئی۔ ہر شخص سون کھینچے اندر دیکھا پٹارہا، مسلح غصہ سے غصے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی، نیکیں اچانک میرے سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا اور ایک سیاہ سیاہ دوڑتا ہوا عورت کی مدد کو گیا، کچھ فائر ہوئے اور منہ پر ڈھانٹے بازو ہاتھوں سے مسلح غصے اپنی اپنی موٹر سائیکلوں پر بھاگ گئے، البتہ عورت کے زور زور سے مدد کرنے اور مدد کی آواز آتی رہی۔ جب سب اہل محلہ کو ڈاکوؤں کے چلے جانے کا ممکن یقین ہو گیا تو باری باری ایک ایک دروازہ کھلنے لگا اور لوگ باگ باہر آ کر عورت کو جھوٹی تسلیاں دینے لگے۔ سب سے آخر میں، میں باہر نکلا۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ میرے اسی پڑوسی کی لاش تھی جو ہمیشہ میرے لیے اور دیگر اہل محلہ کے لیے اپنی زندگی میں پُر اسرار بنا رہا تھا، وہ آج بھی پُر اسرار ممت مر گیا۔ اس کا چہرہ تیزاب سے تھکس کر مسخ ہو چکا تھا جو مسلح غصہ نے عورت پر پھینکا چاہا تھا اور اس کا سارا جسم گولیوں سے چھلنی تھا اور عورت سسک رہی تھی۔

”بیس سو بیس“ (طنز و مزاح)

ارشاد میر

۱۹۸۷ء کا سورج طلوع ہوئے چند ماہ ہو گئے یعنی ابھی ابتدائے عشق ہے اور ہم نے اپنے معنوں کے لیے عزائم بخوینہ کر لیا ہے۔ ”بیس سو بیس“ خدا نخواستہ اس کا بدنام عدد چار سو بیس سے کوئی رشتہ یا واسطہ نہیں ہے۔ ویسے یہ نام ہنجر عدد دہنی آفتی پر اسی طرح مستطہ ہو گیا ہے۔ جیسے اسرائیل عرب ممالک کے اعصاب پر سوار ہے۔ سوچنا ہوں جب ہم اس عدد کی لپیٹ میں آ ہی چکے ہیں تو پھر آج سے غنیمتیں برس بعد کا تصور تھمتا ہی ذہن میں لانے کی سعی کیوں نہ کریں، یعنی بقول اقبال

فکرِ فردا کہوں مجھ غمِ دوش رہوں

گویا ٹھیک میں سو بیس یا ہو سکتا ہے اس سے دو چار برس اور صبر یا ادھر ہی کوئی دھماکہ ہو جائے اور کرہ ارض نیست و نابود ہو جائے یا پھر انسان کوئی ایسے معرکے سر کر لے کہ خود ہی درطہ ہجرت میں ڈوب جائے اور سرش متعلیٰ پر ملا کر یہ کہنے پر مجبور ہو جائے۔ مارا ازیں گیا و ضعیف ایں گساں ہنود

(ہمیں اس نکلے سے اُمید نہ تھی کہ یہ کار نمایاں کرے گا۔)

دیکھا جائے تو اس وقت بھی قیامتِ صغریٰ کی چند ایک لفظ ہمارا ہونوئی اور کئی ایک جانی پہچانی نشانیاں ضرور کاغذ میں جھٹک ڈال دیتی ہیں، لیکن فی الحال یا مستقبلِ قریب میں اصلیت و ڈوی قیامت کی حتمی تاریخ کا سراغ نہیں لگا یا جاسکتا البتہ موجودہ نسل کی کارستانیوں دیکھ کر سادہ لوح اور خدا ترس حضرات مصر ہیں کہ موجودہ حالات کو قیامتِ صغریٰ کے تمہیدی مرحلہ قسلس کی ایک کڑی میں شامل کیا جائے لیکن مردِ مست ہیں کوئی ایسی تشویشناک صورت نظر نہیں آتی، کیونکہ خود روئے لگاؤ نسل کی من مانی کا رد و ایوں کے باوجود ہر حال ابھی تک اتنی نہیں گزری۔ اگرچہ حالات پر بزرگوں کی معزول شدہ بزرگی کی گرفت نمایاں ڈھیلی پڑ گئی ہے جس کے ایک لحاظ سے وہ خود بھی ذمہ دار ہیں۔

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سس غیروں کی بات

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں،

لیکن نامساعد حالات کے باوجود شہرِ یاد کا گہرا سہی کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن بحرے کی ماں آخر تک خیر منابگی کرنا ظفت نسل تو اپنے موجودہ اور سابقہ اسلام کے اپریشن کلین اپ کے منصوبے کو آخری شکل دے چکی ہے۔

اگر خائف سے پردہ پوشی کو تیرہ نہ بالیا جائے تو موجودہ صدی بھی اب تنہی مادی، سسکتی، بکیتی منڈلاتے خطرات سے بچتی بچاتی اور سرچھپاتی پھرتی ہے اور اپنی خیریت کے متعلق خاصی پریشان ہے کہ کہیں اس کے سر قیسی عالمگیر جنگ بھی نہ ٹھوپ دی جائے اور یوں سالہ صدیوں کے جلد ریکارڈ ٹوٹ کر کلنک کا ٹیکہ تہیث کے لیے اس کے چہرے کو داغ دار کر جائے۔ شاید اسی حوالے سے موجودہ صدی سفنوں اور مہینوں کا کام لمحوں میں ختم کر کے ہر لحظہ پابن کا ہے۔

مذمت سے سر برقی ہے کاشانہ ہمارا

ہر لحظہ یہ عالم ہے کہ میں اور نہیں ہیں

اور یوں خاتمہ بالآخر کی مندرجہ ہے جس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس صدی کے باقی ماندہ تیرہ برس بڑی عجلت اور تیزی سے گذر جائیں گے اور پھر ان کی دیکھا دیکھی اگلے بیس برس بھی پلک جھپکنے میں ہی بیت جائیں گے۔ جہاں قبل ازیں ہزاروں صدیاں ایسا کام تمام کروا چکی ہیں وہاں ان گنتی کے سالوں کی مبلغ حیثیت کیا ہے کہ انہیں خواہ مخواہ سُرخاب کا پر لگاتے پھریں اور دیے بھی ہیں وقت کی کونسی قدر و منزلت ہے جو گھبراتے پھریں، کہ چشم بدودر طبعاً بے پروا اور عادتاً بے نیاز مخلوق سے غفلت رکھتے ہیں۔

ہاں نوذکر خیر کس زمانے کا تھا جسے ہم نے ٹاکرٹ بنا یا ہوا ہے اس وقت شاید ہم بقید حیات ہوں یا ہو سکتا ہے راہی ملک مدہم ہریکے ہوں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لگے ہاتھوں اور نہیں تو کچھ پیشگوئیاں ہی کرتے جائیں ممکن ہے آپ کسی تنگ میں آکر پوچھ لیں کہ کیا ہم علم نجوم کے ماہر ہیں۔ یا مٹری سے شد بد رکھتے ہیں یا پھر ہن کالے علم یا ٹونے ٹوٹھے سے شناسائی ہے تو اس ضمن میں بندہ پروردہم آپ کو آگاہ کیے دیتے ہیں کہ اس نوع کے سوال پوچھنے سے اجتناب کیجئے تاکہ آپ کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔ وقتی طور پر ہم ان سوالوں کے جواب میں مکمل سکوت اور خاموشی ہی اختیار کریں گے یا بطور جواب آل غزل آپ سے استفسار کریں گے۔ کہ یہ جو ہر سال قومی اور بین الاقوامی سطح پر بے پناہ پیشگوئیاں بڑے دھڑلے سے کی جاتی ہیں اور اکثر سو فیصدی غلط ثابت ہوتی ہیں یا بغرض محال کوئی ایک آدمہ کلیتاً یا جزوی طور پر اگر یہ اتفاقاً ہی ہے، درست ثابت ہو جائے، تو درائع ابلاغ وہ طوفان (بکہ طوفان بدقیزی کہنا زیادہ سوزوں ہے)، سر پر اٹھاتے ہیں کہ الامان والحفیظ لیکن وہ پیشگوئیاں جو بادی النظر میں ہی بے سرو یا اور مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ صریحاً غلط ثابت ہوتی ہیں اور نتیجۃً دل کی دھڑکن بڑھانے کا باعث بنتی ہیں چہرے پر ہمایاں اڑاتی ہیں۔ نزدک سسٹم بریک ڈاؤن کرتی ہیں۔ بلڈ پریشر کو متوک کے حساب سے پروان چڑھاتی ہیں۔ سر کو ٹوک طرح گھمانے اور آنکھوں کے آگے اندھیرے کی لامتناہی پرچائیاں لانے کا سبب بنتی ہیں یا بڑی شان درباری سے خوف دہراں کی فضا پیدا کرتی ہیں، کیا ان کے خلاف کبھی کسی نے رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ کوئی قانونی نوٹس دینے کی زحمت گوارا کی ہے کبھی ازالہ حیثیت عرفی کا دعوے دائر کرنے کا سوچا ہے کسی حاکم وقت نے اسے توہی اور تذلیل انسانیت کا ترکب ٹھیرایا ہے۔ اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر اگر ہم اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کے لیے پُر تول رہے ہیں تو پھر آپ فہم بردار بوزن لٹھ بردار ہم پر کہیں سوالات کی بوجھاڑ کرنے کی مٹان چکے ہیں۔ چلیے ہم آپ کو امتحان میں نہیں ڈالتے، بلکہ

دوسروں کا انکار کرنے سے بھی بچا لیتے ہیں اور برعلائے اعتدال کرتے ہیں کہ ہم پیشہ ور نجومی تو کجا علماء اس علم سے ہی مخفی صمت رکھتے ہیں۔ البتہ گاہے گاہے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ادب کو تھوڑا بہت منہ ضرور مار لیتے ہیں بلکہ اس کی بقا۔ اور پاسداری میں بھی پیش پیش ہیں۔ اس لیے جب ہم دیکھتے ہیں کہ جو ہنر سائنس دانوں نے چاند پر پہنچ کر اس کا سمجھا چٹھا کھولا تو پوری دنیا میں ان کی اس والہانہ انداز میں پذیرائی ہوئی کہ بابر و شاید اور یہ سائنس دانوں کو چاند کی طرف، پرداز کا خیال آیا تو یہ سارا تصور علامہ اقبال مرحوم کا ہے۔ کیونکہ انھوں نے یہ جملی نہیں کھائی تو نشان دہی جو کر دی۔

”تاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں“

تو بس وہ جگہ ہے کہ دیوانہ وار ہوئے بس است یعنی دیوانوں کو جن کے دورے کے لیے بس چکر دینا کافی ہے۔ سائنس دانوں نے فضاء آسمانی کے چکر لگانے شروع کر دیے اور اب اس خلائی جاسوسی سے نسل انسانی کو خفا کرنے کے لیے فضا میں سورج قائم کرنے بلکہ ٹیکسٹیاں قائم کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ بہر حال اب ان کے حوصلے بلند ہیں، بلکہ کل کلاں کو ان کے مبارک ہاتھوں سے تاروں کا بھی چاند سے ملنا جلتا حشر بپا ہونے والا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت پھر انہی سائنس دانوں کے لیے باجماعت مبارک سلامت کی آوازیں سننے سنانے میں آئیں گی۔ اگر فی الواقع ایسا ہوا تو یہ شعر و ادب کے پروانوں کے لیے دعوتِ فکر ہے۔ کیونکہ چاند کے معاملے میں تو شاعروں نے انتہا پسندی اور مبالغہ آرائی میں خاصی کوتاہیاں برتی تھیں۔ لیکن تاروں کے متعلق ان کا رویہ خاصہ معتدل اور حقیقت پسندانہ ہے۔ بلکہ غالب نے تو انھیں بڑی مہارت اور چابکدستی سے دلچسپ پیرائیں بادی گر بنا دی ہے۔ اس لیے اگر سائنس دانوں نے تاروں کے بارے میں حلیہ یا دیگر کوئی چاند سے ملنا جلتا اعشاش کیا تو اس کا کرڈٹ ہرگز انھیں نہیں لینے دیں گے۔ بلکہ اس کا سہرا بالعموم وانشوروں اور بالخصوص حضرت غالب کے سر ہی بند ہو جائے گا۔ اگر ممکن ہو تو اس شوق کو نہ ملنے کی صورت میں عالمی عدالت انصاف تک لے جانے سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا اور غالب یہ واحد مسئلہ ہوگا جس میں بھارت بھی ہمارا سمجھتا یعنی مصر عثمانی ہوگا۔ بلکہ وائے، درے، ندے، بستے دست تعاون بڑھائے گا۔ کیونکہ وہ ہر وقت عالمی رائے عامہ کی آنکھوں میں دھول بھونکنے کا مذاق اور مذاق ہے اور اس کے پیش نظر نام نہاد سیکر حکومت کی کرشمہ سازیاں بھی ہوتی ہیں جن کو ثابت کرنے کے لیے وہ اقلیتوں کو ڈلا کر ان کی اٹھک شہوتی بھی کرتا ہے۔ اور اس مقصد کی تحیل کے لیے کوئی دھوکئی چکر چلائے دکھانا ہے بلکہ اس کا تو قومی نشان ہی چکر ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی بھی غالباً اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ بلکہ ان کی دیکھا دیکھی دوس نے اپنے ہاں ایک مچھل کا نام غالب رکھ کر حق دہستی بھی نبھایا تھا۔ البتہ یہاں ایک چیز تشریش کا باعث ضرور بن سکتی ہے۔ کہ اگر تاروں کے منہ میں کہیں دوس کو امریکہ پر برتری حاصل ہوگئی تو پھر دوس کی قیمت پر بھی غالب کی دال نہیں گھنے دیں گے اور وجہ ظاہر ہے کہ اگر یہ صورت بنی تو محبت بھی سر تسلیم خم کر دے گا، کیونکہ روپوں کے تدبیر :

”یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں اُسے“

ان حالات میں پھر اس مسئلہ کو یہ۔ این۔ اوہی میں لیجا یا جا سکے گا۔ کیونکہ وہ بھی تو اب ایک نمائشی ادارے کا ڈوپ دھار چکے

جس کی خاص طور پر مشہور طاقتوں کے سامنے کوئی پیش نہیں جاتی کہنے کو تو اس نے سعدی شیرازی کے
بنی آدم اعضائے یک دیگرند

قسم کے مشہور اشعار کو اپنے چارٹر کا حصہ بنا کر دیواروں پر جلی حروف میں لکھوا بھی لیا ہے، لیکن عملاً ان اعضاء کی بین الاقوامی سطح پر
جو قطع و برید ہو رہی ہے۔ قتل و غارت سے ان کا جس طرح قہمہ اور قتلے بن رہے ہیں۔ انسانیت کی جو تذلیل اور بے محنتی ہو رہی
ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یوں گتہ جیسے اشعار انسانیت کا منہ چڑا رہے ہیں۔ انسانیت سوز مظالم پر بیچاری کڑی یوں۔ اینک
جس کا غازہ بھی اب اتر چکا ہے۔ بلکہ جس نے برقی اور جوہری توانائی کو زندگی کے لیے سانس سے بھی زیادہ لازمی بنا لیا ہے بقول
شاعر :-

آشیاں برق کے پہلو میں بنا رکھا ہے
جانے ان جلوہ پسوز کو خبر ہے کہ نہیں

اعضاء کی بات چلی ہے تو مہسکتا ہے۔ اس دور کی نسل بڑی حیرت کا اظہار کرے کہ گزشتہ صدی کے لوگ کتنے جاہل، حوثی
اور بے علم تھے۔ کہ انہیں نہ تو اعضاء کی پریندکاری کا پوری طرح علم تھا اور نہ اس حقیقت سے ہی کا حقہ واقف تھے، کہ
ان اعضاء کو معدوروں کے لیے بہ طریقِ آس کی کام میں لایا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ جب بیسویں صدی کے دوران یورپی ممالک میں
اس فن کا اچھا خاصہ چرچا ہوا۔ تو پھر بھی اپنے ہاں کے لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہ رنگی اور وہ اپنے اسلات کی مانند
اپنے اعضاء سے بستر مرگ یا مرنے کے بعد بھی جذباتی برداشت کرنے پر رضا مند نہ ہوئے۔ اور یوں اپنی جہالت، حماقت اور خود غرضی
سے کئی قیمتی جانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کا باعث بنے۔ انہیں خود تو جانوروں کا گوشت چٹھارے لے لے کر کھالے ادا
ان کے جتنے بخرے کرا کر احباب کو بلا کر کھلانے کا شوق تھا، لیکن وہ اعضاء کے علاوہ اپنے خون کے ایک ایک قطرے پر بھی
دیوانہ وار خدا تھے۔ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ مرنے کے بعد بھی اپنے اجسام کو خوشبوؤں کے چھپر کاو سے آراستہ کراتے تھے اور
بڑے تزک و احتشام سے مومن و عمن مردہ حالت میں بھی چارپائی پر دراز ہو کر یا ریتی پر لے جا کر دفنانے اور جلانے جاتے تھے۔
حد یہ ہے کہ یہ ان کے لوجہیں بھی اتنے سعادت مند اور احمق الذہن تھے کہ وہ بھی انہی کے کہنے پر عمل پیرا تھے اور ان کی دُعا
پر بھی ان کے جسم کا کوئی حصہ اپنے کسی قرابت دار کو کسی قیمت پر یا تحفہ کسی دوست کو دینے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے۔

تذبح کی جاتی ہے کہ اکیسویں صدی کا روشن خیال اور الٹا ماڈرن طبقہ سن طبعیت کو پہنچتے ہی اپنے اعضاء و قوت
علی الاطفال کر دیا کرے گا، بلکہ کئی ایک اعضاء سے محروم معاملہ نہم حضرات تو اپنے جگری دوستوں سے تقاضا کریں گے کہ وہ
انہیں مختار نام یا حلف نام تحریر کر دیں تاکہ وہ حسبِ منشاء بغیر کسی رکاوٹ کے انکی وفاتِ حسرت آریا سے (یعنی جن کے
مرنے کی دوسروں کو حسرت تھی) پر اعضاء کا صحیح مصروف کر سکیں کئی ایک خدا ترس بڑا مہ وصیت نامہ کی مود سے سختی افراد
کے لیے اپنے اعضاء کی تقسیم کر جایا کریں گے تاکہ ان کے وارثان ان کے اعضاء کو غیر محفوظ یا غلط ہاتھوں میں منتقل نہ کر دیں
یا ان کے دام ہی اتنے لگا دیں جو کوئی خرید ہی نہ سکے۔ البتہ امکانِ غالب ہے کہ اس زمانے میں خون کی تبدیلی یا خون کا حاصل

کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ بلکہ تادہ خون کی وکانیں بھی عام کھل جائیں گی (اور یوں لوگ لیے اثر خون فروخت کرنے والے پیشہ وروں کے چنگل سے ٹھیکارا حاصل کر لیں گے)

اس زمانے کے بچے بڑی جبریت سے پڑھا کریں گے کہ ربح صدی پہلے تک بازار میں انسانی گردے، دل، بھیمپڑے، ناک، کان، ہونٹ، اماند، ٹانگوں، سر یا پاؤں وغیرہ کے بچے کا تفتور تک نہ تھا۔ (یاد رہے کہ یہ بچے بجز تہذیب کا ٹریڈ میں علم حاصل کرنے کے لیے مدرسوں میں جایا کریں گے اور محکمہ کے سائے میں پڑھائی ہو کرے گی اور یوں علامہ اقبال رح کے کئی دیگر مصرعوں کی طرح یہ مصرعہ بھی بہ تصرف ادنی الہامی ثابت ہوگا۔

تو یوں کے سائے میں ہم پڑھ کر جواں ہوئے ہیں)

لے دے کریں مصنوعی دامنوں اور بالوں کا سسٹم رائج تھا، اور پھر دانت بھی ایسے کہ باغی کی طرح کھانے اور دکھانے کے اور ہوتے تھے۔ جو کئی مرتبہ بھری مغل میں پوری تنہائی کر کر ہوش و حواس اڑانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ یعنی اوقات کھانے کی میز پر کسی کے مصنوعی دانت بوٹی کے ساتھ باہر اگر دوسرے نازک مزاجوں کا کھانا پینا حرام کر دیتے تھے۔ جہاں تک مصنوعی بالوں کی وگ کا تعلق تھا، وہ نہ ابد میں سے کسی ایک کو سمجھتی تھی، ورنہ اکثریت کی آنکھوں کو سوزانے کی بجائے بگاڑنے کا سبب بنتی تھی۔ البتہ اس کی گرتی ہوئی ساکھ کو ایک حد تک جھجوں نے ضرور بہارا دیا تھا۔

اعضاء کا ذکر خیر ہو رہا تھا تو اس وقت تک ان کو تادیر محفوظ رکھنے کے لیے بھی اچھا خاصہ انتظام و انصرام ہو جائے گا ہو سکتا ہے ان کے لیے گارنٹی شدہ خصوصی کولڈ سٹوریج بھی بن جائیں۔ البتہ اعضاء کی منتقلی میں انتہائی محتاط ہونا پڑے گا اور کوئی بھی عضو لینے سے پہلے اس کے اصل مالک کا حسب نسب دریافت کرنا ہوگا اور خاص طور پر اس کے مزاج و طواری کی جانچ پڑتال ضروری ہوگی تاکہ نووارد اعضاء کی انسان کے پیدا کشتی اعضاء سے خاصہ جنگی کی صورت نہ بن جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر عضو نیامت کے دن انسان کے منی میں باخلاف و اشکاف الفاظ میں گواہی دے گا بلکہ اپنی تمام تر کوتاہیوں اور لغزشوں کا بھی اسے ہی ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ اگر کسی عضو کا سلفز ریکارڈ درست نہ ہو تو اسے کسی قیمت پر بھی نہیں جڑوانا چاہیے۔ کیونکہ ہمیشہ ایک پھلی ہی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے اس لیے احتیاط لازم ہے تاکہ نووارد عضو کی آمد سے

خود تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

والی کیفیت پیدا نہ ہو جائے۔

جہاں تک اعضاء کا مردہ جسم سے زندہ جسم میں گئے کامسئلہ ہے، تو ظاہر ہے، وہ اپنے تئیں خاصے مشرور ہوں گے کیونکہ اس طرح وہ مزید ایک عرصہ تک طے یا خاک بسر ہونے سے بچ جائیں گے دوسرے مدچار اور رنگ ڈھنگ کے آدمیوں سے چھٹ کر بوتلوں تجربوں سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ لوگ شعرا و ملا میڈار حمل کی پیشگوئی کی صداقت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں اس وقت کے جاہل سامعین اس شعر کا مطلب نہ سمجھے، پر اب سمجھ جائیں گے،

ہم نے اُن کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلچر رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا

یہ شریعت ہمارے ایک واجب الاحترام مرجع اور سخن فہمی میں یکتا بزرگ کے سامنے پڑھا گیا۔ تو وہ فوراً بولے واہ یہ آدمی جاپانی میڈٹین کے پرنسپل کا بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک سوال بار بار ذہن میں آجھرتا ہے کہ اگر کسی سر پھرے نے مذکرہ فارمولے پر عمل نہ کیا اور بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغیر دیکھے بھلے کسی بے حرمت کی آنکھ، پتھر دل کا کلچر، بے عزیت کا پتہ، منکوں مزاج کا جیجا، لائی لگ کے کان، سوختہ سامان جگر، نکستی نہ بٹھانے والا ناک، تیوری جرمی پیشانی کو بھی گستاخ و متنا کہہ کر قبول کر لیا (چونکہ اعضا زنا نہ بھی ہوں گے، اس لیے ایجاب قبول کی ترکیب بھی بعض صورتوں میں بے عمل نہ ہوگی) تو اس سے جو مہینے تاج برآمد ہوں گے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ایسی پیوندکاری سے تو انسان لٹو دیا ہی بھلا البتہ وائس و ساء میں خندہ پیشانی، گستاخ دلی، یا قوت ہرنٹ، عزالہ چشم، محرومی انگلیاں، ستواں ناک، سڈول پنڈلیاں وغیرہ نصب ہو جائیں تو پھر کیا کہنے۔

اعضا کے اس دھندے میں کراٹا تناسبی اور ممکنہ نیکر کا کام خاصہ بڑھ جائے گا کیونکہ بعض اوقات ایک ہی شخص کے کئی مرتبہ اعضا تبدیل ہونے پر علیحدہ علیحدہ کھانے کھانے پھرنے پھرنے گئے۔ بلکہ سابقہ ریکاڈ پر بھی کڑی نگاہ رکھنی ہو گی۔ شاید وہ ان حالات میں المیہ میاں سے اعدائے نام کے لیے عرضی بھی گزار دیں، کیونکہ تقاضا یا مطالبہ کی جرأت کرنے سے تو قاصر ٹھہرے۔ اسی طرح ہڑتال کی دھمکی دینا بھی ان کے بس کا روگ نہیں ہو گا۔ غالباً یہ نوان کے دائرہ اختیار میں نہیں ہو گا (یہ سوغات تو خالص زمینی ہے) خیر چلیے یہ ذکر اٹا کا تبسین یا ٹیکرین کے ذاتی مسائل میں اور ہم کیوں پر اتنے پھٹے میں مانگ اڑاتے پھریں، ہو سکتا ہے کہ اسی اندلیچہ کے پیش نظر کسی دُور بین عاقبت اندیش شاعر نے زندگی ہی میں ٹیکرین کو یہ دھمکی دے دی ہے۔

قسم خدا کی کہ ہر دم بے لفظ سنائیں گے

لحد میں ہم سے ٹیکرین مگر سوال کریں

(دیے یہ دھمکی ٹیکرین کی سمجھ میں نہ آئے گی کیونکہ اسے محاورے میں بے لفظ کے اور معنی ہیں اور عربی کے لحاظ سے بے لفظ کلمہ شریف ہے۔ دھمکی تو ہے بیکین ذومعنی ہے) یہاں منہل شہنشاہ اکبر کے اہم ترین رتن فیضی یاد آگئے جنہوں نے قرآن پاک کی بے لفظ تفسیر لکھی تو یار لوگوں نے کہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس پر کفر کا فتوے صادر کر دیا۔ جس پر فیضی مرحوم کی جانب طبعی ہوئی، جس نے بھری عقل میں اپنی صفائی میں بس اتنا کہا کہ اگر خاکم مدین بے لفظ تفسیر کفرانہ عقل ہے تو پھر کیا فرماتے ہیں۔ علمائے کرام اور فضلاء عظام بارے کلمہ طیبہ کے جس پر سبھی لاجواب ہو کر رہ گئے تو صاحبو اگر فتوے کی بات پھیر دیں گے تو اس ضمن میں ہم قطعاً پیش گوئی کرنے کی پوزیشن میں نہیں کر آیا آئے والے مقررہ وقت پر ان کی مانگ بڑھے گی یا کساد بازاری کا شکار ہوں گے اس لیے کہ ہر دو صورتوں میں

یا اپنا گریباں چاک یا ماہین یزداں چاک

ہونے کا اندیشہ لاحق ہے جو ہمیں ہی نہیں شاید آپ کو بھی قابل قبول نہ ہو۔
 المذہب اس وقت لوگ یہ جان کر خندہ استہزاء کا اظہار ضرور کریں گے کہ گزشتہ صدی کے آخری عشرہ تک اچھے خاصے معقول اور ذہین فطین لوگ بھی زبان دکھا کر اور نبض پر ہاتھ رکھ کر نسخہ لکھواتے تھے۔ ہینال کا نام سنتے ہی پورے جسم پر کھپکپی طاری کر لیتے تھے۔ اور بڑی خود اعتمادی سے چار پائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان جان آفریں کے سپرد کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔
 اسی طرح یہ حقیقت جان کر بھی خاصی مایوسی کا اظہار کریں گے کہ ہمارے سادہ لوح بزرگ اچھے خاصے رجعت پسند دنیاؤں اور کبیر کے فقیر تھے۔ جو اپنے ہاں منکوحہ بیویاں رکھتے تھے۔ ان کے ہاں کسی گول فرنیٹ یا بولے فرنیٹ کا تصور ہی نہ تھا اور انکو کوئی آزاد منش لڑکا فرسودہ روایات کے بندھن توڑ کر کسی نٹ کھٹ لڑکی سے یا کوئی روشن خیال لڑکی کسی آوارہ غلام لڑکے سے محبت کی بیگیں بٹھا لیتے تو اگلے وقتوں کے یہ لوگ سیخ پا ہو کر ان بچوں پر عرصہ جیات تنگ کر دیتے لیکن ان پر اس قدر ستم روا رکھے جاتے کہ گھر کا ماحول تھانے کی اذیت گاہ سے بھی بدتر دکھائی دیتا، حالانکہ آج کل تو امریکہ میں مصنوعی بیویاں محض گرین کارڈ کی شرائط پوری کرنے کے لیے رکھنا ایک عام فیثن بن چکا ہے۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اختتام پر ہنگامی اور خوراک کی کمی کا مسئلہ بھی شدت اختیار کر سکتا ہے۔ اس وقت شاید بیماری خوراک ڈوبنے کے لیے نیچے کما سہارا بنے۔ مگر موجودہ دور میں بھی اس خوراک کی جانب خاصی پیش رفت ہوئی ہے، بلکہ اس رجحان نے غذائی بحران پر خالص صحت مند غذائیں چھوڑے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کا کوئی نہ کوئی خطہ بڑی طرح قحط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے آنے والے پیغمبرِ ختم کا سوچ کر ہی رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ممکن ہے اس وقت کوئی ایسی گیس ہی برآمد ہو جائے جو مکمل خوراک کا نعم البدل ثابت ہو۔ اگر فی الواقع کوئی ایسی صورت بن گئی تو پھر پٹرول پمپوں کی طرح جا بجا اس گیس کے پمپ بھی لگ جائیں گے بلکہ گھروں میں ٹوٹی گیس سے ملنے جلنے میٹروں کی تنصیب بھی ہو جائے گی۔ پھر ہو سکتا ہے مشروبات کی طرح بند بٹلوں اور بوتلوں میں بھی اس کی دافر پلائی شروع ہو جائے اور آدمی (INHALER) کی طرح اسے سانس لے کر دیکھو بیڑی آسانی سے معدے تک پہنچا سکے۔ یوں گھریلو عورتیں باورچی خانہ کی جسد قیاحوں سے بھی خلاصی پالیں گی۔ شاید ایسی گیس بھی نکل آئے جو انسان کو گیس فیرے عبادے کی مانند فضا میں پرواز کرا کر ان شروع کرے اور یوں انسان کے مجسم پرندہ بننے کی ازلی خواہش (حالانکہ اگر وہ پرندہ ہوتا تو شکار ہونے سے بچنے اور بیٹھ کرنے کے لیے انسان بننے کی آرزو کو نا) کی تکمیل ہو جائے۔

پروازی گیس خواہ دستیاب ہونے پر کہیں ہماری چھٹی حق کا اتنا اشلہ ضرور ہے کہ الٹک آدمی جس نے حکومتوں کے استحکام اور عوام کے استخصال میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، کی گولی اور لاٹھی چارج سے بھی زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوئی ہے، کے خلاف مذہب ممالک میں منظم پیرائے میں صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے اور اسے غیر انسانی فعل کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ اگرچہ فی الحال دنیا کی سبھی حکومتیں اس گیس سے مسکدوش ہونے یا کتا رکھشی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ آئندہ صدی کے اوائل میں ہی اسے ترقی یافتہ ممالک مہلک مہلک ہتھیار اور انسان دشمن دنیاؤں میں گیس قرار دے کر ترک

کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور دوسری دہائی کے اختتام تک ترقی پذیر ممالک بھی حسب روایت ان کی پیروی کرنا اپنا فرض منجی سمجھیں گے۔
 سمجھئے کہ اس امر کے امکانات خاصے روشن اور تابناک ہیں کہ مسکراہٹیں بکھیرنے والی موموم (LOUGHING) گیس
 ظہور پذیر ہو جائے گی جو اتنی تیز بہدت ہوگی کہ مقدار کی مناسبت سے زیر لب مسکراہٹ سے غلک شکاف قہقہوں کو لگانے
 کا باعث بنے گی۔ ہو سکتا ہے اس کی برآمدگی مزاح نگاروں پر بھی بن کر گرے کہ اس کی موجودگی میں پھر ان کا کون چرساں چال
 ہوگا، پھر اس کا ایک اور خوش کن پہلو یہ ہے کہ شگفتہ اور قہقہہ بارگیس منہ بسورتے لوگوں اور جنگ و جدل میں مصروف
 رہنے والے گھراؤں کی بھی کابایلیٹ دے گی اور بڑی خوبصورتی سے براہیختہ جذبات پر دبیز پردے ڈال دے گی۔ اور
 پھر خواہ جلسہ گاہ میں آئے ہوئے لوگ یا بکس نکالنے والے حکومت کے خلاف کتنا ہی اپنے جذبات کا اظہار کریں، اس گیس
 کی برکت سے ٹی وی کی سکرین پر بھی ناظرین کو غمخیزانہ بھی ہنستا مسکراتا نظر آئے گا جو حکومت کی ہر دلعزیزی کا منہ بولتا
 ثبوت ہوگا۔

اور ہاں یاد آ رہا ہے سینس گوئی بھی پورے وثوق اور اعتماد سے کی جاسکتی ہے کہ اس وقت اشاروں کی زبان بھی
 عوام و خواص میں اچھی خاصی مقبول ہو چکی ہوگی اور غالباً اسی تاثر کے تحت ٹیلی ویژن نے بھرپور انداز میں اس پروگرام کا آغاز
 بھی کر دیا ہے۔ بلکہ اس پروگرام کے کرنا دھرتا کوئی ٹی وی ایوارڈ کا حق دار بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ شاید اس سے یہ ثابت کرنا
 مقصود ہو کہ ٹیلی ویژن مستقبل کے حالات سے پوری طرح بلکہ دوسرے ذرائع ابلاغ سے زیادہ ہی باخبر ہے۔ ڈاکٹر صاحبان نے
 بھی متفقہ طور پر اپنی قیمتی رائے معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کی عام رائے بھی بلا قیمت نہیں ہوتی، دے دی ہے کہ بولنے سے اتنی خاصی
 انرجی ضائع ہو جاتی ہے (کیا پتہ کہ کل کلاں کو الرجی کا واحد ذمہ دار بھی قوت گہرائی کے ذریعے انرجی کے ضائع ہونے کو ہی ٹھہرایا گیا)
 اگر کہیں اشاروں کی زبان کا اتنا تسلط ہو گیا کہ لوگ اپنی اپنی بولی بولنے سے اجتناب کرنے لگے تو اس وقت نہ صرف ان
 عالم کا خواب دیکھا جاسکے گا بلکہ ایک مرتبہ پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا کر پھر کے زمانہ کی یاد تازہ کر دے گی۔

آخر میں اس وقت تک رولٹ (مشینی انسان) اس حد تک اپنا تسلط جما چکے ہوں گے کہ عام انسانوں کی ہر شعوبہ
 میں ان کے سامنے مال نہیں گل سکے گی۔ چنانچہ وہ اپنی عاقبت اسی میں سمجھیں گے کہ غلام میں کالونیائی تعمیر کریں، تاکہ فطرت
 کی رعنائیوں سے غطف اندوز بھی ہوں اور آڑتے پرندوں کے پر گھٹنے کی بجائے پکڑ کر سورج کی تپش سے بھونک کر ہڑپ کر
 جائیں لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اس وقت تک کوئی پرندہ سلامت رہ گیا ہوگا، کہ اسلحہ کی اندھا دھند
 سپلائی کے پیش نظر یہ کام تو اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی پایہ تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ لیکن صاحب ہیں اتنی ڈوکی کوڑی
 لانے کی کیا پڑی ہے کہ حکمائے نزدیک پیش از مرگ دوا بلا کوئی چھتا بھی تو نہیں۔ بزرگوں کا یہ قول گمانٹہ باندھ لیجئے،
 ”مترس از بلائے کہ شب درمیاں است“

پرانے نمبر

- (۱) غزل نمبر — (مئی ۱۹۵۳ء) قیمت : ۱۰۰ روپے
(۲) افادہ نمبر — (دسمبر ۱۹۵۵ء) قیمت : ۱۰۰ روپے
(۳) بیاض غالب نمبر — (اکتوبر ۱۹۶۹ء) قیمت : ۱۰۰ روپے

مندرجہ بالا نمبر

نایاب تھے، مگر اب ان کے نئے ایڈیشن سے جھپٹے ہیں



اسٹاک میں یہ نمبر بھی موجود ہیں۔

- (۱) خطوط نمبر (۲) ادبی سے مرع کے نمبر (۳) انیس سے نمبر (۴) اقبال نمبر
(۵) عصر سے ادب نمبر (۶) سالانہ

محمد طفیل مرحوم کے خاکوں کا مکمل سیٹ شک میں موجود ہے۔

صاحب - جناب - محترم - مکرم - معظّم - محبتی - محذوم
آپ

ادارۃ نقوشن لاہور
اُردو بازار



حافظ لدھیانوی

حدیاری تعالیٰ

پتے پتے میں ہے قدرت تیری
سایہ لطف میں ہے اک عالم
کوئی معبود نہیں تیرے سوا
سانس لیتا ہوں کرم سے تیرے
ہے تمہے تابع فرماں عالم
دل کو تسکین تو ہی دیتا ہے
شعلہ جاں ہے فروزاں تجھ سے
تیرے انوار میں گلشن گلشن
ذکر میں تیرے عجب لذت ہے
ہے زمانے میں وہ سب سے ممتاز
تو کسی سے ہے نہ کوئی تجھ سے
کوہساروں سے بیابانوں سے
اشک غم بھی ہے ترا سرمایا

ہے لبِ گل پہ حکایت تیری
ایک عالم پہ ہے رحمت تیری
سبھی کرتے ہیں عبادت تیری
ہے ہر اک سانس عنایت تیری
ہے ہر اک شے پہ حکومت تیری
یہ عطا کردہ ہے راحت تیری
زندگی میں ہے حرارت تیری
غنجے غنجے میں ہے نکست تیری
روح پرور ہے اطاعت تیری
جس کو حاصل ہے رفاقت تیری
سب پہ آئینہ ہے وحدت تیری
ہے عیاں شانِ جلالت تیری
دل کی دھڑکن بھی ہے لت تیری

ہے مرنے فکر میں تیرا جلوہ
 مجھ کو ہر آن نظر آتی ہے
 تیری تمثیل نہیں ہو سکتی
 میرے دل میں رہیں یادیں تیری
 کوئی جوڑے نہ سکے تیرے سوا
 وہ ہر اک چیز سے ہے مستغنی
 اس کو کیا غم کہ ہوئی ہو جس پر
 شفقِ شام میں ہے رنگِ ترا
 حمد گوئی کا دیا ہے منصب
 ہے یہ بخشی ہوئی عظمت تیری
 و جبر تسکین ہے ترا ذکرِ جمیل
 لبِ حافظ پہ ہے مدحت تیری



حافظ لدھیانوی

حمدِ باری تعالیٰ

جو بھی منظر ہے وہ قدرت کا نشان ٹھہرا ہے حمد کا قافلہ شوق کہاں ٹھہرا ہے
مجھ کو ہر سانس میں آتی ہے محبت کی مہک منظرِ لطیف و کرم گلشنِ جاں ٹھہرا ہے
بستی بستی میں سناتا ہے فسانے تیرے تیرا پیغام رساں ابر رواں ٹھہرا ہے
میرے ہر لفظ میں ہوتا ہے ثنا کا آہنگ ایسا معیارِ مرا حسنِ بیاں ٹھہرا ہے
تیری یادوں سے مری غلوتِ جاں ہے روشن وجہِ شادابی جاں ربطِ نہاں ٹھہرا ہے
اک تری یاد ہے جو وجہِ سکون ٹھہری ہے اک ترا ذکر ہے جو راحتِ جاں ٹھہرا ہے

ہر طرف تیری تجلی نظر آتی اسکو

تیرا حافظ، ترا مذاح جہاں ٹھہرا ہے



حافظ لدھیانوی

حمد باری تعالیٰ

آئینہ نشاطِ فزا تیری حمد ہے جو میری روح کی ہے غذا تیری حمد ہے
 مُردہ دلوں کو زیست ملی تیری حمد سے مضمر ہے جس میں راز بقا تیری حمد ہے
 ہے تیری یاد و جبرِ سکون و قرارِ جاں میرے ہر ایک غم کی دوا تیری حمد ہے
 ہر ایک شے کے لپٹے مناجات تہی ہر اک کا کام صبح و مساتیرِ حمد ہے
 ہیں حمد ہی کی شکل مے دل کی دھڑکنیں آنسو جو خوف سے ہے گرا تیری حمد ہے
 اعلان ہے اذان میں توحید کا تری بعد از نماز حرفِ دعا تیری حمد ہے
 تیرا کوئی شریک نہیں ہے جہان میں عالم کی جو ہے راہِ سنا تیری حمد ہے
 دنیا تے ہست بود میں آنے کے ساتھ ہی آتی ہے کان میں جو صدائِ تیری حمد ہے

حافظ کے شعر کا ہے جو مقصود و مدعا

نعتِ رسولِ پاک ہے یا تیری حمد ہے

قصا ابن فیضی

ح

میری ساری خواہش اس کی
 شفق، شگوفہ، جگنو اس کے
 سبزہ، شبنم، اس کی نزہت
 ماہ و کواکب، عشوہ اس کا
 نقش و نگار و نجم و نگینہ
 بادل، بجلی، آتش، خرمن
 کچھ، کستان، باغ، بیاباں
 باد و زیدہ، ابر چکیدہ
 صرصر، سیل، کمرشمہ اس کا
 رنگ، نمو، شادابی، خوشبو
 مٹی اس کی، سونا اس کا
 ظاہر، باطن، دھوپ، دیرچہ
 آنکھ، پلک، نظارہ اس کا
 سنگ و میزاں، ساغر و سنداں
 خندہ امکاں، شعلہ فاراں
 جوہر شیوہ، زنگار اس کا
 بے خطِ ساغر، نشہ اس کا
 وہ بے ابر، ترشح اس کا
 بادل اس کے، بادش اس کی
 شجر، حجر، آرائش اس کی
 نالہ و سنبل، نازش اس کی
 سحر، ستارہ، تابش اس کی
 طرز، طراز، طرازش اس کی
 آویزش، انگیزش اس کی
 پاشش اور اندوزش اس کی
 خیرش اس کی، ریزش اس کی
 زلزلے، طوفان، رامش اس کی
 ابیزش اس کی، بالش اس کی
 شاخ، ثمر، افزائش اس کی
 مانائی و نماش اس کی
 روح، بدن، گنجائش اس کی
 سنجش اور سگائش اس کی
 ٹھنڈک اس کی، سوزش اس کی
 شیشہ شیشہ، زوائش اس کی
 بے صفت مینا، جوشش اس کی
 وہ بے آب، تراوش اس کی

شعلہ و خس، آؤ نیش اس کی
 آہن اس کا، آتش اس کی
 آب و ہوا سے سازش اس کی
 پالائش، پرائش اس کی
 ناخن ناخن، کاوش اس کی
 اس کا جسم، اور پوشش اس کی
 دیدش اور پردہ، پوشش اس کی
 لوح و قلم، بالائش اس کی
 بود و نبود، آمیزش اس کی
 بسکہ گریز و گزینش اس کی
 ازل، ابد، پیائش اس کی
 مرگ و بدن، فمائش اس کی
 سینہ سینہ، کاشش اس کی
 چاک میں سب کے گردش اس کی
 ”گن فیکوں“ فرمائش اس کی
 وحدت، کثرت، شورش اس کی
 حُسن، بصیرت، بنیش اس کی
 درس لقیں، آموزش اس کی
 نغمہ جس کا، گزارش اس کی
 حرفِ بشارت، پریش اس کی
 اس کا غزہ، گرائش اس کی
 ارضِ روم و مراکش اس کی
 شبنم و نور، اندیشہ اس کا
 اس سے پیش اندوز دو عالم
 پچیم، پُرب، اُتر، دکھن
 سارے موسم، سارے تغیر
 اس کی شوخی تیشہ تیشہ
 آنکھ کا پردہ، روح کا روزن
 انفسِ تا آفاق کشادہ
 کرسی، عرش، جہت، بے جہتی
 نیستی، ہستی، عنصر اس کا
 قدر و قضا کا نقطہ آخر
 عرش، امکان، پیمانہ اس کا
 زندگی، اس کا خدۂ رحمت
 ذوقِ نفس کو برنائی دے
 خود کو زہ گر، خود گل کو زہ
 خود ہی مطرب، خود ہی بربط
 خلوت، جلوت، چم خم اس کا
 صورت، پیکر، جلوہ، اس کا
 کشفِ حقائق، ادراک اس کا
 جبریل، اس کے باغ کا طوطی
 آیتِ رحمت ”قرآن“ اس کا
 ”خُرو ملائک“، ”کوثر و طوبی“
 کون و مکان سے بتر پھر بھی

سب اس کی شطرنج کے مہرے
 خطِ جلی میں اس کو لکھا
 جس کی آنکھ میں ہے خواب اس کا
 جانِ لطف، تغافل اس کا
 میرے دل میں اس کی دھڑکن
 میرے ہونٹ، وظیفہ اس کا
 میری جبین میں سجدہ اس کا
 پتوار اس کی، کشتی میری
 پتھر میرا، تیشہ اس کا
 آنسو میرے، دامن اس کا
 میرا سینہ، سفینہ اس کا
 ذہن مرا، اس کی خلاقی
 میری عبارت، مفہوم اس کا
 میرے لفظ میں معنی اس کے
 میرے شعر میں اس کی حکمت
 میری حمد، تعارف اس کا
 بازی اس کی، بارش اس کی
 پھر بھی خفی پیدا شش اس کی
 راحتِ بستر، بارش اس کی
 شانِ عفو، نگو، شش اس کی
 درد مرا، آرمش اس کی
 میری رُوح، ستارش اس کی
 میرے سر میں نیارش اس کی
 بازو میرے، کوشش اس کی
 جرم مرا، آزمزش اس کی
 لغزش میری، بخشش اس کی
 میری لوح، نگارش اس کی
 جذبے میرے، برزش اس کی
 میرے فقرے، بندش اس کی
 میرے قلم میں، جذبش اس کی
 میرے فن میں، دانش اس کی
 میرے حرف، سفارش اس کی

اُس کے آگے سب بے قیمت
 کس سے پوچھوں؟ ارزش اس کی

مناجات

الہی! شاد ہوں میں تیرے آگے ہاتھ پھیلا کر
 مری اس کیفیت کو اپنی رحمت سے پذیرا کر
 دعائے سید سادات سینے میں فروزاں ہے
 حسین کر دے مری دنیا، حسین تر میری عقبا کر
 بھٹکتی آنکھ کو مرکوز فرما صبغۃ اللہ پر
 دلِ بے تاب کو خوشبوئے لیس سے شکیبا کر
 مری بھگی ہوئی پکیں مخاطب ہیں تو بس تجھ سے
 مری تقدیر کے تاریک غاروں میں اُجالا کر
 مرے چاروں طرف رقصِ حشت کدے اس کو
 مرے اندر جو دشمن بڑھ رہا ہے اُس کو پسپا کر
 رسولِ پاک کے رستے سے ہٹ کر خواہے امت
 اسے پھر سے فلاح و خیر کا ضامن حنایا کر
 مری قسمت میں بھی ہو دیکھنا احیا شریعت کا
 پریشاں آدمیت پر کرم کا باب پھر وا کر
 ترے محبوب کی توصیف میں لب کھولتا ہوں میں
 الہی! غیرتِ گلشن مری سوچوں کا صحرا کر
 زوالِ آمادہ ہیں ہر چند اعصابِ قویٰ بھی
 جواں رکھ میرے جذبوں کو، مرے لفظوں کو اُجالا کر



نعت

لب کھلے جب نبی کی مدحت میں
پانی ہر تلخیِ الم سے نجات
کیا طلب اور اب کروں حق سے
نورِ منشور اس نے بخشا ہے
دین و دنیا کا امتزاجِ حسیں
ارتقا آشنا ہوئیں قویں
مستفیر آپ کی حیات سے ہے
حسن اور سادگی کے سب جوہر
پہلی ساری نبوتوں کے کمال
دو جہاں کی سعادتیں پنہاں
ایک سے ہیں تو نگر و نادار
کس محبت کا درد شامل ہے
چارہ سازی اُنہی کو زیب تھی
کون ثانی مرے حضور کا ہے
کون ہمسرِ شہِ انام کا ہے
آسمان کی نظر نے کب دیکھا
آپ کی یاد نے سکون بخشا
آپ کا چہرہ ماہتاب بنا
وہی پرسانِ عاصیاں ہوں تھے
فقر ان کے ہم قدم ہوں گے
جو خزانہ اُن کی راہ گزار کا ہے
قریہ رنگ اُن کا شہرِ حسیں
پھیلے دنیا میں جو دھنک بن کر

پھول کھلنے لگے طبیعت میں
کھوکے تذکارِ شہ کی لذت میں
نعتِ خیرِ الوری ہے قسمت میں
سیرتِ مصطفیٰ کی صورت میں
نظر آیا اُنہی کی سیرت میں
آپ کی جانفزا قیادت میں
شان جو بھی ہے آدمیت میں
ہوئے یکجا رسولِ رحمت میں
جمع تھے آخری رسالت میں
میرے سرکار کی اطاعت میں
محسنِ خلق کی عدالت میں
اُن کے پیرایہ ہدایت میں
دلنوازی تھی اُن کی فطرت میں
خلق میں صدق میں امانت میں
عدل احساں میں خیر و برکت میں
عابد اُن سا زمین کی وسعت میں
میں گھرا جب کسی مصیبت میں
میری ہر ایک شامِ حسرت میں
پریشِ عرصہ قیامت میں
جب وہ جائیں گے باغِ جنت میں
وہ گھر سے فسادوں ہے قیمت میں
جلوہ گر ہے جو اشکِ حسرت میں
سمٹ آئے جو دل کی خلوت میں

رکھ امید قبول اے تائب !
پیش کر عجز اُن کی خدمت میں

سہایت علی شاعر

نعت

اک شخص، کائنات کا محور کہیں جسے
 بندہ ہے، یک، بندۂ اکبر کہیں جسے
 جس کی زباں سے میرے خدا نے سخن کیا
 اُمّی تھا ایسا وہ کہ سخنور کہیں جسے
 وہ جس نے مُشتِ خاک کو انساں بنا دیا
 وہ نا خدا، خدائی کا مظہر کہیں جسے
 تخلیقِ کائنات کا وہ نقشِ اولیں
 روحِ ازل کا آخری پیکہ کہیں جسے
 اک لفظ، اک جہانِ معانی کا آئینہ
 اک عکس، اک کتابِ مصوّر کہیں جسے
 اک آدمی کہ خاکِ نشیں اور فلکِ معتم
 اک روشنی کہ ذاتِ پیمبر کہیں جسے



اُمّی حرف آشنا

سرور و صدر انبیا، کون! محمد کریم
عالم علم کبیرا، کامل فن ارتقا
جس کی جبین کی ہر کبیر، لوح تہمت کتاب
آدم و خلد کی مراد، دستِ کلیم کا عصا
جس نے ہمیشہ جبریل، زانو درس تہہ کیا
خوشہ خرمین ازل، خندہ چشمِ مطلب
ناؤ حبّ دہ میں، محلِ اسوہ حسیں
ارضِ حرم کی روشنی، کنجِ حسد کی چاندنی
جس کے نفسِ مشکِ مشک، دانشِ اولیں کا پھول
عارضِ عدل کی چمک، گیسوے صدق کی مہک
صبحِ یقیں کی خاوری، شامِ جنوں کی دلبری
آئینہ جمالِ حور، حُسنِ کمالِ عرش و طور
جس سے عیاں، شفقِ سحر، جلوہ سترِ لا الہ
حاملِ وحیِ کردگار، رمز نگار و ریزہ کار

خواجہ بزمِ دوسرا، کون! محمد کریم
اُمّی حرف آشنا، کون! محمد کریم
حاصلِ حرف و ماجرا، کون! محمد کریم
روحِ حنیف کی دُعا، کون! محمد کریم
فاضلِ مکتبِ حرا، کون! محمد کریم
سنبُلِ باغِ آمنہ، کون! محمد کریم
یلِ کعبہ صفا، کون! محمد کریم
شمسِ حسیمِ اولیا، کون! محمد کریم
دامنِ بادِ جانِ فنا، کون! محمد کریم
ناخنِ قدس کی حنا، کون! محمد کریم
حقِ نگر و حق آشنا، کون! محمد کریم
چہرہ رحمتِ خدا، کون! محمد کریم
شیشہ زانو حرا، کون! محمد کریم
نکتہ فروش و نکتہ زار، کون! محمد کریم

مصرعِ کاینات کا ، عیبِ شکستِ نازِ
 حسن میں جس ٹٹے حل گیا، کون ! محمدِ کریم
 زینتِ اعتبارِ ذات ، زیورِ حُسنِ کائنات
 نقش و نگینہ و نوا، کون ! محمدِ کریم
 ہائے وہ جنبشِ حسیں ، دستِ قمرِ شگاف کی
 نقطہ اوجِ محبِ زہ ، کون ! محمدِ کریم
 حل ہوا، جس کے لطف سے سملہ زنائِ ہر
 حبِ لہ فروز ماریہ ، کون ! محمدِ کریم
 جس کی حدیث ، جس کا فعل ، جس کا شعورِ حق نما
 دونوں جہاں کا آئنا، کون ! محمدِ کریم

گو، کہ حیاتِ وقت کے، جبرِ سُلّو لُھول ہوں
 میں بھی، اسی رسول کے باغ کا ایک پُھول ہوں

تحسینِ فراقی

نعت

آنکھ کا روزن بند کریں اور دل کا دریچہ باز کریں
 یادِ نبیؐ میں آؤ ہم بھی نصرتِ نبیؐ اعزاز کریں
 سب سے اعلیٰ سب سے بالا ان کے نور کا جھالا ہے
 اس اجلالِ نور سے پیدا ہوساز کریں
 پلکوں پر اشکوں کو سجا کر چھڑیں راگِ جدائی کا
 دل کی لمحہ لمحہ دھڑکن کو ان کا ہمراز کریں
 پورے شہرِ وجود میں گونجے نامِ محمد صلی علیٰ
 روح کے گنبد میں اک لمحہ پیدا یہ آواز کریں
 ہم بھی آپؐ کی امت میں ہیں ہم بھی آپؐ سے بیعت ہیں
 اس خوش اقبالی پر اتنا کم ہے جتنا ناز کریں
 آنکھیں سبز ہرے گنبد کی روز تلاوت کرتی ہیں
 ہم کو اذنیِ حضوری دے کر حضرتؐ اور اعزاز کریں
 آپؐ کے نقشِ کعبہ پا سے جو بستی مایہ دار ہوئی
 ہم بھی اس میں سر کے بل چل کر سر کو افراز کریں
 فہرستِ خدام میں بے شک سب سے نچلا درجہ دیں
 لیکن ہم کو پاس بلا کر مستقلاً ممتاز کریں



قتیل شفائی

○
اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دم رکھنا
تمناؤں کی ہر وادی میں آہستہ قدم رکھنا
حسینوں کی وہ محفل ہو کہ دربارِ شہنشاہی
کہیں اچھا نہیں ہوتا سرِ تسلیم خم رکھنا
دلوں میں پیار ہے اپنا، بلوں میں اُس کا سرمایہ
عدو کے سامنے یارب! تو ہی میرا بھرم رکھنا
اُسے میں ڈھانپ لینا چاہتا ہوں اپنی ملکوں میں
الہی! اُس کے آنے تک مری آنکھوں میں دم رکھنا
یہی کچھ درمیانِ دین و دنیا ہم نے دیکھا ہے
لگانا لو خدا سے اور پہلو میں صنم رکھنا
قتیل اب بھی مسیحائی کا دعویٰ ہے اُنھیں لیکن
کرم کی آکس اپنے قاتلوں سے پھر بھی کم رکھنا

○

○
رہبری کے نشاں سائے کے سائے بر محل رکھنا
جہاں چھپکی ہوں زنجیریں دیں زلفوں کے بل رکھنا
تمہیں بے کیف کرنے کو نہ جانے کبٹل جائیں
اُن آنکھوں کا تم اپنے پاس نعم البدل رکھنا
رہا ہے ربطِ میری شاعری کا اس کے ہونٹوں سے
مکرجائے تو اس کے سامنے میری غنزل رکھنا
کبھی اپنی جفا پر وہ پشیمان ہو بھی سکتا ہے
مگر تم فیصلہ ترکِ محبت کا اٹل رکھنا
ہزاروں آرزوؤں کو بسا بیٹھے ہو کیوں دل میں
نہیں آسان گھر میں اتنے مہماں آج بھی رکھنا
ہواؤں سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر دائے جس میں
قتیل اُس جھیل میں ہولے سے یادوں کے کتول رکھنا

○

جگن ناتھ آنناد

○
 نہ جانے ہم قیروں کو یہ کس نے بددعا دی ہے
 کہ ہم نے زندگی سڑکوں پہ چل چل کر گنوا دی ہے
 فروزاں ہے ازل سے ایک شمع آرزو دل میں
 خطا کیا ہے وہ، تُو نے جس خطا کی یہ سزا دی ہے
 زمانہ تو نہ تھا یہ شعر کہنے کا، مگر پھر بھی
 اسی پرے میں ہم نے داستانِ دل سُنا دی ہے
 اُتر بھی جائے یہ دریا تو کیا حاصل مجھے، اس نے
 مرے کھلیاں پر جب ریت تہ در تہ بچھا دی ہے
 ہمارے دل کی چنگاری کے تیور ہی کچھ ایسے تھے
 ادھر لمحاتِ فرقت نے بھی کچھ اس کو ہوا دی ہے
 تفکر کی کوئی گتھی سلجھنے ہی نہیں پاتی
 یہ فطرت نے مجھے کس جرم کی آخر سزا دی ہے
 اگر دورِ رخ ہیں اک تصویر کے خیر اور شر دونوں
 تو پھر مذہب نے کیوں دیوار دونوں میں اٹھا دی ہے
 خوشی کا رنگ گہرا ہو گیا جس روز سے ہم نے
 خوشی کی رُوح میں اک درد کی دُنیا بسا دی ہے
 سناٹی جب نہ دے پوری طرح پھر اس کو کیا سمجھوں
 نہ جانے کس نے اتنی دُور سے مجھ کو صدا دی ہے

○
 دیدہ بے نیاز دوست ایوں مری زندگی نہ دیکھ
 دیکھ شرابِ ناب بھی، شیشہ و جام ہی نہ دیکھ

جُھ کو ہے ذوقِ دید اگر، پردہ ظاہری نہ دیکھ
 شعر میں ہے جو کرب دیکھ رُخ پہ ہے جو مہی نہ دیکھ

جسم کی تشنگی کا درد، جسم کی تشنگی سے پوچھ
 نطقِ جمیل پر نہ جا، شوق کی تازگی نہ دیکھ

کم نگہ تری مجھے شکوہ سرا نہ کر سکی
 تجھ سے گلے کا کیا سوال تو مجھے آج بھی نہ دیکھ



جگن ناتھ آزاد



اے دلِ ناداں ، نہ کہ تو نکتہ آرائی بہت
سامنے اہلِ نظر کم ہیں تماشا فانی بہت
خونِ دل قطرہ بہ قطرہ رائیگاں بہت گیا
سچے جھوٹے آنسوؤں نے اُبرو پائی بہت
تیری بیگانہ روی سے دل بڑی الجھن میں ہے
میں یہ سمجھا تھا کہ ہے تجھ سے شناسائی بہت
آزماؤں بار بار اب تو ہم فقیروں کا بھی ظرف
طور پر تو ہو چکی ہے جلوہ فرمائی بہت
ہر قدم پر تھی سہارا میری نادانی مجھے
کر گئی برباد داناؤں کو دانائی بہت
اب نگاہوں میں ہے انجامِ گل و انجامِ خار
سیکھ لی دل نے جو طرزِ ناشکیبائی بہت
فصلِ گل آتے ہی گویا لائے آتش دیدہ تھی
اہلِ گلشن نے مجھے زنجیر پہنائی بہت
رومی و اقبال خود ہوتے ہیں مجھ سے ہم کلام
کیوں نہ ہو محبوب مجھ کو میری تنہائی بہت
یوں تو اے آزاد ! میری شاعری میں کچھ تھا
اہلِ دل اہلِ نظر نے کی پذیرائی بہت



زندگی میں ہر قدم پر مات کھاتا رہ گیا
شوق کا جذبہ کہ حالِ دل سناتا رہ گیا
شعر میں نعرے لگا کر تو نے بازی جیت لی
اور میں لہجے کی نرمی آزماتا رہ گیا
دھوپ میں چلنے کا میں عادی تھا چلتا ہی ہا
سبز پٹیوں کا گھنسا یہ بلاتا رہ گیا
حاکموں کے تم قصیدے پڑھ کے شاعر بن گئے
اپنا نعشہ اپنے دل کو میں سناتا رہ گیا
سب سے ارفع بات بھی زورِ بیاں جس بزم میں
میں وہاں حسنِ بیاں کے ناز اٹھاتا رہ گیا
بزم میں بھی عقل نے ہسر وار کو دل پر لیا
بزم میں بھی عشق سر پر زحسم کھاتا رہ گیا
جب کہ اے آزاد ! ساحل پر تھے ہنگامے بپا
میں کہیں گہرائی میں طوفاں اٹھاتا رہ گیا



مظہر امام

○
جلی کتاب کا اک اقتباس لگتا ہے
وہ میرا دوست، مرا غم شناس لگتا ہے

گلاب بن میں گلاب سفید کی صورت
وہ عام سا ہے، مگر دل کو خاص لگتا ہے

ہوا میں خوشبو تے موسم کہیں سوا تو نہیں
وہ پاس ہے، یہ بعید از قیاس لگتا ہے

سپرگی کا نشہ بھی عجیب نشہ ہے
وہ سر سے پاؤں تک اتھاس لگتا ہے

ہے اس کے ہاتھ میں سوکھے گلوں کا گلہ ستہ
وہ شخص میرا ستارہ شناس لگتا ہے

ذرا میں اپنی نگاہیں تہ نقاب کروں
مرا زمانہ مجھے بے لباس لگتا ہے

○
بے آب آئینے تھے، شجر بے لباس تھے
دنیا بہت اُداس تھی، جب ہم اُداس تھے

سوئے ہوؤں کے خواب دریدہ لباس تھے
جاگے ہوؤں کے سچ بھی فریب قیاس تھے

دنیا تھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

اک خوش ادا کے قُرب سے روشن تھیں لہنتیں
لیکن وہ وسوسے جو مرے آس پاس تھے!

یہ راہ خار و سنگ مرا انتخاب تھی
جو مر چلے بھی آئے، وہ حسب قیاس تھے

○

مظہر امام

○

ہاتھ اٹھتے ہی کٹا، چلتے یہاں سے چلتے
کیا دعا، کیسی دعا، چلتے یہاں سے چلتے
باز ہے کوئی دیرپہ، نہ کوئی در ہے کھلا
کوئی جلوہ نہ ادا، چلتے یہاں سے چلتے

اُس کے گھر پر بھی وہی شہرِ خموشاں کا سماں
کوئی آہٹ نہ صدا، چلتے یہاں سے چلتے
خواب، خوشبوئے طلب، رنگِ ہوس، ناز و وفا
سارا سرمایہ لٹا، چلتے یہاں سے چلتے

کوئی سایہ نہ شجر، کوئی تمسنا نہ امنگ
اڑ گئی سر سے ردا، چلتے یہاں سے چلتے
اب تو دنیا ہے نہ دیں، کوئی عقیدہ نہ یقیں
کوئی اچھا نہ بُرا، چلتے یہاں سے چلتے

اس چکا چوند میں سگوں کی پرکھ بے حاصل
کوئی کھوٹا نہ کھرا، چلتے یہاں سے چلتے
خود کو کس طرح بچائیں کہ بہت دیر سے ہے
تاک میں خلقِ خدا، چلتے یہاں سے چلتے
دوستوں ہی کے قبیضے میں یہ کھسرام نہیں
دشمنوں نے بھی کہا: چلتے یہاں سے چلتے

○

امید فاضلی



آسمانوں سے فرشتے جو اتارے جائیں
جو بھی رُت آتی ہے ہم سے ہی لہو مانگتی ہے
دل کشادہ نہیں رکھتے ہیں مرے شہر کے لوگ
میرا ذمہ نہ اگر جل اٹھیں راہوں میں چراغ
جس طرف دیکھیے سیلاب بہ کف ہے دنیا
یادِ جاناں میں بڑا نشہ ہے لیکن کب تک
آنکھ اب خواب میں ڈھلنے کی سکت کھو بیٹھی
اس کو ہم قیدِ جنوں سمجھیں کہ آزادیِ منبر
سچ کے مقتل سے گزرنا نہیں منظور تو لوگ
جانے کس حال کو پہنچا دیں اسے اہل ہوس
سچ کا اظہار کریں وہ بھی تو مارے جائیں
ہم کہاں تک تری دنیا کو سنوارے جائیں
ان کے دکھ بھی مے سینے میں اتارے جائیں
شرط یہ ہے کہ اُسے آپ پکارے جائیں
کشتیاں لے کے کدھر آج کناںے جائیں
ایک ہی نشہ رگ و پے میں اتارے جائیں
وہ جہاں ہے وہیں ساون کے نطائے جائیں
ہم جہاں جانہ سکیں خواب ہمارے جائیں
زندگی موت کے مانند گزارے جائیں
زلفِ گیتی کو اگر ہم نہ سنوارے جائیں

عشق پھر عشق ہے یہ رائیگاں جاتا ہی نہیں
جیتنا ہے اسے اُمید تو بارے جائیں



اقمید فاضلی



ناز کرنا کہ یہ ناز جدا ہے سب سے
 میرا لہجہ مری آواز جدا ہے سب سے
 جُزِ محبت کسے معلوم کہ وہ چشمِ جیا
 بات تو کرتی ہے انداز جدا ہے سب سے
 جس کو بھی مار دیا زندہ حب وید کیا
 حرفِ حق تیرا یہ اعجاز جدا ہے سب سے
 مقتل و دار و رس سب کے مقدر میں کہاں
 تیرے فن کار کا اعزاز جدا ہے سب سے
 دیکھنا کون ہے کیا اس کو نہیں جان عزیز
 سرورِ بار، اک آواز جدا ہے سب سے
 ٹوٹ جاتا ہے تو سر اور بھی لو دیتے ہیں
 دل جسے کہتے ہیں وہ ساز جدا ہے سب سے
 سوچ کر دام بچانا ذرا اے موجِ ہوا
 میرے انکار کی پرواز جدا ہے سب سے
 نشہ دہر و قیامت کا تو کیا ذکر اقمید
 وہ مرا سر و سرا فرا ز جدا ہے کب سے



امید فاضلے

”داناے رازِ عشق و خودی و خود آگہی“

”اقبال“ وہ مُفکرِ اسلام و فلسفی داناے رازِ عشق و خودی و خود آگہی
اس کی نوائے درسے پائی جہان میں شعرو سخن نے آبرو، ملت نے روشنی

لبے نے اُس کے خفتہ دلوں کو جگا دیا ہر راہرو کو جلوہ منزل دکھا دیا
جو خواب اس نے دیکھا تھا تعبیر کے لیے اس کو خواب کو شعور کا حاصل بنا دیا

اک دل رکھا ہوا تھا وہ اسلام کے لیے سانسیں تھیں قفِ دین کے پیغام کے لیے
اس حریت مزاج کے قلب و دماغ کو خالق نے منتخب کیا الہام کے لیے

ہر گام وہ مُعَلِّمِ حُبِّ رسول تھا یہ ملک جس کی خوشبو ہے وہ ایسا پھول تھا
وہ تاج دارِ شعر، تفسیر کا وہ امام دنیائے حرف میں جو لقیں کا نزول تھا

تخیلِ ارضِ پاک کا سِر نہاں تھا وہ اک آنے والے عہد کا رُوح و رواں تھا وہ

لب بستگی و جبر و غلامی کی رات میں سہمے ہوئے خموش دلوں کی زبان تھا وہ

وہ حق شناس غاتمِ ملت کا وہ نگین
حسنِ خلوص و عدل و مساوات کا امین
درویشی و قلندری و شاعری کا طور
وہ برقی عقل و عشقِ سرِ مطلعِ یقین

وہ میر کے دھڑکتے ہوئے دل کی آبرو
ایمان کا دلِ نگارِ صداقت کی آرزو
جس کے سخن سے بڑھ گیا غالب کا اعتبار
داغِ غزلِ سرا کو کیا جس نے سُرخِ رو

جذبے جو بے اماں تھے اماں ان کو دے گیا
جو لفظ بے زباں تھے زباں ان کو دے گیا
بے منزلی سے سر بہ گریباں تھے جو خیال
اک منزلِ حسیں کا نشان ان کو دے گیا

دفعۃ سلطان



زندگانی میں ہیں آلام بہت
کاش ملتا کہیں آرام بہت
آج بے ساختہ اک یاد آئی
آج رویا ہوں سرِ شام بہت
ہے مجھے فخر کہ میرے دم سے
دولت درد ہوئی عام بہت
نازنین، پردہ نشیں، سبے خبیث
ایک تو اور ترے نام بہت
روح کا کرب، خلش دل کی جلن
مل گئے ہیں مجھے انعام بہت
زلف، رخسار، بہاراں، خوشبو
حُسن کے اور بھی ہیں نام بہت
خامشی، چاند، ستارے، آنسو
دل کو پہنچاتے ہیں آرام بہت
لفظ مل جائیں تو کچھ عرض کروں
آرزوئیں تو ہیں بے نام بہت
جا کے انگلیسنڈ یہ معلوم ہوا
ہے مرے دلیں میں آرام بہت
جذبہ دل کی بدولت رفعت
آتے ہیں حُسن کے پیغام بہت



دیکھ کر مجھ کو پریشان بہت
آپ بن جاتے ہیں انجان بہت
صاحب درد مگر کوئی نہیں
یوں تو دنیا میں ہیں انسان بہت
لب کشائی نہیں ممکن، ورنہ
دل میں بیتاب ہیں ارمان بہت
بے رُخی، وعدہ خلافی، نفرت
آپ کے مجھ پہ ہیں احسان بہت
شاد و آباد حُسیں دُنیا میں
اک مراد دل کہ ہے ایران بہت
محفل حُسن، اشارے، غمزے
میرے مرنے کے ہیں سامان بہت
مجھ کو بھی ناز ہے اپنے فن پر
آپ کے بھی ہیں شناخوان بہت
امنِ عالم ہے ضروری، ورنہ
شہر ہو جائیں گے ایران بہت
زندہ رہنے کا ہمیں حق ہے مگر
زندہ رہنا نہیں آسان بہت
وہ نہیں چاہتے رفعت، ورنہ
دلنوازی کے ہیں عنوان بہت



صدیق کلیم

بامعنی

وہ سب منہ پر لپیپ لگائے بیٹھے ہیں
دیکھو تو کتنی گہری سوچ ہے ان کی
”امن اور انصاف“ ہے نعرہ ان کا
تبدیلی کے خواہاں؟
تبدیلی سے لرزاں؟

○
میرے احباب سے پوچھو
اس چمکیلے بدلتے منظر میں
دور سے دیکھو گرگٹ کتنے رنگ بدلتا ہے !!
اس کی بدلتی رنگت میں
کس رنگت پر ہم ناز کریں؟

○
اُن کے پیارے پیارے لہجے میں
ٹلکے بوجھل نغمے
گنجیمبر سُرور میں بجتے ہیں
ان سب دھاروں میں اظہار کی رو ہے
محض ہے !!

○
اُن کی باتیں میٹھی میٹھی ہیں
اُن کو کہنے دو جو کہتے ہیں
اُن کی لے پر سر دھنتے جاؤ
اُن کی بات کی تڑپ میں جانا کیا ہے؟
بامعنی میں جانو معنی کیا ہے؟

○

صدیق کلیم

درد کی روشنی

شام کے ڈکھ بھرے دھندلوں میں
 راحتوں کے چراغ جلتے ہیں
 سرخوشی ہو کہ ہو دل آزاری
 روشنی کے ایساں جلتے ہیں

○
 روح کے عنبر قزاندھیروں میں
 آنسوؤں کی لڑی ہے بہتی ہے
 رات کے زم گیس بسیروں میں
 فاختہ ہے سسکتی رہتی ہے

○
 کتنے خوش ہیں گلاب ہفتے ہیں
 بلبلوں کی طلسم آرائی
 پتیاں ہیں بکھرتی حباتی ہیں
 ہر طرف جلوہ گر ہے رعنائی

○
 ملنے والے ملاپ کرتے ہیں
 وصل کی بے خودی میں جنت ہے
 ہر گھڑی خود جدائی بنتی ہے
 زلیست اک آتشیں حقیقت ہے

○
 دل ہے کرب و الم کی دنیا ہے
 مسکراہٹ لبوں پہ طاری ہے
 درد کی روشنی میں راحت ہے
 غم فساداتی ہے غم گساری ہے

شہزاد احمد



مرے ہمراہ منزل بھی رواں ہے مسافر میں ہوں یا سارا جہاں ہے
حقیقت تک رسانی ہی کہاں ہے یقین جس کو سمجھتے ہو گماں ہے
وہاں پہنچے جہاں جانا نہیں تھا سفر جتنا کیا سب رائیگاں ہے
وہاں میں ڈھونڈتا ہوں جاودانی جہاں ہر چیز بے نام و نشان ہے
بدلتا ہے وہ دن بھر میں کئی روپ فلک شاید چہرا غوں کا دھواں ہے
عجب آسیب ہے یہ حنائی دل مکین ہوتے ہوئے خالی مکاں ہے
دہکتا کوئلہ ہے ہر حرفِ مطلب مگر یہ کوئلہ میری زباں ہے
بچھڑنے کی گھڑی بھی آن پہنچی مغرب تک غنیمِ سود و زباں ہے
مرے دل میں چمکتے ہیں ستارے مرے اندر بھی شاید آسماں ہے
پہنچنا ہے مجھے اپنے خدا تک مگر ساری خدائی درمیاں ہے

یہ کس کو چھو یا شہزاد میں نے

سکت دل میں نہ اب ہاتھوں میں جاں ہے



شہزاد احمد

اجاڑ ہونے لگیں بستیاں چلا جاتے
 سڑک کے دونوں طرف بے شمار منظر ہیں
 نظر اٹھا کے بھی دیکھا نہ تو نے میری طرف
 بہت سے لوگ مجھے ڈے گئے بہت سے دکھ
 نئے سفر کا ارادہ بھی روز کرتا ہوں
 دل ستم زدہ کا اب تو فیصلہ ہے یہی
 تمام لوگ وہاں گفتگو میں ہیں مصروف
 جو ڈوبنا ہے تو پھر ڈوبنے سے ڈرنا کیا
 زمانہ نیند کے عالم میں ہے سنے نہ سنے
 بس ایک تیری تمنا ہمارے دل میں رہے
 نہ جانے کون سے سورج کی زد میں آ جاتیں
 مجھے خبر ہے شکایت ہے کشتیوں کو بہت
 یہ کیا کہ ایک ہی الجھن میں روز و شب گزریں
 مجھے یقین ہے محبت اسی کو کہتے ہیں
 تمام رات برستی ہے بادلوں کی طسرح
 اندھیری رات سہی راستہ تو روشن ہے

مگر یہ سوچ رہا ہوں کہاں چلا جائے
 رکوں تو کیسے رکوں کاڑاں چلا جائے
 ترے بھی شہر سے اے مہرباں چلا جائے
 جہاں پہ کوئی نہ ہو اب وہاں چلا جائے
 جو کہ چکوں وہ سفر راہیگاں چلا جائے
 اندھیری رات آج اس کے ہاں چلا جائے
 اس الجھن میں کوئی بے زباں چلا جائے
 سمندروں کے اب درمیاں چلا جائے
 کوئی سناتا ہوا داستان چلا جائے
 ہمارے ہاتھ سے سارا جہاں چلا جائے
 ہمارے سر سے اگر آسماں چلا جائے
 ہوا نہ ہو تو کہاں باد باں چلا جائے
 یقین آئے نہ آئے گماں چلا جائے
 کہ زخم تازہ رہیں اور شاں چلا جائے
 وہ آنکھ جس کی رگوں میں دھواں چلا جائے
 چمک رہی ہیں ابھی بجبلیاں چلا جائے

تماشا ہونا تھا جو بھی وہ ہو چکا شہزاد
 بس اب تو ڈوب چکیں کشتیاں چلا جائے

شہزاد احمد



شہر کا شہر اگر آتے بھی سمجھانے کو
جس قدر وہم ہیں سب اس کے عطا کردہ ہیں
یہ ہنر وہ ہے جو دل سے کبھی سیکھا نہ گیا
کیا کوئی کھیل ہے بے نام و نشان ہو جانا
وہ عجب شخص تھا کل جس سے ملاقات ہوئی
آج کے دکھ بھی کسی سے نہیں جھیلے جاتے
ایک لمحہ بھی تو بیکار نہیں کٹ سکتا
دوڑ تک رات کی آنکھوں میں کہیں نیند نہیں
زندگی بھر میں کوئی شے تو مکمل کر لیں
یہ الگ بات کہ اک بوند مقدر میں نہ تھی

اس سے کیا فسق پڑے گاتے دیوانے کو
لیے پھرتا ہوں کسی اور کے بُت خانے کو
تو نے تو جوڑ لیا توڑ کے پیمانے کو
ویسے تو شمع بھی تیار ہے جل جانے کو
میں ملا ہوں کسی جانے ہوئے انجانے کو
یاد مت کر کسی بھولے ہوئے افسانے کو
ایک گتھی جو ملی ہے مجھے سُجھانے کو
آنا سناٹا ہے آئے کوئی تر پانے کو
اؤ لبریزہ کہیں صبر کے پیمانے کو
سر پہ سو بار گھٹا چھائی رہی چھلانے کو

شام ہونے کو ہے جلنے کو ہے شمع محفل
سانس لینے کی بھی فرصت نہیں پرانے کو



راسخ عرفانی

○
وہ گرد باد تھا کوئی، غب رجاوہ تھا
و فور فکر سے رہبر بھی سر نہادہ تھا
سفر بلند پہاڑوں کا رزق کی خاطر
حجر حجر تری راہ میں ستادہ تھا
مراقدم تھا جو پہلے پڑا تھا منزل پر
شتر سوار تھے ساتھی میں پا پیادہ تھا
ہجوم زر میں وہ پہچانتے مجھے کیسے
مری بساط دریدہ سا اک لبادہ تھا
مکیں تھے تنگ نظر ایک ساتھ نہ کے
مکان ورثے کا ورنہ بڑا کشادہ تھا
جو مال چھین کے جھوٹی قسم پر چھوڑ گیا
وہ رابزن بھی طبیعت کا کتنا سادہ تھا
میں اور کیا درجاناں سے مانگتا راسخ !
جو مل گیا تھا مجھے وہ بھی بہت زیادہ تھا

○
زندگی کے پہاڑ سر کرنا
جس طرح بھی ہو یہ سفر کرنا
کتنا مشکل ہے حوصلہ یارو
جاگ کر شام سے سحر کرنا
یہ جنوں ہے کہ انتظار دوست؟
دن کو روشن چہرا رخ در کرنا
رکھ رکھاؤ میں کوئی حرج نہیں
پرا بھروسہ غنیر پر کرنا
کساروں کے اشک پھوٹ پڑیں
نقش پتھر پہ بھی ہنس کر کرنا
میرے خوں پر نہ کوئی حرف آئے
مجھ کو چاہیے وطن بدر کرنا
جل کے خود غود کی طرح راسخ !
دشمنوں کے دلوں میں گھر کرنا

○

جمیل ملک

سلطنت

زمانے کو ایسی ہوا لگ گئی ہے
 کہ وہ دوست بھی جن سے برسوں کی یاری ہے
 جن کی محبت مجھے جاں سے پیاری ہے
 جب بھی مرے شہر آتے ہیں
 اُن سے ملاقات ہوتی ہے لیکن بڑے ہٹلوں میں
 کہ پتے ہوئے موسموں میں
 وہاں نرم گولر کی ٹھنڈی ہوا ہے
 کڑکتی ہوئی سردیوں میں
 وہاں تیسز ہیٹر کی گرمی بہت ہے
 مگر میرے کچھ یار دلدار ایسے بھی ہیں
 جو بدلتے دلوں کے اس آشوب میں بھی
 مرے شہر میں جب بھی خوشبو کے جھونکے کی مانند اُتریں
 مرے دل پہ دستک سی ہوتی ہے جیسے
 مرے گھر کا دروازہ برسوں سے اُن کے لیے ہی کھلا ہے
 کوئی 'بھائی' کہہ کر بلاتا ہے مجھ کو
 کوئی 'میرا عاشق' 'میری جان' کہہ کر مناتا ہے مجھ کو
 مجھے ایسا لگتا ہے

ان دوستوں کے دلوں میں وہ گرمی ہے
 جو میرے رخ بستہ گھر کو
 محبت کی حدت سے دہکا رہی ہے
 مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
 ان کی نگاہوں میں ایسی خنک روشنی ہے
 جو چاہت کی شدت کو، گھر کی مسرت
 مسرت کو پاکیزہ فرحت میں تبدیل کرتی چلی جا رہی ہے
 کہ گھر ہی تو وہ استعارہ ہے جس میں
 بہاروں کی خوشبو ہے
 یاروں کا جادو ہے
 اپنوں کی چاہت ہے
 غیروں کی قدغن نہیں ہے
 جہاں حکمرانی ہے دل کی
 جہاں ہر طرف رنگ بکھرے ہوئے ہیں
 کہ گھر سے بڑی سلطنت اور کوئی نہیں
 اور دل سے بڑا کوئی بھی فن نہیں ہے



ضمیر کی موت

یہاں جو رہتا تھا ایک بابا
تھے سادھوؤں جیسے بال اُس کے
گھنی گھنی سی بھنویں تھیں اُس کی
تھا اُس کے چہرے پہ اک تقدس
بڑا عجب تھا ضمیر اس کا
وہ نسل در نسل سب کے اندر
ہزار صدیوں سے جی رہا تھا

ہوا زمانے کی ایسی بدلی
سبھی ہوا وہوس کے چکر میں ایسے اُلجھے
کہ اُس کو دل سے نکال بیٹھے
کچھ اس طرح بھول بھال بیٹھے
کہ جیسے اس کے کروڑوں بیٹوں نے
اُس کی ویران قبر پر
جا کے فاتحہ بھی نہیں پڑھی ہے
قدم قدم کی غلط روی پر
وہ سب کو رستہ دکھانے والا

حصولِ زر کی تمازتوں سے
ہزار سلوں کو اپنے برگد کی
شاخ در شاخ پھتریوں میں پناہ دے کر بچانے والا
خود اپنے بیٹوں کی چیرہ دستی سے مر گیا ہے
اور اُس کی ٹھنڈی حسین شاخیں بھی کٹ گئیں،
بے شمار حصّوں میں بٹ گئی ہیں

کبھی کبھی مجھ کو یاد آئے تو سوچتا ہوں
بڑا عجب تھا خمیر اُس کا
کہ مر کے بھی اُس کی رُوح جیسے
یہیں کہیں اُس کی لاش میں ہے
کسے خبر ہے کہ آج بھی
زندگی اُسی کی تلاش میں ہے
— سنا ہے میں نے
نئے سفر کے مسافروں سے
خطانہ جائے گا تیر اُس کا
کہ نام بھی تھا خمیر اُس کا



جمیل ملک

○

تیری آنکھوں میں گھلاوٹ ہے شرابوں جیسی
 اور مری پیاس ہے بے نام سراہوں جیسی
 میں بھی مرگشتہ و بیتاب ہوں سیما صفت
 تیری فطرت بھی ہے آوارہ سماہوں جیسی
 جتنا میں ہاتھ بڑھاؤں یہ پھسلتی جائیں
 کیفیت تیری اداؤں کی سراہوں جیسی
 تو حقیقت ہے تو پھر خواب مرے سچے ہیں
 ہو ہو تیری شباہت مرے خوابوں جیسی
 تیری سنجیدہ مزاجی سے مرا حسن و وقار
 ترے چہرے پہ منانت ہے کتابوں جیسی
 دس میں ڈوبی ہوئی خوشبو کی طرح نرم، گداز
 میری بے لوث محبت ہے گلابوں جیسی
 اپنی گفتار پہ نازاں تو بہت تھے ہنس بھی
 بات سُوجھی نہ کوئی تیرے جوابوں جیسی
 تم کو ملتا رہا میسز انِ عدالت کا ثواب
 زندگی ہم نے گزاری ہے عذابوں جیسی
 میرا فن ہے مرا پردہ، مرا جلوہ بھی جمیل!
 جس طرح صورتِ معبود، حجابوں جیسی

○

○

تو مری ساری تمناؤں کا حاصل ٹھہرے
 وہیں منزل نظر آجائے جہاں دل ٹھہرے
 تیرے ہونے سے ہے ہر عقدہ مشکل آسان
 تو نہ ہو پاس تو آسان بھی شکل ٹھہرے
 تو وہ جادو ہے جو سر چڑھ کے ہر سو بولے
 کون اب تیرے سوار و فنی محفل ٹھہرے!
 تم ہی بتلاؤ بھلا دل سے جُدا ہو کیسے!
 وہ جو اک شخص مرے خون میں شامل ٹھہرے!
 موج جب دل سے اُٹھے دل ہی سمندر بن جا
 موج جب دل سے پلٹ جائے تو سال ٹھہرے
 میں کسی اور کو الزام بھی دیتا کیسے!
 مرا معیارِ نظر ہی مرا قاتل ٹھہرے
 کوہِ آتش کی طرح شعلہ فشاں تیرا وجود
 کس میں ہمت ہے کہ اب تیرے مقابل ٹھہرے!
 جس کو کیل کا سودا ہو، رہے آبلہ پا
 جس کے ماتھے پہ ہو محراب، وہ کمال ٹھہرے
 فن میں ہوں نور کے سوتے نہ کبھی خشک جیل
 کوئی خورشید چلے یا مہِ کامل ٹھہرے

○

جمیل ملک

○
یہ تپتے سے دن، یہ سلگتی سی خاموش راتیں
یہاں بن گئیں اپنی جیتیں بھی سنگین باتیں
کہہ رہی ہیں ہم، زندگی کی مسافت کڑی ہے
لیٹیرے میں ہر سو، ادھر بھی اُدھر بھی ہیں گھاتیں
وہاں زندگی کس کناے چلے، کون سے گھاٹ اُترے
جہاں پاؤں شل اور ہونٹوں پہ باتیں ہی باتیں
عجب زندگی ہے، عجب کھیل میں اس کے پیارے
کہیں جا رہے ہیں جنائے، کہیں رہی ہیں برائیں
خدا جانے کس کس کے گھر کا دیا بھج گیا ہے
ہمیں چاند راتیں بھی لگتی نہیں چاند راتیں!
محبت کو کانٹوں کی میسز ان پر تو نہ تو لو
وہ بستی ہے دل کی، جہاں ایک میں ساری فرائیں
جیل ان کے ٹوٹے گھروندوں میں دلن بھی لاؤ
سدا جن کے دل میں اترتی رہی ہیں برائیں

○
خود اپنے بوجھ سے بُتِ گر کے پاش پاش ہوئے
ہم اس ادا سے ضعیفِ جہاں پہ فاش ہوئے
کبھی بہار کی ٹہنی پہ پھول بن کے کھلے
صبا کے ساتھ کبھی حُسنِ ارتعاش ہوئے
ہمیں تھے ابلقِ ایام پر سوار کبھی
نہ جو اٹھائی کسی نے، کبھی وہ لاش ہوئے
جمالِ دوست میں جو ڈوب کر نہیں اُبھرے
کسے خبر کہ سراپا تری تلاش ہوئے!
تمہارے پاس میں سورج بھی، چاند تارے بھی
مگر وہ لوگ کہ جو کشتہ معاش ہوئے!
خیال و فکر کے پیکر تراشنے والے
نمودِ فن کے لیے خود بھی قاش قاش ہوئے
جیلِ عصر کا خوں پسکروں میں بول اٹھا
ہم اپنے وقت کے ایسے صنم تراش ہوئے



علی احمد جلیلی



اجاب کے خلوص سے جب واسطا پڑا
شیشہ تو میں نہیں تھا مگر ٹوٹنا پڑا
مانا تمام سمر رہی ساتھ زندگی
لیکن تمام سمر اسے ڈھونڈنا پڑا
خود اپنی لاش اپنے ہی ہاتھوں دفن کی
یہ دن بھی زندگی میں ہسمیں دیکھنا پڑا
ہوتی رہی انہیں یہ عنایت بہار کی
دامن تھا جن کا لالہ و گل سے بھرا پڑا
احساس اک بچا تھا سفر میں حیات کے
اس کو بھی راستے میں کہیں چھوڑنا پڑا
شعروں کی اوٹ میں تھے جو پیکر چھپے ہوئے
لفظوں کی حلینوں سے انہیں جھانکنا پڑا
مل تو گئی حیات کی منزل مگر علی
ہر حادثے سے اس کا پتا پوچھنا پڑا



مٹ گیا غم، خلش وہی ہے ابھی
بجھ گئی شمع روشنی ہے ابھی
شب کا بستر تو ہے خموش مگر
شکون اس کی بولتی ہے ابھی
اے صلیبو ذرا اٹھ سرجاؤ
زندگی راہ میں کھڑی ہے ابھی
دشمنی تو ابھی زبان نہ کھول
دوستی زہرا گل رہی ہے ابھی
یا تھ تو وہ چھڑا گیا لیکن
انگلی انگلی مہک رہی ہے ابھی
خون کا اور بھی ہو کچھ چھپڑ کاؤ
دھول گلیوں میں اڑ رہی ہے ابھی
جس نے رخصت کیا تھا وقت سفر
وہ نظر ساتھ چل رہی ہے ابھی
زلزلت و عارض کا ذکر کیا ہو علی
شاعری زخم بن رہی ہے ابھی



احمد ظفر



قربت میں بارہا جسے پتھر سمجھ لیا
 دُوری میں کیوں بہار کا منتظر سمجھ لیا
 گھر کا مکین تو گھر میں نہیں سوچتا ہوں میں
 ہر بے وفا نے دل کو مے گھر سمجھ لیا
 اترانہ بام سے مہتاباں کو کیا کہوں
 بس یہ کہ چشمِ تر کو سندر سمجھ لیا
 وہ بات لب پہ آنے سکی دل میں رہ گئی
 کھنے سے پیشتر جسے اکثر سمجھ لیا
 جینا عذاب تھا مجھے جینا بھی آگیا
 گزری جو دل پہ اس کو مقدر سمجھ لیا
 تشنہ لبوں نے زہر پیا ہے بنامِ مے
 اپنے لہو کو بادہ و ساعندر سمجھ لیا
 کافر نے کس لیے مجھے مومن کہا ظفر
 مومن کو دیکھیے مجھے کافر سمجھ لیا



احمد ظفر

○

چھپ کے اُس یارِ سحر دار نے دیکھا مجھ کو
 آئینے نے کبھی دیوار نے دیکھا مجھ کو
 اس سے پہلے کہ کسی زلف کی خوشبو پھیلے
 کیوں مقدر کی شب تار نے دیکھا مجھ کو
 دل کے آئینے میں دیکھا ہے اسے محو خرام
 برق لہرائی کہ تلوار نے دیکھا مجھ کو
 میں سمندر کسی صحرا کی طرح پھیل گیا
 اتنی اونچائی سے کسار نے دیکھا مجھ کو
 میں سراپوں کا مسافر ہوں عذابوں کا اسیر
 کب کسی ابرِ گسار نے دیکھا مجھ کو
 دور ہوتی ہوئی ہر چیز قریب آتی ہے
 جانے کس لمحہ سرشار نے دیکھا مجھ کو
 اپنی خواہش کی فصیلوں میں ہوں محصور ظفر
 میری ہی چشم گنہگار نے دیکھا مجھ کو

○

○

قاتل نے مجھے سمجھا مقتل نے مجھے جانا
 سمجھا تو نہ تو سمجھا مانا تو نہ تو مانا
 کس موڑ پہ آئے ہم تھے وقت کے سائے ہم
 تو مجھ کو نہ پہچانیں تجھ کو نہ پہچانا
 وہ میری تمنا تھی اک اور ہی نیا تھی
 تہ میں کسی دریا کی دیکھا ہے پری خانہ
 پنی لے جو لو اپنا وہ لائے سب اپنا
 سنتے ہیں یہ کہتا ہے ساقی سرِ مینا نہ
 ٹوٹے ہوئے انسان کو آئہ نما کہ دو
 دیوانوں میں دیوانہ فرزانوں میں فرزانہ
 یہ حاصلِ گلشن تھا وہ حاصلِ مدفن تھا
 اس پھول کا ہنس دینا اس پھول کا مرجھانا
 بختے ہیں ظفر تھا وہ پیغامِ سحر تھا وہ
 آباد کیا جس نے ویرانوں میں ویرانہ

○

احمد ظفر

بجھے نہ دل کا دیا

یہ کس نے زہر ملایا ہے میٹھے پانی میں
شجرِ غنیم کی صورت دکھائی دیتے ہیں !!
ہوا چراغ بجھاتے ہوئے دلوں کے گئی
لہو میں ڈوبی ہوئی انگلیاں لکھیں کب تک
وہ داستانِ الم جس کے ہم رہے کڑا
ہمیں تھے نوحہ سرا

کھلے گا کب کسی زنداں کا بند دروازہ
پلک پلک پہ بشارت کی آرزو کب تک
لیے پھرے گی ہمیں جنگلوں میں آوارہ
ہمارے ہاتھ نہ آئے گا دامنِ دلدار
یہ سوچ اپنا مقدر نہ ہو دعا ہے یہی
ہماری جہدِ بقا کے لیے فنا ہے یہی
بجھے نہ دل کا دیا



جدا نیاں تو مقدر ہیں اور بھی کچھ مانگ
دعا سحر کی پرندوں کے چھپانے کی
نوا میں آتشِ فردا کی آب و تاب کی بات
نمودِ گل سے فروزاں ہو چشمہٴ امروز
نہزاں رسیدہ چمن میں بہار آجائے
زمین پہ چاند اتر آئے رات روشن ہو
رواں دواں کسی کشتی میں ہم سفر کوئی
سنائے نغمہٴ امید سازِ ہستی پر
کہ ہجر میں ہیں کیفیتِ وصال سے
جو ہم سے رُوٹھ گیا وہ پریِ جمال ہے
وہ عکسِ خواب کی مانند پھر دکھائی دے
وہ جس کی زلف کے خم کھل گئے تو ہم مجبور
ازل سے تا ابد پیاس کا کوئی صحر
ہمارے ساتھ رہا !!

ہمارے دوست بھی دشمن فضا بھی دشمن ہے
ہمارے سامنے دریا ہے اور پیاسے ہم

احمد ظفر

سرشاخ طوبی

کسی پیر کے سایہ عاطفت میں
کوئی داستاں لکھتے لکھتے
مسافر کڑی دھوپ میں چلنے والے ہمیں یاد آنے لگے ہیں
زمانہ کسی منزلِ شب سے جیسے ہمیں آج آواز دینے لگا ہے
انہیں یاد رکھیں جو ہم میں نہیں ہیں !
مسافر مہر کو جو دلوں سے لگاتے ہوئے چل رہے تھے
وہ دن کیسے دن تھے شکستہ پلوں کے تنے کشتیاں جل رہی تھیں
یہاں سے وہاں تک اندھیرے نے نیچے لگائے ہوئے تھے
وہی ایک لمحہ کوئی حرفِ ساکن مفقود کے ماتھے پہ لکھا ہوا تھا
مگر ایک آواز نے یہ طلسم ستم توڑ ڈالا

بہارِ گل سے یہاں سے وہاں تک نئے پھول کھلنے لگے تھے
ستارے ستاروں سے مل کر زمیں کی طرف آ رہے تھے
کہ تعقیدِ عالم نے مغرب کے باب کھولے ہوئے تھے
”کہ ہم ایک ہیں ایک تھے ایک ہوں گے“
کسی خواب کو اس کی تعبیر ملنے لگی تھی

ازل سے ابد کی طرف جانے والا کوئی کارواں چلتے چلتے
 اسی سمت پھر جا رہا ہوا تھا،
 ہمارے آب و جد کے سینے منور تھے جس سے
 وہ پیمانِ اول جو راز بقا تھا
 وہی راز پرچشم کی مانند کھلنے لگا تھا
 وہ سائے میں جس کے نہ خوف فنا ہے نہ خوف فنا تھا،
 زمیں خطہ گل کے مانند حدِ نظر تک ہمیں اپنے آغوش میں لوریاں دے رہی ہے
 کہ ہر برگ گل پر سنہرے دنوں کا تصور ہمارے مقدر میں لکھا گیا ہے
 فضاؤں میں اڑتی ہوئی تیلیوں کی عبارت کا منظر گزرتے ہوئے ان دنوں کا صلہ ہے
 جنہیں یاد رکھا ہے ہم نے، جنہیں یاد رکھا گیا ہے !
 وہ صحرا جہاں آبلہ پا مقدس امانت کو دل سے لگائے ہوئے چل رہے تھے
 ہمیں یاد آتا رہے گا،
 یہ ہم جو گلستاں میں آئے ہوئے ہیں
 نئی زندگی کے امیں ہم وہی حرفِ سادہ سرشارِ طوبیٰ لکھیں گے



احمد ظفر

اپنے آپ سے ایک مکالمہ

خامشی ایسی زہد جس میں صدا کی خواہش
زندگی وادی پر خار میں گزری — پھر بھی
دل سے جاتی نہیں کیوں قص صبا کی خواہش

گرمی رنگ سے پگھلا ہوا پتھر جیسے
درو دیوار پر کچھ نقش بنا جاتا ہے !
عشرتِ خواب میں ژولیدہ سا منظر جیسے
صفحہ زلیست پر پھیلے ہوئے بے نام حروف
بے ثمر میری دُعاؤں کے شجر ہوں جیسے



اُن خلاؤں میں اترتا ہوا پاگل میں ہوں
چاند ہی جن میں نہ اُترا ہے ستارہ کوئی !
شب کے جنگل میں بکھرتا ہوا پاگل میں ہوں
پھول جس طرح ہو زندہ کسی خوشبو کے بغیر
جو نہ برسے وہ گزرتا ہوا بادل میں ہوں

کتنے ہنستے ہوئے چہروں نے مجھے دیکھا ہے
مجھ سے بڑھ کر نہیں عبرت کا نظارہ کوئی
کتنی روتی ہوئی آنکھوں نے مجھے دیکھا ہے
میں سُگلتا ہوا لمحہ ہوں سرِ شامِ فراق
قلعہ شب کی فصیلاں نے مجھے دیکھا ہے

میں فنا کی کسی منزل میں بقا کی خواہش
مجھ کو منظور نہیں پھر بھی سہارا کوئی

احمد ظفر

رقمطر از بہار

میں اپنی دنیا میں رفتہ رفتہ اتر رہا ہوں
 محبتوں کے کسی شوالے کا حرفِ آخر
 تمام منظر بدل رہا ہے
 وہ مہوشوں کے جلو میں مہوش
 وہ پیکرِ ہفت رنگ جس نے
 نئی رتوں کا کوئی بلا دیا ہوا ہے

میں سوچتا ہوں، زمیں کی اس انتہا کا لمحہ
 سرابِ جاں سے عذابِ جاں تک
 بس ایک ہی سانس کا توقف
 مرے درو بام پر ستارے سجا گیا ہے
 وہ ایک لمحہ، درختِ پت جھڑ میں جل رہے تھے
 یہ ایک لمحہ، کہ جس کی لے پر ہزاروں جگنو برس رہے ہیں

اُدھر کئی ٹھوکر کھل رہے ہیں
 اُدھر کسی شاخ پر پرندے مسرتوں کے سفیر بن کر چمک رہے ہیں
 خیال ہست و عدم سے آگے کسی جہاں میں
 سفر کی ساری نزاکتیں ساتھ دے رہی ہیں
 کہ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ آئے ہوئے ہیں میرے
 یہ ہجرتِ شب ہے یا نمودِ سحر کا عالم
 میں کس سے یوچھوں؟
 یہ کیسی دوشیزہ طرب ہے کہ بہتے پانی میں چاند جیسے
 ہوا کے ہاتھوں میں سبز پتوں کے دف سے نغمے برس رہے ہیں

یہاں شجر ہیں تو ایک جیسے
 دبیز محل کے فرش پر ٹھوکر گد رہے ہیں
 نہ کوئی نقطہ، نہ کوئی محور نہ دائرہ ہی کوئی فضا کا
 یہی مسافت جو لحظہ لحظہ مرا مقدر بنی ہوئی ہے
 مرے لیے راز ہے بقا کا
 میں روز و شب کے حصار میں سانس گن رہا تھا
 اک اجنبی سی فضا سے مانوس ہو گیا ہوں
 کہ وقت کی مہرباں عبارتِ قطراتِ بہار نے بار بار لکھی
 کہ اس سے پہلے تو بارشِ گل میں اتنی شدت کہیں نہیں تھی

فضا ابن فیضی

بجز، لا حاصلی، کیا اور بام و در پہ رکھا ہے
 لہو میں، تیرا ہے، ذائقہ اونچی اڑانوں کا
 بہت نامعتبر ہے، یہ طلسم گردشِ امکاں
 جنوں کو آگیا ہے اس شہروں کا گھنا موسم
 مقدر ہے ہمارا، سایہ سایہ دھوپ میں رہنا
 میں کیا آنکھیں کھلی رکھتا، کہ میری آنکھی نے بھی
 بہت ہے، ہم کو تم کو، یہ متاعِ عظیم لاعلمی
 غنیمت ہے، سحرِ بختِ حرف و صوت، آتنا بھی
 یہی، بس دیکھنا ہے اب، لہو مقبول ہو کس کا
 معافی بھی نجات اس کرب سے، اب کیا دلائینگے
 ہوئے جب شعر، تو احساس کی سطیوں چمک اٹھیں
 بہت بے عافیت ہیں، گلِ خانِ شہر بھی، لوگو!
 فضا! اپنے قلم کو، کس لیے شاخ انا سمجھوں
 عجب الزام اس نے، مجھ سے دانش گر پہ رکھا ہے

اُسے پڑھنا ہے شکل، جو کچھ آئینے پہ لکھا ہے
 وہ، خود سے ملنے، اس دھوکے میں اکثر مبیہ گھرا ہوا
 بڑی الجھی ہوئی تحریر میں، چہرے پہ لکھا ہے
 اسی کا نام میں نے، اپنے دروانے پہ لکھا ہے

ہوئی مدت، کہیں نے چند غریلوں کو بھیجی ہیں
جو، پڑھنا نہیں آتے، سوچ کی کرن بھرو
ہوا اکثر یہی، حالات رستا کاٹ جاتے ہیں
گزشتہ سال ہی، دراصل مرنے کا ارادہ تھا
خبر، اخبار میں تو ہے، کئی شہروں کے جلنے کی
معاون ہو، جدید اسلوب کی تفہیم میں شاید
یہ مطلب ہے نظر پڑنے نہ پائے، عام قاری کی
بس اتنی بات ہے، کیا تجربہ اور آگاہی کیسی
فضا نے زندگی کے مختلف گوشے پہ لکھا ہے



کسی بے شکستہ آئینے کا ٹکڑا بھیج دینا
بہت نازاں ہیں اپنی خواہنا کی پروہ آنکھیں
درو دیوار کی ویرانیاں کم ہو چکی ہیں
اندھیروں میں بھی کر لیں گے کسی صورت گزارا
نئی دانش، تو نازل ہو چکی سب، اس کے اوپر
اسی کو، شیشہ زنگار آمادہ مبارک
جو، کم شیوہ ہیں، کیا جانیں بھلا، ترسیل و ابلاغ
ذرا چکھ لے تو وہ بھی، لفظ ہونے کا مزہ کچھ
پرانے دور کے بیمار خانے میں فضا کو
بنا کر، معنی نو کا مسیحا، بھیج دینا



زخموں کو گلاب لکھ رہا ہوں
 الفاظ، نشے میں جھومتے ہیں
 ہے تابِ نفس، فسقِ خامہ
 اک حرف، ورق ورق، اکیلا
 نام اس کے، جو آج تک ہے بی نام
 ایسا نہ ہو، خود ہی ٹوٹ جاؤں
 وہ، خواب کو موت کہہ رہا تھا
 بال اب سفید ہو رہے ہیں
 اب ہوگی شروع اک کہانی
 اونچی ہے سڑن، موج، پھر بھی
 آندھی میں لگا رہا ہوں خیمہ
 وہ قحط ہے، اب کے خالِ قحط کا
 ہیں اس کے لیے، یہ سب اضافی
 ابھی ہے دھنک سی انگلیوں میں
 اپنا ہی آقباس ہے وہ، جس کو
 یہ طرز، خود اپنے آپ پر ہے
 اس دور کی ساری برکتوں کو
 خوشبو کی کتاب لکھ رہا ہوں
 معنی کو شراب لکھ رہا ہوں
 انجیل شباب لکھ رہا ہوں
 اپنا انتخاب لکھ رہا ہوں
 جملہ انتساب لکھ رہا ہوں
 پانی پر، جناب لکھ رہا ہوں
 میں، موت کو خواب لکھ رہا ہوں
 ماضی کا حساب لکھ رہا ہوں
 میں آخری باب لکھ رہا ہوں
 ہستی کو سراب لکھ رہا ہوں
 سانسوں کو طناب لکھ رہا ہوں
 چہروں پر نقاب لکھ رہا ہوں
 جتنے بھی خطاب لکھ رہا ہوں
 کس خط کا جواب لکھ رہا ہوں
 کہہ کر اکتساب لکھ رہا ہوں
 حضرت کو جناب لکھ رہا ہوں
 دانش کا عذاب لکھ رہا ہوں

مشکل ہے فضا! خود آتشی

اچھا، یا خراب، لکھ رہا ہوں



محسن احسان

○
 فولاد میں ڈھل رہی ہے دنیا
 ملبوس بدل رہی ہے دنیا
 شعلوں کی زباں میں بولتی ہے
 بارود اگل رہی ہے دنیا
 افلاس کی دھوپ سننے نکل کر
 سرتے میں جل رہی ہے دنیا
 اک سود و زیاں کی کشمکش ہے
 ہر لحظہ پھسل رہی ہے دنیا
 کانٹوں کا سجا کے تاج سر پر
 غنچوں کو مسل رہی ہے دنیا
 راتوں کو اُجالنے کی خاطر
 خورشید نگل رہی ہے دنیا
 یا خواب بکھر گئے ہیں اس کے
 یا نیند میں چل رہی ہے دنیا
 بارش کی دعائیں مانگتی ہے
 کس دھوپ میں چل رہی ہے دنیا
 محسن یہ تضاد ارتقا ہے
 اک پاؤں پہ چل رہی ہے دنیا

○
 کرن، شبنم کو پی کر خوشبوؤں پر پاؤں دھرتی ہے
 ہوا، دوشیزہ پتوں کے بدن چھو کر گزرتی ہے
 زوال موسم سرما کی آہٹ ہے پہاڑوں پر
 صدائے آب جھرنوں میں سمٹتی ہے بکھرتی ہے
 فلک سے مریم ابر رواں آہستہ آہستہ
 مسیحا بارشیں آغوش میں لے کر اترتی ہے
 بہار آتی ہے جب بھی گلستاں میں ایسے لگتا ہے
 زمیں اپنے ولادت کے دنوں کو یاد کرتی ہے



محسن احسان

چلا ہے اوڑھ کے زرکار پیرین مہتاب
جگر جگر ہیں ستارے کرن کرن مہتاب
فلک پہ تان گیا کوئی شامیہ ابر
ادھر ادھر سے زمیں پر ہے ضو فلک مہتاب
میں اس کی چاندنی، پلکوں سے چُن رہا ہوں کہ
مرے لیے مرا ہر تیری وطن مہتاب
شجر حجر کے بدن ہو گئے ہیں مہتابی
جلا گیا یہاں قندیل ہر بدن مہتاب
پہن کے پاؤں میں سیال جھانجھن، سر شام
کینز شب کو چلا ہے جھن جھن مہتاب
نہ آفتاب یقین ہے، نہ ماہتاب گام
گہن گہن مرا سورج، گہن گہن مہتاب
برون لفظ کہاں ہے تجلی معنی
ہے حرف حرف ستارہ سخن سخن مہتاب

ذہن اور دل کی کشاکش میں گرفتار ہیں ہم
اپنی ہی ذات سے اب برس پیکار ہیں ہم
اتنی افراط زرخیز و ہوس کی ہے کہ بس
جنس بے مایہ کی صورت سر بازار ہیں ہم
لہلاتے ہیں ابھی سبز نورس کی طرح
اک ذراتیز ہوا آئی تو ہموار ہیں ہم
خندہ زن پہلے تھے ہر خشتِ مکاں پر، لیکن
اب تو یوں لگتا ہے گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم
ثبت ہے اپنے لبوں پر ازلی سناٹا
یوں تو ہر حرف صداقت کے علمدار ہیں ہم
ہم کسے دشمن محرابِ حرم ٹھہرائیں
جو ہو خود شمر تقدس وہ گنگار ہیں ہم
ہم سے رکھنا ہے تعلق تو ذرا سوچ کے رکھ
جتے آسان ہیں ہم اتنے ہی دشوار ہیں ہم
صدفِ حرف، معافی سے ہے خالی محسن
سرِ دربار سخن پھر بھی گمبار ہیں ہم

کسری منہاس



کرو دل کو تم فروزاں، ہو اگر سحر کے پایا سے
 کہ نہ ہوگی دُور ظلمت، کسی شمع کی ضیا سے
 یہ قدم نہ ہٹ سکیں گے، کبھی جادۂ وفا سے
 مجھے مل گیا یہ نکتہ، کسی دوست کی رضا سے
 مجھے ہے فقط یہ شکوہ دلِ رمز آشنا سے
 وہ ہوئے نہ ہونگے واقف تری عظمتِ وفا سے
 کہیں مرکز وفا سے، تجھے دُور لے نہ جائے
 جو ٹپک رہی ہے حسرت تری چشمِ التجا سے
 رہی چشمِ ماسوا سے چھپی اس طرح حقیقت
 جو بھی وقت کے تھے رہزن نظر آئے رہنا سے
 یہی ٹھان لی ہے کشتی، کبھی ڈوب کر نہ ابھرے
 مرے دل کی بات کہہ دے کوئی جا کے ناخدا سے
 ابھی تک بہار پر ہیں، ابھی تک مشامِ جاں ہیں
 کبھی پھول جو چُنے تھے، ترے گلشنِ وفا سے
 ابھی اور ہو گا کیا کیا؟ ابھی دیکھنا ہے کیا کیا؟
 طے کب نجات دیکھیں ہمیں دورِ ابتلا سے
 غمِ عشق کے منازل کبھی طے ہوئے ہیں کسری!
 کہیں آہِ نارسا سے، کہیں بے اثر دعا سے



ڈاکٹر مظفر حنفی

○
 آلام روزگار سے فرصت نہیں ملی
 آئینے سے بھی ہم کو محبت نہیں ملی
 کیسے کہوں کہ خون کا بازار گرم ہے
 مجھ کو کسی دکان پہ مروت نہیں ملی
 مسرور ہوں بساطِ تمنا لپیٹ کر
 اچھا ہوا خلوص کی قیمت نہیں ملی
 جب سے خلا نور دھوئے، سرد ہے بدن
 اک سانس بھر کہیں سے حرارت نہیں ملی
 کیا ظلم ہے کہ میرا جہز پڑھ گئے عہد
 مجھ کو مدافعت کی اجازت نہیں ملی
 وہ گاؤں تھا کہ ہاتھ سے جاتی رہی زمیں
 یہ شہر ہے کہ سر کے لیے چھت نہیں ملی
 کاوش تو خوب کی ہے مظفر کے رنگ میں
 لیکن ہائے شعر کو شہرت نہیں ملی
 ○

○
 غم ترا وقت کے دریا میں بہا جاتا ہے
 میرا سایہ تو کنارے پہ رہا جاتا ہے
 زندگی تھی کہ سجائی گئی آنسو آنسو
 اور وہ شیش محل ہے کہ ڈہا جاتا ہے
 گونجنے لگتی ہیں کچھ گرم لہو کی بوندیں
 دل ہو زخمی تو کہیں شعر کہا جاتا ہے
 پیٹھ پر تیر چلے ہیں، مجھے رونا ہوگا
 دوست کا وار تو سینے پہ سہا جاتا ہے
 ڈوبتے دل میں ابھرتی ہے تری یاد کی لہر
 اور پھر اوس میں یہ پھول نہا جاتا ہے
 شعر کہہ کر بھی مظفر نے بہت رنج کیا
 ہاتھ سے کیا گھر بیش بہا جاتا ہے
 ○

ڈاکٹر مظفر حنفی

آخر آخر وہ کافر بھی اس نکلتے کو مان گئی
پرستہ ہوں لیکن میرا شعر تو پاکستان گیا
دل کی راہیں تو ملتی ہیں، سمتیں لاکھ مخالف ہوں
گردِ سفر میں وہ مجھ کو اور میں اُس کو پہچان گیا
روشن ہو کر تیرے میرے سب کے چہرے ایک ہوئے
پیار کے آئینہ خانے میں آ گیا، حیران گیا
اُس کے مظہر گاتی چڑیاں، روتی شبنم، فستے پھول
رعد نے اُس کا ڈنکا پٹیا، کھسرا پردہ تان گیا
اتنی پتلی دیواریں ہیں، اتنے سارے روزن ہیں
گھر میں کوئی راز نہیں ہے اور پڑوسی جان گیا
یاری کا لینا دینا کیوں میز انوں پر لائے تھے
تجھ کو بھی سوئے میں گھاٹا، مجھ کو بھی نقصان گیا
کل تک ان کی تکراروں سے تیری غزلیں زخمی تھیں
آج مظفر نقادوں کے جھگڑے میں دیوان گیا

جب سے دن بھر دل تھامے تو بیٹھا رہتا ہے
میری چھاتی پر بھی بجھو بیٹھا رہتا ہے
تھرکا کرتی ہے ہونٹوں پر چنچل تستلی سی
اُن آنکھوں میں جھل جھل جگنو بیٹھا رہتا ہے
جی ڈرتا ہے اس کا کھڑا دیکھ نہ آیا ہو
کس کی دھن میں گم سُم سا دھو بیٹھا رہتا ہے
کیسے اُن کو پرچا پھینکوں، کیسے بات کروں
بالکنی میں بوڑھا بابو بیٹھا رہتا ہے
آنکھوں سے بہ جانے دینا، پینا ٹھیک نہیں
موتی جیسا تہ میں آنسو بیٹھا رہتا ہے
تیز ہوائیں مستلوں پر سازش کرتی ہیں
لبے ہاتھ سٹپے چپو بیٹھا رہتا ہے
دشمن بن کر لکھتا ہوں میں خود اپنے اعمال
لاکھ فرشتہ آزد بازو بیٹھا رہتا ہے

اقبال ساجد



کل شب دلِ آوارہ کو سینے سے نکالا
یہ آخری کافر بھی مدینے سے نکالا



لگا دی کاغذی ملبوس پر مہرِ ثبات اپنی
بشر کے نام کر دی ہے خدا نے کائنات اپنی

یہ بھیڑ نکلتی تھی کہاں حنائے دل سے
یادوں کو نہایت ہی قرینے سے نکالا

خلا کے آر بھی میں ہوں خلا کے پار بھی میں ہوں
عبور اک پل میں کرتا ہوں حدودِ ممکنات اپنی

ہم خوں بہا کر بھی ہوئے باغ میں رسوا
اُس گل نے مگر کام پسینے سے نکالا

جیوں گا اپنی مرضی سے مروں گا اپنی مرضی سے
مرے زیرِ تسلط ہے فنا اپنی حیات اپنی

ٹھہرے زرخشن کے حقدار تماشا ثانی
اور مارِ سیہ ہم نے دینے سے نکالا

لکھی ہے میں نے اپنے ہاتھ پر تحریرِ آئندہ
مری اپنی وراثت ہے قلم اپنا دوات اپنی

میں خود پر آزماؤں گا خود اپنا آخری داؤ
خبر ہے مجھ کو ساجدِ حیات بن جائے گی مات اپنی



یہ سوچ کے ساحل پہ سفر ختم نہ ہو جائے
باہر نہ کبھی پاؤں سفینے سے نکالا

شبِ نہرِ شکیل



گو ایک پل بھی اس سے الگ اب بسر نہ ہو
اس بات کی مگر اُسے دیکھو خبر نہ ہو
اس کی گزارشات کو کیسے کروں قبول
جب دل مرا نظر میں مری معتبر نہ ہو
تاریکیوں کی جس کو علامت سمجھ لیا
وہ آنے والی صبح کا پیمانہ بر نہ ہو
اپنی سلامتی کا ترصاف من رہے گا وہ
اچھا ہی ہے جو ہاتھ میں کوئی ہنر نہ ہو
میں جس میں وہ کے ایک مسلسل سفر میں ہوں
اک واہمہ سا ہے کہ وہی میرا گھر نہ ہو
غافل ہوا جو شہر بھنبھور اُس کا لٹ گیا
اتنا بھی اس جہان سے دل بے خبر نہ ہو
اے مستقل ہر اس کی شب اب گزر بھی جا
لاہ سحر کہ جس میں کوئی سب بھی ڈر نہ ہو



دوستوں کا ذکر کیا دشمن ہیں جب بدلے ہوئے
شہر میں تو اب نظر آتے ہیں سب بدلے ہوئے
زیست کے ادوار کتنے مختلف سے جو گئے
سال و مہ ٹھہرے ہوئے اور روز و شب بدلے ہوئے
کس کی دلجوئی کریں کس کو مبارک باد دیں
جب خوشی اور غم کے ہوں یکسر سبب بدلے ہوئے
اک پرانا راستہ اب کس طرح ڈھونڈے کوئی
شہر بھر کے سب گلی کو چے ہوں جب بدلے ہوئے
روز و شب کی گردشیں دل کو بدل پائیں نہیں
آئینے میں گرچہ ہیں رخسار و لب بدلے ہوئے



ناصر زیدی

①

میں ایک پیچہ تا دیدہ کے حصار میں ہوں
نجانے کون ہے وہ کس کے انتظار میں ہوں

وہ خستگیاں ہی سہی، احترام لازم ہے
یہ کم شرف ہے کہ اب تک نگاہ یار میں ہوں

کر و قبول کہ نفرت سے مجھ کو ٹھکرا دو
تمہارے پاس ہوں اور پورے اختیار میں ہوں

میں اپنی ہمت پر دواز کھو چکا شاید
خزاں سے خوف زدہ موسم بہار میں ہوں

تمام شہر مخالف ہوا کرے ناصر
میں مطمئن ہوں کہ اُس حلقہ نگار میں ہوں

○

○

اس توقع پہ کھلا رکھا گریباں اپنا
جانے کب آن ملے جان بہاراں اپنا
لمحے لمحے کی رفاقت تھی کبھی وجہ نشاط

موسم ہجر ہوا اب سروساماں اپنا
نیت نئے خواب دکھاتا ہے اُجالوں کے لیے
وہ کہ ہے دشمن جاں، دشمن ایماں اپنا

نکست گل ہی نہیں خاک بھی ہے ہم کو عزیز
اپنا صحرا ہے، چمن اپنا، خیاباں اپنا

دیکھ لیتی ہے جہاں عزم و یقیں کے پیکر
رُخ بدلتی ہے وہاں گردشِ دوراں اپنا

یہ تو مانا کہ جوئی عشق میں رُسوائی بہت
ہو گیا نام، غزل میں تو نمایاں اپنا

اُس سے بچھڑے ہیں تو محسوس ہوا ہے ناصر!
حال اتنا تو نہ تھا، پہلے پریشاں اپنا

○

ناصر زیدی

○

دل و نگاہ کو تسکین عسر بھرنہ ملی

سفر کا شوق ملا ، منزل سفر نہ ملی
تیرے بغیر کلی دل کی کس طرح کھلتی؟

خزاں کی زد میں بہاروں کی کچھ خبر نہ ملی
زمانہ حسن کی تصویر بن گیا ، لیکن

تلاش جس کی تھی وہ صورتِ بشر نہ ملی
بس ایک بار ملی اس کی رہگزر مجھ کو

پھر اُس کے بعد کوئی اور ، رہگزر نہ ملی
میری حیات میں مہتاب بن کے آ جاؤ

ملی جو مہلتِ شب آج کل ، اگر ، نہ ملی
حرمِ ناز پہ موقوف کچھ نہیں ناصر !

کہاں کہاں پہ فغاں مجھ کو بے اثر نہ ملی

○

○

جس کے جلووں سے مری شام اُجالا جائے
بات اُس شخص کی کیسے کوئی ٹالی جائے
جس کی یادوں سے مہکتی ہے مری شامِ فراق
اُس سے ملنے کی کوئی راہ نکالی جائے
میرے مسلک میں نہیں بے ر کسی سے رکھنا
میرے دشمن سے یہ تصدیق کرا لی جائے
خود کو تقسیم کروں میں زرخل کی مانند
در سے خالی نہ کبھی کوئی سوالی جائے
کوئی آندھی نہ بجائے کسی مفلس کا چراغ
دوستو! ایسی کوئی رسم بھی ڈالی جائے
سر بکف آج غزل خواں ہے تمہارا ناصر !
دستِ نازک میں ذرا تیغ سنبھالی جائے

○

ناصرزیدی

○
 رُوح اور جسم کا وصال کرے
 کوئی آئے مجھے نہال کرے
 ہے کوئی جو بھرے زمانے میں
 میرے زخموں کا زیندال کرے
 پھر کوئی داغ دے جدائی کا
 پھر مے فن کو لازوال کرے
 کون ہوں کیا ہوں اور کیسا ہوں؟
 کاش! مجھ سے وہ سوال کرے
 شرط ہے صرف کوشش پیہم
 پھر جو، وہ رب ذوالجلال کرے
 جس کو دعویٰ ہو آدمیت کا
 پیش اُس کی کوئی مثال کرے
 وہ جو بھڑا تو کیا گلہ، ناصر!
 اس قدر کیوں کوئی ملال کرے

○
 کہیں تاب لانہ پائے، مرے دل ذرا سنبھل کے
 وہ نظر کے سامنے ہیں نئے زاویے بدل کے
 میں جہاں جہاں سے گزرا، تری دید کی طلب میں
 کوئی ہے جو آنکے دیکھے انہیں راستوں پہ چل کے
 مرے ہم نفس عزیزو! مرا حال تم نہ پوچھو
 غم دل ٹپک نہ جائے کہیں آنسوؤں میں ڈھل کے
 جو کبھی تھے جانِ محفل، جو تھے شاعری کا حاصل
 وہ ہیں آج تک پشیمان مری بزم سے نکل کے
 کھے میں نے جس کی خاطر، ہوں پسند اُس کو ناصر!
 مرے خونِ دل کے قطرے، مے شعراں غزل کے



ناصر زیدی



وہ میرے دل کی ہر اک بات جان لیتا ہے
یہ دہم ہے اُسے، اونچی اڑان لیتا ہے



مہک اُٹھے ہیں دہکتے گلاب آنکھوں میں
اُبھر رہا ہے یہ کس کا شباب آنکھوں میں
یہ روشنی کا سمندر کہاں سے آیا ہے؟
بکھر رہے ہیں کئی آفتاب آنکھوں میں
وہ زندگی کی بہار و خنراں کو کیا کرتا؟
جو کھو چکا تھا، تری خواب خواب آنکھوں میں
کرے گا زیر و زبر جو نظامِ عالم کو
میں دیکھتا ہوں وہی انقلاب آنکھوں میں
کہاں وہ حرف جیسے آگئی کہوں، ناصر!
کھلی ہوئی ہے غموں کی کتاب آنکھوں میں



روایتوں کو جنم دینے والے خواب ہوئے
حکایتوں کے مزے قصہ خوان، لیتا ہے

رہے گا وہ تہی دامن خرد کی دولت سے
غموں کی دھوپ میں، چادر جو تان لیتا ہے

وہ ایک شخص کہ ناصر بھی ہے سخنور بھی
اُسی کا نام تو سارا جہان لیتا ہے



ناصر زیدی

صدائیں دی ہیں بہاروں میں تیلیوں نے مجھے
شبِ سبہ میں پکارا ہے جگنوؤں نے مجھے

کروں شمار تو حدِ شمار سے گزروں
کچھ ایسے زخم لگائے ہیں دوستوں نے مجھے

میں بے ہنر تھا مگر صحبتِ ہنر میں رہا
شعور بخشا ہمہ رنگ محفلوں نے مجھے

یہ اور بات کہ ثابت قدم رہا ، ورنہ
بہت فریب دیئے چند قربتوں نے مجھے

خیال و خواب ہوئیں ساری منزلیں ، ناصر!
شکستہ حال کیا ان مُسافروں نے مجھے

دل میں جو آنکھ کے رستے سے سمایا جائے
سامنے سے وہی چہرہ نہ ہٹایا جائے

مجھ سے بڑھ رہے تو تسلیم کروں گا دشمن
میرے دشمن کو مے سامنے لایا جائے

تیری پہچان اگر ہے تو مرے نام سے ہے
تو بھی مٹ جائے اگر مجھ کو مٹایا جائے

میں وہ مجرم ہوں جو ہر دور میں سچ بولتا ہے
اس خطا پر مجھے سُولی پہ چڑھایا جائے

روح بن کر مرے پیکر میں سمانے والے

زنگی بھر نہ تیری یاد کا سایا جائے

جس سے روشن ہیں ابھی مکے کی یادوں کی چراغ

کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص بھلایا جائے

نقش بن کر جو ترے دل پہ سجا ہے ، ناصر!

یہ کوئی حرفِ غلط ہے کہ مٹایا جائے

پروین شاہ

باب حیرت سے مجھے اذن سفر ہونے کو ہے
 تمنیت اے دل کہ اب دیوار، در ہونے کو ہے
 موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے ل میں کیوں
 کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے
 کھول دین زنجیر در اور حوض کو حلی کریں
 زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے
 گم در راہ بن کر کوئی حاصل سفر کا ہو گیا
 خاک میں مل کر کوئی غسل و گھر ہونے کو ہے
 اک چمک سی تو نظر آئی ہے اپنی خاک میں
 مجھ پر بھی شاید توجہ کی نظر ہونے کو ہے
 غمزدہ بستی مسافر لوٹ کر آتے نہیں
 معجزہ ایسا مگر بارِ دگر ہونے کو ہے
 گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا
 اس سے اگلے موڑ کوئی ہم سفر ہونے کو ہے

دیکھنے کا جسے کل رات میں ڈھنگ اور ہی تھا
 صبح جب آئی تو اُس چشم کا رنگ اور ہی تھا
 شیشہ جاں کو مے اتنی ندامت سے نہ دیکھ
 جس سے ٹوٹا ہے یہ آئینہ وہ سنگ اور ہی تھا
 خلق کی بھیجی ہوئی ساری ملامت اک سمت
 اُس کے لہجے میں چھپا تیر و تفنگ اور ہی تھا
 کیا غرض اس سے کہ کس گوشہ عزلت میں رہا
 شمع کے آگے جب آیا تو پتنگ اور ہی تھا
 لوچراخوں کی بُجھانے سے ذرا سا پہلے
 میرے سردار کا اندازہ جنگ اور ہی تھا

اکبر کاظمی



لوگ جو تجھ سے لو لگا تے ہیں
 حادثوں میں بھی مُسکراتے ہیں
 راہرو کس قدر پریشاں ہیں
 راستے کتنے جگمگاتے ہیں
 مرنے والے غمِ محبت میں
 زندگی کے دیے جلاتے ہیں
 ساری دنیا کو بھول جاتا ہوں
 آپ جس وقت یاد آتے ہیں
 کتنی بے رنگ خواہشوں کے چراغ
 میری راتوں میں جگمگاتے ہیں
 جو ستارے فلک سے ٹوٹ پڑیں
 وہ حنلاؤں میں ڈوب جاتے ہیں
 کاظمی میری تیرہ بخشی پر
 میرے احباب مسکراتے ہیں



بھلانا چاہوں تجھے خود کو بھول جاؤں میں
 یہ واقعہ ہے مگر کس طرح سناؤں میں
 جو دوستوں سے ملیں مہس کے زخم کھاؤں میں
 زمانے تجھ کو نہ یہ آئینے دکھاؤں میں
 میں چھین لوں تجھے دنیا سے کیا ضروری ہے
 کچھ اختیار اگر ہو تو مرنے جاؤں میں
 غرورِ حسن سے جس نے تجھے نوازا ہے
 اُسی کے در پہ نہ کیوں سر بھلا جھکاؤں میں
 ملا تو کرتے بارے میں لوگ پوچھتے ہیں
 کسے کسے بھلا داغِ ستم دکھاؤں میں
 ہر ایک شعر میں رکھ دی ہے داستاں میں نے
 تو پڑھ کے دیکھ ترے دل میں گنگناؤں میں
 اے کاظمی یہ معتدّر کی بات ہوتی ہے
 جفا کرے وہ وفا سے نہ باز آؤں میں



اکبر کاظمی



حالِ دل ان کو سنانا چاہوں
 زخیم کو پھول بنانا چاہوں
 حشر تک حُسنِ تغافل دیکھوں
 حشر تک ان کو منانا چاہوں
 عام ہو دولتِ کردار و عمل
 ہائے میں کیسا زمانا چاہوں
 تیرہ و تار جہاں میں رہ کر
 چار سُو رنگ اڑانا چاہوں
 تیری پلکوں میں بسیرا کر لوں
 تیری سانسوں میں سمانا چاہوں
 اہلبِ پرہوترا نام نہ لوں
 درد اُٹھے تو چھپانا چاہوں
 ورقِ دل پہ لکیریں کھینچوں
 کوئی تصویر بنانا چاہوں
 گوفہ و شام کے بازاروں میں
 ایک آواز لگانا چاہوں
 اُس کے نقشِ کعبہ پا کو چوموں
 کھکشاؤں میں ٹھکانا چاہوں
 کاظمی جو نہ تصور میں بھی آئے
 میں اسے دل میں بنانا چاہوں



جب بھی جھونکا ہوا کا آیا ہے
 تیری تصویر ساتھ لایا ہے
 کس نے دل کا دیا جلایا ہے
 آج پھر کون یاد آیا ہے
 لذتِ قُرب سے ہوا محسوس
 عشق پر بھی ہوس کا سایا ہے
 پایا اس نے زندگی کا خلوص
 تیرا غم جس کو راس آیا ہے
 لوگ کہتے ہیں چاندنی جس کو
 تیرے سیمیں بدن کا سایا ہے
 اس میں کچھ زخم بھی فروزاں ہیں
 پھولِ کالر پہ جو سجایا ہے
 کاظمی میں نے قصہ غمِ دل
 اپنے اشعار میں سنایا ہے



سلمان سعید

○
جب بھی تیرے نگر میں آتا ہوں
غم کی بارش میں بھیگ جاتا ہوں

ٹوٹتا ہوں بکھرتا ہوں دن محسّر
خواب ہر شب نئے سجاتا ہوں

صبح ہونے سے شام ہونے تک
اپنے ہونے کا دکھ اٹھاتا ہوں

دل کی طرح اداس لگتے ہیں
پھول گلداں میں جب سجاتا ہوں

میں ہوں بچہ، یہ وقت ہے ساحل
ریت پر بیٹھا گھر بنانا ہوں

○

○
چپ چپ رہنا سیکھ لیا ہے
ہر دکھ سہنا سیکھ لیا ہے

اشکوں کی موجوں نے دل کے
اندر رہن سیکھ لیا ہے

پتھر جیسے لوگوں کو بھی
اچھا کہنا سیکھ لیا ہے

جیون کی تپتی راہوں پر
چلتے رہنا سیکھ لیا ہے

○

سلمان سعید

○
اُفق پر شمس ڈھلتا جا رہا تھا
سفر لبیکن میں کرتا جا رہا تھا

جیسے میں جانتا تھا دوست اپنا
وہ دشمن میرا بدآ جا رہا تھا

جو ہر دکھ سہ رہا تھا خامشی سے
وہ اندر سے بکھرتا جا رہا تھا

لو میں تر بہ تر تھا اک کبوتر
مسلل پھر بھی اڑتا جا رہا تھا

فلک پر دوزنک چھائے تھے بادل
مگر سب شہر جلتا جا رہا تھا

○

○
جب سے اُس کو پایا ہے
دل کا چین گنوا یا ہے
ہاتھ نہیں آتا ہے جو
خواب ہے یا اک سایا ہے
باغ میری اُمیدوں کا
یہ کس نے مہکایا ہے
دل کے سب دکھ دُور ہوئے
ساون پھر سے آیا ہے
اُس کی یادوں نے ہر سو
عجب سازنگ جمایا ہے
پیڑ جو کل تک سُکھا تھا
بہزہ اُس پر آیا ہے

○

سلمان سعید

اپنے شہر کا ایک منظر

نہر کے کنارے پہ

حدِ نظر تک

درختوں سے لپٹی خزاں کی اُداسی

مدھگیت گاتے ہوئے پانی میں زرد پتوں کی آہیں،

اُفتی پر

پہاڑوں پہ،

بادل کے ٹکڑوں میں

چھپتے ہوئے شمس کے سُرخ آنسو،

پریشاں پریشاں پرندوں کی ڈاریں

تصویر کی مانند

چُپ چاپ

خاموش!



ایک نظم

بیون کی اِس دھوپ کڑی میں

اُس کی یاد بہت آتی ہے

اندھی رات کے جگراتوں میں

آنکھوں میں آنسو لاتی ہے

کاش میں دل میں چھپی محبت

اُس سے کھل کر کہہ سکتا

اپنا اُسے بنا سکتا

اپنے بچے کی آنکھوں میں

اُس کا چہرہ پاسکتا!



تحسین فراقی



نہاں نظر سے ہے اور دُہ دُہ پکارتا ہے

یہ کون ہے جو مجھے سُو بَسُو پکارتا ہے

نہ اس سے رشتہ جاں ہے نہ اس سے ربطِ نظر

تو کس لیے اسے میرا لہو پکارتا ہے

یہ کس کی نیزہ صفت لے فضا کو چیرتی ہے

یہ کون دل زدہ راتوں کو ”ہو“ پکارتا ہے

ہوا ہے ہجر میں وہِ خوگرِ صدا ایسا

کہ عینِ وصل مجھے رُو برو پکارتا ہے

عجیب شہرِ شکم ذات میں گھرا ہوں جہاں

ہر ایک صرف کُلو ا و اشربُوا پکارتا ہے

عجب دورا ہے پر قیمت نے لاکے چھوڑا ہے

کہ ہم نفس تو ہے گم اور عدو پکارتا ہے

لکھی ہے دشتِ نوردی نصیب میں پھر سے

کوئی اُسی کی طرح ہو ہو پکارتا ہے



ڈاکٹر طارق عزیز

○
 دن کٹ گیا سفر کا، پھر شام لوٹ آئی
 خالی ہوا ہے رستا، پھر شام لوٹ آئی
 کیوں بے مکاں پرندے سورج کو جھوٹ سمجھے
 اس بات ہی کا ڈرتھا، پھر شام لوٹ آئی
 یہ کون سا عمل ہے دن گھل گیا ہے جس میں
 ہے سُمرتی دُھواں سا، پھر شام لوٹ آئی
 پہلے زتوں میں دکھتا نہیں تھتا کچھ بھی
 یہ مرحلہ بھی گزرا، پھر شام لوٹ آئی
 کیسے اکیلے اتنے سائے سمیٹتے ہم
 سو شام کو پکارا، پھر شام لوٹ آئی
 دکھلا کے دُھوپ منظر، آنکھیں بٹور لی ہیں
 کیا کھیل تم نے کھیلا، پھر شام لوٹ آئی
 ہم شام کو سفر کے عادی سے ہو چکے ہیں
 یہ بھی ہوا ہے اچھا، پھر شام لوٹ آئی
 پہلے تو حیرتوں نے سورج کو دیکھا گرتے
 پھر دن کا خواب ٹوٹا، پھر شام لوٹ آئی



○
 زیادہ کیا بھلا اب حُسن کی تفصیل میں ہوگا
 کوئی دم ہے کہ یہ دل آپ کی تحویل میں ہوگا
 بہت بے خواب رہتے ہو بہت بیدار پڑتے ہو
 یقیناً درد کوئی خواب کی تکمیل میں ہوگا
 پلٹ آئے ہیں ساحل پر جسے سب جان کمزور
 وہ شعلہ سا تمہارے چہرے کی قندیل میں ہوگا
 میں سب سے بھاگ سکتا ہوں مگر خود کبھی بھاگوں
 مرا دشمن، مرا ہی روپ، ہر تمثیل میں ہوگا
 میں سورج کو پکڑنے کا ارادہ کر تو لیتا ہوں
 یہ کارجا نفسانی کیا مری تحصیل میں ہوگا
 نہیں ملتے جو میسے پاؤں رستے میں بچے ہوں گے
 جو میرا سر نہیں ملتا، مری زنبیل میں ہوگا
 مری انگشت مری کھوئی، تمہارے ہاتھ میں ہوگی
 تمہارا پھول جو گم ہے وہ میری جھیل میں ہوگا



ڈاکٹر طارق عزیز

نظم

زمیں زادے، چلو باتیں کریں شہرِ تمنا کی
یہاں تو شام سے پہلے ہی سورج ڈوب جاتا ہے
یہاں ہر خواب سے پہلے ہی نیندیں چونک اٹھتی ہیں
بھاریں یوں گزرتی ہیں
کہ جیسے وقت سے ان کی کوئی ازلی عداوت ہو
کوئی بادل نہیں رکتا، ہوائیں بے مروت ہیں

زمیں زادے، یہ چھوٹے چھوٹے سراور ہاتھ میں رستی
خبر ہے کس نے ذہنوں سے ارادے نوچ ڈالے ہیں؟
تمہیں معلوم ہے ہونٹوں پر کیسی چپ کے تالے ہیں؟
’نہیں ہم شاہِ دولہ کی زیارت سے نہیں آئے‘
زمیں زادے تمہاری ہی امیدوں کی قسم تم کو
گواہی دو کہ ہر لب پہ گواہی لوٹ آئی ہے

ہوئیں صدیاں کہ آنکھوں میں کوئی سُورج نہیں چمکا
 کوئی شبنم نہیں اُتری، کوئی موتی نہیں دمکا
 چلو یہ تو ہماری کم نگاہی کی سزا ٹھہری
 مگر ہم خواب نہ دیکھیں تو نیندیں بے ثمر اپنی
 سماعت بے خبر اپنی، صدا نا معتبر اپنی

زمیں زادے، چلو باتیں کریں شہرِ تمنا کی
 یہ باتیں جو سلگتی ہیں مگر کرنیں نہیں بنتیں
 انہیں روشن اگر کر پاؤ تو کتنے سخی ٹھہرو
 مگر کیا کر سکو گے تم، مگر کیا کر سکیں گے ہم
 کہ ہم اس شہر میں بے خواب راتوں کے حوالے ہیں
 زمیں زادے، زمیں پہ بسنے والے تھکنے والے ہیں۔



منورہاشی



زمانہ میرے قدموں میں پڑا تھا
مگر میں اس سے بچ کر چل پاتا تھا
جو لایا تھا بہاروں کا سندیہ
وہ لمحہ میری قسمت سے جدا تھا
عجب تھی صورتِ حالاتِ یارو
میں اپنے آپ سے ڈرنے لگا تھا
اندھیرے میں جو اک شعلہ سا بھڑکا
وہ تو تھا یا ترسا یہ تھا، کیا تھا
کسے غمِ سوس ہوتی زندگانی
کوئی میری طرف کب دیکھتا تھا
کہاں لمحے وہ جن کی جستجو میں
زمانہ خاک اپنی چھانتا تھا
منور تھا وہاں خورشید لیکن
اندھیرا شہر بچھایا ہوا تھا



سوچتا ہوں حاصلِ احساس کیا کیا رہ گیا
جاں ترپتی رہ گئی اور جسمِ جلتا رہ گیا
جانے والا جا چکا تھا اور میری آنکھ میں
اک تسارہ سالِ رزتا، ہبلملا تا رہ گیا
میں بھی پا بسدا نا تھا وہ بھی مجبورِ خودی
میں بھی پیسا رہ گیا اور وہ بھی پیسا رہ گیا
میری آنکھوں کے لیے حُسنِ بصارت کا سبب
میرے آنکھن میں ترا نقشِ کعبہ پا رہ گیا
ہم صداقت کے علمبردار ہیں لیکن یہاں
جھوٹ جو کہتا رہا وہ شخص اچھا رہ گیا
گو بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ماحول میں
اس کے جانے سے مگر کوئی اکیلا رہ گیا
اک چھناکا سا منور کاپنج کے گھر میں ہوا
بکرچیاں میں خواب کی پلکوں سے چننا رہ گیا





زندگی کی شام (خواجہ احمد عباس کے نام)

وجید انور

اب زندگی کی شام آہستہ آہستہ دبے دبے قدموں سے اپنی سیاہ چادر تانے مسافر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اسے اپنی چادر میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔

آج کی رات مسافر پر بہت بھاری تھی۔
وہ پچھلے چند دنوں سے اپنی زندگی سے لڑ رہا تھا۔ اس سے ڈٹ کے مقابلہ کر رہا تھا۔

آج کی رات کیسے کٹے گی؟
درد اور تکلیف کی یہ رات!

پچھلے پانچ چھ سال سے مسافر بڑی تکلیف کی زندگی گزار رہا تھا۔ پہلے تو دھیرے دھیرے اس کی بنیائی غائب ہونے لگی۔ پھر اُس کے پاؤں مفلوج ہو گئے۔ چلنا پھرنا اس کے لیے دُوبھر ہو گیا۔ بڑی مشکل سے وہ کسی کے سہارے چل سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ کچھوے کی چال۔ اور پھر بلڈ پریشر کی شکایت بھی اسے ہو گئی تھی۔ ذرا ذرا سی اور معمولی بات پر وہ غصہ میں آ جاتا تھا اور بے قابو ہو کے چلنا لگتا تھا۔

زندگی جیسے ایک عذاب ہو گئی تھی۔ ایک جہنم۔ اور وہ جیسے جہنم کی اس آگ میں جل رہا تھا۔
بھن رہا تھا۔

”میں نے تو کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ کسی کا دل نہیں توڑا۔ کسی کو دکھ نہیں دیا۔ پھر یہ عذاب مجھ پر کیوں نازل ہوا؟ وہ سوچنے لگا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔

شاید یہی اس کی تقدیر تھی۔ اُس کے کرموں کا پھل۔ شاید اُس کی قسمت میں زندگی کا یہ ظلم برداشت

کرنا لکھا تھا — حالانکہ وہ کبھی بھی تقدیر یا قسمت کا قائل نہیں تھا — لیکن اب اس کا یقین متزلزل ہوتا نظر آتا تھا۔
ایسے لگتا تھا اب اُسے دکھ جھیلنے اور ظلم برداشت کرنے کی عادت ہو گئی تھی — رُوں وہ چُپ چاپ دکھ برداشت کر رہا تھا — لیکن زبان سے اُف تک نہیں کرتا تھا۔

زندگی کے ٹپڑے میراث کھردرے راستوں پر اُسے ابتدا ہی سے چلنے کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ چپلا جا رہا تھا — اپنی منزل کی طرف — اُس نے پیچھے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا — راستے میں رُکنے یا دم لینے کا نام تو وہ جانتا ہی نہیں تھا۔

اس کی طبیعت سیما بے سندت تھی — بس ہر وقت وہ اپنے کام میں مصروف رہتا تھا — بیکار بیٹھنا تو جیسے وہ جانتا ہی نہیں تھا — نئی نئی منزلوں کی کھوج میں نکل جانے کو بے قرار رہتا تھا۔

اوائل عمر ہی میں اُس نے دنیا کا پہلا سفر کیا تھا — زندگی کے اس پہلے سفر کا حال اُس نے لکھا تھا "مسافر کی ڈائری"۔

اُس وقت سے وہ مسلسل "سفر" میں تھا — رواں دواں — لیکن اب وہ کچھ عجیب حالات کا شکار ہو گیا تھا۔

وقت کے بے رحم ہاتھوں میں وہ بے بس ہو گیا تھا۔ حالات کے غیر متوقع پھیر طوں نے اُسے کمزور اور نڈھال کر دیا تھا — وہ جسمانی طور پر ٹوٹ رہا تھا — کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا — زندگی جیسے رینگنے لگی تھی — اپنا بچ ہو گئی تھی — لیکن پھر بھی وہ حسب معمول کام کر رہا تھا — اُس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا — وہ اسی لگن — اسی گرمی — اور اسی جوش سے کام کر رہا تھا۔ اُسے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ اُس کا جسم ٹوٹ رہا ہے — اُس کے اعضا جواب دے رہے ہیں۔

لکھنا ہی مسافر کی زندگی تھی — اُس کی روٹی روزی تھی۔ صبح سے شام تک وہ لکھتا رہتا تھا۔ اب یہ اس کی مستقل عادت ہو گئی تھی۔ لکھے بغیر اُسے چین نہیں پڑتا تھا — چاہے گھر ہو ٹیکسی ہو — ٹرین ہو یا ہوائی جہاز ہو — اُس کا قلم اُس سے کبھی جدا نہیں ہوتا تھا۔

اُس کا دماغ الگ الگ خانوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان خانوں میں سے جو بھی چیز وہ چاہتا نکال لیتا — اس کا دماغ اچھا خاصا کمپیوٹر تھا جس سے الفاظ ڈھل ڈھل کے نکلتے تھے۔

وہ اکثر کہتا: ”وقت بہت کم ہے اور کام زیادہ۔“ اس لیے اس نے وقت کی قدر کی، کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ جیسے وقت کو اس نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ ایک ایک پل کو جکڑ لیا تھا۔ وہ سوتے میں بھی جاگتا تھا اور اُس کا دماغ سوچ کے تانے بانے بُنتا رہتا تھا۔ بہت پہلے ہی اُس نے انسانوں سے پیار کرنا سیکھ لیا تھا۔ دراصل بچپن کے ایک واقعہ نے اُس کی زندگی کا رخ موڑ دیا تھا۔

اُن دنوں وہ ابھی بچہ تھا۔ ایک دن ایسے ہی اُس نے گھر کے ملازم کو کچھ بُرا بھلا کر دیا تھا۔ اُس سے بدسلوکی کی تھی۔ جب اس بات کی اطلاع اُس کے آبا تک پہنچی تو اُنہوں نے اُس کو بڑی سخت سزا دی۔ اُنہوں نے فوراً اُسے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ دن بھر اُسے کمرے میں بند رہنا پڑا۔ اور وہ بھی مہو کا پیاسا۔ شام کو جب اُسے کمرے سے نکالا گیا تو بھوک کے مارے اُس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ ”چلو معافی مانگو اس سے۔“ آبا نے اُسے ملازم سے معافی مانگنے کا حکم دیا۔ جب اُس نے ملازم سے معافی مانگ لی تو اُسے معاف کر دیا گیا۔

پھر اس کے آبا نے سمجھایا ”یاد رکھو ہر انسان سے اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ اُس سے خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے خواہ وہ کتنا ہی حقیر یا چھوٹا کیوں نہ ہو اُس کی عزت کرنی چاہیے۔“ اُس نے اپنے آبا کی یہ بات گروہ میں باندھ لی۔ اُس دن سے اُس نے انسانوں سے پیار کرنا اور ان کی عزت کرنا سیکھ لیا اور بصید بھاؤ، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کے فرق کو مٹا دیا۔

ہائی سکول کا امتحان پاس کرتے ہی اُسے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں یونیورسٹی میں اُس نے اپنا مقام پیدا کر لیا اور پھر وہاں اُس کا شمار مقبول طالب علموں میں ہونے لگا۔ اعلیٰ درجے میں اُس نے بی۔ اے اور پھر ال۔ ال۔ بی کے امتحان پاس کیے اور تعلیم مکمل کر کے دہلی چلا آیا۔ کچھ عرصہ دہلی میں رہنے کے بعد وہ ممبئی آ گیا۔ شروع ہی سے اُسے جرنلزم سے فطری لگاؤ تھا۔ یہاں ممبئی میں اُسے ایک انگریزی اخبار ”ممبئی کرائیکل“ (BOMBAY CHRONICLE) میں کام مل گیا بڑی محنت اور لگن سے اُس نے اخبار میں کام کرنا شروع کیا۔

ایک دن اتفاق سے اُسے اخبار کا فلمی صفحہ لکھنے کا موقع مل گیا۔ اُس کا کھانا ہوا یہ پہلا صفحہ اس قدر مقبول ہوا کہ ساری فلمی دنیا میں اُن کی آن میں اُس کی شہرت ہو گئی۔ ایک مشہور کمپنی نے اسے اپنا پٹی۔ آر۔ او نامزد کر دیا۔ یہ کوئی چالیس پینتالیس سال پہلے کی بات ہے۔

اب وہ کھولی لٹریچر کے فلیٹ میں آ گیا تھا۔ شیواجی پارک کے علاقے میں اُسے

لے ممبئی کی زبان میں کھولی ایک نہایت مختصر سے کمرے کو کہتے ہیں جس میں دو تین آدمی بہ مشکل رہ سکتے ہیں۔

ایک فلیٹ مل گیا۔

اُن دنوں ممبئی میں اچانک فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا۔ شہر میں ہر طرف ابتری اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ گھر ٹوٹے اور جلانے جا رہے تھے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اگر کوئی ہندو مسلمانوں کے محلے میں چلا جاتا تو وہ وہاں سے بچ کے نہیں آ سکتا تھا۔ اور اگر کوئی مسلمان ہندوؤں کی بستی میں چلا جاتا تو اس کا وہاں سے بچنے کے آنا مشکل تھا۔

در اصل مذہب کی آڑ میں یہ فساد غنڈے پھیلا رہے تھے۔ غنڈے جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا

— ہندو غنڈے — اور مسلمان غنڈے۔

مسافر ہندوؤں کے محلے شیواجی پارک میں رہ رہا تھا جو ان لوگوں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا — لیکن وہاں رہتے ہوئے اُسے کوئی ڈر یا خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تو مسلمانوں کے کسی محفوظ علاقے میں منتقل ہو سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنا فلیٹ نہیں چھوڑا۔ ایسے نازک وقت میں وہ رات دیر گئے ایک دو بجے اخبار کے دفتر سے گھر لوٹا، حالانکہ یہ دفتر گھر سے کافی دور فونٹین کے علاقے میں واقع تھا۔

کرفیو کی وجہ رات کی ڈیوٹی کرنے والوں کو پاس جاری کئے گئے تھے اور دوسرے لوگوں کے آنے جانے پر پابندی تھی۔

ایک رات وہ تھکا ماندہ کام کر کے دفتر سے گھر لوٹ رہا تھا — جب وہ شیواجی پارک کے قریب پہنچا اور اپنے گھر کی طرف چلنے لگا تو اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ایک لمحے کے لیے وہ رک گیا۔ پلٹ کے دیکھا تو پیچھے ایک آدمی چلا آ رہا تھا — مسافر آگے بڑھ گیا — آدمی بدستور اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

”اب تو جان کی خیر نہیں! اُس نے دل میں سوچا۔ ضرور کوئی غنڈہ ہوگا۔ اور فوراً اُسے چھڑا گھونپ کے غم کر دے گا۔“

خاموش دم سادھے ہمت کر کے وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ اُس کے پاؤں جیسے منوں بھاری ہو گئے تھے آہستہ آہستہ اُس کے قدم اُٹھ رہے تھے — دل خوف سے کانپ رہا تھا۔

”عباس بھائی!“ پیچھے سے اچانک آواز آئی

مسافر نے پلٹ کے دیکھا — اجنبی اُس کے بہت قریب آچکا تھا۔

”عباس بھائی!“ اجنبی اس سے مخاطب ہوا ”میں ایک بل مزدور ہوں۔ آپ کو اچھی طرح

جانتا ہوں۔ آپ اخبار میں کام کرتے ہیں نا!“

مسافر کو سخت تعجب ہوا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے وہ سوچ میں پڑ گیا۔
 ”جاس بھائی!“ بل مزدور بولا ”در اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ بستی میں فساد کو روکنے کے لیے ایک امن کمیٹی بنانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آج رات شیواجی پارک میں ایک میٹنگ رکھی ہے آپ کو بھی وہاں چلنا، اور کچھ بولنا ہے۔“

”ہاں! — اچھا — اچھا — تو چلو۔“ مسافر بغیر سوچے سمجھے فوراً بولا۔ اور پھر بل مزدور کے ساتھ شیواجی پارک کے میدان کی طرف چل پڑا
 میدان میں اچھا خاصا مجمع تھا۔ جہاں زیادہ تر بل مزدور، چھوٹا موٹا دھندا کرنے والے اور متوسط طبقے کے لوگ جمع تھے۔

مختلف لوگوں نے فسادات کو روکنے کے لیے تجاویز پیش کیں اور امن کمیٹی قائم کرنے کے لیے زور دیا۔ جب مسافر کی باری آئی تو اُس نے ایک دُھواں دھار تقریر کی۔ جب اُس کی تقریر ختم ہوئی تو سارے لوگوں نے نہایت گرجو ششی سے تائیاں بجا کے اس کا سواگت کیا۔

یہ واقعہ مسافر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ تھا۔ اس کا مسافر کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ اس واقعہ نے مسافر کی زندگی کا رخ عام لوگوں کی طرف موڑ دیا۔

اور پھر ایسے کتنے ہی واقعات اس کی زندگی میں آئے اور وہ عوام اور محنت کش مزدوروں کے قریب آتا گیا، اُن کی طرف کھینچا گیا۔ اب وہ اپنے آپ کو ان ہی میں کا ایک فرد سمجھنے لگا۔ اُن کے رہن سہن، دُکھ سُکھ، آرزوؤں اور غمشوں کو اُس نے اپنے سینے سے لگایا۔ اور پھر وہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ہجوم میں کھو گیا۔ ان کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

دُور دراز سے لوگ اُسے میٹنگوں میں بلاتے اور وہ اُن کے ساتھ چلا جاتا۔ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک۔ ہر جگہ وہ پہنچ جاتا کیونکہ اب وہ انسانوں سے اٹوٹ پیار کرنے لگا تھا۔ اُسے انسان کی عظمت پر پورا یقین تھا۔ وہ انسان سے مایوس نہیں تھا۔

اُس نے اپنی زندگی میں روپے پیسے کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ روپیہ پیسہ اُسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ دولت اور جائیداد رکھنے کے وہ سخت خلاف تھا۔ جب بھی اس کے پاس پیسہ آ جاتا تو وہ اسے دوستوں، فروعیندوں، غریبوں اور طالب علموں میں بانٹ دیا کرتا۔ لاکھوں روپے اس نے کمائے اور سب ان لوگوں میں بانٹ دیا۔ اُس کے پاس صرف ایک ہی دولت تھی۔ وہ تھی علم کی دولت۔ وہ اس علم کی دولت کو ہر جگہ پھیلانا چاہتا تھا۔ دُور دُور تک۔

اپنی کہانیوں کے ذریعے۔

اپنے کالموں اور مضامین کے ذریعے ۔

اپنی فلموں کے ذریعے ۔

وہ روشنی کا ایک مینار تھا جس سے انسانیت، سچائی، ہمدردی اور پیار کی روشنی ہر وقت پھوٹی تھی۔

زندگی بھر وہ یہ روشنی دوسروں کو دیتا رہا تھا لیکن اب یہ روشنی اُس سے چھینی جا رہی تھی

دھیرے دھیرے اُس سے ناسیب ہوتی جا رہی تھی — اس کی بجائے اُس کے اطراف فضا میں اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا

”وہ بھی کیا دن تھے!“ وہ سوچنے لگا ”ہر وقت لوگ اُسے گھیرے رہتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر آگے پیچھے دوڑتے تھے۔ اُس کی تعریف کے پل باندھتے تھے (حالانکہ وہ جانتا تھا اس میں کتنا جھوٹ۔

شامل ہے) اور ایک آج کا دن تھا — وہ ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بستر پر پڑا موت و حیات کے درمیان لٹک رہا تھا — اپنی سانسوں کا ایک ایک پل — ایک ایک گھڑی رگن رہا تھا — کمزور — بے بس — اور ایک اپنا سچ انسان ۔

کہاں چلے گئے تھے وہ لوگ جو اُس کی دوستی کا دم بھرتے تھے — جو اُس کی زندگی کے ساتھی اور

دوست بنے ہوئے تھے؟

کہاں تھے وہ لوگ جو دلمے درمے سخنے اُس سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے؟

کہاں تھے وہ رشتے دار — اُس پر اپنا حق جانے والے — جو اس طرح اُسے یہاں اکیلا

چھوڑ کے چلے گئے تھے؟

وہ اس وقت اپنے آپ کو ALIEN محسوس کر رہا تھا — رشتے ناطوں کی پھیڑ میں اپنے آپ

کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا — یہ سب لوگ — دوست — ساتھی اور رشتے دار اب اُسے

اجنبی لگ رہے تھے — کوئی بھی اس وقت اُس کی دلجوئی کرنے والا نہ تھا — اُسے تسلی دینے والا

نہ تھا۔ ہمدردی اور پیار کے دو بول بولنے والا نہ تھا۔

اُس کے چہرے پر اک گہرے کرب کے آثار نمایاں تھے۔

”اُن یہ زندگی!“ اُس نے سوچا ”کیا اس طرح گھٹ گھٹ کے مرنے کا نام زندگی ہے!“

زندگی کے کتنے ہی دلچسپ واقعات اور حادثات اُس کے دماغ میں جیسے گڈمڈ ہو گئے۔ کتنی ہی

رنگین کہانیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے تیزی سے گھوم گئیں — یکے بعد دیگرے۔

کتنی محنت کی تھی اُس نے اپنی زندگی کو بنانے میں — کس قدر کام کیا تھا!

کام ہی اُس کے لیے عبادت تھی — ہر وقت وہ کتابوں اور اخباروں کے انبار میں گھرا ہوا ہوتا
 اُس کے ہاتھ میں قلم ہوتا — اور یہ قلم کاغذ کے صفحات پر اس طرح دوڑتا جیسے دُکے لگا نہیں۔
 اپنی تحریروں سے اُس نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا — اُن کے دماغ میں جلا پیدا کی — انسانی
 قدروں کا پرچار کیا۔
 اپنے پرچار کی خاطر بعض وقت اُسے انتہا پسندوں سے بُرا بھلا سنا پڑا — یہاں تک کہ گایاں
 بھی کھانی پڑیں۔
 مسافر نے اس کی کوئی پروا نہیں کی — وہ کبھی دل برداشتہ نہیں ہوا۔ بس چپ چاپ اپنا کام
 کرتا رہا۔

لیکن اس وقت وہ نرسنگ ہوم کے بستر پر پڑا خود اپنے آپ کے بازوے میں سوچ رہا تھا — یہ
 سوچ رہا تھا کہ اُس کا کام ادھورا رہ گیا۔ کتنے ہی کام اُسے کرنا تھے — لیکن یہ زندگی! — زندگی نے
 اُس سے وفائ کی — آخر کیوں؟ — کیوں؟ — کیوں؟ — اس کے دماغ میں بار بار یہ سوال
 اُٹھ رہا تھا۔
 اُس نے زندگی کو کیا کچھ نہیں دیا تھا۔ اپنے سکھ آرام اور خوشیوں کو تیاگ کے زندگی کو سنوارنا چاہا تھا
 — خوشیاں دینا چاہا تھا — لیکن یہی زندگی اب اسے دُکھ دے رہی تھی — اُس کا گلا گھونٹ
 رہی تھی۔

یہ زندگی آج مجھ سے کیوں بے وفائی کر رہی ہے؟
 ”میں جو زندگی کے زہر کی ایک ایک بوند آج تک پیتا رہا ہوں۔
 میں جو زندگی کی صلیب کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا رہا ہوں۔
 میں جو زندگی کے ساتھ ساتھ ہر جگہ سائے کی طرح چلتا رہا ہوں۔
 کس قدر ظالم ہے یہ زندگی!“

آج وہ اپنے ناتوان اور کمزور جسم کے پنجر کو لیے نرسنگ ہوم کے اس چھوٹے سے کمرے میں بستر پر
 پڑا موت کی گھڑیاں گن رہا ہے۔
 ایک مجلس — تلاش — مجبور انسان۔
 وہ ہاتھ جس نے لاکھوں روپے ضرورت مندوں اور محتاجوں میں بانٹ دئے آج وہ ہاتھ خالی ہیں

_____ دودارو اور نرسنگ ہوم کا بل چکانے کے لیے تک اُس کے پاس پیسے نہیں ہیں !
 ”کیا یہی میرا مقدر ہے — کیا یہی زندگی بھر کے کام کا جملہ اور انعام ہے !“
 اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پیدا ہوئی — جیسے آج وہ اس زندگی کو چبا کے تھوک دینا
 چاہتا تھا ۔

”نہیں نہیں —“ دوسرے ہی لمحے اس نے سوچا ”زندگی کوئی اتنی معمولی چیز نہیں ہے کہ اسے
 چبا کے تھوک دیا جائے — زندگی بہت قیمتی چیز ہے اس کی قدر کرنی چاہیے — اسے زندگی ! میں تیری
 قدر کرتا ہوں — آج تک تو نے میرا ساتھ دیا — لیکن آج میں تجھے چھوڑ کے جا رہا ہوں — تجھ سے جدا
 ہو رہا ہوں — لیکن میں تجھ سے مایوس نہیں ہوں — مجھے تجھ سے جدائی کا کوئی غم نہیں ہے — دکھ
 نہیں ہے — میں پھر آؤں گا — اس دھرتی پر دوبارہ جنم لوں گا — یاں دوبارہ جنم لوں گا۔
 ”معصوم بچوں کی مسکراہٹوں میں۔

سڑیل نوجوانوں کے بازوؤں کی طاقت میں۔
 کنواریوں اور عورتوں کے وقار اور ان کی آن بان میں۔
 بڑے بوڑھوں کی ذہانت اور ان کی دور رس نگاہوں میں۔“
 ”میں ہر دور — ہر زمانے میں جنم لوں گا — اور ظلم و ستم کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوں گا۔ —
 ہر قسم کی نا انصافی کے خلاف اپنی آواز اٹھاؤں گا — میں انسانی حقوق کے لیے ہر جگہ سینہ سپر
 ہو جاؤں گا۔“

مسافر کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں — بہت ہی آہستہ اور مری ہوئی آواز میں
 اس کے پھر پھڑپھڑاتے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلی — الوداع — الوداع اسے زندگی !
 زندگی کا وہ آخری لمحہ — وہ آخری پل ! — اور پھر زندگی کا سارا کھیل تماشہ ختم !
 مسافر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا ۔

زندگی کے سٹیج پر وہ آیا — ایک چھوٹا سا اداکار — کہنے کو وہ ایک چھوٹا سا اداکار تھا
 لیکن اُس نے کتنا بڑا کردار ادا کیا تھا — زندگی کا سب سے بڑا کردار — سب سے اہم کردار !
 آنے والے زمانے میں زندگی کے اس سٹیج پر اور بھی کئی اداکار آئیں گے — اپنا اپنا کردار ادا کر کے
 رخصت ہو جائیں گے۔ لیکن مسافر نہیں آئے گا — شاید اس کا کردار کوئی ادا نہ کر سکے گا —

_____ پچاس سال میں نہیں — آئندہ سو سال میں بھی نہیں۔
 لوگ اس کے کردار کو بھول نہیں پاتے گے — اس کا کردار ہمیشہ زندہ رہے گا — اُس کی یادوں کی
 خوشبو زندگی کے سلج پر ہمیشہ دمکا کرے گی۔
 اُس کی یادیں لوگوں کا مسلسل پیچھا کرتی رہیں گی۔ _____ مسلسل !!!
 _____ مسلسل !!!

ابن حسن برنی

منظور الہی

ایک خط میں برنی صاحب نے لکھا تھا :
 ” اردو مرکز میں قدرت اللہ شہاب اور مختار مسعود اپنے مضامین پڑھ چکے ہیں، اب آپ کی باری ہے،
 جب لندن آنا ہو ایک شام اس تقریب کا اہتمام ہوگا۔“
 اردو مرکز کی طرف سے لندن آنے کی دعوت ملی۔ مگر یہ سان گمان نہ تھا کہ مضمون کا عنوان ’ابن حسن برنی‘ ہوگا۔ حافظ کا یہ
 شعر میرے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا : سہ

دوش بریا و حریفان بجز اباست شدم
 خُمِے دیدم و خون در دل و پا در گل بُود
 [دوستوں کی یاد میں کل رات میں میخانے کی جانب گیا، شیشے میں مے باقی دیکھ کر میرا جی بھر آیا
 دل خون ہو گیا اور پاؤں کچھڑے لت پت ہو گئے]
 اس شعر کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا تھا :

جب آہ اُن احباب کو میں یاد کر اُٹھتا ہوں جو
 یوں مجھ سے پہلے اُٹھ گئے جس طرح طائر باغ کے
 یا جیسے پھول اور پتیاں اگر جائیں سب قبل از خزاں
 اور خشک رہ جائے شجر

دیکھتے دیکھتے اجل کا سیل رواں ایک متحرک شخصیت کو بہا لے گیا، دوستوں اور عزیزوں کے لیے یہ ایک ہوش رُبا حادثہ تھا،
 وہ منفرد اور عزیز ہستی حُر

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایا بہ ہیں ہم
 کے مصداق انمول خوبیوں سے مرصع تھی، برنی کا تعلق اُس طائفے سے تھا جس کے متعلق کسی نے کہا تھا : سہ

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
 ز ما سلام رسانید ہر کجا ہستند

وہ عوام و خواص میں یکساں مقبول تھے، اُن کے دوستوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، دلپذیر

صفات کی زنگارنگ ٹکڑیاں ایک ہشت پہلو شخصیت میں جگمگا رہی تھیں، ایک جاذب شخصیت جو بیک وقت مثبت اور دلپذیر تھی۔

خون کا رشتہ ایک حادثہ ہے مگر دو دلوں کا رشتہ موت میں منسلک ہونا ایک اختیاری امر ہے، ایک لحاظ سے یہ باہمی کشش بھی اپنے اختیار میں نہیں، انجانے طور پر ہم ایک شخص کو پسند کرنے لگتے ہیں، تعلق خاطر پیدا ہونے کے بعد ہم اپنے دوست کی خوبیاں تلاش کرتے ہیں یا یہ کہ اُس کی خوبیاں ہی ہمیں اس کا گرویدہ بناتی ہیں، لاریب بے لوث محبت قدرت کا اگر انقدر عطیہ ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔

آئی۔ سی۔ ایس۔ اور سی۔ ایس۔ پی کے افسر اعلیٰ اور میرے عمن آئی۔ یو۔ خان بڑے بااخلاق اور بامروت انسان تھے، اُن کے ہاں چلنے کی دعوت پر برنی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تھی بلکہ اُنھوں نے خود ہی اپنا تعارف کروایا تھا، یہ صوبہ مغربی پاکستان کی تشکیل کے دن تھے جسے کم و بیش تیس برس ہونے کو آئے، ان کی شخصیت میں مٹھاس تھی، دل موہ لینے والی جاذبیت تھی، دو چار ملاقاتوں میں ہی واقفیت دوستی میں بدل گئی، انھیں اردو ادب اور شعر و شاعری سے دل چسپی تھی جو ایک قدر مشترک بن گئی، ناصر کاظمی اور دوسرے شعرا کا کلام سُنانے کے لیے اکٹھے آتے جاتے، جمیل نشتر مرحوم کا لاہور آنا ہوتا تو برنی ادبی نشست کا اہتمام کرتے، تواضع کا انداز ایسا ہوتا جیسے ہم اُن پر احسان کر رہے ہوں، بینکاروں کے چھوٹے بڑے کام خوش دلی کرتے، یاد نہیں پڑتا کہ اُنھوں نے مجھے کوئی کام کہا ہو۔

لاہور میں یونائیٹڈ بینک کا علاقائی دفتر کھلے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ کارپروازان کو پڑھے لکھے طبقے کے اکاؤنٹ حاصل کرنے کا خیال آیا کہ یوں بینک کی سادھ بڑھے گی، ڈاکٹر، اساتذہ، انتظامیہ کے افسران وغیرہم، اس مقصد کے لیے چند افسران کا انتخاب کیا گیا، ایک ایسے نوآموز نے برنی صاحب سے شکوہ کیا کہ بیٹھنے کے لیے اُسے کمرہ نہیں دیا گیا، نہ ہی اُس کے پاس کوئی فون ہے، خدا جانے برنی کس مٹی کے بنے ہوئے تھے، فوراً کہنے لگے:

”صاحب! یہ آپ ہی کا کمرہ ہے، آپ میرے کمرے میں بیٹھئے، یہی فون استعمال کیجئے۔“

بینک میں نووارد بے یقینی کے عالم میں اُن کا مُنہ تھکنے لگا، آج کل کے دور میں یہ بات ناقابل یقین سمجھی جائے گی کیونکہ ہم گریڈ اور مراتب کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔

نوجوان مسعود نے جوش و خروش کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا مگر شومی قسمت سے وہ ایک BRIEFLESS LAWYER کے ہاں جا پہنچا جو بددماغ بھی تھا، کچھ رد و قدح کے بعد اُس نے اپنا اکاؤنٹ کھولنے کے لیے پانچ سو روپے کا چیک دیا، وہ بھی حیدرآباد کے کسی بینک کا، مصروفیت کی وجہ سے مسعود چند روز چیک بُک نہ بھیج سکا تو ذکیل صاحب برنی صاحب پر برس پڑے اور فون پر جلی گئی سنائیں، برنی تحمل سے اُس کی بات سننے رہے اور معذرت خواہانہ انداز میں ”جی۔ جی۔۔۔ درست فرمایا“ کہتے رہے۔ اس گفتگو کے دوران مسعود کمرے میں موجود تھا مگر اُس کے حُسن اخلاق

نے گوارا نہ کیا کہ وکیل صاحب سے کہیں کہ مسعود اسی کمرے میں موجود ہے، اُس سے بات کر لیجئے۔ علاقائی انچارج کی خوش اخلاقی نے اس نوجوان کے دل میں گھر کر لیا اور وہ انہیں ایک ”ہیرو“ کے روپ میں دیکھنے لگا۔ مسعود کا کہنا تھا کہ اُس نے زندگی میں ایسا شیریں کلام شخص نہیں دیکھا، اُن کی گفتگو میں شاعری کی گھلاوٹ ہوتی۔ فرائض منصبی کی ادائیگی میں مسعود کو بسا اوقات برنی صاحب کے ہمراہ باہر جانے کا اتفاق ہوتا، اُس نے بتلایا تھا کہ برنی بڑے مخیر تھے۔ راستے میں جو سائل مل جاتا اُسے عام روش سے بڑھ کر دیتے بلکہ کسی نادار کی خستہ حالی دیکھ کر اُس زمانے میں پانچ دس روپے بھی دے دیتے، کبھی یوں بھی ہوا کہ کوئی مانگنے والا دیکھ کر مسعود نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور برنی صاحب نے روک دیا۔

”اس سائل کو دیکھ کر میں نے دینے کی نیت کر لی تھی، آپ کسی اور کو دے دیجئے۔“
 کردار کا ایک اور پہلو اُن کی زیر دست قوتِ ارادی تھی، وہ کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتے تھے، کچھ کرنے کا عزم کر لیتے تو اُسے مکمل کر کے دم لیتے۔
 ”مسعود صاحب! فلاں شخص باہر سے لوٹ آیا ہے، آپ وہاں پہنچ جائیں، ملاقات طے ہو جائے تو مجھے فون کر دیں۔“

”جناب! وہ آج ہی لاہور واپس آیا ہے، کار بھی نہیں ہے، کل صبح جانا مناسب نہ ہو گا۔“
 ”نہیں، میں یہ کام آج ہی کرنا ہے، آپ میری گاڑی لے جائیے، میں چھوٹی گاڑی لے کر پہنچتا ہوں۔“
 بھلائی اُن کی سرشت میں تھی، احسان جلائے بغیر وہ ضرورت مندوں کے کام کرتے تھے، دوستوں کی فرمائش پر ”نہ“ کا لفظ اُن کی لغت میں نہیں تھا۔

”برنی صاحب! ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا مدت سے بیکار ہے، بڑا پریشان ہے۔“

”کوئی بات نہیں اُسے میرے پاس بھجوا دیجئے۔“

”برنی صاحب! فلاں نوجوان بڑا غریب ہے اور اپنے خاندان کا واحد سہارا ہے۔“

”ہو جائے گا صاحب!“

یہ اور بات ہے کہ یونین کے صدر کی حیثیت سے اسی صاحبزادے نے پُر پُرزے نکالے، برخوردار کو شیخی بگھارنے کا موقع ہاتھ آیا اور ووٹ دہندگان کو مرعوب کرنے کے لیے منہ بھر کرے کا دروازہ ہاتھ سے کھولنا عار سمجھنے لگا، بالآخر انجام وہی ہوا جو تکبر کا ہوتا ہے۔

عمر بھر برنی صاحب نے بے شمار لوگوں کی دستگیری کی، چند برس بعد اُن کے ایک ہم عصر سے واسطہ پڑا جسے ہمسری کا دعویٰ بھی تھا مگر انسان دوستی کے ضمن میں موصوف بالکل کورے تھے، کبھی ایسا ذکر ہوتا تو ادھر ادھر کی بات کر کے ٹال جاتے۔

وَن یونٹ کے خاتمے پر سابق صوبوں کی تجدید ہوئی، میں کراچی میں تعینات ہوا، ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا کر برنی اور یونائیٹڈ بینک لازم و ملزوم تھے۔ ادارے سے وفا کشی کا یہ عالم تھا جیسے ذات اور ادارے کا مکمل ادغام ہو، بے پناہ مصروفیتیں انھیں گھر سے رہیں، عموماً رات گئے گھر لوٹتے، وہ جانتے تھے کہ کامیابی کے لیے مسلسل محنت شرط اولین ہے، اسی کی بدولت انہوں نے ترقی کا زینہ سرعت کے ساتھ طے کیا گو چند برس بعد خرابی صحت کی صورت میں اس کی کڑی قیمت ادا کرنا پڑی، بینک کے پریذیڈنٹ آغا حسن عابدی کے ساتھ اُن کا رشتہ محض ایک جونیئر اور سینئر کا نہ تھا بلکہ اُس میں بے پایاں عقیدت، نیا زمندی اور وفا کشی کی جھلک تھی، اُن کا ہر حکم پتھر پر لکیر تھا اور اُن کی برخواہش وہ بلا تاقل اور بکمال عجلت پوری کرنا چاہتے تھے، بینک کی ترقی اور توسیع کے سلسلے میں آغا صاحب عملے کے ہر فرد کا بھرپور تعاون چاہتے تھے، اس حکمت عملی کو بروئے کار لانے میں برنی صاحب کی کلیدی حیثیت تھی۔ مصروفیت کے باوجود وہ اس ٹوہ میں رہتے کہ مل بیٹھنے کا موقع ہاتھ آئے، دعوت کرنے کا کوئی جواز ہو۔

اے عزیزاں غنیمت است لقا ذوق دیدار یک دگر گیرید
دوستان در عزیمتِ سفرند یک زماں لذتِ نظر گیرید
[اے عزیزو! پیار سے ایک دوسرے کو دیکھو اور اسے غنیمت جانو۔

دوست رخصت ہونے کو ہیں انھیں ایک بار جی بھر کے دیکھ لو
کراچی میں احباب کی چوڑی برنی صاحب کے ہاں جمتی یا یوسفی صاحب کے گھر پر، چند اور دوست شریک ہو جاتے، باہر سے کوئی مہمان اہجاتا تو فراز کوہ پر واقع شیراز ہمارے پسندیدہ جگہ ہوتی، ایک ہی مضمون پر مختلف شعرا کے اشعار دہرائے جاتے، کبھی ادبی شخصیتیں زیر بحث آتیں، کبھی کوئی تازہ کتاب یا افسانہ، سیاست پر اظہار خیال تو خیر ہم لوگوں کی گھٹی میں ہے، دنیاوی جھیلوں سے دور دو تین گھنٹے ہنسی خوشی گزر جاتے۔ انسان کو یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، زندگی اسی طور آگے بڑھتی رہے گی، دوست احباب کی مشغلتی رہے گی اور ایسی خوش وقتی کبھی ختم نہیں ہوگی۔

ادب اور شعر و شاعری کا ذکر چل نکلا ہے تو معذرت کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بینکاری سے اس کا رشتہ نہیں جڑتا، عام تاثر یہ ہے کہ بینکار صبح و مساجع و تفریق کے چکر میں رہتا ہے اور دن بھر کی تھکن اسے فنون لطیفہ کے قریب پھٹکنے نہیں دیتی، یہ کلیہ صحیح ہو یا غلط چند ہستیاں ہر حال مستثنیٰ ہوتی ہیں، برنی اردو ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے، وہ رسائل اور ماہنامے بالاستیعاب دیکھتے تھے، بہت برس پہلے بلونت سنگھ کا طویل افسانہ ”رات، چور اور چاند“ نقوش میں قسط وار چھپا تھا، افسانہ نگار نے اُس کا اختتام ایسے ڈرامائی انداز میں کیا تھا کہ قاری چونک اُٹھے، برنی ملے تو کہنے لگے ”آخری صفحہ پڑھ کے میں لرز اُٹھا تھا“ اور حقیقت بھی یہی تھی، وہ بڑے بینکار نہ ہوتے تو ذوق اور وسعت مطالعہ کی بدولت بڑے ادیب اور انشا پرداز ہوتے۔

متعدد ادیبوں اور شاعروں سے اُن کے ذاتی مراسم تھے۔ حفیظ ہوشیار پوری سے بھی یاد اللہ تھی، ایک مشترک دوست نے اُن سے حفیظ کی شدید علالت کا ذکر کیا اور بتلایا کہ چند ادویات کی سخت ضرورت ہے جو صرف ہانگ کاٹنگ اور سوٹر رلینڈ سے دستیاب ہو سکتی ہیں، برنی صاحب نے فوراً منگوانے کا انتظام کر دیا اور متعدد بار ہمارے پری کی ایک شام وہ حفیظ کو دیکھنے کے لیے ہسپتال گئے، غالب نے عیادت کو ”خوش اقبال رنجوری“ سے تعبیر کیا تھا، حفیظ نے سپاس عیادت کا حق یوں ادا کیا:۔

دردِ دل پر یہ کس نے دستک دی ، کوئی تو یارِ مہرباں آیا
دیکھتا کیا ہوں میں کہ ابنِ حسن ، طرب انگیز و گل فشاں آیا
جانے کس کس کی یاد تازہ ہوئی ، ذکرِ احباب درمیاں آیا

حفیظ نے صحیح کہا تھا، یاسیت سے کوسوں دور برنی ہمیشہ پر امید دکھائی دیتے تھے، بشاشت کی کرنیں اُن کے بُسرے سے چھوٹی تھیں، اُن کی ہفت رنگی شخصیت میں منفی عنصر کا دخل نہ تھا اور ایک فکری خود اعتمادی ماحول پر اثر انداز ہوتی تھی، وجہ، سروقامت، خوش وضع قطع، خوش لباس، مسکراتا کھلتا چہرہ، بچے میں شائستگی، ہر لحاظ سے ایک نستعلیق صاف ستھری شخصیت جو محفل کو گرماتی تھی، وہ جس جگہ ہوتے زینتِ محفل ہوتے۔

اُن کی روزمرہ زندگی میں بھی جمالیاتی حس کی جھلک نظر آتی تھی، ایک بار اُن کے ہاں بیٹھے ہوئے کوئی یادداشت لکھنے کے لیے میں نے جیب سے معمولی قسم کا بال پوائنٹ نکالا، اُسے دیکھ کر برنی پریشان سے ہو گئے، لکھنے لگے: ”آپ کے لیے بہتر قلم ہونا چاہیے“ اور غالباً کراس کا بال پوائنٹ لا کر مجھے دیا۔

برنی شہاب صاحب کے مداح اور اُن کی نیکی طبع کے معترف تھے مگر شہاب عام ڈگر سے ہٹ کر مختلف قسم کے آدمی تھے، اُنہوں نے ضروریاتِ زندگی بتدریج محدود کر لی تھیں اور بڑی حد تک علاقائی دنیا سے بے نیاز ہو گئے تھے جب کہ برنی آب و خاک کی اس دنیا سے رشتہ استوار رکھتے تھے، وہ دنیاوی خوشیوں اور راحتوں سے لطف اندوز ہونے کا ڈھنگ جانتے تھے، ابنِ حسن کا مزاج شامانہ اور ٹھاٹھ امیرانہ تھا، انہیں اُجلی چیزوں سے محبت تھی، سفید بے داغ قمیص پر نفیس ریشمی کٹاٹی، نکلتے ہوئے قدر چھتا ہوا نیلا سوٹ، چمکتے سیاہ قمیص، وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی اُسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے،

اللہ جمیلٌ ویحب الجمال

[اللہ خود جمیل ہے اور حسن پسند کرتا ہے]

اُنہوں نے بھرپور زندگی بسر کی مگر سفلی آلائشوں سے پاک رہے اور اپنے عقیدے میں راسخ الاعتقاد، کراچی میں ماہِ صیام میں برنی پورے روزے رکھتے مگر شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ افطاری کے وقت اہلِ حنا نہ اور مہمانوں کو عمدہ چیزیں کھانے کی ترغیب دیتے۔

مُنیادِی معاملات میں برنی کی بیدار مغزی مسلم تھی مگر بعض اوقات وہ ناقابلِ یقین بات پر یقین کر لیتے تھے، جس پر اعتبار کر لیا اُس کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہہ دیتے، یہ سادہ دلی تھی یا انسانی فطرت کے تضاد سے صرف نظر؟ شاید یہ کہنا مبالغ نہ ہو کہ اُنہوں نے اپنے گرد ایک نشاط انگیز ماحول کی تشکیل کی تھی جس میں گراوٹ یا عامیانا پن کا گزرنہ تھا، اُن کی شائستگی اور شگفتہ مزاجی کسی ہلکی بات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، مزاح کی چاشنی طنز سے مبرا تھی۔ وہ دوائی اخلاقیات کا مرقع تھے، اگر کسی سے تکلیف پہنچی یا بوجہ دل آزاری ہوئی تو کبھی شکوہ نہیں کیا، کسی بات پر شکریہ کی نوبت آتی تو بھال ہے جسیں شکن آلود ہوئی، بٹنے کے لیے وہی کشادہ بازو، سلوک میں وہی وسعتِ قلبی، خاطر مدارات میں وہی دریادلی۔

خاندانی وراثت پر فخر و مباہات ہماری قومی کمزوری بن چکی ہے، ضیاء الدین برنی عمدہ تعلق کے مشہور مورخ تھے جنہوں نے ہر واقعہ لکھنے سے پہلے اُس کی چھان پھٹک کی اور اپنے تاثر کے ساتھ اُسے سادہ الفاظ میں قلم کیا، بزرگوں میں ایسی عبقری شخصیت کا ہونا بجائے خود ایک قابلِ فخر بات تھی جس کا ذکر اُنہوں نے کبھی نہیں کیا۔ بلکہ مجھے چند ماہ پیشتر علم ہوا کہ نامور محقق اور مقالہ نگار سید حسن برنی آپ کے والد تھے، کس نفسی کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھولے سے بھی بات نہیں کی، ایک دو مرتبہ ایسا اس برنی کا ذکر ضرور ہوا تھا جنہوں نے اپنے قوی اور اثاثہ ردا حدیث پر ایک مبسوط کتاب مرتب کرنے میں صرف کردئے تھے اور وہ بھی میرزا صاحب کی نگارشات کے حوالے سے چند روز پیشتر مجھے معلوم ہوا کہ وہ برنی صاحب کے چھوٹے ماموں تھے۔

کراچی میں قیام کے دوران حکومتِ پاکستان کی طرف سے مجھے خطاب ملا، اتوار کی صبح اخبارات میں اعلان ہوا، صبح صبح احباب اور جاننے والوں کا جھگڑا لگ گیا مگر جو گرم جوشی برنی صاحب کے معانفے میں تھی اس کی تپش آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

کراچی سے میرا تبادلہ ہوا تو آنا فانا جج کی ادائیگی کا پروگرام بن گیا، دو روز میں انتظامات مکمل ہو گئے اور ہم برنی صاحب کی معیت میں ایئر پورٹ کی جانب رواں تھے، کمال اور ندیم حبیب پبلک سکول میں زیرِ تعلیم تھے، اُن کے امتحان ہونے میں ابھی وقفہ تھا، برنی اُنہیں اپنے گھر لے گئے، مسز برنی نے اپنے بچوں کی طرح ان کی دیکھ بھال کی، وہ بھی اپنے بھجلیوں سے گھل مل گئے اور کیل گود اور شرارت میں برابر کے شریک ہو گئے۔ تیرنے کے لیے کلب جاتے تو کمال برنی اور ندیم برنی بن جاتے۔

انسان سونا چاندی تو لوٹا سکتا ہے مگر احسان کا قرض عمر بھر نہیں اتار سکتا۔

کچھ عرصے بعد برنی صاحب کو ایک بڑا صدمہ پہنچا، بیمار ہوئی اور خورد سال بچے کیچھے چھوڑ کر چھوٹا بھائی آنا فانا دنیا سے گزر گیا، اُس کا یوں اُٹھ جانا برنی صاحب کو بید شاق گزرتا مگر اُن کی فعال شخصیت خالی ہمدردی کی قائل نہیں تھی، بھائی اور بچوں کی رہائش کے لیے اپنے مکان پر دوسری منزل تعمیر کروائی، بچیوں کی شادیاں کیں اور حتی الوسع ان کی

کفالت اور نگہداشت کی۔

برنی کراچی میں تھے تو فون پر بات ہو جاتی تھی، لندن چلے گئے تو خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا، اُن کی نفاست پسندی کا اظہار خطوط کے ذریعے ہوتا، اعلیٰ درجے کی سٹیشنری، لفافے پر گھر کے پتے کی سنہری چھاپ، دیکش طرز تحریر اور ابھرتی ڈوبتی موجوں میں سموئی ہوئی ایک خاص انداز کی خوشنویسی جیسے لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہوا میں ڈول رہے ہوں۔

احباب سے مل کر انھیں دلی مسرت ہوتی تھی، لندن میں 'بائی پاس' کا مرحلہ طے کر کے رخصت پر کراچی آئے تو خوش و خرم نظر آ رہے تھے، ایئر پورٹ پر میں نے طبیعت کا حال پوچھا تو کہنے لگے: "دوستوں سے مل کر جی خوش ہو گیا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اپریشن کے سات آٹھ برس بعد اُن کی صحت اچھی رہی، اُن دنوں ایک بار ہمارا امریکہ جانا ہوا، لندن میں بمشکل دوہین روز کا قیام تھا، بی۔سی۔سی۔آئی کے دفتر میں ہم برنی صاحب کے آنے کا انتظار کرتے رہے، دو تین بار فون کیا، معلوم ہوا کہ ابھی نہیں پہنچے، پرائیویٹ سیکرٹری نے گھر پر اطلاع کر دی ہوگی، مجال ہے برنی صاحب کی طرف سے چوک ہوئی ہو، ہم یوسفی صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، سرشام میاں بیوی و ہاں آ گئے۔ برنی کہنے لگے: 'ایلر جی سے چہرے پر خارش ہونے لگتی ہے، ڈاکٹر کہتا ہے دھوپ میں باس نہ نکلو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟' اُسی شام یوسفی صاحب نے ایک ناخواندہ مہمان کا ذکر چھیڑ دیا جو کسی واقف کی معرفت بمعہ بچوں کے آدھلے تھے اور گلے کا مار ہو کر رہ گئے تھے، یوسفی صاحب حسبِ معمول پچھڑیاں چھوڑ رہے تھے، کہنے لگے کراچی جانے سے پہلے بیگم کھانے کی چیزیں ڈیپ فریز میں رکھ گئی تھیں تاکہ چند روز کھانا پکانے کی زحمت نہ ہو، ڈیپ فریز میں پڑے رہنے سے کھانے کی ماہیت بدل جاتی ہے۔ مہمان ایک ایک ڈش نکال کر اُسے بغور دیکھتے جیسے عجوبہ روزگار ہو۔ اور واپس رکھ دیتے، پھر میکے انڈسٹری ہیمبرگر منگوانے کے لیے آپس میں مشورہ کرتے۔ ذکر اک بلائے جان کا تھا اور بیان یوسفی صاحب کا، ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

برنی صاحب کو علم ہو گا کہ بیگم کی غیر حاضری میں گھر کا کام کاج یوسفی خود سنبھالتے ہیں۔ کھانا پکانا، صفائی ستھرائی اور اس میں کسی کی مدد لینا گوارا نہیں کرتے۔ اُس پر ستر ادا اپنے جوتے پالش کرنا، بنیان اور جراب دھونا اور قمیص استری کرنا تو خیر عمر بھر کی عادت ہے جو فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے مگر دوستوں کے ساتھ ہی برنی ایک تکلف ملحوظ رکھتے تھے۔ اُن کی جبلی شرافت کا تقاضا تھا کہ حجاب کا مہین سا پردہ باقی رہ جائے۔ ورنہ کہہ دیتے، "میاں! کس جھنجھٹ میں پڑے ہو، یہ کام کسی اور کے سپرد کرو اور فارغ وقت تخلیقی کام میں صرف کرو۔" اُٹھتے ہوئے برنی اگلے روز دوپہر کے کھانے کی دعوت دے گئے۔

یوسفی صاحب کے علاوہ 'کندن' رستوران میں فیض صاحب، زہرا نگاہ اور ماجد مدعو تھے۔ فیض صاحب

مناست کی تصویر تھے، دکھ بھرے انداز میں بیروت کی تباہی اور فلسطینیوں کی حالتِ زار کا ذکر کرتے رہے، ”لٹلس“ کی اشاعت کے لیے شمالی افریقہ کا ایک ملک اُن کی نظر میں تھا، آمر حکمران کے زمانے میں انصاف کے تعلق سے زیرِ بحث آگئے، ماجد مصر تھے کہ حکومت کا نامزد قاضی القضاۃ بے لاگ فیصلہ نہیں دے سکتا اور تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا، زہرا اپنی ہم نام زہرا نگاہ کے ساتھ باتوں میں مصروف رہیں، کھانا لذیذ تھا اور صحبت پُر لطف، برنی تواضع میں بچے جارہے تھے ”آپ ایک روز اور ٹھہر جائیں تو مکمل طبی معائنہ کروادوں، وہ ایک یا دو کارٹسٹ تھی مگر برنی صاحب کا جی نہیں بھرا، دوسرے روز سیر شام آگئے، کہنے لگے، ”آج آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دیں گے، چند قدم پر ایک ریسٹوران ہے وہاں کھانا کھا لیں گے“ وہاں جا کر بھی بس نہیں چلتا تھا کہ کیا کیا چیز کھلا دیں، یہ تھے ابنِ حسن برنی!

پھر پتیا چلا کہ اُس جانِ ناتواں پر عارضوں کی یلغار ہوئی، فالج کا شدید حملہ ہوا، دل کی تکلیف بڑھی تو اس کے ساتھ مشین منسلک کر دی گئی، انہوں نے ہر بیماری کا مقابلہ بڑی پامردی کے ساتھ کیا، لندن جانا ہوا تو دیکھ برنی لڑکھڑاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں، وہ اپنے بدلے ہوئے انداز سے بخوبی آگاہ تھے مگر اسے اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا، اپنی چال پر خود ہی پھبتی کتنے کہ لولا لنگڑا ہو گیا ہوں، جب ملک ہمت نے ساتھ دیا دفتر جا کر کام کرتے رہے۔ احباب سے تعلقات نبھاتے رہے، اُن دنوں ایک روز ہمارے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے وفاقی محتسب کی آمد کا ذکر کیا، میں نے کہا بھی دو پہر کے وقت وہ ہوٹل میں کہاں ملیں گے، کہنے لگے: کارڈ چھوڑ آؤں گا۔ آخری دنوں میں آدا جعفری کے لیے لندن میں دو تین نشستیں ہوئیں، آدا بہن نے اردو مرکز کی تقریب میں آنے سے منع کیا کہ ناحق تکلیف ہوگی، وہ مان کر نہیں دیتے، ”واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کی تقریب ہو اور میں غیر حاضر رہوں!“ یہ وضع داری آخر دم تک قائم رہی۔

آخری علالت سے چند روز قبل میرے خط کا فوری جواب آیا، میں بہت خوش ہوا اور متعجب بھی۔ بیسیاختہ غالب کا یہ شعر جواب کا عنوان ہوا

ما لذت دیدار ز پیغامِ گر فتم
مشتاق تو دیدن ز شنیدن شناسد

[چاہنے والے کے لیے تمہارا پیغام لذت دید سے کم نہ تھا، پیغام کیا ملاؤں محسوس ہوا جیسے تمہیں

دیکھ رہا ہوں، ہم دیکھنے اور سننے میں فرق روا نہیں رکھتے]

افسوس ابنِ حسن بہت دور چلے گئے، اب دید ہوگی نہ شنید، دل گرفتہ دوستوں کے دل میں بیٹے دنوں کی سہانی یاد ہوگی اور پُر کیف صحبتوں کی حسرتِ بازیافت، ایک خوشگوار عہد کی بازیافت، ممکن ہے اس احساسِ زیاں میں خود پسندی کا پہلو بھی ہو، ڈھلتے سالوں میں ہم پر اپنی خامیاں عیاں ہوتی ہیں اور یہ سوچ کر دل جذبہٴ تشکر سے لبریز ہو جاتا ہے کہ ان کوتاہیوں کے باوجود دوستوں نے ہمیں اپنا یا تھا۔

ادوار مارچ میں ایک ڈبہ الماری میں نظر آیا، کھول کے دیکھا تو برنی صاحب کے خطوط تہ بہ تہ قرینے سے دھرتے دوبارہ پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی، اُسے جوں کاتوں وہیں رکھ دیا۔ اس بار وہ ڈبہ تو ڈھونڈنے سے نہ ملا البتہ پُرانے کاغذ کھنگالتے ہوئے دس برس پہلے کے لکھے ہوئے دو خطوط ملے، لندن میں مکان خریدنے کے متعلق لکھا تھا:

”ایک ٹکڑا پرکونے کا مکان ہے، تین طرف چمن آرائی کا اہتمام ہے، پائیں باغ میں سوئمنگ پول بھی ہے، دفتر سے تیرہ چودہ میل کا فاصلہ ہے، راستے میں ہرے بھرے کھیت، سرسبز میدان، پُراشجار جنگل پڑتے ہیں، آج کل کھیتوں میں سرسوں پھولی ہے، پاکستان کی یاد ساتی ہے، وطن جس کے لیے آج کل ہر وقت دعائیں ہیں،“ خط کی تاریخ ہے ۱۲ جون ۱۹۷۷ء جب پی۔ پی۔ پی اور قومی اتحاد کے مابین محاذ آرائی عروج پر تھی۔

آخری فقرہ وطن سے دُور رہنے والوں کی دلی کیفیت کا آئینہ ہے، ملک کے حالات و گروگوں ہوں تو اہل وطن پر جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے مگر تارکین وطن کے لیے غیر یقینی کیفیت، صحیح خبروں کا فقدان اور عزیز واقربا کے لیے پریشانی دو گنا عذاب ہے۔

دوسرا خط ملکہ معظمہ کی سلور جوبلی کے متعلق تھا، انگریز قوم کی سائیکس میں تضادات پر بحث تھی، شاہی خاندان سے بے اعتنائی اور شاہ پرستی، ایک دیرینہ اور مستحکم جمہوریت مگر ملکہ کے لیے جذبہ عقیدت، سلور جوبلی کی ہر تقریب میں شمولیت کے لیے لوگوں کا ذوق و شوق مگر تنظیم اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ، خط کا یہ حصہ تین صفحوں پر محیط ہے مگر برنی ایک حساس دل رکھتے تھے، جشن کی رنگینیاں اُن کی افسردگی کم نہ کر سکیں، خط کا آخری حصہ دلی کیفیت کا غماز ہے جہاں جذبات کا آبگینہ چھلک پڑا ہے، لکھا ہے:

”پچھلے دنوں طبیعت بہت افسردہ رہی، میرے ایک خالہ زاد بھائی تھے جن سے بہت دوستی اور وابستگی تھی، اس بار کراچی گیا تو مجھے ملنے کے لیے وہ پہلی مرتبہ پاکستان آئے اور اس قدر ٹوٹ کے ملے کہ دل و جان میں پیوست ہو گئے، خوب لطف رہا، طویل شبینہ نشین ہوئیں، بیتے ہوئے دنوں کی باتیں، بکھرے ہوؤں کی یادیں، میں ادھر آیا اور وہ ہندوستان واپس چلے گئے، مشکل سے تین چار مہینے گزرے ہوں گے کہ خبر آئی کہ وہ رخصت ہو گئے۔“ آخری دنوں میں بھی برنی بارمانے کے لیے تیار نہیں تھے، اُن کا خیال تھا کہ آخری بحران سے بھی وہ سبکا سار غزر جائیں گے مگر قوی جواب دے رہے تھے، دُوبتے سورج کی کرنوں سے گرد و پیش ایک مضمحل تابندگی کا سنکے تھا، اس حال میں بھی وہ یاد رس نہیں تھے، عیادت کے لیے آنے والے اُن کے حوصلے کی داد دیتے، پھر ایک روز جب سڑی پورے شباب پر تھی برنی برف کی براق چادر اور ڈھکے سو گئے، ہمیں اس جدائی کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا، بیاریوں کی یورش ایسی تھی کہ ہر آن دھڑکا لگا رہتا تھا، کبھی خیال ہوتا کہ ممکنات کی دنیا میں کیا کچھ ممکن نہیں، شاید انسان دائمی جدائی سے سمجھوتہ نہیں کر پاتا اور یوں موت کی حقیقت کو جھٹلاتا ہے۔

ایک لحاظ سے نہ ہوتے ہوئے بھی برنی ہمارے درمیان موجود ہیں اُس بھینی خوشبو کی مانند جو کاروانِ رنگ و بو گزر جانے کے بعد فضا میں معلق رہ جاتی ہے، کسی کا بخیر کی یاد، اُس گرم جوشی کی یاد جس میں اخلاص کی بُو باس تھی، سالِ نو اور عید کے موقع پر دُعاؤں سے معمور تہنیت ناموں کی یاد، پیچھے رہ جانے والوں کے لیے بھی اُن کا یہی پیغام ہوتا، ”مسکراتے رہو اور پُر اُمید اپنا دامن پھولوں سے بھر لو، تروتازہ خوشترنگ پھول، کچھ اُسود گیاں اپنے ارد گرد بانٹ دو“ اُس محبِ گرامی کی یاد میں ہیں اُن خوبیوں کی یاد تازہ کرنی چاہیے جو اُس پہلو دار شخصیت میں یکجا ہو گئی تھیں، خوش خلقی، صلہ رحمی، مروت اور رواداری، دوستوں کی دلداری، بیکسوں کی اشک شونی، حُر بادِ دوستانِ تملطف بادِ دشمنانِ مَدِار

تجدیدِ اُلفت کے اس پیمان سے ابنِ جن کی رُوح یقیناً شاد کام ہوگی۔
جب تک جان میں جان ہے انسان سلسلہٴ روز و شب کے چکر سے آزاد نہیں ہو سکتا، فزنگی اپنے ڈگر پر چلتی رہتی ہے، بالآخر چند یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں، وہ یادیں محبت اور رفاقت کا سرمایہ ہیں، البتہ یہ حسرت رہ جاتی ہے کہ اُن لمحوں میں ہمیشگی نہیں تھی اور اس جہانِ گزراں میں انھیں دوامِ بخشنا اپنے بس میں نہ تھا، اب احساسِ محرومی دل پر شیخوں مارتا ہے، پچھلے پہر کے سناٹے میں بے نام خیالِ ذہن کے دیرپے میں پھڑپھڑاتے ہیں اور شام کی گہری اداسی میں حریفانِ رفتہ کے داغ بھڑک اُٹھتے ہیں۔

ابو الفضل صدیقی صاحب مرحوم؟

انور سدید

ابھی ابھی اخبار ”امروز“ نے اطلاع دی ہے کہ (پ - پ - ۱) معروف افسانہ نویس ابو الفضل صدیقی ۶ ستمبر کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ انھیں دو ہفتے قبل دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ ایک مقامی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ وہ چھ کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے تین صد سے زیادہ افسانے لکھے جن پر انھیں ادبی ایوارڈ بھی ملے۔ انھیں پاپوش نگر کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی رسم سوگم جمعہ کو ہادی مارکیٹ ناظم آباد میں ہوگی۔“

خبر نمایاں طور پر چھپی ہے۔ بے حد مفصل اور بامعنی ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ ”کیا بڑا ادیب واقعی مر سکتا ہے اور کیا جمعہ کو رسم سوگم کے بعد ہم ابو الفضل صدیقی کو واقعی اس دنیا سے خارج اور اپنی یادوں سے حذف کر دیں گے؟ یہ سوچ کر میرے جسم میں ککپی کی لہریں دوڑ گئی ہیں اور میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ سچا ادیب کبھی مر نہیں سکتا۔ وہ اپنی تخلیقات میں اور اپنی کتابوں میں زندہ رہتا ہے اور ابو الفضل صدیقی تو بڑے ادیب ہی نہیں بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے ایک ادبی جلسہ انجمن ترقی اردو کراچی نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۷ء کو منعقد کیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، مختار زمان، شمیم احمد اور مشرف احمد نے ان کی شخصیت اور فن پر مضامین پڑھے تھے اور اس صداقت کی بازیافت کی تھی جس کا اظہار ابو الفضل صدیقی نے اپنے افسانوں میں کیا تھا اور جو ان کے باطن میں مشکِ نافذ کی طرح ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔ بلاشبہ یہ جلسہ غیر معمولی تھا اور ابو الفضل صدیقی کو ان کے شایان شان خراجِ تحسین ادا کیا گیا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ معمول کی ایک کارروائی تھی جس کی ابو الفضل صدیقی کے نزدیک شاید کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کی شان تو اس بے نیازی میں تھی جو ان کی فطرت کا حصہ تھا۔ ان کا وقار تو اس استغنا میں تھا جو وہ قائم نمود کے حربوں سے اجتناب کر کے ظاہر کرتے تھے۔ ان کی عظمت اس درویشی میں تھی جو عارف پور نوادہ کے چودھریوں کا فرزند ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی طویل عملی زندگی میں ظاہر کی۔ انھوں نے اپنا پیرہن کاغذ کے بے خوشبو پھولوں سے نہیں سجایا اور عظمت کا جعلی لباس زیب تن نہیں کیا۔ چنانچہ انہیں ملنے کے بعد کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ میں کسی بڑے ادیب سے یا کسی عظمت مآب سے مل کر آ رہا ہوں۔ بلکہ وہ ہمیشہ دوسروں کو عظمت کا احساس دلاتے اور انھیں ایک بڑے امتحان میں ڈال کر

رواپنے اپراکسار کی کلیم ڈال لیتے۔ اب جبکہ ان کا جسم خاکی اس دنیا میں موجود نہیں اور وہ پیوندِ خاک ہو چکے ہیں تو احساس و تباہی کہ ابوالفضل صدیقی حقیقی معنوں میں عظیم انسان بھی تھے اور عظیم ادیب بھی۔ اور ایسے ہی لوگوں کی رحلت سے بساطِ ادب ویران اور دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔

ابوالفضل صدیقی کی زندگی اور ان کی افسانہ نگاری پر نظر ڈالیں تو وہ ہر لحاظ سے ایک بامعنی، منفرد اور مثبت کردار کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ وہ ۱۹۰۸ء میں بدایوں کے جاگیردارانہ ماحول میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب یہام کے ممتاز شاعر غلام مصطفیٰ یک رنگ سے جاملتا ہے جو مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ اصغر علی صدیقی ضابطہ ن کے خاندان کے ایک اور شاعر تھے جن کا زمانہ ۱۸۷۲ء تا ۱۸۹۲ء ہے۔ ابوالفضل صدیقی کے والد چودھری ابوالحسن صدیقی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اور عدالت دیوانی میں وکالت کرتے تھے۔ شاعری کا ذوق انھیں بھی تھا اور وہ بصیرت منظر نگار تھے۔ انھوں نے ابوالفضل کو ابتدائی تعلیم سینٹ جارجز اسکول مسوری میں دلائی لیکن سینئر کیمبرج کے بعد علی گڑھ بھیج دئے گئے۔ لیکن وہاں دل نہ لگا اور وہ اپنی جاگیردارانہ پورنوادہ میں مقیم ہو گئے۔ انگریزی مدرسے اور علی گڑھ کے عارضی قیام نے انھیں روشن مزاجی عطا کی، حقیقت کو سائنسی انداز میں دیکھنے کا رویہ اور انسان دوستی سکھائی۔ دوسری طرف دیہات کے ماحول نے انھیں فطرت شناس بنایا۔ سیر و شکار کی عادت ڈالی۔ باغبانی اور کاشتکاری سے محبت بڑھانے کا سلیقہ سکھایا۔ ان کی شخصیت اور فن کے پس پشت بدایوں ایک ہم عصری دیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن روشن مزاجی اور زندہ دلی کے آثار سینٹ جارجز اسکول اور علی گڑھ نے پیدا کیے۔ وہ بے وقت قدیم بھی تھے اور جدید بھی۔ قدامت سے انھوں نے صحت مند روایات کے تسلسل کو قائم رکھنے کا سبق سیکھا اور جدیدیت سے انھوں نے ہر نئے تجربے اور خیال سے بامعنی انداز میں استفادہ کی کاوش کی اور ان عناصر سے ابوالفضل صدیقی کا جو کردار مرتب ہوا اس کی صفات انوکھی اور جاذبِ نظر تھیں، یہ کردار ان کے افسانوں کے عقب سے بھی جھانکتا ہے اور وہ اپنی شخصیت سے ہی نہیں اپنی تحریروں سے بھی الگ پہچانے جاتے ہیں۔ شکار ان کی شخصیت کا زاویہ ہے۔ کاشتکاری اور باغبانی ان کی تخلیق کے زاوئے ہیں اور افسانہ نگاری میں ان سب کا عکس موجود ہے اور دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کے آباء و اجداد میں شاعری کا ذوق موجود تھا لیکن انھوں نے پہلی محبت افسانے سے کی اور شاعری کی طرف زندگی بھر نہیں دیکھا۔

ان کی افسانہ نگاری کی ابتدا کی شہادت مختار زمن صاحب نے فراہم کی ہے اور لکھا ہے کہ ”سب افسانہ نگار افسانہ لکھنا شروع کرتے ہیں۔ ابوالفضل صدیقی نے افسانہ لکھنے سے شروعات کی۔ رات کا وقت ہے۔ سارا گھر سو رہا ہے۔ دس برس کا لڑکا ابوالفضل لحاف اوڑھے

لیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اپنے سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کی پردادی جسے وہ ”میا“ کہتے تھے آکر دکھتی ہیں۔ ”اے ہے! ابو الفضل یہ کس سے باتیں کر رہا ہے تو؟“

”میا! کسی سے نہیں۔ یہاں کون بیٹھا ہے؟“

واقعہ یہ تھا کہ صدیقی صاحب خود اپنے دل سے کہانیاں گھڑ کر اپنے کو سنایا کرتے تھے۔^۱ خود ان کا قول تھا کہ ”میرے لیے افسانہ ایک وہی اور پیدائشی چیز ہے۔“ لیکن ان کا پہلا مضمون افسانہ نہیں تھا بلکہ یہ ردِ عمل تھا ممبرانِ اسمبلی کے غیر سنجیدہ رویے کے خلاف جو انہوں نے طوائفیت کے پیشے کے زیرِ بحث بل پر اختیار کر رکھا تھا۔ ان کا یہ مضمون دیوان سنگھ مفتون نے اپنے رسالہ ”ریاست“ میں شائع کیا اور اس کی گونج دور دور تک سنی گئی۔ ابو الفضل صدیقی کا پہلا افسانہ مولانا صلاح الدین احمد کے ادارتی نوٹ کے ساتھ ۱۹۴۰ء میں رسالہ ”ادبی دنیا“ میں شائع ہوا۔ مولانا کے ابتدائی تعریفی اور تعارفی جملے اتنے موثر ثابت ہوئے کہ ابو الفضل صدیقی مستقل طور پر افسانہ کی وادی میں آگئے اور پھر اسی کو اپنے ادبی شخص کا وسیلہ بنایا۔

ابو الفضل نے اپنی زندگی میں کم و بیش تین سو افسانے لکھے اور ان میں سے بیشتر اعلیٰ درجے کے افسانے شمار ہوتے، ان کا آخری افسانہ ”نقوش“ میں شائع ہوا اور اس پر ”نقوش ایوارڈ“ دیا گیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”اہرام“ ۱۹۴۵ء میں اور ناول ”تعزیر“ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ وہ اپنے سانچہ ارتحال تک ”ادبی دنیا“ سے کبھی غیر حاضر شمار نہیں ہوئے۔ افسانے تو ان پر بارش کے قطروں کی طرح موسلا دھار برستے تھے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ابو الفضل صدیقی نے انہیں کتابی صورت دینے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گزشتہ سال کا یہ ادبی واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ مشفق خواجہ نے ان کے افسانوں کے تین مجموعے ”آئینہ“، ”انصاف“ اور ”جو الالکھ“ بیک وقت شائع کر دیے۔ میں نے ”آئینہ“ کا پہلا افسانہ پڑھنا شروع کیا جب کراچی سے رخصت ہونے کے بعد میں شالیمار ایکسپریس میں بیٹھ چکا تھا اور ”جو الالکھ“ کا آخری افسانہ پڑھ کر کتاب بند کی تو شالیمار لاہور میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے گھر پہنچتے ہی مشفق خواجہ کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اس دفعہ مجھے کراچی سے لاہور تک کا طویل سفر ابو الفضل صدیقی کی معیت میں کرنے کا موقعہ دیا۔ اس سفر کے دوران ابو الفضل صدیقی مجھے روہیل کھنڈ، بدایوں، کھڑانوادہ اور عارف پور نوادہ اور نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتے رہے۔ اور اپنے مشاہداتِ شیریں سے نوازتے اور سیراب کرتے رہے۔

مجھے احساس ہوا کہ ابو الفضل صدیقی بنیادی طور پر داستان نگار ہیں۔ وہ اگر داجہ علی شاہ کے عہد میں ہوتے

تو اس دور کے سب سے بڑے داستان سرا شمار ہوتے۔ ان کا ایک محبوب مشغلہ شکار تھا۔ چنانچہ ان کی زندگی نگاہ میں انسانی تہذیب کے تین ارتقائی زاویے یعنی جنگل، دیہات اور شہر آئے ہیں اور انھوں نے جنگلی ذی روح، دیہاتی آدمی اور شہری انسانیتوں کو موضوع بنا کر بے حد موثر افسانے لکھے ہیں۔ ان کے پیش نظر دیہات بھی تھا اور دیہات کی تہذیب بھی۔ ابو الفضل صدیقی نے ان دونوں پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کی اور اس تہذیب کو نمائندگی افسانوں کے ذریعے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اہمیت انسان کو دی ہے اور دیہات کو اس انسان کی فطرت اُجاگر کرنے کے لیے ہی استعمال کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں تعلقہ دار، کسان، جاگیردار، بٹے، جلاہتے، وید، حکیم اور متعدد دوسرے ٹائپ کردار صرف اپنی جھلک ہی نہیں دکھانے بلکہ اپنے مثالی کردار کی تمام جزئیات کی نقاب کشائی کر دیتے ہیں۔

ابو الفضل صدیقی نے دیہات کے ماحول کو تین قسم کے عناصر سے زندگی عطا کی ہے :

اول : وہ جاگیردار جو تعلقہ کا مالک اور تعلقے میں بسنے والے لوگوں کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ یہ بظاہر سخت گیر اور جابر ہے۔ لیکن یہ باطن نرم دل اور ہمدرد خلّاق ہے۔

دوم : وہ پالتو آدم زاد جو اس جاگیردار کے دسترخوان سے ریزے چھتے ہیں اور خدا سے زیادہ جاگیردار کا شکر بجالاتے ہیں۔ ان کی وفاداری اور خلوص پر کبھی کسی کو شک نہیں ہوا اور جاگیردار ان کی جاں نثاری کو اپنے تحفظ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

سوم : وہ کسان، مالی اور کاشتکار جو بظاہر کمزور اور بے آسرا ہیں لیکن جن کے اندر بغاوت کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے۔ ابو الفضل صدیقی نے دیہاتی زندگی کے ان تین زاویوں کو زندگی کے اعلیٰ شعور اور نفسیاتی پیچیدگی کی کامل آگاہی سے پیش کیا ہے۔ اوریوں خیر و شر، گناہ اور ثواب اور عدل و انصاف کی دائم صداقتوں کو اجاگر کیا ہے۔ تخلیقی اعتبار سے ابو الفضل صدیقی کی غزلی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنا مشاہدہ دیہات کے خارج تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے بعض ایسے واقعات بھی لکھے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے دیہات کے باطن میں اتر کر بالآخر اس جنگل کو دریافت کر لیا جو اپنے قوانین خود وضع کرتا ہے۔ خود ہی ان کا لقا ذکر کرتا ہے اور جس میں تعلقہ دار شیر ہے اور کسان معمولی بکری کی زندگی گزارتا ہے۔ ابو الفضل صدیقی کے دیہات میں عظمت بھی ہے اور میت بھی۔ یہ دلاویز بھی ہے اور پراسرار بھی۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں جاں کاہ جراحات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ زخموں پر مرہم کا پچھا بھی رکھ دیتے ہیں اور یہ مثبت عمل انہیں اپنے بہت سے معاصر افسانہ نگاروں سے ممتاز بنا دیتا ہے۔

مختار زمن نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کے افسانے بہت طویل، جزئیات بہ کثرت اور جملہ ہائے معترضہ بشمار ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو ابو الفضل صدیقی کی طوالت افسانے پر بوجھ سا بن جاتی ہے۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ابو الفضل صدیقی بنیادی طور پر داستان نگار تھے۔ ان کا مشاہدہ وسیع اور گہرا تھا۔ چنانچہ جب تک وہ اجمال کی پوری تفصیل کو سامنے نہ لے آتے انھیں چین حاصل نہ ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ افسانہ لکھتے لکھتے نہ صرف اس میں کھو جاتے بلکہ اس سے خود بھی مزا لینے لگتے اور ایک مضمون کو سورتنگ میں باندھ چکنے کے بعد بھی سیر نہ ہوتے۔ چنانچہ مختار زمن نے لکھا کہ

”افسانے کا اصل پلاٹ ایک پُر شور چوڑے پاٹ کے دریا کی طرح رواں رہتا ہے۔ لیکن اس میں سے چٹکلوں کی چھوٹی چھوٹی شاخیں اور ندی نالے بھی نکلتے رہتے ہیں۔ افسانے میں ایک دنیا بسی رہتی ہے۔“

مولانا صلاح الدین احمد نے نصف صدی پہلے لکھا تھا کہ

”دیہات کے موضوعات پر لکھے والوں میں پریم چند کے بعد ابو الفضل صدیقی دوسرے اہم لکھنے والے نئے افسانہ نگار ہیں لیکن ساتھ ساتھ نثر نگار کی حیثیت سے وہ پریم چند سے بہتر لکھنے والے ہیں اور ان کا جمالیاتی شعور انھیں ایک مختلف افسانہ نگار بنادیتا ہے۔ فی الحقیقت یہی ابو الفضل صدیقی کی انفرادیت اور یہی ان کا امتیاز ہے۔“

اور ہمارے عہد کے نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی نے حال ہی میں یہ رائے دی ہے کہ

”ابو الفضل نے ۱۹۳۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۹ء سے وہ مسلسل لکھ رہے ہیں، جب ان کا افسانہ ”سماج کا شکار“ ”ادبی دنیا“ لاہور میں شائع ہوا تو اس وقت دنیائے ادب میں دو رجحان نمایاں تھے۔ ایک رومانوی رجحان اور دوسرا حقیقت نگاری کا رجحان۔ رومانوی رجحان کے افسانوی ادب کے نمائندہ ستیا جید ریلدرم، ل۔ احمد، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتحپوری وغیرہ تھے اور حقیقت نگاری کے نمائندہ پریم چند تھے۔ ابو الفضل نے اپنے معاصرین علی عباس حسینی اور اعظم کرپوری کی طرح یہ دونوں اثرات قبول کیے ہیں لیکن ۱۹۳۶ء کی تحریک کے زیر اثر رومانوی اثر کم ہو گیا ہے اور سماجی شعور، طبقاتی تقسیم اور حقیقت نگاری کے اثرات غالب آگئے ہیں۔ ابو الفضل نے اس میں یہ اضافہ اور کیا کہ نثر کو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اس لیے وہ دوسرے افسانہ نگاروں سے پہلے بھی مختلف تھے اور آج بھی مختلف ہیں اور وہ اردو زبان کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔“

شیم احمد نے ان کے فن کے دائرہ اثر کی وسعت کی طرف اشارہ کیا اور لکھا ہے کہ

ان (ابوالفضل صدیقی) کی کہانیوں میں صرف اس معاشرے کی عکاسی ہی نہیں بلکہ اس پورے نظام کی ہرگزوری اور استحصال کے شعور کے ساتھ انسانی اقدار اور اجتماعی شعور کی طرف بڑھتے ہوئے عمل کو بھی پیش کرنا ان کا مقصد رہا ہے۔ انہوں نے برصغیر کی آبادی کی اکثریت کے معاشی ڈھانچے، زرعی نظام، زرعی نظام کے مظاہروں، زرعی نظام کے جانوروں، وسیلوں اور طبقاتی مطالعے کے ہر اس پہلو کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے جس کو ایک بھرپور زندگی کا مطالعہ کہا جاسکتا۔ اس مطالعہ میں صدیقی صاحب نے اپنی زندگی کے تقریباً ۵۵ سال لگا دیئے۔

یہ چند اقتباسات اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے فن کا اثبات ان کی تخلیقی زندگی کی ابتدا میں بھی کیا گیا تھا اور اس کا اعتراف مارچ ۱۹۸۷ء میں عوامی سطح پر ایک بڑے جلسہ عام میں بھی کیا گیا جب ان کی عمر ۸۰ برس کی ہو چکی تھی اور جب انہوں نے ایک مخصوص دھمک سننے کا اعلان بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔

”دھمک“ کا ذکر آیا ہے تو اس واقعے کی وضاحت ضروری ہے جسے ڈاکٹر جمیل جالبی اور مختار رزمن نے بیان کیا ہے اور جی کی شہادت میں ابن الحسن اور سلمیٰ رزمن شامل ہیں۔ میں یہ واقعہ یہاں مختار رزمن کی زبان میں پیش کرتا ہوں،

”یہ غالباً ۱۹۷۴ء کا قصہ ہے۔ ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے، ”دیکھو میاں! دھمک سن رہا ہوں۔ بس آیا ہی چاہتا ہے۔“ پوچھا، ”کون آیا چاہتا ہے؟“ بولے، ”موت کا فرشتہ اور کون؟“ میں نے کہا، ”بڑے بھائی! کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی تو آپ بہت دن جئیں گے!“ بولے، ”میاں! معلوم ہے؟ میرا زانچہ بنا رکھا ہے۔ بدایوں میں ایک پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ ۸۰ برس کا بڑھا برہمن۔ سفید چمک داڑھی۔ وہ ہمارے سب گھروالوں کے زانچے بنایا کرتا تھا اور اکثر باتیں صحیح نکلتی تھیں میری پیدائش کے وقت اس نے والد سے کہا، ”کیل صاحب! ذرا بچے کو جا کر دیکھو اس کے بائیں ہاتھ پر پدم (مسٹر) ہے یا نہیں۔ والد صاحب جھٹ زچہ خانے میں گئے۔ دیکھا تو پدم موجود تھا۔ دیکھو اب بھی ہے اس نے زانچہ بنا کر کہا، ”میں رائٹر بنوں گا اور ۶۶ سال بعد ۱۹۷۴ء میں فلاں تاریخ کو مر جاؤں گا۔“ میں نے کہا، ”چھوڑیے۔ آپ بھی کس دہم میں پڑ گئے۔“ بولے، ”میاں! اب تک اکثر باتیں صحیح نکلیں۔ یوں پل پر پل کے فرق سے غلطی ہو سکتی ہے۔“ مجھے خیال ہوا کہ کہیں ان پر کوئی نفسیاتی ردِ عمل نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اور جمیل جالبی صاحب نے مشورہ کیا کہ اس خاص تاریخ کو ۱۲ بجے رات تک ہم انہیں اپنے ساتھ رکھیں گے۔ جب تاریخ گزر جائے گی تب چھوڑیں گے۔“

اب کیا مضائقہ ہے کہ اس ”دھمک“ کی بقیہ کہانی ڈاکٹر جمیل جالبی کی زبان میں پیش کی جائے۔ جالبی صاحب لکھتے ہیں کہ ۳۱ مئی کی رات کو بارہ بجے ہم ان کے ہاں پہنچے اور کہا کہ ”ہم موت کے فرشتے کی تلاش میں آئے ہیں۔“ کیا وہ اچکا ہے یا آنے والا ہے؟ وہاں کے اور یہاں کے وقت میں تو کچھ فرق نہیں ہے؟ بہت

ہنسے۔ پھر ہمارے ساتھ گھر کے باہر سڑک پر ٹہلتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرکا بوجھ اُتر گیا ہے۔ اور

وہ اب ہلکے پھلکے ہو گئے ہیں۔“

پنڈت گوپی ناتھ کا زائچہ واقعی غلط تھا اور زندگی نے انھیں مزید بارہ برس دئے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو کہانیوں کا روپ دے سکیں اور زندگی اور معاشرے سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے افسانوں کی صورت میں زندگی اور معاشرے کو دکھایا۔ پس کر دیں۔ ابو الفضل صدیقی نے اس قرض کو ایک دیانت دار ادیب کی طرح ادا کیا اور اس عرصے میں اپنے فن کی ایک ایسی جہت بھی دریافت کی جس کی طرف کسی نقاد نے تاحال توجہ نہیں دی حالانکہ یہ ان کی افسانہ نگاری ہی کی طرح اہم ہے۔ میری مراد ابو الفضل صدیقی کی خاکہ نگاری سے ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد سے لے کر محمد طفیل تک اردو خاکہ نگاری نے متعدد مدارج طے کیے ہیں۔ ابتدا میں یہ فن شخصیت کا مرقع تیار کرنے کا فن شمار ہوتا تھا۔ فرحت اللہ بیگ اور عصمت چغتائی نے اس میں شخصیت کے منفی پہلوؤں کو اس محبت سے پیش کرنے کی کاوش کی کہ شخصیت خامیوں کے باوجود پیاری محسوس ہونے لگی۔ مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کی شخصیت نامے ایک دفعہ پھر اس فن کو مرقع نگاری کے مدار میں لے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدوح تہذیبی زاویوں سے دریافت کرنے اور اسے رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکانے کی روش عام ہو گئی۔ غلطی کے خاکے اس رجحان سے بغاوت اور انحراف کی مثالیں ہیں۔ انھوں نے حقیقت کو اس جراثیم سے پیش کیا جس جراثیم کو انھوں نے شخصیت سے دم ملاقات محسوس کیا تھا۔ چنانچہ اب خاکہ نگاری سے عنود و درگزر کا زاویہ معدوم ہو گیا اور خاکہ نگار نے شخصیت پر غالب آنے کی کوشش شروع کر دی۔ محمد طفیل نے خاکہ نگاری میں چاول پر ”قل ہو اللہ“ لکھنے کا عمل اختیار کیا اور جراثیم آمیز حقیقت کو چھپانے کے بجائے اسے زیر سطح اور بین السطور رکھنے کی کاوش کی اور دوہرا ذائقہ پیدا کیا۔ ان کے خاکے سے مدوح ناراض نہیں ہوتا لیکن قاری شخصیت کے بعض معکوس زاویوں سے بھی روشناس ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ وہ ایسی کفایت لفظی سے کرتے ہیں کہ ”صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں“ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ابو الفضل صدیقی کی خاکہ نگاری میں اجمال کو تفصیل سے پیش کرنے کی روش نمایاں ہے۔ وہ شخصیت کو دریافت نہیں کرتے۔ اس کے گرد و پیش کی بازیافت بھی کرتے ہیں۔ اور اس عمل میں شخصیت کا خاندان، بیوی بچے اور آبا و اجداد ہی زیر بحث نہیں آتے بلکہ شخصیت کے دوست، ان کے اہل خانہ، عہدہ دار اور محلے کے دکاندار بھی ان کے خاکے کے مدار میں بے محابا داخل ہو جاتے ہیں اور یہ ابو الفضل صدیقی کی تہذیبی شخصیت کا وصف تھا کہ جو شخص بھی ان کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھاتا وہ اسے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے پلائے بغیر جانے نہیں دیتے تھے اور ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ جس سے ایک دفعہ ہاتھ ملاتے اس سے ملاقات کی تمام جزئیات کو ذہن میں محفوظ رکھتے اور دم ضرورت ان جزئیات کو خاکے میں مناسب مقام پر جگہ دے دیتے۔ چنانچہ ان کا خاکہ محض خاکہ نہیں ہوتا یہ شخصیت کی پوری تاریخ ہوتا ہے۔ اور ہم ایک خاکے میں بیک وقت کئی شخصیات کے ظاہر اور باطن سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد، سید سجاد ظہیر،

مہربان جالبی اور ضیا جاندہری پر ان کے مضامین اس نوعیت کے ہیں کہ انھیں خاکے کہنے کے بجائے ان شخصیات جہد نامے قرار دینا چاہیے۔ ابو الفضل صدیقی کے اس عمل میں بھی ان کی داستان سرائی کا فن اپنا جادو جگاتا ہے۔ نصیت کو داستان کا کردار تصور کرتے ہیں اور پھر اپنی معلومات کو اس طریقے سے پیش کرتے ہیں کہ شخصیت کے تھ اس کا عہد اور گرد و پیش بھی روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری کا یہ انداز ہمیں شاہراہ احمد دہلوی کے ہاں بھی نظر ہے لیکن اس انداز کو عروج فن یقیناً ابو الفضل صدیقی نے عطا کیا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے شخصیت کو ادب کی ستان کا ہیرو بنا دیتے تھے اور خاکے کو سوانحی داستان!

میں نے اس مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے کہ ابو الفضل صدیقی میں ایک انوکھے کردار کی خوبیاں موجود تھیں۔ وہ دنیا سے مختلف قسم کے انسان نظر آتے تھے اور وضع قطع سے ہی نہیں عادات و اوصاف کے اعتبار سے بھی ان کا زہد گانا تھا۔ میں ان کا خاصا پرانا قاری اور شیدائی تھا۔ لیکن ان سے پہلی ملاقات چند سال قبل اہل قلم کانفرنس ہوئی اور اپنا تعارف نام لے کر کرایا تو حیران رہ گیا کہ وہ میرے نام ہی سے نہیں کام سے بھی واقف تھے اور میں یہ بھی یاد تھا کہ میں نے ”اردو زبان“ کے کسی ابتدائی پرچے میں لکھا تھا کہ اسلامیہ کالج لاہور میں ضیا ندھری میرے انگریزی کے استاد تھے۔ اس کانفرنس میں انتظامیہ نے ایوبوں کے قیام اور طعام کا بہت اعلیٰ لام کیا تھا۔ ایک پانچ ستارہ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانے کی میز سجی تھی۔ پاکستان کے عظیم ادبا انواع و اقسام کے نوں سے یوں نبرد آزما تھے جیسے پانی پت کے میدان میں مغل لودھیوں کے ساتھ نبرد آزما ہوتے تھے۔ ہر ادیب اس کھانے کو اپنی زندگی کا آخری کھانا سمجھ کر بھٹ رہا تھا اور پلیٹ پر پہلے کھانے کا قطب مینار کھڑا کرتا۔ اس مینار کو پیٹ میں اتارتا اور پھر دوبارہ میز پر بھٹ پڑتا۔ ابو الفضل صدیقی، جو ہم کی اس نفسا نفسی کو ایک طرف سے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک خالی پلیٹ تھی۔ بہت دیر تک یہ پلیٹ خالی ہی رہی اور انھیں زکی طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی تا آنکہ ادبائے کرام نے پسپائی اختیار کی اور کھانے سے بھری ہوئی میز پر کا منہ چڑھنے لگیں۔ تب ابو الفضل صدیقی صاحب نے پلیٹ میں تھوڑا سا سلاڈ ڈالا۔ کچھ دہی لیا۔ پلیٹ کے کونے میں تھوڑا سا سالن انڈیلا اور نان کا آدھا ٹکڑا لے کر ایک طرف ہو گئے۔ ایک نوجوان ادیب نے

یافت کیا،

”صدیقی صاحب! بس اتنا سا کھانا؟“

وہ بڑے اطمینان سے بولے:

”میاں! زندہ رہنے کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے۔“

رکھنے لگے کہ،

”انسان کا ظرف کھانے کی میز پر سامنے آتا ہے۔ بیشتر لوگ صرف کھانے کے لیے زندہ ہیں، وہ زندہ رہتے

سچ بات تو یہ ہے کہ میں کیا اور میرا کام کیا! انور سدید

کے لیے نہیں کھاتے۔“

اچھا کھانا ابو الفضل صدیقی کا ذوق تھا۔ وہ بہت خوش خوراک بھی تھے۔ اچھے کھانے سے ان کا عشق بہت گڑھا تھا لیکن کھانے کی میز پر جب طرزِ تپاک اہل دنیا دیکھتے تو بس مسکرا کر رہ جاتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا کھانا عام ڈگر سے ہٹا لیا تھا۔ فجر کے وقت ایک پیالی چائے کے ساتھ دو توس لینے۔ گیارہ بجے چپاتی سالن کے ساتھ کھاتے۔ اور شام کا کھانا چار بجے کھا لیتے تھے۔ آخری دنوں میں کچے پیٹے کو بطور سبزی استعمال کرنے لگے تھے۔ ذیابیطس نے یلغار کر دی تو مبین کی روٹی کھانے لگے۔ ذیابیطس کی شکایت رفع ہو گئی تو مختار زمن نے ایک جملے میں اس واقعے کو یوں سمیٹا:

”اُن کے بے پناہ زمیندارانہ ڈنڈے کے آگے شکر کی ذریات نہیں ٹھہر سکیں۔“

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ”طرح مصرع“ کے طور پر لکھا ہے کہ ان کے پاس ۱۲۲ قلم ہیں جن کے وہ بلا شرکتِ غیر سے مالک ہیں۔ ”اس طرح“ پر ان کے ایک ہم جلیس نے مرصع غزل لکھ دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

”لکھتے وقت ان کے پاس نکلڑی کا ایک بڑا صندوقچہ رکھا رہتا ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ”بڑے بھائی! کسی نہ کسی دن مجھے آپ کا صندوقچہ چرانا ہے“ اپنے خاص انداز میں مسکرا کر کہتے ہیں، ”میاں! صندوقچے کے پاس میرا پستول بھی رکھا رہتا ہے۔ وہ دیکھا ہے؟“

”آپ کو معلوم ہے اس صندوقچے میں کیا ہے؟ اس میں تقریباً پونے تین سو فاؤنٹین پن رکھے ہیں۔“ صاحبِ قلم تو کیا وسیع قلم و کے کسی حکمران کے پاس بھی شاید اتنے قلم نہ ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ جب سے فاؤنٹین پن ایجاد ہوئے ہیں صدیقی صاحب نے انھیں خرید کر جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ پارکر، بلیک برڈ، مونٹ بلانک، شیفر، ہرماڈل، ہر رنگ اور ہر سائز کے قلم اس صندوقچے میں بھرے ہوئے ہیں۔ بعض لیٹل کی انگلیوں کی مخروطی اور نازک۔ بعض سہارن پوری پونڈے (گتے) کی طرح بانس کے بانس۔ صدیقی صاحب باری باری سب سے لکھتے ہیں۔ ہمیشہ بڑھیا کا غذا استعمال کرتے ہیں۔ خط اتنا خوب صورت جیسے کاغذ پر موتی رول رہے ہوں۔ لیکن انداز تحریر کچھ اس قسم کا ہے کہ اس خط کا پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے سُتے موتیوں کا حاصل کرنا۔ یہ معمولی کاتب کے بس کا کام نہیں۔ ان کے خاص کاتب ہیں:

مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی پر انھوں نے معرکہ آراء سوانحی خاکہ لکھ کر ڈاکٹر وزیر آغا کو بھیج دیا تو ”اوراق“ کے کاتب تمکین شیرازی ہزار کوشش کے باوجود اسے پڑھ نہ سکے اور یہ کراچی کے اس خاص کاتب سے لکھوانا پڑا جو ان کا سوا و خط پڑھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ان کا خط بے حد پختہ تھا۔ لیکن کچھ گانے کی طرح اس خط کے ساتھ لمبے ریاض کے بعد ہی موانست پیدا ہوتی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ ”ابھی تک ابو الفضل صدیقی کی صرف

دس فیصد تحریریں کتابی صورت میں شائع ہوتی ہیں۔ ان کی تحریروں کے غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صدیقی صاحب خط شکستہ میں لکھتے تھے اور ان کا مسودہ نئی نسل کے بے علم کاتب عام طور پر پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی لیے ان کی اشاعت میران کرام کے لیے ایک لایخل مسئلہ بن کر رہ گئی۔“

ابوالفضل صدیقی کے کردار کی ایک اور خوبی ان کی بذلہ گوئی اور بذلہ سنجی تھی۔ ان کا جملہ بظاہر سادہ اور بے رنگ ہوتا لیکن اس کے پس منظر میں خود کوئی واقعہ ہوتا اور اس واقعے سے ہی جملہ نہ صرف جگمگا اٹھتا بلکہ اس سے بشاشت مزاح بھی پھوٹ نکلتی اور ان جملوں سے ان کی زندگی بھر کا تجربہ بھی ضرب المثل کی طرح عکس فگن ہو جاتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ

”ایک دن کہنے لگے ”میاں! دیکھو مرغادو طرح سے اذان دیتا ہے۔ عام مرغنا کہتا ہے: ”داتا گاؤں، داتا گاؤں“ لیکن بعض مرغے منحوس ہوتے ہیں اور جب اذان دیتے ہیں تو کہتے ہیں ”چوٹا گاؤں، چوٹا گاؤں“ جو مرغنا ”چوٹا گاؤں“ کی بانگ لگاتا ہے تو اس کے مالک سے نہ صرف مرغالے لکھ جاتے بلکہ چاول، گھی اور تھو یا بھی لیا جاتا ہے تاکہ وہ باؤں کے تدارک کے لیے اس منحوس مرغے سے نجات حاصل کر لی جائے۔ اور میاں دیکھو! عام طور پر کسان کا مرغنا ”چوٹا گاؤں“ کی بانگ لگاتا ہے اور زمیندار کا مرغنا ”داتا گاؤں“ کی!“

ان کا یہ جملہ ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ:

”میاں! گھوڑا اور بھوڑا ہاتھ پھیرنے سے بڑھتا ہے!“
لوگوں کو کرکٹ کی کمینٹری سننے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے گرد بیٹھا دیکھتے تو بے اختیار کہتے:
”شکاری شکار کھیلیں اور اٹھتی پیچھے پیچھے پھریں۔“

مختار زمین کو بتا رہے تھے کہ ”وہ علی گڑھ بھیج دے گئے تو وہاں ان کا دل نہ لگا۔“ زمین صاحب کو شرارت سوجھی اور بقول شخصے انہوں نے ان کی خدمت میں گستاخ ہو کر پوچھا: ”پھر دل کہاں لگا؟“
بولے: ”بس صفدری اور جعفری سے!“

زمین نے کہا: ”بہت خوب، چٹری اور دو دو! یہ محترمائیں آپ کو کہاں مل گئیں؟“
ابوالفضل بولے: ”میاں! دو بندوقیں تھیں، بارہ بورکی۔ بڑی اچھی مار تھی ان کی۔ میرے ہاتھ پر چپڑھی ہوئی تھیں!“

آموں سے ابوالفضل صدیقی کی محبت کے قہقہے مشہور ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ ”ہمارے گھر کی کوٹھڑی میں آم بھرے رہتے تھے۔ میں صبح سے اُٹھ کر کھانا شروع کر دیتا تھا۔ دن بھر کھاتا۔ رات کو چار پانی کے پاس دونوں طرف آموں سے بھری ہوئی بالٹیاں رکھ لیتا اور اکثر آم کا رس کھری چادر پانی پر اور بدن پر مل لیتا تاکہ آموں کی خوشبو بوسی رہے۔“

مختار زمن نے ایک دفعہ اپنے گھر میں آم کے دو تین پودے لگائے تو صدیقی صاحب بہت خوش ہوئے۔ پودوں کو دیکھا۔ ہر پودے کے پتے کو توڑا، مسلا اور سونگھا۔ پھر ایک پودے کے متعلق بولے:

”آمن ہے!“

زمن حیران ہوئے کہ یہ ”آمن“ کیا ہوتا ہے؟ پوچھا: ”بڑے بھائی! کیا فرمایا؟“

ابو الفضل بولے: ”یہ آمن ہے یعنی مالدین ہے!“

زمن صاحب نے کہا: ”بڑے بھائی! کمال ہے آپ آموں میں بھی جنس لے آئے۔“ نہایت سنجیدگی سے بولے:

”لیس فیملی ہے۔ سمجھا کرو۔ ننگڑا، فحری، سفیدہ، چونسا، گلاب خاص وغیرہ آم ہیں۔ دسہری، انگوری، عروکس آمن ہیں۔“

زمن صاحب نے پوچھا: ”آخر فرق کیا ہے؟“

بولے: ”دیکھو آم میں کیفیت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن آمن کی خوشبو اور رس زیادہ لطیف ہوتا ہے۔“

زمن صاحب نے خوش ہو کر نعرہ لگایا: ”جنس لطیف زندہ باد!“

ابو الفضل صدیقی شکار کے بہت رسیا تھے۔ رات رات بھر جا گئے اور شکار کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیندان سے بیزار ہو گئی۔ نیند سے تعلقات کی کشیدگی کو دور کرنے کے لیے ان کے گھر میں تین بستر لگتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اول شب باہر لیٹتے تھے، نصف شب کے قریب برآمدے کے بستر پر استراحت کرتے اور آخر شب کمرے میں آ لیٹتے۔ ۱۵ اور ۱۶ ستمبر ۶۸ء کی درمیانی شب کو بھی ان کے گھر میں تین بستر آراستہ کیے گئے تھے۔ لیکن اس روز وہ مرض قلب کی وجہ سے ہسپتال کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور پھر لوں ہوا کہ نیند انہیں خود مانے آ گئی۔ صبح بھر کے کشیدہ تعلقات درست ہو گئے۔ ابو الفضل صدیقی نے نیند کی زلفیں اپنے شانوں پر بکھیر لیں اور وہ سو گئے اور ابھی تک جاگے نہیں۔ اخبار ”امروز“ نے کتنی غلط خبر دی ہے کہ ”ابو الفضل صدیقی انتقال کر گئے ہیں۔“

صادقین ، خورشید نشاں شخص

رشید نثار

صادقین پاکستان کی نہدی پہچان اور ثقافتی دبستان تھا۔ اُس کے فن کی عظمت اتنی بلند تھی کہ بعض اوقات نگاہیں اس کا طواف کرنے سے بھی قاصر ہو جاتی تھیں۔ کیونکہ اس کی رفعت تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

صادقین ہومو سوسائٹس اور زندگی کے بہت سے سپر رکھتا تھا مگر اُس نے پاکستانی ثقافت کو اتنا فروغ دے دیا تھا کہ اس کا نام پاکستانی فیشن کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ تصویر، تحریر اور شاعری ایک مثلث بنا کر اُس کی زندگی کے بہت سے زاویے تراشتی تھی۔ مثلاً اس کی تصویر، مصوری کا ایک الگ دبستان بناتی ہے۔ جب کہ تحریر ایک مخصوص خط کی شناخت بنتی ہے جس طرح خط کوئی، خط مثلث اور نستعلیق وغیرہ الگ الگ زاویوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ بعینہ صادقین اپنے منفرد خط کی بنا پر دبستان خطاطی میں اہم تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لہذا خط صادقین "عظیم خطاطی کے دبستان میں روحانی سکون اور اطمینان کے اعتبار سے ایک واضح تصور رکھتا ہے اور اب اس کا شمار بیسویں صدی کے نامور خطاطوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ تقابلی اور اہمیت کی دوڑ میں صادقین کا اپنے آپ کو عظیم خطاط کی حیثیت میں منوالینا نہ صرف پاکستانی ثقافت کا ایک رفیع باب ہے بلکہ اس کی عظمت کا ایک اہم پہلو بھی کہ وہ ادب کے راستے مصوری تک پہنچا اور مصوری نے اُسے خطاطی کی منزل تک پہنچا دیا۔ اس کا یہ سفر و شوار بھی تھا کبھی اور جاہل بھی، مگر اس سفر میں اُس نے شخصی سطح پر روحانی ارتقاع حاصل کیا اور پرسکون موت مرکز پاکستانی ثقافت کو ایک ہیجان میں مبتلا کر گیا۔ اس طرح صادقین کی موت کے سکون کے برعکس پاکستانی عوام کا ہیجان بڑے اچھوتے رد عمل کا اظہار ہے۔ جسے محسوس کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ صادقین پاکستان تھا اور پاکستان صادقین کے بغیر نامکمل ہے۔ لہذا صادقین پاکستانی تناظر میں ہمیشہ موجود رہے گا۔

صادقین کے روحانی ارتقاع کا ایک الگ معاملہ ہے۔ اُس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارا اپنا معاشرہ روحانی افلاس کا شکار ہے۔ لہذا روحانی مفلسی ایک بلند روحانی انسان سے قدرتی طور پر فیض یاب ہونا چاہتی ہے کہ آج صداقت، امن اور انصاف کے معانی سے نااہل لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے لیے کسی عظیم بزرگ شخصیت کی شفقت میں پناہ لینا چاہتے ہیں مگر کیا صادقین کی ذات میں کوئی پناہ گاہ تھی۔ کیا وہ زرخیز معاشرے کو پناہ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا؟ میرے خیال میں صادقین کا روحانی سکون اور شعری اطمینان صداقت اور نا آشنا معاشرے کو ایک پیغام ضرور دیتا تھا کہ "جنگ کے خلاف امن کا پیغام، انسان دوستی اور روحانی روشنی میں مصغر ہے۔ اس کے باوصف صادقین مصور اور خطاط کی حیثیت سے زبردست معاشرے کے ڈرائنگ روموں کی زینت تھا، جہاں قرآنی آیات کی خطاطی ایک فیشن کا درجہ رکھتی تھی کسی روحانی کیف کا نہیں۔

صا دقین نے بہت سی تصاویر کو تجریدی انداز میں عظمت و نور کے تقابل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مگر آرٹ کے دسیاؤں نے اُس کے منظر نظریے کو کبھی پرکھا نہیں اور نہ ہی اُس کے بارے میں سوچا ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنے گھر کی دیواروں کو اس کی تصاویر اور خطاطی سے سجایا تاکہ کمرہ رنگوں کے امتزاج اور روحانی تقدس سے جگمگاتا رہے۔ چنانچہ پاکستان میں صا دقین کی تدریجیت کا عام اندازہ یہی تھا۔ اور اس کی پذیرائی بھی اسی سطح پر رہی تھی۔ جب کہ پاکستان سے باہر اس کی پرستش ہوتی تھی اور یہ پرستش پاکستانی عظمت میں اضافے کا باعث بنتی تھی، بلکہ پاکستانی ثقافت کی فنی بلندی کا ایک اعتراف بھی بلند سطح پر ہوتا تھا۔ اب صا دقین ہمارے درمیان نہیں رہا تو پاکستانی عوام کو بھی اس کی عظمت کا احساس ہوا ہے۔ شاید ہمارے درمیان وہ کر اُس کے قرب نے اس کی عظمت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اور شاید لمحہ فراق نے پاکستانی ذہنوں کو اُس کے نظریے سے ہم آہنگ کر دیا ہے اور اب بھی اُس کی عظمت اور بلندی کی دلیل ہے۔ صا دقین مزاج اور فن کے اعتبار سے اس دنیا کا انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس کے لباس اور ہیبت کدائی سے بنا جتا تھا کہ اُس کی روح کسی آسمان سے اتر کر آئی ہے یا وہ میدہ کا جگمگ ہے جس کے سر دیک ”صد اقت“ فن سے الگ نہیں ہے اور نہ ہی اُسے اس دنیا کے فانی بیاباؤں سے ناپا جاسکتا ہے۔ وہ تو از خود ایک ذمہ، متحرک اور مجتہد فن تھا، بالکل سنان، خاموش اور گہرا۔ لہذا ایسے محسوس کی پرستش ہی کی جاسکتی ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن دونوں ایک فنکار اور اسی اکائی نے اُسے محبت کا اسم اور روح کا پُر سکون جسم بنا دیا تھا۔

پاکستان صنعتی انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اس تناظر میں سکون و اطمینان کے پیمانے بھی بتدریج تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس لیے اب سکون کا باعث اخلاق نہیں ہوگا اور اطمینان کی مبنی در روحانی ارتقاء نہ ہو سکے گی۔ لہذا صا دقین کی پذیرائی اگر ہوگی تو محض محبت و آرٹ کی بنیاد پر۔ اس کے باوصف آرٹ کے شدید امجد آرٹ کو صنعتی تہذیب کے تناظر میں نہ دیکھ سکیں گے۔ بلکہ ان کے نزدیک عیسیٰ کی مظلومیت، مذہبی دکھی آتما اور حسین کی مجروح اتنا سب مل کر صا دقین کی اہمیت بڑھاتے رہیں گے اور یہی انداز اُس کے فن کی اساس بنتی رہی گی۔

صا دقین کے پاس اطمینان اور سکون کی جو دولت تھی وہ اُس نے فن کے ذریعے پیدا کی تھی اور اس کا فن آفاقی ہونے کے ناطے مذہبی اور روحانی تناظر بھی رکھتا تھا۔ جس طرح عیسوی دینیات کے مبلغ، نقاش اور مصور آفاقی سطحوں پر سچا نے جاتے ہیں، صا دقین بھی اسی حوالے سے آفاقی سطح پر سچا نا جائے گا۔ صا دقین نے اپنے فن کے لیے ”کرن“، ”کبیر“ اور ”تیکے“ کو ممبر اور انداز میں برتا ہے۔ اُس کا نظریہ تھا کہ ”عظمت کی روحانی کو کچھ نور چاہیے تاکہ سفیدی باہر آئے“ اس طرح ”کرن“ کو مجسم کرنے کے لیے اُس نے کبھی سنگ مرمر کا انتخاب کیا ہے اور عظمت کے تناظر کے لیے کالا چمڑہ اُس کے فن کی آماجگاہ بنا ہے۔ یاد ہے کالا چمڑہ چغٹائی کے فن کا بھی حصہ تھا۔ مگر صا دقین نے صرف چند اشیا پر اکتفا نہیں کیا۔ اُس نے پتے، پتھر، کاغذ، کپڑے، جتے، کٹڑی، شبیہ، کمینوس، لوسہ اور اینٹوں کو بھی فن کی آماجگاہ بنائے رکھا جن پر اُس کے فن کے سفر کی داستان کھنی ہوئی ہے لہذا اتنا بڑا مقصور اس صدی پر دھرتی نے پیدا نہیں کیا ہے۔

صا دقین بیسویں صدی کا چہرہ گو شاعر اور مقصور ہے۔ اس نے شاعری کو مقصوری کا قلم دیا اور مقصوری کو شاعری کی زبان دی ہے۔

چنانچہ اُس کے اشعار بھی کسی ایک تصویر پر منتج ہوتے ہیں۔ اور تصویر کے اندر شاعرانہ امتزاج بڑی خوبصورتی سے جھلکتا رہتا ہے۔ بلکہ بظاہر فطرت کو اُس نے خطاطی کے پس منظر کے طور پر رہتا اور ان مظاہر کو فطرت کی زبان بخش دی تو شاعرانہ مصوری اور خطاطی کا یہ نیا اسلوب ہے۔ جسے پاکستانی اسلوب کہا جائے تو درست ہوگا۔ صادقین نے اپنی مصوری میں اُس انسان سے ابتداء کی ہے جس نے روشنی کو پہل بار دیکھا تھا۔ اس ابتدائی انسان کو روشنی نے حیرتوں کے لامتناہی سلسلے بخش دیئے تھے۔ یہی سے آغاز کرتے ہوئے وہ خطاطی کی تہذیبی منزل تک آتا ہے۔ چنانچہ اُس کی مصوری، شاعرانہ خیال کے ساتھ ساتھ اپنے دامن میں ایک کہانی بھی رکھتی ہے اور یہ عنصر اُس کا تیسرا پہلو بنتا ہے۔ جب کہ اُس کے بیشتر معاصرین اور بزرگ پیشروں کی اکہری اور دوہری سطحیں رکھتے ہیں، لیکن صادقین صرف دو سطحوں پر خود کو قائم بالذات نہیں بناتا، بلکہ شش جہات کو وہ اپنی ذات اور کائنات کا متعلق موضوع بنا دیتا ہے اور اتنی سطحیں شاید آج کسی دوسرے مصور اور خطاط کے پاس موجود نہیں ہیں۔ البتہ انیسویں صدی کے بہت سے مصور تین سے زیادہ جہتیں رکھتے تھے۔ انھوں نے تصویر کے لیے موضوع اور موضوع کے لیے نظریے کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس اعتبار سے صادقین موضوع کے تناظر میں انیسویں صدی کے ”مصورین“ کا ہم سفر، لیکن شاعری اور خطاطی میں ایک سے زیادہ عناصر کے امتزاج کی بنا پر صادقین میری صدی کے تقریباً تمام مصوروں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ صادقین نے مصوری میں بنیادناز اور رسم و روایات کی پابندی کے خلاف بہت بڑا جہاد کیا ہے۔ اُس نے تصویر کو تجرید سے چھٹکارا دلایا، خیال کو مصور کیا اور تجریدی صورت میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر کے علامتی اظہار کو اپناتے ہوئے اپنا الگ دبستان قائم کر دیا ہے، چنانچہ یہ دبستان تصویر کے پس منظر میں داستان، موضوع اور نظریے کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس طرح صادقین کو ایک الگ دبستان کے بانی کی حیثیت سے پچاسو، سیزان، مانیس اور رواو کے تقابلی مطالعے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب مصور فرانسسی دبستان کے شاہیر ہیں۔ اس پر صادقین کی اپنی پھاپ دکھائی دیتی ہے خطاطی کے جس عہد میں صادقین نے ابتداء کی ہے اس وقت خارجی عنصر کو نمایاں حیثیت دینے والے فن کے خالص شاہیر بہت سے تجربات کر رہے تھے۔ ان میں مولانا حافظ یوسف صدیقی (مرحوم) رشید بٹ، آذر زوی، عبدالمجید دہلوی، موجد، اسلم کمال قابل ذکر ہیں۔ مگر بہتات تصویر کے انداز میں کہنا اور خارجی عنصر کی بجائے تصویر کو داخلی کیفیت دے کر زنجوں کو نفسیات بخشنا یہ صرف صادقین ہی کا کمال ہے (صادیقین کے اس وصف کو پاکستان سے باہر غیر محاکم میں پاکستانی اسلوب کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے) اپنے اس کمال کا صادقین کو بھی احساس تھا۔ اس لیے اُس نے فن کی تفہیم کے لیے الوان و خطوط کا ایک الگ اسلوب تراشا جس سے صادقین کے کیفیت و جذب کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔

صادیقین کے لیے مذہب ایک زمانے میں ثانوی حیثیت رکھتا تھا اور انسانِ دانا کے برعکس وحشی، نیم برہنہ اور جنگلی

سے ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ حسین کے سوا مذہب میں شعری روایت کے طور پر کسی دوسرے کو (باقی حاشیہ لگے صفحہ پر دیکھیں)

انسان بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ انسان کو یقینی کی حالت میں دیکھنے کی خواہش صادقین کے ہاں بڑی شدت سے پائی جاتی ہے۔ اور اسی تناظر میں وہ اپنے فن کے ایوان میں کسی آلائش کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ آلائشیں عین ملکی نظریات کی ہو سکتی تھیں، نیز اس اسلوب کو جس کا تصویری اظہار اپنے ملکی نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ صادقین نے خاص پاکستانی اسلوب کو ایک جذبہ دے دیا اور پیغام بھی، جس میں پاکستانی ذہن کے لیے ایک نئی وسعت تھی۔ اُس کا نظریہ فن کچھ یوں تھا:-

- و فن اپنی نظر میں محض معلق شے نہیں ہے۔
- و زندگی اور معاشرے سے فن اس طرح پھوٹتا ہے جس طرح زمین سے درخت۔
- و انسانیت کی اُمت، حوصلے کا ادراک، امتیازِ حق و باطل کی اہلیت۔
- و نیک و بد میں تفریق کرنے کی صلاحیت، یہ سارے عناصر ایک فن کار کے دل و دماغ کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں صادقین کے نظریے سے پیشتر مذہبی اندازِ نظر موجود نہیں تھا۔ بلکہ تجرید، علامت اور صنفِ یاتی انداز کی معنوی فروغ یا رہی تھی اور رنگوں میں زرد، نارنجی اور سلیٹی رنگ سب رنگوں پر حکومت کر رہے تھے لیکن صادقین نے معنوی میں سیاہ رنگ کو مذہبی تناظر میں بڑی اہمیت دی اور سبز رنگ کو روحانی ارتقاع کی علامت کے طور پر برتنا جس سے غیر شعوری طور پر پاکستانی تحریک کی طرف سفر کا آغاز ہوا۔ چنانچہ یہ امر کہ پاکستان ایک روحانی ارتقاع کی تخلیق ہے کہی انشؤ اور کسی بڑے فن کار کے لیے باعثِ نزاع نہیں ہے اور اس چھوٹے سے تصور سے پاکستانی عوام صوفی اور مذہبی انسان بخوبی واقف ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب بھی روحانیت سے الگ کسی نظریاتی تناظر میں ادب اور معاشرت کو ہم آہنگ کیا گیا ہے تو وہ فطری انجام سے پیشتر ہی ناکام ہو گیا لیکن جب بھی روحانی ارتقاع کو فن کے ذریعے پیش کیا گیا، اُسے نئے رجحان کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ اور اب صادقین کو روحانی ارتقاع کے حوالے سے سچا ناچار رہا ہے، تو موجودہ صدی اس کی اپنی روحانی صدا ہے۔ اُس نے روحانی خلا کو پورا کرنے کے لیے جن رنگوں کو مستحکم کیا ہے۔ اُن میں خصوصی طور پر کچھ رنگ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس رنگ میں روح کا تعلق دل سے بنتا ہے، لہذا صادقین نے روح اور دل کو معنوی، خطاطی اور شاعری کا حاکم بنایا ہے۔ صادقین نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ اُس نے فن کی دیوی سے شادی رچالی تھی۔ اس لیے اس کا سارا وقت عروسِ فن کو سنوارنے اور بنانے میں صرف ہوتا رہا۔ اُس کے فنی ارتقا کی داستان بہت طویل ہے مگر اس ارتقا میں اس کی تنہائی نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ اُس کے فن پاروں میں جہاں کہیں خلا موجود ہے اس کی مینا دیھی وہی ازلی تنہائی ہے جس نے اُسے فن کی دیوی پر قربان کر دیا تھا۔ اگر صادقین تنہا نہ ہوتا تو اُس کے ہاں امید کی کرن کا نور نہ چھوٹتا بلکہ مایوسی، ابہام و شک سب

البتہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا لیکن خطاطی تک آتے آتے اس نے ایک مدہش قلندر بن کر بڑی طویل ریاست کی ہے۔ (ر۔ن)

مل کر اُسے گھیر لیتے اور وہ تنہائی کی گٹھیا میں بیٹھا سسکیاں لیتا رہتا۔ لیکن اُس کی تنہائی ہی اُس کی اپنی کائنات تھی۔ اُس نے اس کائنات کو فن پاروں سے سجا دیا تھا۔ بلکہ اُس کی زندگی کے کرب نے تنہائی کو ایک سخن بخش دیا تھا۔ لہذا تنہائی، سخن اور وجود اُس کے لیے بامعنی ہو گئے تھے۔

صادقین کی قوتِ تخلیق میں بحیووں کی سی سرعت تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے ایک نقطہ اتصال پر رُک کر ان گنت دن اور بے نام راتیں گزار دیتا تھا۔ اُس نے لمحے کی جبریت کو کبھی قبول نہیں کیا تھا، لہذا ”لمحہ“ اُس کے لیے بامعنی اور ”ساعت“ اُس کے لیے زمان و مکان کی قید سے رہائی کے مترادف تھی۔ اُس نے فن کو وجود و عدم کے تصور سے بھی ماوراء بنا دیا تھا۔ اگر لمحہ اُسے قید کر سکتا تو صادقین آج فنا ہو کر وقت کی گرد میں دب کر گم ہو چکا ہوتا، لیکن بیسویں صدی میں صرف صادقین ہی ایک ایسا فن کار ہے جو لمحے سے آزاد اور گنتی کی ساعتوں سے ماوراء دکھائی دیتا ہے۔ صادقین! اپنی تنہائی کے عصر میں خود اپنے سامنے رہتا تھا۔ وہ دوسری ذات ”الروح“ تھا۔ صرف اپنی ذات کے گرد حاشیہ لگا کر بیٹھا رہتا تھا۔ یہ حاشیہ اُسے اپنی ذات کے غل سے باہر نہیں نکلتے دیتا تھا۔ بلکہ ج کے موقع پر جب اُس کے دوستوں نے اُسے پکڑ ڈھکڑ کر ج کرا دیا تو اُس وقت بھی اس کی آنکھ بند تھی۔ جب اُس کے دوستوں نے پوچھا کہ صادقین کج کیسا رہا تو اُس نے جواب دیا ”ہم نے تو آنکھ کھول کر اُسے دیکھا ہی نہیں“ تو یہ استغناء را اپنی جگہ بے حد اہم ہو جاتا ہے کہ وہ پھر کس کو دیکھتا رہا؟ اس اعتبار سے بھی صادقین قبلیہ تیسری سے تعلق رکھتا تھا، لہذا اس کی آنکھیں اس کے اندر کی طرف کھلتی تھیں۔ اور جس فن کار کی آنکھ اپنے باطن میں کھلتی ہو وہی فن کار عظمت کے در سے نور کا سورج طلوع کر سکتا ہے۔ لہذا صادقین نے کعبہ کو بھی آنکھ کھول کر نہیں دیکھا۔ تو جس حاشیے کو اُس نے اپنی تصویروں کے گرد کھینچ رکھا تھا وہی حاشیہ نظارہ کعبہ کے وقت بھی اُس کے گرد کھینچا ہوا تھا۔ یقیناً صادقین ایک سادہ و اور فقیر کی حیثیت میں خانہ کعبہ کے طواف کو گیا تھا (فقیر تو خدا کے ساتھ معاملہ کرتا ہے) اور اپنی ذات کو ضم کر کے سمندر بن جاتا ہے۔ مگر صادقین فقیر کے ساتھ ساتھ کبک فن کار بھی تھا اور فن کار اپنی ذات کو کسی دوسری ذات میں ضم نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے دوسری ذات سے بھی خوف آتا ہے۔ لہذا صادقین کا فنکار اپنی ذات میں ضم رہا۔ ایک فنکار کی فنی عظمت کی یہ علامت بھی ہے اور اُس کے فلسفے کی تصدیق بھی۔ صادقین فقیر یا سادہ و کی حیثیت سے ایک عارف بھی تھا۔ اس کا عارفانہ نظام گہروے رنگ کے لباس تک محدود نہیں تھا، بلکہ حرف، کو صوت اور صوت کو صورت عطا کرنے کے لیے اس نے فقیرانہ نظام کے تحت تخلیقی جست لگائی تھی۔ وہ فقیر کیوں تھا۔ کیا وہ اپنے معاصرین کی طرح جدیدیت کے تناظر میں خود کو ”ماڈرن“ نہیں بنا سکتا تھا۔ یقیناً وہ ایسا کر سکتا تھا۔ مگر اُس کے خون اور فکر میں اپنے آباؤ اجداد کا تخلیقی ہنر گردش کرنا رہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے فن کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اپنے بزرگوں کے فن کو بھی گلے سے لگائے رکھا۔ مثلاً اُس کے والد بہت خوبصورت سلام نگار اور مرثیہ گو تھے، اس کے بھائی کانٹین ”بہت اچھے صحافی، شاعر اور فن کے پرستار تھے۔ چنانچہ تہذیبی طور پر اُس کے تجربات میں خاندانی عطا بھی شامل تھی۔ لہذا اس نے کالجوں، سکولوں، لائبریریوں، تاریخی عمارات اور عجائب گھروں میں اپنے فن کو آباد کئے رکھا اور اُس کے ساتھ ساتھ دوستوں، نیاز مندوں اور پرستاروں کو اپنے فن پارے تحفہ پیش کرتا رہا اور یوں پاکستان کے اندر اور پاکستان سے باہر اُس کا فن پھیلتا

رہا اور اس کی عقیدت کا گراف بھی ٹرے بنا رہا۔
ہمارے موجودہ عہد میں وہ فن کا خوش نصیب گردانا جاتا ہے جسے اپنی زندگی میں عزت نصیب ہوئی ہو۔ اپنی فن کا روں میں صادقین بھی شامل تھا جس کی عظمت کا اعتراف نہ صرف اس کی زندگی میں وسیع پیمانے پر ہوا بلکہ حکومت کی طرف سے اس کے نام کی گیلری کا قیام ایک نئی روایت کے اجراء کے مترادف ہے (خدا کرے یہ روایت ہمیشہ قائم رہے)۔

صادقین کی خطاطی گہرے نیلے رنگ سے شروع ہوتی تھی۔ یہ رنگ امن، آشتی کا مزاج متعین کرتا ہے لیکن صادقین اس رنگ کو آفاق کے تناظر میں استعمال کرتا تھا جس میں وسعت اور گہرائی دونوں موجود تھے۔ وہ خود بھی ایک گہرا انسان تھا۔ اس لیے آفاق اُسے بے حد پسند تھا۔ چنانچہ آفاق پر موزا آیات لکھ کر وہ اسلامی تہذیب کو آشکار کرتا تھا اور یہ بھی بتاتا تھا کہ آفاق پر آیات کی روشنی کی وجہ سے چاند اور ستارے چمکتے ہیں اور اگر ستارے چمکتے ہیں اور اگر آیات ربانی نہ ہوں تو دونوں عالم ظلمت کدے کا روپ اختیار کر جائیں۔ چنانچہ فنون لطیفہ کے باب میں صادقین کا فطری منطقہ روحانی اور مابعد الطبیعیاتی بنتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کا فن آفاقی حدود کو چھوڑتا ہوا دونوں عالم کو محیط ہو جاتا ہے۔ میں یہاں اُس کی عظمتوں کا گراف نہیں پیش کرنا چاہتا کہ وقت خود اس کی عظمتوں کا معترف اور نگہبان ہے لہذا وقت کے دوش پر اس کی شہرت دور دور تک پھیل رہی ہے اس کے باوصف میں صرف انسا کہوں گا کہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد اس کے فن کے دبستان تھے جہاں نیول ہڈی کو ارڈر، عجائب گھر، سپورٹس کامپلیکس اور بہت سے ادارے اس کی معتقل کے اسیر اور اس کے خلوص کے سفیر ہیں۔ صادقین نے جتنے میمورل جتنے منظر، جتنی تختیاں اور بے حساب گروپس بنائے اُس کی رفتار کا اندازہ لیں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ لکیریں کھینچ کھینچ کر، نقطے بنانا کر، توسیں اور حاشیے مصور کرنے کے تھے اُس کی انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ وہ ان ٹیڑھی انگلیوں سے بھی کوئی نہ کوئی تصویر بنالیا کرتا تھا (مصور جو ٹھہرا) لہذا ٹیڑھی انگلیوں سے وہ ہاتھ پھیلا کر مبرش اور رنگوں سے آزاد لفظ ”اللہ“ بنا کر اپنے پرستاروں کو دکھایا کرتا تھا۔ سچ ہے فن کی آبیاری محض زندگی سے کی جاتی ہے اور صادقین تو تھا ہی سیکر فن — مجسم محبت — اور محض مصور! اس اعتبار سے صادقین کا کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا۔ وہ اگر رنگوں کے دائرے سے باہر نکل کر کہیں اور چلا جاتا تھا تو شرعی دیوبی سرسوتی اس پر مہربان ہو جاتی تھی۔ اور شرعی وہ جسے رباعی کی پیچیدہ ہتھکڑی میں گرفتار کرنا بہت ہی مشکل عمل ہے۔

۱۰ چند رباعیات دیکھئے :-

فن کی چل تو رہی ہے ریڑھی یاربت	سطریں لکھتا ہوں بڑی میٹھی میٹھی بات
لکھتے ہوئے آیات جنوں بچپن سے	اب انگلیاں ہر چکی ہیں ٹیڑھی یاربت
نقش تھے پا مال بنائے میں نے	پھر اُلجھے ہوئے بال بنائے میں نے
تخلیق کے کرب کی جو کمینچی تصویر	تو اپنے خدو خال بنائے میں نے
بہت ہی بے تحاشے ہیں مرے ہاتھ	کب شکل نگاری میں گئے ہیں مرے ہاتھ
بچپن سے شبانہ روز لکھتے لکھتے	
اس عمر میں سونچ کچھ ہیں مرے ہاتھ	

(بقدر الحضور)

صادقین کو اپنے عصر پر ایک فوقیت حاصل ہے کہ وہ جتنی آسانی سے مڑ باہمی کہہ لیتا تھا اتنی آسانی سے اُس کے معاصرین نہیں کہہ سکتے تھے۔ (وہ بھی پنجابی زبان میں)۔ اور مصوری میں خیال، جذبے کے ساتھ ساتھ وہ "اشاریت" کے نظام کا پابند ہو کر معانی کا ایک جہاں آباد کرتا تھا، اور خطاطی کے ذریعے وہ عقیدے کو اپنے اسلوب کا امتیازی وصف بنا کر اسے اپنی زندگی کی "معجزانہ نوعیت" بنا دیتا تھا۔ چنانچہ صادقین دوسرے الفاظ میں ازلی راہب کی شکل میں نہ صرف عظیم عقیدے کا پرچارک تھا بلکہ "رحم و کرم" کے علامتی اظہار کو رزمیاتی پیکر بھی عطا کر دیتا تھا، اس لیے صادقین کے فن کو فنا نہیں۔ بلکہ مصوری میں اُس نے جن نئی اقدار کو جنم دیا ہے، اُس میں نرمی، ہمدردی، عبودیت اور احساس کا رچاؤ تہ در تہ امتزاجی پر نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ اُس کا فن جسم کے جہنم سے آزاد کا علامہ اور صبحِ ازل کی وحیاتی کیفیت کا دہرانا نام ہے۔ اس اعتبار سے صادقین سادہ بھی ہے، قلندر بھی، تھکار بھی، تغزل کا سکون شاعر بھی اور انکساری کا معصومیت آئینہ بھی۔ چنانچہ انسانی وجود میں معانی کے اتنا ہمدرد کو لے کر زندگی کرنا شیوہ پیغمبری ہی ہے۔ لیکن اس عہد میں ولی کامل کے بغیر فن کی دنیا میں قیادت فراہم کرنا ایک جو کھم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تاہم صادقین اپنے فن کا ولی تھا اور مدہوش قلندر بھی اور گویں وہ خورشید مثال شخص تھا جس کے پاس ولایت فن کی شخصی سند بھی تھی اور رُوح کے جلالِ جمال کا بیکراں عصر بھی۔

صادقین! روشنی کا غیر مبہم کشیدہ کار تھا۔ اُس نے نور کی پرستش کی تھی۔ لہذا ایسا شخص نور کا حصہ بن کر ظلمتوں میں جگمگاتا رہتا ہے۔ یقیناً صادقین دنیا کے لیے ایک مثال (LEGEND) اور فن کا ایک مجتہد ہے، جو مستقبل میں میتھ (MYTH) کا درجہ حاصل کر لے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) صادقین نے اُنہوں کے علاوہ پنجابی میں بھی اُردو کے وزن پر رباعیات کہی ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی سے کہ اس کی تاو اور الکلامی پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ (ریل)

فکر تونسوی کا مزاج

انور سدید

فکر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی تھی۔ ان کی نظموں کا مجموعہ آزادی سے پہلے ”ہیولے“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا اور اس پر ایک تحسین آمیز مضمون کنہیا لال کپور نے سیرا میں لکھا تھا۔ اتنی عمدہ اٹھان اور اتنی اعلیٰ پذیرائی کے باوجود عجیب اتفاق یہ ہے کہ انہوں نے شاعری سے وفادارانہ سلوک نہیں کیا اور آزادی کے بعد جب نئے ماحول میں انہیں توافق کی تلاش ہوئی تو انہوں نے طنز و مزاح کو اپنے مزاج کے زیادہ مطابق سمجھا اور پھر معاشرے کی ہوا جمیوں اور ناہمواریوں کو ایس صداقت بیانی سے پیش کیا کہ آگش بازی کے انار کی طرح مسکراہٹیں چھوٹی چلی گئیں اور آخر طنز و مزاح ہی ان کے ادبی شخص کا وسیلہ بن گیا اور شاعری ایک سرسبز منظر میں چلی گئی۔

مجھے مقبول احمد مقبول بتا رہے تھے کہ فکر تونسوی کو ابتدائے حیات میں معاشی نا آسودگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے والد تونسہ شریف میں کریمانے کی دکان کرتے تھے جو کنبے کی پوری طرح کفیل نہیں تھی۔ چنانچہ فکر تونسوی اپنی خواہش کے مطابق تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔ باپ چاہتے تھے کہ فکر دکان میں ان کا ہاتھ بٹائیں لیکن فکر کو نوں تیل کی فروخت کا پیشہ پسند نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اپنے والد کی مرضی کے خلاف ایک روز تونسہ شریف چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ رخت سیر کے بغیر گھر سے نکلے اور لاہور پہنچ گئے۔ لاہور کا قیام معاشی اور اقتصادی لحاظ سے فکر کے لیے اچھا تجربہ نہیں تھا۔ یہاں انہیں نان و جوہر حاصل کرنے کے لیے کئی پاڑ بیٹنے پڑے۔ ادب کی پہلی معر ز نوکری انہیں رسالہ ”ادب لطیف“ میں ملی اور انہوں نے ”سیرا“ کی ادارت میں بھی حصہ لیا۔ لیکن ذہنی سکون کا یہ دور بہت مختصر ثابت ہوا اور آزادی کے بعد انہیں جالندھر کو جہاں ان کا دوست گور بخش سنگھ محو رجالندھری مقیم تھا اپنی پناہ گاہ بنانا پڑا۔ لیکن جالندھر بھی عارضی ٹھکانا ثابت ہوا اور وہ دہلی چلے گئے جہاں قلم اور قسط اس کا وسیلہ زندگی بن گئے اور شاعری کی جگہ طنز و مزاح نے لے لی۔ اس اسلوب کو فکر نے تا دم آخر اختیار کیے رکھا اور جب ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو دنیا سے رخصت ہوئے تو ”پیاز کے پھلکے“ ”آدھا آدمی“ ”آخری کتاب“ اور ”فکرایت“ وغیرہ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔

فکر تونسوی کے یہ شہیدہ حالات زندگی اگرچہ مختصر ہیں تاہم ان سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ زندگی ان

لے ”جگوان کی لیل“ میں لکھتے ہیں ”مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس بڑے شہر میں تنہا ہوں، ماما کے بغیر سانس لے رہا ہوں۔“

پر کچھ زیادہ مہربان نہیں ہوتی۔ انہیں بچپن میں جس اقتصادی نامساعدت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ قیامِ دہلی کے دوران اگرچہ نظر نہیں آتی ہے لیکن انہیں آسودہ حال تصور کرنا شاید مناسب نہیں۔ حالات کی اس نامساعدت نے ہی فکرِ تونسوی کے داخل میں ردِ عمل پیدا کیا اور پھر وہ لمحہ بھی آیا جب دولت کی اس غیر منصفانہ تقسیم پر وہ اپنی خلوت میں ہنسنے لگے اگرچہ یہ ایک مفکر کا قہقہہ تھا اور اس میں پاگل پن کا عنصر نظر نہیں آتا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فکرِ تونسوی کے طنز و مزاح کے بیشتر سوتے اس معاشی ناہمواری سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان آبادیوں کا تبادلہ ہوا تو اس کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات نے بھی جنم لیا۔ ذہنی انتشار کی اس کیفیت میں اقدار کی شکست و ریخت بھی عمل میں آئی اور معاشرے کی وہ ہمہ جہتی بھی پارہ پارہ ہوئی جو ایک طویل عرصے قائم تھی اور اعتمادِ باہمی جس کی اساس تھی۔ فکرِ تونسوی بھی آگ، خون، قتل، غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کے اس گھمسان سے گزرے جو خطِ آزادی کے دونوں طرف بلا تیز مذہب و ملت برپا تھا۔ توقع تھی کہ فسادات کا یہ ابال اور جذبات کا یہ الاوجب رُوبہ اعتدال ہو گا تو ایک متوازن معاشرہ معرضِ تخلیق میں آجائے گا۔ لیکن المیہ یہ ہو ا کہ قدروں کی شکستگی نے معاشرے کو ایک نئے زوال سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ اب جہلی الائنمنٹوں، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، رشوت اور سفارش کا بازار گرم ہو گیا جس نے نا آسودگی پیدا کی، معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کو جنم دیا اور سماجی تضادات کی نئی جہت زندگی کی عام سطح پر ابھاری۔ فکرِ تونسوی نے آزادی سے پہلے کے دور میں سماجی انصاف اور معاشرتی انصاف کا خواب دیکھا اور ایک مثالی نظام کو نئے ملک میں رائج کرنے کی آرزو کی تھی۔ آزادی کے بعد ان کا یہ آدرش ٹوٹ گیا۔ چنانچہ ان کے ہاں جو محکم مایوسی اور دبیز بے چارگی نظر آتی ہے وہ ان حالات ہی کی زائیدہ ہے اور اس کے شدید ردِ عمل نے ہی انہیں معاشرے کا مذاق اڑانے پر آمادہ کیا اور وہ سنجیدہ شاعری سے طنز و مزاح کی طرف آ گئے۔ اب ان کی حیثیت ایک ایسے ناظر کی تھی جو سب کچھ دیکھتا ہے۔ بظاہر بے بس ہے۔ لیکن خون کے آنسو پی رہا ہے اور جب بات اختیار میں نہیں رہتی تو نوکِ قلم سے نشتر کا کام لینے لگتا ہے اور ہنسی ہنسی میں وہ کام کر گزرتا ہے جو بڑے بڑے مصلح بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ یہ کننا شاید درست ہو کہ فکرِ تونسوی نے طنز و مزاح سے حیوانِ ظریف بننے اور جسم کی فاضل قوت کو نفسی اور مذاق میں صرف کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ طنز و مزاح سے سماجی اصلاح کے موثر حربے کا کام لیا ہے اور یہ حربہ اس لیے کیا نظر آتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں پورے ہندستان کی نظریں فکرِ تونسوی کی طرف دیکھنے لگیں کہ کسی مخصوص واقعے پر وہ اپنا ردِ عمل کس طرح ظاہر کرتے ہیں اور معاشرتی ناہمواری کو کس طرح عیاں کرتے ہیں اس عالم میں فکرِ تونسوی کی حیثیت بالعموم اس پتے جیسے ہوتی جو بھرے دربار میں مصاحبوں کی موجودگی میں بادشاہ سلامت کو بے لباس یا ننگا کرنے کی جرات کر سکتا تھا۔ اس قسم کی مصیبت سے فکرِ تونسوی کے بارے میں دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں :

اول : یہ کہ فکرِ تونسوی زندگی اور معاشرے کی ناہمواریوں کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ ان کا ذہن اس ناہمواری پر شدید ردِ عمل پیدا کرتا ہے لیکن وہ اس پر برہم نہ ہوتے بلکہ اس ناہمواری سے ہمدردانہ رویہ پیدا کر لیتے تھے۔

دوم: ان میں اتنی جرأت اور عالی حوصلگی بھی تھی کہ وہ اس پر اپنا شونخ و شنگ تبصرو بھری مجلس میں پیش کر دیتے تھے۔ چنانچہ وہ بیک وقت زندگی کے ہجوم میں شامل بھی ہوتے، دھکے بھی کھاتے اور پھر اپنی پریشانیوں اور پشیمانیوں کو چھپانے یا ان پر غصے میں نام دم ہونے کے بجائے ان میں دوسروں کو بھی شریک کر لیتے تھے۔

ان دو زاویوں سے دیکھئے تو احساس ہوتا ہے کہ مسلسل ناکامیوں اور پرہم نامرادیوں کے باوجود فکرتونسوی نے لمبا چڑا غم پالنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے معاشرتی دکھ کو اپنی ذات کا روگ نہیں بنایا۔ شدید کرب محسوس کیا لیکن خون نہیں تنو کا اور احساس کو کسی گہرے بحران سے دوچار نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ پوری زندگی انہیں باز کچھ اطفال نظر آتی ہے اور وہ اس کی ہر کوٹ سے کھیلنے اور لطف اٹھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے مزاج کی جو صورت پیدا ہوئی ہے یہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے عیاں ہے۔

”چترنجن کے عشق کی کہانی ہسپتال بھر میں مشہور ہو چکی ہے۔ دنیا میں کئی باتیں خواہ مخواہ مشہور ہو جاتی ہیں جیسے باپڑ کے پاڑ مشہور ہیں میں نے ایک دفعہ ایک باپڑ کو اسی سے پوچھا تھا:

”بھائی صاحب! باپڑ کے مشہور پاڑ یہاں کے کس بازار میں ملتے ہیں؟“

وہ بولا:

”میں نہیں جانتا“ اور یہ کہہ کر وہ ہانک لگانے لگا:

”کشمیر کے سیب لے لو، چار روپے کلو“

حالانکہ وہ ہاچل کے سیب تھے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے وہ سیب نہیں بیچ رہا۔ مشہوری بیچ رہا ہے بلکہ کشمیر بیچ رہا ہے۔“ (آدھا آدمی)

”جنازہ بڑی نیچرل چیز ہے بشرطیکہ دوسروں کا ہو۔ مثلاً ہمارا سیاسی لیڈر بوڑھا ہو جائے ہاتھ اور لاشی دونوں بیک وقت کانپنے لگیں تو خدمت قوم میں اس کا اعتقاد اور بھی بچتے ہو جاتا ہے اور جنازے میں اعتقاد کم ہو جاتا ہے حالانکہ قوم اپنے مستقبل کی قسم کھا کر اس سے بار بار وعدہ کرتی ہے کہ ہم آپ کے جنازے میں لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوں گے۔ آپ جنازے کی طرف قدم تو بڑھائیے مگر لیڈر اصرار کرتا ہے کہ میں وزیر اعظم بنے بغیر جنازہ نہیں اٹھاؤں گا۔ ہاں۔ جنازہ نیچرل چیز ہے۔ لیکن لیڈر ان نیچرل بن کر رہنا چاہتا ہے، وزیر اعظم بن کر رہنا چاہتا ہے۔“ (بوڑھوں کا سال)

”میں نے ایک صاحب سے کہا:

”براہ کرم مجھے دو چار گالیاں دے دیجئے۔“

انہوں نے فائل سے عینک اٹھائے بغیر کہا ،
 ”ساری ! میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ اس خدمت کے لیے کسی اور کے پاس جائیے؟“
 اس صاحب نے کسی اور کا ایڈریس بھی نہیں دیا اور نہ میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ جب گالی ایسی
 لفینڈ شے کے لیے اس کے پاس ٹائم نہیں تھا تو ”ایڈریس“ ایسی بے رس شے کے لیے وہ ٹائم
 کہاں سے نکالتا۔ میں نے سوچا ، ”ان صاحب سے تو وہ آدمی بہتر تھا جس نے کسی سے ایک مرتبہ
 پوچھا تھا ،
 ”جناب ! آپ بتا سکتے ہیں کہ میونسپل کارپوریشن کا دفتر کہاں ہے؟“

وہ بولا :

”یہ بتانے کے لیے میں پچاس پیسے چارج کروں گا۔“
 ضرورت مند نے پچاس پیسے اس کی تھیلی پر رکھ دیئے اور اس نے بتایا کہ ،
 ”جس جگہ آپ کھڑے ہیں وہی میونسپل کارپوریشن کا دفتر ہے۔“

فکر معاشرے کے زیرک ناظر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکثر ایسے واقعات کے بیان میں زیادہ دل چسپی لی ہے جن سے
 معاشرتی ہمواریاں سطح پر بے ساختہ انداز میں ابھر آتی ہیں۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ واقعے کو ٹیڑھی آنکھ سے
 نہیں دیکھتے۔ نہ ہی واقعہ نگاری میں مبالغہ آرائی کی کوشش کرتے ہیں۔ تخلیقی مزاح میں ان کا حربہ وہ جملہ ہے جو فکر تونسوی
 بیان واقعہ کے بعد آہستہ سے لٹکا دیتے ہیں اور جس سے سارا واقعہ اچانک ایک لطیف کی طرح کھلکھلا اٹھتا ہے۔ اس لحاظ سے
 دیکھئے تو واقعے کا بیان مزاح کے لیے زمین ہوا کرتا ہے۔ فکر تونسوی واقعے کو غبارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں ، اس میں
 آہستہ آہستہ ہوا بھرتے ہیں اور جب غبارے کا پیٹ پھول جاتا ہے تو ایک ہلکی سی خمیں سے اسے پھاڑ دیتے ہیں۔ بظاہر
 غبارہ پھٹ جاتا ہے لیکن حقیقتاً یہ دبے ہوئے جذبات کا کھارکس کرتا ہے اور لٹچ کو رفع کر ڈالتا ہے۔ مضمون ”صبح کی سیر“
 میں لکھتے ہیں ،

”میں کئی بار سوچتا ہوں کہ اگر کوئی محبوبہ صبح کی اس سیر میں میرا بھی ساتھ دیتی تو ناتوانی عشق میں ہماری
 پوزیشن بھی اس مدد اسی جوڑے سے کچھ کم نہ ہوتی۔ تاریخ عشق ہم پر بھی ڈھرائی جاتی۔ ڈاکٹروں کے مشورے
 بدستور بیکار جاتے۔ اطلاعات عرض ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے بھی مشورہ دیا تھا کہ صبح کی آسجین کھایا کرو غم دوراں
 سے نجات مل جائے گی۔“

میں نے پوچھا : کیا بیوی کو بھی ساتھ لے جایا کروں؟
 وہ بولا : پھر تو ایک چیز سے ہی نجات ملے گی ، غم دوراں سے یا بیوی سے۔“

چنانچہ میں تنہا ہی آکسیجن کھانے کے لیے سیر پر نکل جاتا ہوں۔ مگر ہر مرتبہ آکسیجن کے بجائے ایک ٹرک سے ملاقات ہوتی ہے جو اینٹوں اور مٹی روڑے سے بھرا ہوتا ہے۔ اس میں سے قریباً ایک کوئٹل گرو غبار اڑ کر میرے اندر چلا جاتا ہے۔ ایک دن میں نے ڈاکٹر سے پوچھا: ”میڈیکل سائنس کے اعتبار سے یہ مضر عمل مٹی کیسی ہوتی ہے؟“ وہ بولا: ”یہ ماڈرن دور کی آکسیجن ہے۔“

ایک نظر افت آمیز صورت واقعہ (HUMOROUS SITUATION) فکر تونسوی کے مضمون ”قصہ ٹیلی فون کا“ میں یوں سامنے آتی ہے:

”حالت کافی دردناک تھی۔ اچھا ٹیلی فون گویا ہے جو صرف رنگ نمبروں سے ہی ڈیل کرتا ہے۔ محبوبہ سے ملاؤ تو جہنم سے جاتا ہے۔ ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ سے ملاؤ تو کسی دفتر زراعت سے جا جڑتا ہے۔ تیسری مرتبہ ایک ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا جو میرے نروس سسٹم کا علاج کرتا تھا۔ ٹیلی فون ڈاکٹر کے بجائے کسی دفتر میں ایک خاتون سے بھڑکیا جو شاید خاوند کو بھڑک کر مشورہ دے رہی تھی۔ ”بچہ رو رہا ہے تو میں کیا کروں! لوری کا ریکارڈ لگا دو، چپ ہو جائے گا۔“

اور شوہر کہہ رہا تھا:

”ریکارڈ مل نہیں رہا، تم ٹیلی فون پر ہی اسے لوری سنا دو ناں!“

خاتون نے چرما کر کہا:

”میرے دفتر کی فائلوں میں لوری کی موسیقی ڈھونڈتے ہو؟ میں لوری نہیں دے سکتی۔ یہ تم ہی لوری دے دو ناں! گھڑی بھر کے لیے مٹی بن جاؤ۔“

”ڈارلنگ! میں تو ڈیڈی بننے سے بھی کتراتا تھا اور تم مٹی بننے کا حکم دے رہی ہو!“

مگر پھر ایک آہ سرد کے ساتھ مردانہ لوری کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ میں نے سچ میں چیخ کر ٹوکا:

”اجی، بند کیجئے یہ لوری شوری، مجھے لوری نہیں چاہیے۔ وٹامن بی کمپلیکس چاہئیں۔“

فکر تونسوی افسانہ نگار نہیں تھے لیکن جس تخلیقی انداز میں انہوں نے مزاحیہ واقعات تخلیق کیے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اگر افسانہ نگار بننے کی کوشش کرتے تو اس صنف میں بھی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتے۔ ان کے بعض مضامین میں صورت واقعہ ہی نہیں افسانوی فضا بھی موجود ہے۔ اور جب کردار سامنے آتے ہیں تو محض ظرافت ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ حرکات و سکنات سے اپنی شخصیت کا واضح نقش بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں ان کا مضمون ”آدھا آدمی“ کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو بظاہر ایک مزاح پارہ ہے لیکن اس میں افسانے کی خصوصیات بھی موجود ہیں۔ فکر تونسوی کی خوبی یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں طنز لطیف فطری طور پر شامل ہوتی چلی جاتی ہے اور بعض اوقات تو ان کا

تبصرہ اتنا کیلا ہوتا ہے کہ معاشرے کی سفاکی کے لیے تیز نشتر سے کم ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ فکر تونسوی مزاح نگاروں کے اس محدود قبیضے سے تعلق رکھتے ہیں جو مزاح اور طنز میں حدِ فاصل قائم نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر:

”یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے محلہ کو صرف ایک دو ٹیلی فون نصیب ہوئے تھے۔ ایک تو چرنجی لال سو داگر جو بے اپنے گھر گوا لیا تھا اور ٹیلی فون لگنے کے بعد چرنجی لال کھلانے لگے تھے۔ وہ ایک دفعہ اسمبلی الیکشن میں کھڑے ہو گئے تھے اور کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ کیونکہ انہیں لکڑی اور سیاست دونوں کے بھاؤ معلوم تھے۔ ٹیلی فون لگنے سے دو نیچے نکلے۔ ایک تو ان کا سوشل اسٹیٹس بڑھ گیا اور دوسرے لکڑیوں کے دام چڑھ گئے۔ دوسرا ٹیلی فون ایک حکیم صاحب کے چوبی کھوکھے میں تھا۔ کوئی بھی ان کے ہاں ٹیلی فون کرنے جاتا تو وہ آٹھ آنے چارج کر لیتے۔ سرکاری ریٹ چار آنے تھا۔ ان کی طبی پریکٹس کم جلتی تھی ٹیلی فون زیادہ چلتا تھا۔ وہ ٹیلی فون کال کو کل بنفشہ کی پڑیا سمجھ کر بیچتے تھے۔ شکایت کیا کرتے تھے:

”اجی! کیا کریں، سالی ایلو پتھی کا زور ہے۔ گل بنفشہ بکتا ہی نہیں۔“

ممبر اسمبلی کی لکڑیاں بکتی تھیں اور حکیم صاحب کی کالیں۔ ایک مرتبہ مارکیٹ میں گل بنفشہ کا ریٹ بڑھ گیا تو انہوں نے بھی کال ریٹ آٹھ آنے کی بجائے دس آنے کر دیا۔ میں نے بھی محسوس کیا کہ میرے گھر ٹیلی فون لگنے سے لوگ آتے جاتے بھے سلام کرنے لگے ہیں۔ میری بیوی کو مندر کا پجاری دوسروں سے زیادہ پرشاد دینے لگا ہے حتیٰ کہ سکول میں میرے نالائق ترین بیٹے کو پرنسپل نے مانیٹر بنا دیا۔ میں نے پرنسپل سے کہا:

”آپ نے یہ ناشائستہ حرکت کیوں کی، میرا بیٹا تو انتہائی اجڑ ہے۔“

وہ بولے:

”اجی! اس لڑکے کے اندر جھانکیے، بے پناہ صلاحیتیں ملیں گی۔“

میں نے اس کے اندر جھانک کر دیکھا تو ہیلو، ہیلو کی صدائیں آرہی تھیں۔ پرنسپل صاحب وہ صدائیں سن لیتے تھے، مگر میں بہرہ تھا۔“

میں عرض کر چکا ہوں کہ فکر تونسوی معاشرے کے طبقاتی تضادات کو شدت سے محسوس کرنے والے ادیب تھے۔ چنانچہ جب وہ غریب کی بے بسی اور ناداری کا مشاہدہ کرتے تو بے حد جذباتی ہو جاتے اور اپنے ساتھ پڑھنے والوں کو بھی، بھان میں مبتلا کر دیتے۔ اس قسم کے مواقع پر ان کے لہجے میں درد مندی پیدا ہو جاتی، آواز لرز نے لگتی اور الفاظ آنسوؤں میں بھیگے ہوئے نظر آتے۔ لیکن پھر اچانک ہی ایک ایسا لمحہ بھی آجاتا جب طنز کا شگوفہ کھل اٹھتا اور پھر ایک فکر تونسوی اچانک دبیز اندھیرے میں جگنو سا چمکا دیتا۔ مثال ملاحظہ کیجئے جس سے فکر تونسوی کا نظریہ مزاح بھی آشکار ہوتا ہے۔

”در اصل ہماری قوم کے پاس ہنسنے کے لیے ٹائم نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس ہنسنے کا تمدن ہی نہیں ہے۔ یہاں ہنسنا بد تہذیبی سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کسی میاں بیوی کو ایک دوسرے کے سامنے ہنسنے نہیں دیکھا۔ اگر بد قسمتی سے ہنس بھی رہے ہوں تو بچوں کے آتے ہی چپ ہو جاتے ہیں کہ کہیں وہ بُرا نہ مان جائیں۔ بس اسی خطرے اور اسی سنجیدگی کے بارے میں ہماری قوم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہے۔ فن مزاح میں بھی شاید اسی لیے ہم اور جنل نہیں بن سکے۔ ہم ایک سہمی ہوئی مگر سنجیدہ تہذیب کے نمائندے ہیں سچ کا پرچار کرتے ہیں مگر سچ کہنے سے کتنی کاٹ جاتے ہیں۔ ہم چور کو بھی چور نہیں کہتے مبادا وہ کسی وزیر کا بیٹا ہے۔“ (میرا پہلا اور آخری صدارتی خطبہ)

آپ نے دیکھا کہ اس طویل تقریر میں چھوٹے سے آخری جملے نے کیسی طنزیہ صورت پیدا کی ہے اور کس طرح سارے اقباس کا تناظر تبدیل کر دیا ہے۔ فکر تو نسوی کا یہی فن ہے کہ معمولی سے جملے سے طنز کا افی وسیع تر کر دیتے ہیں اور اپنے مشاہدے ہی کی نہیں دانش کی دھاک بھی قائم کر دیتے ہیں۔

دانش کا ذکر آیا ہے تو یہاں ان چھوٹے چھوٹے مفرد جملوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو بظاہر مزاحیہ ہیں لیکن ان کا باطن تجربے کی دانش سے معمور ہے اور ان میں ظرافت میں طنز کی سبک سی کیفیت اور لطیف سی چھن بھی موجود نظر آتی ہے۔ اس قسم کے جملوں میں فکر تو نسوی نے خلیل جبران بننے کی کوشش نہیں کی تاہم انھوں نے موضوع کا گھونگھٹ اُلٹنے اور اس کے عقب سے ایک مسکراتی ہوئی صورت کو ہویا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چند جملے ملاحظہ کیجئے:

- ۱۔ ”شریعت النفس انسانوں کا المیہ یہی ہوتا ہے کہ وہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔“
- ۲۔ ”میرے ایک دوست ہیں کہ جن کی دوستی اچھی نہ جن کی دشمنی اچھی۔ کیونکہ وہ حکمہ پولیس میں افسر ہیں۔“
- ۳۔ ”ماڈرن بیوی ہو تو وہ سر درد ہوتی ہے۔ پرانے زمانے کی بیوی ہو تو وہ سر درد کی تکلیف ہوتی ہے۔“
- ۴۔ ”زندگی بھرا گر آپ نے ایک جھوٹ بھی نہیں بولا تو بے شک آپ انسان ہیں مگر غیر فطری۔“
- ۵۔ ”ایک بڑھیا ہر روز چھت پر جا کر چڑیوں کو دانہ دینا ڈالا کرتی تھی۔ بڑھیا مر گئی تو چڑیوں نے چھت بدل لی۔“

۶۔ ”بے ایمانی کوئی عیب نہیں بلکہ سماج کی ضرورت ہے۔ اگر بے ایمان نہ ہوں تو ایمانداروں کے پاس کوئی کام نہ رہ جائے۔“

- ۷۔ ”پچھتاوا کیا ہے؟ ایک خوشی آئی اور چلی گئی مگر اس کا علم بعد میں ہوا۔“
- ۸۔ ”کبھی کو مارنے میں آپ کو وہ لطف نہیں آتا جو لطف کبھی کو آپ کے کاٹنے میں آتا ہے۔“
- ۹۔ ”لیڈر ایک ایسا چیک ہے جس پر حوام دستخط کریں تو کیش ہو جاتا ہے ورنہ ”ڈس آنر“

ہو جاتا ہے۔“

۱۰۔ ”انسان جس جانور کو کھانا چاہتا ہے اسے پالتا ہے۔ جانور جسے کھانا چاہتا ہے اسے

پالتا نہیں۔“

۱۱۔ ”کنوارا لڑکا — سر تا پا غلطیاں

شادی شدہ مرد — سر تا پا جدوجہد

بوڑھا — سر تا پا معافی“

۱۲۔ ”پرانے خطوط کو پڑھنے میں سب سے بڑا لطف یہ ہوتا ہے کہ ان کا جواب نہیں لکھنا پڑتا۔“

مزاج اور فہمی چونکہ لازم و ملزوم ہیں اس لیے فکر تو نسوی نے فہمی کو تحریک دینے کے لیے بیشتر کارآمد اور آزمودہ حربے استعمال کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ اس کی ایک صورت تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ وہ واقعے کو اختتام پر اس طرح بل دیتے ہیں کہ واقعہ لطیف کی طرح مسکرا اٹھتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واقعے یا بیان کی روانی میں اگر کوئی ترشا ہوا لطیفہ تخلیق مزاج میں معاون بن جاتا ہے تو وہ اس کا ہاتھ بھی نہیں جھٹکتے بلکہ اسے اس طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں کہ لطیفہ ان کے بیانیہ کافطری جزو و نظر آنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مضمون موت کے بارے میں ”حسب قیل دلچسپ لطیفہ استعمال ہوئے ہیں۔

”ایک پریشان بوڑھے نے خدا سے دعا مانگی، ”اللہ تعالیٰ میرے لیے موت بھیج دے۔“

دروازے پر کھٹ کھٹ ہوتی۔ بوڑھے نے پوچھا، ”کون ہو؟“

جواب آیا، ”میں موت ہوں، آپ نے مجھے ابھی بلایا تھا۔“

بوڑھا گھبرا گیا۔ بولا، ”مگر میں نے تو اپنے بیٹے کو بلایا تھا۔“

جواب آیا، ”میں آپ کا بیٹا ہی تو ہوں۔“

ایک فوجی سردار صحت تیزی سے دوڑتے جا رہے تھے کسی نے پوچھا، ”سردار نیتا سنگھ جی! خیریت تو ہے

کہہ جا رہے ہیں؟“

وہ بولا، ”ایک چور چوری کر کے بھاگا ہے اسے پکڑنا ہے۔“

”مگر چور کہاں ہے؟“

”وہ میرے پیچھے رہ گیا ہے۔“

فکر تو نسوی نے طنز و مزاح سے اپنے عہد کی منافقت، کمینگی اور اخلاقی کج روی پر ضرب لگانے کی کاوش کی ہے اور اس صحت مند عمل میں انہوں نے برصغیر کے سیاسی مزاج پر بھی طبع آزمائی کی اور تنگ نظری، دوغلا پن اور بے انصافی پر

سماجی انسان کے زاویے سے طنز کی۔ فکر تونسوی اس زمانے کے مزاج نگار تھے جب دنیا کی سرحدیں سمٹ گئی تھیں۔ ذرائع ابلاغ و آمد و رفت نے پوری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا تھا اور ایک ملک کا واقعہ فوری طور پر دوسرے ملک کے حالات پر اثر انداز ہو جاتا تھا چنانچہ ان کے سیاسی مزاج کا دائرہ صرف برصغیر تک محدود نہیں بلکہ اس کے مدار میں پوری دنیا آ جاتی ہے۔ محکمہ تونسوی تلاطم پیدا نہیں کرتے بلکہ وقت کے دریا میں ایک چوٹا سا پتھر پھینک کر بس ایک لمحاتی سا تحریک پیدا کر دیتے ہیں اور خود فنا صلیہ پر کھڑے ہو کر مسکراتے رہتے ہیں۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں :

”میں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں نے ماں کے دودھ کے بعد کوئی دودھ نہیں پیا۔ ادھر فریقِ مخالفت یعنی میری بیوی کا بھی یہی دعویٰ تھا۔ میں نے کہا ”اگر دونوں کے دعوے صحیح ہیں تو پھر دودھ کون پی جاتا ہے اور جو بھی پی جاتا ہے وہ تمہارے ہی زیر سایہ پی جاتا ہے“ مثال کے طور پر ممکن ہے کہ یہ بلی پی جاتی ہو۔ میں نے کونے میں بیٹھی ہوئی بلی کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے وہ بلی نہ ہو اسرائیل ہو جو امریکہ کے زیر سایہ پڑا ہے۔ چڑھ رہا ہے“

”جو سرکار عوام سے ہر وقت قربانی کا مطالبہ نہیں کرتی وہ خود ایک دن عوام کے ہاتھوں قربان ہو جاتی ہے“

”میں نے ایک سیاستدان کو سٹیج پر آنسو بہاتے دیکھا اور اسٹیج سے آکر انہیں اپنے ہی آنسوؤں پر مسکراتے دیکھا“

”انگل نے مجھے بتایا کہ ایک بار میرے ایک لاکھ روپے کی تعمیل ایک صاحبِ اقتدار لیڈر کے پیچھے تین مہینے تک بھاگتی رہی کیونکہ اس لیڈر کے قلم کی جنبش سے مجھے دس لاکھ روپے کا منافع ہو سکتا تھا میں نے پوچھا :

”پھر منافع ہوا؟“

وہ بولے : ”ہوا“

مگر میں نے پھر سوال کیا :

”انگل ! روپیہ لیڈر کے پیچھے بھاگنا ! میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کبھی روپیہ آپ کے پیچھے بھی بھاگا؟“

ہاں ! روپیہ ہی نہیں۔ وہ لیڈر بھی ہفتوں میرے پیچھے بھاگتا رہا اور کہتا رہا : بھائیہ صاحب ! ذرا میری بات تو سنئے، میرے قلم کو جنبش میں لائیے۔ منافع کے لاکھوں روپے آپ کے پیچھے

بھاگنے کے لیے تیار ہیں۔“ (ایک روپے کا نوٹ)

اس قسم کے واقعات سے فکر تو نسوی نے زندگی اور معاشرے کے ان گنت بھیاں تک پہنچے اور ان چہروں کے پس پردہ پر ان چڑھنے والی منافق اور کریہہ رُوحوں کو بے حد تیکھے اور موثر انداز میں بے نقاب کیا ہے اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں محرومی، عدم مساوات، بے انصافی اور نارسانی کا احساس روز افزوں ترقی پارہا ہے چند لمحوں کے لیے فرد کو مسکراتے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

فکر تو نسوی کے بیشتر مزاج پارے اخباری کالموں میں شائع ہوئے۔ یوں ان کا خطاب براہ راست عوام سے تھا اور انہیں روزانہ کثرت سے مسکراہٹیں فراہم کرنا ان کے منصبی فرائض میں شامل ہو گیا تھا۔ فکر تو نسوی کی یہ بات خاص طور پر متاثر کرتی ہے کہ وہ صحافت کی ناگ و تاز میں تو شریک رہے لیکن انہوں نے اپنے کالموں کو صرف ہنگامی واقعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اکثر ایسی معاشرتی خرابیوں کو بدف بنایا جو سلطان کی طرح ان کی قوم کے جسم میں سرایت کر گئی تھیں اور جن کے فوری علاج کی توقع نہیں تھی۔ ان کے موضوعات میں رشوت، سفارش، چور بازاری، اقربا پروری، طلاوت، روپے پیسے کی ٹوٹ کھسوٹ، جعل سازی، بے ایمانی، دروغ گوئی، ایمان فروشی وغیرہ کو مستقل حیثیت حاصل رہی۔ مروریات نام کے ساتھ چونکہ معاشرتی معائب کو بھی فروغ ملا اور اقدام واردات کے بھی نئے نئے طریق ایجاد ہوتے چلے گئے اس لیے فکر تو نسوی نے ان موضوعات پر دو غزلے، سہ غزلے کہنے میں عار محسوس نہیں کیا اور جب بھی قلم اٹھایا ایک نئی کیفیت پیدا کی وہ بظاہر لوگوں کو ہنسا رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عجز بھر دوتے رہے۔ ان کے طنز و مزاح کی کتابیں ان کے مجسم آنسوؤں ہی کا مجموعہ ہیں۔ افسوس کہ یہ شمع جو جلتی بھی تھی اور روتے روتے مسکراتے بھی لگتی تھی ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

(۲) دو نمبر

و ایک نمبر اقبال پر جو ان کی غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا نمبر غالب پر جو ان کی غیر مطبوعہ اور کیا ب تحریروں پر مشتمل ہے۔
و یہ دونوں نمبر کتاب شدہ صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ بڑی کوشش ہوگی کہ انہیں بہ منظر عام پر لایا جاسکے۔

ہماری کتابیں جو دستیاب ہیں

محمد طفیل	۲۵ روپے	(۱) خدوی
محمد طفیل	۲۵ روپے	(۲) محبتی
محمد طفیل	۲۵ روپے	(۳) معظم
منظور الہی	۳۵ روپے	(۴) سلسلہ روز و شب
منظور الہی	۲۵ روپے	(۵) درد کشا
ممتاز حسن	۱۸ روپے	(۶) خیر البشر کے حضور
ادیبہ بزمی	۱۰ روپے	(۷) سر کشیدہ
خدیجہ مستور	۳۰ روپے	(۸) زمین
شوکت تھانوی	۱۰ روپے	(۹) مابدولت
"	۳۰ روپے	(۱۰) قاضی جی من جئے
"	۱۰ روپے	(۱۱) دیگرہ دیگرہ
"	۱۰ روپے	(۱۲) مضامین شوکت
فراق گورکھپوری	۲۵ روپے	(۱۳) من آنم
محمد طفیل	۵۰ روپے	(۱۴) نیم نامہ
اختر انصاری دہلوی	۱۵ روپے	(۱۵) بلوہ شبانہ

ادارہ فروغِ اردو، ۱۱۔ ایک روڈ۔ انارکلی لاہور



عظمت شیخ

محمد طفیل

بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً سورج دن کو نکلے گا اور چاند رات کو۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عظمت شیخ کی تصویر کشی کا ہے۔ یہ جس تصویر کو بھی کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کریں گے وہ ضرور قابل ذکر ہوگی۔ جیسے غالب کی غزل، جیسے اقبال کا شعر!

کسی زمانے میں، میرے ہاتھ میں بھی کیمرہ تھا اور میں ٹمک ٹمک کرتا رہا۔ یہ مشغذہ برسوں استوار رہا۔ تصویروں سے گھر بھر گیا۔ اُن پرنتوں میں پاکستان اور ہندوستان کے اکثر ادیبوں کی تصویریں تھیں۔ اس لیے بظاہر آسان مگر مشکل ترین فن کا کچھ اتا پتا مجھے بھی ہے۔ نقوش کے لاہور نمبر میں بھی میری اتاری ہوئی کئی تصویریں چھپی ہیں۔ مگر جسے فن کہتے ہیں وہ بات کہاں تھی! یہی وجہ ہے کہ میں نے باوجود خاصا وقت بلکہ خاصے برس صرف کرنے کے بعد اس فن کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ کیونکہ کسی بھی فن میں، اگر کمال حاصل نہ ہو سکے تو ضروری نہیں کہ اُسے جان کا آزار بنایا جائے! میرے نزدیک جس شخص کے بارے میں کوئی کلمہ کہا جائے پہلے اس کو دیکھنا چاہیے۔ اس کے فن پر گفتگو بعد میں کرنی چاہیے۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ اپنی موج کے آدمی ہوتے ہیں مگر اس طرح فن کار کے فن پر دسترس حاصل کرنے میں کسر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ آدمی پہلے اور فن بعد کا شعبہ ہے۔ میں نے فن کو شعبہ کہا ہے۔ شاید زیادتی ہو مگر میرے نزدیک کمالی فن کی پہچان یہی ہے کہ وہ مبہوت کرے۔ کوئی سمجھنا چاہے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے اور یہ کہنے پر مجبور ہو کہ ایسا ہو نہیں سکتا تھا جو ہو گیا۔

عظمت شیخ نے اپنی زندگی کے منصوبوں کو ترتیب وار آراستہ کر رکھا ہے۔ ترجیحات مقرر کر رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی تصویریں اتاریں۔ اس کے بعد اپنے وطن کی۔ پھر دنیا بھر کے اسلامی آثار کی۔ آثار والی تصویریں ابھی منظر عام پر نہیں آئیں مگر آئیں گی ضرور! کیونکہ صادق جذبے حالات کو بچھاڑ دیتے ہیں۔

یوں پہلے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ پھر اپنے وطن کی شادابیوں میں کھو گئے۔ اس کے بعد عالم اسلام سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ اس طرح منزل بہ منزل چلیں گے کیونکہ کوئی بھی شخص پہلی منزل کے بعد تیسری منزل پر نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ اپنے قدم دوسری منزل پر نہ ٹکائے!

ان کی تصویروں میں کشش کیوں ہے؟ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے تمام تصویروں کو اپنے دل پہ اتارا، اس کے بعد کاغذ پر اُبھارا۔ درمیانی مرحلے جو ہیں انھیں میں اور آپ سمجھ نہ سکیں گے۔ یہی مرحلے بندے کو خدا کے نزدیک کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ہی فن میں یکسانی کی شان پیدا ہوتی ہے۔ عشق کی وارفتگی کو کوئی نہیں جان سکا۔ اس کی قوت کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ فن کو جانتے سے پہلے فن کار کو پہچاننا چاہیے۔ اُس سلسلے کا ایک اور واقعہ، ایک اور مکالمہ یاد آیا۔ میں لاہور میوزیم میں داخل ہوا کیونکہ وہاں شیخ صاحب کی حریم شریفین سے متعلق کھینچی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں۔ قبل ازیں میری ان سے کوئی ملاقات نہ تھی۔ نہ صورت دیکھی تھی نہ گفتگو سنی تھی۔

تصویریں دیکھیں تو دیکھتا رہ گیا۔ تصویروں نے پہلے حیران پھر مبہوت کر دیا۔ وہاں شیخ صاحب سے رسمی سی گفتگو ہوئی۔ دل کی بات کو زبان پر نہ لایا۔ میں عموماً دل کی باتوں کو زبان پر نہیں لاتا۔ خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ شیخ صاحب دوبارہ طے تو میں نے حرفِ مدعا کہہ دیا کیونکہ مجھ میں ضبط کا یا رانہ تھا۔ میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”میں دس پندرہ جلدوں میں نقوش کا رسول نمبر چھاپ رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ آپ کی تصویروں سے ان نمبروں کو آراستہ کروں!“

جواب: ”کتنی تصویریں چاہئیں؟“

میں گویا ہوا: ”میرا جواب آپ سن نہ سکیں گے، مجھے پچاس سے زیادہ تصویریں چاہئیں۔“

”یعنی میرا کل سرمایہ؟“

”جی ہاں!“

شیخ صاحب نے کچھ سوچا، دوچار سوالات کیے۔ اس کے بعد فیصلہ کر دیا۔ جواب یہ تھا: ”اگر یہ معاملہ عشقِ رسول کا ہے تو میرا سب کچھ حاضر ہے!“

یہ تقریب، شیخ صاحب کی تصاویر ”مناظرِ پاکستان“ سے متعلق ہے۔ میں نے آپ کو ادھر ادھر کی باتوں میں بہت الجھایا۔ اگر میں ادھر ادھر کی باتیں نہ کرتا تو میرا یہ ادھر ادھر اضمحون، مزید ادھر ادھر رہ جاتا۔ کیونکہ میرے نزدیک کوئی شخص، اپنے کسی ایک کارنامے پر بڑا آدمی نہیں بنتا بلکہ اس کے بڑے پن میں بے شمار ریاضتوں کی فیکری شامل ہوتی ہے۔

پاکستان ہی کے موضوع پر محمد امین کی کتاب ”جنتی تھرو پاکستان“ اور ”دی بیوٹی فُل پاکستان“ بھی ہے ان کی کتابوں کی اپنی خوبیاں ہیں۔ اس کتاب کی اپنی طرح داریاں۔ بڑے فن کار جو ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہمعصرین میں اپنی چند منفرد خوبیوں کی وجہ ہی سے ممتاز ہوتے ہیں۔ میں آپ کو اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔

میں نے خانہ کعبہ میں جا کر دیکھا کہ وہ ماحول اور وہ دنیا ہم سے بالکل ہی مختلف ہے۔ میں جب بھی خانہ کعبہ

میں داخل ہوا۔ مجھے فور ہی نور دکھائی دیا۔ اب اس نور کو کون اپنی تصویروں میں دکھاتا! اُس مرحلے سے بھی ایک فوٹو گرافر گزر گیا۔ فوٹو گرافر کا نام عظمت شیخ ہے۔ تصویر کا نام ”خانہ کعبہ کا ایک منظر“ ہے۔ اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے زاویے کی بات ہوتی ہے۔ میں ان تصویروں کو کسی اور زاویے سے دیکھوں گا، دوسرا کسی دوسرے زاویے سے۔ باور کیجئے کہ مجھے تو عظمت شیخ کی تصویریں تلاوت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

”منظر پاکستان“ کے نام سے جو شیخ صاحب نے کتاب پیش کی ہے وہ خوب ہے، دلکش ہے، دلاویز ہے، خوب صورت پاکستان کی خوبصورت عکاسی! پہاڑوں کے جلال کو جوں کا توں مقید کر دکھایا۔ بھیلوں کے جمال کو بعینہ اجاگر کر دیا۔ ملک کے چاروں صوبوں کے باسیوں کے رہن سہن اور رسم و رواج کو آنکھوں کے سامنے سجادیا غرض تاریخی عمارتوں کی تاریخ ساز تصویریں تائیں!

یہ کتاب قدرت کے حُسن اور فوٹو گرافی کے حُسن کا تقابلی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ کبھی قدرت کی فیاضیوں پر سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے، کبھی عکاس کی فنی مہارت پر مرجہا! یہ کتاب قدرت کی فیاضیوں اور فن کی باریکیوں کی داستان ہے جو حُسن اور سنانی جاسکتی ہے، جو دیکھی اور دکھائی جاسکتی ہے!

میرے نزدیک، بڑے فن کار کا فن عطیہ خداوندی ہوتا ہے۔ لازوال کاموں میں اگر قدرت کی تھپکی حاصل نہ ہو تو کوئی ادیب، کوئی مؤرخ کسی کے بھی فن پر ہمیشہ زندہ رہنے کی فکر نہیں لگا سکتا!

آئیے، میں آپ کو اپنی وادی میں لے چلوں، کتابوں کی دنیا میں، کیونکہ میں اسی ”جرم“ کی یاداشٹیں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔

میں نے عبدالرزاق کا نیوری کی کتاب ”البراکہ“ کو اٹھایا، وہ اہل علم اور اہل کمال کی قدروائیں سے بھری پڑی ہے۔ میں نے محمد حسین آزاد کی کتاب ”دربار اکبری“ کو اٹھایا وہ بھی اہل فن کے اعتراف سے مزین ہے۔ میں نے صباح الدین عبدالرحمان کی کتاب ”بزم تمغریہ“ کو اٹھایا۔ وہ بھی اہل کمال کی حوصلہ افزائیوں سے آراستہ ہے۔ اس کے بعد میں نے فردوسی کے شاہنامہ کی تخلیق کے بارے میں پڑھا۔ محمود غزنوی سے فردوسی کا یہ طے ہوا تھا کہ وہ فی شعر ایک اشرفی دے گا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ یہ انعام فردوسی کو مل سکتا۔ کیونکہ محمود غزنوی نے جب ساٹھ ہزار اشرفیاں روانہ کیں تو شہر کے ایک دروازے سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا، دوسرے دروازے سے اشرفیاں پھیں۔

اہل کمال کے سلسلے میں یہ مثال عظمت شیخ پر صادق نہیں آتی کیونکہ خدا نے انہیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔ فن کی دولت کے ساتھ من کی دولت بھی، پھر من اور فن کی دولت کے ساتھ بہت سے دنیاوی سگے بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقامات مقدسہ کی تصویر کشی کی وجہ سے ان کا معاملہ براہ راست ہے۔ بیچ میں کوئی دنیاوی بادشاہ نہیں! میں قلم کا مسافر ہوں۔ اگر میں حاکم وقت ہوتا تو انہیں سونے سے تول دیتا۔ انعام کا مسئلہ ضرورت کا مسئلہ

نہیں ہوتا بلکہ اعترافِ فن کا مسئلہ ہوتا ہے۔ چونکہ میں حاکمِ وقت نہیں ہوں صرف قلم کار ہوں، اس لیے انہیں سونے کے سے لفظوں سے تولنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر واسے افسوس کہ اس کی بھی قدرت نہیں رکھتا!

میری ان سے چند ملاقاتیں ہیں۔ مگر وہ چند ملاقاتیں انہی کی وجہ سے ہیں۔ جب بھی کویت سے پاکستان آتے ہیں تو خود ملنے میں پہل کرتے ہیں۔ اگر وہ پاکستان آئیں اور چپ چاپ واپس چلے جائیں تو ہمیں علم بھی نہ ہو۔ مگر وہ یہاں آتے ہی دوستوں کو ڈھونڈتے ہیں، اُن کی خیر خیریت پوچھتے ہیں۔ اگر ہم انہیں چائے یا ٹھنڈے پانی کے لیے پوچھیں گے تو وہی اگوتا جواب دیں گے، ابھی پی کے کیا ہوں، ابھی خواہش نہیں!

اگر آپ ان کے گھر پہنچ جائیں تو ان کا اصرار ہوگا یہ بھی کھائے وہ بھی کھائیے۔ اگر آپ کہیں گے کہ ابھی کھاپی کے آیا ہوں تو ان کا جواب ہوگا: پھر کیا ہوا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اتنا اصرار کریں گے کہ وہ نعمتیں خاصی پریشانی کا باعث بنیں گی!

یہ بھی ان کا نیکہ کلام ہے، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ یہ فقرہ ان کا رسمی نہیں ہوتا، خلوص دل سے نکلا ہوتا ہے۔ غرض جو کام بھی ان کے نیکہ کلام کی یاداش میں ان کے ذمہ کریں گے اسے دیرویر ضرور پورا کریں گے۔ دیرویر اس لیے ہو جاتی ہے کہ یہ اپنے ٹھکانے سے اکثر ادھر ادھر ہوتے ہیں۔ کبھی فن کے شوق میں، کبھی کاروبار کے سبب!

جیسے یہ دل کے اچھے ہیں ویسے ہی یہ صورتاً بھی خوش وضع ہیں۔ سفید سرخ رنگ جسے جلال پور جٹاں کا رنگ روپا نہیں کہا جاسکتا، اونچا لمبا قد، سفید بال، تجسس آنکھیں، متناسب جسم، غرض ایک بارعِ شخصیت، جو متاثر کرے۔ عموماً آرٹسٹ حضرات کی یہ ”شب“ یہ وضع قطع نہیں ہوتی۔ اللہ فی دیتا ہے تو ضروری نہیں کہ ڈھانچہ بھی ویسا ہی فراہم کرے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے دونوں خوبیوں سے نوازا۔

جو معاملہ ان کے دل کا ہے وہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوگا۔ ہر ایک کی مدد کرنا ان کا وظیفہ حیات ہے کبھی کبھی یہ بڑی آزمائشوں میں پڑ جاتے ہیں مگر اُن پر بھی پورا اترتے ہیں۔ ان کا خیال ہے جو کچھ ہمارے پاس ہے اس میں سب کا حصہ ہے۔

ان کے کچھ ایسے واقعات کا مجھے علم ہے۔ اگر میں انہیں بیان کر دوں تو ان کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہو۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس سے شیخ صاحب کو رنج ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنی خوبیوں پر چادر ڈال رکھی ہے۔ تاکہ کوئی دیکھ نہ لے، کوئی سونگھ نہ لے۔ اگر کوئی سونگھ یا دیکھ لے گا تو اس کی منتیں کریں گے خدا کے لیے اس واقعہ کا ذکر کسی دوسرے سے نہ کرنا!

ان کا دل بیدگداز ہے۔ ذرا سی دیر میں آنکھیں چمک جاتی ہیں۔ ایک اس موقع پر کہ جب ذکرِ رسولی ہو، دوسرے کسی کی بے بسی کے موقع پر!

یہ ان کی زندگی کے سیدھے سے واقعات ہیں، جنہیں میں نے سیدھے لفظوں میں بیان کر دیا۔ ورنہ انسان تو گورکھ دھندا ہے۔ اسے سمجھنا آسان مسئلہ نہیں ہوتا۔ آج کے تہہ درتہ انسانوں میں کسی ایسے شخص کا مل جانا کچھ کم عجب بے کی بات نہیں!

ایک دن اخبار میں پڑھا کہ شیخ صاحب اپنے دوستوں کے لیے لاہور کی فوٹو گرافی کریں گے۔ جو چند دنوں کے لیے وطن آیا ہوا اس کا لچر لچر مسئلے سے بندھا ہوتا ہے۔ والدین کے لیے، رشتہ داروں کے لیے، دوستوں کے لیے، ذاتی کاموں کے لیے، پھر ان لمحات میں فوٹو گرافی کے لیے وقت نکالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ میں نے اُن سے اس سلسلے میں بات کی۔ آپ نے ایک بار پھر لاہور کی فوٹو گرافی کے لیے وقت نکالا۔ بڑی بات ہے یہ۔

”کوئی بڑی بات نہیں!“

”بڑی بات تو ہے۔“

”دوستوں کی فرمائشوں کو پورا کرنا بھی تو انسانیت ہی کا ایک حصہ ہے!“

”اس انسانیت میں کتنا وقت صرف ہوا؟“

”ایک دن لگ گیا۔“

”اسے دوستانہ کھاتے میں ڈالیں گے یا کسی اور خانے میں؟“

اسے میرے شوق کے خانے میں ڈال لیے، میں دوستوں کی خدمت کو نماز روزے کی ادائیگی جیسا مسئلہ، یا

اس سے تھوڑا سا کم درجہ دیتا ہوں۔ پھر میرا شوق پورا ہوا۔ دوست بھی خوش، میں بھی خوش!!

محمد طفیل، میرا دوست

رشید اختر ندوہ

جولائی ۱۹۳۸ء کی کوئی بھی سات یا آٹھ تاریخ تھی، جب میں تھوڑی مدت پہلے حمایتِ اسلام مہنت دار اخبار کا چودھری محمد حسین مرحوم کی لگا ہوا ششماہی کے سبب ایڈیٹر مقرر ہوا تھا۔ ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی اور میں حضرت حفیظ جالندھری کے پاس ماڈل ٹائوی میں رہتا تھا کہ شام کے سات بجے کے قریب حفیظ صاحب نے ملنے کے لیے دونوں، لطیف فاروقی اور محمد طفیل ان کے مکان پر آئے۔ دونوں میری طرح ملبے پتلے، شرمیلے اور انہیں بچے کے باتیں کرنے والے تھے۔ انہوں نے مجھ ہی سے پوچھا۔

حضرت حفیظ جالندھری گھر پر ہیں۔

میں نے جواب دیا :

ہیں تو سہی مگر سو رہے ہیں، آٹھ بجے آئیں گے۔

مجھے یاد نہیں یہ محمد طفیل نے یا لطیف فاروقی نے مجھ سے اجازت چاہی کہ کیا اس وقت تک وہ میرے پاس بیٹھ سکتے

ہیں، جب تک حضرت حفیظ جالندھری بیدار رہیں۔

میں نے انہیں اجازت دے دی کہ یہ دونوں ملبے پتلے نوجوان مجھے بہت اچھے لگے۔

پھر مجھ میں اور ان میں تعارف ہوا، اور یہ تعارف کچھ کس انداز میں ہوا کہ جب ان دونوں نے مجھے دعوت دی، کہ کل دوپہر کا کھانا میں اور حضرت حفیظ جالندھری لطیف فاروقی کے گھر میں لوہاری دروازہ کے اندر کھائیں تو میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کی طرٹ دکھیا۔ ان دونوں کے چہروں پر عجیب مصدمیت جھلک رہی تھی۔ وہ دونوں مجھے اچھے لگے۔ اور جب حفیظ صاحب سونے کے کمرے سے اٹھ کر باہر باغیچہ میں آئے اور ہم تینوں ان کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان دونوں نے حفیظ صاحب کو فرشتی سلام کیے تو میں بہت حیران ہوا اور میں نے بڑے تعجب سے ان سے کہا۔

لکھنؤ اور دہلی میں تغلیب پاکر تو میں آیا ہوں اور فرشتی سلام تم کو رہے ہو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، محمد طفیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر طبری بے باکی سے کہا :

کیا زبان کی طرح مودبانه آپ بھی لکھنؤ اور دہلی کی اجارہ داری ہے ؟

تو حفیظ صاحب بہت خوش ہوئے اور ان کی یہی خوشی تھی، جس کے باعث وہ دوسرے دن دوپہر کو لطیف

فاروقی کے ہاں کھانا کھانے کے لیے لوہاری دروازہ کے اندر تشریف لے گئے۔

پھر اکثر ایسا ہونے لگا کہ محمد طفیل، لطیف فاروقی اور میں لطیف فاروقی کے ہاں اکٹھے ہوتے۔

یہاں تک کہ سلسلہ میں اردو کے مثال واقع لوہاری دروازہ نے میرا پہلا ناول ساز شکستہ چھاپا اور میری رہائش کے لیے لوہاری دروازہ میں ایک دو کمرے کا مکان کرایہ پر لیا۔ یہیں محمد طفیل نے ایک بڑے خوش لوہی کی شاگردی اختیار کی۔ میں اس وقت شہباز اخبار میں نیوز ایڈیٹر تھا۔ مجھ میں اور محمد طفیل میں ایسا رشتہ استوار ہوا کہ جب تک سلسلہ میں اخبار شہباز زندہ نہیں ہوا، اور میں نے دہلی کا سفر اختیار نہیں کیا، محمد طفیل اور میں روزانہ ایک دوسرے سے ملنے۔ کبھی ناغہ نہ ہوتا۔

دہلی پہنچ کر میں نے اخبار انصاری کی ایڈیٹری اپنے ذمہ لے لی اور محمد طفیل سے میرا رابطہ کٹ گیا۔ دہلی سے میں سلسلہ کے آخر میں بمبئی چلا گیا۔ اگست ۱۹۷۷ء میں پھر لاہور آنا ہوا، تو جس شخص کے پاس میں سب سے پہلے پہنچا وہ یہی محمد طفیل تھے جو اب ایک دارالاشاعت ادارہ فروغ اردو کے مالک تھے اور ایک روڈ پران کا دفتر تھا۔ چھ سال کے وقفے نے گو دونوں کو خاصا بدل ڈالا تھا۔ لیکن جب گھسے لے تو ایسا لگا جیسے کبھی بچڑے ہی نہ تھے۔ اس وقت میں ٹٹا ٹپا بمبئی سے آیا تھا اور میرے پاس سوائے پندرہ اگست ناول کے مسودہ کے جو میں نے کچھ ہفتے پہلے مکمل کیا تھا، میرے پاس کچھ نہ تھا۔

محمد طفیل نے جنہیں میں اب طفیل صاحب کہہ رہا ہوں شیخ عبدالسلام، علامہ الدین اور ملک مبارک کو اپنے دفتر میں چائے کی دعوت دی اور میرے ناول ۱۵ اگست کو چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ یہ انہوں نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ انہوں نے پندرہ اگست اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کوئی دس ہزار کی تعداد میں چھاپا اور مجھے اتنی رائٹنگ دی کہ میں نے لاہور کی بجائے کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔

محمد طفیل کا نقوش اس وقت ابتدائی مراحل میں تھا۔ طفیل صاحب کی حدودِ محنت، ذہانت، معاملہ فہمی تھی کہ نقوش نے جو ترقی اور جواہرِ خدمت، ان کی وفات کے دن تک کی، پاکستان اور ہندوستان کا کوئی دوسرا ادبی پرچہ نہیں کر سکا۔ یہ ایک بڑی حقیقت ہے اور اسے کوئی بھی ادیب یا پبلشر ٹھٹھا نہیں سکتا کہ محمد طفیل جیسے ذہین، طبائع، معاملہ فہم ایڈیٹر، ان کے سوانہ ہندوستان میں پیدا ہونے اور پاکستان میں۔

بہت بڑے بڑے لوگوں نے، ادبی رسالے نکالے ہیں۔ مگر جس استقلال، پامردی، ہمت، دلیری اور محنت سے محمد طفیل صاحب نقوش نے اپنے پرچے کو منزل بہ منزل آگے بڑھایا اور اسے ایک عظیم ادارہ کی شکل دی، مجھے ان بڑے لوگوں میں اوّل کوئی دوسرا نظر نہیں آ رہا۔

مجھے ان بڑے لوگوں کی گستاخی ماحشا و تلامذہ مطلوب نہیں ہے، ان میں میرے کئی محسن اور اُستاد تھے۔ ان میں کئی اردو ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مگر محمد طفیل جو بھاٹی دروازہ کے اندر کی ایک چھوٹی سی گلی کے اندر کارہنہ والا تھا، سجدہ اللہ سے بازی لے گیا۔

میرا یار طفیل

(ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جیسے)

جگنے ناتھ آزاد

یہ، رجولائی کی بات ہے۔ میں نے طفیل کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا :

برادر عزیز، السلام علیکم
آپ کے پہلے عنایت نامے کی رسید اور مکمل جواب میں نے دے دیا تھا، خاص نمبر کے بارے میں اپنی رائے کا بھی اظہار
کر دیا تھا۔ اُمید ہے کہ مفصل خط موصول ہو گیا ہوگا۔

اس کے بعد اگلے دن آپ کا ایک اور عنایت نامہ ملا جس میں آپ نے اطلاع دی کہ خاص نمبر سے پہلے ایک عام نمبر
بھی زیر ترتیب ہے۔ آپ نے اس کے لیے مقالے کی فرمائش کی تھی۔ ایک غیر مطبوعہ مقالہ رف لکھا ہوا موجود تھا۔ میں نے
سوچا پہلے مقالہ صاف کر لوں تو اس کرم نامے کی رسید دوں۔

مقالہ اب قریب قریب صاف ہو چکا ہے۔ دو ایک دن میں اس خط کے ساتھ ڈاک کے حوالے کر دیا جائے گا
زیر تصنیف کتاب ”روداد اقبال“ کا ایک غیر مطبوعہ باب ہے۔ ابھی تو ساری کتاب ہی غیر مطبوعہ ہے۔
یہاں اتنی ضخیم کتاب ہزاروں صفحات پر مشتمل، کون چھاپے گا، اس لیے آپ اس باب کو اطمینان سے
چھاپے ان شاء اللہ یہ مدقل غیر مطبوعہ ہی رہے گا۔

اس دوران میں آپ کا خوبصورت عید کارڈ ملا۔ سراپا سپاس ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ مجھے اکثر
یاد کرتے رہتے ہیں۔

ہاں ایک خط میں آپ نے لکھا تھا کہ نقوش ہی کے بارے میں ”نقوش“ کا ایک خاص نمبر شائع ہو رہا ہے،
یعنی ”نقوش“ کا نقوش نمبر۔ اس کے لیے آپ نے مجھ سے میرے پسندیدہ موضوع پر لکھنے کی مٹرائش کی
تھی۔ میں اس خاص نمبر کے لیے ”نقوش“ کے اقبال نمبروں پر کھوں گا۔ آپ مجھے اذرا و کرم یہ بتائیں کہ کس تاریخ
تک یہ مقالہ آپ کو مل جانا چاہیے۔

فردی میں ایک خط میں میں نے آپ کو لکھا تھا کہ بحرین میں ”نقوش“ کا ایک شمارہ دیکھا جو مجھے ابھی تک
نہیں ملا۔ اس کا مہینہ اور سال تو یاد نہیں لیکن بہت پرانا نہیں ہے۔ گزشتہ دو ایک برس ہی کا ہے۔

پہچان یہ ہے کہ اس میں میری بہت سی غزلیں ہیں۔ اس کا مجھے انتظار ہے۔
 اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔
 بھابی کو آداب، بچوں کو پیار اور دُعا
 نیاز مند
 گلشن ناتھ آزاد

پس نوشت :-

خط کشیدہ حصے کے جواب کا انتظار رہے گا
 آزاد

چونکہ مضمون مکمل طور پر ابھی تک صاف نہیں ہو سکا تھا، اس لیے سوچا کہ دو ایک دن تک جب مذکورہ مضمون (کمپوز) میں اقبال جیسے اساتذہ صاف ہوجائے گا تو یہ خط اور مضمون دونوں اکٹھے ان کو بھیج دوں گا۔
 رات کو حسبِ معمول میں اور میری بیوی پاکستان ٹیلیوژن دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک اعلان ٹیلیوژن پر آیا :
 محمد طفیل کی یاد میں

کلمات دل بچ کر دس منٹ پر

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بیوی نے میرے چہرے کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا یہ کون محمد طفیل ہے؟
 میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا، لیکن میرا خیال اپنے دوست محمد طفیل کی طرف تھا۔ میری بیوی میرے دل کی کیفیت بھانپ گئی۔ بول خدا نہ کرے یہ آپ کے دوست محمد طفیل ہوں۔ میں اب بھی خاموش تھا۔ جیسے میری فوت گشتا رسل ہو گئی ہو بیوی نے بات جاری رکھی اور کہنے لگی کہ پاکستان ٹیلیوژن میں باقاعدہ دیکھتی ہوں۔ گھر میں پاکستان کے اخبارات اور رسائل بھی آتے ہیں۔ میں نے کسی اور طفیل محمد کا نام کہیں نہیں دیکھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر میں پاکستان سے نیشنل بک اپ پر خبریں نشر ہوں گی۔
 اُن خبروں سے تفصیل معلوم ہو جائے گی۔

اے پاکستان ٹیلیوژن کا معاملہ یہ ہے کہ میں اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود پاکستان ٹیلیوژن کا ڈراما دیکھنے کے لیے وقت نکال لیتا ہوں، اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن کا ڈراما ہندوستانی وقت کے مطابق ساڑھے آٹھ یا نو بجے ٹیلی وژن پر آتا ہے۔ کھانے کا وقت ہم لوگوں نے وہی طے کر رکھا ہے۔ ہم دونوں (میں اور میری بیوی) ساڑھے آٹھ یا نو بجے، جو بھی ڈرامے کا وقت ہو (کھانا ٹیلی وژن والے کمرے میں لگا لیتے ہیں۔ ڈراما اور کھانا دونوں کے ختم ہوتے ہی میں اپنے کمرے میں اپنا کھنٹہ پڑھنے کا کام کرنے چلا جاتا ہوں اور میری اُسی کمرے میں جب تک اُن کا جی چاہے ٹیلیوژن دیکھتی رہتی ہیں۔

ملاقات ہو گئی تو علیک سلیک مزد ہوتی تھی، لیکن مراسم اس سے آگے نہیں بڑھے اور اُس وقت مجھے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ایک وقت ہم دونوں میں دو مئی کا رشتہ قائم ہو جائے گا اور وہ بھی اُن حالات میں جب کہ تقسیم ملک کے بعد میں لاہور چھوڑ کر دہلی آ جاؤں گا اور طفیل بدستور لاہور ہی میں رہیں گے۔

در اصل رشتہ مودت کی استواری میں میرے پاکستان کے سفروں کو بھی خاصا دخل ہے۔ جن کی ابتدا ۱۹۵۸ء ہی سے ہو گئی تھی اور ۱۹۵۹ء تک جن کی تعداد اتنی زیادہ رہی (اور خدا کے فضل و کرم سے اب بھی کچھ کم نہیں ہے) کہ احباب لاہور کے ساتھ میرے مراسم کا رشتہ کبھی منقطع نہ ہونے پایا۔

(۳)

محمد طفیل کا نقوش ۱۹۵۸ء میں شروع ہوا تو اُس کے اولین ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی تھے۔ اُن کے ساتھ شاید نائب مدیر کے طور پر اجروہ سرور کا نام آتا تھا طفیل اُس زمانے میں نقوش کے منجربا منتظم تھے لیکن میرے ساتھ اُن کی خط و کتابت کا سلسلہ اسی زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔

کچھ مدت بعد نقوش اپنی ترقی پسندانہ پالیسی کے باعث حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا اور بند ہو گیا۔ ایک دھ برس کے بعد جب یہ جاری ہوا تو محمد طفیل خود اس کے ایڈیٹر بن گئے۔ اس وقت تک ان کی دکان ادارہ فروغِ اُردو اچھی چل نکلی تھی اور انھوں نے کتابیں خاصی تعداد میں چھاپ لی تھیں۔ غالباً تو کت نصابی کی تصانیف کا پورا سیٹ انھوں نے چھاپا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک خود مصنف کے طور پر منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔

لاہور سے دہلی ہجرت کے بعد میرا لاہور کا پہلا سفر ۱۹۵۸ء ہی میں ہوا۔ اُس سفر میں طفیل سے ملاقات نہ ہو سکی۔ یوں تو لاہور کاٹن مزن کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ہلالی لالہ پور جاتا رہا اور لاہور سے ہو کر، لیکن طفیل سے بھرپور ملاقات ۱۹۵۹ء میں ہوئی لاہور کے ایک مشاعرے میں۔ یہ مشاعرہ بونیورسٹی ہال میں منعقد ہوا۔ سید عابد علی عابد مرحوم کی صدارت میں۔ مجھے اس مشاعرے کی زیادہ باتیں یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ بچم احمد شجاع بھی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ انھوں نے بھی اپنا کلام پڑھا۔ میں جب مشاعرہ گاہ میں داخل ہوا تو اُستاد محترم سید عابد علی عابد بڑی محبت سے میرے ساتھ بٹنگیر ہوئے اور مجھے ڈانس پر حکیم احمد شجاع کے ساتھ ہی جگہ ملی۔ میں جب اپنی کرسی پر بیٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب صدر کی کرسی کے پیچھے ڈانس پر محترم طفیل صاحب

سے ادارہ فروغِ اُردو سے یاد آ یا کہ اسی نام کا ایک ادارہ کھنڈ میں بھی ہے۔ مجاز مرحوم لاہور گئے، طفیل سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ طفیل کی طبیعت میں مزاح تو تھا ہی کہنے لگے، مجاز صاحب سنا ہے کہ کھنڈ میں ایک ادارہ ہے جن کا نام ہے ادارہٴ دروغِ اُردو۔ مجاز کہاں چوکے والے تھے۔ فوراً ہی انھوں نے کہا کہ دروغِ برگردنِ لادوی اور راوی لاہور میں ہے۔

۱۹۵۹ء اگرچہ اس مشاعرے کو آج بیستیس برس سے زیادہ ہو گیا ہے لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اس میں اپنی طویل نظم ”وطن میں اجنبی“ کا ایک مختصر سا حصہ ”بازگشت“ پڑھا تھا اور ان اشعار پر اُستاد محترم سید عابد علی عابد نے خاص طور سے داد دی تھی۔

بیٹھے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر اپنی کرسی چھوڑان کے پاس جا بیٹھا۔ اور مشاعرے کے خاتمے تک ان کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ وہ بعض شعراء کے کلام پر فقرہ بازی بھی کرتے رہے لیکن سرگوشی کے انداز میں اور ڈانس پر بھی کسی کو اس بات کا احساس نہ ہوا۔ دوسرے دن میں ان کی دکان دار دارہ فروغ اردو ایک بڑا لاہور پران سے ملنے گیا۔ دیر تک باغیچہ میں رہیں۔ انہوں نے اپنی مطبوعات سے مجھے لاد دیا اور ساتھ ہی مٹھائی کا ڈبہ دینے ہوئے کہا کہ تمہیں تو ہم لاہور سے اس طرح رخصت کرتے ہیں جیسے بیٹی کو گھر سے رخصت کیا جاتا ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے بھی لوگوں نے اس جملے پر قہقہہ لگایا اور بعض افسردہ خاطر ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس جملے میں افسردہ خاطر کا پہلو بھاری تھا۔

(۴)

اب مجھے ہر واقعہ کی صحیح تاریخ نو یاد نہیں لیکن قاری ان واقعات کے پیش نظر کسی حد تک تاریخوں کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ شاید نقوش کو جاری ہوئے دن برس ہوئے تھے کہ طفیل صاحب نے نقوش کا دس سالہ جشن منانے کا پروگرام بنایا۔ مجھے اس سلسلے میں انہوں نے لکھا کہ اس موقع پر ایک مخصوص شعری نشست منعقد کرنے کا ارادہ ہے (مشاعرہ نہیں) آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ میں جابنا ہوں ہندوستان سے جوش صاحب، فراقی صاحب اور آپ آئیں۔ جوش صاحب اور فراقی صاحب کو میں پانچ پانچ سو روپیہ دے سکوں گا۔ آپ کو کچھ نہیں دلے گا۔ لیکن ان دونوں کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ غالباً اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ یہ میری آبرو کا سوال ہے۔ میں نے جوش صاحب سے بات کی۔ انہوں نے پانچ سو روپیہ پیشے ہی ناکہ کھڑکی۔ اور کہا پانچ سو روپیہ میں نہیں جانا، انہوں نے عرش سے مشورہ کیا۔ عرش نے بھی عدم شرکت کے حق میں رائے دی۔ عرش بھی شاعر تھے۔ مشاعروں کے شاعر۔ جن مشاعرے میں وہ خود مدعو نہ ہوں۔ اس میں وہ جوش کی شرکت کا مشورہ کیسے دے سکتے تھے اور جوش صاحب کو پانچ سو روپیہ پر آمادہ کرنا میرے لیے نامی ایک مشکل کام تھا۔ اور میں طفیل پر یہ طے لگانا بھی چاہتا تھا کہ جوش صاحب پانچ سو روپیہ پر آمادہ کر سکتا ہوں میرے لیے بھی یہ آبرو کا سوال تھا۔ فراقی صاحب الا آباد میں تھے۔ انہیں میں نے خط لکھا۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے۔ خط میں انہوں نے لکھا، طفیل کو کھوکھو الا آباد سے وہی تک اور وہی سے الا آباد تک کا طیارہ سے کراہیہ اور وہی میں قیام و طعام کے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔ میں نے فراقی صاحب کو لکھا کہ الا آباد سے وہی تک طیارہ سے کی سروس تو نہیں ہے۔ میں یہ غلط بات طفیل کو کیسے لکھ سکتا ہوں، اور

لے طفیل صاحب کا متاعوں میں جا کے بیٹھنے کا شوق زیادہ عرصے تک نہ رہا۔ بعد میں تو انہوں نے شاعروں میں جابنا یعنی شاعر بننے کا فعل بالکل ترک کر دیا۔ لے طفیل کے خطوط جن کی تعداد خاصی زیادہ ہے میرے پاس محفوظ ہیں لیکن ان خطوط کے اسرار فائوں میں بند ہیں اور فائوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس وقت ان کے خطوط تلاش کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ لیکن چونکہ میں اپنے پاس رکھے ہوئے تمام خطوط انجن ترقی اردو (مہند) کے حوالے کر رہا ہوں اور وہاں ان خطوط کی باقاعدہ فہرستیں بنائی جا رہی ہیں اس لیے دو تین برس تک ان شاء اللہ ایسی صورت ہو جائے گی کہ میرا خطوط کا یہ خزانہ اندک سمیت اردو کے ہر اس شائق کی دسترس میں ہوگا جو ان خطوط کو دیکھنا چاہے گا یا ان پر کام کرنا چاہے گا۔

جہاں تک دہلی میں قیام و طعام کا تعلق ہے آپ جب دستور میرے مہمان ہوں گے آپ ہر حالت میں آئیں گے ریل سے اور اگر آپ کیں تو ریل کا کرایہ آمد و رفت کا میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ یہ چھوٹی سی بات میں طفیل صاحب کو نہیں کھوسکتا۔

گویا فراق صاحب کا مسئلہ تو حل ہو گیا اور یہ مسئلہ کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ فراق صاحب پاکستان بہت کم بلائے گئے ہیں۔

ہندوستان کے شعراء میں پاکستان کے لیے مقبول ترین شاعر جگر تھے۔ نہ جوش نہ فراق۔ ویسے جوش کا ڈنکا اُس زمانے میں بہت زیادہ تھا۔ اور ابھی تک فراق کا قد یوسف زلف کے دیباچے اور حسن عسکری کی تحریروں کے باوجود کم از کم ہندوستان میں جوش اور جگر کے مقابلے میں کوٹا تھا۔ فراق کو جو اس بات کی شکایت ممتی تھی۔ انھوں نے خود مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ ان مسئلوں

کو دیکھو یہ مجھے مہربم سمجھتے ہیں۔ چونکہ یہ بات انھوں نے بغیر کسی سیاق و سباق کے کہی تھی اس لیے میں نے سمجھا کہ کیا کہہ رہے ہیں اور یہی

ان کا طریقہ تھا۔ ناستتہ کے بعد کمرے میں چل فڈمی کر رہے ہیں ریگریٹ کے لمبے لمبے کس لے رہے ہیں سوچ میں غرق ہیں کہ چانک

ان کی زبان سے یہ یہ جملہ سننا ہوں "ان مسئلوں کو دیکھو مجھے مہربم سمجھتے ہیں" میں نے کہا میں نہیں سمجھا۔ انھوں نے میری بات سنائی

کردی اور اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا کہ "یہ مجھ سے کہتے ہیں آئیے مہربم صاحب تشریف لائیے" اب میں بات کی تہ تک پہنچ

گیا۔ اور میں نے کہا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کے سامنے منہ سے ایسا کون کہہ سکتا ہے کہ آئیے مہربم صاحب تشریف لائیے۔ یہ کوئی

کہنے کی بات ہے۔ کہنے لگے ان کے دل میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ منہ سے یہ چاہے ایسا نہ کہیں۔ میں نے کہا۔ فراق صاحب، یہ ہندو یا

مسلم کی بات نہیں ہے۔ ادب اور شاعری میں پرانی تدریوں کا حامل جو طبقہ ہے خواہ وہ ہندوستان میں ہے خواہ پاکستان میں اُس کے نزدیک جوش اور جگر کا مرتبہ آپ سے بلند ہے۔ لیکن YOUNGER GENERATION جو پرانی اقدار سے بیزار

ہے اور شاعری میں نیا بن اور ننگنگی دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کے نزدیک آپ کا مرتبہ آج کے تمام شعراء سے بلند ہے۔ یہی

YOUNGER GENERATION اکل ادب میں عادی ہو گئی۔ اُس وقت آپ کو جوش اور جگر سے ہنر نام

سمجھا جائے گا۔ اب دیکھتے آج، غزل کے ارجو عناصر کا ذکر اکثر ہوتا ہے۔ اس ہنرست میں فانی، حسرت، اصغر اور جگر کے

نام لیے جاتے ہیں۔ فراق اور یگانہ کا نام کوئی نہیں لیتا۔ حالانکہ فراق اور یگانہ کے بغیر غزل کا ذکر مکمل ہی نہیں ہے جس قدر غزل

کی یہ لوگ بات کرتے ہیں وہ چارستونوں پر نہیں بلکہ چھستونوں پر قائم ہے۔ یہ تو صرف نئی اور پرانی اقدار کی بات ہے۔

ہندو یا مسلمان کی بات نہیں۔

فراق صاحب سے جواب نہ بن پڑا لیکن یہ کیسے تسلیم کرتے کہ ان کے مقابلے میں کوئی معقول بات بھی کہہ سکتا ہے چنانچہ

پیلے ٹوٹا انھوں نے گریٹ کا ایک لمبا کش لیا، پھر مجھے ڈانٹ کے چپ کر دیا۔ یہ کہہ کے کہ تم انھیں نہیں جانتے میں جانتا

ہوں لیکن دل میں انھیں اس بات کا یقین رہا ہو گا کہ ان کا تجزیہ غلط ہے اور میرا صحیح۔

حیرت میں بات طفیل صاحب کی شعری نشست کی کر رہا تھا تو اس شعری نشست کی تاریخ مقررہ

سے بہت دن قبل فراق دہلی آ گئے۔ صبح صبح انھیں اسٹیشن پر لینے گیا۔ آپ شاید تھرڈ کلاس یا انٹر کلاس

کے ٹوہے سے برآمد ہوئے تھے۔ انھیں گھر لے گیا۔ وہاں ہنہ دھوکے تیار ہو کے ہم لوگ دستل سب سے دفتر

ہینچے۔ جوش صاحب فراق صاحب کو دیکھ کے باغ باغ ہو گئے۔
فراق صاحب کے دس بارہ روز قبل دہلی پہنچنے کا ایک نامزدہ یہ ہوا کہ انہوں نے جوش صاحب کو لاہور جانے پر آمادہ کر لیا۔ میں اس بات سے بہت خوش تھا طفیل نے میرے ذمے بہت مشکل کام لگا دیا تھا اور یہ شکل میری کوشش سے آسان نہیں ہو رہی تھی۔ فراق صاحب کی کوشش سے یہ آسان ہو گئی۔ مجھے یہ خوشی تھی کہ طفیل کے سامنے اب میری ٹیکہ نہیں ہوگی اور میں ڈینگ مار سکوں گا کہ مجھے واقعی جوش صاحب کا قرب حاصل ہے اور میں ان کی مرضی کے خلاف ان سے فیصلہ کر سکتا ہوں۔ لیکن دراصل مجھے برخاستہ ذرا کہ ہر کتنا ہے جوش آخری وقت پر غچہ دے جائیں، کیونکہ پانچ سو روپے پر جوش کا لاہور جانا مجھے ذرا انہرانی سی بات نظر آرہی تھی۔

خبر اب آگے سینے ————— اپنی دنوں میں غالباً جنرل ایوب خان کی حکومت آگئی اور پاکستان میں مارشل لا لگ گیا۔ شاید اس خصوصی نشست کے اندر مشاعرہ جیسا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا انقضا مشکل ہو گیا۔ اب طفیل کا مجھے تار ملا کہ مارشل لا کے باعث خصوصی نشست منسوخ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے یہاں فراق صاحب کو دکھایا۔ وہ تو اسے ٹھٹھنے ہی آگ لگا لگا ہو گئے اور کھنکھارے ہو کر طفیل کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے ہزار کہا کہ اس میں طفیل صاحب کی کیا خطا۔ ملک بھر میں مارشل لا لگ گیا ہے اب اس طرح کے جلسے، مشاعرے وغیرہ کچھ مدت کے بعد ہی شروع ہو سکیں گے۔ شروع میں تو فوج جب حکومت سنبھالنی ہے تو جلسے جیسے سب بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کا منہ بدستور رہا اور اسی غصے کے عالم میں انہوں نے کہا کہ طفیل کو لکھو کہ اس وقت تک فراق صاحب کا دہلی کے سفر میں آٹھ سو سو روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ یہ روپہ مجھے ملنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ دوں گا، آپ مطمئن رہیں اور یہ روپہ آپ کو مل جائے گا۔ اس زلے میں آٹھ سو سو روپے بڑی رقم تھی اور فراق صاحب کا خرچ اس کا دسواں بانڈر حوالہ حصہ بھی نہیں ہوا ہوگا۔

دوسرے دن دفتر بار میں نے جوش صاحب کو طفیل کا تار دکھایا۔ جوش تار پڑھ کے بہت خوش ہوئے۔ دراصل وہ اس خصوصی نشست میں شرکت کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ پتی کے بھاگوں جھیکا ٹوٹا۔ جوش کی جان میں جان آئی۔

وہاں سے اٹھ کے فراق میرے ساتھ میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے کہ ابھی طفیل کو خط لکھو۔ میں نے کچھ آئیں باتیں سنائیں کہ لکھ دوں گا۔ ہر دو لکھ دوں گا لیکن فراق کہاں ملنے والے تھے۔ کہنے لگے تم لکھو۔ میں تمہیں لکھواتا ہوں۔ یہ خط تمہاری طرف سے ہوگا۔ اور انہوں نے لکھواتا شروع کر دیا۔

اس خط میں طفیل کو برا بھلا کہنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور یہ خط میری طرف سے تھا۔ فراق صاحب نے یہ جملہ بھی لکھوا دیا، کہ میں تمہیں روپے سے جاتا ہوں، تم کہتے ہو ذلیل ہو، وغیرہ وغیرہ۔

اب ادھر تو میں یہ خط لکھ رہا تھا اور ادھر میری روح فنا ہو رہی تھی کہ اگر یہ خط ایڈیٹر جس میں ڈال دیا گیا تو میرا کیا شرم ہوگا

اس میں یہ بھی تھا کہ الہ آباد سے دہلی تک اور دہلی میں قیام کے سلسلے میں فراق صاحب کا اتنا روپیہ خرچ ہو چکا ہے (بہروپیہ اس وقت تک ایک ہی دن میں) آٹھ نو سو سے بڑھ کر ہزار سو اہزار تک پہنچ گیا تھا، اس کا کون ذمہ دار ہوگا.....

جب اس طرح کی لغویات سے لبریز خط مکمل ہو گیا تو اُن کا حکم ہوا کہ اسے لفافے میں بند کر دیا اور پتہ لکھو میں نے دونوں ارشادات کی تعمیل کی۔ لیکن دراصل میری حالت یہ تھی کہ خط : کا تو لہو نہیں بدن میں، اور میں یہ فیصلہ کرنے پر بھی تیار ہو چکا تھا کہ پہلے تو انہیں سمجھاؤں گا کہ ایسا خط نہیں جانا جاوے اور اگر وہ نہ مانے تو میں اس خط کو چاک کر دوں گا۔ اس کے بعد جو ہوسو سو۔ فراق کی کس کے ساتھ لڑائی نہیں ہوتی میرے ساتھ بھی ہو جائے گی تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔

اب لفافہ بند ہو گیا۔ اس پر پتہ لکھا گیا۔ فراق صاحب نے خود ہی چٹراسی کو آواز دی۔ وہ اندر آیا۔

یہ ایک عجیب لمحہ تھا۔ لیکن ہر شخص کی عزت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ فراق صاحب کے ہاتھ میں ہوتی تو کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہیں تھی، مذکورہ لفافہ میرے سامنے دکھا تھا۔ دو چار لفافے اور بھی رکھے تھے جو ڈاک میں میرے نام آئے تھے اور ابھی تک بند تھے۔ میں نے اصل لفافے کو نظر انداز کر کے اُن میں سے ایک لفافہ اُٹھا کے چٹراسی کو سے دیا۔ ڈاک میں ڈال دوں اس یقین کے ساتھ کہ اس پر تو میرا نام تپا لکھا ہے یہ تو مجھے کل کی ڈاک میں پھر آئے گا۔ چٹراسی وہ لفافہ لے کے چل دیا اور فراق صاحب مطمئن ہو گئے کہ آزاد کا گائیوں بھرا خط طفیل کے نام، طفیل کو مل ہی جائے گا۔ میں اپنی جگہ مطمئن تھا کہ بلا مل گا۔

اب فراق صاحب نے کیا کیا۔ رات کو تنہائی میں بیٹھ کر طفیل کے نام ایک خط لکھا کہ آزاد بڑا ضرب آدمی ہے وہ نہیں گالیاں دے رہا ہے اور اس نے تمہیں میرے روکنے کے باوجود ایک بہت سخت خط لکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اُس زمانے میں فراق صاحب کے خطوط "نقوش" میں چھپ رہے تھے۔ یہ خط بھی چھپ گیا ہے دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا اور میں نے طے کر لیا کہ میں فراق صاحب سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لوں گا، لیکن فراق صاحب کی شخصیت میں بعض خوبیاں ایسی بھی تھیں کہ اُن سے قطع تعلق کرنا آسان بھی نہیں تھا۔ اُس سے قطع تعلق کے معنی تھے اچھی گفتگو سے محروم رہنا۔

کچھ مدت کے بعد ملتان میں ایک مشاعرہ تھا، ہندوستان سے اُس مسافرے میں صرف میں ہی مدعو تھا۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ جب پاکستان جاتا تھا اور بالخصوص جب لاہور سے گزرتا ہوتا تھا تو طفیل کو لکھ دیتا تھا کہ یہاں سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہیے۔ طفیل اُس زمانے میں نوما استعمال کرتے تھے، شاید وہ پاکستان میں نہیں ملتا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ نوما ہی کی فرمائش کرتے تھے۔ اب کے بھی اُنہوں نے نوما ہی کی فرمائش کی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں دہلی سے امرت سرنگ دہلی سے جا رہا تھا۔ امرتسر سے لاہور تک سڑک کے ذریعے سے اور لاہور سے ملتان تک پھر ریل سے۔ لاہور سے ملتان تک ریزرویشن کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں سکا تھا کیونکہ دفتر سے چھٹی لینے میں دیر ہو گئی تھی اور ریزرویشن کے بارے میں ملتان کے منتظیل مشاعرہ کو میں خط نہیں لکھ سکا تھا۔ چنانچہ میں

لے فراق صاحب کے اس خط کی عبارت مجھے یاد نہیں، لیکن یہ خط چونکہ "من آئم" میں چھپا ہے اس لیے تفصیلی طور پر عبارت اُس میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نے طفیل کو لکھا کہ میں بس اسٹیڈ سے سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچوں گا۔ آپ میرے لیے لاہور سے ملتان تک کی ریزرویشن کروالیں اور ٹکٹ مجھے لاہور ریلوے اسٹیشن پر دے دیں۔ آپ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں میرا انتظار کریں میں وہیں آپ سے ملوں گا۔ چنانچہ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں جب میں پہنچا تو طفیل صاحب وہاں میرے منتظر تھے۔ ابھی ریل کی روانگی میں بہت وقت تھا۔ اس لیے اطمینان سے باتیں ہوئیں میں نے طفیل سے پوچھا کہ حضرت برتیا کیسے ہیں نے لغویات سے لبریز کون سا خط آپ کو لکھا؟ کہنے لگے۔ میں بھی اس بات پر حیران تھا کہ آپ کا کوئی خط ایسا مجھے نہیں ملا۔ پھر فراقی نے نہ جانے یہ سب کیسے لکھ دیا۔ میں نے کہا۔ سوال یہ ہے کہ جب فراقی کا خط لے بنایا دھتا تو آپ نے اُسے نقوش میں چھپا کیوں؟ طفیل سے جواب نہ بن پڑا۔ کہنے لگے خیال تھا یہ حسد کمال دوں گا۔ کہیں فراقی کے دوسرے خط کے ساتھ یہ بھی کاتب کو دے دیا گیا اور چھپ گیا۔ مگر ساتھ ہی انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ یہ خط ”من آئم“ میں نہیں چھپے گا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد جب ”من آئم“ چھپ کے آئی تو کیا دیکھتا ہوں، کہ خط اس میں بھی موجود ہے، رشاد اس کا سبب یہ ہو کہ طفیل میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھول گئے ہوں اور نقوش میں مطبوعہ تمام خطوط اس ہدایت کے ساتھ کاتب کو دے دیئے گئے ہوں کہ اب کتابی سامان پر ان کی کتابت کرو۔ چنانچہ اُس خط کی بھی کتابت ہو گئی اور وہ جمع ہو گیا۔ دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طفیل فراقی کی شاعری اور نثر کے عاشق تھے۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ فراقی کا ایک ایک لفظ محفوظ ہو جائے۔ کسی خط کا کوئی حصہ حذف نہ کیا جائے۔ اور میں اس کی زد میں آ گیا۔

میرے دل میں اس واقعے کا تکرر کچھ مدت تک رہا، لیکن انجام کار ختم ہو گیا اور میں یہ بات بھول ہی گیا۔ اور اب جبکہ میں ماضی کی راکھ کو بیدار کرنے بیٹھا ہوں تو اس میں سے یہ سب کچھ، تلخیاں اور کسلا پن، برآمد ہو رہا ہے۔

(۵)

ہاں تو میں ریلوے اسٹیشن پر طفیل کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔ ابھی ریل میں چلی تھی کہ میرے ایک عزیز دوست خلیفہ اقبال حسین مجھے ڈھونڈنے ڈھونڈتے اسٹیشن پر آئے۔ وہ اپنی گاڑی ساتھ لائے تھے۔ ان کا اسرار تھا کہ میں ریل سے نہ جاؤں، بلکہ ان کی گاڑی میں ان کے ساتھ ملتان چلوں۔ خلیفہ اقبال حسین ایک بڑی محبوب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا تعلق پٹیالہ کے خلیفہ خاندان سے تھا۔ تقسیم ملک کے وقت ہجرت کر کے لاہور چلے گئے تھے۔ تقسیم سے قبل ان کے ساتھ میرے مراسم نہیں تھے۔ تقسیم کے بعد یہی بار ملاقات ہوئی اور پتا چلا کہ میری شاعری کے عاشق ہیں۔ انہیں میرے سیکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ لاہور میں جب بھی گیا ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ میں ان کے یہاں قیام کروں۔ ایک دفعہ لائل پور کے ایک مشاعرے سے واپس آتے ہوئے میں نے اور غلام ربانی ناماں نے ان کے دولت بکدے پر قیام کیا۔

خلیفہ اقبال حسین میری تواضع کے لیے اپنی گاڑی میں اسکاچ دسکی کی متعدد بوتلیں رکھ کے لائے تھے جن پر ملتان میں عدم صاحب نے ہاتھ صاف کیا اور مشاعرے سے پہلے ہی ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔

گویا طفیل صاحب کا عزیز ہوا ٹکٹ خلیفہ اقبال حسین نے استعمال نہ کرنے دیا اور ملتان تک کا سفر خلیفہ صاحب کی گاڑی میں ہوا۔ یہ گاڑی منٹگری کے قریب پہنچ کر خراب ہو گئی اور انجام کار میں لاہور سے آنے والی اسی ریل کا انتظار کرنا پڑا جس کے

لیے طفیل صاحب نے میرا ٹکٹ خرید لیا اور جسے چھوڑ کے ہم کار سی سے روانہ ہو آئے تھے۔
اب یہ کارڈ راجپور کے سپرد ہوئی جس نے کہا کہ اسے ٹھیک کر کے میں ملتان لے آؤں گا، اور ہم نے پلیٹ فارم پر ریل کا انتظار شروع کیا۔ وہاں اتفاقاً طور پر بھیدامند سے ملاقات ہو گئی۔ یہ ان کے ساتھ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی، ورنہ اس سفر کا بہت بڑا حاصل تھا۔ بات یہ تھی کہ اُس ریل سے لاہور اور راولپنڈی کے شعراء سفر کر رہے تھے۔ مجید امجد خود دو شعراء میں مدعو نہیں تھے، لیکن ان میں سے بعض شعراء سے ملنے اسٹیشن پر آئے تھے۔

اب یہاں ملتان کے شعراء کا ذکر تو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن ابھی گزشتہ دروری میں جب پنجاب کے گورنر مخدوم سید سجاد حسین صاحب سے گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ملنے کا اتفاق ہوا تو انھیں وہ مشاعرہ یاد تھا اور ملاقات میں انھوں نے خاص طور سے اس کا ذکر کیا۔ مخدوم صاحب قبل اُس وقت شاید پنجاب اسمبلی کے سپیکر تھے یا رکن تھے اور مشاعرہ انہی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔

(۶)

پُرانی بات ہے۔ ابھی ”نقوش“ کو جاری ہونے دو تین برس ہی ہوئے ہوں گے۔ مجھ سے طفیل صاحب نے کہا کہ اُن کا ارادہ یہ ہے کہ نقوش دہلی سے بھی جاری کیا جائے۔ غالباً کلکتے کے کسی ناچر کتب کے ساتھ اُن کی بات ہوئی تھی۔ انہوں نے اس ناچر کتب کی بہت تعریف کی اور کہا کہ بہت ایمان دار آدمی ہے۔ اس وقت میری مطبوعات کا بہت سا روپیہ اس کے ذمے ہے۔ وہ بیروپیہ لاہور نہیں بھیج سکتا۔ اس لیے پانتا ہے کہ ہندوستان میں میرے کسی دوست کو بھیج دے۔ میں چاہتا ہوں اُسے آپ کا پیادے دوں۔ دو روپیہ آپ کو بھیج دے اور آپ یہ اپنے پاس محفوظ رکھیں اور میں جب بھی دہلی آؤں آپ سے لے لوں میں نے کہا مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس ناچر کتب کو طفیل صاحب نے میرا پیادے دیا اور اُس نے طفیل صاحب کا روپیہ میرے نام بھیج دیا۔ طفیل نے مجھے خط لکھا کہ میں دہلی آ رہا ہوں اور آپ سے ملوں گا۔ میں ان دنوں بیمار تھا۔ خط کا جواب نہ دے سکا۔ طفیل نے دوبارہ خط لکھا۔ میں اس کا بھی جواب نہ دے سکا۔ علالت کی وجہ سے۔ آخر ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ طفیل صاحب غریب خانے پر موجود ہیں۔ میں بیماری کی حالت میں باہر صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھ سے لیٹ گئے اور اسی مزاح مہرے لہجے میں کہنے لگے کہ خط کا جواب غالباً تم نے اس لیے نہیں دیا کہ میرا روپیہ مار لینا چاہتے ہو۔ مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا ”کسی کی جان گئی اور آپ کی ادا بھری“ آپ کا روپیہ محفوظ ہے۔ اتنے میں چائے آگئی اور بعد میں جب میں اندر سے اُن کا روپیہ لانے کے لیے اُٹھا تو مجھ سے چلا ڈگیا۔ خود طفیل نے مجھے سہارا دیا۔ اور اسی لہجے میں کہنے لگے۔ یا رنم تو واقعی بیمار ہو میں سمجھا تھا مذاق کر رہے ہو۔

کیٹی نقوش ”کو کلکتے“ یا دہلی سے جاری کرنے کی پہل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ حالانکہ ان کا خیال یہ تھا کہ بیٹر پیپر پر کتابت شدہ مضامین نظم نثر ہندوستان بھیج دیے جایا کریں گے۔ اور جیسا یہ پاکستان میں پھینا ہے ویسا ہی ہندوستان میں چھپ جایا کرے گا۔

(۷)

۱۹۷۱ء میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی دعوت پر میں پاکستان گیا۔ وہاں چار یونیورسٹیوں میں مجھے لیکچر دینا تھے۔ پنجاب

یونیورسٹی لاہور، کراچی یونیورسٹی کراچی، پشاور یونیورسٹی پشاور اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔ اس سفر میں میری پہلی منزل لاہور تھی۔ چونکہ میں اپنے احباب کے لیے اپنی تصانیف کی جلدیں لے کے گیا تھا جس کے باعث سامان کا وزن بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لیے یہ سفر میں نے رٹرک کے ذریعے سے کیا۔ واک پر محب گرامی قند جناب مسیح الدین احمد صدیقی ڈائریکٹر جنرل پاکستان اکیڈمی آف لٹریز خود موجود تھے۔ انھوں نے ملنے ہی کہا کہ آپ کے ایک دوست آپ کے لیے یہاں واکر آئے ہوئے ہیں اور وہ کسٹم کے دفتر میں بیٹھے ہیں، آپ بتائیے وہ کون ہیں۔ میں نے کہا صدیقی صاحب یہ تو آپ نے بڑا مشکل سوال کیا ہے۔ کیونکہ لاہور میں میرے عزیز دوست لوگوں کے دوست، ایک سے زیادہ ہیں۔ انھوں نے پھر بھی اصرار کر کے نام پوچھنا چاہا۔ میں نے کہا۔ میں ترتیب کے بغیر کم از کم پانچ سات نام لوں گا، ایک نام لینا تو بڑا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی۔ ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بول اٹھے ہیں آپ نے صحیح کہا ہے۔ آپ کو لینے کے لیے احمد ندیم قاسمی آئے ہوئے ہیں۔ طفیل صاحب کے بارے میں انھوں نے کہا کہ وہ راسٹرنگلڈ کے سیکرٹری ہیں اور راسٹرنگلڈ کی جانب سے آج شام ہی کو آپ کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے، طفیل صاحب اس جلسے کی تیاری میں مصروف ہیں دیکھو میرے اور قاسمی کے ساتھ ضرور آتے۔

صدیقی صاحب مجھے اپنے ساتھ مال روڈ برائنز کلائنیش سٹریٹ میں لے گئے، جہاں میرے قیام کا انتظام تھا۔ بخود ہی دیر بعد راسٹرنگلڈ کے ایک خاندان سے آئے اور میں ان کے ساتھ راسٹرنگلڈ کے دفتر پہنچ گیا۔ جہاں لاہور کے اہل قلم، ادیب، شعرا کافی تعداد میں موجود تھے۔ پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی، آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، نئے دوست ملے۔ مرزا ادیب کی فرمائش پر میں نے سفر برما کی داستان سنائی۔ جہاں میں کوئی دس ہندو روز قبل حلقہ احمر رنگون اور اسلامک سنٹر برما کی دعوت پر گیا تھا۔ سوال جواب کا سلسلہ ختم ہونے ہی کو تھا کہ ایک صاحب نے کہا مدت سے آپ کا کوئی شعری مجموعہ نہیں چھپا۔ اگرچہ اس دوران میں آپ کی نثری تصانیف خاصی تعداد میں چھپی ہیں۔ پاکستان میں بھی آپ کی بہت کتابیں چھپی ہیں لیکن یہ سب آپ کی نثری تصانیف ہیں، چنانچہ مجھے کیا سوچا، میں نے طفیل صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میرا مجموعہ کلام چھپانا ہی نہیں چاہتے۔ اب یہ چھپے تو کیسے۔ طفیل جھینپ گئے۔ کہنے لگے ضرور چھاپوں گا۔ میں نے اسی روم میں کہا۔ یہ آپ کے سامنے کہہ رہے ہیں چھاپوں گا، لیکن بعد میں مجھ سے کہیں گے نہیں چھاپتا۔ اس پر سامعین میں ایک فقہہ سا بلند ہوا

بعد میں طفیل مجھ سے کہنے لگے۔ اچھا تم اب مجھے جرگے کے سامنے لے گئے ہیں نے کہا بھئی جب میرا نیا مجموعہ کلام نہیں چھپا ہے تو کچھ نہ کچھ تو جواب میں کہنا ہی تھا۔

لاہور سے میں کراچی چلا گیا، وہاں سے اسلام آباد، اسلام آباد سے میاںوالی اور عیسیٰ خیل، عیسیٰ خیل سے پھر اسلام آباد اور اسلام آباد سے پشاور۔ پشاور میں زندگی میں پہلی بار گیا تھا۔ وہ دو ایک دن کا قیام زندگی میں ہمیشہ نسیم جان نضر کی طرح خوش برساتا رہے گا۔

پشاور سے میں پھر اسلام آباد آیا۔ یہاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں میرا لیکچر تھا۔ یہاں صدر پاکستان جنرل محمد ضیا الحق سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس سے قبل ملاقات لاہور میں ہو چکی تھی اور جب اسلام آباد کی ملاقات کے بعد میں قصر صدر سے

رضت ہوا تو میری زبان پر اقبال کا یہ مصرع تھا۔

مسلمان کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

خیر میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں۔ کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ اسلام آباد کے لیکچر کے دوسرے روز مجھے دہلی واپس روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ اسلام آباد سے میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے آفس سپرنٹنڈنٹ کی معیت میں کتابوں کے تحائف سے لدا چھندا میں لاہور آیا۔ چونکہ شام سے پہلے ہی کتابوں کے بجسوں سمیت داکہ کی سرحد کو عبور کرنا تھا اور وقت بہت کم تھا۔ اس لیے طیارے سے اترنے ہی اپنے دو دوستوں سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ ایک چودھری عبدالحمید پر وپر آئیٹر مکتبہ کا روال اور دوسرے محمد طفیل۔ چودھری عبدالحمید کے ساتھ گپ شپ کے بعد نقوش پریس (ارو بازار) کا رخ کیا۔ طفیل وہاں نہیں تھے۔ بیٹے پروین نے بتایا کہ گھر پر ہیں، چنانچہ پروین کی رہنمائی میں، میں مسلم ٹاؤن پہنچا۔ وہاں طفیل کے ساتھ تنویری دیر محفل جی۔ بھابی سے اور بچوں سے ملاقات ہوئی۔ چائے اگئی۔ چائے کے ساتھ جتنی چیزیں تھیں سب ویجیٹریں یعنی سمو سے، بسکٹ، وال موٹو وغیرہ میں نے کہا بار اگر یہی چیزیں کھانا تھیں تو نم نے پاکستان کیوں بنایا۔ یہ سب تو ہندوستان میں بھی مل سکتا تھا۔ اس پر گھر کے سب لوگوں کو ہنسی اگئی۔ طفیل صاحب نے کہا پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم لاہور کو چھوڑ کے دہلی کیوں چلے گئے۔ میں لاجواب ہو گیا اور جواب بھی کیا دنیا اگر نازش رضوی مرحوم اور شیخ عبدالشکورہ مجھے یہ کہہ کر زبردستی ہندوستان کو دھکیلنے کہ اب تم ہمارے لیے مصیبت بن گئے ہو۔ حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تمہاری حفاظت ہم نہیں کر سکتے۔ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ اور وہ مجھے خود ہی ریفیو جی کیپ میں نہ پہنچا آتے تو ہو سکتا تھا کہ میں لاہور ہی میں رہتا۔ حالات تو آخر ٹھیک ہو ہی گئے تھے۔

(۸)

میں بے ترتیبی کے ساتھ واقعات سناتے سناتے سہ ماہی تک پہنچ گیا حالانکہ درمیان میں کچھ ایسی باتیں مجھے کہنا تھیں جن کا تعلق ۱۹۷۷ء سے ہے۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں پہلا اقبال انٹرنیشنل کانگریس لاہور میں منائی گئی۔ میرے لیے اس کانگریس کی اہمیت یوں بھی بہت زیادہ تھی کہ میں بارہ برس کے بعد لاہور جا رہا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد مجھے پاکستان جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس مدت میں مشاعروں اور سینیاروں کے چند دعوت نامے آئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی منسوخی کی اطلاع بھی آتی چلی گئی۔ ایک عجیب بے بسی اور گھٹن کا عالم تھا۔ کیونکہ یا تو یہ صورت تھی کہ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۸ء تک سال میں ایک یا دو یا تین پھر پاکستان کے جس میں مشرقی پاکستان بھی شامل تھا لگتے تھے۔ اور اب بارہ برس میں ایک بار بھی وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔ یہ جو اقبال انٹرنیشنل کانگریس کی بدولت ٹوٹا اور میں اس کانگریس کی دعوت پر لاہور پہنچ گیا۔ اس سفر کی یوں تو قابل ذکر باتیں بہت ہیں اور ان میں سے اکثر کا ذکر میں اپنی مختلف تحریروں میں کر بھی چکا ہوں۔ لیکن جن باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ ان سب کی گنجائش اب اس مضمون میں نہ شکل سکے گی۔ کیونکہ اس میں صرف طفیل ہی سے متعلق باتوں کا ذکر ہے۔

جب لاہور میں اقبال کانگریس کے سینیار اور جلسوں کا پروگرام ختم ہو گیا تو آخری اجلاس سیالکوٹ میں منعقد ہوا میرا ارادہ اس کے بعد دو تین روز لاہور میں قیام کرنے کا تھا، کیونکہ کانگریس کے پروگراموں نے اتنا مصروف رکھا تھا کہ شہر میں

گھوم کے احباب سے ملنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس دوست کے گھر میں قیام کروں۔ پیشکش اکثر احباب کی طرف سے تھی۔ مثلاً برادرِ مہتمم قنبل شہنائی، جناب نذیر احمد سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور، عزیزِ مہتمم مسعود شورش، لیکن فقرہ خالِ طفیل ہی کے نام پڑا۔ وہ ایک دن کانٹنی نیشنل ہوٹل میں کمرے میں آئے اور تحفے میں ملی ہوئی کتابوں کے انبار — فرش پر، صوفے پر، شہیت پر، بنگ کے ایک حصے پر دیکھ کے حیراں رہ گئے۔ کہنے لگے آخر تم ہو تو متعصب ہندو، پاکستان کے دشمن، تم نے سوچا کہ اور تو کسی طرح پاکستان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، یہاں کی تمام کتابیں ہی سمیٹ کے لے جاؤں۔ کچھ تو پاکستان کا نقصان ہو گا۔ بیوروٹی کے بعض طلبہ اس وقت میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے اس فقرے کا ٹھٹھا اٹھایا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس لطیفے کے پس پشت وہ تکلیف دہ عنصر ضرور ہے جس نے ہندوستان اور پاکستان کو ابھی تک ایک دوسرے کا ستیا پڑوسی ملک نہیں بننے دیا، لیکن اس جملے میں جو ORIGINALITY تھی، اُس نے مجھے بھی طلبہ کے ساتھ تہمت لگانے پر مجبور کر دیا۔

اقبال انٹرنیشنل کانگریس کا آخری پروگرام سیالکوٹ میں متاعرہ تھا۔ راقم التحریر کی صدارت میں۔ اب صدر بے چارے کے لیے مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ متاعرے کو درمیان میں چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا۔ متاعرہ صبح کے ایک ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔ یوں تو ہی اقبال انٹرنیشنل کانگریس کا مہمان تھا، لیکن سیالکوٹ میں صبح معنی میں میرے میزبان ریشا تروڈ کزل سادھنے۔ وہاں کی کوکا کولا کمپنی کے مالک مجھ سے ملنے کے لیے سیالکوٹ میں والد محترم کے شاگرد امیر عبداللہ خاں روڈ کی بھی نشریت لے آئے تھے۔ دوسری صبح مجھے ناک ٹالو کی سیکنگ مکمل کر کے طفیل صاحب کے گھر منتقل ہونا تھا۔ متاعرے کے بعد چائے کا دور ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد لاہور پہنچ جاؤں۔ اور تھوڑی دیر کے لیے سولوں۔ اُسی روز سسٹن بجے بیگم عبادت بیروی کے کالج میں ہم لوگوں کے اعزاز میں ایک اجلاس بھی تھا۔ لیکن کزل شاد کے یہاں تاجیز مورہی تھی۔ میں حیراں تھا کہ یہ بار بار چائے کا دور کیوں چل رہا ہے۔ آخر صبح چار بجے کزل شاد نے کہا، کہ آپ تیار ہو جائیے، گاڑی آپ کو لاہور لے جانے کے لیے تیار ہے۔ اور مجھے غلوت میں لے جا کے کہا کہ یوں تو میرے پاس اور کئی گاڑیاں اور کئی ڈرائیور موجود ہیں، لیکن میں آپ کو اپنے ایک خاص ڈرائیور کے ساتھ لاہور بھیجنا چاہتا تھا، اور وہ ڈرائیور گوجرانوالہ میں تھا۔ اُسے تبلیغ کر کے بلوایا ہے۔ اس لیے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ آپ اس کے ساتھ جائیں گے تو مجھے اطمینان رہے گا۔ بیٹن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ میزبانی رسمی میزبانی نہیں ہے۔ جو محض کھانے کی عمدہ دعوت تک محدود ہو بلکہ اس میزبانی میں ایک ایسا ستیا خلوص اور سچی محبت شامل ہے جس کی بدولت انسانیت آج بھی زندہ ہے، چونکہ رات کا سفر تھا سیالکوٹ سے لاہور تک، اس لیے نہ جانے کزل شاد کے دل میں کیا کیا گھماں گزرے ہوں اور انھوں نے سوچا کہ کوئی حقیقی خطرہ نہ ہونے کے باوجود آزاد کے اس سفر کا ایسا انتظام ہونا چاہیے جو ہر طرح کے اندیشے سے پاک ہو۔

آج کزل شاد ہم سے ہینڈ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں لیکن میرے دل میں اُن کی یاد ہمیشہ کے لیے زندہ ہے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔!

گاڑی میں دو شرعاً اور بھی تھے۔ انھیں رستے میں اُن کے شہروں میں پہنچایا گیا۔ اُن کے گھروں تک اور میں کوئی سات آٹھ بجے کے قریب ہوٹل انٹرنیشنل میں پہنچا۔ اس وقت نیند تو آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی، لیکن اپنا اثر یوں چھوڑ گئی کہ بے خوابی کے باعث

سرچھٹ رہا تھا میں نے ابھی بڑی شکل سے ہاتھ منہ دھویا تھا اور کپڑے بدلے تھے کہ طفیل صاحب، عزیزم پرویز اور جادو کو ساتھ لے کے آگئے۔ کتابوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انھوں نے پرویز سے کہا کہ اب مجھے اور آزاد کو گھر پہنچاؤ، وہاں آزاد اور میں ٹرک جائیں گے، ناشتا کریں گے اور تم اس کے بعد بازار سے تین چار بڑے بڑے ٹرک لوہے کے خرید کے ان تمام کتابوں کو ان میں بھر کے گھر لے آنا۔ طفیل اس وقت اردو بازار والے مکان میں رہتے تھے۔ مسلم ٹاؤن کا مکان ان دنوں زیر تعمیر تھا۔ اس دن طفیل بہت مصروف تھے۔ شام کو شیرازن ہوٹل میں نقوش کے اقبال عسکری رسم رومنائی ہرنا تھی جس میں لاہور کے قریباً تمام ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فن کاروں کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے متعدد وٹیکنیٹ مدعو تھے۔

ناشتے کے بعد میں نے طفیل کو بتایا کہ آج بیگم عبادت بریلوی نے کالج میں چند بیرونی مندوبین کو ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ میں بھی مدعو میں شامل ہوں۔ تو دس بجے ہم دونوں وہاں چلیں گے۔ آپ کو بھی دعوت ملی ہوگی۔ طفیل جواب میں تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بولے دعوت کو تو خیر چھوڑ دو، ملی ہے یا نہیں ملی ایک ہی بات ہے۔ میں تمہارے جانے کا انتظام کروں گا۔ لیکن خود نہیں جاؤں گا۔ میں سمجھا شاید انھیں بلاوا نہیں ہے۔ اب میں انھیں مجبور کیوں کروں لیکن کسی طرح ان کی زبان سے نکل ہی گیا کہ عبادت اور ان کے درمیان کچھ شکر رنجی ہے، اس لیے وہ نہیں جائیں گے۔ میں جان گیا کہ دعوت تو انھیں ملی ہے لیکن کتنا ہے ہی۔ اب میں اڑ گیا کہ آپ کو دعوت تو منر عبادت بریلوی نے دی ہے اپنے کالج میں آنے کے لیے۔ اس دعوت سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کیا تعلق۔ آپ کو چیلنا ہوگا۔ آخر وہ مان گئے۔ مجھے لے کے وہاں پہنچے۔ جلسہ شروع ہوا۔ سرور صاحب نے تقریر کی۔ راقم التحریر نے بھی، پروفیسر رلیف رسل کی تقریر باقی تھی۔ جلسے نے طول کھینچا تو ہم دونوں اجازت لے کے آگئے اس لیے کہ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا، اور طفیل شیرازن ہوٹل کی دعوت کے انتظام کی طرف توجہ کرنا چاہتے تھے۔

گھر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اب آپ سو جائیں۔ آپ رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں۔ لیکن میرے لیے بے وقت سونا بہت دشوار ہے۔ میں نے کہا چلتے ہیں بھی آپ کے ساتھ شیرازن ہی چلتا ہوں۔ کہنے لگے اس وقت آپ کے دوستوں میں سے کوئی نہیں آیا ہوگا۔ ابھی تو بیرے خانسائے میز پر لگا رہے ہیں گے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں، بیروں، خانسائوں ہی سے باتیں کریں گے۔ چنانچہ ہم دونوں نے ان کی موٹر میں شیرازن کا رخ کیا۔ وہاں جاتے ہی میں ایک صوفے پر لیٹ گیا اور طفیل اختتام میں مصروف ہو گئے۔

اب میری خوش قسمتی دیکھئے کہ تھوڑی سی دیر میں (جلسہ شروع ہونے کے وقت سے بہت قبل) محب گرامی فدر شیخ عبدالشکور تشریف لے آئے۔ انھوں نے زینے ہی میں سے طفیل کو آواز دی۔ اگرچہ میں یہ آواز تیس برس کے بعد سن رہا تھا، لیکن میں نے یہ آواز پہچان لی۔ اور طفیل سے کہا کہ شیخ عبدالشکور کی آواز ہے۔ طفیل نے زینے ہی میں ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا شیخ صاحب آزاد نے آپ کی آواز پہچان لی ہے اور شیخ صاحب ابھی زینے ہی میں تھے کہ انھوں نے وہیں سے میرے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔ پہلا جہان کا اس قدر بزرگ محبت تھا کہ دل میں اُتر گیا۔ اگر اس جیلے کو نقل کرنے سے میری خود سنائی کا

پہلے نکلتا تو ضرور یہاں نقل کرتا۔

”نقوش“ کی رسم رونمائی کے اس جلسے میں متعدد حضرات نے تقریریں کیں۔ پروفیسر آل احمد سرور، ایسا ندر بوسانی، ڈاکٹر عبد الباقی، اور متعدد دوسرے حضرات نے ”نقوش“ اور محمد نقوش دونوں کو عراجِ تحسین ادا کیا۔ راقم التحریب سے بھی تقریر کی فرمائش ہوئی۔ اگرچہ تقریر بنی البدیہ تھی لیکن چونکہ ٹیپ ریکارڈ ہوئی اس لیے محفوظ رہ گئی اور اس کا متن مجھے لاہور سے ملا تو یہاں ہندوستان کے اکثر اخباروں میں شائع ہوا۔ شاید یہ تقریر ”نقوش“ میں شائع نہیں ہوئی۔ دراصل یہ تقریر دوسری تقریروں کے ساتھ ”نقوش اقبال“ (۴) میں شائع ہونا تھی۔ غالباً بزمِ اجماع تک چھاپی نہیں ہے۔ اس وقت ”تعمیر حیات“ (نپدرہ روزہ) کھنڈ کا ۱۰ جلد ۱۹۷۸ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ اس میں یہ تقریر چھپی ہے اور چونکہ یہ طفیل اور ”نقوش“ کے ذکر سے معمور ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اسے زیرِ نظر تحریر کا حصہ بنانے میں کوئی عرج نہیں چنانچہ میں اسے یہاں عرتِ بحرتِ تعمیر حیات سے نقل کر رہا ہوں۔

”نقوش“ (اقبال نمبر) کا لاہور میں اجراء

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تقریر

صدر محترم اور معزز خواتین و حضرات !

سیکڑوں سال کے واقعات مل کر تاریخ کا ایک لمحہ بناتے ہیں اور سیکڑوں سال کی تاریخ روایت کے ایک لمحے کو جنم دیتی ہے لیکن اس کھیلے میں مستثنیات بھی ہیں، جیسے دنیائے اردو میں ”نقوش“ جو اپنے پہلے شمارے کے ساتھ ہی تاریخِ ادب کا ایک حصہ بن گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک روایت بن گیا۔ ”نقوش“ کے بغیر اردو کی تاریخِ ادب نامکمل ہے۔ ”نقوش“ کے بغیر چراغِ یاد کا ذکر ادھر اسے آج اس قسم کے جلسے ہندوستان میں ہر اس جگہ سننے میں آتے ہیں جہاں اردو کے چار ادیب مل بیٹھے ہیں۔ پاکستان میں تو ایسی لائبریری اور ایسے گھروں کی تعداد بہت ہوگی جہاں ”نقوش“ کی فائل پہلے شمارے سے نازہ ترین شمارے تک موجود ہو۔ لیکن ہندوستان میں بھی ایسے مرکزوں کی کمی نہیں جہاں آپ ”نقوش“ کا جو شمارہ چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔ خود اس خاکسار کی ذاتی لائبریری میں ایک مدت تک یہ کیفیت رہی۔ اوجہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۷ء تک کے قیام سرینگر کے دوران میں اس کا پانچ ہزار کتابوں پر مشتمل دہلی کا ذخیرہ کتب دیکھ کی زد میں آیا تو اکثر نادرا اور قیمتی کتابوں کے ساتھ ”نقوش“ کے بھی متعدد شمارے ضائع ہو گئے جن میں ”پطرس نمبر“، ”شوکت تھانوی نمبر“، ”مکاتیب نمبر“ اور ”لاہور نمبر“ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

خیر یہ تو ”نقوش“ کی ادبی حیثیت کے ایک پہلو کی بات ہے جو میں کہوں یا نہ کہوں، اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ کہنا مجھے اس وقت یہ ہے کہ ”نقوش“ آج اس منزل سے آگے نکل چکا ہے جب اس کا کوئی خاص شمارہ شائع ہوتا ہے اس کی رسمِ اجراء کی ضرورت محسوس ہو۔

”نقوش“ کے خاص شماروں کی رسمِ اجراء پہلے بھی ادا ہوتی رہی ہے، اور اس کی روداد پڑھ کے

ہمیشہ مجھے یہ خیال آتا رہا ہے کہ میر صاحب کے اس بھی تعارف کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں اور غالباً ”مدیر نقوش“ خود اس مصرعے کی معنویت کے قائل ہوں تھے۔
 لیکن میں آج کی رسم اجراء سے بہت خوش ہوں کیونکہ اگر ”مدیر نقوش“ محمد طفیل المعروف ”بھیر نقوش“ ہم اجراء کے بہانے یہ محفل نہ سمجھتے تو دنیا بھر سے آئے ہوتے ادیب اور بالخصوص ہندوستان سے آئے ہوتے یار یار سرور جعفری، صباح الدین، عبدالرحمن اور یہ خاکسار پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں سے اس طرح کیسے مل سکتے جیسے اس محفل میں مل رہے ہیں۔ مجھے تو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کائنات مل گئی ہو۔ اس بہانے کیسے کیسے پڑنے یا احباب مل گئے۔ جی چاہتا ہے بیشت اسی طرح برسوں جی رہے۔

اور ہاں یاد آیا ”نقوش“ نے ۱۹۴۸ء سے لے کر اس وقت تک کتنے ہی نمبر نکالے تھے جو مادہ ادب پر سنگ میل بھی بنتے چلے گئے اور چراغِ راہ بھی۔ لیکن ”اقبال نمبر“ نہیں نکالا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ”نقوش“ کے کارناموں میں یہ ایک کمی رہ گئی تھی کیا مبارک لمحہ تھا وہ جب محمد طفیل کو اس کمی کا احساس ہوا۔ اور پھر اس کی تلافی کی تو اس شان سے کہ یکے بعد دیگرے تین نمبر نکالے اور اب چوتھا ”اقبال نمبر“ شائع ہونے والا ہے۔ میں جب اقبال عالمی کانگریس کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو ان میں وہ چار ضخیم جلدیں (سائیکلو اسٹائل کیے ہوئے انگریزی اور اردو مقالات پر مشتمل جو سمینار میں پڑھے گئے) سب دقتِ کار نامہ نظر آتا ہے اور عالمی کانگریس سے باہر کے کام پر نظر ڈالتا ہوں تو ”نقوش“ کے چار ”اقبال نمبر“ (جن میں سے ایک میں ابھی تک اپنے تصور ہی میں دیکھ رہا ہوں) سب سے زیادہ بلند، سب سے زیادہ بڑا اور سب سے زیادہ با وقار کام نظر آتا ہے۔ اس موقع پر ”مدیر نقوش“ کی اس ادبی دیانت کی داد دیجئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ ”نیزنگ خیال“ کے ”اقبال نمبر“ کی شائع کردہ اپنا کارنامہ فراموش نہیں ہے۔ اور ”نقوش“ کے ”اقبال نمبروں“ کی مجموعی تعداد کو چار نہیں بلکہ تین بتا رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ”نیزنگ خیال“ کے ”اقبال نمبر“ کا شائع ہونا ایک معجزہ نہیں تھا۔ آج اس عمل گم شدہ کو ماضی کی گہرائیوں سے باہر نکال کے لے آنا اور اسے اپنی پوری کچھ دمک کے ساتھ جوہرِ ان ادب کے سامنے پیش کرنا ایک معجزہ ہے۔

ہماری دنیا نے اردو ایسے معجزوں سے آشنا نہیں ہے۔ اس لیے میرے نزدیک ”نقوش“ کے ”اقبال نمبر“ کی تعداد تین نہیں بلکہ چار ہے جس کے لیے بی سارے ہندوستان کی طرف سے ”مدیر نقوش“ اور ان کے رفقاء کا کو مبارک باد دیتا ہوں اور یہ بھی توقع رکھتا ہوں کہ ”نقوش“ کے ”اقبال نمبروں“ کا یہ سلسلہ ”نیز چار یا بقول طفیل نمبر“ کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ ”اقبال“ پر صحیح معنی میں کام تو اب شروع ہوا ہے۔

میں نے طفیل کے مگر کوئی تین چار روز قیام کیا اور اس کے بعد دہلی روانہ ہو آیا۔ اگرچہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی یہ

کی گاڑی میں ہم چار دوست بیٹھے تین چار گاڑیاں اور تین جن میں دوسرے احباب تھے۔ بلوچستان کے ایک معر شاعر جن کا نام میں بستی سے منقول کیا ہوں۔ پروفیسر صاحب کی بڑی بڑی (اسکاٹ لینڈ) اور دوسرے احباب اور اس طرح یہ ناولد وانگ کو روانہ ہوا۔
روانگی سے قبل بھائی (بیگم طفیل) نے میری بیوی کے لیے تحائف دیے اور میں نے جانے کتنی محبت بھری یادیں لے کے لاہور سے رخصت ہوا۔

(۹)

۱۹۳۷ء میں پاکستان میں جانے کا اتفاق تین بار ہوا۔ پہلے نوکراچی میں انجمن سادات امر وہہ کا مشاعرہ تھا، پھر میری کتاب *LABAL I MIND AND ART* کی لاہور میں رسم رونمایی۔ پھر دو تین ماہ بعد لاہور میں دوسری اقبال ٹرسٹیل کانگریس منعقد ہوئی۔ مشاعرے کے لیے میں کراچی جانے کے لیے لاہور سے گزرا۔ (اپنے محترم دوست نواب زادہ خان عبدالغفور صاحب کے یہاں قیام کرنے کے بعد) تو طفیل لاہور میں نہیں تھے کوڑے ہوئے تھے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ بزم سادات امر وہہ کے مشاعرے کے بعد جب میں جیسے ہوٹل سے منتقل ہو کر پروفیسر صاحب حمید الدین شاہد کے یہاں اٹھ آیا تو طفیل کوڑے والی پر اسی جیسے ہوٹل میں آ کے مقیم ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ ہوٹل سے میری روانگی سے نفوذی دیر بعد طفیل صاحب اس ہوٹل میں آ کر قیام پذیر ہوئے۔ چنانچہ میں پروفیسر حمید الدین شاہد کے ساتھ انہی قدموں والی اس سے ملنے کے لیے گیا۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ یہیں آ کے قیام کرنے والے ہیں تو میں یہاں سے منتقل ہی نہ ہوتا۔ میں تو اس لیے منتقل ہوا کہ یہاں اکیلا رہ گیا تھا۔ تمام دوست احباب چلے گئے تھے۔ انہوں نے بہت کہا کہ اب پھر واپس آ جاؤ۔ پرسوں اکٹھے لاہور چلیں گے اور وہاں سے تم دہلی چلے جانا۔ لیکن میں دوسرے روز ہی لاہور روانہ ہو رہا تھا، اور اس طرح بار بار انتقال مکانی مجھ ایسے کاہل آدمی کے لیے آسان بھی نہیں تھا۔

اقبال عالمی کانگریس میں پھر طفیل سے ملاقات ہوئی۔ سرور صاحب، بیگم سرور اور میں، ہم ان سے ملنے ان کے اردو بازار والے دفتر گئے۔ ہم تینوں کے ساتھ وہ تپاک سے ملے۔ اگرچہ کچھ مدت سے میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کم گو ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرے دن انہوں نے سرور صاحب اور اس خاکسار کی دعوت کی۔ اپنے نئے مکان میں۔ وہاں احباب لاہور سے ملاقاتیں ہوئیں اور بہت دیر تک یہ محفل جی رہی۔

آخری ملاقات اسی سال کے شروع میں ہوئی۔ لاہور میں ہندوستان کے اردو ادیبوں اور شاعروں کا ڈیلیکیشن راولپنڈی سے لاہور پہنچا تو ایئر پورٹ پر تشریف لانے والے احباب میں طفیل بھی موجود تھے۔ یہ ملاقات خاصی مختصر رہی۔ اس کے بعد ہم لوگ درود لاہور میں رہے، لیکن طفیل سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اصل میں یہ سفر تو رشتہ درگروں کا فکندہ دوست والا معاملہ تھا۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے پروگرام ایسا کچھ اور بھرپور بنایا کہ ہم لوگوں کو اپنا ہوش بھی نہ رہا۔ اور بارہ دن کے بعد سفر پاکستان کے بعد میں دہلی پہنچا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی خواب ٹوٹ گیا ہو۔ یہ قول جگر

دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا اب تک اثر خواب ہے معلوم نہیں کیا

(۱۰)

یہاں اگرچہ اس ذکر کی ضرورت نہیں لیکن بیان کرنے میں حرج بھی کوئی نہیں کہ اگرچہ طفیل صاحب مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ پبلشر بھی تھے اور میں صرف مصنف لیکن مجھ میں ان میں تجارتی تعلقات کبھی نہیں رہے۔ مجبور کلام والی بات تو ہنسی مذاق میں ختم ہوگئی تھی۔ ہاں جب میں نے ”اقبال“ اور مغربی مفکرین ”لکھی تو میری خواہش تھی کہ یہ لاہور سے بھی چھپے۔ میں نے طفیل کو اس سلسلے میں خط لکھا، لیکن فوراً ہی جگ مشروع ہوگئی اور خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ہاں لندن کے راستے خط آجاسکتے تھے لیکن یہ ایک طویل اُمل والا معاملہ تھا۔ طفیل نے مجھے براستہ لندن خط لکھا کہ ساری کتاب کا مسودہ بہ یک وقت (مختلف حصوں میں نہیں) مجھے بھجوا دیجئے میں انھیں چھوٹے چھوٹے لفافوں میں کتاب کا ایک ایک باب بھجنا چاہتا تھا معلوم نہیں کیوں۔ باب یاد نہیں آ رہا، لیکن اُس وقت میرے لیے سارا مسودہ انھیں بیک وقت بھجنا بہت مشکل نظر آیا۔ حالانکہ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر اس میں کیا شکل تھی۔ بہر طور یہ مسودہ اُن تک نہ پہنچ سکا۔ اور بارہ برس تک دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک اور خط و کتابت کی جو حالت رہی اُس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جو اس مشکل سے گزرے ہیں۔

(۱۱)

یہ ڈاک والے حالات بارہ برس بعد کہیں آکے نہ رہے۔ اور سب سے پہلے طفیل صاحب کا جو خط مجھے بلا وہ ایک خوبصورت عید کا رڈ تھا جس میں اُن کے قلم سے کچھ اس طرح کا جملہ درج تھا..... میں تو اس مدت میں بہت اُداس رہا (یہ عید کا رڈ اس مجھے سمیت کا غذا ت میں محفوظ رکھا ہے لیکن اس وقت سامنے نہیں ہے)۔ اب میں کیا بتاؤں کہ اس مجھے نے مجھے کس قدر متاثر کیا۔ بہر طور، اس خط کا جواب ہوں نے دیا وہ یہاں نقل کر رہا ہوں۔ اور اسی پر میری یہ تحریر ختم ہو رہی ہے اس مصرعے کے ساتھ کہ :
نہاری نیکیاں زندہ ، تمہاری خوبیاں باقی

اب خط کا جواب ملاحظہ کیجئے :

تین برس کی طویل مدت کے بعد لاہور سے طفیل کا خط اور عید کا رڈ ملنے پر

پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولن

جاں نذرِ دلفریبی عنوان کیے ہوتے (غالب)

یہ پھر راوی کے ساحل سے مبارک باد عید آئی	کہ یا اُجڑے گلستان کو بہاؤں کی نوید آئی
مبارک باد کا پیغام خود دلیرانہ وار آیا	مگر بن کر مری بیتابی جاں کا قرار آیا
طفیل اک حرف میں تیرے عجب اک سوز پہناں تھا	کہ میری غلمتِ شب میں چراغاں ہی چراغاں تھا
گذشتہ دورِ اُجڑا اس طرح چشمِ نقاشا میں	تصور لے گیا مجھ کو مری یاد دل کی دنیا میں
جگاہوں نے مجھے اس طرح اپنے روبرو پایا	کہ لب پہ شعریہ بے ساختہ اقبال کا آیا

بیاساقی! فائے مرغ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد، نگار آمد، مترار آمد

بر قیدِ ہوش ہے پیایے مراد یارِ پَن اب تک
خدا جانے سبب اس کا ہے سنا کہ ویرانی
کسی کو کیا بتاؤں میرے دل پر کیا گزرتی ہے
سنا ہے آج بھی راوی مجھے آواز دیتا ہے
دکن جا کر بھی اک لاہور یاد آتا رہا مجھ کو
کرتیری یاد سے خلوت میں ہوں اک انجمن اب تک
مرے صحرائے دل پر رشک کرتا ہے جن اب تک
سنا ہے یاد کرتا ہے مجھے میرا وطن اب تک
چھپا پاتے نہیں اس راز کو گنگ جمن اب تک
مٹا پائی نہیں اس یاد کو ارضِ دکن اب تک

میرے دل میں ابھی آباد ہیں مودِ یار، یارِ الے

”پریشاں جلوۂ چوں ماہتاب اندر بسیا ہانے“

میں اکثر سوچتا ہوں دشت کی موعت کہاں تک ہے
سنا کہ اس طرح الفاظ میں سوزِ دروں میسر
جو دنیا کی زبانوں تک ہے میرے آغواں تک ہے
کہ اب میرا قیاس باقی فقط میرے گماں تک ہے
کہ میرا درد و نہاں میرے اندازِ بیاں تک ہے
متاعِ درد کا سودا میرے بازارِ بیاں تک ہے
میں اکثر سوچتا ہوں دشت کی موعت کہاں تک ہے
سنا کہ اس طرح الفاظ میں سوزِ دروں میسر
جو دنیا کی زبانوں تک ہے میرے آغواں تک ہے
کہ اب میرا قیاس باقی فقط میرے گماں تک ہے
کہ میرا درد و نہاں میرے اندازِ بیاں تک ہے
متاعِ درد کا سودا میرے بازارِ بیاں تک ہے

”دریں حسرت سراغِ نیست افسونِ جرس دارم

ز فیضِ دل طمیدن کے فردش بے نفس دارم“

۲۔ ط۔ شخصیت و کردار (خطوط کے اشیانہ میں)

ڈاکٹر نثار احمد

دنیا میں انسانوں کا شمار نہیں، بظاہر انسان سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سب کا خمیر ایک، ایک سا ڈھا سچا، ایک سی فطرت، ایک جہت، ایک میولا، ایک سا خاکہ، شکل و صورت بھی تقریباً یکساں، بس کوئی درالیا کوئی ذرا ویسا، اہل البتہ کچھ آدمی، کچھ اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظاہری خدوخال میں دوسروں کی طرح ہوتے ہوئے بھی دوسروں سے الگ، دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں، اور مختلف اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر کا آدمی دوسرا ہوتا ہے، ان کا باطن جدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو نکالتے کر لیتے ہیں، اور اس قابل ہو جانے ہیں کہ اپنا آئینہ خود دیکھ سکیں۔ ایسے لوگ زیادہ نہیں ہوتے مگر ہوتے ہیں ”یادگار زمانہ“۔ ان کو یاد نہیں کیا جاتا، وہ خود بخود یاد آتے ہیں اور پردہ شور پر مسلسل جگمگاتے رہتے ہیں طفیل صاحب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کو یاد نہیں جاتا بلکہ وہ خود بخود یاد آتے ہیں اور اب بھی یاد آرہے ہیں۔ !!

میرے ان کے درمیان تعلقات کی ”کہانی“ بہت لمبی چوڑی نہیں، پر کبھی لمبی بے مزہ کہانی سے زیادہ لطیف چوڑی سی حکایت میں آتا ہے۔ چار سال بھلا کیا ہوتے ہیں؟ مگر نہیں یادیں نو چار لمحوں کی بہت ہوتی ہیں۔ بلکہ کبھی تو ایک لمحہ بھی ”عرصہ دراز“ کا بدل بن جاتا ہے۔

۲۔ ط کا نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ ہم نے کیا سنا۔ اردو زبان، ادب و انشاء، صحافت اور ادبی رجحانات سے معمولی دلچسپی رکھنے والا کون سا شخص ایسا ہے جو اس سے واقف نہ ہوگا۔ وہ فاتح زمانہ جس کے نقوش کی ۳۰، ۳۵ سال سے دھوم ہے جس نے اپنی علمی ادبی فتوحات سے بڑے بڑے کشور کشان ادب کو گوشہ نشین بنا دیا۔ جس کے فنوروں نے علم و ادب کے خزانے بکھیرے، اُس سے بہر حال راجی سی واقفیت مجھے بھی تھی۔ کچھ فنوروں کو دیکھا تھا، پڑھا تھا، کچھ پاس بھی تھے، مگر ”محو نقوش“ سے ”سالانہ“ کبھی پیش نہ آیا تھا۔ آتا بھی کیسے؟ میرا راستہ الگ تھا اور ان کا راستہ الگ۔ ہاں جب وہ راستہ بدل گئے ”میری گلی“ میں نکل آئے تو پھر

اے برادر مرحوم طفیل صاحب کا میرے نام جو پہلا خط آیا وہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء کا لکھا ہوا تھا اور آخری خط ۱۴ جون ۱۹۸۶ء کا لکھا۔ مگر انتقال سے کوئی دو ہفتہ پہلے ۱۱۔ لے۔ اللہ انھوں نے کی اور اس دوران کل ۲۹ خطوط لکھے۔ میرے جوابی خطوط کی تعداد بھی ۲۹ ہے۔ یادوں کا یہ سرمایہ میرے پاس محفوظ ہے۔

۱۔ نقوش کے یادگار غیر بہت سے نکلے۔ ان کی صحیح تعداد مجھے بھی نہیں معلوم۔ نمایاں ترین غزل ”غزل غنیر، افسانہ غنیر، بیاض غالب غنیر، خطوط غنیر“ ادبی معرکے غنیر، اہل غنیر، میر غنیر، اہل غنیر، منو غنیر، لاہور غنیر، آپ جیتی غنیر وغیرہ، لیکن سب کا ستر تاج ”رسول غنیر“ ہے۔

۲۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا عطا کردہ نام۔

ایک دن ایسا ہوا کہ کشتی بھائی ہم دونوں کے درمیان واسطہ بن گئے۔ یہ بھی اچانک ہوا۔ مجھے تیار چلا کہ کشتی بھائی کب ہندوستان گئے اور جاتے جاتے لاہر میں م۔ ط سے کیا کہہ گئے۔ انکشاف اس وقت ہوا جب طفیل صاحب کا پہلا رقعہ میرے نام لایا :
 ”محترم! سلام سنوں!

مجھے بھی ڈاکٹر ابو الخیر کشتی نے بتایا کہ آپ نے ”مہد نبوی“ میں ریاست کائنات و ارتقاء کے عنوان سے مقالہ لکھا ہے اور انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مقالہ ڈاکٹر حمید اللہ کے معیار سے بڑھ کر ہے۔ یہ سب کچھ سن کر بہت خوشی ہوئی۔
 ”ہم نے رسول امیر کی چار صدی پیش کی ہیں باقی چھ اس سال مکمل کرنے کی دھن ہے۔ اگر آپ اپنا قیمتی مقالہ (خواہ کتنا بھی طویل ہو) ”نقوش“ کے لیے عنایت فرمائیں گے۔ نوہ نقوش کی بھی اہمیت کو ٹھہرائے گا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں گے۔ وہ بھی نادیر کیا ایسا ممکن ہے؟ براہ کرم جواب عنایت فرمائیے گا نا کہ یکسوئی ہو۔“

یہ بھی ”جنگاری“ جو شعلہ ”سہنی اور پھر اس کی تپش“ دونوں کو برابر گرماتی ”رہی۔
 ہمارا پہلا تعارف گویا بھی سا تھا لیکن ”یہ حوالہ“ کی برکت تھی یا ان کا جذبہ دروں، کہ آٹھ مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ یہ ”دل کا معاملہ“ بن گیا اور دل پر اختیار کئے ہے؟ آغاز ہوا تو تنہا طب تھا ”محترم! بھر محب مکرم، مجھے، محب گرامی کے شکفات سے بھل کر“ ”برادر م“ بھائی جان، بندہ نواز ہو گیا، اور جو مغال آئینہ تھا، اس نے لکھا۔ مکرم و محترم، برادر محترم، برادر معظم، بھائی صاحب ذرہ نواز، بھر اس سے بھی دل نہ بھرتا تو۔ برادر م، عزیز م، جیسیم!!

م۔ ط کم گو، کم آواز تو تھے ہی، بحر میں بھی یہی شان رکھی، مختصر نویسی، میں انھیں کمال حاصل تھا۔ بیان پر سجتا بھی تھا اور ہے بھی یہ اسلوب کا حسن، ادب کا اعجاز، مگر معاملات دل سے تو ہر حال لگا نہیں کھانا نا! اس لیے لکھنے والے نے لکھا :
 ”آپ کی بے پناہ مصروفیت کا مجھے اندازہ ہے مگر یہ کیا؟ تعلق کی چنگاری کو شعلہ بنایا۔ دل میں آترے اور چل دیئے شاہد تنگی دانستہ چھوڑ دیتے ہیں، کہ شوق اور فزول ہو۔ چارعت لکھتے ہیں تو تسلی نہیں ہوتی۔“

پھر انھوں نے اپنے ”حرفوں“ کی تعداد بڑھا دی مگر۔ ”چرچری سے نہ گیا؟ وہ اختصار پر قائم رہے اور میں تفصیل پر! البتہ اس کی بیشی سے ”کیف و کم“ پر فرق نہ پڑا بلکہ وہ اور سوا ہو گیا۔ یہ بتانی ہی تو تھی، لکھا :
 ”میں کراچی آئندہ ماہ حاضری سے رہا ہوں۔ سلام کرنے پہنچوں گا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ بعد ورق گردانی مسودہ کو چوم لیا تھا۔“

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشتی۔ حال صدر شعبہ اردو جامعہ کراچی۔ کراچی۔

۲۔ برادر مکرم ڈاکٹر کشتی صاحب کی اس رائے کی ذمہ داری ان ہی پر ہے۔ وہ بڑے ہی جہاندیدہ ہیں۔ یہ کیا کہہ سکتے ہیں۔ البتہ یہ ضیافت ہے کہ ہم جیسے طالب علموں نے تو محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی کتابوں، تحریروں اور مقالوں کو پڑھ کر ہی لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔

۳۔ بحوالہ خط مرقوم، ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء (موصول ۲ اپریل ۱۹۸۳ء)

۴۔ خط مرقوم ۲۵ اپریل ۱۹۸۳ء

۵۔ خط مرقوم ۷ اپریل ۱۹۸۳ء

”میں کراچی آیا تو آپ سے ملے بغیر واپس نہ آؤں گا۔ یہ اشتیاق میرا ہے۔“ پھر واقعی وہ کراچی آگئے۔ ملے مگر یہی بات نہیں۔ ایسا لگا جیسے پہلے بھی ملے ہیں، بلکہ برسوں سے آشنا ہی ہے۔ ”اختصار کے بند ٹوٹ گئے۔ باتیں ہی باتیں گھنٹوں، پہروں گزر گئے گھڑی کی ٹمک ٹمک نے اٹھایا جو آگ لگا کے گئے تھے، اُسے بچانے کے لیے لکھا :-

”معلوم ہی نہ ہوا کہ پہلی بار مل رہے ہیں۔ ایسے باتیں کہیں کہ جیسے مدتوں کے پچھڑے کرتے ہیں۔“

پھر رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آیا کہ کچھ دنوں کا ناغہ بھی بار بن گیا۔ کچھ دنوں خط چٹا لکھ کر جواب نہ آیا تو بے کلی پڑھی، اس لیے کہا گیا۔ ”آپ نے چپ چاپ کا روزہ شاید پھر رکھ لیا ہے۔“

جواب آیا۔ —————

”میں دو ماہ پاکستان سے باہر رہا۔ یہ قدم اپنی گرتی ہوئی صحت کے لیے اٹھایا تھا مگر دوبارہ جانے کی آخری شرط پرواپس آگیا۔ کیونکہ ایک مرحلہ پر اتنا زیادہ وقت نہیں کال سکتا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ خطوط کی بجائے خط کا لفظ میں نے جان بوجھ کر لکھا ہے۔ کچھ لفظی میر پھر تو مجھے بھی آتا ہے۔“

اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ دن گزر گئے میں خط نہ لکھ سکا، کچھ بیماری کچھ مصروفیت، موقع نہ ملا مگر ان کا پیانہ صبر چھلک ہی پڑا، صرف اتنا ہی لکھا :

”کیا ڈاکٹروں نے بولنے سے منع کر رکھا ہے۔“

پھر وہ آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ میرے ”ذاتی معاملات“ میں بھی دخل ہو گئے۔ اُن کا دل بھی تو ایسا تھا، حساس دل، کسی کے پھانس عجیبی تو بے چین وہ ہوتے، کرب وہ محسوس کرتے۔ میری والدہ کا انتقال ہوا۔ یہ حادثہ میرا تھا۔ غم میرا تھا مگر محسوس انھوں نے کیا اور لکھا :

————— والدہ ماجدہ کے انتقال کی اطلاع پا کر بے حد دکھ ہوا، والدہ کیا نعمت ہیں۔ اس کا اندازہ میں بخوبی کر سکتا ہوں، اس لیے کہ میری ذات اور میرا کام، صرف والدہ محترمہ کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ میں کچھ نہ تھا۔ آپ کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ آپ نے والدہ کی خدمت کی۔ کیونکہ وہ کافی عرصہ سے شدید بیمار تھیں یہی تو یہ موقع بھی نہ ملا۔ میں کتنا بد قسمت ہوں۔ میں تو کام صرف اس وجہ سے کرتا ہوں کہ میرے ماں باپ کا نام عزت

۱۔ خط مرقوم (مئی ۱۹۸۳ء)

۲۔ خط مرقوم ۲۸ جون ۱۹۸۳ء

۳۔ خط مرقوم ۲۱ جولائی ۱۹۸۴ء

۴۔ خط مرقوم ۲۵ ستمبر ۱۹۸۴ء

۵۔ خط مرقوم ۴ مارچ ۱۹۸۵ء

سے لیا جائے۔ اگر ہم اچھے کام کریں گے، دوسرے اُن کی رُوح کو ثواب پہنچائیں گے تو وہ ہم سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔
وہ سدا ہمارے ساتھ رہیں گے۔ کیا آپ کو یقین نہیں آتا؟
— دیکھئے میں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ والدہ ماجدہ کی رُوح کو خوش کرنے کے لیے باقی زندگی بیکا رہیں اور کرنی چاہیے۔
امید ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہوگا..... کبھی کبھی خط لکھتے رہیں ورنہ میرا جزا حال ہوجائے گا۔
ان کی بے پایاں محبت، ان کی تسلی کا جواب بجز حُسنِ سپاس اور کیا تھا؟

وقت گزر جاتا ہے، بات رہ جاتی ہے، والدہ کے ساتھ رحلت پر معلوم ہوا کہ کتنے ہی
”ہمدرد“ اور اصل ”بے درد“ نکلے اور کتنے ہی دعویٰ دار خالی خولی ثابت ہوئے بلکہ اس شہرِ لیے مہر“ میں، اندازہ
یہ ہوا کہ جب بیکت تعزیت وصول کرنے نہ جائیں کسی کے ہونٹ نہیں ہلکتے۔ تنگساری تو دُور کی بات ہے۔
— ”آپ درد آشنا تھے سب پر بازی لے گئے اور آپ کے بروقت محبت نامہ نے بڑی ہمت بڑا
حوصلہ بخشا۔ آدمی دھوپ میں چل رہا مہر تو ذرا سا سایہ بھی کتنا مہلا گتا ہے۔ کیسا سکون دیتا ہے۔“
یہ دنیا پھر دنیا ہے۔ دنیاوی معاملات میں آتا رچڑھا ہوتا ہی رہتا ہے۔ مگر انہیں گوارا نہ تھا کہ میرے معاملات
بجڑ جائیں۔ اس لیے تفتیش حال بھی کرتے، مشورہ بھی دیتے اور ”ایڑ“ بھی لگاتے۔ ایک موقع پر بڑی شفقت سے لکھا:
”یہ صحیح ہے کہ آج کل حق دار کو حق نہیں دیا جاتا، ذرا اپنی دوستیاد..... کو تو سنا دیجئے۔ کوئی سبیل نکالیں گے۔
اللہ نے انہیں اچھے کاموں کی توفیق دی ہے میری طرف سے بھی کہیے گا کہ طفیل نامی شخص جھک کر سلام عرض
کر رہا ہے اور کچھ کہہ رہا ہے۔“

کچھ ہی دنوں بعد صورت حال کو تازہ کئے پھر لکھا:

”یقیناً آپ اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے..... نہ ملے ہوں گے۔ بے شک اللہ پر بھروسہ
کرنا چاہیے مگر اللہ نے کچھ باتیں بندوں پر بھی چھوڑ دی ہیں۔“

بات ذرا لمبی ہو گئی مگر اس پر میرا کیا اختیار؟ یادوں کے دوش پر نہ جانے کہاں نکل گئے۔ لذیذ بودھکایت
دراز تر گفتہ مختصر اکہنا یہ تھا کہ ہمارے اُن کے تعلقات کی دنیا رسولِ غیر کے سامنے میں آباد ہوئی۔ شاداب ہوئی۔
اگر وہ رسولِ غیر نہ نکلتے تو شاید ہم سے بھی ملاقات نہ ہوتی۔!

۱ خط مرقوم ۱۷ اپریل ۱۹۵۵ء کو ہوا، اور ان کا خط پہلے سہفتہ ہی میں آگیا،

۲ خط مرقوم ۲۸ اپریل ۱۹۵۵ء

۳ خط مرقوم ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء

۴ خط مرقوم ۲۳ جولائی ۱۹۵۵ء

۵ خط موصولہ ۶ اگست ۱۹۵۵ء

اُس زمانہ میں انہیں نقوش کے ”محول“ مبرا کے سوا کسی چیز کا ہوش نہ تھا، اُن کی ساری دلچسپیاں، اُن کے ظاہر و باطن کا اُنکا زانہ کا اول، اُن کا آخر ”مبرا ہی تھا۔ وہ اس کی خاطر سب کچھ کرنے، لینے دینے کو تیار تھے۔ مبرا سے گزر جانا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں اُنہیں چھوٹے بڑے محروم و محمول، بلند پست کسی کی پروا نہ تھی اور حسب ضرورت منت غرضاء، نزعیب، نحر بیس، مطالبہ، نقاضہ، ڈانٹ ڈھیٹ، دھمکی، معذرت کہی سے عار نہ تھی۔ شاید اسی لیے وہ اُس حقیر فقیر“ تک بھی پہنچ گئے۔ اور بڑے مرنم لہجے میں پلکھا، یہی کیا کیا کیا نہ لکھا:

”میرا دل یہ چاہتا ہے کہ مجھے آپ کا قلمی تعاون حاصل ہو اور حاصل ہے تاکہ سب کے موضوع پر ایک کا زمانہ انجام دیا جاسکے۔ جسے اس موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکے۔“

”کرامی نامہ مل، مضامین ملے، آپ کا کرم برادر کم کشفی صاحب کا احسان کہ آپ سے تعاون کرایا۔ آپ نے مجھے مرعوب کر دیا۔ ایسا میری زندگی میں کم ہوا تھا۔“

”میں آپ کی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا۔ ناہن تو بچے کا غنڈ پر لکھ دوں، خدا مجھے اور آپ کو نوش رکھے۔“

”اگر ممکن ہو تو سیر کے کسی ایم موضوع پر کوئی اور چیز بھی لکھ ڈالیں۔ میں آپ کو تنگ اس لیے بھی کرتا ہوں گا کہ آپ انہی باتوں سے تھک سکیں، لہذا اسرا سمجھتیں۔“

”اپنی طرح اپنے غم کو بھی حرکت دیجئے۔ دوتیں منامیں بھیج دیجئے، اگر آپ کے مضامین اپنی دلوں نہ پہنچے تو۔۔۔“

بہر حال میں نے سب حال لکھ دیا ہے۔ اب آپ مانیں اور آپ کا کام۔ میں آپ کو بار بار یاد دلاتا ہوں کہ اُن کا کہہ کر کہ کام سمیٹنے میں لگ گیا ہوں۔“

”میں آپ سے ملنا تو اچھا ہوتا۔ غائبانہ حسب میں کام کرتے۔ غائبانہ رسول کا بھلا ہوتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ منت سماجت سب بیکار ہے۔“

۱۔ خط موصول ۳ اپریل ۱۹۸۳ء

۲۔ خط مرقوم ۱۰ اپریل ۱۹۸۳ء

۳۔ خط مرقوم ۲۵ اپریل ۸۳ء

۴۔ خط موصول جون ۸۳ء

۵۔ خط مرقوم ۳۱ جولائی ۱۹۸۳ء

۶۔ خط مرقوم ۱۱ ستمبر ۸۳ء

”آپ سے کُئی۔ وہ بھی بچی لے

چند لفظوں، چند حرفوں میں، انہوں نے جو کچھ کہا، جو کچھ کہا، اس کے ادبی محاسن پر، تو ادب والے، نظروں لے غور کریں،
پہلے اس طور جو سب جذبات رماں دواں ہے۔ اُسے تو ہم آپ دونوں دیکھ سکتے ہیں نا؟

تعلقات کی یہ نوعیت جو مجھ سے تھی اور نہ جانے کتنوں سے ہوگی کہ ہر ایک ان کا گردِ دیمہ تھا اور ہر شیدائے متوالا یہی سمجھتا
تھا کہ سب سے بڑا طفیل ”وہی ہے۔ بہر طور اُن کے چاہنے والوں کی صحیح تعداد شاید کسی کو معلوم ہو۔

ان کا کمال یہ دیکھئے کہ بادی النظر میں تو وہ ایک رنگ آموز، زندگی آمیز ادبی پرچے کے لیے محض ایک مضمون کا ”خُشک تناظر“
کرتے تھے، لیکن پھر اسی خشک کو ”تر“ بنا دیتے، پھر اُسے سمندر کی گہرائی عطا کر کے رگِ جاں سے ہم آہنگ کرتے، رشتوں کو نبھاتے،
وصنداری قائم رکھتے اور اپنی تمنائے مختلفہ کی تہدیدِ طوفانی کرنے کے لیے چن چن سے سمجھوتوں کو جمع کر کے ”جشنِ بہاراں“ کا اہتمام
کرتے، خود بھی خوش ہوتے اور دوسروں کو بھی خوش کرتے۔

جہاں تک میں نے دیکھا، میں نے جانا، طفیل صاحب کی شخصیت کا مناسب ترین مرکزی حوالہ ”عشقِ رسول“ ہی تھا۔ ان
کے اندر ”مذہبیت“ بڑی گہرائی میں اُتری ہوئی تھی، جسے انہوں نے لاکھ بھپانا چاہا مگر بالآخر ٹھپ نہ سکی۔ دیکھئے نا، پیر میں کی
تبدیلی سے ”سبوتے جاں“ کی ماہیت کیسے بدل جاتی؟ ہر سکتا ہے کچھ لوگوں کے ذہن میں اُن کی تصویر مختلف ہو اور وہ تین تین
سال والے محمد طفیل کو جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”کتابت سے ادارت“ تک کا سفر طے کرتے ہوئے جن لوگوں نے انہیں
دیکھا ہے اور جو ان کی روایت پرستی، ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحانات سے واقف ہیں ان کا رد یہی اور نہ ”جام“ کسی اور
”درد“ کو تلاش کریں مگر میرا تاثر بالکل مختلف ہے۔ میرے نزدیک ”جذبِ اندروں“ اور ”تڑپ“ کے بغیر، جذلوں کی صداقت کے
بغیر بارگاہِ رحمۃ للعالمین میں ایسی سوغات ”پیش نہیں کی جاسکتی تھی اور نہ ایسا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جاسکتا تھا۔ آرزوئیں
تمنائیں رکھنے والے الگ ہوتے ہیں اور محض تنہرت دولت چاہنے والے اور۔۔۔ رسولِ مبرک کے لیے سارا انتظام، سارا استہمام ان کا سفر شوق
تھا اور تمام نردِ چسپاں بس مشامِ جاں کو معطر کرنے کے لیے تھیں، نذر کے لیے تھیں۔ وہ خود بھی اپنی زندگی کا ماحصل ”اسی کو
گردانتے تھے اور یہ ان کے نقوش“ سے، ان کے صحیفہ دل کی ”سطر سے عیاں ہے۔“

————— ”میری گنہ گاری اپنی جگہ، توفیقِ ایزدی اپنی جگہ مگر سوال یہ ہے، کہ میرے

اس سفر شوق کا حال کچھ میرے رسولؐ کو بھی معلوم ہے؟ میں حاضر ہوں یا رسول اللہؐ

————— ”جب وہ مبرشائع ہوا تو دنیا بھر سے توصیفی خطوط آئے اور مجھے یاد رکھایا گیا کہ اس سے بہتر پرچہ

چھاپنا ناممکن ہے۔ مگر میرے دل میں کوئی اور ہی اراکۃ تھا۔ کوئی اور ہی تھا۔ آج ۱۹۸۲ء کے پہلے میں پورے اٹھارہ برس کے بعد اپنی محنت کے اعتبار سے، اپنی لگن کے اعتبار سے وہ حاصل زندگی نمبر پچیس کر رہا ہوں کہ جو میرا منتہا تھا۔

”آج میری وہ آرزو پوری ہوئی جن کے لیے بہل بے کل رہا۔“

”بچپن کی بات کہ جب میرے دینیات کے اُستاد نے کہا: ”ہمارے رسولؐ دنیا کی ایسی ہستی تھے کہ ان میں سرخوئی موجود تھی۔ یہ بات ذہن میں جم کر رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ بچپن کی اس ذات نے میرا چھاپنا زندگی بھر نہ چھوڑا۔ تحت اشعر کی بات ”رسولؐ“ میں چھلک پڑی تھی۔“

”آج جب میں سیرتِ رسولؐ کے مطالعہ سے گزر رہا ہوں۔ دنیا کی ساری آسائشیں میری گود میں ہیں، پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ کاشکش میں حضورؐ کے زمانہ میں ہوتا۔ میرا شمار بھی ”اصحابِ صفہ میں ہوتا ہے۔“

”کسی طرح اور کسی کے فین سے سیرت کے موضوع پر دستِ جلدیں منکل ہو گئیں۔ یہ وہ خواب تھا جو میں نے دکھا۔ زندگی بھر دیکھا تھا۔ خواب سب دیکھتے ہیں، تعبیر کوئی کوئی دیکھتا ہے۔۔۔۔۔ عرض جس عبادت کی ابتداء تینیس برس پہلے کی تھی وہ ایک ”بڑے کام“ کے لیے بطور ”مشق“ کام آئی ہے۔“

”میں پہلے ادب کی چوکت پر کھڑا تھا۔ اب حضورؐ کی بارگاہ میں ہوں۔“

..... ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کا ایک شعر.....

و بحق جاہل اتنی باک مغرم

واللہ یعلم اتنی اہواک

(مجھے آپ کی عزت و عظمت کی قسم! میں آپ سے بے پناہ محبت رکھتا ہوں اور اللہ میری اس والہانہ

محبت کا گواہ ہے)۔

دعویٰ کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں۔ میرا دعویٰ کوئی نہیں۔ میں تو صرف ”عاشقانِ رسولؐ“ کی صف

۱۔ رسولؐ نمبر کی کتابت کا آغاز ۱۹۷۷ء میں ہوا تھا۔

۲۔ طلوع — جلد چہارم

۳۔ ایضاً

۴۔ جلد ششم (اس شمار سے ہیں)

۵۔ طلوع — جلد ہشتم

۶۔ جلد دہم — عجز و شکر ص ۵۶، ۱

میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں وہ بھی سب سے آخر میں۔“

آدمی جب کسی میں "اتنا ڈوب جائے تو خود آسے کہاں کا ہوش رہتا ہے؟ مگر شاید یہ کوناہ طرفوں کا معاملہ ہو جو راج کے پالیس وہ ایسے ہوش مند ہو جاتے ہیں کہ "گرتوں کو تھام" لیتے ہیں۔ انھیں دیکھتے معنائیں کا تقاضا بھی انتخاب بھی، خطوط اور خطوط کا جواب بھی، کاروبار کی دیکھ بھال بھی، بال بچوں، پوتی پوتوں کی خبر گیری، دوا دارو بھی، کتا بست کی نگرانی، ڈاک بٹلی پارسل کی ہدایت بھی، مگر کیا مجال کہ "چمن بندی" سے غافل ہو جائیں۔ یا خوب سے خوب تر کی تلاش میں نہ رہیں۔ جیسے وہ خود تھے پسند بھی اُسی درجہ علاقی۔ رسول نمبر ہزار تحریریں کا انتخاب ہے۔ نئے سے نئے پہلو تلاش کرتے۔ موزوں سے موزوں آدمی ڈھونڈ نکالتے اور کھواتے، چلے نوٹس دیکھ کر پٹے چاہے ادائیگی، چاہے دھکی۔ انھیں دھن سوار ہو جاتی تو پھر نہ اُترتی۔ شروع شروع کی بات ہے، کراچی آئے، کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ سہیل جیس میں قیام تھا، مجھے بلایا اور ایک بڑا موٹا تازہ ہجیم شمیم سامتودہ دکھایا۔ کہنے لگے چپا پنا ہے رائے دو۔ رائے دی گئی "ظاہری حجم زیادہ ہے معنوی وزن کم"۔ پس پھر کیا تھا، تقاضے شروع ہو گئے اور "دارپوار" کرنے لگے۔ میں نے "منہ بند کرنے کے لیے" جلدی جلدی مکمل کر کے ایک قسط "بیج دی۔ مگر وہ اصل معاملہ "بھانپ گئے۔ بغیر مہلت دیئے نکھا :

— پی آئی اے والوں نے ٹیلیفون کیا کہ کراچی سے ایک پکیٹ آیا ہے وہ لے جایئے۔..... میں مستودہ لینے خود پہنچا۔ وہیں کھولا۔ طبیعت خوش ہوئی۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ جمال اچھا ہے وہ آپ نے الگ باندھ کے رکھ لیا یعنی دوسری قسط!..... اگر آپ کا مضمون یونہی سا ہوتا تو اصرار نہ کرتا، اب تو بہ اصرار کہوں گا، بہ منت کہوں گا مضمون مکمل کیجئے، براؤ کر مضمون مکمل کیجئے۔ اگر خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو صبر بھی بہت کر لیا.....“

مجھے یقین ہے کہ شرق و شفق ہشیانگی و دازنگی اور حدود و دستحدی انہوں نے "رسول نمبر" کے لیے دکھائی اور جی جان لگا کر "لالہ کی خاندی" کی وہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ میں تو ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہوں چلے کہاڑا ہی کہیں نہ ہو جائے میں تو تخت یا تختہ "کا فائل میں" غالباً اسی لیے نقوش کے تمام نمبر دوسروں پر بازی لے گئے کہ ان کا مرتب خود بھی کام کرنا جانتا تھا اور دوسروں سے کام لینا بھی اسے خوب آتا تھا۔ یہ کام ہر ایک نہیں کر سکتا۔ تاہم "رسول نمبر" چونکہ حاصل زندگی تھا، اس لیے ان کے جذبات کی آئینہ "اس میں تیز ہوں، تیز ہوں اور تیز ہوں۔ یہاں تک کہ وہ "شعلہ" آخری بار بھڑکا اور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ "میرے ایک دوست نے کہا تھا، سیرت پر خدمت گزاری، ہر ایک کو اس نہیں آتی۔

۱۷ خط موصول جون ۱۹۷۳ء

۲۷ برادرزادہ عزیزم جاوید طفیل کی روایت ہے کہ رسول نمبر کے بعد وہ خواہاں تھے کہ نقوش کا کاروبار بند کر دیا جائے اور پھر عملاً یہی نمبر ان کی زندگی کا آخری نمبر ثابت ہوا۔

شبلی نعمانی نے کام شروع کیا وہ مر گئے، قاضی سلیمان منصوری کا مفصل کتاب لکھنے کا ارادہ تھا وہ مر گئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ اطمینان لکھنے کا ارادہ تھا وہ مر گئے لہذا تم بچو! میرا جواب تھا ”زہے نصیب“ ^۱ مطلب صاف ہے کہیں وجدان دور کا منظر قریب کر دیتا ہے۔ وہ واقعی خوش نصیب نکلا۔ اندر بھی سچا باہر بھی سچا، اندر سُندر، اوپر سُندر، اوپر چھپ گیا وہ چلا گیا مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اپنے ”خالوس الفاظ“ میں وہ موجود بھی تو ہے، اس نے بہت پہلے کہا تھا۔

میں بھی جب غار میں جا کر چھپ جاؤں گا اور صدیاں بیت جائیں گی، تو میرے بال سفید ہرچکے ہوں گے مگر میرے پیش کردہ الفاظ جو میرے رسولؐ کی زبانی سے نکلے ہوں گے جوں کے توں ہوں گے۔ سچے الفاظ کبھی بولھے نہیں ہوتے۔ ^۲

اُن کی یادیں تو بھی ”جوں کی توں ہیں۔ یادیں بھی تو کبھی ”بوڑھی“ نہیں ہوتیں!!
کوئی کیا جانے میں اور وہ
اب کس دنیا میں رہتے ہیں

نذر جناب محمد طفیل مدیر نقوش

کارواں درکارواں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے
 منزلوں کے رازداں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے
 بے خبر انجام سے چلتے تھے جو چلتے رہے
 کون تھے آئے کہاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے
 خواب میں بھی ذکران کا خواب کی صورت ہوا
 کل ہمارے درمیاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے
 جو فنا کو بھی بقا کے ولولے دیتے رہے
 محرم رنگ جہاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے
 بول تھے انمول جن کے وہ سخن کی آبرو
 محفلوں میں گلفشاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے
 آسمانِ علم و فن کے راستوں کے شہسوار
 سرزمینِ مہوشاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے
 ہیم شکستِ دیدہ و دل کی عبارت ہیں ظفر
 حاصلِ صدِ مکششاں کچھ لوگ جانے کیا ہوئے

قطعات تاریخ وفات محمد طفیل مرحوم

تھا ادب کا وہ ایک بطلِ عظیم
”صاحبِ وصف“ تھا کئی تاریخ
نیک تھا عزم اس کا عزمِ صمیم
”ہے مقامِ طفیل خلدِ نعیم“
۲۴۷
۱۱۲۹ + ۲۴۷ = ۱۳۷۶

تھی ادب میں طفیل کی تعظیم
لے سرِ بعد یہ کئی تاریخ
اور رسالہ نقوش نقشِ سلیم
انتقالِ طفیل رنجِ عظیم
۱۹۸۶ + ۲ = ۱۹۸۸

چھپ گیا اب جو تھا ادب کا سہیل
”تازہ غم“ ہے رہے ”بہم“ نہ نجوم
بڑھ گئی اور بھی وہ ظلمتِ یل
رنجِ کوہِ گراں ہے مرگِ طفیل
۱۳۵۳ - ۲۴۷ = ۱۳۰۶

اب نہیں ہے طفیل، نظم نہیں
بزمِ درہم کرو! ”بہم“ کیوں ہو؟
اور کسی میں وہ پختہ عزم نہیں
”تازہ غم“ ہے کہ میرِ بزم نہیں
۱۳۵۳ - ۲۴۷ = ۱۳۰۶

مرگِ طفیل کی تھی خبر جب ملی
درہم ہو بزم ”ہائے سرِ بزم“ اب کیاں
تاریخ کی تھی فکر سو تاریخ یہ کئی
”غم تازہ“ ہے کہ ہو گئی رحلتِ طفیل کی
۱۳۵۳ - ۲۹ + ۲ = ۱۳۸۶

چودہ سو چھ تھا ہجری کا سن اس جہان میں
سن ایک ہزار نو سو چھیاسی تھا عیسوی
”رحلت ہوئی طفیل کی جن کی نہیں نظیر“
جنت گئے طفیل کہ ماہر تھے اک مدیر

غزل نما

مصنفہ ادا جعفری
ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی -
قیمت ایک سو روپے

غزل نما قدیم شعر کا تذکرہ ہے جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یہ ۷۷ صفحہ کا محیط ہے۔ اس میں ۳۷ قدیم شعرا کے مختصر و جامع حالات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا مختصر نمونہ بھی دیا ہوا ہے۔ اس تذکرے کا پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۱ء) اور آخری شاعر میاں داد خاں (متوفی ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) ہے چونکہ اس تذکرہ کی ترتیب شاعروں کے سال وفات کے حساب سے قائم کی گئی ہے اس لیے ہم اسے ۱۶۱۱ء سے ۱۹۰۷ء تک کے چند نمائندہ شاعروں کا تذکرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابتدائی دور کے ان شعرا سے اردو کی بتدریج ترقی اور عہد بہ عہد کی شاعرانہ شوگالیوں کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ اردو زبان علاقائی زبانوں کو کس طرح ساتھ لے کر چلی اور اپنی فطری متناساری، کشش اور جاذبیت سے کس طرح ان میں گھل مل گئی۔ رفتہ رفتہ کس طرح ان کو متاثر کیا اور آخر ان پر چھا گئی۔ ہر دور کے شاعروں نے اس کی صلاحیتوں کو پر ان چڑھانے میں کیا کیا رول ادا کیا؟ کس طرح ایک نئے ماحول کی بنیاد ڈالی گئی اور ہر وقت کے ساتھ ساتھ ہر ولعزیز اور مانوس ہوتی گئی؟ اس کے علاوہ محترمہ ادا جعفری کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ مذکورہ قدیم دور کے وہ شعرا جو اپنے اپنے وقت میں نامور اور استاد کی درجے پر فائز تھے اور جو آج عام قاری کے ذہنوں سے اُتر گئے ہیں ان کا بھی مجملہ تعارف ہو جائے، اور شیدایانِ علم و ادب سے ملک کے اہل قلم کو ان کے کارناموں سے آگاہ کیا جائے۔ یہی وہ جذبہ ہے کہ جس سے سرشار ہو کہ مصنفہ نے غزل نما کی شکل میں یہ تذکرہ مرتب کیا جو اپنی افادیت کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے جس کا تعلق حال سے کہیں زیادہ مستقبل سے ہے۔ کیونکہ زمانہ جتنا آگے بڑھتا جائے گا اس کی قدر و قیمت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا اور آنے والے رُہِ روانِ ادب اس سے روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔

مصنفہ چونکہ خود اعلیٰ درجہ کی کمنڈ مشق شاعرہ ہیں اور شعر کی باریکیوں سے بخوبی آشنا۔ اس لیے شعروں کے انتخاب میں انھوں نے جس شرف نگاری اور محنتِ شوق سے کام لیا ہے اس سے ان کی بالغ نظری اور شعر شناسائی کی خصوصیتیں جھلکتی ہیں اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں شعر کے پرکھنے کا ملکہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ غزل نما میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے مختلف شعرا کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ غزل کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر قسم کے عاشقانہ، موعظانہ، زندانہ، فلسفیانہ خیالات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی مسائل پر بھی اس میں گھل کر بات

کرنے کی گنجائش ہے اور شعر اپنی غزلوں میں مذکورہ موضوعات کے علاوہ بھی مختلف جذبات پر خامہ فرسائی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ غزل اپنی وسعت کے اعتبار سے تمام اصنافِ سخن پر بھاری ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ شعر غزل میں اپنے لیے نئے نئے موضوع و مضمون تلاش کرتے رہتے ہیں اور یہ کسی حد اور قید کے پابند نہیں۔

مذکورہ میں عام طور سے خوبیاں کم اور کمزوریاں زیادہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ شاعروں کے حالات، ان کے سالِ پیدائش و وفات اور ان کے عہد کا خیال کم رکھا جاتا ہے۔ زیرِ نظر تذکرہ میں راقم الحروف نے مذکورہ اندراج میں سے جب چند ایک کی پڑتال کی تو ان کو صحیح پایا جس سے مصنف کی تحقیق اور ان کی دیدہ وری کی داد دینا پڑتی ہے بعض غیر شاعروں کے مرتبہ انتخابِ کلام میں بھی کئی قسم کے سقم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک شاعر کے اشعار دوسرے شاعر کے کلام میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی شعر مختلف شاعروں سے منسوب کر دیا جاتا ہے لیکن زیرِ نظر تذکرے میں کہیں ایسی صورت نظر نہیں آتی۔ اداجعفری صاحبہ مشہور شاعرانہ ذوق رکھنے والے اہل قلم میں سے ہیں۔ اس تذکرے کی تصنیف میں انہوں نے جس انہماک، کوشش اور سلیقے سے کام لیا ہے اہل نظر اسے ہمیشہ سراہیں گے۔ حالات کی ترتیب میں تفصیل کی بجائے ایجازِ نویسی سے کام لیا گیا ہے جسے ان کے قلم کا اعجاز کہنا چاہیے۔ یہ تذکرہ اس وقت زیادہ مفید ثابت ہوگا جب کبھی تقابلی مطالعہ میں اسے پرکھا جائے گا۔

اس تذکرہ کا تعارف ملک کے مشہور محقق و نقاد جناب جمیل الدین عالی کے قلم کا مرہونِ منت ہے ”غزلِ نما“ کو کتابی شکل میں چھاپنے کا فیصلہ محترم قدرت اللہ شہاب کے ایما پر کیا گیا ہے جو آج ہمارے سامنے ہے۔ پیشِ لفظ خود محترم اداجعفری صاحبہ نے لکھا ہے جس میں انہوں نے متن کی تیاری، حوالہ جات کی فراہمی اور دوسرے کٹھن مشکلات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، ساتھ ہی انہوں نے جنابِ مشفق خواجہ کا نام بہت احترام سے لیا ہے اور ان کی اعانت کی بے حد تعریف کی ہے۔ یہ ایک قیمتی اور نادر اشاعت ہے۔ امید ہے کہ اہل نظر اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے تاکہ جس ادبی مقصدِ وجید کے پیشِ نظر یہ تذکرہ منصوبہ شہود پر آیا ہے وہ بخیر و خوبی پورا ہو سکے۔

(ک۔م)

ہمسفر بگولوں کا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور فن کا مطالعہ

ناصر زیدی

اتر: ڈاکٹر طاہر تونسوی، ضخامت: ۳۳۲ صفحات، قیمت: -/۷۵ روپے، ناشر: سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور۔

آج کی زیر تبصرہ نئی کتاب ہمسفر بگولوں کا، ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کے ممتاز و منفرد اور مامور نقاد، ادیب، محقق اور افسانہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور فن کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر بنیادی طور پر ایک تخلیقی قلم کار ہیں اگرچہ ان کی شہرت بحیثیت نقاد زیادہ ہے۔ ان کی ایک تنقیدی کتاب ”اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ“ تو گویا ان کے نام کا لاجندہ بن چکی ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا اور وہ ادب کی دنیا میں اپنی پہلی تنقیدی کتاب ”نگاہ اور نقطے“ کے ذریعے متعارف ہوئے، تاہم وہ افسانہ بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ سنہ ۱۹۷۰ء میں شائع نہیں ہوا مگر ایک ناولٹ ”ضبط کی دیوار“ کے عنوان سے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ کلام نرم و نازک کے نام سے ان کی ایک طنزیہ مزاحیہ تصنیف بھی ان کے شعبہ ادب میں اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی زیادہ تر مطبوعات تنقید و تحقیق کے زمرے میں آتی ہیں جب میں اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کو بیسٹ سِلر (BEST SELLER) کا درجہ حاصل ہے اور اس کتاب کے اب تک گھگ ایک درجن ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ پاکستان میں سی ایس ایس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ آج تک کسی تنقیدی کتاب کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ چودہ برس کے عرصے میں بارہ تیرہ مرتبہ شائع ہو سکے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اس معرکتہ آراء کتاب کے علاوہ دیگر معروف تصنیفات میں ”ادب اور لاشعور“، ”تنقیدی دبستان“، ”ادب اور کلچر“، ”افسانہ حقیقت سے علامت تک“، ”تحقیقی اور لاشعوری محرکات“، ”شعور اور لاشعور کا تنازع، غالب“ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک اور خاص موضوع اقبالیات بھی ہے اور اس ضمن میں ان کی بہت سی کتابوں میں ”مکر اقبال کا تعارف“، ”اقبال اور ہلے مکر کی رچی“، ”مکر اقبال کے متورگوشے“، ”اقبال شعاع صدرنگ“، ”اقبال محمود ورج عالم“ اور ”اقبال کا نفسیاتی مطالعہ“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو تنقید و تحقیق کے علاوہ نفسیاتی موضوعات سے بھی خاص لگاؤ ہے، ان کے پی اتھ ڈی کے مقالے کا موضوع بھی ”اُردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان“ تھا۔

زیر نظر کتاب ”ہمسفر بگولوں کا“ ڈاکٹر سلیم اختر کے تمام ادبی کا ناموں اور نمک و نمک کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کتاب کے مصنف

ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر سلیم اختر کے شاگرد و رشید ہیں اور انھوں نے اپنے استاد کے ہمہ جہت اور ہمہ رنگ ادبی کاموں کے بارے میں یہ کتاب لکھ کر فی الحقیقت شاگردی کا حق ادا کیا ہے۔ عموماً اس قسم کی کتابوں کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ مدوح خود ہی اپنے بارے میں ”تصنیف مدحیہ“ لکھ کر اپنے کسی شاگرد یا دوست کے نام سے شائع کر دیتے ہیں مگر ذریعہ تبصرہ کتاب ”ہمسفر بگلوں کا“ میں یہ شائبہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک ذمہ دار ادیب اور نقاد ہیں۔ انھوں نے اس سے پہلے بھی تنقید و تحقیق کے میدان میں خاصا کام کیا ہے، ان کی یہ کتاب بھی بلاشبہ ان کے تنقیدی و تحقیقی کام میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنی کتاب ”ہمسفر بگلوں کا“ میں جو چند عنوانات قائم کیے ہیں وہ یوں ہیں :

”لفظوں کی مالا — ”بگولے کا اضطراب“ — ”تنقید میں نگر نو کا داعی“ — ”ادبی تاریخ کے خارزاروں میں“ — ”اقبال نسائی میں نئی جہت“ — ”باطن کی تاریکی میں روشنی کا متلاشی“ — ”مزاج کے پھول میں طنز کا خار“ — ”نفیات اور جنس کے تنے رستے پر“ — ہر ایک مقام سے آگے نکل گیا۔ مزید! —

ان عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے ہی مصنف کے مہدوح کی شخصیت کے منوع ہولے کا سراغ مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے، ڈاکٹر سلیم اختر کے فکر و فن کی ابتداء سے لے کر عروج تک کی داستان کو حوالوں کے ساتھ خوبی و خوبصورتی کے ساتھ رقم کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے فن اور شخصیت کے متعلق جہاں بھی اور جو کچھ بھی لکھا گیا، اس سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ایک مربوط تذکرہ لکھ دیا ہے جو نہ صرف ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی و تحقیقی اور تخلیقی کاموں پر روشنی ڈالتا ہے، بلکہ ان کے فن اور شخصیت پر آئندہ چل کر کام کرنے والوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

”نقشِ نحریر“ کے عنوان سے ایک خاصہ مختصر حصہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریروں سے انتخاب پر مبنی زیرِ نظر کتاب ”ہمسفر بگلوں کا“ میں شامل ہے۔ کچھ منتخب مضامین کے عنوان یہ ہیں —

”غزل میں تصورِ محبوب“ — ”بکری“ — ”بشرے دی برزو“ — ”بھجوروں کا موسم“ — ”میکار“ — ”دہانِ غالب“ کی تقریبِ رومنائی“ — قصہ ہیرا پنجا بطرزِ جدید“ — ”زنانہ کرکٹ میچ پر کنٹری“ — ”گوگرد اماؤ وغیرہ“۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر سلیم اختر کے غیر مدون مضامین کا اشاریہ کتابیات کے عنوان سے مرتب کر کے شامل کیا گیا ہے۔ — عرشِ صدیقی نے فلیپ پر جو رائے لکھی ہے اس سے اتفاق کیے بنا چارہ نہیں کہ —

اس کتاب کا ہر باب ڈاکٹر سلیم اختر کے بنیادی نظریات کی نشان دہی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی یہ تصنیف اردو کے ایک اہم نقاد اور افسانہ نگار کے نگری ارتقاء اور اس کے افکار کی روشنی میں آج کے انسان، معاشرے اور عصر کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگی۔ یہ تصنیف، محبت اور عقیدت کا ثمر ضرور ہے، لیکن اس کے ساتھ مصنف کی بالغ نظری اور اس کے اعلیٰ تنقیدی شعور کا ثبوت بھی ہے۔

مجموعی اعتبار سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تصنیف لطیف ”ہمسفر بگلوں کا“ ایک قابلِ ستائش کاوش ہے۔
 اس کتاب سے زندہ شخصیات پر ان کی زندگی ہی میں اعترافِ فن اور اعترافِ عظمت کی خوشگوار روایت مستحکم
 ہوتی نظر آتی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، گروپشس، جلد بندی، سب کچھ معیاری ہے اور قیمت
 - ر ۵۰ روپے مناسب -

کاکلِ عنبر — اظہر صدیقی

جیلانی کامران

ہمارے شعری ماحول میں غزل کی پذیرائی اس امر کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے کہ غزل کو سننے اور پڑھنے والے اس شعری روایت کی برابر پاسداری کر رہے ہیں اور شاعری کے نئے رویوں نے غزل کو بدستور اپنے درمیان مقام دیا ہے تاہم اس پذیرائی کی ایک عمرانی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے دور میں وہ سارے اجزا برابر موجود ہیں جن سے غزل کی شاعری رونما ہوتی رہی ہے ایک ایسا زمانہ جو حسب حال نظر نہیں آتا ایسے انسان جن سے کم و بیش کوئی بھی شخص غرض نہیں ہے اور ایسے واقعات جو پریشانیوں کو نئی پریشانیاں ہی دیتے ہیں رہتین اجرائی خرابی خراب لوگ اور خراب حالات ہر دور میں اپنے عہد کی غزل کو استعارے، انداز کرب اور انسان کے بارے میں اچھی یا بُری رائے فراہم کرتے رہے ہیں ہمارے عہد کی غزل نے اس ماحول میں احتجاج کے رویوں کو بھی نمایاں کیا ہے فرد کے انسان ہونے کے تصور کے ضائع ہونے کا ذکر بھی کیا ہے اور علم کے لہجے کو مناظر فطرت کے ساتھ جوڑتے ہوئے فطرت کو بھی شاعر کے کرب میں شامل کیا ہے جن اہل نظر نے اس عہد کی غزل کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھا ہے انہوں نے اپنے انداز میں غزل کے بارے میں رائے بھی دی ہے اور عموماً کیا ہے کہ غزل اپنے عہد کی دستاویز بن رہی ہے یعنی میں بھی اس زمانہ جہاں جانتا ہے جس میں شاعر کے ساتھ بے شمار دوسرے لوگ برابر جی رہے ہیں تاہم دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر زمانہ لوگ اور حالات تینوں کی صورت، دگرگوں اور نراب ہے تو نہ صرف غزل اس کیفیت کو استعاروں میں محفوظ کرتی ہے بلکہ آسمان اور مناظر فطرت نام کی وسعتوں کو بھی ایسے ہی رنگوں میں نمونہ کرتی ہے دوسرے لفظوں میں ایسی غزل کا شاعر اپنے تاریک تاثر کو کائنات کی دوریوں تک پھیلانے کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور ہر جانب احتجاج کے سلسلے کی تصویر ثبت کرتا ہے ایسے ماحول میں اظہر صدیقی کی غزل کچھ نئے رویوں کی نشان دہی کرتی ہے اور کچھ نئے گوشے ظاہر کئے ہیں

پہلی بات جو اس غزل نے اپنے انداز میں کہی ہے یہ ہے کہ جنت سے بچھڑنے کا جو حادثہ انسان پر گزرا تھا اس سے کہیں بڑھ کر اور شدت میں غالباً کہیں زیادہ سنگین حادثے اس پروردگار کے دوران گزرے ہیں اور شاید ایسا ہی سنگین حادثہ ایسی صورت میں اترتا بھی ہے جہاں زمانے، لوگوں اور واقعات ان تینوں کی حالت نراب اور دگرگوں ہے۔ اظہر صدیقی ایسے حادثے کو اپنی نسل کے دائرہ عمر کے ساتھ منسوب کرتے ہیں لیکن یہ بات تو ہر کوئی کہتا ہے اور کہنے کا حق رکھتا ہے اظہر صدیقی نے جو فکری جہت اس کیفیت میں شامل کی ہے وہ ایسے سنگین حادثے میں انسان کے بارے میں ہے کہ وہ ایسی دگرگوں کیفیت میں کیسے جی سکتا ہے؟ اس اعتبار سے میں اس شعری مجموعے کی اس غزل کو مرکزی لہجے کی غزل خیال کرتا ہوں جس کی ردیف میکہ ہے اور تاقیہ منہ بھلا اور چلنا ہے۔۔۔۔

ان پر رونق ویرانوں میں میری جان سنبھلنا سیکھ

اظہر روشن تاریکی میں سنبھل سنبھل کر چلت سیکھ

سے چارہ گروں سے بات نہ کر
اور اپنی آگ میں جلتا سیکھ

اس غزل کا محسوساتی جغرافیہ بھی کچھ عجیب سا ہے۔ شاعر نے دیرانوں کو پر دلتی بتایا ہے اور تاریکی کو بھی روشن کیا ہے... تاہم یہ جغرافیہ، چاند اور اسٹروٹائٹس کے اشاروں کو بھی اپنے دائرے میں شریک کرتا ہے اور اس حوالے سے شاعر اپنے آپ کو اسٹروٹائٹس کے انسانی شخص میں شامل کرتا ہے جو سطحِ مہتاب پر اترے تھے.... اس کتاب کا فلیپ لکھنے والوں نے غالباً اس حوالے سے شاعر کو انسان کا نمائندہ بھی قرار دیا ہے شاعر کا خیال ہے کہ تیرہ سبھی کے اندھاروں میں من کی جوت ہی میں جلنے سے انسان کی ان پریشانیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے جن سے وہ گزر رہا ہے یہ غزل شاعر کے پردے میں اظہر صدیقی کو اور اظہر صدیقی کے پردے میں اہل درس و تدریس کو نمایاں کرتی ہے اور کچھ ایسے انداز میں سرگوشی کرتی ہے کہ چاند سر ہوا انسان اترے ہی وہ بھی مجھ سے مختلف نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ اگر ہم بھی اپنے دل کی آگ میں جلنے کا انداز اپناتے رہیں تو وہ رفیقیت بھی ہم تک ضرور پہنچ پائیں گی جس کی تمنائیں ہمارے شب و روز جل رہے ہیں اظہر صدیقی کا فلسفہ کچھ اس انداز میں تلقین کرتا ہے کہ درد کی ٹخنیوں میں ہی اظہر بیٹھے والوں نے زندگی پائی.... اگر جو کچھ میں نے کہا ہے درست ہے تو یہ کہنا بھی قابل غور ہے کہ اظہر صدیقی کی غزل اضطراب کی غزل ہے جو احتجاج اور غم و درداں کے بعد آنے والے مقامات کا دھندلا سا علم بھی دیتی ہے! تاہم اضطراب کا ردیہ اس غزل کا اور اس مجموعے کا مرکزی اور بنیادی رویہ دکھائی دیتا ہے!

لیکن اضطراب کیوں اور کس بات کا؟ یہ سوال شاعر کے حوالے سے ضروری دکھائی دیتا ہے....
معلوم نہیں شاعر نے یہ اور اس طرح کے دوسرے اشار کس مفہوم کو ملحوظ رکھ کر کہے ہیں....

سہ ڈوبتے چاند کی کرنوں کی صدا کون سُنے
لوگ تو ڈوب چلے وقت کے طوفانوں میں
کرتا ہے آسمان بھی افق پر مجھے سلام
گردوں کی سمت آنکھ مری جب ذرا اٹھے
جب تک روا چمن میں تھی اہل نظر کی بات
ہر گوشہ چمن سے کئی ہم نوا اُٹھے
ہر چند پر و تار بھی رو داد دلبری
لیکن وہ جذبِ شوق سے نا آشنا رہی

ان چند اشار میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کو عموماً شکایتِ زمانہ اور احتجاجِ درداں کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے لیکن مجھے ان میں اضطراب کی کیفیت دکھائی دیتی ہے مثلاً ڈوبتے چاند کی کرنوں کو صدا بنا کر شاعر نے لوگوں کی توجہ کو اس سلسلے کی جانب مبذول کر دیا ہے۔ چاند جو آسمان پر چمکتا ہے وہ ڈوبتا اور نکلتا ہے لیکن بہت کم صدا بنتا ہے؟ اس لئے یہ سوال ابھرتا ہے کہ کون سا چاند ڈوب رہا ہے اور کیوں اس کی ڈوبتی کرنوں کی صدا سننا ضروری ہے؟ یہ مصرعہ ایک دوسری کیفیت کو بھی اپنے محسوسات

میں شریک کرتا ہے کہ لوگ تو زمانے کے سیلاب ہی میں ڈوب چکے ہیں! کہیں یہ شعر ان قوموں کی حقیقت حال کی جانب تو اشارہ نہیں کرتا ہے جن کے پرچموں پر چاند کی علامت نظر آتی ہے! شاعر کا اضطراب جو دوسرے اشعار میں بھی برابر کارفرما ہے غالباً اس لئے ہے کہ خرابی دوران نے انسان سے اعلیٰ مقامات کی سرفرت چھین لی ہے۔۔۔ شاعر کا یہ دکھ قابلِ توجہ ہے!

لیکن اہم صدیقی کا انسان جغرافیے سے بے نیاز نہیں ہے۔ کیونکہ جو اسٹروٹائٹس، خلا، سیاحتی اور چاند کی تسخیر کرنے گئے تھے وہ جن تمدنوں کے نمائندے ہیں وہ تمدن غالباً انسان کے اعلیٰ ذہنی مقامات سے محروم نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی واقعی محروم ہے تو وہ شاعر کے آپے تمدن کا انسان ہے اہم صدیقی کا اضطراب اس اعتبار سے اپنے ہی کمرے کے بارے میں ہے اور وہ اپنے ہی انسان کے لیے پریشان ہے کہ یہ انسان جذب شوق سے مدبر روزنامہ ناشر ہو رہا ہے۔

اطہر صدیقی کی غزل میں مثالی انسان کی تلاش کا ذکر بھی کیا گیا ہے میں اس بارے میں کچھ تیوں کہوں گا کہ اطہر صدیقی کی غزل میں جو دکھ اور جو آرزو برآمد ہوئی ہے اس کے مجموعے سے امکانات کا سفر ایک شکل اختیار کرتا ہے یہ ابتداء اس سلسلے میں ایک مختلف پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اطہر صدیقی نے بار بار کہکشاں کو رہنما بنا کر کہا ہے جب کیا ہے کسی نے عزم سفر کہکشاں بن گئی ہے راہ گزور۔۔۔ اس غزل میں اسی اشارے کو دوسرے اشارے بھی نمایاں کرتے ہیں۔ شاعر نے اس غزل میں لوک پلچ کو کچھ اس طرح استعمال کیا ہے کہ کہکشاں اور راہ گزور کے اشارے مدوح اور عظمت کے اشارے بن گئے ہیں اور عام لوگوں کی یادداشت میں بھی یہ امر برابر زندہ ہے کہ کون تھا وہ جس کے گرد راہوار سے کہکشاں نے راستے کی صورت پائی تھی بچے آج کل بھی عموماً اپنی بوڑھی اور بزرگ خواتین سے پوچھتے ہیں کہ معراج کی رات کو کون کی سواری کہکشاں سے گزری تھی؟ اطہر صدیقی نے ان اشاروں کو کھولا نہیں ہے۔ اپنی غزل میں معنی رکھا ہے۔ کیوں کہ اہل نظر اور آئینہ دار شمس و قمر اس فنی امر سے بخوبی واقف ہیں۔ اپنی غزل کی مدد سے شاعر نے اپنے عہد کو عروج و سفر کی یاد سے آباد رکھنے کی سعی بھی کی ہے۔

اگر صدیقی کی غزل میں اور خوبیاں بھی ہیں جن کی جانب پڑھنے والے راغب ہوتے رہیں گے میں نے جس خوبیوں کا ذکر کیا ہے انہیں بھی اس ذیل میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

”دخل در معقولات“ ایک نظریں

احمد ظفر

تنقید کرنا نہ تو آسان کام ہے اور نہ ہی یہ جلد ہضم ہوتی ہے۔ مگر بعض اصحاب ایسے بھی ہیں جو اپنے تنقیدی شعور کی ’لٹھ‘ کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور ایک ایسی چھڑی کو ہاتھ میں لے کر جھٹکنا شروع کر دیتے ہیں جس سے شعلوں کی بجائے پھول جھڑتے ہیں۔ اس طرح ادب میں نہ تو دخل در معقولات کا طعنہ ملتا ہے اور نہ ہی کسی کی جائز ناجائز نارائے کا خطرہ رہتا ہے اس کے باوجود دخل در معقولات پر کچھ نہ کچھ بات کرنے کی گنجائش رہتی ہے۔

ارشاد میر صاحب نے دخل در معقولات لکھ کر کچھ ایسے بسورتے ہوئے ہونٹوں کو گلکشاں کرنے کی کوشش کی ہے جو برسوں سے اپنے مقدر کو رو رہے ہیں۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ رونے والوں کو ہنسنا نا کوئی اچھی بات نہیں بالکل درست فرمایا آپ نے، جس طرح چھپ کر بات کرنے سے منہ پر بات کرنا اچھی بات نہیں اسی طرح ارشد میر کے کارنامے دخل در معقولات یا ارشد میر کی دخل در معقولات کو بھی بُرا نہیں کہا جائے گا۔ کارنامہ مذکور ہے اس لیے ارشد میر کے دخل در معقولات کتاب مونس ہے۔ چنانچہ ارشد میر کی دخل در معقولات دونوں صیفے اپنی حسبِ درست ہیں۔ کتاب اور کتاب کے مصنف کے نام کی تکرار بار بار اس لیے کی ہے تاکہ کچھ دیر کے لیے یہ دونوں مضمون آپ کو یاد رہ جائیں۔

اردو ادب میں پطرس طنز و مزاح لکھنے والوں کے قافلہ سالار ہیں اور اس قافلے کے دوسرے شرکا‘ رشید، شوکت، شفیق، یوسفی اور کچھ دیگر وغیرہ قسم کے حضرات شامل ہیں۔ اب ان انگلیوں پر گنے جانے والے چند ناموں میں ایک اور نام کا اضافہ ہوا ہے۔ ارشد میر وہی ارشد میر جن کا ذکر ادب میں بار بار ہو چکا ہے مگر ہم ہوتے تم ہوئے کہ میر ہوتے

مگر اتنا یاد رہے کہ ارشد میر نہ تو ہم تم، ہیں اور نہ ہی اس کی زلف کے اسیر ہیں بلکہ ارشد میر نے دخل در معقولات میں زلف کو زنجیر اور اپنے بھلے آزاد قلش کو اسیر کھنہ سے گریز کیا ہے۔

ارشاد میر کی مزاح نگاری کا دراصل مقصد ہی یہ ہے کہ دوسرے کے معاملات میں دخل دینے سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنی شگفتہ تحریر میں نہ صرف اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں بلکہ بہت سوں کو بے قرار کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

نقاد، شاعر، خطیب، محقق، سیاست دان، وکیل غرضیکہ زندگی کے کسی بھی اہم شعبے کا کوئی

کتنا ہی اہم فرد کیوں نہ ہو۔ ارشد میرٹھی فلسفی میں اسے انتہائی محیرِ اہم شخص بنا دیتے ہیں۔ یہ کمال نہیں تو اور کیا ہے!

ارشد میرٹھ دخیل در معقولات میں خندہ بے جایا نوخ استہزا سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کا کمال یہ ہے کہ آئینے کے سامنے بیٹھتے تو ضرور ہیں مگر عکس کسی اور کا دکھا جاتے ہیں۔ آپ کہیں گے یہ تو شعبہ گری ہے۔ جی ہاں آپ کا قول درست ہے۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ طنز و مزاح ہو یا ادب کی کوئی اور صنف لفظوں کی شعبہ گری ہی تو ہے بقول فیض صاحب:

”جیسے یہ فن آجاتا ہے وہ کامیاب، اور دوسرا عمر بھر اس دشت کی سیاحی کے ساتھ ساتھ اس کی خاک بھی چھانٹتا رہتا ہے۔“

اب آئیے ان موضوعات کی طرف جن میں ارشد میرٹھ ”تجاوز“ یا ”دخل در معقولات“ کا ثبوت دیا ہے۔ غالب کا بستر“ میں ارشد میرٹھ نے بہت سی اہم اور سرکردہ شخصیتوں کا بستر گول کر دیا ہے اور اس طرح ایک مختصر سے مضمون میں — اردو ادب کا نقاد جو ”غیر منصبی فرائض“ انجام دے رہا ہے اس کی تصویر کھینچی ہے اور کیا خوب کھینچی ہے منکد ایک شاعر“ میں میرٹھ ہی قبیلے کا ذکر ہے اور میرٹھ ہی قبیلے کا ایک ایک فرد حصولِ شہرت کے لیے جان دینے تک کے جن مرحلوں سے گزر رہا ہے اس کی ایک بار پھر تصدیق ہو جاتی ہے

حکے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ ما نیست

تیزی سے ترقی کرتے ہوئے معاشرے میں سائیکل کی کیا اہمیت ہے۔ یہ جاننے کے لیے ارشد میرٹھ ’دیہاتی سائیکل‘ سے استفادہ کیجئے۔ ’عینک اور عینکے‘ میں بغضِ معاویہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا قلعِ مع کیا گیا ہے۔ ’شوشہ‘ میں ضرورت سے زیادہ چھاتی نکال کر چلنے والوں کا ذکر ہے۔ ’تکلیہ کلام‘، ’تاش اور تاشے‘، ’لغافہ‘ اور ’تعمیراتی جن‘ میں فرد اور معاشرے کی بے شمار الجھنوں کا تذکرہ ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارا آج کا دور بے شمار نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے۔ ’داد‘، ’میں بیداد‘ اور ادب میں بے ادبی کے بروشیر ادب کو جس طرح چاٹ رہے ہیں بلکہ چٹ کر رہے ہیں اس کی تفصیل ارشد میرٹھ کی زد میں آئی ہے۔

ارشد میرٹھ نے نہ صرف میرٹھ، آپ کے اور اپنے SENSE OF HUMOUR کو تسلیم

رکھا ہے۔ بلکہ کچھ اس قسم کے لوگوں کی ضیافتِ طبع کا سامان بھی کیا ہے جو لطیفہ سنف کے بعد کہتے ہیں ”پھر کیا ہوا؟“ اور جس مزاح کے بارے میں میں صرف یہی کہوں گا کہ جو شخص اس لطیف شے سے محروم ہے۔ وہ دانشور تو ہو سکتا ہے کبھی معاشرے کا اہم فرد نہیں ہو سکتا۔ دانش کی اس غیر ضروری بہتات کو کچھ ہماری حس طنز و مزاح ہی کم کر سکتی ہے اسی لیے ارشد میرٹھ بہت سے رونے والوں کو نہ صرف مسکراتے پر مجبور کیا ہے بلکہ بعض مقامات پر ان کے نالہ شیون کو مکالموں میں تبدیل کر دیا ہے اور جب ایک چیتا چگھاڑتا شخص مکالمہ آرائی پر اتر آئے تو اس کی تہذیب کا

آغاز ہوتا ہے۔

یہی کام ارشد میر نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ بعض عینکے ارشد میر کے اس کام کو دخل در معقولات ' گردانتے ہوئے کہیں گے یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ تو آپ میرے مقولے کو ایک بار پھر پیش نظر رکھیں۔ ہر اچھی بات شروع میں اچھی نہیں لگتی۔ جس طرح ارشد میر کو پہلی بار دیکھ کر آپ پر طبیعت طاری ہو جاتی ہے بالکل ایسے ہی دخل در معقولات کا دیدار پہلے تو آپ پر طبیعت طاری کرے گا۔ اور پھر اس کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی آپ مسکرائیں گے کبھی خندہ بے جا پراتر آئیں گے۔ اور کبھی اس زور سے قہقہہ لگائیں گے کہ سننے والے اسے دخل در معقولات کہیں گے۔

اب جہاں تک محترمہ بسم اللہ نیاز احمد کے اس دعویٰ کا تعلق ہے تو اس ضمن میں مزید یہ بھی عرض کیا جاسکتا ہے کہ کس موضوع پر

مسند پر غم اٹھا کر محض اولیت کا شرف حاصل کرنا بذات خود چنداں اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ کام کے معیار اور نفاذ و نظر کے زاویوں کی بنا پر کتاب حوالے اور سند کا درجہ پاتی ہے۔ اگر کتاب میں جان ہوگی تو وہ زندہ رہے گی ورنہ گمراہ میں تبدیل ہو جائے گی۔

جہاں تک اردو گیت کے بارے میں کوائف، معلومات اور حوالے جمع کرنے کا تعلق ہے تو مصنف نے یقیناً بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ چنانچہ گیتوں کے مجموعوں کا تذکرہ بھی ہے اور گیت نگاروں کے فن پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے، کہیں مفصل اور کہیں مجمل۔

گیت کی ابتدا کے ضمن میں مصنف نے جو بحث کی ہے وہ اچھی ہے اور جس طرح سے اُنھوں نے سنسکرت اور ہندی روایات کی جڑوں کا کھوج لگایا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے اور بھگتنی کال کے گیت نگاروں کے گیتوں اور اسلوب پر بحث بھی دلچسپ ہے اور اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گیت محض جبرم کی مپکار اور صنی جذبات کا اظہار نہیں بلکہ وہ بھجن بن کر روحانی اظہار میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے، البتہ مصنف نے صوفیاء کو رام سے جو گیت منسوب کیے ہیں، ان کا گیت ہونا محملِ نظر ہے، اسی طرح صوفیاء کے گیتوں کے بارے میں ان کا یہ ارشاد ”ان میں سے کچھ گیت تو غزلوں کی شکل میں ہیں جو مختلف راگ راگینوں میں گائے جاتے ہیں“ (صفحہ ۱۷۰) اپنے اندر جو منطقی تضاد رکھتا ہے غالباً اس کی طرف مصنف کی نگاہ نہیں گئی۔ گیت غزل کیسے بن سکتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ اصناف ہیں اور ان کی ٹیکنیک کے جداگانہ تقاضے ہیں۔ اُنھوں نے صوفیاء کے گیتوں کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ گیت کم اور دوسرے زیادہ ہیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے دیوند رستیا رتھی نے لوک گیت جمع کرنے کے لیے کوشش کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دیوند رستیا رتھی نے ڈاڑھی بڑھالی تھی اور وہ گاؤں گاؤں جا کر گیت جمع کرتا تھا، ایسے گیت جو ادیبوں کی شعوری تخلیقات نہ تھے، بلکہ خود رو پھولوں کی مانند لوک رس میں ڈوبے ہوئے صحیح معنوں میں عوامی گیت تھے۔ گیتوں کا یہ مجموعہ ”گائے جاہندوستان“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مصنف نے کتابیات میں ”میں ہوں خاندان بدوش“ کا ذکر کیا، لیکن وہ ”گائے جاہندوستان“ کے نام سے بے خبر نظر آتی ہیں۔ اتنے بڑے کام میں ایسی فروگزاشتیں ہو جاتی ہیں، تاہم دیوند رستیا رتھی کا مفصل تذکرہ ضرور ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس نے سرکاری اداروں کی اعانت کے بغیر یہ کام ایک جذبہ سے کیا، ایک اور چیز جو مجھے بہت کھٹکی ہے یہ ہے کہ اُنھوں نے فیض احمد فیض کو زبردستی گیت نگار ثابت کر دیا ہے۔ ان کی دانت میں ”فیض“ کی ایک مشہور نظم ”مجھ سے پہلی محبت میرے محبوب“ مانگ اب گیت بن گئی ہے۔ کیونکہ وہ پاکستان کی مشہور مغنیہ نور جہاں کے گلے کی پرسوز آواز میں بھل کر گیت بن کر گونج رہی ہے۔ “(ص ۴۴) اسی طرح اُنھوں نے فیض کی نظم ”رقیب“ اور بعض دوسری نظموں کو بھی جو زبردستی گیت بنا دیا تو اسے مصنف کا کمالِ تحقیق ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ پی، ایچ، ڈی کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالے میں ایسی فروگزاشتیں نہیں ہونی چاہیے۔

مصنف نے فیض کی نظم ”میرے سہم میرے دوست“ نقل کرنے کے بعد اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

” فیض نے اس نظم میں گیت کے مفہوم میں بڑی وسعت اور گیت کے دامن میں بڑی کشادگی پیدا کر دی ہے۔ فیض کے نزدیک غزل بھی گیت اور نغمہ ہے۔ نظم بھی گیت اور نغمہ ہیں، گیت تو گیت اور نغمہ ہوتے ہی“ (ص ۴۵۴)

مصنف اس ضمن میں مزید رقمطراز ہیں۔

” فیض کے احاطہ فن میں صحیح معنوں میں گیت کہلائے جانے والے گیت نہیں ملتے سوائے ان نظموں کے جو گائے جانے اور مقبول عوام ہو جانے کے باعث گیت کی تعریف میں آ سکتی ہیں“ (ص ۴۵۵)

اس اقتباس سے پوچھنا ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر تو گیت کا کوئی فنی معیار ہے اور نہ ہی کوئی تکنیکی مفہوم، اگر نور جہاں کوئی نظم گا دے تو وہ گیت بن جاتی ہے، پادہ گائے جانے کے باعث مقبول عوام ہو جائے تو گیت بن جاتی ہے۔ واضح رہے کہ بحیثیت ایک صنفِ سخن گیت کی یہ تعریف قابل قبول نہیں ہو سکتی اور نہ ہی گائے جانے کے باعث کوئی بھی نثری ہیئت گیت کے سانچے میں داخل ہوتی ہے۔ انھوں نے گیت کی تعریف میں جن ناقدین کی آرام کے حوالے دیئے ہیں، اگر عملی تقلید میں انھیں ہی ملحوظ رکھا ہوتا تو بعض گیت نگاروں کے مطالعے میں رائے کی جو افراط و تفریط ملتی ہے، اس سے بچا جاسکتا تھا۔

نوٹ ۱۔ پی، ایچ، ڈی کے لیے ترمیم کیجئے اس تحقیقی مقالے کے نگاران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تھے۔

